قرآن حکیم کی مقدس آیات و احادیث نبوی آپ کی دینی معلومات میں اضافے اور تبلیغ کے لیے شائع کی جاتی ہیں۔ ان کا احترام آپ پر فرض ہے لہذا جن صفحات پر یہ آیات درج ہیں ان کو صحیح اسلامی طریقے کے مطابق بے حرمتی سے محفوظ رکھیں۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

جلد 25 ❖ شمارہ 09 ❖ اکتوبر 2015ء

ماہنامہ پاکیزہ کراچی

مدیرہ اعلیٰ : عذرا رسول

شعبہ اشتہارات

منیجر اشتہارات محمد شہزاد خان 0333-2256789

نمائندہ کراچی محمد رمضان خان 0333-2168391

رانا محمد حمید 0323-2895528

نمائندہ لاہور افراز علی تارش 0300-4214400

قیمت فی پرچہ 60 روپے ❖ زرِ سالانہ 800 روپے

پبلشر و پروپرائٹر: عذرا رسول

مقام اشاعت: C-63، فیز II ایکس ٹینشن ڈیفنس کمرشل ایریا مین کورنگی روڈ کراچی 75500

پرنٹر: جمیل حسن

مطبوعہ: ابنِ حسن پرنٹنگ پریس ہاکی اسٹیڈیم کراچی

خط کتابت کا پتا ● پوسٹ بکس نمبر 982 کراچی 74200

Phone :35804200 Fax :35802551

E-mail: jdpgroup@hotmail.com

قارئین کرام!

السلام علیکم!

آپریشن ضربِ عضب نے وطن دشمنوں کی کمر توڑ دی ہے۔ قبائلی علاقوں میں ہماری جری فوج نے وطن دشمنوں کے تمام نیٹ ورک ختم کر دیے ہیں جس کا اعتراف عالمی رائے عامہ کی رپورٹس ہیں۔ گزشتہ دنوں یہ خبر گردش کرنے لگی تھی کہ دہشت گردی کے خلاف اتحادی سپورٹ فنڈ پاکستان کو اب نہیں ملے گا لیکن ضربِ عضب کی کامیابی نے امریکا کو بھی فیصلے پر نظرِ ثانی کے لیے مجبور کر دیا اور ایک خصوصی نمائندے نے اعلان کیا کہ نئی صورتِ حال کے پیشِ نظر پاکستان کو اتحادی فنڈ کی ادائیگی جاری رہے گی۔ یہ کامیابی شمالی علاقوں سے وطن دشمنوں کے صفایا کی وجہ سے پاکستان کو ملی ہے۔ پاک فوج نے دہشت پسندوں سے ان علاقوں کو تقریباً خالی کرا لیا ہے اس لیے ان کے وہ ہمدرد جو اِدھر اُدھر چھپے بیٹھے ہیں ان سے ہوشیار رہنے کی اب زیادہ ضرورت ہے گو کہ خفیہ ایجنسیاں، پولیس اور قانون نافذ کرنے والے دیگر ادارے پوری طرح بیدار ہیں۔ کامیابی سے مارے گئے چھاپے اور گرفتار دہشت پسند اس کا ثبوت ہیں لیکن عوام کی ذمے داری بھی اب بڑھ گئی ہے۔ اپنے اردگرد ہمیں کڑی نظر رکھنی ہوگی۔ مشتبہ افراد اور سرگرمیوں کی اطلاعات پولیس اور قانون نافذ کرنے والے اداروں تک پہنچا کر اپنی ذمے داری ہمیں ادا کرنی ہوگی۔

معراج رسول

قلم کار

اس کی پرورش پانی پت کے جس گھر میں ہو رہی تھی وہ گھر اس کے نانا خواجہ سجاد حسین مرحوم کا تھا۔ جنہیں اس قصبے میں ایک نمایاں مقام حاصل تھا۔ سجاد حسین محمڈن اینگلو اورینٹل کالج علی گڑھ سے پڑھے ہوئے ان چار نوجوانوں میں سے تھے جنہوں نے کلکتہ یونیورسٹی سے بی اے کی سند حاصل کی تھی۔ اس زمانے میں بی اے کی سند دولت و اقتدار کی چابی تھی۔ یو پی کے گورنر نے ان چاروں کو بلا کر کہا کہ گورنمنٹ سروس کے کسی بھی اعلیٰ عہدے کے لیے وہ درخواست دے دیں، انہیں وہ نوکری دے دی جائے گی۔ ایک نے سول سروس کو چنا اور دس سال میں کمشنر کے عہدے پر پہنچ گیا۔ دوسرے نے محکمہ پولیس کا انتخاب کیا اور انسپکٹر جنرل کے عہدے تک ترقی کی۔ تیسرا جوڈیشنری میں گیا اور سیشن جج بنا مگر سجاد حسین نے محکمہ تعلیم کو پسند کیا اور ڈپٹی ایجوکیشنل انسپکٹر سے انسپکٹر جنرل کے عہدے تک پہنچے تھے کہ نوکری کو لات ماری۔ پینشن لے کر جایداد فروخت کی اور قصبے میں ایک اسکول قائم کر کے بیٹھ گئے۔ 1946ء میں سجاد حسین کا انتقال ہوا۔ انتقال سے چند منٹ قبل جب ہوش آیا تھا تو پہلا سوال یہی کیا تھا کہ کیا بچوں کے میٹرک کا رزلٹ آ گیا؟ تعلیم سے اس قدر محبت کرنے والے شخص کی زیرِ نگرانی تربیت پانے والے لڑکے کو بھی علم سے اسی قدر رغبت ہونا ضروری ہے۔ پھر والد غلام السبطین بھی علم و ادب کی جانب راغب تھے مگر سجاد حسین اور غلام السبطین میں ایک بڑا فرق یہ تھا کہ سجاد حسین کی سوچ قوم تک محدود تھی جب کہ غلام السبطین انسان دوستی اور جمہوریت پر یقین رکھتے تھے۔ اس دور میں زمینداری کا دور دورہ تھا۔ حسب نسب، شرافت، رذالت، اونچے خاندان، نیچ خاندان، سید، انصاری، شیخ مغل، پٹھان کے امتیازات عروج پر تھے۔ شادی بیاہ میں فضول خرچیاں، توہم پرستی، تعویذ گنڈے، پیری مریدی، عرس و قوالی، مجلس، ماتم کا خوب خوب چرچا تھا مگر غلام السبطین کے نزدیک یہ سب بے معنی تھے۔ وہ صرف انسانیت پر یقین رکھتے تھے۔ مگر سادگی پسند تھے۔ نمود و نمائش سے حد درجہ نفرت کرتے تھے مگر آزادیِ ہند کے بھی حامی تھے۔ اس وقت مسلمانوں کی بڑی جماعتیں تھیں مجلسِ احرار، مسلم کانفرنس، جمعیت العلماء ہند اور مسلم لیگ۔ باقی تینوں نے مسلم لیگ اور اس کے مطالبۂ پاکستان کے خلاف محاذ بنا رکھا تھا۔ غلام السبطین مسلم کانفرنس کے حامی تھے اس لیے مسلم لیگ کی سیاست کو پسند نہیں کر رہے تھے جب کہ ان کے صاحبزادے کا یہ عالم تھا کہ وہ مسلمانوں کی چاروں بڑی جماعتوں کو انسان دشمن قرار دے رہا تھا۔ یہی خیال اس کا کانگریس کے بارے میں بھی تھا۔ اس کی دلچسپی سیکولرازم میں تھی۔ وہ کمیونسٹ نظام کا حامی تھا۔ یہ فکر اسے تب ملی تھی جب وہ بہت چھوٹا تھا۔ چار یا پانچ برس کا رہا ہو گا۔ 1919ء کا سال تھا۔ جلیانوالہ باغ کا خونی واقعہ رونما ہو چکا تھا اور انگریز پنجاب کے لوگوں پر رعب طاری کرنے کے لیے طرح طرح کی کوششیں کر رہے تھے۔ جی ٹی روڈ کے اطراف میں جتنے بھی قصبے تھے ان سب کے اسکولوں میں حکم جاری کیا گیا تھا کہ وہ سب بچوں کو جھنڈیاں دے کر قطار میں کھڑا کریں تا کہ انگریز فوج جو سڑک سے گزرے گی اس کو خوش آمدید کہیں۔ صبح سے سہ پہر تک ننھے ننھے بچے دھوپ میں کھڑے رہے۔ توپیں، بندوقیں، مشین گنیں اور بھالے تلواریں سنبھالے فوجی گزرے۔ حکومت کا خیال تھا کہ اسلحہ اور فوجیوں کی نمائش سے عوام مرعوب ہو جائیں گے مگر ان بچوں پر الٹا اثر ہوا۔ کئی دن تک غلام سبطین کا بیٹا لوگوں کو جمع کر کر کے ان ''لال منہ والے بندروں'' کی نقل کرتا اور کہتا کہ ہم انہیں یہاں سے نکال باہر کریں گے۔ یہی نفرت وقت کے ساتھ بڑھتی رہی اور 1938ء میں وہ نوجوانوں کی بین الاقوامی تحریک کی کانفرنس میں امریکا پہنچ گیا۔ اس کانفرنس میں شرکت کے لیے 30-35 ملکوں سے نوجوان آئے تھے۔ جرمن جو ہٹلر کی گسٹاپو سے چھپ کر آئے تھے۔ اطالوی، مسولینی کی خفیہ پولیس کو جل دے کر آئے تھے۔ برطانوی، پولش غرض ہر ملک سے نوجوان چھپ کر آئے تھے۔ خود یہ بھی متحدہ ہند کی حکومت کو جھوٹے خطوط دکھا کر امریکا آیا تھا۔ صرف اس لیے کہ اس کے اندر فاشزم کے خلاف جذبات بیدار ہو چکے تھے۔ اس کی تقریر نے تمام نوجوانوں میں اسے مقبول کر دیا۔ وہ لوگ جنہیں برطانوی تسلط سے ہند کی آزادی سے کوئی مطلب نہیں تھا وہ بھی اسے مبارک باد دینے لگے۔ یہ کانفرنس جنگ روکنے کے لیے منعقد ہوئی تھی لیکن دیر میں ہوئی تھی اور سال بھی نہیں گزرا تھا کہ دوسری جنگِ عظیم برپا ہو گئی۔ یہ واپس آ گیا۔ یہاں آ کر اس نے بمبئی کرانیکل نامی اخبار کو جوائن کر لیا۔ وقت گزرتا رہا۔ وہ جن خیالات کا حامل تھا ان خیالات کو شکست ہونے لگی تھی۔ برطانوی حکومت تو بساط سمیٹ رہی تھی مگر ہند میں تعصب کے عفریت نے سر اٹھا لیا تھا۔ شمال مشرق اور شمال مغرب سے فسادات کی آندھی اٹھنے لگی تھی۔ انسانی خون ارزاں ہو گیا تھا۔ وہ بمبئی میں تھا اور اس کی ماں، بہنیں پانی پت میں۔ جب مغربی پنجاب سے ہندو سکھ پانی پت پہنچے تو انہوں نے قیامت برپا کر دی۔ ہر گلی کوچے کو مسلمانوں سے خالی کرانے کی مہم شروع ہو گئی۔ فسادات کے بیس بائیس دن انہوں نے وہیں گزارے پھر دہلی سے فوجی ٹرک گیا اور ان لوگوں کو دہلی لایا گیا پھر اس نے ماں کو اپنے پاس بمبئی بلا لیا۔ وہ دن رات بمبئی میں امن کی میٹنگز میں گزارتا کیوں کہ وہ قلم کار تھا اور قلم کار کبھی تعصب پسند نہیں ہوتا۔ کالم لکھتا، مضامین چھاپتا مگر جب انسانیت نے ہلکی سی انگڑائی لی اور کچھ امن وامان ہوا تو وہ صحافت کے ساتھ فلم میں بھی دلچسپی لینے لگا لیکن اس کی پہچان اول تا آخر قلم کار ہی رہی۔ اسے دنیا خواجہ احمد عباس کے نام سے جانتی ہے۔

شہرِ خیال

☆شاہد جہانگیر شاہد پشاور سے رقمطراز ہیں۔ ”آج سرگزشت سے اپنے عشق کی داستان سناؤں گا۔ سرگزشت سے میری پہلی ملاقات عجیب حالات میں ہوئی۔ یہ 90ء کی دہائی کی بات ہے۔ میں ایک سرکاری اسپتال میں آفس انچارج تھا۔ اسپتال کے سامنے فٹ پاتھ کے قریب ایک ردی اخبار فروش کی دکان تھی۔ اکثر ردی میں پرانی کتابیں اور میگزینز بھی اس کے پاس آجاتے تھے جنہیں وہ فٹ پاتھ پر پھیلا دیتا تھا جسے وہاں سے گزرنے والے اکثر علم کے پیاسے خرید لیتے تھے۔ ڈیوٹی پر آتے جاتے میں چند لمحے دکاندار کے پاس رک کر سلام دعا کرتا اور کتابوں پر ایک اچٹتی سی نظر ڈالتا اور روڈ کراس کر کے اپنے اسپتال میں آجاتا۔ فٹ پاتھ پر بعض اوقات بڑی قیمتی اور نایاب کتب بھی مل جاتی ہیں جنہیں میں خرید کر اور ضروری مرمت کروا کر اپنی ذاتی لائبریری کی زینت بنا لیتا۔ اچھا قلم، اچھی کتاب اور اچھی خوشبو ہمیشہ سے میری کمزوری رہی ہے۔ انہی دنوں ایک روز میں ڈیوٹی ختم کر کے گھر جارہا تھا۔ حسب معمول دکاندار کے پاس رک کر ایک سانس کی۔ چند لمحے رک کر پرانی کتابوں پر نظر ڈالی کہ اچانک ایک نعتیہ کلام پر مبنی بہت ضعیف کتاب پر نظر پڑی جس کی جلد اکھڑ چکی تھی۔ میں نے احتراماً جھک کر کتاب اٹھالی۔ ابھی میں اٹھنے لگا تھا کہ اسی کتاب کے نیچے ایک سرگزشت نظر آیا جو کہ آزادی نمبر تھا۔ سرگزشت کے ٹائٹل پر پاکستان کے قومی پرچم اور بابائے قوم حضرت قائداعظمؒ کی تصاویر چھپی ہوئی تھیں۔ میں نے وہ پرچہ بھی اٹھالیا۔ اس قسم کی ناقدری اور بےحرمتی دیکھ کر ہمیشہ میرا دل کڑھتا ہے۔ میں نے دونوں کی قیمت پوچھی تو کہنے لگا کہ ڈاکٹر صاحب آپ یونہی لے جائیں، میرے پاس تو یہ ردی میں آئے ہیں۔ (یاد رہے کہ ہمارے ہاں کمپاؤنڈر اور چپڑاسی کو بھی اسپتال کی نسبت سے ڈاکٹر کہہ کر پکارا جاتا ہے اور میں تو ایک اہم عہدے پر متعین تھا۔) میرے بےحد اصرار پر کہنے لگا کہ چلیں آپ دس روپے دونوں کے دے دیں میں کتابیں لے کر گھر روانہ ہوگیا۔ ایک واقف دکاندار کو نعتیہ گلدستہ جلد تبدیل کرنے کے لیے دے دیا اور سرگزشت کا پرچہ لے کر گھر آگیا۔ فرصت کے اوقات میں سرگزشت کا مطالعہ شروع کیا۔ ایک کے بعد ایک مضمون پڑھتا چلا گیا اور بےحد متاثر ہوا۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ کراچی سے شائع ہونے والا مشہور ”سب رنگ ڈائجسٹ“ بےانتہا عروج کے بعد زوال کی طرف گامزن ہوچکا تھا اور کئی کئی ماہ کے ناغے اور بعض اوقات تو سال میں صرف ایک بار شائع ہونے لگا تھا اور ایسے میں سرگزشت کی آمد ایک تازہ ہوا کا جھونکا ثابت ہوئی۔ اگست کا پرچہ پڑھنے کے فوراً بعد میں نے تازہ شمارہ خریدا وہ بھی بڑا دلچسپ تھا۔ اب تو میں سرگزشت کے عشق میں مبتلا ہوتا چلا گیا لہٰذا پرانی کتابوں کے بازار کے واقف دکانداروں سے گزارش کی کہ اب تک کے جتنے بھی پرانے پرچے مل سکتے ہیں وہ میرے لیے رکھ لیں۔ اب روزانہ چھٹی کے بعد پرانے پرچوں کی تلاش میں کباڑی بازار جانے لگا۔ کبھی ایک کبھی دو پرچے ہاتھ لگ جاتے۔ سوائے پہلے پرچے کے اس وقت تک کے تمام پرچے آخرکار مجھے مل گئے۔ میری تلاش مکمل ہوئی اور تب سے اب تک ہر ماہ کا ایک بڑا ذخیرہ میرے پاس جمع ہوگیا۔ پھر میرے پاس جگہ نہ رہی اور صرف موجودہ سال کے پرچوں کے علاوہ تمام پرچے دوستوں میں بانٹ دیے۔ اب بار بار کے پڑھے ہوئے انہی پرچوں کا مطالعہ کرتا ہوں یہاں تک کہ نیا پرچہ آجاتا ہے تو پھر اس میں مصروف ہوجاتا ہوں۔ یہ تھی سرگزشت سے میرے عشق کی داستان۔ اس وقت ایک بار پھر اگست اور ستمبر 2015ء کے پرچے میرے سامنے پڑے ہوئے ہیں۔ دونوں پرچے بہت اچھے مضامین پر مشتمل ہیں۔ آج چھ ستمبر ہے جب میں یہ تبصرہ تحریر کررہا ہوں۔ کئی دن سے ٹی وی کے مختلف چینلز پر شہیدوں کے لواحقین اور غازی آ آ کر اپنی یادداشتیں اپنے ہم وطنوں سے شیئر کرتے ہوئے خود بھی جذباتی ہوجاتے ہیں اور ناظرین کو بھی اپنے ساتھ 1965ء کے پاکستان میں لے جاتے ہیں۔ جب چشم فلک نے مختلف زبانوں اور فرقوں میں بٹی ہوئی عوام کو ایک قوم اور ایک آواز ہوتے ہوئے دیکھا تھا۔ ٹی وی نے تو اپنا حق ادا کردیا لیکن سب ہی جانتے ہیں کہ تحریر کو تصویر پر ہمیشہ فوقیت حاصل رہی ہے۔ تصویر تو کچھ عرصہ بعد ذہن سے محو ہوجاتی ہے لیکن تحریر برسوں تک اور بعض اوقات صدیوں تک محفوظ رہتی ہے اور اپنے پڑھنے والوں کو رفتگان کی یاد اور کارناموں سے آگاہ کرتی رہتی ہے۔ اگست اور ستمبر 2015ء کے پرچوں میں مجھے شدت سے اپنے ان محسنوں کی کمی محسوس ہوتی رہی ہے جنہوں نے اپنا کل ہمارے آج پر قربان کردیا تھا۔ اُمید ہے کہ آیندہ کسی شمارے

میں یہ کمی ضرور پوری کی جائے گی۔ اس ماہ ڈاکٹر ساجد امجد جناب احسن مارہروی کا زندگی نامہ لے کر آئے ہیں۔ بہت خوب ڈاکٹر صاحب۔ دیگر مضامین بھی بہت اچھے ہیں لیکن فرداً فرداً سب کا ذکر مشکل ہے کہ خط پہلے ہی بہت طویل ہو گیا ہے۔ اس ماہ کا توشۂ خاص جناب زرہ حیدرآبادی کا مضمون ''شاعر کوئی اور ہے'' تھا۔ یہ ایک بے حد اہم اور معلوماتی مضمون ہے۔ انور فرہاد کا ''مولا جٹ'' بھی خوب تھا۔ بہت سی معلومات حاصل ہوئیں کس کس مضمون کا ذکر کیا جائے سب ہی تحریریں بہت اچھی تھیں۔ 'شہرِ خیال' منظر علی خان کو کرسیٔ صدارت مبارک ہو۔ نجمی رحمٰن کا تبصرہ مزہ دے گیا۔ مجید احمد جائی، سدرہ بانو ناگوری، منشی محمد عزیز مے، آفتاب احمد نصیر اشرفی، رانا محمد شاہد سب کے تبصرے جاندار تھے۔ ظہیر احمد تبسم میں آپ کی دعاؤں اور محبتوں کے لیے مشکور ہوں۔ طاہرہ گلزار بھی اس ماہ غیر حاضر رہیں۔ برادرم وحید ریاست بھٹی بھی گزشتہ کئی ماہ سے مسلسل غیر حاضر چلے آرہے ہیں۔ ان سے گزارش ہے کہ اپنے بھرپور تبصرے کے ساتھ دوستوں کی محفل میں حاضر ہوں۔ اتنی طویل غیر حاضری اب چبھنے لگی ہے۔ دوستوں سے گزارش ہے کہ ذاتیات کی بجائے درگزر سے کام لے کر سرگزشت میں چھپنے والے ادبی مواد پر تبصرہ کیا کریں۔ ہم سب سرگزشت کے رشتے سے ایک دوسرے کے عزیز ہیں۔''

☆ **احمد خان توحیدی** کا اظہاریہ کراچی سے۔ ''شمارہ ستمبر 31 اگست کو کلمہ چوک راولپنڈی سے لے کر عازم کراچی ہوا۔ 28 گھنٹے کا سفر ہم نے سرگزشت میں ڈوب کر طے کیا۔ طویل لبو ختم ہوئی لیکن محفل کے ساتھی ڈفلیاں نہ بجائیں۔ جب تک دم ہے سرگزشت، سسپنس، جاسوسی اور پاکیزہ کی دم چھوڑنے کا میرا ہرگز ارادہ نہیں۔ برادر معراج رسول صاحب دین و دنیا کی تعلیم تجارت بن کر غریب کی جھگی سے دور محلوں میں روپوش ہو گئی ہے۔ بچپن میں سرکاری اسکول میں دروازے بند کر کے ہمیں سرکاری دودھ پلایا جاتا تھا۔ اب یہ ہم اسپتال والوں سے پوچھیں جسے کوئی چیز وقت پر نہیں ملتی۔ درسی کتب و سامان کے دو ٹرک حیدرآباد میں پکڑے گئے۔ ایک بھی ہمارا ہیرو اتنے عظیم ہیرو میز ون لیزر لکوٹ کے بارے میں ہم بالکل بے خبر تھے۔ بچی کو غیر مسلم کہہ کر نکل جانے کا جملہ قلبی صدمے کا باعث بنا۔ اسلام پوری دنیا کا واحد مذہب ہے جو غیر مسلم کو پورا احترام دیتا ہے۔ (مگر ہم نہیں دیتے، کیا یہ کوتاہی کم ہے) ''شہر خیال'' میں تانک جھانک کی۔ منظر علی تاج سجائے نظر آئے۔ ہم نے بھی مبارک باد کے ساتھ جتنے لڈو اٹھا سکتے تھے لے کر نکل آئے۔ برادر مجید احمد جائی اچھا تبصرہ کیا، ہم سب کے دل کی بات ہے کہ تعلیم کی آڑ میں لوٹ مار ہو رہی ہے۔ مسز سدرہ ناگوری تبصرہ طویل بٹ ویری گڈ تھا۔ بٹ یو میرے گاؤں والی بھاگاں لڑاکی کی طرح دروازے کی اوٹ سے تانک جھانک کرتی آستین چڑھائے نظر آئی۔ اعلیٰ تعلیم یافتہ لیکچرار بے بی ثریا طاہر گلزار لڑائی پر روٹھ کر اعتکاف میں جا بیٹھی ہیں۔ اپنی محفل میں نوک جھوک لازم ہے مگر سب ساتھی کسی کی کامیاب و ناکام ازدواجی زندگی میں دخل نہ دیں، سب کا ذاتی مسئلہ ہے۔ بھائی فلک شیر رحیم یار خان امر دبھی ازدواجی زندگی کے بغیر نہیں رہ سکتا جیسا کہ بزرگوں نے برادری کو یکجا رکھنے کے لیے تین نکیل ڈال کر ہمیں 20 ووٹ کا سربراہ بنا کر بلدیاتی امیدواروں کو ہماری خدمت کا موقع دیا۔ رانا شاہد، منشی عزیز مے، ظہیر تبسم، نجمی USA، نثار لاڑکانہ، بشریٰ افضل، آفتاب نصیر اشرفی کے اچھے تبصرے تھے۔ طویل کہانیاں میں احسن الکلام، سفر امریکا، شاعر کوئی اور ہے سراب کا مطالعہ کر نہ سکا کیونکہ پرچے کو بچوں نے اسکول کے مضمون سمجھ کر قبضہ کر لیا ہے۔ ابن کبیر کی خدمت گار کاش یہ جذبہ پہلے ہوتا تو ہمارا باز و نہ کٹتا۔ منی نہیں گیتا، اختر بلوچ نے اتنے عظیم خاندان کی مختصر تحریر دوبارہ تفصیل سے لکھیں۔ ستمبر کی شخصیات، عظیم قائد کو دیکھ کر خود بخود ہاتھ سیلوٹ پر چلا گیا۔ اف ہائے، زندگی نے مہلت نہ دی۔ نکل کے دن روتا چھپ کے رات روتی ہے۔ بابا جان و بھگت سنگھ کے بارے میں پہلے پڑھا نہیں ہے۔ آدم خور پسند آئی، ہر شمارہ میں شکار کہانی لازمی دیں۔ سلمیٰ اعوان کی کیلاشی کہانی، ویری گڈ۔ انور فرہاد مولا جٹ کی یاد تازہ کرانے پر شکریہ۔ ایاز راہی ساہیوال کی زرخیز مٹی سے ہم ٹرک بھر بھر کے لا کر فارم بنا رہے ہیں۔ سچ بیانیاں، عجب دستور، معاشرہ کی سو فیصد تلخ حقیقت۔ 1970ء میں میں خود چشم دید گواہ ہوں کہ ماں ... ایک بیٹے کو دیسی گھی کھلاتی اور دوسرے معذور بیٹے نے اپنی کمائی سے چار آنے کا ڈالڈا گھی لایا تو ماں نے اسے جوتے سے مارا۔ والدین کا ناروا سلوک بچوں کو احساسِ کمتری میں مبتلا کر دیتا ہے۔ سعدیہ کو نیک آدمی سے شادی ضرور کر لینی چاہیے۔ ذمہ دار کون، اعلیٰ تعلیم یافتہ مگر غلط روش پر ایسے لڑکوں کو تبلیغی جماعت میں بیٹھنا چاہیے۔ انشاءاللہ ہر مسئلہ حل ہو جائے گا۔ ست رنگی دنیا، کراچی اور ہر جگہ یہی حال ہے، ہمارے ساتھ کام کرنے والے باقاعدگی سے ماہنامہ بھتہ دے کر جان کی امان چاہتے ہیں۔ قسمت کے کھیل، گلناز اپنی ناسمجھی میں برباد ہوگی۔ دوسروں کے لیے گڑھا کھودنے والے دانش جیسے لوگ خود گڑھے میں گرتے ہیں۔ روایتوں کے اسیر، بالغ ہونے پر شاہ زیب کو معذور سمجھ کر شادی نہ کرنے سے یہ نوبت آئی۔ ازدواجی تعلق شرعی اصل حل ہے۔ کاش فیصل نفسیاتی مریض تھا۔ شاہین کاظمی کی گلی نے دور جہالت کی یاد تازہ کر دی۔ تلافی، نوشین کا فرحان سے ملنا غلط تھا۔ نتیجہ قتل و خودکشی۔ اقرارِ جرم، ایسے ہیرا پھیری والے بے ضمیر لوگوں کا انجام یہی ہوتا ہے۔ چونکہ سرگزشت، سچ بیانیوں کے باعث منفرد مقام رکھتا ہے اور ہر شمارہ خاص شمارہ ہوتا ہے۔''

☆ **اعجاز حسین سٹھار**، نور پور تھل سے لکھتے ہیں۔ ''ایک مدت بعد پرچا بر وقت ملا۔ ہاکر والے براہ راست رابطہ سے گھبرا رہے ہیں۔ قیصر خان سے بات ہو جائے، یہ ہماری خوش قسمتی ہوگی۔ یوسف سانول، بھئی قریب رہتے ہوئے ملاقات نہ ہونا عجیب لگتا ہے۔ احمد خان توحیدی، ہوائی سلام کا شکریہ۔ ہم بھی موٹروے پر بورڈ نظر آنے پر سلام کو عادت بنا لیں گے۔ منظر علی خان، واقعی آپ خان بلوچ ہیں۔ مبارک

یاد قبول کیجیے۔ ''مُنی نہیں گیتا'' وطن ہمارا آزاد کشمیر کی زندہ مثال ہے۔ ''ستمبر کی شخصیات'' خاصے کی چیز ہے اور معلومات کی پٹاری ہے۔ ''مولا جٹ'' میں نے 1981ء میں سرگودھا کے تاج سینما میں دیکھی تھی۔ اب فاطمہ جناح روڈ پر سینما کی جگہ لوہا اسٹیل کے سامان کا بہت بڑا اسٹور ہے۔ سچی بات ہے فلم دیکھ لینے کے بعد ایک مدت بعد اس کی مقبولیت کا علم ہوا اور ہم تب تک زمانے کی افراتفری میں کہانی بھی بھول چکے تھے۔ ساہیوال کی سیر بھی گزارا کرا گئی۔ ''سراب'' پر جو دوست بلا جواز تنقید کر رہے ہیں اس پر افسوس ہے۔ کہانی میں تسلسل اور دلچسپی میں ذرا برابر کمی نہیں آئی اور واقعات کی روانی ساون کے دریا کے بہاؤ جیسی ہے اور مصنف کی محنت قابل داد ہے۔ پہلی سچ بیانی، ''عجیب دستور'' میں والدین کا رویہ نہ سمجھ آنے والا اور عجیب ہے۔ سوتیلی اولاد سے ایسا سلوک دیکھا سنا ہو سکتا ہے یہاں تو ایسا لگتا ہے جیسے گزری نسلوں کا انتقام لیا جارہا ہے۔ کہانی کا تانا بانا ایسے گورکھ دھندے پر ہے کہ قاری الجھ کر رہ گیا ہے۔ پڑھنے کے بعد دلچسپی، ہمدردی کی بجائے بیزاری سی محسوس ہوئی ہے۔ ''ذمہ دار کون'' میں وہ خود ہی ذمہ دار ہیں۔ یوں محرومیوں کا شکار طبقہ انتقام پر اتر آئے تو دنیا کے آدھے سے زیادہ انسان لقمۂ اجل بن جائیں۔ جرم کے بعد ہر مجرم مختلف تاویلیں گھڑ کر خود کو بے گناہ اور مظلوم ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ''ست رنگی دنیا'' میں راشد نے انعامی رقم حاصل کرنے کے بدلے سکون کا سودا کرلیا تھا۔ یک مشت دولت کو سنبھالنا عام انسان کے بس کی بات نہیں پھر کتنے مافیا ہیں جو شریف، بے ضرر اور بے بس انسانوں کے تاک میں رہتے ہیں۔ ''قسمت کے کھیل'' میں عورت نے کسی کی زندگی میں کیا زہر گھولنا تھا بلکہ وہ خود تباہ و برباد ہوگئی۔ وہ نوجوان تھی، زندگی سے لطف اندوز ہونا تھا۔ کتنی خوشیاں، جولانیاں اور راحتیں اس کی تاک میں تھیں لیکن وہ دوسروں کے ہاتھوں کھیلتے کھیلتے سب کچھ حتیٰ کہ سانس تک ہار بیٹھی۔ ہر بندہ اپنے مزاج، سوچ اور عقل کے مطابق فیصلہ دے سکتا ہے کہ کون نقصان میں رہا۔ ''روایتوں کے اسیر'' میں کافی کچھ ظاہر نہیں کیا گیا۔ بڑی بڑی دیواریں کتنی بے بس عورتوں کی سسکیوں، آہوں اور نا انصافیوں کی گواہ ہیں اور یہ سب کچھ آج بھی ویسا ہی چل رہا ہے صرف کردار بدل رہے ہیں۔ ''کاش'' میں فیصل اور نورین کی عمر میں خاص فرق نہ تھا۔ مرد بھی تو اپنی شادی کے لیے کم عمر ترین لڑکی پسند کرتا ہے بس جذبے جوان رہنے چاہئیں اور محبت، خلوص اور وفا میں فرق نہ آنے پائے۔ ''طلاق'' میں جذبات سے ہٹ کر اور حقیقت کو سامنے رکھ کر سوچا جائے تو شمین کے اس قدم کو سراہا نہیں جاسکتا۔ فرقان مر چکا ہے۔ بدنامی جتنی حصے میں آنی تھی وہ آچکی ہے۔ آخر میں ایک شکوہ بھی پیدا ہوگیا ہے کہ معراج رسول نے اپنے انٹرویو سے محروم رکھا ہوا ہے۔ اب بھی ہمارے بھتیجے کی شادی کے احوال کے لیے پاکیزہ کا انتخاب ہوا۔ میری طرف سے دلی مبارک باد کے ساتھ سرگزشت کے قارئین کا جرم بھی بتا دیں بھلا اپنوں کے ساتھ کوئی یوں بے رخی بھی برتتا ہے۔''

☆ سعید انور عباس شاہ کا خلوص نامہ دریا خان، بھکر سے۔ ''ستمبر کا شمارہ ہمیں 4 ستمبر کو ملا، ایک تو شمارہ لیٹ ملا دوسرا سب سے بڑی کوفت ہمیں اس وقت ہوئی جب ''شہر خیال'' کے کسی بھی حصے میں ہمارا نام شامل نہ تھا۔ حالانکہ خط تو ہم نے بروقت پوسٹ کر دیا تھا جو یقیناً ڈاکخانے والوں کی بھینٹ چڑھ گیا ہوگا۔ ان ڈیوٹی فل محکمے کی ہم کیا مثال دیں یہ خود اپنی مثال آپ ہے۔ 3 ستمبر کو ایک مرتبہ پھر محکمہ ڈاک کے ایک اعلیٰ افسر ریڈیو پاکستان کو انٹرویو دے رہے تھے اور اپنے محکمے کے اوصاف خوب بڑھا چڑھا کر بیان کر رہے تھے۔ وہ بار بار ایک ہی جملہ دہرا رہے تھے کہ ہمارا مستعد عملہ یہ کرتا ہے وہ کرتا ہے، زیادہ سے زیادہ دو تین دن میں ڈاک بخیر و خوبی اپنی منزل تک پہنچا دیتا ہے جب کہ ہوتا اس کے برعکس ہے۔ ہم نے ایسے بچیاں بچے بھی دیکھے ہیں جو محکمہ ڈاک کی کوتاہی سے امتحان دینے سے بھی رہ جاتے ہیں کیوں کہ رول نمبر سلپ یا تو ان کو وقت پر نہیں ملتی یا پھر پوسٹ مین صاحب ایسی بے حد ضروری چیز کو ناکارہ سمجھ کر صحیح ایڈریس کی بجائے اپنی آسانی کی خاطر راستے میں پڑنے والی کسی دکان پر دے دیتے ہیں کہ کسی آتے جاتے کو دے دینا، اب یہ دکاندار پر منحصر ہے کہ وہ اس کے ساتھ کیا سلوک کرتا ہے۔ ''شہر خیال'' میں منظر علی خان بازی لے گئے بہت بہت مبارک ہو بھائی اس کے علاوہ مجید احمد جائی، بزرگ ہستی خالد محمود، سدرہ بانو ناگوری، فلک شیر، منشی محمد عزیز مئے، نعیم الحسن شاہ، محمد احمد رضا انصاری، ظہیر احمد تبسم، بشریٰ افضل، رانا حبیب الرحمٰن، آفتاب احمد نصیر اشرفی، رانا محمد شاہد، نثار احمد اور مجی رحمٰن کے شاندار خطوط پڑھ کر ہم مستفید ہوئے۔ ''شہر خیال'' کی معروف شخصیت رانا سجاد نہ تو محفل میں شامل تھے اور ان کا نام بلیک لسٹ میں شامل تھا۔ بھئی کہاں ہیں آپ خدا خیر کرے۔ اس کے علاوہ شہر خیال کے چمکتے دمکتے ستارے قیصر عباس خان، شاہد جہانگیر شاہد اور ہماری ہر دلعزیز بہن طاہرہ گلزار بھی غیر حاضر تھیں۔ پچھلے خط میں وہ کچھ ناراض ناراض سی لگ رہی تھیں۔ کہیں انہوں نے ہم سب سے منہ موڑ تو نہیں لیا۔ خدا کرے ایسا نہ ہو۔ محمد سلیم قیصر بھی شامل محفل نہیں تھے۔ خدا ان کو سلامت رکھے اور ان کی مصیبتیں جلد دور فرمائے۔ بشریٰ افضل آپ کے عزیزوں کی وفات پر ہم آپ کے غم میں برابر کے شریک ہیں خداوند کریم مرحومین کو جنت میں اعلیٰ درجہ عطا فرمائے اور آپ سب کو صبر جمیل عطا فرمائے، آمین۔''

☆ عبدالجبار رومی انصاری کا خلوص نامہ لاہور سے۔ ''سرگزشت ستمبر کا شمارہ 29 تاریخ کو مل گیا تھا۔ اس دفعہ سرورق پر تو خوب صورتی کا خمار چھایا ہوا تھا۔ چند دن پہلے تک جو گیتا کی خبر اخبار میں پڑھی تھی۔ حیرت ہوئی کہ اتنی جلدی گیتا کے متعلق معلومات سرگزشت کے صفحات پر بھی آگئیں۔ واہ مان گئے جی، یوں سب سے پہلے ''مُنی نہیں گیتا'' کو ہی پڑھنے بیٹھ گیا۔ گونگی گیتا بالکل بجرنگی بھائی کی مُنی ہی لگی۔ اللہ کرے وہ بھی جلد اپنے والدین سے ملے، ایدھی فاؤنڈیشن کی گیتا کے لیے محبت اور اسے اپنا مذہبی ماحول دینا انسانی ہمدردی اور خدمت کی انتہا

ہے۔ اللہ انہیں اجرِ عظیم دے۔ اداریے میں بہت اچھی بات کہی گئی اگر حکومتی سطح پر سستی اور معیاری تعلیم کے لیے عملی اقدامات کیے جائیں تو لوگ مہنگے اسکولوں کی طرف دیکھیں بھی نہیں۔ بہرحال تعلیم تو ضروری ہے۔ ہمارا ہیرو واقعی ہیرو تھا جنہوں نے مذہب سے بالاتر ہو کر پاکستان کی حفاظت کو اپنا مشن بنایا اور جان بھی قربان کردی۔ میر دن لیزلی کی سوچ بہت اعلیٰ تھی۔ ''شعبر خیال'' میں خیال آرائی کی صدارت منظر علی کو ملی بہت مبارک ہو۔ تجزیہ زبردست تھا اور خوشیوں کے لیے قربانی بھی دینی پڑتی ہے۔ مجید احمد جائی کی خیال آفرینی بھی اچھی تھی۔ سدرہ بانو نا گوری بھی وجود زن سے ہے کی حمایت میں بول پڑیں واقعی اس کے بغیر تو کائنات کے رنگ نامکمل ہیں اور منشی عزیز صاحب یہ خط تو ہوتے ہی ہمارے پڑھنے کے لیے پھر غیر اخلاقی حرکت کیسے؟ آفتاب احمد نصیر نے بھی اچھا لکھا ہے۔ رانا محمد شاہد، اللہ آپ کی پریشانی دور کرے۔ نثار احمد جاسوسی فیملی کا حصہ بنو تو انتظار بھی نہیں کرنا پڑے گا کیونکہ سرگزشت کے ختم ہوتے ہی جاسوسی مل جاتا ہے اور جب تک جاسوسی ختم ہوتا ہے تو سسپنس آجاتا اور پھر سرگزشت کا دیدار ہو جاتا ہے۔ یوں پتا ہی نہیں چلتا اور مہینا گزر جاتا ہے۔ باقی دوستوں میں نجمی رحمان، رانا حبیب الرحمٰن، ظہیر احمد تبسم، بشریٰ افضل، محمد احمد رضا، نعیم الحسن، فلک شیر، خالد محمود، سیف اللہ اور خرم علی راؤ نے بھی بہترین تبصرہ نگاری کی ہے۔ ستمبر کی شخصیات میں قائداعظم، مولانا مودودی، اشفاق احمد، نوابزادہ نصر اللہ اور بابا گرونانک کی زندگی کے بارے میں معلومات افزا تحریر زبردست تھی۔ پاکستان کی حسین وادی سے کیلاشی کہانی پہاڑی رنگ لیے بہترین تھی۔ فلم نگری سے ''مولا جٹ'' کا اشتہار دیکھ کر بے اختیار مسکراہٹ دوڑ گئی۔ مولا جٹ اور نوری نت کے کرداروں پر مشتمل یہ ایک لازوال فلم ہے۔ شکاریات میں آدم خور نے چونکا دیا۔ کہانی دلچسپ تھی۔ ''تاریخ عالم'' کا تیسرا حصہ بھی زبردست رہا۔ ایک ہی وقت میں دنیا کے مختلف خطوں میں کیا بود و باش رہی، پڑھ کے اچھا لگا۔ ارتقاء کا یہ سفر دلچسپی کا حامل ہے۔ سید علی احسن کی شاعری پر مشتمل تحریر احسن الکلام اثر انگیز تھی۔ ان کی علم دوستی نے ادبی دنیا میں نمایاں مقام حاصل کیا۔ ساہیوال کا ذکر خیر پڑھ کر بہت خوشی ہوئی، اکثر اپنے آبائی شہر بہاولنگر جاتے ہوئے یہیں سے گزر کے جاتے ہیں اور کھنڈرات کے شہر ہڑپہ کا حال بھی اپنی آنکھوں سے دیکھ چکے ہیں۔ یہ سلسلہ بہت اچھا ہے جو پاکستان کے گوشے گوشے کی سیر کروائی جاتی ہے اور بیش بہا معلومات بھی مل جاتی ہیں۔ (ہم ایسے مضامین دینا پسند کرتے ہیں بشرطیکہ آئے) ''سراب'' اپنے عجیب و غریب انداز سے آگے بڑھ رہی ہے۔ ''بیت بازی'' میں حنا غفار، محمد احمد رضا اور مجید احمد جائی کے اشعار ٹاپ پر تھے۔ بیت بازی کے دو پیج اور بڑھا دیں، پلیز۔''

☆ کے نجمی رحمٰن کا پُرخلوص تبصرہ برٹ لیٹ (یو ایس اے) سے۔ (گوکہ یہ تبصرہ بہت لیٹ ملا ہے پھر بھی شامل کر لیتے ہیں)
''اگست کا شمارہ حسبِ معمول 18 اگست کو ملا۔ کتاب گھر والوں کا کہنا ہے کہ پاکستان سے Late آتا ہے۔ آپ کا اداریہ پڑھا صرف افطاری پر جانا وقت اور عبادت تراویح میں خلل نہیں ڈالتا بلکہ اتنا کھانا کھایا نہیں جاتا جتنا پھینک دیتے ہیں۔ بہت دکھ ہوتا ہے ہم نے تو افطاریاں تقریباً بند کردی ہیں۔ سیماب اکبر آبادی کا مختصر احوال پڑھا۔ سچ تو یہ ہے ''نامی کوئی بغیر مشقت نہیں ہوا۔ سو بار جب عقیق کٹا تب نگیں ہوا۔'' کلائیو اپنے حصے کا کام کر گیا آگے سراج اس کے لیے تیار ہے۔ ڈاکٹر ساجد امجد کا اندازِ بیان بہت ہی دلنشیں ہے۔ آگے اگست والے اہم شخصیات آیا بھی دل خوش ہو گیا کہ ہم بھی کچھ اہم ہو سکتے تھے اگر واقعی کچھ کر دکھاتے، آخر اسٹار LEO ہے نا۔ لفظ پاکستان کا خالق کوئی بھی ہو اچھا خیال اللہ کی طرف سے ہے۔ اللہ میرے پاک وطن کو چلا رہا ہے۔ 11 اگست کو سوٹ اور ٹائی پہن کے بیان دیا جا رہا ہے کہ یہ نئی نسل کو مغربی تہذیب سے دور رہنے کے لیے تربیت دینے کی ضرورت ہے۔ اس کو یہی نہیں پتا کہ ٹائی حضرت عیسیٰ کی صلیب کی نشانی کے طور پر مغرب میں پہنتے ہیں۔ ہمارے قائداعظم نے پاکستان بنتے ہی اچکن ٹوپی کو پاکستان کا لباس قرار دیا تھا۔'' تاریخِ عالم'' دلچسپ جا رہا ہے بچ لباس کے، لباس کا مقصد بدن کو ڈھانپنا ہے۔ مسلم عورت کے لیے خاص قرآن الحکیم میں احکامات ہیں یہ جو ٹی وی پر انٹرویو لیتی ہیں ہر روز بیوٹی پارلر سے تیار ہو کر آتی ہیں دوپٹا کندھے کے ایک طرف دوسری طرف کھلے بال، فل میک اپ لگتا ہے اپنے میاں کے ساتھ خلوت میں بیٹھی ہیں۔ یہ پاک وطن کی نمایندہ ہیں ایک مسلم عورت کے روپ میں آئے تو زیادہ اچھی لگے۔ پُراسرار کتب حیرت انگیز ہے۔ خاص کر یہ تحریریں، تصویریں۔ شاید افریقا کی قدیم قوموں میں کوئی یہ پُراسرار تحریر جاننے والے ہوں۔ بڑے غلام علی خان واقعی اپنے فن میں یکتا تھے۔ زیڈ اے بخاری کو اگر کچھ دن کا اختیار ملا تھا تو انہیں خوشدلی سے یہ مسائل دیکھنے چاہیے تھے، موسیقی تو روح کی غذا ہے۔ برائی کچھ اور چیز ہے۔ طلعت محمود کی آواز بہت پُرسوز ہے اس کی گائی ہوئی غزلیں ہر زمانے میں زندہ رہیں گی۔''

☆ محمد عمران جونانی نے کراچی سے لکھا ہے۔ ''چھ سات ماہ کی غیر حاضری کے بعد ستمبر کے سرگزشت نے سرورق سے ہی دل موہ لیا۔ حالیہ احتساب اور جنرل راحیل کے اقدامات کے بعد حالات بدل رہے ہیں امید ہے ہر شعبہ کی طرح تعلیم پر بھی مثبت اثرات مرتب ہوں گے۔ یک سمتی سرگزشت نے لہو گرما دیا۔ کیسے کیسے جانباز اپنے لہو سے اس دھرتی کو سینچتے آئے ہیں تاکہ ہم سکون سے رہ سکیں۔ ڈاکٹر ساجد کی عمر میں برکت دے کہ آفاقی کے بعد سرگزشت کا مستقل سرمایہ ہیں۔ مولانا نارہردی کے حالات نے گرد و پیش سے بے خبر کر دیا۔ مشاہیر نے زندگی کی تمام تر مشکلات کے باوجود علم و ادب سے بے توجہی نہ برتی۔ نمونہ کلام کا انتخاب بھی شاندار تھا خاص کر وہ نظم دل کو لگی جس میں مولانا نے فرمائش پر حالات روز و شب نظم کے پیرائے میں باندھے۔ ابن کبیر کے خدمت گار پڑھنے کے لیے مضبوط دل کی ضرورت ہے۔ پل پل بڑھتی ہوئی محرومی، خوف اور اس کے بعد چند فرشتہ صفت لوگوں کا مسیحا کی صورت ابھرنا انسانیت کی معراج ہیں، ایسے لوگ جو مٹی کا قرض اتار

رہے ہیں۔ ان کی خدمات کو فراموش نہیں کیا جاسکتا۔ ویسے بنگلہ دیش میں بھی مسلم اکثریت ہے اگر کیمپوں کے باسی خود وہاں کے وفادار ہوکر حقوق مانگیں، ضد چھوڑیں تو قومی دھارے میں شامل ہوکر مصلحت کے ساتھ قوت مجتمع کرسکتے ہیں۔ لیکن جن کی وجہ سے وہ کیمپوں میں محصور ہوئے کیا ان کا کوئی فرض نہیں؟ اختر بلوچ نے مٹی نہیں گیتا قدرے اختصار کے ساتھ لکھی۔ اوپر والا اس لڑکی کو صبر سکون دے، اچھا راستہ نکالے پڑھ کر خوشی ہوئی کہ وہ محفوظ ہاتھوں میں ہے۔ کچھ عرصہ قبل میری ایدھی صاحب سے ملاقات ہوئی ان کی شخصیت کا اثر اور دفتر کا ماحول ہی کچھ اور ہے۔ صائمہ اقبال جو کہانی خوب صورتی سے بنتی ہیں مختصر شخصی خاکوں میں بھی کمال کررہی ہیں۔ تمبر کی تحریر کو شمارے کا عطر اور معلومات کا جہان قرار دیا جائے تو غلط نہ ہوگا۔ انسان عجب مخلوق ہے کبھی درندے کو گولی مار کر آدم خور بنتا ہے اور کبھی خود آدم خور بن کر ساتھیوں کو کھاتا ہے۔ انجم ساحلی اچھا ماحول بناتے ہیں لیکن اس ماہ کے شکاری صاحب کچھ سست اور ناتجربہ کار سے لگے۔ تاریخ عالم میں منظر امام نے دلچسپی برقرار رکھتے ہوئے معلومات پہنچانے کی روایت باقی رکھی۔ فطری طور پر تذکرہ زیادہ پسند آیا۔ ویدانیت کے بارے میں مزید کچھ لکھیں تو نوازش ہوگی۔ آغاز سے انجام تک کیلاش کہانی نے اپنے سحر میں جکڑے رکھا۔ میں بھی اسی پہاڑی ماحول میں سانس لیتے ہوئے صبح کی خوشبو محسوس کررہا تھا۔ ڈیل ڈن سلمیٰ اعوان۔ مولاجٹ اس جیسی دوسری کلاسک فلموں اور فنکاروں کا تذکرہ دلچسپی کا باعث ہے تاہم انور فرہاد اچھے قلم کار ہیں۔ علیم صاحب کے طرز تحریر کے تو جی ہم قائل ہوگئے۔ دلکش انداز ہے قاری کو ساتھ لے کر چل رہے ہیں۔ قمر علی عباسی کا رنگ جھلکتا ہے۔ کبھی الطاف شیخ کبھی آفاقی اور اب یہ صاحب۔ غرض یہ کہ سرگزشت میں میلہ لگا رہتا ہے۔ سراسر میری نالائقی ہے کہ ذرہ حیدرآبادی جیسے جید عالم ادب کا یہ پہلا شہ پارہ میری نظر سے گزرا (حالانکہ پہلے بھی ان کے مضامین چھپ چکے ہیں) شاعری کا شوق میرے دل میں بڑا پرانا ہے اور خاص کر ایسے مجموعہ پسند ہیں جن میں اس قسم کے کلاسک کو جمع کیا گیا ہے۔ یہ سلسلہ ادبی مضامین جاری رہے تو گرانقدر سرمایہ ہوگا۔''

☆بشریٰ افضل بہاولپور سے لکھتی ہیں۔'' 30 اگست کو سرگزشت ملا ٹائٹل پر دوصنف نازک بہت پریشان تھیں۔ یہ جنگل میں صنف مخالف چلے جارہے تھے۔ یادگار زبر عظیم ہستی براجمان یہ تمام نظارے دیکھتے رہے۔ انکل کی باتیں سنیں اور' ہمارا ہیرو' ہیرو کی عظمت کو سلام کیا۔ منظر علی خان کو' معبر خیال' میں کرسی صدارت پر براجمان پایا۔ حاجی بدرالدین کو خدا جنت الفردوس میں جگہ دے اور ان کے گھر والوں کو صبر عطا فرمائے آمین۔ رانا حبیب الرحمٰن کے تبصرے نے ہنسا ہنسا کر پیٹ میں بل ڈال دیے۔ بہت اچھا لکھا ہے۔ ہماری محفل کے ساتھیوں کی یہی خصوصیت ہے کہ روتوں کو ہنسا دیتے ہیں۔ ہمارا بھی کچھ ایسا ہی حال تھا تبصرہ پڑھ کر تازہ دم ہوگئے۔'' عجیب دستور'' بے چاری سعدیہ کے ساتھ واقعی زیادتی ہوئی اس کے بیرون ملک نہ جانے کے فیصلے کو سراہا جانا چاہیے۔ دراصل بہن بھائی بھی سعدیہ سے ہی گھر یا باہر کے سارے کام کرواتے۔ سعدیہ نے بالکل درست اور صحیح فیصلہ کیا۔'' ذمہ دار کون'' میں الف ف کو زیادہ میڈیا نے تباہ کیا تھا۔ ایک نیک انسان جس نے بیٹی کی خاطر اپنا گھر بار چھوڑا اور الف ف اکیلا رہ گیا تعلیم مکمل کرکے بھی اس کے شعور نے اسے نہ جھنجوڑا اگر کسی سے مشورہ کرلیتا تو کبھی ایسا قدم نہ اٹھاتا۔ میڈیا ہی اس کی تباہی کا ذمہ دار ہے۔'' ست رنگی دنیا' ارشد کا اگر انعام نکل آیا تھا تو اس کو نوکری نہیں چھوڑنی چاہیے تھی۔ اس نے بہت غلط کیا مجھے بہت افسوس ہوا اتنی بڑی رقم بغیر پلاننگ کے ضائع کردی جہاں سے چلا تھا وہیں پہنچ گیا۔ لوگوں کے لیے نصیحت کا پہلو نمایاں تھا۔ انکشافاتی پارے اچھے تھے۔''

☆سدرہ بانو ناگوری کا اظہاریہ کراچی سے۔'' اداریہ پڑھا، بھارت کے سرکاری اسکولوں کا ذکر خیر تھا بھارت ہمارا لاکھ دشمن سہی مگر اس کا یہ عمل قابل تعریف ہے۔ اسکول ہمارے ملک میں بھی ہیں۔ طلبہ بھی ہیں مگر تعلیم کا معیار بالکل بھی اچھا نہیں ہے۔ ایوان میں بیٹھے لوگوں کو اس سے کوئی غرض نہیں سوان سے کیا اُمید رکھنی۔ بڑے بڑے دعوے ضرور ہوتے ہیں مگر بات پھر وہیں پہ آجاتی ہے کہ دکھاتے رہتے ہیں سب روشنی کے خواب مگر چراغ بن کے اندھیروں میں جلنے والا کوئی نہیں۔' معبر خیال'' میں منظر علی خان پہلے نمبر پر نظر آئے خالد محمود کا تبصرہ شکایتوں سے بھرا پڑا تھا۔ تجمی رحمان صاحبہ نے بڑی دور سے یاد کیا، بہت شکریہ۔ جی عزیزہ کی طرح ہم بھی'' سلور جوبلی نمبر'' کے منتظر ہیں دیکھتے ہیں کہ انتظار کی گھڑیاں کب ختم ہوتی ہیں۔ ظہیر احمد تبسم اور رانا حبیب نے ایک ہی بات لکھی کہ سدرہ بانو، طاہرہ گلزار سے لڑرہی تھی تو بھائیوں پلیز تبصروں کو غور سے پڑھا کریں۔ میرا مقصد لڑائی نہیں تھا۔ طاہرہ آپا بڑی ہیں، ہم سب کے لیے محترم ہیں ہاں کبھی اگر بڑے غلط فہمی کا شکار ہوجائیں تو چھوٹے ان کی رہنمائی کردیا کرتے ہیں۔ اُمید ہے آپا مائنڈ نہیں کریں گی۔ ڈاکٹر صاحب نے احسن مارہروی کی شاعری سے سجا کر'' احسن الکلام'' کا زندگی نامہ لکھا۔ اور بہت خوب لکھا۔'' ابن کبیر'' کی خدمت گار بھی خوب رہی۔ بنگلہ دیش جیسا ملک جہاں سہولتوں کا فقدان ہو جہاں بھوک اور غربت نے ڈیرے ڈال رکھے ہوں وہاں ایک امریکی اور خاص طور پر ایک مسلمان کا جذبہ ہمدردی قابل ستائش ہے۔ وہاں کے غریب لوگوں کے لیے وہ ایک ایسے چراغ کی مانند ہے جس کی روشنی نے ان کے گھروں میں اجالا بکھیر دیا ہے۔ تمبر کی شخصیات میں صائمہ اقبال شاید فاطمہ ثریا بجیا کا ذکر کرنا بھول گئیں ہیں۔ ان کی تاریخ پیدائش بھی تمبر کی ہے۔ 85 بہاریں دیکھ چکی ہیں اور آج کل کافی بیمار بھی ہیں خدا ان کو جلد صحت یاب کرے، آمین۔ سفر امریکا کا دوسرا حصہ بھی شاندار رہا۔'' مٹی نہیں گیتا'' اس خبر کو اخبار میں پڑھ چکے ہیں مگر یہ انکشاف نیا ہے کہ بجرنگی بھائی جان اس لڑکی پر بنائی گئی ہے۔ یہ فلم تو دولت اور شہرت کے لیے بنائی گئی ہے کیا ایسا بجرنگی ہوگا جو بغیر دولت اور شہرت کے اس لڑکی کو اس کے اپنوں سے ملاسکے کیوں کہ یہاں تو اچھائیاں بھی صرف فلموں تک محدود ہوکر رہ گئی ہیں۔'' مولاجٹ'' کے پوسٹر ہم بھی ایک دو جگہوں پر دیکھ چکے ہیں لیکن انور فرہاد نے فلمی دنیا کی اس اہم شخصیت سے متعارف کردیا، اچھا لگا۔'' تاریخ عالم'' کے حوالے سے منظر امام کی معلومات زبردست رہیں۔'' ساہیوال'' کو خدا سلامت

رکھے۔ ''سراب'' کی سرایاں بھی جاری ہیں۔ ''عجیب دستور'' اچھی نہیں لگی۔ سعدیہ صاحبہ کے اپنے بہن بھائیوں اور ماں باپ کے شکووں کے علاوہ کچھ نظر نہیں آیا۔ The end بھی کچھ خاص نہیں ہوا وہ پہلے بھی تنہا تھی اور آخر میں بھی تنہا رہ گئی ہی گلی کے بنگلے بھی سنے۔ ''تلافی'' پڑھ کر آنکھیں نم ہوگئیں۔ نوشین کی حرکتوں نے اس کا ہنستا بستا گھر اجاڑ دیا اس کا جو انجام ہوا شاید ماں باپ کی عزتوں کو روندنے والی لڑکیوں کو مقدر میں یہی کچھ ملا کرتا ہے۔ آخری سچ بیانی میں مجرم نے ''اقرار جرم'' کرلیا مگر دولت اور پیسے کی ہوس میں ظفر بے چارہ مفت میں مارا گیا۔''

☆ محمد اشفاق، سرائے عالمگیر سے آئے ہیں۔ ''ستمبر 2015ء کا سرگزشت ملا۔ سب سے پہلے ''سراب'' کی قسط پڑھی۔ مجموعی طور پر کہانی شاندار ہے اور اگر 40,30 قسطیں اور بھی ہو جائیں تو تب بھی کوئی بات نہیں ہے۔ پھر ''معطر خیال'' میں داخل ہوئے۔ اگست کے شمارے میں کسی ایک وکیل کا خط شائع ہوا تھا جس کا خیال تھا کہ یہ خطوط ڈائجسٹ والے خود ہی گھڑ لیتے ہیں۔ محترم معراج رسول صاحب نے جن رسالوں کو اپنا خون دے کر پروان چڑھایا ہے ان کے بارے میں اس نے ایسا لکھا اور آپ نے شائع کردیا۔ کیا بات ہے۔ پھر اس نے ''سراب'' کے بارے میں بھی لکھا تھا۔ کہانی کو مختصر کرو یہ جملہ اس نے بھی لکھا تھا اور اس ماہ خرم علی راؤ جو پرانے قاری ہونے کے دعویدار ہیں اس نے بھی ایسا ہی لکھا۔ میرا دعویٰ ہے کہ یہ خرم علی راؤ بالکل پرانا قاری نہیں ہے۔ 1985ء سے تو میں بھی سارے پرچے پڑھ رہا ہوں۔ میں نے تو اس کا خط کبھی نہیں پڑھا۔ ''بازی گر'' اچھی تحریر ہے۔ لیکن دیوتا، موت کے سوداگر، شکاری اور تاوان جیسی کہانیاں کیا اس سے متاثر ہوکر لکھی گئی ہیں۔ آئندہ خرم علی راؤ کی ای میل نہ ہی شامل کریں تو اچھا ہوگا (ہم ہر قاری کی رائے کا احترام کرتے ہیں۔ کیوں کہ ہر ایک کی سوچ جدا ہوتی ہے) ۔ پھر سعدیہ کی سچ بیانی پڑھی۔ پچھلے ماہ فیصل کی کہانی پڑھی تھی جس کی ماں اور بہن بھائی نے اس کی زندگی تباہ کردی تھی۔ اس ماہ سعدیہ کی سچ بیانی پڑھی۔ میری اپنی سچ بیانی بھی بالکل ایسی ہی ہے۔ میرے بھی ماں باپ اور بہن بھائیوں نے مجھے بالکل اسی طرح تباہ کرنا چاہا تھا۔ کل سے میں سوچ رہا تھا کہ مجھے سعدیہ کی مدد کرنی چاہیے۔ میں اپنا موبائل نمبر لکھ دیتا کہ وہ مجھ سے رابطہ کرے لیکن ایک بات کا ڈر لگتا ہے کہ جب آپ کسی عورت کی مدد کرتے ہیں تو جب اس کے حالات ٹھیک ہوجاتے ہیں تو اس کو پھر اپنے بہن بھائی یاد آجاتے ہیں اور مدد کرنے والے کو وہ زہر دینے سے باز نہیں آتی۔ پھر بھی میں سوچوں گا۔''

☆ فلک شیر شاہ گوٹھ رحیم یار خان سے لکھتے ہیں۔ ''ماہ ستمبر کا سرگزشت پڑھ کر کچھ پرانی یادیں تازہ ہوگئیں۔ ''مولا جٹ'' پڑھتے پڑھتے یوں لگا جیسے سینما میں بیٹھ کر فلم دیکھ رہے ہیں۔ سلطان راہی کی موت کا زخم پھر سے ہرا ہوگیا۔ ظالموں نے ایسے ہیرو کو بھی موت کے گھاٹ اتار دیا جو ہر فلم میں حق اور سچ کا ساتھ دیتا تھا۔ ماشاء اللہ اس دفعہ کافی معلوماتی لٹریچر پڑھنے کو ملا۔ احسن الکلام، ستمبر کی شخصیات، تاریخ عالم، کیلاشی کہانی، سفر امریکا اور ساہیوال سب اچھے موضوع تھے۔ تحریروں میں ''عجب دستور'' اچھی تھی۔ بڑے بھائیوں کا بھی فرض بنتا ہے کہ چھوٹے بہن بھائیوں اور ماں باپ کا خیال رکھیں۔ ''دستہ دار کون'' ایک سبق آموز تحریر، جس نے نحش چینلز کو بے نقاب کیا۔ ''ست رنگی'' بھی سبق ہے کہ حصول منزل میں برکت ہے اور شارٹ کٹ راستے سے جو دولت کمائی جائے تو برکت نہیں رہتی اور نہ ہی کار خیر میں لگائی جاسکتی ہے۔ ''قسمت کا کھیل'' اچھی سچ بیانی تھی۔ اللہ کی رضا پر قائم رہنا ہی زندگی کی کامیابی کی دلیل ہے۔ ''روایتوں کے اسیر'' ہلکی پھلکی اچھی تحریر تھی۔ کاوش تو اچھی کی گئی تھی۔ بس گزارہ کرگئی۔ ''کاش'' بھی پسند آئی۔ کبھی کبھی ایسا ہوجاتا ہے۔ ''تلخی'' اور ''تلافی'' اچھے انداز میں لکھی گئیں۔ تلافی اور اقرار جرم دونوں سچ بیانیوں کا مرکزی خیال تو زبردست تھا مگر رائٹرز کچھ اناڑی اناڑی لگے۔ میری فیملی میں چاروں ڈائجسٹ بڑی مقبولیت کے حامل ہیں۔ پورا مہینا سکون سے پڑھتے پڑھتے گزر جاتا ہے۔ کمپوزنگ، پرنٹنگ کسی رسالے کی کامیابی کی ضمانت بھی جاتی ہے، جس کے لیے آپ کا ادارہ خراج تحسین کا مستحق ہے۔ آپ کو خصوصی مبارک باد پیش کرتا ہوں کہ میری سسٹر اور بیٹی نے ذیشان کی شادی کی تصویروں میں سے آپ کی تصویر کو سب سے بیسٹ قرار دیا، پاکیزہ میں میری بیوی نے تبصرہ بھی لکھا ہے۔ پھر انسان کی خوب صورتی کا راز اس کی خوب سیرتی میں ہے۔ دوپٹا عورت کی عزت ہے۔ ادارے کی سربراہ ہونے کی حیثیت سے آپ نے اسلامی روایت کو برقرار رکھا۔ معراج رسول صاحب اور ان کی فیملی کو ہم پہلے ہی عزت کی نگاہ سے دیکھتے آئے ہیں۔ اب اور بھی اضافہ ہوگیا ہے۔ یہ تعریف نہیں ہمارے دل کی آواز ہے جو آپ تک پہنچا رہے ہیں۔ مجھے کچھ کہانیاں وغیرہ لکھنے کا شوق ہے۔ ایک دفعہ آپ نے لکھا تھا کہ بس لکھتے رہیں اور بھیجتے رہیں۔ انشاء اللہ کوشش جاری رکھوں گا۔ جب تک ہے جاں جب تک ہے جہاں۔ وہ کیا ہے کہ بقول شاعر ایک عرض تمنا ہے سو ہم کرتے رہیں گے۔ کبھی تو بورڈ کو ہماری کوئی تحریر پسند آہی جائے گی۔ ''ہوا کے دوش پر'' کے بعد ''اندھی محبت'' بھیجی ہے۔ اسی امید کے ساتھ کہ شاید ہمارا نام بھی مصنفوں میں آجائے۔''

☆ منشی محمد عزیز مُنے نے لڈن وہاڑی سے لکھا ہے۔ ''ستمبر کا سرگزشت 29 اگست کو ہاتھ لگا۔ سرورق پر ایک حسینہ اداس اور گم سم سی نظر آرہی تھی۔ دوسری طرف ایک صاحب اپنے کتے کے ہمراہ چہل قدمی کرتے نظر آئے۔ اداریے تک پہنچے۔ آہ! غیر مسلموں نے ہماری ساری روایات اپنالی ہیں اور ہم اتنے بدنصیب اور بے حس ہوچکے ہیں کہ سب کچھ جاگتی آنکھوں سے دیکھنے کے باوجود بھی ان اچھی باتوں پر عمل پیرا ہونے کی ذرہ برابر کوشش نہیں کرتے۔ تعلیم آج کل ایک بزنس بن چکی ہے اور بس۔ یک کہی داستان میں ''ہمارا ہیرو'' کے اس ایک فقرے نے جھنجوڑ ڈالا کہ یہ ملک ہمارا بھی ہے ایک دن اس پر قربان ہوجاؤں گا۔ ''معطر خیال'' کی صدارت منظر علی خان کے نام تھی۔ مبارک باد۔ خرم علی راؤ

''سراب'' سے الرجک لگتے ہیں۔ شکریہ مجید احمد جائی کہ آپ نے یاد کیا۔ سالگرہ کی مبارک باد۔ اللہ آپ کے غم، خوشیوں میں بدل دے، آمین۔ خالد محمود کی کم از کم ایک تجویز صد فیصد قابل عمل ہے کہ ہمارے تاریخی ہیروز کے بارے میں نئی نسل کو آگاہ ہونا چاہیے۔ سدرہ بانو! آپ نے شاید ایسی ماں نہ دیکھی ہو جو کہ اپنے نفسانی تعلقات کی خاطر اپنے بچوں کا گلا دبا دیتی ہے لیکن ادھر ایسی ماں بھی موجود ہے۔ بس اللہ تعالیٰ معاف فرمائے۔ میرے خط نے پچھلے دو ماہ کی غیر حاضری کی ساری کسر نکال دی۔ بہت شکریہ آپ کا۔ آفتاب احمد نصیر اشرفی! آپ کی بیگم کی وفات پر تعزیت نامہ بھیجا تھا جو شائع نہ ہو سکا۔ اللہ تعالیٰ انہیں غریق رحمت کرے اور آپ کو صبر عطا فرمائے۔ دیار غیر سے نجمی رحمان صاحبہ کی آمد اچھی لگی۔ شاہد جہانگیر، اعجاز سنار، وحید ریاست بھٹی، احمد خان توحیدی، محمد سلیم قیصر، رضا محمد سجاد وغیرہ غیر حاضر تھے۔ مجید احمد جائی، سدرہ بانو ناگوری، آفتاب احمد نصیر اشرفی اور نجمی رحمان کے خطوط بھرپور تھے۔ ''احسن الکلام'' ڈاکٹر صاحب کا ایک اور شاہکار تھا لیکن صفحہ نمبر باون پر داغ کے مشہور شعر میں غالباً غلطی تھی۔ باون صفحہ پر شعر یوں ہے۔ اردو ہے جس کا نام، ہمی جانتے ہیں داغ ہندوستان میں دھوم ہماری زبان کی ہے اور 149 صفحہ پر پہلے مصرع میں سے لفظ ''کا'' غائب تھا (اکثر حضرات ہماری کو ہمارے پڑھتے ہیں۔ 149 پر کس مصرع میں لفظ کا غائب ہے۔ دوبارہ چیک کیا مگر نظر نہیں آیا؟) دیگر کہانیوں کے بارے میں مجھے سمجھ نہیں آرہی کہ کس کو ٹاپ پر رکھیں اور کس کو دوسرے نمبر پر رکھیں۔ بہر کیف محترم ابن کبیر کی خدمت گار اس ماہ کی بہترین تحریر تھی۔ سقوط ڈھاکا اور بہاریوں پر ڈھائے جانے والے مظالم کے متعلق زیادہ سے زیادہ لکھا کریں۔ شاید کسی بے حس کے دل پر کوئی مثبت اثر ڈال دے۔ کاش ہمارے حکمران، بے چارے ان بچے پاکستانیوں کے بارے میں بھی کوئی اقدام اٹھائے۔ انوار اللہ خان کا جذبہ قابل تعریف ہے۔ ''مٹی نہیں گیتا'' کی مختصر داستان نے بہت مغموم کر دیا۔ نام نہاد جمہوریت پسند بھارت کے منہ پر طمانچہ تھی یہ تحریر۔ ستمبر کی شخصیات اس بار محترمہ صائمہ اقبال کے قلم سے۔ بہت ہی مزے دار اور بھرپور مضمون تھا۔ ''آدم خور'' کے لیے انجم فاروق سے معذرت کہ پڑھی نہیں۔ ''تاریخ عالم'' کی سیر بڑے مزے سے کرتے ہیں اور داد دیتے ہیں جناب منظر امام کی تحقیق کو۔ قلم نگری میں اس مرتبہ مشہور زمانہ فلم مولا جٹ کا تفصیلی تذکرہ تھا۔ شاعر کی اور ہے میں محترم ذرہ حیدر آبادی نے بہت سے مشہور اشعار کے اصل شاعروں کے بارے میں بتایا۔ ساہیوال ہمارا ہمسایہ ضلع ہے۔ ایاز راہی نے مختصر سا بھرپور مضمون لکھا۔ خصوصاً ہڑپہ تہذیب کے بارے میں۔ حسب دستور سرورق کی پہلی کہانی بہت اداس کر گئی۔ بہت ہی دکھی کہانی ہے۔ سعدیہ کی اللہ انہیں کوئی مخلص ساتھی ملا دے۔ ''ذمہ دار کون'' میں الف ف مجھے تو نفسیاتی مریض لگ رہا تھا۔ ''ست رنگی'' دنیا میں راشد ایک کروڑ روپے کا انعام پا کر بھی تہی دست رہا۔ اسے بدنصیبی کے سوا کیا کہا جا سکتا ہے۔ ''قسمت کا کھیل'' بھی ایک سبق آموز کہانی ہے۔ جس کا انجام اداس کر گیا۔ گلناز کی بدنصیبی کے مجرم اس کے اپنے رشتے دار بھی تھے۔ ''تلافی'' میں توصیف نے اپنی خطا کی تلافی صحیح معنوں میں کر دی۔ اقرار جرم جیسا کہ نام سے ظاہر ہے جرم و سزا کے موضوع پر تھی۔ جس کے آخر تک اصل قاتل کا پتا نہیں چلا۔ احمد نواز بہت چالاک مجرم تھا لیکن بالآخر پکڑا ہی گیا۔''

☆ رضا احمد خان نے دریا خان بھکر سے لکھا ہے۔ ''ماہنامہ سرگزشت سے تعلق کافی پرانا ہے اور یہ میرے زیر مطالعہ رہتا ہے۔ قیصر خان صاحب نے یاد کیا تو نہ چاہتے ہوئے بھی مجھے حاضر ہونا پڑا۔ دراصل والدہ محترمہ فوت ہو گئیں تو مجھے کسی چیز کا ہوش نہ رہا اور پورا سال شدید صدمے میں رہا۔ والدہ سے محرومی کا دکھ کیا ہوتا ہے۔ یہ ان کو پتا ہوتا ہے جو اس سانحے سے گزر چکے ہوں۔ مجھے تو ایسا محسوس ہوا کہ میں چھاؤں میں بیٹھا تھا اور اچانک دھوپ میں آگیا۔ خونی رشتوں نے رویے بدلے اور بہن بھائی اپنے نہ رہے تو پہلی دفعہ سمجھ آئی کہ کوئی کسی کا نہیں۔ میں اب اپنوں کے ہوتے ہوئے بھی باہر کے کھانے کھانے پر مجبور ہوں۔ منگنی ہوئی تھی۔ اپنوں کی سازشوں کی وجہ سے ٹوٹی تو اتنا دل برداشتہ ہوا کہ دوبارہ گھر نہ بسانے کی قسم کھالی۔ اب کوئی میرا پرسانِ حال نہیں۔ کچھ لوگ بدنصیبیاں اپنے ساتھ لے کر پیدا ہوتے ہیں۔ میں بھی ان بدنصیب افراد میں شامل ہوں۔ میری والدہ کے لیے ضرور دعا کریں کہ اللہ انہیں جنت الفردوس میں جگہ دے اور مجھے سکون نصیب ہو۔''

☆ خرم علی راؤ کی تنقید۔ ''مقابلوں کے لیے کوپن بھیجنے لگا تو سوچا کہ ایک خط بھی تحریر کر دیا جائے۔ چند دریافت طلب امور یہ ہیں۔ ڈاکٹر ساجد امجد کے مضمون میں اردو والے شعر میں ہے کہ ''ہندوستاں میں دھوم ہماری زباں کی ہے'' جب کہ ذرہ صاحب کے تحقیقی مضمون میں جلی حروف میں ہے کہ ''ساری جہاں میں دھوم......'' میں نے بھی اسی طرح سنا اور پڑھا ہے جیسے کہ ذرہ صاحب والے مضمون میں ہے۔ درست آپ بتا دیں (صحیح ہندوستان میں دھوم ہے)۔ ''مٹی نہیں گیتا'' نامی مضمون دوسری سطر میں لکھا ہے۔ ''کھویا سے کھویا چھلتا'' ہم نے تو کھوے سے کھوا چھلنا پڑھا اور لکھا ہے (درست کھوئے سے کھوا چھلنا ہے)۔''

☆ مجید احمد جائی کی ملتان سے آمد۔ ''ہمارا ہیرو میرون لیز لی مڈلکوٹ ہے۔ ہماری تاریخ ایسے ہیروز سے بھری پڑی ہیں جنہوں نے اپنی بہادری جرأت سے پاکستان کا نام روشن کیا۔ 'معبرِ خیال' میں منظر علی خان صدارت کی کرسی پر براجمان تھے۔ خالد محمود شکوے شکایات کے انبار لگا رہے تھے۔ ارے بھائی ملتان کی سرزمین زرخیز ہے۔ مہمان نوازی، محبتوں میں یہ خطہ مشہور ہے اور آپ جلے کٹے بیٹھے ہیں۔ فلک شیر ملک وقت سے پہلے کوئی بھی نہیں جاتا۔ موت کا وقت مقرر ہوتا ہے۔ سدرہ بانو ناگوری، منشی محمد عزیز مئے، محمد احمد رضا انصاری، ظہیر احمد جسیم، آفتاب احمد نصیر، رانا محمد شاہد ہنشار احمد، نجمی رحمن کے تبصرے جاندار تھے۔ منشی محمد عزیز مئے، محمد احمد رضا انصاری، بشریٰ افضل، رانا حبیب الرحمن،

مجی رحمٰن آپ نے بندہ ناچیز کو یاد رکھا، بہت شکریہ۔ طاہرہ گلزار، ایم سلیم قیصر غیر حاضر تھے۔ حاجی بدرالدین صاحب کو اللہ تعالیٰ جوارِ رحمت میں اعلیٰ مقام عطا فرمائے۔ ''عجب دستور'' سرورق کی کہانی لمحہ لمحہ رلاتی رہی۔ آخری فقرہ بہت زبردست تھا۔ ''ذمہ دار کون'' عورت کے قرب کا متلاشی اپنے جرم کی سزا کاٹ رہا ہے۔ مجھے تو نفسیاتی مریض لگتا ہے۔ ''ست رنگی دنیا'' راشد کے ساتھ برا ہوا۔ کہتے ہیں دولت جو اپنے ہاتھ سے کمائی جائے وہی اچھی ہوتی ہے۔ ''روایتوں کے ستم'' شاہ زیب معذور تھا لیکن درندگی کی انتہا کو پہنچ گیا تھا۔ قدرت نے اس کا انجام ٹھیک ہی لکھا۔ کالی کوٹھڑی میں ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مر گیا۔ شاہ زیب جیسے درندے ہر گلی محلے میں دندناتے پھرتے ہیں۔ دولت، ان کو پناہ دے رہی ہے۔ ''گل'' کہانی کو جلد ختم کیا گیا ہے اگر تفصیلی پیش کیا جاتا تو چاشنی بڑھ جاتی۔ قسمت کا کھیل، تلافی، کاش، اقرارِ جرم زبردست رہیں۔ ''سراب'' پڑھی نہیں۔ ''ساہیوال'' کی سیر خوب رہی۔ اگر ہم ملتان کے حوالے سے تحریر بھیجیں تو شائع کریں گے؟ (ملتان پر قرۃ العین زینب کی بہت عمدہ تحریر چھپ چکی ہے ''مولتان سے ملتان تک'')۔ ''ستمبر کی شخصیات'' خوب رہی۔ ''مولا جٹ'' واقعی زبردست قلم تھی۔ نسیم فضل کے ساتھ برا ہوا۔ فلمسازوں، موسیقاروں کو ایسا نہیں کرنا چاہیے۔ ''شاعر کوئی اور ہے'' کمال تحریر تھی۔ ''تاریخ عالم'' منظر امام، آدم خور، منی نہیں گیتا، خدمت گار شاندار رہی۔ ''کیلاش کہانی'' نے اپنے سحر میں جکڑے رکھا۔ احسن الکلام داغ دہلوی کے شاگرد کا زندگی نامہ پڑھ کر مزہ آیا۔ ''حقیقی مسیحا'' آپ بیتی ای میل کر چکا ہوں۔ سند دیجیے گا اور ہاں قارئین کی دل چسپی کے لیے مقابلے کا کالم شروع کریں۔''

☆ ناصر حسین رند کا اظہاریہ بہاولپور سے۔ ''اس دفعہ پوری قوم نے یوم دفاع بھرپور اور جوش و خروش سے منایا کیوں کہ اس دفعہ جنگ ستمبر 1965ء سے 2015ء کا 50واں یعنی گولڈن جوبلی تھا۔ ڈیئر مجید احمد جائی، عید کارڈ والی روایت ختم ہونے پر ہم ٹھنڈی سانسیں لے کر رہ گئے۔ کاش یہ روایت ہمیشہ زندہ رہتی۔ سدرہ بانو ناگوری ڈیئر آپ نے بالکل بجا فرمایا۔ وجودِ زن سے ہے تصویرِ کائنات میں رنگ۔ بشریٰ افضل صاحبہ والدہ رانا محمد سجاد کی نہیں بلکہ رانا محمد شاہد کی رخصت ہوئی ہیں۔ اللہ تعالیٰ ہر کسی کی ماں کو اپنی حفظ و امان میں رکھے۔ اللہ تعالیٰ انہیں عمر خضر عطا فرمائے۔ رانا محمد شاہد ہم سرگزشت کے علاوہ بھی دیگر پرچوں میں آپ کی تحریر دیکھا کرتے ہیں۔ مجی رحمٰن، آف یو ایس اے یاد رکھنے کا شکریہ۔ قیصر خان خوش رہو۔ محمد سلیم قیصر اللہ تعالیٰ آپ کا اچھا وقت جلد شروع ہو، آمین۔ خالد کبیر ڈیئر سال میں ایک دفعہ آتے تھے۔ وہ بھی اب غائب ہو گئے ہو۔ سال میں ایک دفعہ تو حاضری لگوا لیا کرو پلیز۔ سہیل احمد عباسی پنوعاقل میں سیلاب آیا، اپنی خیریت سے آگاہ کرو۔ جاوید احمد سرکانی درانی کہاں گم ہو گئے ہو۔ ہمارے شہرِ خیال کے ساتھی محمد ایاز راہی ''ساہیوال'' نامی تحریر میں حاضر تھے لیکن تحریر ذرا مختصر سی تھی اگر آئندہ سے ہڑپہ تہذیب پر ایک جامع تحریر شائع ہو جائے تو مزہ آ جائے۔ مجی کہانیوں میں ''کاش'' پسند آئی۔ یہ عجیب غریب اور نفسیاتی قسم کی تحریر تھی۔ اس جیسی فلم بھول بھلیاں انڈیا کی فلم دیکھی تھی جو کافی سسپنس اور خوب فلم تھی۔ آپ نے سچ بیانیوں میں آخری کہانی عجیب و غریب پُراسرار قسم کی کہانیوں کا جو سلسلہ شروع کیا تھا اس کو جاری رکھیں۔''

☆ اصغر عباس کی میاں چنوں سے آمد۔ ''آپ کی طرف سے مضامین کا مشاہرہ وصول ہو گیا ہے۔ یہ رقم پا کر میں بہت خوش ہوں۔ سرگزشت چونکہ کئی سالوں تک زیرِ مطالعہ رہا۔ . . . . اس لیے اس کے تمام لکھاریوں سے بھی مانوسیت ہو گئی۔ کچھ دن پہلے کے ایک اخبار میں جناب علی سفیان آفاقی کے انتقال کا پڑھا دل اداس ہو گیا۔ سرگزشت کی ''فلمی الف لیلہ'' ذہن میں گھومنے لگی اور پرانی یادیں تازہ ہو گئیں۔ اللہ آفاقی صاحب کو جنت میں اعلیٰ مقام پر فائز کرے۔''

☆ انجم فاروق ساحلی کا لاہور سے مکتوب۔ ''آدم خور'' شائع کرنے کا بے حد شکریہ۔ جن احباب نے ''لباس'' کو سراہا ان کا بے حد مشکور ہوں۔ اس مرتبہ سرگزشت کا ٹائیٹل گہرے رنگوں میں رومانویت کے پُرکیف مناظر سے مزین کافی پُرکشش اور جاذبِ نظر تھا۔ اس ماہ سرگزشت کو ہاتھوں ہاتھ فروخت ہوتے دیکھا۔ مدیر سرگزشت محنت اور لگن سے جدت اور ندرت کا بڑا خیال رکھتے ہیں۔ احسن الکلام میں صفحہ نمبر 40 پر درج اشعار ضرب تھے۔ شاعر کوئی اور ہے۔ بہترین علمی و ادبی کاوش ہے۔ خدمت گار انسانی جذبات کی کشمکش کا اچھا احوال ہے۔ ''ستمبر کی شخصیات'' میں قائداعظم، سید مودودی، اشفاق احمد، نور جہاں، سجاد ظہیر، بابا گرونانک، حسین شہید سہروردی نے توجہ حاصل کی۔ ''تاریخ عالم'' منظر امام صاحب کی بڑی زرخیز تحریر ہے۔ اسے بڑی محنت اور لگن سے قلم بند کیا گیا ہے۔ معلومات کا ایک طویل سلسلہ ہے۔ صفحہ نمبر 104 پر تہذیب اور ثقافت کے مابین فرق کی گفتگو موجود ہے۔ اس سلسلے میں (Spengler) سپنگلر کے الفاظ بڑے واضح ہیں۔ ''فلسفۂ زندگی انسان کو ثقافت دیتا ہے اور کلچر جن محسوس و مرئی پیکروں میں جلوہ پیرا ہوتا ہے اسے تہذیب کہتے ہیں۔ (Decline of the West) باروپوچی کم و بیش اس خیال کا اظہار کرتا ہے۔ جب وہ لکھتا ہے کہ تہذیب لاطینی زبان کا لفظ ہے جس کے اندر اجتماعی زندگی کا تصور موجود ہے۔ اس لیے تہذیب سے مراد وہ طریق کار ہے جس کا مظاہرہ انسانی معاشرے میں ہو۔ اس کے برعکس کلچر اس طریق عمل کا نام ہے جس کا تعلق انسان کی ذات اور اس کی داخلی دنیا سے ہے۔ سفر امریکا کا دوسرا حصہ خوب ہے۔ آپ بیتیاں ابھی زیرِ مطالعہ ہیں۔''

تاخیر سے موصول خطوط: اصغر علی تابش، ندرت فاطمہ (لاہور)، انیس جیوانی (کراچی)، عنایت حسین امجد (پشاور)، فرقان چنگیزی (کوئٹہ)، فہیم الدین (کورنگی)، رام لعل للوائی (سکھر)، ناہید احمد ملک (سرگودھا)، فیصل بٹ (سیالکوٹ)۔

محسن الملک

ڈاکٹر ساجد امجد

انگریزوں کی غلامی نے مسلمانانِ ہند کی سوچ کو بھی پابند سلاسل کردیا تھا۔ وہ آج کو ہی سب کچھ سمجھنے لگے تھے، کل کی انہیں کوئی فکر نہ تھی۔ مسلمانوں کے مستقبل کی طرف بڑھتی سیاہی کو سرسید احمد خان نے محسوس کرلیا اور انہوں نے ''اقرا'' کے حکم کو برصغیر کے چپے چپے پر پھیلانے کا بیڑا اٹھایا۔ انہوں نے صاف لفظوں میں کہا، مسلمانوں کا سنہری مستقبل تبھی لوٹ سکتا ہے جب تعلیم عام ہو، اس لیے کہ زمانہ بدل چکا ہے۔ اب شمشیر و سنان نہیں قرطاس و قلم سے دنیا کو فتح کیا جاسکتا ہے۔ ان کی اس فکر کو عام کرنے میں ہر محاذ پر ساتھ دینے میں جس شخص نے اہم کردار ادا کیا، تن من دھن سے ساتھ دیا، اسی شخص کا زندگی نامہ۔ اس نے اپنا آج مسلمانانِ برصغیر کے کل کی خاطر قربان کردیا تھا۔

متحدہ ہند میں تعلیم حاصل کرنے والے ایک خاموش سپاہی کی داستان حیات

ابھی دن کی روشنی نے آنکھیں نہیں دکھائی تھیں۔ نومولود نے اندھیرا ٹٹولا اور چراغ پر آنکھیں رکھ دیں۔ قریب کھڑی عورتوں نے بچے کے بھرے بھرے جسم، چوڑی پیشانی، باریک ہونٹ اور نہایت کھلی رنگت کی طرف دیکھا۔ کسی نے چراغ اٹھا کر قریب کردیا۔ مبارک بادوں کے شور میں ہلکا ہلکا اجالا بیدار ہوکر آنگن میں ٹہلنے لگا۔ گھر میں چہل پہل ایسی تھی کہ میر ضامن علی وقت سے پہلے ہی بیدار ہو گئے۔ اس چہل پہل کی وجہ ان کے علم سے باہر نہیں تھی۔ ان کی بیوی کی حالت رات گئے بگڑ گئی تھی لیکن وہ اپنی عادت سے مجبور تھے۔ نیند پر قابو نہیں پاسکتے تھے۔ صحن پار کرکے آنے والی آوازیں صاف بتا رہی تھیں کہ سب خیریت ہے۔ وہ یہ دیکھنے کے لیے گھر سے باہر نکلے کہ جس ذی نفس نے ان کے گھر میں پہلی سانس لی ہے وہ لڑکی ہے یا لڑکا۔ انہیں دیکھتے ہی عورتیں اِدھر اُدھر ہوگئیں اور وہ سیدھے بیوی کے کمرے میں پہنچ گئے۔

''آپ تو ایسے سوئے کہ پھر خبر ہی نہیں لی۔''

''تمہیں تو میری نیند کا حال معلوم ہی ہے لیکن یہ بھی تو دیکھو میں وقت سے پہلے بیدار بھی تو ہوگیا۔''

''بہت احسان ہے آپ کا۔''

''اپنے بیٹے کو نہیں دیکھو گے؟ یہی دیکھنے تو آیا ہوں۔''

انہیں دیکھے بغیر ہی معلوم ہوگیا کہ بیٹا ہوا ہے اور جب دیکھا تو مزید خوشی ہوئی۔ ان کے خاندان میں جس طرح کے خوب صورت بچے پیدا ہوتے تھے یہ بھی ویسا ہی تھا۔

''آپ نے جو نام سوچا تھا وہی رکھیں گے یا اب کچھ اور سوچ لیا۔''

''سید مہدی علی سوچا تھا۔ میرے خیال میں یہی نام مناسب رہے گا۔''

''مولا نے برکت دی تو میرا بچہ بڑی ترقی کرے گا۔ خاندان کا نام اس سے روشن ہوگا۔'' ماں نے کہا اور دو قطرے آنسوؤں کے آنکھوں سے نکل کر رخساروں پر آگئے۔ یہ آنسو یقیناً خوشی کے تھے اور قبولیت کے بھی کہ یہی بچہ آگے چل کر ''محسن الملک'' کے لقب سے سرفراز ہوا۔

☆.......☆

ہندوستان پر جب مسلمانوں کی حکومت ہوئی تو اسلامی حکومت کے استحکام اور تمدن کی ترویج کے لیے نامی سرداروں اور جانباز سپاہیوں کو جاگیریں عطا ہوئیں اور وہ مع اپنے قبائل کے وہیں آباد ہو گئے اور اس طور سے ان قصبات کی بنیاد پڑی جو خاص طور پر تمام شمالی ہندوستان میں پھیلے ہوئے ہیں اور عرصہ دراز تک اسلامی شرافت اور اخوت کا ضامن سمجھے جاتے رہے۔ ان ہی قصبات میں سے ایک قصبہ ''اٹاوہ'' بھی تھا۔ یہاں ایک خاندان آباد تھا جو ''سادات بارہہ'' کی شاخ سمجھا جاتا تھا۔

ایک زمانہ تھا جب سادات بارہہ کا دور عروج تھا۔ سید عبداللہ خان اور سید حسین علی خان دونوں بھائی بادشاہ گر سمجھے جاتے تھے۔ حال یہ تھا کہ یہ دونوں بھائی جس کو چاہتے تخت پر بٹھا دیتے جس کو چاہتے اتار دیتے۔ مغل حکمرانوں کے پس پردہ یہی حکومت کر رہے تھے۔ پھر جب ان کا سورج غروب ہوا سید عبداللہ خان اور سید حسین علی خان قتل کر دیے گئے تو ان کے متعلقین ادھر ادھر پھیل گئے۔ کئی نسلیں گزر گئیں۔ ان نسلوں کو صرف یہ یاد رہ گیا کہ وہ کس خانوادے سے ہیں۔ ان کا شجرہ نسب کیا ہے۔ انہی میں وہ خاندان بھی تھا جس میں ابھی کل تازہ سید مہدی علی کا اضافہ ہوا تھا۔ یہ خاندان دنیوی جاہ و ثروت سے بے بہرہ اندوز تھا اور گم نامی کے ساتھ منازل ہستی طے کرنے میں مصروف تھا۔

سید مہدی علی کو باپ (میر ضامن علی) کی طرف سے تو جہالت ترکہ میں ملی تھی یعنی وہ پڑھے لکھے نہیں تھے لیکن اس کے نانا مولوی محمود علی ایک مشہور عالم تھے اور اسی دولت علم کی بدولت ملازمت سرکار انگریزی میں صدر الصدوری اور دربار ٹونک میں وزارت کی کرسی پر پہنچے اور شاید یہ ان ہی کا اثر تھا کہ سید مہدی علی کی تعلیم و تربیت پر ابتداء ہی سے توجہ دی گئی۔

1837ء کے جس سال میں مہدی علی کی ولادت ہوئی مغلوں کی کمزوری عروج پر تھی۔ دہلی کے لال قلعے پر مغلوں کا پرچم لہرا ضرور رہا تھا لیکن عمل داری انگریزوں کی تھی۔ بادشاہ تو محض وظیفہ خور تھا۔ انگریزوں کا۔ انگریزوں نے ابھی اتنا تکلف ضرور کیا تھا کہ سرکاری زبان فارسی رہنے دی تھی۔ انگریزی تعلیم کی ضرورت سے اس زمانے میں کسی کے کان بھی آشنا نہ تھے۔ البتہ فارسی تعلیم دنیوی اور عربی تعلیم دینی ترقی کا زینہ سمجھی جاتی تھی لہٰذا جب مہدی علی پڑھنے کی عمر کو پہنچا تو تحصیل فارسی و عربی میں مصروف ہو گیا۔

بہت سے بچے پڑھتے ہیں اور بہت سے خوب پڑھتے ہیں لیکن مہدی علی کی ذہانت تو قابلِ رشک تھی۔ حال یہ ہوا کہ چند برس نہیں گزرے تھے کہ اٹاوہ میں کوئی اسے پڑھانے والا نہیں رہا۔ وہ اٹاوہ میں موجود علما سے زیادہ عالم بن چکا تھا۔ اب اس کی تعلیم کے لیے کسی ایسے عالم کی ضرورت تھی جو اس سے زیادہ علم رکھتا ہو۔ بڑی مشکل سے ایک عالم مولوی عنایت حسین کا پتا لگایا گیا جو قصبہ پھپھوند میں رہتے تھے۔ سید مہدی علی کو ان کے سپرد کر دیا گیا۔ مولوی عنایت حسین کی تربیت سونے پر سہاگا ہو گئی۔ کہا جاتا ہے کہ اس نے مولوی سلامت اللہ کانپوری سے بھی تعلیم حاصل کی۔

ابتداء ہی سے اس کا ذہن تیز اور طبیعت شوخ تھی اس لیے ادب و شعر سے اس کو خاص مناسبت تھی اور زمانہ طالب علمی ہی میں اس کے حافظے میں برجستہ فارسی عربی اشعار کا ایک اچھا ذخیرہ جمع ہو گیا اور اولوالعزمی نے کتب بینی کی طرف مائل کیا۔ شوق تعلیم کا تقاضا تھا کہ ابھی یہ مشغلہ جاری رہے لیکن خانگی حالات کچھ اور تقاضا کر رہے تھے۔ گھر والوں کے مطابق یہی بہت تھا کہ اتنی تعلیم حاصل کر لی۔ بس اب کہیں نوکری کر لینی چاہیے۔ اسے بھی امید تھی کہ حصول تعلیم میں جتنی محنت کی ہے اساتذہ نے جن لفظوں میں حوصلہ افزائی کی ہے اس کے بعد تو اعلیٰ سے اعلیٰ عہدہ اس کا منتظر ہو گا۔ اس نے تگ و دو شروع کر دی۔ بہت جلد اسے معلوم ہو گیا کہ کسی اعلیٰ ملازمت کے لیے قوی ذرائع اور بااثر سفارش کی ضرورت ہوتی ہے محض قابلیت کوئی نہیں دیکھتا۔ جب اٹاوہ کی سڑکوں پر گھومتے ہوئے بہت دنوں کی دھوپ سر سے گزر چکی تو کلکٹر کے دفتر کا سائبان میسر آ گیا۔ معلوم ہوا یہاں محرر کی جگہ خالی ہے۔ تنخواہ محض دس روپے ماہانہ ہو گی۔ اسے اپنی قابلیت کے مقابلے میں یہ آمدنی کم معلوم ہوئی تھی لیکن آئندہ ترقی کی امید پر اس نے یہ ملازمت قبول کر لی۔

وہ دہلی اور میرٹھ سے دور اٹاوہ میں بیٹھا تھا۔ اسے معلوم ہی نہیں تھا کہ ہواؤں کا رخ کس طرف ہے۔ آندھی کیسا طوفان اٹھانے والی ہے۔ تبدیلی موسم کا کچھ احساس تھا تو ضرور مگر ایسا نہیں تھا۔

☆.......☆

سپاہ ہندوستان کو انگریزوں سے سنگین اور شدید اختلافات تھے۔ انہیں یقین تھا کہ انگریز انہی کے بل بوتے

پر حکومت کر رہے ہیں۔ پھر بھی انہیں خاطر میں نہیں لاتے۔ ان سپاہیوں کو اپنی ذلت تو گوارا تھی لیکن جب چربی والے کارتوس متعارف کرائے گئے تو انہیں یقین ہو گیا کہ انگریز انہیں بے دین بنانے کا فیصلہ کر چکے ہیں۔ ان کارتوسوں کو منہ سے چھیلنا پڑتا تھا اور ان کے متعلق یہ مشہور ہو گیا تھا کہ ان میں سور اور گائے کی چربی استعمال کی گئی ہے۔

میرٹھ کے فوجی افسروں نے حکم دیا کہ دیسی سپاہی چربی والے کارتوس استعمال کریں۔ پچاس سپاہیوں نے یہ کارتوس استعمال کرنے سے انکار کر دیا۔ ان کے خلاف فوجی قانون حرکت میں آ گیا۔ ان کا کورٹ مارشل ہوا۔ ان کی وردیاں اتار لی گئیں۔ پیروں میں بیڑیاں ڈال دی گئیں۔ یہ فوجی گڑگڑاتے رہے کہ انہیں اس طرح ذلیل و خوار نہ کیا جائے لیکن کوئی سننے والا نہیں تھا۔ انگریز فوجی افسر انہیں دیکھ دیکھ کر ہنس رہے تھے۔ انہیں اسی حالت میں جیل خانے لے جایا گیا۔ وہ بھی اس طرح کے بازاروں سے گزارا گیا۔ دیگر ہندوستانی سپاہی یہ منظر دیکھ رہے تھے۔ وہ بے بس تھے لیکن غصہ ان کے چہرے سے عیاں تھا۔ سرگوشیوں میں باتیں کر رہے تھے کہ خدمت کا یہ صلہ ہے تو کل ہمارے ساتھ بھی یہی ہو سکتا ہے۔

دوپہر نہیں گزری تھی کہ دیواروں پر اشتہار لگ گئے کہ انگریزوں سے لڑنے کے لیے لوگ تیار ہو جائیں۔

اگلے روز اتوار تھا۔ انگریز اپنے گرجا میں عبادت کی تیاریاں کر رہے تھے۔ شہر میں اور اردگرد کے دیہات میں شور و شر کی علامات ظاہر ہو رہی تھیں۔ شہری مسلح ہو رہے تھے۔ آفتاب غروب ہونے کو تھا۔ پہلی جنگ کا بگل بجنے کو تھا کہ ہندوستان رجمنٹ غصے سے بپھری ہوئی باہر نکلی۔ جو انگریز افسر سامنے آیا مارا گیا۔ افسروں کے بنگلوں کو آگ لگا دی۔ ان کے بیوی بچوں کو قتل کر دیا۔ وہ نعرے لگا رہے تھے کہ دہلی چلو چنانچہ وہ گئے اور اپنے پیچھے اپنے افسروں کے گھروں کو خاک اور انگریزوں کی لاشوں کے سوا کچھ نہ چھوڑا۔

دہلی میں حسب دستور کچہریاں ہو رہی تھیں کہ باغیوں کی آمد کی خبر مشہور ہوئی۔ جتنی دیر میں انتظامات ہوئے ایک بلوا شہر میں برپا ہو گیا۔ انگریزوں کو چن چن کر قتل کیا جا رہا تھا۔ چھاؤنی میں جتنی دیسی سپاہ تھی ایک نے بھی انگریزوں کی حمایت میں بندوق نہیں اٹھائی۔ قلعے کے عین نیچے کمشنر فریزر مارا گیا۔

جتنے بڑے انگریز افسران شہر میں تھے، قتل ہوئے یا فرار ہو گئے۔ سارے شہر پر باغیوں کا قبضہ تھا۔

اٹاوہ دور ضرور تھا لیکن ہندوستان کی زمین پر تھا۔ یہ خبریں یہاں پہنچیں تو زلزلہ آ گیا۔ دیکھتے ہی دیکھتے یہ زمین بھی انگریزوں کے قدموں سے خالی ہو گئی۔ سید مہدی علی کے قدیم سرپرست مسٹر ہیوم کلکٹر بھی غائب ہو گئے۔ دفتر بند ہو گیا۔ مہدی علی گھر بیٹھ گیا۔ ''لو جی، دس روپے ماہانہ کا آسرا تھا وہ بھی گیا۔ آئندہ کیا حالات ہوں کسے خبر۔''

انگریزوں پر یہ بڑا سخت وقت تھا۔ زمین تنگ آسمان دور تھا۔ بڑے بڑے وفادار دوست بھی دشمن جان ہو گئے تھے۔ سید مہدی علی کے خاندان نے باوجود یہ کہ نواب فرخ آباد کے نائب ہوئے بغاوت کی آگ اٹاوہ میں بھی منتقل کر دی مگر اپنی وہی چال برقرار رکھی اور جادۂ اطاعت سے انحراف نہ کیا۔

☆...☆

سرسید احمد خان اس وقت اپنی اجڑتی ہوئی دلی سے دور بجنور میں صدر امین کے فرائض انجام دے رہے تھے۔ بجنور ابھی تک بلوائیوں کی پہنچ سے دور تھا۔ غدر کی خبر سنتے ہی انہیں دہلی میں اپنے گھر کا خیال آیا۔ کیا خبر دہلی میں اس کی ماں پر کیا گزر رہی ہوگی۔ پھر اس خیال سے دل کو تقویت بھی مل گئی کہ باغیوں کا اگر خطرہ ہوگا تو انگریزوں کو ہوگا ہندوستانیوں کو نہیں۔ انگریزوں کا خیال آتے ہی انہیں ان انگریزوں کا خیال آیا جو بجنور میں مقیم تھے۔ اگر شوریدگی بڑھی تو ان کی جانیں محفوظ نہیں رہیں گی۔ اس خیال کے آتے ہی انہوں نے ہتھیار باندھے اور مجسٹریٹ کی کوٹھی پر پہنچ گئے۔ انگریزوں پر اس وقت کیا گزر رہی ہے۔ اس کا اندازہ اسے اس وقت ہوا جب وہ مجسٹریٹ کی کوٹھی پر پہنچا۔ بجنور میں اس وقت بیس یورپین، عورتوں اور بچوں سمیت تھے اور یہ سب مجسٹریٹ کی کوٹھی میں جمع ہو گئے تھے۔ مارے خوف کے سب کا برا حال تھا۔ سب سے بری حالت مجسٹریٹ کی بیوی کی تھی۔

''مسٹر احمد! ہماری جانوں کو سخت خطرہ ہے۔ بلوائی لوگ ہم کو نہیں چھوڑے گا۔ ہم کو ادھر سے نکالو۔''

''میم صاحب، جب تک آپ کا یہ دوست زندہ ہے آپ کو گھبرانے کی ضرورت نہیں۔''

''اوہ! تھینک یو مائی فرینڈ۔ مگر اب ہوگا کیا آپ ان بلوائیوں کو کیسے روکیں گے۔''

"یہ آپ کے سوچنے کی بات نہیں۔ میں مجسٹریٹ صاحب کے ساتھ مل کر سب انتظام کرلوں گا۔"

سر سید احمد خان نے بجنور کی حفاظت کے لیے حکومتی کوششوں کے علاوہ اپنے طور پر بھی انتظام کیا۔ ڈپٹی مجسٹریٹ اور تحصیل دار دونوں مسلمان تھے۔ سر سید نے حفاظتی دستوں کو دو حصوں میں تقسیم کیا۔ ڈپٹی مجسٹریٹ اپنے غول کو لے کر رات بھر گشت کرتے تھے اور خود تحصیل دار کے ساتھ مل کر جیل خانے اور خزانے کا گشت کرتے رہے۔

حالات پُرسکون تھے لیکن ایک روز اچانک سراسیمگی پھیل گئی۔ ایک کمپنی تلنگوں کی جو سہارن پور سے مراد آباد جا رہی تھی، بجنور پہنچی۔ خبر مشہور ہوگئی کہ اس کمپنی کی نیت ٹھیک نہیں بلکہ کچھ تلنگے مجسٹریٹ کی کوٹھی پر پہنچ بھی گئے ہیں۔ یہ خبر سنتے ہی سر سید مجسٹریٹ کی کوٹھی پر پہنچے۔ یہاں پہنچ کر معلوم ہوا خبر غلط ہے ان کی جان میں جان آئی لیکن ساتھ ہی یہ خیال بھی آیا کہ اگر کسی دن واقعی ایسا ہوگیا تو کیا ہوگا۔ بجنور سے زیادہ مجسٹریٹ کی کوٹھی کی حفاظت کرنی چاہیے۔ انہوں نے اسی وقت کوٹھی کے سامنے شامیانہ لگایا اور شہر کے سر بر آوردہ مسلمانوں کے ساتھ کرسیاں ڈال کر بیٹھ گیا۔

اِدھر اُدھر سے شورشوں کی خبریں آرہی تھیں۔ خبر آئی کہ آزادی کے متوالوں نے مراد آباد کے جیل خانہ کو توڑ دیا اور قیدی اِدھر اُدھر پھیل گئے ہیں۔ سیاسی قیدی تو حصول آزادی میں لگ گئے مگر جرائم پیشہ ڈاکے ڈالنے لگے۔ جس وقت یہ خبر آئی کہ سر سید اپنے ساتھیوں سمیت مجسٹریٹ کی کوٹھی پر تھے۔ تمام صاحبان نے اس اندیشے کا اظہار کیا کہ کہیں باغی یہاں کا خزانہ لوٹنے نہ آ پہنچیں۔ بالآخر یہ رائے قرار پائی کہ خزانے کو کنویں میں ڈال دیا جائے اور جب حالات پُرسکون ہوجائیں تو نکال لیا جائے۔

اس وقت اس پر عمل بھی ہوگیا۔

حالات اتنے بگڑتے جا رہے تھے کہ اب لگتا تھا بجنور کو بچانا مشکل ہو جائے گا لہٰذا فیصلہ یہ ہوا کہ عورتوں کو اور بچوں کو یہاں سے نکال کر رڑکی پہنچا دینا چاہیے۔

عورتوں اور بچوں کو ہاتھی پر سوار کرایا گیا اور سر سید اپنے ساتھ تحصیل دار کو لے کر نکلے اور کسی نہ کسی طرح میرٹھ تک پہنچ گئے لیکن اس حالت میں کہ پیروں میں چھالے پڑے ہوئے تھے۔ انہیں ہر جگہ انگریزوں کا مخبر سمجھا جا رہا تھا اس لیے بڑی مشکل سے جان بچا کر آئے تھے۔ حالت اتنی بری تھی کہ آتے ہی بیمار پڑ گئے اور ایسے کہ پانچ مہینے تک میرٹھ سے کہیں اور جانے کے لائق نہ رہے۔

ان پانچ مہینوں میں دنیا ہی بدل گئی۔ آزادی کے متوالے پسپا ہوتے ہوتے ناکام ہو گئے تھے۔ فتح شکست میں بدل گئی تھی۔ انگریز دوبارہ دہلی میں داخل ہو چکے تھے اور اب دوسرے علاقوں کی شوریدگی کو دبانے کے لیے لڑائی کر رہے تھے۔

فتح مند انگریز فوج شہر میں داخل ہوئی۔ جو شخص راہ میں ملا قتل کردیا گیا۔ معززین شہر اپنی آبرو بچا کے گھروں میں پڑے رہے۔

سر سید نے ایک وفادار ملازم کی حیثیت سے انگریزوں کی دوبارہ عمل داری کی خبر بڑی خوشی سے سنی لیکن یہ بھی سنا کہ جس وقت وہ اپنی جان خطرے میں ڈال کر انگریزوں کا دفاع کر رہے تھے۔ ان کی عورتوں کو بہ حفاظت بجنور سے نکال رہے تھے۔ دلی میں سرکاری فوج کے سپاہیوں نے ان کا گھر اور تمام اسباب لوٹ لیا۔

وہ دہلی پہنچے تو شہر کا پہچاننا مشکل تھا۔ چھتیں گر گئی تھیں، دیواریں بیٹھ گئی تھیں۔ وہ اس شہر خموشاں کو تکتے ہوئے اپنے گھر پہنچے۔ ان کی حویلی میں اب دیواروں کے سوا کچھ نہیں تھا۔ کسی نے انہیں بتایا کہ ان کی ماں ایک ملازمہ کے ساتھ آٹھ دن ہو گئے جلو خانے کی ایک کوٹھری میں بند ہیں۔ وہ دیوانہ وار کوٹھری کی طرف بھاگے اور دروازہ پیٹ ڈالا۔ اندر تین عورتیں تھیں۔ ان کی والدہ، خالہ اور ملازمہ۔

"بیٹا تو یہاں کیوں آگیا۔ ہم تو مر ہی رہے ہیں تو تو بچ جاتا۔"

"اماں بی! اب میں آگیا ہوں آپ لوگوں کو کچھ نہیں ہوگا۔"

"کیسے کچھ نہیں ہوگا۔ یہاں کوئی کسی کو نہیں جانتا۔ میں نے بھی بہت کہا تھا میں سید احمد کی ماں ہوں لیکن انہوں نے ایک نہ سنی سب کچھ لوٹ کر لے گئے۔ ملازم پہلے ہی بھاگ گئے تھے۔"

"اس وقت کی بات اور تھی۔ میں ابھی قلعے سے آرہا ہوں۔ انگریزوں سے بات کر کے آیا ہوں۔"

وہ گھر سے نکلے کہ کسی سواری کا بندوبست ہو تو والدہ اور خالہ کو میرٹھ لے جائیں۔ جہاں انسان پیدل چلتے ہوئے ڈرتے ہوں۔ وہاں سواری کہاں۔ وہ ایک مرتبہ پھر قلعہ گئے۔ آخر حکام نے اجازت دی کہ شکرم (بیل گاڑی) جو سرکاری ڈاک میرٹھ لے جا رہی ہے وہ اس شکرم میں اپنی

عورتوں کو لے جاسکتے ہیں۔
وہ شکرم لے کر گھر آئے۔ والدہ اور خالہ کو شکرم میں بٹھایا اور میرٹھ کی طرف چل دیا۔
میرٹھ میں ان کے دوست منشی الطاف حسین تھے۔ انہوں نے ایک مکان خالی کرا دیا جہاں انہوں نے دونوں خواتین کو اتارا۔
''آپ کے گھر والوں پر جو کچھ گزری اسے سن کر کلیجہ منہ کو آتا ہے۔'' منشی الطاف نے کہا۔
''مجھ پر تو کچھ بھی نہیں گزری۔ جو کچھ قوم پر گزری ہے مجھے تو اس پر رونا آتا ہے۔ کیسے کیسے نامی خاندان برباد ہوگئے۔''
کچھ دیر کی خاموشی کے بعد سرسید نے پھر زبان کھولی۔ ''سوال تو یہ ہے کہ اب کیا ہوگا۔ مسلمان قوم جس طرح بے اعتبار ہوئی ہے اس اعتبار کو بحال کرنے میں ایک زمانہ لگ جائے گا۔ انگریز اب مسلمانوں کی بھلائی کا کیوں سوچیں گے۔ انہیں ملازمتوں پر کیوں رکھیں گے۔ ان کی تعلیم کا کیا ہوگا۔ کون ہوگا جو انگریزوں کو مسلمانوں کی وفاداری کا یقین دلائے گا۔''
اس رات وہ سونے کے لیے لیٹے تو خیال کی بھی چادر اوڑھ لی۔ مجھے مسلمانوں کی طرف سے انگریزوں کی غلط فہمی دور کرنے کے لیے کام کرنا ہوگا۔ اپنی قوم کو جہالت سے دور کرنا ہوگا۔ انہیں آمادہ کرنا ہوگا کہ وہ جدید تعلیم حاصل کریں۔ انگریزوں کے ساتھ دشمنی کا نہیں مصالحت کا رشتہ رکھیں۔ انگریزوں کے ساتھ مل کر انگریزوں کی طرح ترقی کریں۔ مجھے اس کی ابتدا کرنی ہوگی۔ اس کے لیے میں ایک تحریک چلاؤں گا۔ اصلاحی تحریک، تبدیلی کی تحریک، ترقی کی تحریک۔

☆......☆

جنگ حصول آزادی کی آندھی جس تیزی سے چلی تھی اسی تیزی سے ختم بھی گئی۔ اسی ہنگامے نے انگریزی اقتدار کو جڑ سے اکھاڑ پھینکا تھا۔ سلطنت مغلیہ کے جھلملاتے چراغ کو دفعتاً ایسا روشن کر دیا تھا کہ لگتا تھا اکبر و اورنگ زیب کا زمانہ پھر لوٹ آئے گا لیکن خوش گمانیوں کے یہ چراغ چند ماہ بعد ہی بجھ گئے۔ ہر جگہ انگریزوں کا تسلط دوبارہ قائم ہوگیا اور اس شان سے کہ دہلی کا لال قلعہ مغلیہ پرچم سے محروم ہوگیا اس کی جگہ حکومت برطانیہ کا پرچم لہرانے لگا۔
حالات پرسکون ہوتے ہی دفاتر کا نظام بحال ہوا۔ جو انگریز افسران زندہ بچ گئے تھے انہوں نے اپنے اپنے عہدے سنبھال لیے۔ اٹاوہ کے کلکٹر مسٹر ہیوم بھی واپس آگئے۔ دفتر سنبھالتے ہی انہیں سید مہدی علی کی یاد آئی۔ فوراً ہرکارہ دوڑایا اور مہدی علی حاضر تھے۔ مسٹر ہیوم پہلے ہی تحقیق کر چکے تھے کہ اس نے یا اس کے خاندان نے بغاوت میں حصہ نہیں لیا ہے۔ انہوں نے خوش ہو کر اسے اپنا پیش کار بنا لیا اور صرف ڈیڑھ سال بعد ہی اسے سررشتہ داری پر ترقی دے دی گئی۔ یہ عہدہ اس وقت اہل عملے کی جان سمجھا جاتا تھا۔ لوگ اس عہدے کی آرزو لے کر لب گور پہنچ جاتے تھے اور وہ ابھی خیر سے جوان تھا۔
اس کی عادت تھی کہ کچہری کے اوقات کے بعد اور اکثر رات کو کچہری میں بیٹھ کر قانون یاد کیا کرتا تھا۔ ایک دن کلکٹر کا گزر رات کے وقت کچہری کے سامنے والی سڑک سے ہوا تو خلاف معمول کچہری میں روشنی دیکھ کر تعجب ہوا۔ کلکٹر اپنی سواری سے اترا اور جس کمرے سے روشنی آرہی تھی اس کے شیشوں سے اندر جھانکا۔ اسے پہچانتے میں ذرا دقت نہیں ہوئی۔ دیکھا کہ مہدی علی اندر بیٹھے کچھ پڑھ رہے ہیں۔ یہ تعجب اب بھی تھا کہ اس وقت کیا پڑھ رہے ہیں۔ دروازہ کھلوا کر اندر گئے۔ دیکھا کہ قانون یاد کر رہے ہیں۔
''مسٹر مہدی، یہ تو آپ کے کام کی چیز نہیں پھر کیوں یاد کر رہے ہو۔''
''ایک تو اس لیے کہ رعایا کا فرض ہے کہ حکومتی قوانین سے واقف ہو دوسرے یہ کہ کیا خبر کب میری ترقی ہو جائے اور مجھے ان قوانین کی ضرورت پڑ جائے۔ بارش کے آثار ہوں تو ضروری تیاری کرنی پڑتی ہے۔''
''مسٹر مہدی، میں نے ایسا دور اندیش ہندوستانی آپ سے پہلے نہیں دیکھا۔ میں اعلیٰ حکام سے آپ کی سفارش کروں گا۔''
''میں آپ کا شکر گزار رہوں گا۔''
کلکٹر ہیوم نے اس کے شانے تھپ تھپائے اور وہاں سے رخصت ہوگئے۔ مہدی کو بھی اب بہت دیر ہوگئی تھی۔ اس نے بھی روشنی گل کی اور کچہری سے گھر چلا آیا۔
کچھ دن نہیں گزرے تھے کہ اسے سررشتہ داری سے تحصیل داری پر ترقی دے دی گئی۔ اس نے خود کو اس کا اہل ثابت کیا۔ عہدے پر فائز ہوتے ہی اس نے اٹاوہ کی ترقی کے لیے کام شروع کر دیے۔ اس نے بہت سی جدید سڑکیں اور سرکاری عمارتیں تعمیر کرائیں۔ شفا خانہ، ہائی اسکول،

تحصیل، منصفی اور کوتوالی کی شاندار عمارتوں کے علاوہ اپنے محسن مسٹر ہیوم کے نام پر ہیوم گنج کی تعمیر بھی کرائی۔ اب اٹاوہ ایک قصبے سے زیادہ خوش نما شہر نظر آرہا تھا اور مہدی علی کی انتظامی صلاحیتوں کا منہ بولتا ثبوت تھا۔

دوسری طرف سرسید احمد خان بجنور سے ترقی پا کر صدر الصدور کے عہدے پر پہنچ گئے تھے ترقی پا کر مراد آباد آگئے۔ وہ برابر اس کوشش میں تھے کہ کسی طرح مسلمانوں کی طرف سے انگریزوں کا دل صاف کیا جائے لیکن کوئی صورت سمجھ میں نہ آتی تھی۔ وہ دل سے مانتے تھے کہ انگریزوں نے بغاوت کے سمجھنے میں غلطی کی ہے۔ ان کے نزدیک یہ ملکی بغاوت نہیں تھی بلکہ صرف سپاہیوں کی حکم عدولی تھی اور اس کے پیچھے بھی انگریز حکام کی بعض غلطیاں تھیں جو اتنی بڑھ گئیں کہ غصے میں ڈھل گئیں۔ بہت سوچ سمجھ کر انہوں نے قلم کو زبان کیا اور انگریزوں کی بدگمانیوں کے جواب لکھنے بیٹھ گئے۔ انہوں نے نہایت تفصیل سے انگریزوں کی بدگمانیوں کے جواب لکھے اور وہ تمام الزام جو لوگوں کے خیال میں گورنمنٹ پر عائد ہوتے تھے۔ نہایت دلیری کے ساتھ تحریر کے حوالے کیے۔ اس رسالے کا نام انہوں نے ''اسباب بغاوت ہند'' رکھا اور نہایت خاموشی سے پانچ سو جلدیں چھپوالیں۔ ان میں سے کچھ اپنے پاس رکھ کر باقی کا پارسل ولایت کو روانہ کردیا۔

یہ کتاب یا رسالہ گورنمنٹ آف انڈیا کو بھی بھیجا اور بعض انگریز حکام کے پاس بھی پہنچ گیا۔ مہدی علی نے یہ رسالہ اسباب بغاوت ہند مسٹر ہیوم کے پاس دیکھا اور ان سے پڑھنے کے لیے عاریتاً طلب کرلیا۔ وہ گھر پہنچے اور بستر پر لیٹ کر اس کی ورق گردانی میں مشغول ہوگئے۔ جیسے جیسے وہ آگے بڑھتے گئے ان کی آنکھیں کھلتی چلی گئیں۔ سرسید نے یہ مقدمہ ایسی دلیلوں سے لڑا تھا کہ وہ متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ سادہ مگر دلنشیں انداز ان کے لیے بالکل نیا تھا۔ اس وقت جیسی پُرتکلف زبان استعمال کی جارہی تھی یہ اسلوب اس سے بالکل مختلف تھا۔ رسالہ ختم ہوا تو وہ سرسید کے دالہ و شیدا ہوگئے۔ دل میں ایک تمنا پیدا ہوئی کہ کسی طرح اس شخص سے ملاقات کی جائے۔

انہوں نے یہ رسالہ مسٹر ہیوم کو واپس کیا تو اس کے مندرجات کا ذکر بھی نکل آیا۔ انہیں یہ دیکھ کر خوشی ہورہی تھی کہ مسٹر ہیوم سرسید کے دلائل سے متاثر نظر آرہے تھے۔ وہ مسلمانوں کی طرف سے ان کے دل میں نرم گوشہ پیدا ہوتے ہوئے دیکھ رہے تھے۔

وہ بہت چاہتے تھے کہ سرسید احمد خان سے ملیں اور ان کی کاوشوں کی ان کے سامنے تعریف کریں لیکن ان کی دفتری مصروفیات نے انہیں موقع فراہم نہیں کیا البتہ انہوں نے اتنا کیا کہ سرسید کی تقلید مال اور فوجداری کے متعلق اردو میں نہایت اعلیٰ درجے کے چند رسائل تالیف کیے۔

وہ سرسید سے مل تو نہیں سکے لیکن ان کی سرگرمیوں پر برابر نظر رکھتے رہے۔ سرسید کا تبادلہ اب مراد آباد سے غازی پور ہوگیا۔ قوم کی بھلائی اب بھی ان کے پیش نظر تھی لیکن مسلسل تجربات نے نوعیت بدل دی تھی۔ اب انہیں پختہ یقین ہوگیا تھا کہ جب تک مسلمان وہ جدید علوم جو انگریز اپنے ساتھ لائے تھے حاصل نہیں کریں گے اس وقت تک مسلمانوں کی بھلائی کی تمام تدبیریں فضول ہیں۔ مشکل یہ تھی کہ مسلمان انگریزی سے نابلد تھے اور انگریزوں سے نفرت اتنی تھی کہ ان کی زبان سیکھنے کے روادار نہ تھے۔ اب جدید علوم کی اشاعت صرف ایک ہی صورت میں ممکن تھی کہ علمی کتابیں دیسی زبان میں ترجمہ کی جائیں۔ جب علم کی رغبت بڑھے گی تو لوگ خود بخود انگریزی سیکھنے کی طرف مائل ہوں گے اور انگریزوں سے ربط و اتحاد بھی پیدا ہوگا۔ اس مقصد کو پیش نظر رکھتے ہوئے انہوں نے ایک سائنٹیفک سوسائٹی قائم کی۔ ڈیوک آف آرگائل جو اس وقت وزیر ہند تھے۔ انہوں نے سوسائٹی کا پیٹرن بننا منظور کیا۔ ان کے علاوہ اور کئی انگریز حکام پیٹرن قرار پائے۔ بہت سے رئیس ہندو اور مسلمان اس کے ممبر بنے اور ترجمے کا آغاز ہوگیا۔

اس سوسائٹی کی شہرت مہدی علی تک بھی پہنچی۔ انہیں اور بہت سے لوگوں کی طرح اپنی زبان سے عشق تھا۔ ان کی تربیت فارسی اور عربی کے ماحول میں ہوئی تھی۔ انہوں نے گمان کیا کہ اسی طرح سرسید قوم کو انگریزی کی طرف لے جارہے ہیں۔ ان کے بارے میں بہت سی باتیں پہلے ہی سے مشہور تھیں مثلاً یہ کہ وہ انگریزوں کے مخبر ہیں یا یہ کہ وہ انگریزوں کے ساتھ کھانے کو جائز سمجھتے ہیں۔ ان کے دیگر عقائد کے بارے میں بھی طرح طرح کی باتیں مشہور ہورہی تھیں۔

سرسید ابھی ترجمے کے مسائل سے نمٹ ہی رہے تھے کہ ان کا تبادلہ علی گڑھ ہوگیا۔ سائنٹیفک سوسائٹی کا کام ان کے بغیر چلنا ممکن نہ تھا اس لیے سوسائٹی کا تمام سامان اور اسٹاف بھی وہ علی گڑھ لے آئے۔

انہی دنوں مہدی علی کا علی گڑھ جانا ہوا۔ وہ سرسید سے بھی ملے۔ دل میں غبار تو تھا ہی اس ملاقات میں انہوں نے مسلمانوں کی ترقی تعلیم کے بارے میں سرسید کے خیالات معلوم کیے اور ان کے ارادوں پر دھواں دھار بحث کی۔ سرسید کے بعض مذہبی عقائد بھی زیرِ بحث آئے۔

سرسید میں مخالف کو قائل کرنے کی زبردست قوت تھی۔ یہاں بھی یہی ہوا۔ وہ مہدی علی کے ہر سوال کا جواب مدلل انداز میں دیتے رہے۔

مہدی علی کی تشفی تو ہو گئی لیکن یہ خیال دل میں پھر بھی تھا کہ اس ارادے میں سرسید کو ہرگز کامیابی نہیں ہو سکے گی لیکن جب اس سوسائٹی کے تحت چند کتابیں ترجمہ کرا کے شائع کی گئیں تو مہدی علی جیسے علم دوست کی آنکھیں کھل گئیں۔ انہوں نے ایسے شاندار خیالات کسی اور کتاب میں نہیں پڑھے تھے۔ انہیں اپنی جہالت کا شدت سے احساس ہوا۔ انہیں پہلی مرتبہ احساس ہوا کہ سرسید جو کچھ کر رہے ہیں بہت مناسب ہے۔ اس میں قوم کی بھلائی اور ترقی پوشیدہ ہے۔ ایک اکیلا آدمی کچھ نہیں کر سکتا۔ اس کا ہاتھ بٹانا چاہیے یہ خیال آتے ہی انہوں نے اپنی رائے سے رجوع کیا۔ سرسید کی رائے صحیح اور میرے خیالات غلط ہیں۔ جہاں تک ہو سکے گا میں سرسید کی مدد کروں گا۔ وہ ایک مرتبہ پھر سرسید سے ملے اور نتیجے میں سائنٹیفک سوسائٹی کا ممبر منتخب کر لیے گئے۔

مہدی علی نے سرسید کے مشن پر کام شروع کر دیا۔

☆.....☆

سائنٹیفک سوسائٹی کا سالانہ جلسہ تھا۔ سوسائٹی کے تمام ارکان علی گڑھ میں جمع تھے۔ نواب مصطفیٰ خان شیفتہ اور مولانا حالی بھی آئے ہوئے تھے۔ سید احمد سے ان کی شناسائی نہیں تھی لیکن ان کے خیالات سے وہ متاثر ضرور ہونے لگے تھے۔ مہدی علی اب ترقی کرتے کرتے مرزا پور کے ڈپٹی کلکٹر بندوبست ہو گئے تھے۔ وہ ان اجلاسوں میں شرکت کرنے خاص طور پر علی گڑھ آئے ہوئے تھے۔

سوسائٹی کا آخری اجلاس ختم ہو چکا تھا۔ بہت سے لوگ سرسید کی کوٹھی پر جمع تھے۔ خوش گپیوں کا ماحول تھا کہ اچانک سرسید نے ماحول کو سنجیدہ بنا دیا۔ ”آپ حضرات کو معلوم ہے سر ولیم میور کی کتاب ”لائف آف محمد“ چار جلدوں میں چھپ کر ہندوستان پہنچ چکی ہے۔“

”جی ہاں سنا تو ہم نے بھی ہے۔“

”افسوس کہ اسلام پر حملے ہو رہے ہیں اور مسلمانوں نے صرف سنا ہے۔“

”انگریزی داں، ہندوستان میں ہیں ہی کتنے جو اس کتاب کا اثر لیں گے۔“ کسی نے کہا۔

”آپ نے ٹھیک کہا لیکن ذرا یہ تو سوچیے اس کتاب کو پڑھنے کے بعد انگریزوں کے دلوں میں اسلام کی کیا وقعت رہ جائے گی۔“

اس بات کا کسی کے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔ ہر شخص ایک دوسرے کا منہ تک رہا تھا۔

”آپ لوگ گواہ رہیے گا۔“ سرسید کی بھاری بھرکم آواز گونجی۔ ”میں اس کتاب کا جواب لکھنے کا ارادہ کر چکا ہوں۔“

لوگ سمجھ رہے تھے کہ بات آئی گئی ہو گئی لیکن سرسید تو جس بات کا ارادہ کر لیتے تھے اسے پورا کر کے چھوڑتے تھے۔ انہوں نے اس دن کے بعد سے تیاریاں شروع کر دیں۔ ایک انگریزی خواں نوجوان کو ملازم رکھا جو اس کتاب کے ضروری حصے پڑھ کر سناتا تھا۔ ایک مولوی صاحب کو اس کام پر لگایا کہ وہ دورِ جاہلیت کے عربی شعرا کے کلام سے ایسے اشعار کا انتخاب کریں جن میں قبل از اسلام کی فرسودہ رسموں کا ذکر کیا گیا ہے۔

جواب لکھنے کے لیے حوالے کی کتب کی ضرورت پڑی تو اسے معلوم ہوا جنگِ آزادی میں وہ تمام نجی کتب خانے ضائع ہو چکے ہیں جہاں سے یہ کتابیں مل سکتی تھیں۔ اب ایک ہی راستہ تھا کہ ولایت کا سفر اختیار کیا جائے اور وہاں بیٹھ کر ولیم میور کی کتاب کا جواب لکھا جائے لیکن یہ ارادہ کتب کی تلاش سے بھی زیادہ دشوار تھا۔ ان کے پاس اتنا سرمایہ نہیں تھا کہ اس سفر کے مصارف برداشت کرتے یہ سفر اتنا آسان نہیں تھا کہ وہ اس کی دقتوں کو برداشت کرتے۔

وہ اپنی بے بسی پر ہاتھ ملتے رہے لیکن جلد ہی قدرت نے اس کا انتظام کر دیا۔ گورنمنٹ نے چند دوسرے طلبہ کے علاوہ ان کے بیٹے سید محمود کو تعلیم کی غرض سے یورپ بھیجنے کے لیے اسکالرشپ جاری کیا۔ گورنمنٹ کی اس امداد نے سرسید کے ارادوں کو نئی زندگی بخش دی۔ انہوں نے بھی طے کر لیا کہ وہ بیٹے کے ساتھ ولایت جائیں گے۔ سفر کے اخراجات کے لیے انہوں نے اپنا کتب خانہ بیچا، کوٹھی گروی رکھا کچھ قرض لیا اور رخصت کے لیے حکومت کو درخواست

دے دی۔ یہ بتانا مناسب نہ تھا کہ وہ کس مقصد کے لیے انگلستان جانا چاہتے ہیں لہٰذا انہوں نے درخواست میں لکھا۔

''گورنمنٹ انگریزی کے مطالب کو استحکام بخشنے کے واسطے اس کے سوا کسی امر کی ضرورت نہیں ہے کہ اہلِ یورپ اور ہندوستان کے درمیان ربط ضبط کو ترقی دی جائے۔ بس اس مقصد کی تکمیل کے واسطے ہندوستانیوں کو میری رائے میں یورپ کے سفر کی ترغیب دینی چاہیے تاکہ وہ مغربی ملکوں کی شائستگی کے عجیب وغریب نتیجوں اور اس کی ترقی کو بہ چشمِ خود مشاہدہ کرلیں۔ اسی خواہش پر میں یہ بات چاہتا ہوں کہ خود انگلستان جاکر اپنے ہم وطنوں کے لیے ایک نظیر قائم کروں۔''

انہوں نے اس دورے کی اصل غایت سے کسی کو آشنا نہ کیا۔ ان کے دوست بھی یہی سمجھ رہے تھے کہ ان کا یہ دورہ مطالعاتی دورہ ہے۔ صرف ایک سید مہدی علی تھے جنہیں انہوں نے اپنا راز دار بنایا۔

''میں صرف تمہیں اصل بات بتا رہا ہوں کہ میں انگلستان سر ولیم میور کی کتاب کا جواب لکھنے کے لیے جارہا ہوں۔ کسی کو اس کی ہوا نہیں لگنی چاہیے ورنہ اوّل تو حکومت مجھے جانے نہیں دے گی اور اگر چلا بھی گیا تو وہاں کے کتب خانے مجھ پر بند کردیے جائیں گے۔ تم اس راز کو کسی پر ظاہر نہ کرنا۔ وہاں پہنچ کر مجھے جو ضرورت ہوگی میں تمہیں لکھوں گا۔ یہ ضرورت مالی بھی ہوسکتی ہے اور علمی بھی۔ میں کسی اور پر بھروسا نہیں کرسکتا۔''

''آپ نے مجھ پر بھروسا کیا ہے تو میں اس پر پورا اتروں گا۔''

دونوں دوستوں نے ایک دوسرے کو خدا کے سپرد کیا۔ سرسید احمد خان ممبئی پہنچے ان کے دونوں بیٹے بھی ان کے ساتھ تھے۔ چند روز ممبئی کی سیر میں گزارے اور پھر بحری جہاز میں سوار ہوگئے۔

لندن پہنچتے ہی انہوں نے کام شروع کردیا۔ سب سے پہلے حوالے کی کتب کی فراہمی کا مرحلہ تھا۔ انڈیا آفس کا کتب خانہ چھان مارا۔ برٹش میوزیم کی لائبریری سے بہت سی اطلاعات حاصل کیں۔ عربی کتابیں جو مصر، فرانس اور جرمنی سے شائع ہوئی تھیں، وہ منگوائیں کچھ کتابیں لندن کے بازاروں سے خریدیں۔ ایک آدمی ملازم رکھا جو انہیں لاطینی کتابوں کے ضروری حصے پڑھ کر سناتا تھا اور وہ نوٹس لیتے جاتے۔

وہ اس بات کی مکمل احتیاط رکھے ہوئے تھے کہ جب تک کتاب چھپ کر تیار نہ ہوجائے۔ ہندوستان میں اس تصنیف کی شہرت نہ ہونے پائے۔ وہ صرف مہدی علی کو رازدار بناکر آئے تھے لہٰذا کتاب کے سلسلے میں پیش آنے والی ہر مشکل کے بارے میں انہی کو لکھتے تھے۔

''میں شب و روز تحریر کتاب سیر مصطفوی صلعم میں مصروف ہوں۔ سب کام چھوڑ دیا ہے۔ کمر درد کرنے لگتی ہے۔ اِدھر فکر ترتیب مضامین کتاب، اُدھر فکر جواب اعتراضات۔ کسی شخص کے مددگار نہ ہونے کی صورت میں یہ کام اور بھی مشکل ہوگیا ہے۔''

''روپیا ہر روز صرف ہوتا جاتا ہے۔ کتبے کھدوائے ہیں، نقشہ جات جو استدلات کتاب میں داخل ہوں گے بنوائے ہیں اس شخص کا بل آنے والا ہے جو انگریزی عبارت لکھتا ہے۔''

مہدی علی اس دوران تفاسیر واحادیث اور اکابر علما کی تصنیفات سے ایسا مواد برابر بھیجتے رہے جو ''خطبات احمدیہ'' کی تالیف میں سرسید کے کام آسکتا تھا۔

جیسے جیسے کتاب آگے بڑھتی گئی اخراجات کے جو اندازے انہوں نے لگائے تھے سب غلط ہوتے گئے۔ اندازے سے زیادہ خرچ ہونے کی توقع تھی۔ انہیں فکر ہونے لگی کہ لکھنا اور چھپوانا شروع کردیا تو روپیا کہاں سے آئے گا۔

انہوں نے اب تک مہدی علی کو علمی کاموں کے لیے خطوط لکھے تھے کہ فلاں کتاب کا فلاں قصہ نقل کر کے بھجوادو لیکن اب مالی مدد کی ضرورت تھی۔ انہوں نے چندے کے لیے خط لکھا۔

''میری یہ رائے ہے کہ سو سو روپے احباب سے چندہ لیا جائے۔ تیس آدمی جمع ہونے چاہئیں تین ہزار سے کم خرچ نہیں ہوگا۔''

مہدی علی نے فوراً لبیک کہا۔ کچھ رقم اپنے پاس سے فراہم کی کچھ احباب سے جمع کی۔ کہیں سے کورا جواب ملا۔ بہر حال جو رقم جمع ہوئی وہ انہوں نے انگلستان روانہ کردی۔

وہ اس طرح رقم کا بندوبست کرتے پھر رہے تھے جیسے وہ اپنے کسی مشن میں مصروف ہو۔

احباب سے جو رقم جمع ہوئی وہ اونٹ کے منہ میں زیرے کی طرح تھی۔

انہوں نے گھبرا کر پھر خط لکھا۔

"میری درخواست ہے کہ کسی مہاجن سے میرے لیے ہزار روپے قرض لیجیے۔ سود اور روپیا میں ادا کروں گا۔ میں نے دلی بھی خط لکھا ہے کہ میری کتابیں اور میرا اسباب یہاں تک کہ ظروف حسن تک فروخت کر کے ہزار روپے بھیج دو اگر ہزار روپے مہاجن سے ہزار دلی سے آئے اور پانچ چھ سو روپے چندے میں آ گئے تو کتاب بخوبی چھپ جائے گی۔"

جب کتاب مکمل ہو گئی اور وہ دیباچہ بھی لکھ چکے تو اندازہ چھاپے کی لاگت کا کیا، اس کے ہوش جاتے رہے۔ چار ہزار کا خرچ آ رہا تھا جب کہ مہدی علی نے جو رقم بھیجی وہ سولہ سو تھی۔ اس نے یہ سوچے بغیر کہ ادا کہاں سے کرے گا لندن کی ایک بینک سے تین ہزار کا قرض لے لیا اور مہدی علی کو خط لکھ دیا۔

"اگر تمام روپیا خرچ ہو جائے اور میں فقیر بھیک مانگنے کے لائق ہو جاؤں تو بلا سے۔ قیامت میں یہ تو کہہ کر پکارا جاوے گا کہ یہ فقیر مسکین جو اپنے دادا محمد صلعم کے نام پر فقیر ہو کر مرا۔

"خطبات احمدیہ" چھپ کر بازار میں آ گئی تھی اور کتب فروشوں کی دکانوں پر رکھی ہوئی تھیں۔ اس مصروفیت سے نمٹنے کے بعد انہوں نے یہاں کی تعلیمی حالت کا مشاہدہ کرنا شروع کیا۔ کیمبرج کو خود جا کر دیکھا۔ تعلیم نسواں پر غور کیا اور تعلیم کے مختلف طریقوں میں سے جو طریقہ ہندوستان کے مسلمانوں کی حالت کے مناسب سمجھا اس کو نگاہ میں رکھا۔ انہوں نے غور کیا تو اس نتیجے پر پہنچے کہ یورپ کی تمام ترقی یہاں کی تعلیمی ترقی کی وجہ سے ہے۔ ہندوستان کے مسلمان اس وقت تک ترقی نہیں کر سکتے جب تک ان کی تعلیمی ترقی نہیں ہو جاتی اور جب تک انگریزی تعلیم وہ حاصل نہیں کر لیتے۔ اس نے نہ صرف طے کر لیا کہ وہ ہندوستان جا کر تعلیمی جدوجہد میں مصروف ہو جائیں گے بلکہ مہدی علی کو لکھ بھی دیا۔

"اگر مسلمانوں کی تربیت کے لیے جداگانہ مدرسہ قائم ہو جائے تو ایک زحمت ہمارے لیے ہے۔ کوئی رات نہیں جاتی کہ ایسے مدرسے کے تقرر کی باتیں اور تجویزیں یہاں نہیں ہوتیں مگر بغیر دس لاکھ روپے نقد ہوئے ممکن نہیں ہے۔"

اس علمی و تعلیمی سیر کے دوران میں ایک کتب خانے میں انہیں ٹیٹلر اور اسپیکٹر نام کے دو رسالے ملے۔ ان پرچوں کے بارے میں کہا جاتا تھا کہ ان کی تحریروں سے انگریزوں کے اخلاق و عادات، رسم و رواج اور قومی خیالات میں انقلاب برپا ہو گیا۔ انہوں نے یہ بھی منصوبہ بنا لیا کہ وہ ایسا ہی ایک رسالہ خاص مسلمانوں کے فائدے کے لیے نکالیں گے۔ ان کا یہ ارادہ اتنا پختہ تھا کہ اس کا نام بھی تہذیب الاخلاق تجویز کر لیا۔

ان خیالات اور منصوبوں کو ساتھ لے کر وہ ہندوستان واپس آ گئے۔ ممبئی پہنچے اور پھر بنارس پہنچ کر اپنے عہدے کا چارج لے لیا۔ وہ اتنی جلدی میں تھے کہ بنارس پہنچنے کے دو مہینے بعد ہی انہوں نے تہذیب الاخلاق پہلا پرچہ شائع کر دیا۔

سید احمد کے نزدیک جو باتیں مسلمانوں کی دنیاوی ترقی کی مانع تھیں اور زیادہ تر مذہبی خیالات پر مبنی تھیں اس لیے ان پرچوں میں ان مذہبی عقائد پر مضامین لکھے جانے لگے جن کی موجودگی کی وجہ سے سید احمد کے بقول مسلمان ترقی نہیں کر سکتے تھے۔

اس پرچے میں سرسید کے علاوہ مولوی چراغ علی اور سید مہدی علی بڑے سرگرم مضمون نگار تھے۔ سرسید کے مضامین زیادہ تر اخلاقی اور تمدنی ہوتے تھے جب کہ مولوی چراغ علی اور مہدی علی کے مضامین مذہبی ہوا کرتے تھے۔ مہدی علی جو کچھ لکھتے اس میں ایسی لطافت ہوتی کہ لوگ پڑھتے تھے اور سر دھنتے تھے۔ سرسید پر جو لوگ نکتہ چینی کرتے تھے ان کے جواب وہ ایسی ظرافت اور فصاحت سے دیتے تھے کہ سرسید کے حریف دنگ رہ جاتے تھے اور ان سے جواب نہیں بن پڑتا تھا۔ تیسرے پرچے کے بعد ہی مخالفتوں کا وہ شور اٹھا کہ کان پڑی آواز سنائی نہ دیتی تھی لیکن سید مہدی علی مخالفتوں سے گھبرائے بغیر مضامین لکھتے رہے اور اس بے باکی سے کہ خود سرسید بھی تعریف کیے بغیر نہ رہ سکے۔

"مولوی مہدی علی خان کا علم اس کی ذاتی خوبیاں اس کی پیاری پیاری باتیں اس کی سچی ایمانداری اس کی فصیح تقریر اس قابل ہیں کہ اگر ہماری قوم کے دل کی آنکھیں اندھی نہ ہوتیں تو اس کے نام پر فخر کیا کرتے۔"

مخالفتوں کی آندھی ابھی چل ہی رہی تھی کہ سرسید نے ہوا کے ایک جھونکے کا مزید اضافہ کر دیا۔ وہ ان دنوں بنارس میں تھے وہیں ایک کمیٹی "خواستگاران ترقی تعلیم مسلمانان" قائم کی۔ اس کمیٹی کا کام یہ تھا۔ "جہاں تک ہو سکے یہ کمیٹی

اس بات کے دریافت کرنے میں کوشش کرے کہ سرکاری کالجوں اور اسکولوں میں مسلمان طالب علم کس لیے کم پڑھتے ہیں۔ علوم قدیمہ اور علوم جدیدہ کیوں نہیں رواج پاتے اور جب یہ تمام موانع ٹھیک ٹھیک دریافت ہو جائیں تو ان کے رفع کرنے کی تدابیر کرے۔

کمیٹی کا پہلا اجلاس بنارس میں منعقد ہوا۔ سید مہدی علی اس جلسے میں شرکت کے لیے بنارس گئے۔ انہوں نے اپنے تجربے کی روشنی میں کئی تجاویز کمیٹی کے سپرد کیں۔ ان تجاویز کی روشنی میں کمیٹی نے ایک اشتہار جاری کیا جس میں تمام مسلمانوں سے درخواست کی بلکہ دعوت دی کہ وہ اس مسئلے پر مضامین لکھیں۔ بہترین مضامین پر تین انعام پانچ سو، تین سو اور ڈیڑھ سو روپے دیے جائیں گے۔

مقررہ تاریخ تک اس اشتہار کے جواب میں 32 مضامین موصول ہوئے۔ ان میں ایک مضمون مہدی علی کا بھی تھا۔ جو اصحاب مضامین کی جانچ پڑتال کے لیے مقرر کیے گئے تھے انہوں نے مہدی علی کے مضمون کو پہلے انعام کا مستحق قرار دیا لیکن مہدی علی کی خواہش سے اسے انعام کی فہرست سے خارج رکھا گیا۔

ان رسالوں کے موصول ہونے کے بعد ان خیالات کا جائزہ لیا گیا جو ان مضامین میں بیان ہوئے تھے اور یہ طے کیا گیا کہ ایک کالج قائم کیا جائے۔

اس کمیٹی کا جلسہ ہونے والا تھا جس میں کمیٹی کو اپنی رپورٹ پیش کرنی تھی۔ مہدی علی بھی آئے ہوئے تھے۔ صبح جلسہ ہونے والا تھا۔ سرسید نے ان کا پلنگ اپنے کمرے میں بچھوایا تھا۔ رات گیارہ بجے تک مسلمانوں کی تعلیم کے بارے میں باتیں ہوتی رہیں پھر مہدی علی کی آنکھ لگ گئی۔ رات کے کوئی دو بجے ہوں گے کہ سسکیوں کی آواز سے ان کی آنکھ کھل گئی۔ کوئی رو رہا تھا۔ انہوں نے سرسید کے پلنگ کی طرف دیکھا۔ پلنگ خالی تھا۔ وہ گھبرا کر کمرے سے باہر نکلے۔ دیکھا کہ سرسید ٹہلتے جا رہے ہیں اور روتے جا رہے ہیں۔ مہدی علی بھی یہی سمجھے کہ خدانخواستہ شاید کوئی افسوس ناک خبر آئی ہے؟

یہ سن کر وہ اور زیادہ رونے لگے۔ ''اس سے زیادہ افسوس ناک خبر اور کیا ہو گی کہ مسلمان روز بہ روز بگڑتے جا رہے ہیں اور مستقبل قریب میں ان کی بھلائی کی کوئی صورت نظر نہیں آ رہی ہے۔''

''خدا سب ٹھیک کر دے گا۔ کل جلسہ ہو تو رہا ہے۔''

مہدی علی نے ڈھارس بندھائی۔

''مجھے امید نہیں کہ کوئی نتیجہ نکلے گا۔''

ساری رات اسی ادھیڑ بن میں گزر گئی کہ کل کے جلسے کا انجام کیا ہو گا۔

دوسرے دن سید احمد نے اپنی رپورٹ کمیٹی کے سامنے پیش کی۔ ''اس کے سوا کوئی چارہ نہیں کہ مسلمان اپنی تعلیم کی فکر خود کریں۔'' اسی رپورٹ میں انہوں نے مجوزہ کالج کی اسکیم اور طریقہ تعلیم بھی بیان کیا۔

اس کمیٹی نے چندہ جمع کرنا شروع کر دیا۔ اس کے ایک رکن مہدی علی بھی تھے۔ انہوں نے مرزا پور میں جہاں وہ ڈپٹی کلکٹر تھے ایک جلسۂ عام منعقد کیا۔ اس میں نہایت زبردست تقریر کی۔ اس وقت جب کہ سرسید کو کافر، ملحد، نیچری اور جانے کیا کچھ کہا جا رہا تھا ان کے حق میں تقریر کرنا کوئی معمولی بات نہیں تھی۔ انگریزی تعلیم کے فروغ کے لیے چندے کی اپیل کرنا بھی بڑی ہمت کی بات تھی۔ انہوں نے نہ صرف تقریر کی بلکہ ایسی زوردار تقریر کی کہ اسی جلسے میں ایک معقول رقم مہیا ہو گئی۔

گورنمنٹ نے بھی سرسید کی اس کوشش کو سراہا اور وعدہ کیا کہ اگر کمیٹی کی کوششوں سے مجوزہ کالج قائم ہو گیا تو حکومت اس مدرسے کی پوری مدد کرے گی۔

انگریز حکومت نے خطیر رقومات چندے میں دیں تو سید احمد کی ڈھارس بندھی۔

مہدی علی مرزا پور میں ڈپٹی کلکٹری کے دن کاٹ رہے تھے کہ حیدر آباد دکن کے وزیراعظم سر سالار جنگ کو اپنی ریاست کے مالی معاملات سنوارنے کے لیے کسی قابل اور ایماندار شخص کی ضرورت پیش آئی۔ ریاست میں کوئی ایسا فرد نظر نہ آتا تھا۔ انہوں نے سرسید سے مشورہ کیا۔ عرصے تک خط کتابت چلتی رہی بالآخر سرسید نے مہدی علی کا نام پیش کیا اور بہت کچھ تعریف کرنے کے بعد پُرزور سفارش کی جسے سر سالار جنگ نے منظور کر لیا۔

مہدی علی مرزا پور میں تھے کہ سرسید نے انہیں خوش خبری سنائی۔ ریاستوں کی ملازمت اور وہ بھی دکن جیسی امیر کبیر ریاست کی ملازمت اور پھر قدر دانی سے بلایا جا رہا تھا۔ انہوں نے فوراً رضامندی ظاہر کر دی لیکن وہ حکومت کے ملازم تھے۔ ریاستوں کا کچھ بھروسا نہیں کب نکال دیا جائے۔ اس نے تجویز پیش کی کہ اسے ڈیپوٹیشن پر بلا لیا جائے یعنی وہ ملازم تو انگریز کار ہے لیکن اس کی خدمات سر سالار

جنگ مستعار لے لیں۔ سالار جنگ نے اس تجویز کو پسند نہیں کیا اور سرسید کو لکھ دیا۔

''ایک شخص دو آقاؤں کا ملازم نہیں ہو سکتا اگر مولوی مہدی علی کو ہماری گورنمنٹ پر اعتماد ہے تو مستعفی ہو کر آئیں۔''

اب اس کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا کہ اگر وہ حیدر آباد جانا چاہتا ہے تو ڈپٹی کلکٹری سے استعفیٰ دے کر جائے۔ انہوں نے استعفیٰ دے دیا اور حیدر آباد چلے آئے۔ حیدر آباد میں وہ ''مجوزہ کارروائی'' کے عہدے پر فائز ہوا۔ یہ ایک جدید عہدہ تھا جو خاص اس کے لیے وضع کیا گیا تھا۔

انہوں نے اس خوبی سے کام سنبھالا کہ مقتدر حلقوں میں اپنے لیے مقام پیدا کر لیا اور صرف دو سال کے عرصے میں ان کو ''معتمد مال گزاری'' بنا دیا گیا۔

اس وقت حیدر آباد کے باشندوں میں ان کے معیار کا کوئی تعلیم یافتہ شخص ایسا نہیں تھا جسے وہ اپنی مدد کے لیے اپنے ساتھ ملا سکتے۔ وصول مال گزاری کے لیے انہیں بہت سے لوگوں کی ضرورت تھی جو ان کی نیابت میں پوری ریاست میں پھیل جائیں اور اراضی کی پیمائش وغیرہ کر کے ایسا نظام وضع کریں کہ رعایا کو بھی شکایت نہ ہو اور آمدنی پوری طرح خزانے میں منتقل ہو کر ریاست کی ترقی کا باعث بنے۔

سالار جنگ تحصیل مال گزاری کی مد میں بہت سی اصلاحات کر چکے تھے لیکن ان اصلاحات کے بعد بھی کوئی قابل انتظام نہ تھا۔ وصولی کرنے والوں اور زراعت پیشہ رعایا کے درمیان ہمیشہ کش مکش رہتی تھی۔ مہدی علی نے جب خوب اچھی طرح جائزہ لیا تو اس نتیجے پر پہنچے کہ یہ کام اکیلے فرد کا نہیں۔ اس کے لیے بہت سے قابل مددگاروں کی ضرورت ہے۔ یہ وہ افراد ہوں جو مقامی نہ ہوں کیوں کہ جو افسران وصولی کے درمیان خورد برد کرتے ہیں وہ مقامی انتظامیہ سے مل جاتے ہیں۔ سب ایک دوسرے کی مدد کر رہے ہیں جس کی وجہ سے سرکاری خزانے کو بھاری نقصان اٹھانا پڑ رہا ہے۔ انہوں نے سالار جنگ کی منظوری کے بعد مختلف مقامات سے بہت سے قابل انتخاب کو اپنے گرد جمع کر لیا۔ ان میں مولوی نذیر احمد بھی شامل تھے۔

ان افراد کی تقرری نے ایک بھونچال کھڑا کر دیا۔ ریاست کے اعلیٰ حلقوں نے اسے اپنی حق تلفی سمجھا کہ ہمیں نوازنے کی بجائے باہر سے لوگ بلائے جا رہے تھے۔ شدید تعصب اور فرقہ بندی نے نہایت خطرناک صورت حال پیدا کر دی۔ جن عہدیداروں کو منتخب کیا گیا تھا ان کے خلاف بعض بااثر افراد بلکہ جماعتوں کی طرف سے رعایا میں تعصب پیدا کیا جا رہا تھا۔ ان کے کاموں پر بے جا نکتہ چینی ہونے لگی۔ مہدی علی تو گویا اس خرابی کی جڑ تھے۔ ان کے خلاف بے انتہا تعصب برتا جا رہا تھا۔ وہ افسردہ تھے کہ قوم کس حال کو پہنچ گئی ہے، جو ان کی فلاح و بہبود کے لیے کام کرتا ہے لوگ اسی کے خلاف ہو جاتے ہیں۔

یہ آندھی اتنی شدید تھی کہ سالار جنگ کے قدم بھی لڑکھڑانے لگے۔ ان کے دل میں بھی خیال پیدا ہونے لگا کہ مہدی علی کامیاب نہیں ہو سکیں گے۔

ریاست میں خوشامدیوں اور سازشیوں کی کمی نہیں تھی جو مہدی دشمنی میں ایک جگہ جمع ہو گئے تھے لیکن مہدی علی یہاں سے بھاگنے کی بجائے ایک جگہ ڈٹے ہوئے تھے۔ سرسید کی مثال ان کے سامنے تھی۔ پورا ہندوستان ان کا مخالف تھا لیکن وہ ڈٹے ہوئے تھے۔ جان لیوا مشکلات سامنے آئیں لیکن انہوں نے ہمت نہ ہاری۔ وہ بھی اس لشکر کا سپاہی تھے۔ یہ ہار کیسے مانتے، انہوں نے سالار جنگ کو بھی حوصلہ دلایا اور کئی ملاقاتوں کے بعد انہیں اطمینان کرا دیا کہ اگر استقلال سے کام ہوگا تو کامیابی یقینی ہے۔

آہستہ آہستہ وہ ان مشکلات پر غالب آ گئے۔

ان کی ان کاوشوں کی تعریف حیدر آباد کے ریزیڈنٹ نے بھی کی۔

''میں کامل ترین اعتماد رکھتا ہوں کہ آپ ہز ہائی نس نظام کی گورنمنٹ اور ان کے ملک کی رعایا کی اعلیٰ درجے کی جاں نثارانہ خدمات انجام دیں گے۔ ہندوستان سے جو افسر یہاں آئے ہیں ان کو جو دقتیں پیش آئی ہیں ان کا آپ نے اپنی دماغی قوت اور اصابت رائے سے استیصال کر دیا ہے لیکن اس میں شک نہیں کہ جب یہاں کی رعایا یہ سمجھ لے گی کہ ان کو ملک و رعایا کی بہبودی پیش نظر ہے اور یہ ایمانداری سے بے لاگ کام کرتے ہیں تو ان کی جاں فشانی کو قدر کی نگاہوں سے بھی دیکھے گی۔''

انگریزی عمل داری میں قاعدہ یہ تھا کہ انگریزوں کا ایک نمائندہ ہر ریاست میں ہوتا تھا جسے ریزیڈنٹ کہتے تھے۔ یہ ریاست کے کاموں کی نگرانی کرتا تھا اور رپورٹ حکومت کو بھیجتا تھا لہٰذا اسے ریاست میں خاص اہمیت حاصل ہوتی تھی۔

مہدی علی نے اس خوبی سے کام سرانجام دیے کہ حکومتِ انگلشیہ اس کی خدمات کی تعریف کیے بغیر نہ رہ سکی۔ اس کی بدولت نظام حیدرآباد کی بھی مقبولیت ہوئی اور خود مہدی علی کی کارکردگی کو بھی سراہا جانے لگا۔

وائسرائے لارڈ ڈفرن نے ریزیڈنٹ حیدرآباد کو لکھا۔

''گورنر جنرل، اجلاس کونسل نے اس یادداشت کو دلچسپی سے ملاحظہ کیا اور مجھے اس خواہش کے ظاہر کردینے کا ارشاد ہوا ہے کہ گورنر جنرل اس ترقی کی قدردانی کا اظہار کرتے ہیں جو ریونیو سروے میں حکومت نظام نے کی ہے اور جس سے مولوی سید مہدی علی کی کارگزاری پر بہت کچھ روشنی پڑتی ہے۔''

حیدرآباد کے ایک سابق ریزیڈنٹ اور موجودہ لیفٹیننٹ گورنر بنگال نے مہدی علی کے نام خط لکھا۔

''اس میں کوئی شک نہیں کہ آپ نے نہایت مفید کام شروع کیا اور اس کو نہایت کامیابی سے چلایا۔ بلاشبہ ایک کامیاب حکومت کے لیے یہ سنگِ بنیاد ہے اور آپ کو یہ سن کر اطمینان ہوگا کہ اس لحاظ سے حیدرآباد صوبہ بنگال کے ان اضلاع سے جن میں دوامی بندوبست ہے بہتر ہے اور ہندوستان کے نہایت ترقی یافتہ اضلاع سے بہت زیادہ پیچھے نہیں ہے۔''

مہدی علی نے تھوڑے ہی عرصے میں اپنی محنت اور قابلیت سے مخالفین کی زبانیں بند کردیں۔ چمکتے ہوئے سورج سے انکار کون کرسکتا ہے۔ یہی حال اس کے کام کا تھا۔ اس نے آمدنی کو مستقل اور جائز محصولات قائم کرکے محفوظ کیا اور دوسری طرف رعایا کو حقوق دلوائے اور لگان و مال گزاری کی ایک معتدل شرح معین کی۔ لگان کی شرح اتنی منصفانہ رکھی کہ شکایت کے سب دروازے بند ہوگئے۔ مال گزاری کا ننانوے فیصد حصہ وقت پر وصول ہونے لگا۔

اس نے یہ اصلاحات مال گزاری تک محدود نہیں رکھیں بلکہ اسے تمام دفاتر تک پھیلا دیا۔ اس نے مولوی نذیر احمد کو دورہ کرکے معائنہ دفاتر کا حکم دیا۔ انہوں نے دفاتر کا دورہ کیا اور دفاتر کی حالت سے متعلق رپورٹیں پیش کیں۔

''کسی علاقے کا دفتر مرتب نہیں۔ دفتر بڑے نہیں لیکن ابتری اس قدر ہے کہ بیان نہیں ہوسکتی۔ ہر محکمہ میں عملہ کافی ہے لیکن ہر شخص کی بھی آرزو ہے کہ اور زیادہ ہوں۔''

ایک اور رپورٹ میں لکھا۔

''اس ضلع کے دفاتر کی ابتری اس قدر ہے کہ اگر مختصر حالت میں لکھا جائے تو خود ایک دفتر ہوجائے۔ محافظ دفتر شاید ہی کوئی ہو جو مثل اور مقدمہ کے مفہوم کو سمجھتا ہو۔ انتہائی بدتمیزی سے چند کاغذات کو سی لیا ہے اور اس کا نام مثل ہے اور ان کاغذات کی تعداد نہ تو مثل سے معلوم ہوتی ہے نہ دفتر سے۔''

جب یہ اور اس جیسی دوسری رپورٹیں موصول ہوچکیں تو مہدی علی ان رپورٹوں کی تصدیق کے لیے خود دوروں پر نکلے۔ انہوں نے ان دفاتر کی وہی حالت دیکھی جو ان رپورٹوں میں بیان ہوئی تھی۔ اب وہ ان خرابیوں کی اصلاح کی طرف مائل ہوئے۔ عہدے داروں کے مشاہرات میں اضافہ کرایا۔ ضرورت کے لحاظ سے عملے کا تعین کرایا۔ کاغذات کی باقاعدہ ترتیب کرائی گئی۔ ہر ضلع کے بستوں کے جداجدا رنگ تجویز کیے۔ بعض دفاتر میں دریوں اور گدوں پر کچھ کام ہوتا تھا۔ اس نے میز، کرسی اور دوسرے فرنیچر سے اسے تبدیل کیا۔ عہدے داروں کو ان ذمہ داریوں کا احساس دلایا اور ایسا عملہ مقرر کیا جو ان دفاتر میں اچانک پہنچ کر دیکھتے تھے کہ دفتر کی حالت کیسی ہے اس سے یہ ہوا کہ لوگوں پر خوف طاری ہوگیا اور دفاتر میں عملہ پابندی سے پہنچنے لگا۔

تھوڑے ہی دن میں یہ نظام ایسا درست ہوگیا کہ ایک تقریب میں ریزیڈنٹ یہ کہنے پر مجبور ہوگیا۔

''مجھے گلبرگہ اور اورنگ آباد میں سرکاری دفاتر کا معائنہ کرنے کا موقع ملا ہے اس لیے نہایت خوشی سے یہ کہہ سکتا ہوں کہ جس طریقے سے تہذیب و ترتیب دفتر ہوئی ہے وہ نہایت عمدہ اور قابلِ تعریف ہے۔ یہی اہم امور انتظامی ہیں جو باعثِ استحکام ریاست ہوتے ہیں اور جن پر کہ انتظام سلطنت کا دارومدار ہے اور یہی ترقی کا دارومدار ہے۔''

مہدی علی کی اصل قدر و قیمت اس وقت ظاہر ہوئی جب حیدرآباد قحط کا شکار ہوا۔ سالار جنگ کی نظر مہدی علی پر گئی اور انہوں نے قحط زدہ علاقوں کا انتظام مہدی علی کے سپرد کیا۔ اسے اس آفت سے نمٹنے کا تجربہ اس وقت بھی ہوا تھا جب وہ مرزاپور میں ڈپٹی کلکٹر تھا۔ لہٰذا وہ ان تدبیروں سے واقف تھا جو سرکار انگریزی میں قحط زدوں کی دستگیری کے لیے کی جاتی ہیں۔

اس نے اپنے سابقہ تجربے کی روشنی میں کام شروع کردیا۔ جو علاقے زیادہ سختی سے متاثر نہیں ہوئے تھے ان کو محفوظ رکھنے کی تدابیر کیں۔ قحط زدہ رقبوں میں فیاضی کے ساتھ امدادی کام جاری کیے۔ کنوؤں اور تالابوں وغیرہ کی درستی کا کام کیا گیا۔ محتاجوں اور مساکین کے لیے محتاج خانے قائم کیے۔ غلے کی درآمد برآمد پر بغیر کسی تجارتی دست اندازی کے بڑی توجہ رکھی اور چند ہی روز میں یقینی بنادیا کہ محض غذا نہ ملنے کی وجہ سے کوئی موت واقع نہ ہو۔ قحط زدہ علاقوں میں ضرورت سے بھی زیادہ غلہ پہنچادیا گیا۔ حفظانِ صحت کی تدبیریں عمل میں لائی گئیں۔ اس کی کوششوں سے صرف چند مقامات پر ہیضہ اور چیچک کی شکایت ہوئی لیکن ان امراض نے وبا کی شکل اختیار نہیں کی۔

چند ماہ کی مدت میں اس نے ایسا قابو پالیا کہ معلوم ہی نہ ہوتا تھا کہ قحط پڑا ہے۔

قحط رفع ہوجانے کے بعد انگریزی حلقوں میں اس کی قابلیت اور ایمانداری کے خوب چرچے ہوئے۔

"یہ صاحب (مہدی علی) جب کہ ڈپٹی کلکٹر تھے تب بھی قحط کے امدادی کاموں میں شریک تھے اور اس وجہ سے ان تدبیروں سے خوب واقف تھے جو سرکار انگریزی میں قحط زدوں کی دستگیری کے لیے کی جاتی ہیں۔"

ممتاز اخبار نے بھی اس کے حسنِ انتظام کی داد دی۔

☆......☆

اس کے محسن سرسید احمد خان کی مشکلات ناگفتہ بہ ہوتی جارہی تھیں۔ ایک طرف وہ ریاست حیدرآباد کی ترقی و بہبود کے لیے کوشاں تھے۔ دوسری طرف سرسید اپنی جنگ لڑ رہے تھے۔ جس قوم کی بھلائی پیشِ نظر تھی اس کے بعض افراد ان کی جان کے درپے تھے۔ ان کے مشہور مخالف مولوی امداد علی علمائے وقت کو بھڑکانے میں مشغول تھے تاکہ ان کے خلاف فتویٰ لے سکیں اور بالآخر وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہوگئے۔ علمائے ہند و حرمین کے فتوؤں کے مطابق سید احمد کو کافر قرار دے دیا گیا۔ اس صورتِ حال کو دیکھتے ہوئے کمیٹی کے ایک جلسے میں مولوی سمیع اللہ نے تقریر کرتے ہوئے زور دے کر کہا کہ مدرسۃ العلوم کی مخالفت روز بروز بڑھتی جارہی ہے۔ اسے رفع کرنے کی صورت اس سے بہتر کوئی نہیں کہ ایک ماتحت مدرسہ بطور نمونہ علی گڑھ میں قائم کیا جائے تاکہ اس کا طریقہ تعلیم لوگوں پر ظاہر ہو اور معلوم ہو کہ اصول اسلام کے برخلاف نہیں۔

علی گڑھ میں ایک وسیع میدان تھا۔ کسی زمانے میں یہاں فوج پریڈ کیا کرتی تھی مگر اب وہاں چھاؤنی نہیں رہی تھی۔ سرسید نے مجوزہ کالج کے لیے اس زمین کو پسند کیا اور حکومت سے درخواست کی کہ یہ زمین کالج کے لیے دے دی جائے۔ یہ کام اتنی آسانی سے نہیں ہوگیا۔ حکومتی کارندوں نے قدم قدم پر روڑے اٹکانے شروع کیے۔ علی گڑھ کا کلکٹر اس کے بالکل حق میں نہیں تھا۔ دوسرے حکام کو بھی اپنے ساتھ ملالیا۔

یہ مخالفت اتنی شدید تھی کہ کمیٹی نے مایوس ہوکر زمین کا خیال ہی دل سے نکال دیا۔ مایوسی کے بادل تنے کھڑے تھے کہ نئے گورنر نے سرسید سے ملاقات کی اور دو شرائط پر زمین دینے کا وعدہ کرلیا۔

پہلی شرط یہ تھی کہ جو عمارت اس میں بنائی جائے اس کے بننے سے پہلے اس کا نقشہ گورنمنٹ کے ملاحظے کے لیے بھیجا جائے۔ دوسری شرط ذرا کڑی تھی اگر کوئی اتفاق پیش آجائے اور کالج بند کردیا جائے تو جس قدر عمارت بنی ہوئی یہاں موجود ہوگی ان سب پر سرکار کا قبضہ ہوجائے گا۔

سرسید نے کمیٹی سے منظوری کے بعد دونوں شرطیں منظور کرلیں اور جواب میں قطعہ اراضی پر قبضے کی سند مل گئی۔

چٹیل زمین کے سینے پر عمارت کی تعمیر کا آغاز ایک ایسا خواب نظر آرہا تھا جس کی کوئی تعبیر نہیں تھی جب کہ سرسید یہ چاہتے تھے کہ جلد سے جلد تعمیر کا کام شروع کردیا جائے کہیں ایسا نہ ہو کہ گورنمنٹ کی نیت بدل جائے۔ سوال سرمائے کی فراہمی تھی۔ نقشہ ایسا بنایا تھا کہ مسلمانوں کے عروج کی کہانی سناتا تھا۔ اس کے لیے بڑی رقم کی ضرورت تھی اور حال یہ تھا کہ کوئی چندہ دینے کو تیار نہ تھا اول تو لوگ انگریزی تعلیم ہی سے نفرت کرتے تھے دوسرے تہذیب الاخلاق کے مضامین نے لوگوں کو شک میں ڈال دیا تھا۔ مولوی حضرات کفر کا فتویٰ دے ہی چکے تھے۔ وہ اپنے وعظوں میں تقریریں کررہے تھے کہ سید احمد کو چندہ نہ دیا جائے۔ انہوں نے بھی طے کرلیا تھا کہ خواہ بھیک مانگنا پڑے۔ وہ کالج ضرور بنائیں گے۔ انہوں نے قوم کی خاطر واقعی بھیک مانگی۔ علی گڑھ میں نمائش لگی تو کتابوں کی دکان لگائی۔ والنٹیر بن کر گلے میں جھولی ڈالی، اسٹیج پر کھڑے ہوکر اپنی بے ہنگم آواز میں غزلیں گائیں۔ مجرے میں پہنچ گئے۔ طوائف اور سازندوں سے چندہ لیا۔ جس نے دعوت کرنی چاہی اس سے دعوت کے بدلے رقم طلب کی۔ کالج کا فنڈ

بڑھتا جا رہا تھا۔
ایک اجنبی مسافر انگریز ڈاک بنگلے میں ٹھہرا ہوا تھا۔ سید احمد نے تعارف نہ ہوتے ہوئے اس سے چندے کی رقم طلب کی۔
''آپ کو اس کام کے لیے صرف اپنی قوم سے مانگنا چاہیے۔''

''بے شک! میری قوم کی پستی ہے کہ غیروں کے سامنے ہاتھ پسارنا پڑتا ہے مگر یاد رکھیے اگر یہ کالج انگریزوں کی اعانت کے بغیر بن گیا تو انگریزوں کے لیے کوئی ذلت کی بات اس سے زیادہ نہ ہوگی۔ وہ ہندوستان کی حکومت سے فائدہ اٹھاتے ہیں مگر ہندوستانیوں کی بھلائی کے متعلق کاموں میں شریک نہیں ہوتے۔'' سرسید نے کہا اور وہ انگریز اتنا شرمندہ ہوا کہ اسی وقت چندہ دینے کو تیار ہو گیا۔
مہدی علی کو معلوم ہوا کہ تعمیر میں چندے کی وقت ہے۔ اسی وقت ایک ہزار نقد اپنے پاس سے چندہ بھیج دیا۔ پھر انہیں معلوم ہوا کہ سرسید قرض لے کر چندہ پورا کرنا چاہتے ہیں تو انہوں نے ذاتی ذمہ داری پر چھ ہزار کا قرض لیا اور سرسید کو روانہ کر دیا۔ حیدرآباد میں بلا اجازت قرض نہیں لے سکتے۔ انہوں نے سالار جنگ سے بات کی۔ انہیں باور کرایا کہ اگر سرسید قرض نہیں لوٹائیں گے تو وہ ادا کریں گے۔ سالار جنگ کو جب معلوم ہوا کہ قرض کالج کی تعمیر کے لیے بھیجا جائے گا تو انہوں نے منظوری دے دی۔
انہوں نے صرف امداد ہی نہیں کی بلکہ سالار جنگ کی توجہ اس طرف دلائی اور ریاست سے گرانٹ مقرر کرا دی۔ یہ انہی کی کوششوں کا نتیجہ تھا کہ سالار جنگ علی گڑھ آئے اور کالج کا معائنہ کرنے کے بعد اپنی جاگیر سے بھی سالانہ امداد منظور کی۔
مہدی علی اس سلسلے میں اتنی کاوشیں کر رہے تھے کہ سرسید ان کے احسان مند ہوتے جا رہے تھے۔ انہوں نے اظہارِ شکر گزاری کے لیے ایک عمارت مہدی منزل کے نام سے موسوم کی اور یہ نوٹ شائع کیا۔
''کمیٹی نے اپنا فرض سمجھا کہ ان میں سے ان بزرگوں کی جنہوں نے اس (کالج) کے قیام میں بے انتہا ہمت صرف کی ہے اور اپنے مال سے اور اپنی سعی سے کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کیا۔ خاص طور سے شکر گزاری کی جاوے۔ بعض کی سعی اور فیاضی ایسی ہے جن کے شکریہ کی دائمی یادگار کا قائم ہونا۔ ہماری کمیٹی کو ذریعہ افتخار مقصود ہے۔ ان بزرگوں میں سے ایک جناب سید مہدی علی خان ہیں۔ انہوں نے اپنی ذات سے بے انتہا فیاضی اور اپنے قلم و قدم سے بے نظیر امداد اس مدرسے کی، کی ہے اس لیے ممبران کمیٹی نے یہ تجویز کی ہے کہ بطور اظہارِ شکر گزاری ایک عمارت جناب ممدوح کے نام سے موسوم کی جاوے اور اس عمارت کا نام مہدی منزل ہو۔
اس کے بعد بھی وہ جب تک حیدرآباد میں رہے وقتاً فوقتاً کالج کو امداد دیتے رہے اور ایسے لوگوں میں اپنا نام لکھوا دیا جنہوں نے علی گڑھ کالج کے لیے قربانیاں دیں اور قوم کی بھلائی کے لیے اپنے دن رات صرف کیے۔
وہ ابھی حیدرآباد کی ملازمت سے دست کش نہیں ہوئے تھے کہ سرسالار جنگ کا انتقال ہو گیا۔ ریاستوں میں انتظام سلطنت کسی ایک فرد کے گرد گھومتا ہے۔ اس کے اٹھتے ہی نظام سلطنت الٹ پلٹ ہو جاتا ہے۔ مرنے والے کے ساتھ ہی اس کی تجاویز بھی عتربود ہو جاتی ہیں۔ وہ لوگ سامنے آ جاتے ہیں جو کبھی اس کے منظور نظر نہ تھے۔ وہ لوگ پس منظر میں چلے جاتے ہیں جو اس مرنے والے شخص سے وابستہ تھے۔
وہ سرسالار جنگ کے جنازے میں شریک تھے لیکن ان کا ذہن آئندہ کی منصوبہ بندی کر رہا تھا۔ وہ سوچ رہے تھے اب سالار جنگ نہیں رہے۔ لہٰذا سازشیں سامنے آ کر رقص کریں گی۔ ذرا سی غفلت ہمیشہ کے لیے بدنامی کا باعث بن جائے گی۔ انہوں نے ارادہ کر لیا تھا کہ یہاں سے استعفیٰ دے کر علی گڑھ چلے جائیں گے اور اپنی صلاحیتیں علی گڑھ کالج کے انتظام میں خرچ کریں گے۔
وہ استعفیٰ دینے کا ارادہ کر چکے تھے۔ دو چار دوستوں سے اس کا تذکرہ بھی کر دیا تھا۔ ادھر لارڈ رپن نے سر اسٹوارٹ بیلی کو ضروری انتظامات کے لیے کلکتہ سے حیدرآباد بھیجا۔
سرسالار جنگ کے خاص لوگوں کے لیے یہ زمانہ نہایت نازک تھا۔ پچھلی رقابتیں ازسرنو تازہ ہو گئی تھیں۔ اب سالار جنگ نہیں رہے تھے اور نواب آصف جاہ نابالغ تھے۔ مولوی مہدی علی اس تعصب کے خاص نشانہ تھے۔ سر اسٹوارٹ بیلی نے حیدرآباد پہنچتے ہی دیکھا کہ ہر طرف بے اطمینانی پھیلی ہوئی ہے۔ ریاست کا ناخدا چل بسا تھا۔ کشتی ڈول رہی تھی۔ اس کے ساتھ ہی انہوں نے یہ بھی سنا کہ مہدی علی استعفیٰ دینے کا ارادہ کر چکے ہیں۔ اس خبر سے

انہیں سخت دھچکا لگا کیوں کہ وہ ان کی خدمات سے ناواقف نہیں تھے جو مہدی علی انجام دے چکے تھے اور دے سکتے تھے انہوں نے ریزیڈنٹ کے ذریعے اسے کہلوایا۔

''آپ حیدرآباد سے چلے جانے کا خیال ہرگز دل میں نہ لائیں۔ یہ بات بالکل نامناسب ہوگی۔ مجھے پورا یقین ہے کہ نواب مرحوم (سالار جنگ) کی وفات کے وقت سے آپ نے اب تک سیدھا اور صاف راستہ اختیار کر رکھا ہے جس کی غرض یہ تھی کہ نئے انتظام میں بامصالحت کارروائی ہو۔ میں اُمید کرتا ہوں کہ آپ اس ریاست کی سرسبزی کے لیے اپنی قابلیت صرف کرتے رہیں گے اور سر اسٹوارٹ بیلی کی صلاح پر کارروائی کرنے سے آپ صرف اپنی سرکار ہی کی خوشنودی حاصل نہ کریں گے بلکہ عوام کی نظروں میں بھی اس کی قدر ہوگی۔''

اس ہدایت کے بعد انہوں نے استعفیٰ دینے کا ارادہ ملتوی کر دیا لیکن اپنے دفاع کے لیے ضروری تھا کہ سالار جنگ کا جانشین کوئی ایسا شخص ہو جو نہ صرف ان کی پالیسیوں کو جاری رکھے بلکہ خود مہدی علی کا دفاع کر سکے۔ اس کے لیے سالار جنگ کے فرزند میر لائق علی سے بہتر کون ہو سکتا تھا۔ معتمدین خاص اور ہواخواہان سلطنت کی بھی خواہش تھی کہ میر لائق علی اپنے لائق باپ کے جانشین ہوں۔

حیدرآباد میں ایک مشہور خاندان تھا جس کے امراء امرائے پائگاہ کہلاتے تھے انہوں نے میر لائق علی کی مخالفت کی۔ یہ کش مکش بڑھتی ہی جا رہی تھی اور عہدہ خالی پڑا تھا۔ حالات بگڑتے جا رہے تھے اور اس وقت تو ناگفتہ بہ ہو گئے جب مسٹر جے۔ جی کاڈری قائم مقام ریزیڈنٹ ہو کر آئے۔ یہ حضرات آتے ہی ان کوششوں میں مگن ہو گئے جہاں تک ممکن ہو۔ شمالی ہند کے قابل نوجوانوں کو جنہیں سر سالار جنگ نے انتخاب کیا تھا اور ظاہر ہے ان کے سرخیل مہدی علی تھا۔ ریزیڈنٹ کے مخالفانہ ارادوں کا براہ راست نشانہ مہدی علی تھے۔

اب حیدرآباد میں واضح طور پر دو گروپ بن گئے۔ ایک گروپ کی سربراہی مہدی علی کر رہا تھا جو میر لائق علی کے حق میں تھا اور ان کی تقرری کے لیے کوشش کر رہے تھے کیوں کہ یہ اس کی شرافت کا تقاضا تھا۔ سالار جنگ اس کے محسن تھے ان کے احسان کا بدلہ اور کسی طرح ادا نہیں ہو سکتا تھا کہ وہ میر لائق علی کی مدارالمہامی کے لیے کوشش کرے۔

مہدی علی یہ مقدمہ بڑی شدت سے لڑ رہے تھے۔ انہوں نے ہر انگریز افسر تک اپنا مقدمہ پہنچایا۔ ان کی نیک نامی اور انتظامی صلاحیت کے سب ہی قائل تھے۔ لہٰذا وائسرائے نے دخل اندازی کی اور تمام اندیشے ہمیشہ کے لیے دور کر دیے وہ خود حیدرآباد آئے۔ اعلیٰ حضرت آصف جاہ کو آبائی سند پر متمکن کیا اور اسی دن میر لائق علی خان کو منصب وزارت پر فائز کر کے مختار الملک کا موروثی خطاب مع خطاب عماد السلطنت عطا کیا۔

حریفوں کو شکست ہو چکی تھی۔ تھوڑے دن کے لیے حالات پُرسکون بھی ہو گئے تھے لیکن پس پردہ سازشیں جاری رہیں اور بالآخر ایک وقت وہ آیا جب مہدی علی کو حیدرآباد سے جانا پڑا۔

عنان وزارت ہاتھ میں لیتے ہی میر لائق علی نے مہدی علی کی وفاداری اور اس کی قابلیت کے ترازو میں تولا اور ایک جدید عہدہ محکمہ پولیٹکل وفنانس وضع کر کے مہدی علی کو اس کا معتمد مقرر کیا۔ یہ عہدہ ایسا تھا کہ حکومت کی پوری طاقت اس کی ذات میں مجتمع ہو گئی۔ حکومت کے تمام صیغے اس کے زیر اثر آ گئے۔ ایسی طاقت اسے کبھی نہیں ملی تھی جیسی کہ اب ملی ہے۔

نظام حیدرآباد اعلیٰ حضرت آصف جاہ کی نظروں میں بھی مہدی علی کا اعتبار بہت بڑھ گیا اور ایک مرتبہ نوروز کی تقریب پر اسے منیر نواز جنگ بہادر کا خطاب مرحمت فرما کر اپنے اس اعتماد کا اظہار کیا۔

جب نواب حیدرآباد اسے اتنا چاہیں تو کس کی مجال کہ ان کی طرف میلی آنکھ سے دیکھے۔ انہوں نے خود بھی ایسی طبیعت پائی تھی کہ سازشوں کا شکار ہونے والے نہیں تھے لیکن میر لائق علی خان اپنی ناتجربہ کاری سے سازشیوں کے ہتھے چڑھ گئے۔ ان کے گرد کچھ ایسے لوگ جمع ہو گئے جن کے مشوروں سے ان سے ایسے افعال سرزد ہو گئے جو ان کی وزارت کی حدود سے باہر تھے۔ دوسرے لفظوں میں انہوں نے اپنے اختیارات سے تجاوز کیا۔ سازشی افراد ان کے دل میں یہ ڈالتے رہے کہ ریزیڈنٹ ان کی پشت پر ہے لہٰذا انہیں اعلیٰ حضرت (آصف جاہ) کی طرف سے کوئی خدشہ نہیں ہونا چاہیے لیکن جب وقت آیا تو وہ اعلیٰ حضرت کے معتوب ہو گئے اور انہیں استعفیٰ دینا پڑا۔ میر لائق علی کا عہدۂ وزارت صرف تین سال رہا۔

مہدی علی ایک مرتبہ پھر دھوپ میں کھڑے تھے۔ وہی حالات تھے کہ جب سالار جنگ کا انتقال ہوا تھا اور وہ

خودکو تنہا محسوس کر رہے تھے۔ میر لائق علی کے دور میں انہوں نے بقول اس کے حیدرآباد میں خدائی کی پوری حکومت جیسے ان کے ہاتھ میں تھی۔ اب میر لائق علی خان کی جگہ نواب سر آسمان جاہ وزارت پر فائز کیے گئے۔ اب انہیں نہیں معلوم تھا کہ ان پر کتنا بھروسا کیا جاتا ہے۔ وہ ایک مرتبہ پھر استعفیٰ دینے کا ارادہ کر چکے تھے کہ دوبارِ نوروز میں اعلیٰ حضرت آصف جاہ نے انہیں " نواب محسن الدولہ محسن الملک" کا خطاب مرحمت فرما کر اس کی قدردانی خدمات کا اظہار فرمایا۔

دیسی ریاستوں میں "جسے پیا چاہے وہی سہاگن" والا مقولہ چلتا ہے۔ سرکار جس سے خوش ہیں تمام عہدے دار بھی اس کی قدر و منزلت کرتے ہیں۔ اعلیٰ حضرت کی طرف سے انہیں خطاب عطا ہوا تو خود وہ بھی مطمئن ہوئے اور نئے آنے والے وزیر کی نظروں میں بھی ان کا اعتماد بحال ہو گیا۔

محسن الملک کا خطاب ان پر ایسا چسپاں ہوا کہ لوگ رفتہ رفتہ ان کا نام مہدی علی بھول گئے اور وہ محسن الملک ہو کر رہ گئے۔ انہیں لوگ اس خطاب سے اس طرح پکارتے تھے جیسے یہی ان کا نام ہو۔

وقت بدلتا ہے تو وقت کے تیور بھی بدل جاتے ہیں۔ نواب سر آسمان جاہ عماد السلطنت نے اس کی قدر تو کی لیکن اس کے اقتدار میں کمی آگئی اور مولوی مشتاق حسین (وقار الملک) کو جو میر لائق علی خان کے زمانے میں صوبہ دار تھے۔ عروج حاصل ہوا۔

وہ عہدوں کے لالچ میں مبتلا نہیں تھے اس لیے انہوں نے اس تنزلی کی پروا بھی نہیں کی۔ ان کے لیے یہی بہت تھا کہ نیا وزیر اعظم بھی ان کی خدمات کی قدر کرتا ہے۔

وہ ریاست کی ترقی و فلاح کے لیے کام کرتے رہے۔ اپنی انہی کوششوں کے دوران میں انہوں نے معدنیات کے ٹھیکے میں جو چالاکیاں ہوئی تھیں اور جس سے گورنمنٹ نظام کو بہت بڑا مالی نقصان پہنچا تھا اس کا پردہ چاک کیا۔ یہ معاملات جب پریس میں آئے تو لندن میں ہیجان برپا ہو گیا کیونکہ حصص کی خریداری میں حکومتِ برطانیہ بھی شامل تھی۔ لندن میں ایک تحقیقاتی کمیٹی بنی۔ اس کی پیروی کے لیے گورنمنٹ نظام نے نواب محسن الملک (مہدی علی) کو پیروی کے لیے منتخب کیا۔ بعض مشیر قانون اور مددگار ان کے ساتھ لندن روانہ ہوئے۔

جب تک وہ لندن میں قدم رکھتے اخبارات نے کالموں کے ڈھیر لگا دیے تھے جن سے اس غلط فہمی کا اندیشہ تھا کہ نظام گورنمنٹ، گورنمنٹ آف انڈیا اور ریزیڈنٹ کے خلاف منشا کام کرتی ہے۔

مہدی علی نے لندن پہنچتے ہی مسٹر فریون سے ملاقات کی اور ان پر اپنی گورنمنٹ کے خیالات ظاہر کیے۔

"ہز ہائی نس، وزیر اور دیگر ارکانِ حکومت کی مقررہ پالیسی یہی ہے کہ کوئی کام ایسا نہ کیا جائے۔ جو ریزیڈنٹ حیدرآباد، گورنمنٹ آف انڈیا اور انڈیا آفس کے خلافِ مرضی ہو اور یہ کہ ہمارے تمام کام حکومت بالا کے ایما کے مطابق ہوں۔"

اس نے اپنی اس پالیسی کو بڑے بڑے عمائدین کے سامنے بھی بیان کیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ غلط فہمیاں دور ہو گئیں۔ اس کے بعد انہوں نے تحقیق کے لیے بنائی گئی کمیٹی کے سامنے خود کو شہادت کے لیے پیش کیا۔ اس نے اس خوب صورتی سے یہ مقدمہ لڑا اور ایسی خوب صورت دلیلیں دیں کہ وہ عہدے دار جو نظام حکومت کو نقصان پہنچانے والے تھے اور اس وقت لندن میں موجود تھے بلکہ خاص طور پر بلوائے گئے تھے لاجواب ہو کر رہ گئے اور وہ غلط فہمیاں دور ہو گئیں جو ایک سازش کے تحت نظام گورنمنٹ کے خلاف پھیلائی گئی تھیں ان کی کوششوں سے وہ غلط فہمیاں دور ہو گئیں۔ موجودہ ہوم سیکریٹری کو ہٹا دیا گیا۔

مہدی علی نے چند ہی روز میں لندن کے سرکاری حلقوں میں نہایت مقبولیت حاصل کر لی۔ مختلف لارڈ صاحبان نے انہیں اپنے گھر دعوت پر بلایا۔ یہ کسی بھی ہندوستانی کے لیے اس وقت قابلِ فخر تھا۔ وہ جہاں بھی گئے نہ صرف ریاست حیدرآباد کا مقدمہ لڑا بلکہ ایسے دلائل دیے اور ثبوت پیش کیے جو ہندوستان کی تمام ریاستوں کی صفائی پیش کرتے تھے۔ ان غلط فہمیوں کو دور کرتے تھے جو ان ریاستوں کے خلاف ولایت میں پھیلائی گئی تھیں۔

لندن میں ان کی قابلیت کے چرچے تھے لیکن ہندوستان میں ان کے خلاف ایک نیا محاذ کھلنے والا تھا جس کا احساس خود اسے بھی نہیں تھا۔ یہ تو ہندوستان پہنچ کر ہی معلوم ہونے والا تھا۔

وہ ساحلِ ہند سے سفر کر کے جب حیدرآباد پہنچے تو حیدرآباد کلب میں انہیں مدعو کیا گیا۔ ابھی تک سفر کی تکان اتری نہیں تھی طبیعت بھی مضمحل تھی۔ ایک مختصر تقریر کے

بعد انہوں نے وہاں بیٹھنے سے معذرت کی اور گھر چلے آئے۔

ہوم سیکریٹری کا عہدہ خالی پڑا تھا۔ ایک انار تھا اور سو بیمار تھے۔ رسہ کشی تو ہونی ہی تھی۔ یہ معاملہ بہ آسانی نمٹ بھی سکتا تھا لیکن ریزیڈنٹ کی مداخلت نے کھیل بگاڑ دیا۔ وہ فتح نواز جنگ (مہدی حسن) کے حق میں تھا جب کہ مدارالمہام سر آصف جاہ ریزیڈنٹ کی ضد پوری کرنے کو تیار نہیں تھے۔ اس میں کہیں محسن الملک (مہدی علی خاں) کا نام نہیں تھا لیکن فتح نواز جنگ یہی سمجھ رہے تھے کہ وہ محسن الملک کو بنانا چاہتے ہیں۔ محسن الملک نے ان کے کان بھرے ہیں۔ وہ کھلے عام محسن الملک کے خلاف تقریریں کرنے لگے۔ محسن الملک کو بدنام کرنے میں کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھا۔

اسی زمانے میں مسٹر ہاول ریزیڈنٹ آئے۔ انہوں نے اس آگ کو مزید ہوا دی۔ وہ نواب محسن الملک (مہدی علی) کی حمایت میں فریقانہ حیثیت سے شریک ہوگئے اور فتح نواز جنگ کے ہوم سیکریٹری کیے جانے کی سخت مخالفت کی۔ اپنی پوری قوت صرف کردی۔ گورنمنٹ کے ارکان بھی دو حصوں میں تقسیم ہوگئے۔ بالآخر مسٹر ہاول حیدرآباد سے ہٹا دیے گئے اور ان کی جگہ نیا ریزیڈنٹ آگیا۔ اس نے غیر ضروری مداخلت سے گریز کیا۔ فتح نواز جنگ ہوم سیکریٹری ہوگئے اور ایک سکون سا ہوگیا۔

یہ سکون چھلنی میں پانی کی طرح رہا کہ پانی بہہ گیا اور چھلنی خالی رہ گئی۔ دو سال بہ مشکل گزرے تھے کہ سر چیچلی پلوڈن ریزیڈنسی پر آئے اور چند ہی دن میں سر آسمان جاہ کے خلاف ہوگئے۔ سازشوں کا بازار ایک مرتبہ پھر گرم ہو گیا۔ انہی سازشوں کا نتیجہ تھا کہ وقار الملک نے استعفیٰ دے دیا اور حیدرآباد سے روانہ ہوگئے۔

ان کے جاتے ہی سر آسمان جاہ کی نظروں میں مہدی علی (محسن الملک) کی وقعت بڑھ گئی۔ انہوں نے وقار الملک سے متعلقہ مہمات بھی مہدی علی کے حوالے کردیں۔ مہدی علی بھی نہایت خلوص سے ان مہمات کو سر کرتے لگے اور ان غلط فہمیوں کو دور کرنے میں بھی مشغول رہا ہے جو سر آسمان جاہ اور ریزیڈنٹ کے درمیان پیدا ہوگئی تھیں۔ ان کی کوششیں محض کوششیں رہیں اور تاریکی بڑھتی رہی۔ انہوں نے وقار الملک کو خط لکھا۔

کوشش بدستور جاری ہے اور حضرت اقدس و اعلیٰ کے احکام کی تعمیل اور مرضی مبارک کے مطابق کام کرنے میں ہم سب سرگرم ہیں۔ کیا عجب ہے کہ نواب صاحب کی وفاداری اور اطاعت اپنا نیک نتیجہ دکھائے اور شورش بند ہو جائے ورنہ بہت جلد بندہ بھی پہنچتا ہے اور علی گڑھ میں آ کر ملتا ہے۔

وہ بدستور فنانشل سیکریٹری رہے اور ان کا تعلق مدارالمہام سے تھا۔

ہر طرف سے مایوس ہونے کے بعد امرا کی سازشوں نے ایک نیا جال پھینکا۔ ایک روز منصب دار غضنفر علی بیگ، محسن الملک کے پاس آئے اور انہیں یہ پیغام دیا کہ نواب سرور جنگ کو روپے کی ضرورت ہے۔ وہ چاہتے ہیں سر آسمان جاہ ان کی مالی امداد کریں۔

نواب سرور جنگ شطرنج کا ایک پیا مہرہ تھے جو اب استعمال کیے جا رہے تھے۔ آغا مرزا نواب سرور جنگ اودھ کے باشندے تھے اور سر آسمان جاہ کے مخالف سمجھے جاتے تھے۔ ریزیڈنسی میں بھی ان کا اثر رسوخ تھا۔ اعلیٰ حضرت کی تعلیم کے لیے مقرر ہوئے تھے۔ اتالیقی کے بعد ریزیڈنٹ کی سفارش پر معتمد پیشی کے ممتاز عہدے پر فائز کیے گئے۔

محسن الملک کو جب معلوم ہوا کہ سرور جنگ کو مالی امداد کی ضرورت ہے تو اس نے سر آسمان جاہ کو مشورہ دیا کہ یہ امداد کردی جائے۔

''اگر کچھ مالی امداد دے دی جائے گی تو ان (سرور جنگ) کی بدگمانی دور ہو جائے گی اور اس بخشش سے کوئی حرج نہ ہوگا۔''

اس نے یہ مشورہ مصلحت وقت کے تحت دیا تھا۔ سرور جنگ اور سر آسمان جاہ کے درمیان بدگمانیاں چلی آ رہی تھیں۔

محسن الملک نے یہی سوچا ہوگا کہ اس احسان کے بعد قربتیں بڑھیں گی جو ریاست کے لیے بھی اچھا ہوگا اور خود آسمان جاہ اور ان کے لیے بھی اچھا ہوگا۔

سر آسمان جاہ نے امداد کی مد میں ایک لاکھ روپے دینا منظور کرلیا۔ یہ روپیا، نواب سرور جنگ نے وصول بھی کرلیا لیکن اسے امداد نہیں رشوت کا رنگ دے کر اعلیٰ حضرت آصف جاہ کے علم میں لایا گیا۔

نواب فتح نواز جنگ ہوم سیکریٹری کو بھی موقع مل گیا۔ انہوں نے یہ واقعہ ریزیڈنٹ تک پہنچا دیا۔

''سر آسمان جاہ امور مملکت نہیں چلا سکتے اس لیے لوگوں کو رشوت دے کر ان کا منہ بند کر رہے ہیں۔'' جب

ریزیڈنٹ اعلیٰ حضرت سے ملا اور ان کے سامنے یہ معاملہ پیش کیا گیا تو انہوں نے نواب سرور جنگ کو طلب کیا اور ان سے وضاحت چاہی۔ انہوں نے جو بیان دیا اس میں اس عطیہ کی تحریک اور اسے قبول کرنے پر اصرار کا سارا الزام نواب سر آسمان جاہ اور محسن الملک پر رکھ دیا۔

''میں تو پہلے ہی آپ کے علم میں لا چکا تھا کہ سر آسمان جاہ نے مجھے ایک لاکھ روپے اصرار کر کے دیے ہیں۔ یہ شاید اس لیے تھے کہ میں اپنے فرائض سے غفلت برتوں اور جیسا وہ چاہتے ہیں ویسا کروں لیکن میں آپ ہی کا وفادار رہوں گا۔''

ریزیڈنٹ پہلے ہی ملا ہوا تھا۔ اس نے نواب سرور جنگ کے بیان کو سچ قرار دیا اور محسن الملک کی صفائی کو درخور اعتنا نہیں سمجھا۔

محسن الملک اس نتیجے سے ایسا مایوس ہوا کہ استعفیٰ پیش کر دیا۔ اعلیٰ حضرت نے استعفیٰ منظور کر لیا سازشیوں کا داؤ چل چکا تھا۔

گمان یہ تھا کہ مہدی علی جب حیدر آباد کو الوداع کہہ گئے تو چونکہ وہ اعلیٰ حضرت کے معتوب ہیں اس لیے کوئی شخص انہیں خدا حافظ کہنے ریل تک نہ آئے گا۔ اب تک یہی ہوتا رہا تھا۔ اعلیٰ حضرت کے معتوب افراد چپکے سے ریل میں بیٹھ کر چلے جاتے تھے لیکن عوام میں ان کی مقبولیت کا عالم یہ تھا کہ جب لوگوں کو معلوم ہوا کہ وہ روانہ ہو رہے ہیں تو شام ہی سے لوگوں کی آمد و رفت شروع ہو گئی۔ وہ ہجوم ہوا کہ پلیٹ فارم بھر گیا۔ لوگ آہ و فغاں کر رہے تھے۔ انہیں الوداع کہنے والوں میں انگریز بھی تھے۔ انہوں نے ٹوپیاں اتار کر اس کے حق میں نعرے لگائے۔ کوئی ایسا نہ تھا جس کی آنکھوں میں آنسو نہ ہوں۔

ٹرین نے روانگی کی سیٹی دی اور روانہ ہوئی۔ پورا مجمع سکتے کی حالت میں ٹرین کو جاتے ہوئے دیکھ رہا تھا۔ پھر جب ذرا سکتہ ٹوٹا تو ایک ولولہ چلا اٹھا۔

''ایک سازش کے تحت خیر خواہ لوگوں کو الگ کرایا جا رہا ہے تاکہ آئندہ کوئی عقل مند یہاں رہے نہیں اور پھر جس کا جی چاہے وہ کرے۔''

اخبار آزاد نے دوسرے دن کے شمارے میں اس منظر کو یوں بیان کیا۔

''آپ کی روانگی سے دو روز پیشتر لوگ بہ کثرت آپ سے ملنے اور آپ کو وداع کرنے ٹھیک ساڑھے سات بجے ریلوے اسٹیشن پر جلوہ فرما ہوئے۔ مولوی صاحب کے آنے سے پہلے ایک جانب ہزارہا آدمی انگریز، پارسی، لیڈیاں، ہندو، مسلمان جن میں اکثر سرکاری عہدیدار تھے۔ دوسری جانب ایک کثیر تعداد ان بیوہ عورتوں کی تھی جن کی وہ مدد کیا کرتے تھے، اپنے چھوٹے چھوٹے، یتیم بچوں کو لیے ہوئے مولوی صاحب کو الوداع کہنے آئی تھیں۔''

ہم نے کیا کسی نے بھی آج تک کسی عہدے دار کی روانگی پر اس طرح خاص و عام کو وداعی تقریب میں شریک ہوتے نہیں دیکھا۔

مہدی علی نے ان بیوہ عورتوں کی آہ و زاری کو دیکھ کر پرائیویٹ سیکریٹری سے کہا۔

''سرکاری غلام کی جانب سے قدم بوسی کے بعد عرض کرتا کہ جب تک فدوی تھا ان غریب عورتوں کو جس طرح چاہا نباہا۔ اب میری آخری سفارش ہے جو میں ان عورتوں کے لیے کرتا ہوں۔ کہ ان بے کسوں کی پرورش کا سرکار کو خیال رہے۔''

☆......☆

ایک شخص شام بہاری لال سرسید احمد کے دفتر میں ہیڈ کلرک تھا۔ کالج کے جتنے اخراجات ہوتے تھے سرسید کے ہاتھوں ہوتے تھے اور بہاری لال بہ حیثیت کلرک اس کا حساب کتاب رکھتا تھا۔ کالج کا روپیا بینک بنگال میں تھا اور حسبِ ضرورت چیکوں کے ذریعے نکالا جاتا تھا۔ کچھ پرامیسری نوٹ بینک کی سپردگی میں تھے جن کا منافع تقریباً دو ہزار سالانہ بینک سے ہر سال وصول کیا جاتا تھا۔

شام لال کو کام کرتے ہوئے دس بارہ سال ہو گئے تھے۔ سرسید اس پر اعتماد کرنے لگے تھے لہٰذا اکثر بغیر پڑھے ہی چیک پر دستخط کر دیا کرتے تھے اور بہاری لال بینک سے پیسے نکلوا لیتا تھا۔ اس نے جب دیکھا کہ سرسید اس پر اعتبار کرنے لگے ہیں تو اس کی نیت خراب ہوئی۔ جس قدر روپے چاہتا نکلوا لیتا۔ اس کی ہمت مزید بڑھی۔ پھر اس نے جعلی دستخط بنانے شروع کر دیے۔ سرسید کو معلوم ہی نہ ہوتا اور پیسے بینک سے نکل جاتے یہاں تک کہ بینک میں جمع شدہ زر ضمانت بھی ختم ہو گئی۔ اس نے کالج کے ٹرسٹیوں کی طرف سے ایک مختار نامہ بنایا اور اس پر سات ٹرسٹیوں کے جعلی دستخط کر کے بینک کو بھیج دیا۔ اس مختار نامے کے ذریعے بینک کو اختیار دیا گیا تھا کہ کالج کو جس قدر روپے کی ضرورت ہو پرامیسری نوٹوں کی کفالت پر سودی روپیا قرض دیتا

رہے۔

کسی کو کانوں کان خبر نہ ہوئی اور بہاری لال کالج کے نام پر قرض لے کر اپنی عیاشیوں پر خرچ کرتا رہا۔ ایک دن بہاری لال کی درخواست آئی کہ وہ بیمار ہے اسے رخصت دی جائے۔ پھر معلوم ہوا اس پر فالج کا حملہ ہوا ہے۔ نہ جانے کب تک ڈیوٹی پر نہ آسکے۔ کوئی مدت معین نہیں تھی کہ وہ کب آتا ہے۔ سرسید نے کچھ مدت کے لیے ایک عارضی کلرک کی تقرری کرلی۔ اس کلرک نے سیٹ پر بیٹھتے ہی حساب کتاب کا جائزہ لیا۔ رجسٹر دیکھے۔ پرانی چیک بکیں دیکھیں۔ اسے شک تو ہوا کہ کچھ گڑبڑ ہے لیکن نیا نیا آیا تھا پوری طرح بات کو سمجھ نہ سکا۔

اس سے پہلے یہ ہوتا تھا کہ بینک کی طرف سے تقاضے اور اکاؤنٹ کی صورتِ حال کے جو خطوط آتے تھے بہاری لال انہیں غائب کردیتا تھا لیکن اس نئے کلرک نے ان خطوط کو پڑھا بھی، ان پر غور بھی کیا اور اس نتیجے پر پہنچا کہ بینک اکاؤنٹ میں کوئی گڑبڑ ہوئی ہے۔ وہ سرسید کی خدمت میں پہنچا اور تمام معاملہ گوش گزار کیا۔

''وہ تو بہت ایماندار آدمی تھا۔ یقیناً بینک کو کوئی غلط فہمی ہوئی ہوگی۔'' سرسید نے کہا۔

''نہیں جناب بینک ایسی غلطی نہیں کرسکتا۔ ضرور کوئی جعل سازی ہوئی ہے کوئی آپ کے علم میں لائے بغیر پیسے نکلوا تا رہا ہے۔''

''یہ ہوسکتا ہے کہ آج شام بہاری لال کو کچھ دیر کے لیے بلوایا جائے۔ وہ بتائے گا کہ اصل معاملہ کیا ہے تم ابھی نئے ہو پوری بات سمجھ نہیں رہے ہوگے۔''

''گستاخی معاف! اسے بلانے کی غلطی نہ کیجیے گا۔ اگر وہی چور ہے تو ہوشیار ہو جائے گا۔ اسے تو یہ معلوم بھی نہ ہونا چاہیے کہ معاملہ کھل چکا ہے۔''

''پھر معاملہ کھلے گا کیسے۔''

''آپ فکر نہ کیجیے۔ میں حساب کتاب دیکھتا ہوں۔ ہوسکا تو بینک سے بھی رابطہ کروں گا۔ اگر پھر بھی کوئی بات ظاہر نہ ہوئی تو بے شک بہاری لال کو بلا لیجیے گا۔''

سرسید نے یہ کام اس پر چھوڑ دیا۔ نیا کلرک اب تمام معاملہ سمجھ چکا تھا۔ اس نے پچھلی چیک بکیں دیکھیں۔ چیک بکوں کی کاؤنٹر فائلیں بغیر لکھی ہوئی تھیں۔ جتنے کا چیک کاٹا گیا تھا کاؤنٹر فائل پر وہ رقم درج نہیں تھی۔ معلوم ہی نہیں ہوتا تھا کہ چیک کتنی رقم کا جاری ہوا اور کس تاریخ کو۔ روزنامچہ دیکھا تو اس پر کسی چیک کا اندراج ہی نہیں تھا۔

کلرک نے تمام صورتِ حال ایک مرتبہ پھر سرسید کے سامنے رکھ دی اور انہیں مشورہ دیا کہ وہ اب بینک سے رابطہ کریں۔ سرسید نے بینک سے خط و کتابت کی تو ظاہر ہوا کہ غبن ہوا ہے۔ بہاری لال ایک لاکھ سے زیادہ کی رقم ہڑپ کرچکا تھا۔

سرسید کے لیے یہ صورتِ حال نہایت نازک تھی۔ صرف رقم ہی نہیں ڈوبی تھی بلکہ اس کی عزت بھی داؤ پر لگ گئی تھی۔ کوئی یہ بھی کہہ سکتا تھا کہ خود اس نے قوم کی امانت ہڑپ کرلی۔ انہوں نے ٹرسٹیوں سے مشورہ کرنے کے بعد اس واقعے کی اطلاع گورنمنٹ کو دی اور بہاری لال گرفتار کرلیا گیا لیکن مقدمہ چلنے سے پہلے ہی اس نے حوالات میں خودکشی کرلی۔

☆......☆

محسن الملک مہدی علی خان حیدر آباد کی بھول بھلیوں سے نکلے تو سیدھا علی گڑھ پہنچے اور انہوں نے اپنی بقیہ زندگی کالج کی ترقی کے لیے وقف کرکے مستقل علی گڑھ میں رہنے کا عزم کرلیا۔

وہ بہت سے عزائم لے کر علی گڑھ آئے تھے لیکن بدقسمتی سے یہ سرسید کا آخری زمانہ تھا خصوصاً ایک لاکھ کے غبن کے بعد تو کالج کی کشتی ڈانواڈول تھی۔ انتظامی معاملات دگرگوں تھے۔ تعمیر کا کام رُک گیا تھا۔ چندے کی کوئی سبیل نہیں تھی۔ سرسید کو تو ایسی چپ لگی تھی کہ ساتھیوں کو الجھن ہوتی تھی۔

اس کالج کی بنیادوں میں مہدی علی کی محنت، پسینا اور روپیا دفن تھا۔ انہیں سرسید سے جو عقیدت رہی تھی اس کا بھی تقاضا یہ تھا کہ وہ کالج کی اصلاح کے لیے ہر طریقہ بروئے کار لائیں۔ یہ کام علی گڑھ میں رہ کر نہیں ہوسکتا تھا۔ انہوں نے ممبئی کا رخ کیا اور اسے اپنا محورِ عمل قرار دیا۔

اس وقت سب سے بڑی ضرورت یہ تھی کہ مخالفین کالج سے ربط ضبط کیا جائے اور انہیں کالج کی ترقی میں حصہ لینے پر آمادہ کیا جائے۔ اس وقت انہوں نے وہی کام کیا جو کبھی سرسید نے کیا تھا۔ ہر اس شخص سے ملاقات کی جس سے ذرا بھی توقع کی جاسکتی تھی۔ جسٹس بدرالدین طیب جی کا شمار علی گڑھ کے مخالفین میں ہوتا تھا۔ مہدی علی نے اپنی اعجاز بیانی سے انہیں ایسا رام کیا کہ عام مسلمانوں میں علی گڑھ کے ساتھ ہمدردی پیدا کرنے اور قومی تعلیم کی طرف

متوجہ کرنے کے لیے ایک اخبار جاری کرنے پر تیار ہو گئے۔ انہوں نے اپنے ساتھ کچھ اور لوگوں کو بھی ملایا اور ان اصحاب نے مشترکہ سرمائے سے گجراتی اور انگریزی میں مانیٹر اور اردو میں مراۃ الاخبار جاری کر دیا اور عام انتظامات وغیرہ کے لیے ایک بورڈ بنا دیا لیکن کچھ عرصے کے بعد بورڈ نے اخبار بند کر دیا۔ مہدی علی نے پھر دریا دلی دکھائی اور اپنے پاس سے سرمایہ لگا کر دوسرا اخبار نصیر ممبئی کے نام سے جاری کرا دیا۔

اس اخبار میں خود انہوں نے مضامین لکھے اور دوسروں سے لکھوائے۔ ان مضامین کا ایسا اثر ہوا کہ تھوڑے دنوں میں ہی علی گڑھ کے مقاصد لوگوں کے دلوں میں اچھی طرح راسخ ہو گئے۔ مختلف العقائد مسلمانوں کو کئی میمنوں، خوجے، سلیمانی اور داؤدی بوہرے سب میں اس نے ایک قسم کی قومی زندگی پیدا کر دی۔

اس ہی کی کوششوں سے ہز ہائی نیس آغا خان کے دل میں ایسی لگن پیدا ہوئی جس نے ان سے علی گڑھ کی ترقی اور عظمت کے کام کرائے۔

وہ علی گڑھ کالج کی ترقی کے لیے کوشاں تھے۔ ممبئی سے نکلے اور ہندوستان کے دورے پر روانہ ہو گئے۔ میرٹھ، دہلی، مظفر نگر، سہارن پور، رام پور، مراد آباد وغیرہ کے دورے کیے۔ ہر جگہ جلسے منعقد کرائے، تقریریں کیں۔ اس کی مخالفتیں بھی ہوئیں، طعنے بھی دیے گئے۔ جو القابات سرسید کو دیے جاتے تھے انہی القابات سے انہیں بھی نوازا گیا۔ یہاں تک کہہ دیا گیا کہ ان کا لیکچر سننے کے لیے جانا سیدھا جہنم میں جانا ہے۔ لیکچر سننے والوں پر ان کی منکوحہ عورتیں حرام ہو جائیں گی۔

رام پور گئے تو نواب رام پور سے ملاقات کی۔ یہاں سے مراد آباد گئے۔

ان دوروں نے ان کی ثابت قدمی نے ایک عام بیداری پیدا کر دی۔

ان کی کوششیں بار آور ثابت ہو رہی تھیں۔ ادھر کالج میں سخت ابتری پھیلی ہوئی تھی۔ سرسید پر غبن کے صدمے کا ایسا اثر ہوا تھا کہ طبیعت میں بے پناہ غصہ اور چڑچڑا پن پیدا ہو گیا تھا۔ کسی کی بات سننے کے روادار نہ تھے۔ وہ یورپین اسٹاف کے ہاتھوں میں کھیل رہے تھے۔ یوں لگتا تھا کہ کالج آہستہ آہستہ انگریزوں کے ہاتھوں میں چلا جائے گا۔ محسن الملک یہ تصور بھی نہیں کر سکتے تھے کہ سرسید کی مرضی کے خلاف کوئی کام کرے اور انہیں تکلیف پہنچائے لیکن یہ کالج کی بقا کا مسئلہ تھا لہٰذا وہ وقار الملک کی اسی رائے سے متفق ہو گئے کہ ٹرسٹیوں کے پاس ایک یادداشت بھیجی جائے کہ وہ کالج کی خبر لیں اور اسے یورپین اسٹاف کے ہاتھوں میں جانے سے بچائیں لیکن یہ یادداشت ٹرسٹیوں تک نہیں پہنچ سکی۔ سرسید کی علالت اور پھر انتقال نے اس یادداشت کو ٹال دیا۔

سرسید کے بیٹے جسٹس محمود کی ذہنی حالت کثرت شراب نوشی نے ازحد خراب کر دی تھی۔ وہ باپ کے جانشین ضرور ہو گئے تھے لیکن کام کرنے کے قابل نہیں رہے تھے۔ قوت فیصلہ بالکل ختم ہو چکی تھی۔ کالج کی حالت یہ تھی کہ اسٹاف ممبروں کی تنخواہیں، معماروں، باغبانوں، مزدوروں، کتب فروشوں کا روپیا ادا کرنا تھا۔ ان قرضوں کی اتنی فہرست تھی کہ کبھی ختم ہونے میں نہ آتی تھی۔ کالج میں ہر وقت قرض خواہوں کا ہجوم رہتا تھا۔ سیکڑوں غضب ناک خطوط آتے تھے۔

محسن الملک نے اس وقت سب سے پہلا کام یہی کیا کہ اپنی تمام تر توجہ کالج کی مالی مشکلات سے نکالنے کی طرف مبذول کر دی انہوں نے ایک لمحہ ضائع کیے بغیر سرسید میموریل فنڈ کمیٹی قائم کی۔ صرف چھ ماہ میں اس نے بینک کا قرضہ ادا کر کے سود سے مخلصی حاصل کر لی۔

سید محمود کی حالت سیکریٹری شپ کے لیے ناقابل ہوتی جا رہی تھی۔ کچھ لوگوں نے ان کے کان بھی بھرے تھے کہ محسن الملک خود سیکریٹری بننا چاہتے ہیں اس لیے وہ کھلم کھلا محسن الملک کی مخالفت پر اتر آئے۔

ٹرسٹیوں کی عام رائے یہی تھی کہ چونکہ سید محمود کی ذہنی حالت اس قابل نہیں رہی کہ وہ سیکریٹری شپ کو تادیر چلا سکیں چنانچہ اجلاس ہوا اور کثرت رائے سے مہدی علی محسن الملک کو سیکریٹری منتخب کر لیا گیا اور سید محمود لائف پریذیڈنٹ کیے گئے۔

اس فیصلے کے بعد مہدی علی اٹھ کھڑے ہوئے۔ ان کی آنکھوں سے آنسو جاری تھے اس کی آواز بھرائی ہوئی تھی اور وہ کہہ رہا تھا۔

"اس وقت مجھے مر جانا چاہیے۔ افسوس! میں اپنی آنکھوں سے دیکھوں کہ تیس برس کی دوستی کے بعد سید محمود کا عہدہ مجھے ملے۔"

سید محمود اس سے پہلے ہی احتجاجاً کمرے سے باہر نکل

گئے تھے۔ مہدی علی اپنی تقریر ختم کر کے جب باہر نکلے تو سید محمود برآمدے میں ٹہل رہے تھے اور یقیناً غصے میں بھی تھے۔ وہ پہلے ہی کہتے رہے تھے کہ محسن الملک سیکریٹری شپ کا عہدہ اپنے پاس رکھنا چاہتے ہیں۔ اب یہ بات سچ ہو گئی تھی چاہے اس میں محسن الملک کی کوششوں کا دخل تھا یا نہیں۔

محسن الملک مہدی علی نے سید محمود کو برآمدے میں دیکھ کر انہیں مخاطب کیا۔

"محمود سن! یہ وقت ایسا ہے کہ مجھے اور تجھ کو دونوں کو مر جانا چاہیے۔ میں ٹرسٹیوں کے کہنے کی کچھ پروا نہیں کرتا۔ اگر تو مجھے سیکریٹری مقرر کرے تو میں سیکریٹری ہوتا ہوں۔ میری اور تیری تیس برس کی دوستی ہے۔ تو نے اس عرصے میں مجھے بہت تکلیفیں دی ہیں لیکن اس پر بھی میں تیرے کہنے سے باہر نہیں ہوں۔ تیری جوتیاں اٹھانے کو موجود ہوں۔"

یہ سننا تھا کہ سید محمود بھی رونے لگے اور آگے بڑھ کر محسن الملک کو گلے سے لگا لیا۔ دونوں نے ایک دوسرے کی پیشانی پر بوسہ دیا۔

بہ ظاہر تو یوں لگتا تھا کہ سید محمود نے انہیں معاف کر دیا ہے لیکن ان کی ذہنی حالت ٹھیک نہیں تھی۔ گھڑی میں تولہ گھڑی میں ماشہ تھے۔ محسن الملک نے ان کی اطاعت و فرمانبرداری میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی حتی الامکان یہ بھی کوشش کی کہ سید محمود کے ساتھ مل کر کام کریں لیکن سید محمود کی حالت مزاج، کالج کے کاموں کو بہ آسانی چلنے نہیں دے رہی تھی۔ محسن الملک، ان کے جال میں بری طرح پھنس کر رہ گئے تھے۔ وہ سرسید کے بیٹے تھے اس لیے جا و بے جا مداخلت کو اپنا حق سمجھتے تھے۔ وہ جب نشے میں ہوتے تو کسی کی سننے کو تیار نہ ہوتے۔ ان کی اس حالت نے انگریز اسٹاف کو بھی ان سے بدظن کر دیا۔ کالج کے پرنسپل مسٹر بیک نے ٹرسٹیوں کو نوٹس دے دیا۔

"میں نے مصمم ارادہ کر لیا ہے کہ ٹرسٹی یا تو محمود کو رکھیں گے یا مجھے۔"

مسٹر بیک کا انتقال ہو گیا اور ان کی جگہ مسٹر ماریسن آئے تو انہوں نے بھی صاف کہہ دیا جب تک مسٹر محمود کو معزول نہیں کیا جاتا وہ یہ عہدہ قبول نہیں کریں گے۔

سید محمود کو پریذیڈنٹ شپ سے ہٹا دیا گیا اور وزیٹر بنا دیے گئے۔ اس طرح سید محمود کی مداخلت عملاً ختم ہو گئی اور نواب محسن الملک کام کرنے کے لیے آزاد ہو گئے۔

یہ کام آسان نہیں تھا۔ جہاز ڈوب چکا تھا اسے باہر نکالنا تھا۔ سرمائے کی کمی، ٹرسٹیوں کی عدم توجہی، اسٹاف کی خود سری یہ سب ایسے خطرات تھے جن سے بہ حیثیت سیکریٹری محسن الملک کو نبرد آزما ہونا تھا۔ ہوا مخالف تھی اور سفر ضروری تھا۔ ٹرسٹیوں سے اُمید نہیں کی جاسکتی تھی کہ وہ سیکریٹری کی مدد کریں۔

محسن الملک دن رات کام کر رہے تھے لیکن انہیں جادو نہیں آتا تھا کہ تمام کام ایک ساتھ حل کر دیں۔ اسٹاف خصوصاً انگریز اسٹاف ان کے لیے مصیبت بنا ہوا تھا جو تنخواہوں میں اضافے پر اصرار کر رہا تھا۔ اسے اس سے غرض نہیں تھی کہ کالج کی مالی حالت کیا ہے۔ طلبہ کے ساتھ بھی ان کا رویہ ناروا ہوتا جا رہا تھا جس سے طلبہ میں بے چینی بڑھ رہی تھی۔

وقت کے ساتھ ساتھ ہندوستان کی سیاست بھی کروٹیں لے رہی تھی۔ ان حالات کا اثر کالج پر بھی پڑ رہا تھا۔ محسن الملک کو اس سے بھی نبرد آزما ہونا پڑ رہا تھا۔ جب صوبہ متحدہ کی نگرانی سر انٹونی میگڈانلڈ کے ہاتھ میں آئی اور انہوں نے صوبے کا چارج لیا تو مشکلات مزید بڑھ گئیں اور ایک لحاظ سے محسن الملک کو سیاست میں داخل ہونا پڑا۔

سر انٹونی میگڈانلڈ کی حکومت نے 1900 (اپریل) کو سرکاری دفاتر میں دیوناگری حروف جاری کرنے کا ریزولیشن پاس کیا۔ ہندی رسم الخط سرکاری کاموں میں ضروری قرار دینے سے مسلمانوں میں سخت بے چینی پیدا کر دی۔ محسن الملک نے قومی نقطۂ نظر سے اس کے خلاف احتجاج کرنے میں نمایاں حصہ لیا۔

محسن الملک کی کوٹھی پر ایک مختصر جلسہ تعلیم یافتہ اصحاب کا منعقد ہوا۔ اس میں یہ طے کیا گیا کہ علی گڑھ اور دیگر اضلاع کے مسلمانوں کی ایک میٹنگ بلائی جائے اور اس میں گورنمنٹ کے اس ریزولیشن پر غور کیا جائے چنانچہ ایک جلسہ علی گڑھ کالج میں منعقد ہوا۔ اس جلسے میں محسن الملک نے نہایت زوردار تقریر کی۔ اس ریزولیشن کے مضر پہلوؤں کی طرف توجہ دلائی اور مشورہ دیا کہ مسلمانوں سے صلاح مشورہ کر کے گورنمنٹ میں پیش کرنے کے لیے یادداشت تیار کی جائے۔ محسن الملک نے اس یادداشت کو تیار بھی کیا اور پیش بھی کیا اور بہ مقام لکھنؤ ایک جلسے کا انعقاد بھی قرار دیا۔

ابھی یہ جلسہ ہوا نہیں تھا کہ سر میگڈانلڈ نے اس کا نوٹس لے لیا۔ ان کی ناراضی کو دیکھتے ہوئے محسن الملک نے انہیں

لکھا کہ وہ نینی تال آکر وضاحت پیش کرنا چاہتے ہیں۔ میکڈانلڈ اتنے خفا تھے کہ انہیں حاضری کی اجازت بھی نہیں دی۔ وہ اس سے اتنے ناراض تھے کہ محسن الملک کا خطاب بھی انہیں گوارا نہیں تھا۔ انہوں نے بھرے جلسے میں کہا کہ حیدرآباد کی ملازمت ترک کرنے کی وجہ سے خطاب اب قابل تسلیم نہیں رہا۔

اس خفگی کا نتیجہ نہ جانے کیا نکلتا کہ تائید غیبی کام آگئی۔ میکڈانلڈ رخصت ہوئے اور سرجیمس لاٹوش نے حکومت صوبہ متحدہ کا چارج لے لیا۔ یہ شخص سرسید کے مشن اور مسلمانوں کی تعلیم سے حقیقی دلچسپی رکھتا تھا۔ سرجیمس سے بڑی امیدیں تھیں۔ انہوں نے صاف کہہ دیا تھا کہ یہ کالج گورنمنٹ کا کالج نہیں۔ اس کی خودمختاری بدستور اسی طرح رکھی جائے جیسی کہ سرسید کے زمانے میں تھی۔ میں اور میرے جانشین اس کی ترقی میں دل سے متوجہ رہے ہیں۔

ابھی کالج کی مشکلات ختم نہیں ہوئی تھیں کہ اس پر ایک اور حملہ ہوگیا۔ گورنمنٹ کی طرف سے ایک اسکیم پیش کی گئی جس کے تحت لوکل حکومتوں کو تعلیم کے لیے کچھ روپیا دیا۔ صوبہ متحدہ کی گورنمنٹ نے اسے بنارس ہندو کالج میں سنسکرت محمڈن کالج میں عربی تعلیم کے لیے اور الہ آباد میں سائنسی تعلیم کے لیے دیا جانا تجویز کردیا۔ اس اسکیم نے مسلمان ماہرین تعلیم میں ایک ہیجان پیدا کردیا۔ خیال یہ ہوا کہ اس وقت جو کوششیں کالج کے استحکام کے لیے ہورہی ہیں ان میں رکاوٹ آئے گی۔ نیز مسلمانوں میں تفرقہ پڑجائے گا۔

محسن الملک نے اس اسکیم کی مخالفت میں نہایت توانا آواز بلند کی۔ وہ عربی زبان کی تعلیم کے مخالف نہیں تھے اور نہ ہوسکتے تھے لیکن ان کے مطابق یہ وقت مناسب نہیں تھا۔ انہوں نے اس اسکیم کے خلاف ایک مدلل مضمون تحریر کیا۔

''اس وقت مسلمانوں کی جو توجہ انگریزی تعلیم کی طرف ہو چلی ہے وہ پھر جائے گی اور ایسی حالت میں جب کہ اس وقت کالج کے پاس اتنا سرمایہ بھی نہیں ہے کہ اس کی آمدنی سے ایک صیغہ کا خرچ بھی چل سکے۔ عمارتیں غیر مکمل ہیں۔ کوئی اچھا کتب خانہ تک نہیں تو کیونکر ممکن ہے کہ عربی تعلیم کے لیے ایسا سرمایہ جمع کرنے کی کوشش بارآور ہوسکے جو اب تک انگریزی تعلیم کے لیے بھی میسر نہیں۔''

اس ایک مضمون تک محدود نہیں۔ وہ تواتر سے مضامین لکھتے رہے لیکن یہ اتنا اہم اور پیچیدہ مسئلہ تھا کہ عرصہ تک وہ اس گتھی کو سلجھاتے رہے۔ مسئلہ یہ تھا کہ ٹرسٹی گورنمنٹ کے خوف سے آزادرائے دیتے ہوئے ہچکچاتے تھے۔ آغاخان کی تائید نے محسن الملک کو اور بھی کمزور کردیا۔ انہوں نے دھمکی دے دی کہ اگر یہ اسکیم قبول نہ کی گئی تو وہ اپنی امداد بند کردیں گے۔ محسن الملک نے اس دھمکی کی بھی پروا نہیں کی بالآخر سرجیمس نے مداخلت کی۔ محسن الملک کی وکیل کو سمجھا۔ گورنمنٹ کی پالیسی میں تبدیلی آگئی۔ ہزآنر بہ نفس نفیس کالج میں تشریف لائے اور ان غلط فہمیوں کو دور کیا جو گورنمنٹ کی حمایت تعلیم عربی سے پیدا ہورہی تھی۔

انہوں نے صاف کہہ دیا۔ ''انگریزی تعلیم کو کم کرکے عربی تعلیم قائم کرنے کا کوئی ارادہ نہیں۔''

اس قضیے سے نمٹنے کے بعد ایک مرتبہ پھر محسن الملک کالج کی بہتری کے لیے اقدامات اٹھانے کی طرف راغب ہوگئے۔

کالج کے سابق طلبہ کی کالج کے ساتھ دلچسپی قائم رکھنے کے لیے اولڈ بوائز ایسوسی ایشن قائم کی۔ سابق طلبہ کو انتظامات کالج میں شریک کیا۔ یہ جماعت روز بروز مضبوط ہوتی گئی۔ سابق طلبہ بڑے بڑے عہدوں پر متمکن ہو چکے تھے۔ ان سے کالج کو بڑے مالی فوائد ہوئے۔

ڈاکٹر ضیاء الدین جو اس وقت لندن میں تعلیم پارہے تھے ان کے ذریعے ایک اورینٹل علی گڑھ کالج ایسوسی ایشن قائم کرائی۔ اس کے تحت جلسے ہوتے تھے جن میں علی گڑھ کے مقاصد کی تبلیغ ہوتی تھی۔ ان جلسوں میں ہندوستان کے پینشن یافتہ انگریز اور ہندوستانی طلبہ اور وہ معزز اصحاب جو انگلستان میں مقیم تھے شرکت کرتے رہے۔

اس ایسوسی ایشن سے کالج کو کوئی مالی فائدہ نہیں پہنچا لیکن یہ فائدہ کچھ کم نہیں تھا بلکہ مالی فوائد سے زیادہ تھا کہ لندن میں علی گڑھ کالج کی تبلیغ ہوتی رہی۔

محسن الملک کا سب سے بڑا کارنامہ آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کا دائرہ کار بڑھانا تھا۔ اس انجمن کا قیام اگرچہ سرسید کے ہاتھوں ہو چکا تھا لیکن سرسید نے اسے ممالک متحدہ و پنجاب تک محدود رکھا تھا۔ محسن الملک نے وقت کے تقاضوں کو مدنظر رکھتے ہوئے اس کی سرگرمیوں کو تمام ہندوستان کو محیط کردیا۔ یہ اجلاس نہ صرف تعلیمی بیداری کا باعث بنے بلکہ مالی فوائد کا سبب بھی بنے۔

سرسید کی بڑی آرزو تھی کہ ایک اجلاس ممبئی میں بھی ہو لیکن وہ اس میں کامیاب نہیں ہوسکے تھے۔ محسن الملک نے

ان کی یہ آرزو بھی پوری کر دکھائی۔

اس اجلاس میں مالی طور پر تو چنداں فائدہ نہیں ہوا لیکن ایسی بنیاد قائم ہوگئی جو آگے چل کر مالی فوائد کا سبب بنے۔ اس کے برعکس لکھنو میں ہونے والی کانفرنس میں عطیات کی بارش ہوگئی۔ ایک لاکھ سے زیادہ کا چندہ وصول ہوا۔ محسن الملک کی تقریریں ہر جگہ موثر و مفید ثابت ہوئیں۔

محسن الملک تعلیم نسواں کے زبردست حامی تھے۔ اب زمانہ بھی کہہ رہا تھا کہ عورتوں کو بھی پڑھنا لکھنا چاہیے۔ ہر چند کہ ہندوستان کے مسلمانوں میں اب بھی لڑکیوں کی تعلیم کو اچھا نہیں سمجھا جاتا تھا محسن الملک نے علی گڑھ میں ایک زنانہ اسکول قائم کیا اور اس کے لیے محسن الملک کی توجہ دلانے پر فرمانروائے بھوپال نے بارہ سو روپے ماہوار کی گرانٹ عطا فرمائی۔

بوڑھے محسن الملک اتنا کام کر رہے تھے کہ سرسید کی جوانی یاد آجاتی تھی۔ اب انہوں نے کالج کو اس معیاری درجے تک پہنچا دیا تھا کہ مہمانوں کی آمد پر خفت اٹھانی نہ پڑے۔ وہ فخر سے کہہ سکیں کہ جو سرمایہ انہوں نے بذریعہ چندہ اکٹھا کیا یا ان حضرات نے دیا وہ اپنی زبان سے اپنے ہونے کا اقرار کر رہا ہے۔ یہ بھی سرسید کی روایت تھی جسے محسن الملک نے زندہ کیا۔ لارڈ کرزن اور نواب صاحبان رام پور اور مہاراجا اندور کالج میں تشریف لائے۔

سر جیمس لاٹوش کی آمد کالج کا ایک یادگار واقعہ تھا۔ کالج کی آراستگی دیکھنے سے تعلق رکھتی تھی۔ ان کے ہاتھوں نظام میوزیم اور آسمانی منزل کا افتتاح کرایا گیا۔ ایڈریس پیش کیا گیا۔ اس کے بعد عربی کی اعلیٰ تعلیم کے لیے چندوں اور وظیفوں کا اعلان ہوا۔ اسٹریچی ہال تالیوں سے گونجتا رہا۔

وہ دن بھی محسن الملک کی محنت کی اجرت کا دن تھا جب پرنس آف ویلز ولی عہد سلطنت برطانیہ مع پرنسز آف ویلز کالج کے معائنے کے لیے آئے۔ اس موقع پر ہز رائل ہائی نیس کی منظوری سے ایک سائنس اسکول حضور ممدوح کے نام سے موسوم ہو کر قائم ہوا۔ اس اسکول کے لیے ممبئی کے مشہور فیاض تاجر سر آدم جی پیر بھائی نے ایک لاکھ اور ہز ہائی نیس آغا خان اور راجا صاحب محمود آباد نے 35,35 ہزار چندہ دیا۔

ان حضرات کی آمد بتا رہی تھی کہ انہوں نے محسن الملک کی کاوشوں کو تسلیم کر لیا ہے اور اس کالج کو اس قابل سمجھنے لگے ہیں کہ اپنے قدموں کی رونق بخشیں۔

مولوی مہدی علی خان محسن الملک جس وقت مستقل قیام کے لیے علی گڑھ آئے اور قومی تعلیم کا بوجھ اپنے کاندھوں پر رکھا یہ دراصل حیدر آباد کی پُرمشقت ملازمت کے بعد آرام لینے کا زمانہ تھا لیکن انہوں نے کالج اور قوم کی خاطر کام شروع کر دیا۔ طوفانی دورے کیے۔ مخالفوں کو موافق بنایا۔ اجلاس منعقد کیے، کالج کی مالی حالت کو بہتر بنایا اور اس کالج کو ایسا بنا دیا کہ بیرونی مہمانوں کو فخر کے ساتھ دکھا سکیں مگر کام ایسا ہی تھا جو وہ نہ کرتے تو شاید کوئی بھی نہ کر پاتا۔ انہوں نے کالج کو یونیورسٹی بنانے کا خیال ہر مسلمان کے دل میں پیدا کر دیا۔

ان کی کوششوں ہی کا نتیجہ تھا کہ طلبہ کی تعداد اچانک بڑھ گئی۔ انہوں نے نہ صرف چندے کی اپیلیں کیں بلکہ جہاں بھی گئے وہاں کے روسا امراء اور عام لوگوں کو اپنی اولاد کو کالج میں داخل کرانے کی ترغیب بھی دی چنانچہ سابق راجا نا کپور، نوابان مرشد آباد، ڈھاکا، سورت، منگرول کے خاندانوں کے لڑکوں نے داخلے لیے۔ برما، کلکتہ، میسور، حیدر آباد، بمبئی، سندھ اور بلوچستان کے طلبہ بھی داخل ہونے لگے اور یہ تعداد ہر سال بڑھتی ہی چلی گئی۔

پرنس آف ویلز کی آمد کی یادگار میں سائنس اسکول بھی قائم ہوا۔ مشرقی علوم وفنون کی ترقی کے لیے اعلیٰ پیمانے پر عربی شاخ کا انتظام کیا گیا۔

کالج کی وہ عمارتیں جو سرسید کے زمانے میں ادھوری رہ گئی تھیں انہیں مکمل کرایا۔ بعض نئی عمارتیں بھی تعمیر کرائیں۔

علماو مشائخ علی گڑھ کالج کی طرف سے بے حد وحشت زدہ تھے جب کہ عوام پر ان کا بہت اثر تھا۔ اس طبقے کو ہم نوا بنانا بہت مشکل تھا۔ محسن الملک ان کی غلط فہمیاں دور کرنے میں برابر مشغول رہے۔ وہ اس کوشش میں پورے طور پر تو کامیاب نہیں ہوئے لیکن جو مخالفت پہلے تھی اس میں کمی آگئی بلکہ مولانا شاہ سلیمان پھلواری نے تو محسن الملک کے ہمراہ رنگون تک جا کر عملی ہمدردی کا بھی ثبوت دیا۔ دیگر علماء نے بھی ان کی مساعی کو قابلِ ذکر ٹھہرایا۔ جب تک سرسید زندہ رہے علماء ان سے بدظن ہی رہے۔ محسن الملک نے اس نفرت کو محبت میں تبدیل کیا۔ مولانا عبدالباری فرنگی محلی (لکھنو) نے بالکل بجا لکھا۔

”سرسید کی مذہبی فروگزاشت سے زیادہ ہمارے اکابر کو ان کی سیاست سے بے گانگی تھی۔ ان کے استقلال

طبع کے باعث جو خود رائی تھی اس کا تدارک ناممکن تھا اس وجہ سے اکثر مواقع پر تنفر ہو جاتا تھا۔ اس کے دفاع میں نواب سید مہدی علی خان صاحب کے ایسے صلح جو اور متاثر مزاج شخص کی ضرورت تھی اور خدا کی حکمت نے انہیں انتخاب کیا تھا۔''

نواب محسن الملک جب کالج ہی کی کسی خدمت کے سلسلے میں میرٹھ پہنچے تو انہیں مدرسہ مظاہر الاسلام (سہارن پور) کی طرف سے جلسہ تقسیم انعام میں شرکت کی دعوت دی گئی۔ یہ بھی ایک کرامت ہی تھی کہ انہیں ایک اسلامی مدرسے میں مدعو کیا جا رہا تھا جب کہ وہ سرسید کی نیابت کر رہے تھے جن سے علماء کے تعلقات کبھی خوشگوار نہ رہے اور یہ تاثر عام تھا کہ علما علی گڑھ کالج اور انگریزی تعلیم کے خلاف ہیں۔

محسن الملک نے اس دعوت کو بڑی خوشی سے قبول کیا اور سہارن پور تشریف لے گئے۔ جلسے میں علمائے دیوبند بھی موجود تھے۔ محسن الملک کا نہایت شاندار استقبال کیا گیا۔ نہ صرف یہ بلکہ انہیں جلسے کا صدر بنایا گیا۔ علمائے دیوبند کی موجودگی میں یہ اعزاز کم نہ تھا کیونکہ وہ مسلکی اعتبار سے بھی الگ تھے پھر بھی انہیں جو تہنیت نامہ پیش کیا گیا اس میں ان کے تعریفی کلمات کے ساتھ ساتھ اس تاثر کی بھی تردید کی گئی کہ ارباب مدارس اسلامیہ انگریزی تعلیم کو برا سمجھتے ہیں۔

یہ وہ کامیابیاں تھیں جو وہ حاصل کرتے جا رہے تھے اور جن کا براہِ راست فائدہ کالج اور سرسید مشن کو پہنچ رہا تھا۔

ان کی پذیرائی صرف محبانِ اسلام ہی میں نہیں ہو رہی تھی بلکہ انگریزی گورنمنٹ بھی ان کی معترف ہوئی اور ان کی خدمات اور ملکی کاموں کی قدر دانی کے اعتراف میں انہیں 1906ء میں ''قیصرِ ہند'' کے طلائی تمغے سے نوازا گیا۔ یہ ان کے متوازن مزاج کا ثبوت ہے کہ ہر طبقہ خیال تک ان کی رسائی تھی۔

ہز آنر سر جیمس بذاتِ خود علی گڑھ آئے اور اپنے ہاتھوں سے یہ تمغا انہیں پہنایا۔

''یہ عزت صرف ان لوگوں کو ملتی ہے جو اپنے ہم عصر لوگوں کی بے لوث خدمت کرتے ہیں اور نہایت خلوص کے ساتھ ہندوستان کی فلاح کے لیے اپنے کو وقف کر دیتے ہیں۔ سرسید کی وفات کے بعد سے میں نے مولوی سید مہدی علی خان کے کارناموں کو بہ غور دیکھا ہے اور مجھ کو معلوم ہے کہ ان کی جانفشانی، خوش بیانی اور صائب رائے کالج کی غیر معمولی ترقی کی کس قدر باعث ہوئی ہے۔''

☆......☆......☆

طلبہ اور یورپین اسٹاف کے درمیان تعلقات کشیدہ چلے آ رہے تھے۔ انگریز پروفیسر اپنے ہم منصبوں تک کو اہمیت نہیں دیتے تھے تو طلبہ کس گنتی میں۔ ٹرسٹیوں اور ہندوستانی اسٹاف نے بہت کوشش کی کہ یہ تعلقات بگاڑ کی طرف نہ جائیں لیکن یہ کشیدگی بڑھتی ہی چلی گئی۔ طلبہ کے پاس انگریز پروفیسروں کے خلاف شکایتوں کے انبار لگ گئے۔ طلبہ نے نہایت صائب اور مؤدبانہ طریقہ استعمال کیا۔ اپنی شکایت پر مبنی درخواست لکھی اور ایک طالب علم سید مصطفیٰ حسین کے ذریعے پرنسپل تک پہنچا دی۔ پرنسپل نے اس درخواست پر غور کرنے کی بجائے اسے بے عزت کر کے دفتر سے نکال دیا۔

طلبہ اس واقعے کو بھی کڑوے گھونٹ کی طرح پی

گئے۔

کچھ دن بعد ایجوکیشنل کانفرنس کی سینٹرل اسٹینڈنگ کمیٹی کا اجلاس ہوا جس میں طالب علم مصطفیٰ حسین بھی شریک تھا۔ پرنسپل کی نظر اس پر پڑی تو عین جلسے میں اس طالب علم کو لتاڑا۔

''میں یا مصطفیٰ حسین دونوں میں سے کوئی ایک میٹنگ سے چلا جائے۔''

جلسہ گاہ میں سناٹا پھیل گیا۔ پھر سب نے دیکھا کہ مصطفیٰ حسین اپنی جگہ سے اٹھا اور جلسہ گاہ سے نکل گیا۔ یہ طلبہ کی سخت بے عزتی تھی جب کہ مصطفیٰ حسین کا کوئی جرم نہیں تھا۔

انگریز پرنسپل نے صرف یہی نہیں کیا بلکہ مصطفیٰ حسین کو کالج اور بورڈنگ سے بھی خارج کر دیا۔

کسی نے کوئی احتجاج نہیں کیا۔ ہندوستانی پروفیسر چپ سادھے بیٹھے رہے اور کچھ دیر کے بعد جلسے کا دوبارہ آغاز کر دیا گیا۔

اس واقعے نے طلبہ کو سخت مشتعل کر دیا تھا لیکن محسن الملک کے سمجھانے بجھانے پر طلبہ نے کوئی قدم اٹھانے سے گریز کیا۔ البتہ انہیں یہ یقین ہو گیا کہ اسٹاف اور ٹرسٹیوں میں سے کسی کو ان کے ساتھ ہمدردی نہیں۔ بے اعتمادی کا یہ زہر ان کی رگوں میں اترتا چلا گیا۔ طلبہ خاموش ہو گئے تھے لیکن جھنجلائے ہوئے تھے۔

طلبہ اور اسٹاف کی یہ رسہ کشی علی گڑھ سے باہر بھی نکلی اخبارات میں ایسے مضامین شائع ہوئے جو طلبہ کے حق میں اور انگریز پرنسپل کے خلاف تھے۔ اس سے پرنسپل کے دل میں مزید بدگمانیاں پیدا ہوئیں۔ اس کے خیال میں یہ مضامین باقاعدہ منصوبے کے تحت لکھوائے جا رہے ہیں۔ دوسری جانب طلبہ کو حوصلہ مل رہا تھا کہ وہ حق پر ہیں اور ان کے ساتھ ناانصافی کی جا رہی ہے۔ بددلی تھی کہ روز بہ روز بڑھتی جا رہی تھی اور کوئی ان پر قابو پانے والا نہیں تھا۔

سرسید کے آخری دنوں میں جو حالات رونما ہوئے تھے اس سے ٹرسٹیوں کا اثر انگلش اسٹاف کے دلوں سے زائل ہو گیا تھا جو اب تک بحال نہ ہو سکا تھا۔ محسن الملک نے جب کام سنبھالا تو وہ بھی کالج کی بیٹھتی ہوئی دیوار اٹھانے میں مشغول رہے۔ انہیں اتنی اُمید بھی نہیں تھی کہ اگر کوئی وقت پڑا تو ٹرسٹیوں کی جماعت ان کی مدد کرے گی لہٰذا وہ کالج اور قوم کے بہترین مفاد میں چشم پوشی کرتے رہے اور

انگلش اسٹاف اپنی من مانی کرتا رہا۔ اپنی شرائط منواتا رہا۔ طلبہ کی برہمی کالج کے اس خراب نظم و نسق کا نتیجہ تھی جو برابر بڑھتی جا رہی تھی۔ پرنسپل کی ناعاقبت اندیشی نے اس آگ کو بالکل ہی بے قابو کر دیا۔

علی گڑھ میں سالانہ نمائش لگا کرتی تھی۔ اس وقت طلبہ کی کوئی اور تفریح تو تھی نہیں۔ سال بھر اس نمائش کا انتظار کیا کرتے تھے اور جب نمائش لگتی تھی تو خاص طور پر جتنے اقامتی طلبہ ہوتے تھے جمع ہو کر نمائش کا رخ کیا کرتے تھے۔ ان طلبہ کے دم سے نمائش میں خوب رونق ہوا کرتی تھی۔

فروری 1907ء کی نمائش تھی۔ طلبہ کا ایک گروہ مختلف اسٹالوں کو دیکھتا ہوا آگے بڑھتا جا رہا تھا۔ ایک طالب علم راجا غلام حسین اور پولیس کے ایک سپاہی کے درمیان جھگڑا ہو گیا۔ کچھ لوگ بیچ میں پڑے اور جھگڑا ختم ہو گیا۔ کسی نے یہ سوچا ہی نہیں تھا کہ جھگڑا ابھی ختم نہیں ہوا۔ اس سپاہی کا غصہ ابھی رفع نہیں ہوا تھا۔ اس نے اس جھگڑے کی اطلاع اپنے افسروں کو دی اور طالب علم کا نام بھی بتایا۔ دوسرے دن سپرینٹنڈنٹ پولیس کالج میں آیا اور پرنسپل سے ملاقات کی۔ پرنسپل کو چاہیے تو یہ تھا کہ اپنے طالب علم کا دفاع کرتا یا کم از کم اتنا تو کرتا کہ غلام حسین کو بلا کر احوال معلوم کرتا۔ کچھ اور لڑکوں کو گواہی کے لیے طلب کرتا لیکن اس نے بغیر کسی چھان بین کے غلام حسین کو کالج سے نکال دیا۔ طلبہ غلام حسین کو بے قصور سمجھتے تھے۔ انہوں نے ایک وفد ترتیب دیا۔ اس وفد نے پرنسپل سے ملاقات کی اور اصرار کیا کہ وہ غلام حسین کو نہیں بلکہ اس سپاہی کو سزا دلوائیں جس نے جھگڑے میں پہل کی تھی اور بھری نمائش میں غلام حسین کو زدوکوب کیا تھا۔ پرنسپل نے اس درخواست کو پائے حقارت سے ٹھکرا دیا۔ وہ اس وقت دانش مندی کا مظاہرہ کر سکتا تھا، ان کا غصہ ٹھنڈا کرنے کے لیے ان سے کچھ وعدے کر لیتا لیکن اس نے ان طلبہ کی تذلیل کی۔

غصے میں بھرے ہوئے طلبہ نے اسٹرائیک کر دی۔ محسن الملک اتفاق سے علی گڑھ ہی میں تھے۔ انہوں نے جو سنا تو چند ٹرسٹیوں کو لے کر طلبہ یونین کے سیکریٹری کے پاس گئے اور اس سے مذاکرات کیے۔

''کیا تم یہ نہیں دیکھتے کہ میں بذات خود تمہارے پاس چل کر آیا ہوں۔ پھر تم میری بات نہیں مانو گے؟''

''ہم آپ کی بہت عزت کرتے ہیں لیکن ہم یہ بھی نہیں چاہتے کہ انگریز پروفیسر اس کالج کو اپنی جاگیر سمجھیں۔

یہاں کے فیصلے ٹرسٹیوں کو کرنے دیجیے یا آپ کہیے یہ انگریز پرنسپل کون ہوتا ہے۔ اوّل تو یہی غلط ہے کہ حکومت پرنسپل شپ کے لیے اپنا نمائندہ بھیجتی ہے۔''

''میرے بچو! تمہیں نہیں معلوم کہ ہم کس حکمت کے ساتھ اس ادارے کو زندہ رکھے ہوئے ہیں۔ ہندوستان پر ان کی حکومت ہے۔ ہم کب تک ان سے ٹکر لیں گے۔''

''یہ کالج ہمارے ہم وطنوں کے چندے سے چلتا ہے۔ چندہ جمع کرنے آپ جاتے ہیں یہاں کا انگریز اسٹاف نہیں جاتا۔ ہم ان کا نہیں آپ کا حکم مانیں گے۔''

''تو پھر میرا حکم مان لو۔ یہ اسٹرائیک ختم کردو۔ میرے لیے یہ سوہانِ روح ہے کہ میں جن بچوں کے لیے چھت مہیا کررہا ہوں وہ ناخوش ہوں اور اسٹرائیک پر اتر آئیں۔ باہر کتنی بدنامی ہوگی کہ مہدی علی جس ادارے کے لیے ہماری جیبیں خالی کرا رہا ہے کالج کا نظم و نسق بھی ٹھیک نہیں کرسکتا۔''

''اسٹرائیک ختم کردینے سے کیا ہوگا۔ کیا انگریز پروفیسر کلاسوں میں اور کلاسوں سے باہر ہماری تذلیل کرنے سے رک جائیں گے؟ نہیں بلکہ وہ تو اور شیر ہو جائیں گے اب تو ہمارا ایک ہی مطالبہ ہے انگریز اسٹاف کو نکال باہر کرو۔ ہم اس وقت تک کلاسوں میں نہیں جائیں گے۔ ہماری اسٹرائیک میں مزید شدت آجائے گی۔''

''تم سب کیوں میری جان کے دشمن بن گئے ہو۔ میں تم سے وعدہ کرتا ہوں کہ میں ان معاملات کو ٹرسٹیوں کے سامنے اٹھاؤں گا اور یورپین اسٹاف کے بڑھتے ہوئے اقتدار کو کم کردوں گا۔''

''اس وقت ہمارا ایک ہی مطالبہ ہے کہ غلام حسین کی سزا معاف کی جائے۔''

''اس وقت مصلحت کا تقاضا یہ ہے کہ تم لوگ غلام حسین کی سزا مان لو اور اپنی طرف سے بلا شرط معذرت کرلو۔ اب کسی کو سزا نہیں دی جائے گی۔''

ان کی اس یقین دہانی پر طلبہ نے اسٹرائیک ختم کردی۔ ایک معذرت نامہ لکھ کر پرنسپل کی خدمت میں پیش بھی کردیا۔

ابھی ایک ہفتہ بھی نہیں گزرا تھا کہ پرنسپل نے چھ اور طلبہ کو کالج چھوڑنے کا حکم دے دیا۔ اس نئے حکم نامے کے جاری ہوتے ہی پانی سر سے اونچا ہوگیا۔ طلبہ نے محسن الملک کو ان کا وعدہ یاد دلایا۔

مملکت State

ایک کثیر التعداد انسانی آبادی جو کسی خاص خطۂ زمین کے اندر مستقل طور پر سکونت پذیر ہو نیز بیرونی اقتدار سے آزاد ایک باقاعدہ منظم حکومت کے تحت ہو اور قریباً قریباً سب باشندے اس کا حکم مانتے ہوں۔ آبادی، خطہ، زمین، حکومت اور خود مختاری یہ چار چیزیں مملکت کے لیے لازمی شرط ہیں۔ ان میں سے ایک کی عدم موجودگی سے بھی مملکت معرض وجود میں نہیں آسکتی۔

مرسلہ: نادر مرزا۔ راولپنڈی

''آپ نے وعدہ کیا تھا کہ اب کسی طالب علم کو سزا نہیں دی جائے گی۔''

محسن الملک نے اپنی بے بسی ظاہر کی اور طلبہ نے کالج بند کردیا۔

اس کالج کے لیے ستر ٹرسٹیوں کی ایک بااثر جماعت موجود تھی۔ اس جماعت میں جس طبقے کا بڑا عنصر تھا اس وقت اس سے یہ امید ہی نہیں ہوسکتی تھی کہ انگلش اسٹاف کے خلاف اگر کوئی کارروائی کرنی پڑے گی تو وہ سیکریٹری کا ساتھ دے گی۔ اگر محسن الملک کوئی قدم اٹھاتے بھی تو ٹرسٹیز دو حصوں میں تقسیم ہو جاتے جو کالج کے لیے مزید نقصان دہ ہوتا اسی لیے وہ بے بس ہوگئے لیکن کالج نے جو وقار حاصل کیا تھا وہ اس شورش کے ہاتھوں خاک میں ملتا ہوا دیکھ کر ان کا دل بیٹھ گیا۔

اسٹاف کو اب بھی اس شورش میں اپنی غلطی نظر نہیں آرہی تھی بلکہ ان کے نزدیک کوئی ایسی بات تھی ہی نہیں جس کی شکایت طلبہ کو کرنی چاہیے تھی۔ جب مرض کا احساس ہی نہ ہو تو علاج کیا ہو۔ وہ تو اس اسٹرائیک کو سیاست کا شاخسانہ سمجھ رہے تھے۔ کم از کم حکومت کو انہوں نے یہی باور کرایا۔

چند کانگریسی اخبار یونین میں آتے ہیں۔ ان کے پڑھنے سے طلبہ کے قلوب اثر پذیر ہوتے ہیں اور اس کے ثبوت میں کانگریس لیڈروں کی وہ مالی امداد کی پیش کش ہے جو انہوں نے اسٹرائیک قائم رکھنے کے لیے طلبہ کو دی ہے یہ

کالج کے نظم ونسق کا معاملہ نہیں بلکہ ایک سیاسی معاملہ ہے۔ کالج کے طلبہ کو سیاست سے دور رہنا چاہیے۔

یہ ایک ناشائستہ الزام تھا جو طلبہ پر لگایا جارہا تھا۔ علی گڑھ کالج کے اکابرین نے طلبہ کو ہمیشہ سیاست سے دور رکھا تھا۔ محسن الملک خود بھی جب حیدر آباد سے ریٹائر ہو کر آئے تو بہ آسانی سیاست کا راستہ اختیار کر سکتے تھے لیکن انہوں نے قومی اصلاح اور تعلیمی خدمات کے لیے خود کو وقف کر دیا۔ اگر چند سیاسی آرٹیکل لکھے بھی تو اردو ہندی تنازع پر تھے۔ یہی ان کی سیاست تھی۔

طلبہ نے اپنے اوپر لگنے والے الزام کی بھرپور مخالفت کی اور ایک مفصل ٹیلی گرام کے ذریعے گورنمنٹ کو باور کرایا۔ محسن الملک کے خیالات ابتدا ہی سے کانگریس کے بارے میں اچھے نہیں تھے۔ ان طلبہ نے ان کا حوالہ بھی دیا تھا کہ ہم محسن الملک کے تربیت یافتہ ہیں اسی لیے کانگریسی لیڈروں کے دام میں کیسے آسکتے ہیں۔ یہ محض الزام ہے جو ہم پر تھوپا جارہا ہے۔

ان طلبہ نے محسن الملک سے بھی ملاقات کی اور انہیں یقین دلایا کہ ان کے سیاسی عزائم نہیں۔ یہ انگریزی اسٹاف کی سیاست کا شاخسانہ ہے کہ ہم پر یہ الزام لگایا جارہا ہے تاکہ ان کی کوتاہیاں دبی رہیں۔

اس شورش کی تحقیقات کے لیے ایک کمیشن قائم ہوا اور اس نے شکایات اور اسباب شورش کی تحقیقات کر کے یہ فیصلہ سنا دیا کہ اس شورش کا تعلق قطعی سیاسی نہیں۔ اس کمیشن نے ایسی تجاویز بھی دیں جن پر عمل کر کے طلبہ اور اسٹاف میں ہم آہنگی پیدا کی جاسکتی تھی۔

یہ کمیشن رخصت ہوا تو لیفٹیننٹ گورنر سر جان ہیوٹ کالج کا معائنہ کرنے کے لیے آئے۔ گورنر نے ایک مرتبہ پھر اس خیال کی تردید کی کہ یہ کوئی سیاسی واقعہ تھا۔ انہوں نے ٹرسٹیوں کو بھی ہدایت کی کہ وہ اس واقعے کے اسباب کو ختم کرنے کے لیے جرأت سے کام لیں اور یہ اُمید ظاہر کی۔

”برائی سے بھلائی جلوہ گر ہوگی اور موجودہ پریشانی سے نکل کر کالج اس خوش حالی سے جو اسے اب تک نصیب رہی نسبتاً زیادہ خوش حالی کے دور میں جنم لے گا۔“

گورنر کی آمد دل خوش کن تھی۔ گورنر نے حوصلہ افزائی بھی کی تھی اور ہمدردی بھی لیکن محسن الملک ان حالات سے اور ٹرسٹی حضرات کے رویے سے ایسے دل برداشتہ ہوئے تھے کہ انہوں نے ٹرسٹیوں کے سامنے استعفیٰ پیش کر دیا اور اس کی منظوری پر بے حد اصرار کیا۔

یہ خبر مشتہر ہوتے ہی صدہا خطوط انہیں موصول ہوئے جن میں استدعا کی گئی تھی کہ وہ اپنے فیصلے پر نظر ثانی کریں قومی اخبارات نے بھی اصرار کیا کہ وہ اپنا استعفیٰ واپس لے لیں۔

صرف مسلمانوں میں نہیں بلکہ اور بہت سے لوگوں میں نواب محسن الملک کے علی گڑھ کالج کے سیکریٹری شپ سے عنقریب مستعفی ہوجانے کی خبر بڑے افسوس کے ساتھ سنی جائے گی۔ نواب محسن الملک نے علی گڑھ کے لیے سخت کوششیں نہایت صداقت اور بے غرضی کے ساتھ کی ہیں۔ مسلمانوں کی تعلیمی ترقی ان کی سچی گرم جوشی کا نتیجہ ہے۔ ایک مدت دراز تک کام کرنے کے بعد جب زمانہ آرام کا تھا تو انہوں نے علی گڑھ کالج کا کام اپنے ذمے لیا۔ ہمیں اُمید ہے کہ نواب صاحب قبلہ ایک دفعہ پھر اس رائے پر نظر ثانی فرمائیں گے اور بدنصیب مسلمانوں کی کشتی کو طوفان خیز سمندر کے رحم پر چھوڑ کر علیحدہ نہیں ہوں گے۔“ (ٹائمز آف انڈیا)

اس موقع پر اولڈ بوائز کا جلسہ بھی ہوا۔ اس میں نئے اور پرانے طلبہ، اسٹاف اور ٹرسٹیوں کی طرف سے پُرجوش تقریریں ہوئیں۔ ان تقریروں کا خلاصہ یہ تھا کہ گزشتہ باتوں کو فراموش کیا جائے، رواداری اور اعتماد کی فضا کو برقرار رکھا جائے۔ طلبہ اور اسٹاف کے درمیان خوشگوار تعلقات قائم کیے جائیں۔

تمام شرکاء نے ان تجاویز پر عہد وپیمان کیے اور اجلاس ختم ہوا۔

محسن الملک کو استعفیٰ واپس لینا پڑا لیکن ان کے دل پر جو سخت چوٹ لگی تھی اس نے انہیں سنبھلنے نہیں دیا۔ ایسی مشکلات ان کے لیے نئی نہیں تھیں لیکن اب بڑھاپا تھا۔ اعصاب اس قابل نہیں رہے تھے کہ تکالیف برداشت کرتے۔ وہ بیمار ہوگئے۔ چونکہ بمبئی کی آب وہوا انہیں راس آگئی تھی اور یہاں طبیعت بحال ہوجاتی تھی لہٰذا وہ بمبئی چلے گئے۔ بخار نے یہاں بھی ساتھ نہیں چھوڑا۔ دکھ ایسا تھا کہ کم ہونے میں نہیں آتا تھا۔ دوستوں کے خطوط یہاں بھی پہنچ رہے تھے لیکن اس میں تاب تحریر نہیں تھی۔ وہ مایوسی کی اس منزل پر تھے جہاں انسان کو کوئی اپنا ہمدرد نظر نہیں آتا تاان کے ساتھ جو سلوک ہوا تھا وہ سب کو اس کا ذمہ دار ٹھہرا رہے تھے۔ کوئی ایسا نہیں تھا جس کے سامنے وہ اپنا دکھ بیان

کرتے۔ کرتے بھی تو کیوں کرتے۔

وہ دوستوں کے خطوط الٹ پلٹ کر دیکھ رہے تھے کہ ان کی نظر مولوی عبداللہ جان کے خط پر پڑی۔ مولوی صاحب کو وہ اپنا ہمدرد سمجھتے تھے۔ انہیں دکھ ہوا کہ اب تک ان کے خط کا جواب کیوں نہیں دیا۔ بہت دن بعد انہوں نے قلم اٹھایا اور مولوی عبداللہ جان (ٹرسٹی) کو خط لکھنے بیٹھ گئے۔

''عنایت نامہ پہنچا۔ میری طبیعت کا کیا حال پوچھتے ہو۔ آپ سب صاحب میری جان کے دشمن ہو کہ جو آپ نجات نہیں دیتے۔ آپ صاحبان سمجھ لیں کہ میرا رنج اور غم میری بیماری اب نہ جاوے گی جب تک میں کالج کا سیکریٹری رہوں گا۔ بہت گالیاں کھائیں بہت آفات سہے مگر اب نہ گالیاں کھانے کی طاقت ہے نہ اپنے معزز ٹرسٹیوں کی طرف سے باضابطہ ذلیل ہونے کی ہمت ہے اور نہ کالج کو جنگ و جدل کا اکھاڑا بنانا منظور ہے ورنہ میں بھی سینے میں دل اور منہ میں زبان اور ہاتھ میں قلم رکھتا ہوں۔ چپ چاپ گالیاں سننا اور اپنے آپ کو باضابطہ اور اعلانیہ ذلیل ہونا گوارا نہیں کرسکتا۔''

میں اس وقت ایک خاص وجہ سے مجبور ہوگیا۔ ورنہ اب میں ایک دن کے لیے بھی سیکریٹری رہنا منظور نہ کرتا اور اس کا مجھے رنج ہے اور سچ پوچھو تو یہی میری بیماری ہے اور میں بیماری کا شکرگزار ہوں کہ اس نے اس زمانے میں میری بڑی مدد کی اور گالیوں کے اکھاڑے میں آنے سے روکا۔

خدا میری بیماری کو میری مدد کے لیے قائم رکھے تاکہ سامنے گالیاں کھانے سے بچتا رہوں۔

وہ جب بھی بمبئی آتے تھے ان کی صحت بحال ہو جاتی تھی لیکن اس مرتبہ حالت جوں کی توں تھی۔ بخار میں کمی ضرور آگئی تھی لیکن جسم گھلتا جارہا تھا، کمزوری بے پناہ ہوگئی تھی۔ ڈاکٹروں نے کئی معائنوں کے بعد اپنی رائے کا اظہار کردیا۔

''دماغ کی حالت ایسی ہے کہ دو مہینے تک کوئی کام نہیں کرنا ہے۔ دل کی حرکت کمزور ہے۔ پھیپڑوں میں خون کا دورہ سست ہے۔ نبض کی رفتار اچھی طرح نہیں معلوم ہوتی۔ ان وجوہ سے ضروری ہے کہ ہفتے عشرے تک بستر سے علیحدہ نہ ہوں۔ اس کے بعد امتحان کیا جائے گا اور بستر سے جدا ہونے کی اجازت اس شرط کے ساتھ دی جائے گی کہ دو مہینے تک کسی پہاڑ پر رہیں اور جسمانی اور خاص طور پر دماغی محنت مطلق نہ کریں۔ اگر ایسا نہ کریں گے تو اندیشہ ہے کہ ہاتھوں کا رعشہ جو اس وقت موجود ہے ترقی پکڑ جائے گا اور لکھنے پڑھنے کے کام سے بالکل معذور کردے گا۔''

کچھ دنوں بعد ڈاکٹروں کی ہدایت پر عمل کرنے کی وجہ سے کچھ افاقہ تو ہوگیا لیکن ڈاکٹروں کا اب یہی مشورہ تھا کہ وہ کسی پہاڑی مقام پر جاکر کچھ دن آرام فرمائیں۔ انہوں نے شملہ جانے کا ارادہ کرلیا۔ ستمبر 1907ء کے آخری ہفتے میں علی گڑھ آئے تاکہ یہاں سے شملہ جا سکیں۔

وہ اس عمر میں بھی ہمیشہ تر و تازہ رہا کرتے تھے۔ کالج کے کاموں میں جوانوں کی طرح مشغول رہتے تھے لیکن اس مرتبہ ان کا چہرہ اداس تھا۔ نقاہت کے آثار نمایاں تھے۔

مولانا وحید الدین سلیم ان سے ملنے کے لیے آئے تو ان کی حالت دیکھ کر دنگ رہ گئے۔ بڑی دیر تک ادھر اُدھر کی باتیں ہوتی رہیں۔ زیادہ باتیں ماضی قریب کے واقعے یعنی طلبہ کی اسٹرائیک کے بارے میں ہوتی رہیں۔ محسن الملک اس واقعے سے سخت رنجیدہ تھے۔

مولوی وحید الدین سلیم نے ان سے پوچھا۔ ''اب تو تمام معاملات بخیر و خوبی نمٹ گئے۔ کیا اب بھی آپ کو کوئی شکایت ہے۔''

محسن الملک نے عجیب حسرت بھری آواز میں جواب دیا۔ ''مولانا! بظاہر کوئی شکایت نہیں مگر میں نہیں جانتا وہ کیا چیز ہے جو میرے اندر سے نکل گئی ہے۔ میرا دل بیٹھ گیا ہے اور اب کسی کام میں اور کسی بات میں لطف نہیں آتا۔''

مولانا وحید الدین نے انہیں تسلی دی۔ ''آپ شملہ تشریف لے جارہے ہیں۔ خدا کی ذات سے اُمید ہے کہ شملہ کی آب و ہوا آپ کو راس آئے گی اور اب کوئی شکایت باقی نہیں رہے گی۔''

''ہاں میں بھی یقین کرتا ہوں کہ شملہ پہنچ کر میری تمام شکایتوں کا خاتمہ ہوجائے گا۔'' محسن الملک نے کچھ دیر تامل کرنے کے بعد جواب دیا۔

وہ شملہ گئے۔ دو ہفتے تک تو حالت رو بہ اصلاح رہی لیکن پھر مرض نے زور باندھا۔ گردن، چہرہ، آنکھوں اور پیشانی پر ورم ہوگیا۔ یہ ورم اتنا شدید تھا کہ ورم کے بوجھ سے آنکھیں بند ہوگئیں۔ یورپین ڈاکٹروں نے دو مرتبہ عمل جراحی کیا لیکن کوئی فائدہ نہیں ہوا۔ ورم بڑھتا گیا اور دماغ تک اس کا اثر جا پہنچا۔ ڈاکٹر کے مطابق ان کا

خون زہریلا ہو گیا ہے۔ نیم بے ہوشی کی کیفیت طاری تھی مرنے سے ایک دن قبل انہوں نے دوستوں اور ملازموں کو جمع کیا۔

''مجھے اب زندگی کا اعتبار نہیں۔ آپ سب صاحب گواہ رہیں کہ میں صدق دل سے کلمہ اسلام پڑھتا رہا ہوں۔ میں نے جو کچھ قومی خدمات کی ہیں وہ نیک نیتی کے ساتھ ہیں۔ اگر ان کاموں میں کوئی غلطی ہوئی تو میں بے قصور ہوں کیوں کہ میری نیت ہر حال میں نیک تھی اور خدا میری نیکی کا شاہد ہے۔''

یہ ان کے آخری الفاظ تھے جو انہوں نے کسی سے کہے۔

16 ویں اکتوبر 1907ء کو شام چھ بجے ان کی روح عالم بالا کی طرف پرواز کر گئی۔

اس حادثے جانکاہ کی خبر راتوں رات پورے ہندوستان کو پہنچا دی گئی۔ وائسرائے ہند کو بھی اس کی اطلاع پہنچا دی گئی۔

صبح ہوتے ہی بہت سے لوگ اس کوٹھی کے سامنے جمع ہو گئے جہاں ان کا قیام تھا۔ جنازہ اٹھایا گیا۔ اگرچہ نماز جنازہ جامع مسجد میں ہونی تھی مگر ریل کا وقت قریب تھا اس لیے ایک وسیع میدان میں نماز پڑھائی گئی۔ کالج کے قائم مقام سیکریٹری کو اطلاع کر دی گئی کہ محسن الملک کی وصیت کے مطابق ان کی تدفین اٹاوہ میں ہو گی لہٰذا لاش اٹاوہ جائے گی۔

یہ اطلاع ملتے ہی ٹرسٹیوں نے فوراً ایک اجلاس کیا اور اس وصیت پر بحث کی گئی کہ ان کی میت اٹاوہ میں دفن کی جائے؟ اور مختصر سی بحث کے بعد یہ قرارداد پاس کی کہ ان کو کالج میں سرسید کے پہلو میں دفن کیا جائے نہ کہ اٹاوہ میں۔

''نواب محسن الملک کے جو بے شمار احسانات ہیں ان کے اعتراف کا بھی ایک طریقہ ہے۔ سرسید کے پہلو میں دفن کیے جانے کا حق ان کے سوا کسی کو نہیں۔''

''اگر مرحوم نے کوئی وصیت اٹاوہ میں دفن کیے جانے سے متعلق کی ہے تو اس کی وجہ غالباً یہ ہو گی کہ خان بہادر، زین العابدین کے دفن کیے جانے کے بعد یہ ریزولیشن پاس کر دیا گیا تھا کہ آئندہ کوئی شخص کالج میں دفن نہ کیا جائے۔ اس ریزولیشن کا علم نواب صاحب کو تھا اس لیے یہ وصیت کر دی ہو گی لیکن نواب مرحوم کی جو خدمات کالج کے لیے ہیں ان کے سامنے اس ریزولیشن کی کوئی حقیقت نہیں۔ ہماری بدقسمتی ہو گی اگر انہیں کسی اور جگہ دفن کیا جائے۔ وہ قوم کی امانت تھے اور ان کو دفن کیے جانے کی نسبت رائے دینے کا حق قوم کو ہے۔ اگر ان کے عزیزوں کو اس بات میں کچھ اختلاف ہو تو اس کی وجہ محض ان کے جذبات ہوں گے مگر یقین ہے کہ وہ بھی اس تجویز کو پسند کریں گے اور ہماری اس تحریک کی قدر کریں گے۔''

رات کے دو بج رہے تھے کہ کلکتہ میل ٹرین علی گڑھ اسٹیشن پہنچی۔ معززین شہر، ٹرسٹی حضرات اور طلبہ کی ایک بڑی تعداد موجود تھی۔ ٹرین نے جیسے ہی پلیٹ فارم کے قدم پکڑے لوگ دیوانہ وار ٹرین کی طرف دوڑے کہ ڈبے میں جا کر مرحوم کا آخری دیدار کر لیں کیوں کہ عام لوگوں کو ابھی معلوم نہیں تھا کہ کہاں دفن کیا جائے گا۔

انجمن شبان المسلمین شملہ کے ارکان، سید سردار علی کی سربراہی میں میت کے ہمراہ تھے کہ ٹرسٹی حضرات نے ان سے اپنی قرارداد کا ذکر کیا اور میت علی گڑھ اسٹیشن پر اتارنی چاہی۔ وصیت درمیان میں آ گئی۔ سید سردار علی میت کو حوالے کرنے کے لیے تیار نہیں تھے۔ محسن الملک کے عزیز و اقارب جو اس وقت وہاں موجود تھے وہ بھی میت کو اٹاوہ لے جانے پر بضد تھے۔ اچھا خاصا تنازع اٹھ کھڑا ہوا۔

کسی قدر حجت کے بعد تابوت کی گاڑی علی گڑھ اسٹیشن پر اتار لی گئی۔ اعزہ اب بھی اصرار کر رہے تھے کہ میت کو اٹاوہ میں دفن کیا جائے۔

دن نکل آیا تھا اور ابھی کچھ طے نہیں ہو پایا تھا۔ نواب وقار الملک کو بھی اطلاع کر دی گئی تھی۔ وہ بھی پہنچنے والے تھے۔ اسی اثناء میں نواب مرحوم کی بیگم کا تار موصول ہوا۔ اس میں لکھا تھا کہ وصیت کی تحقیقات کی جائے۔ اگر وصیت ثابت نہ ہو تو میت علی گڑھ میں دفن کر دی جائے۔

دن کے کوئی دس بجے ہوں گے کہ نواب وقار الملک اسٹیشن پہنچے۔ انہیں بیگم محسن الملک کا تار دکھایا گیا۔ انہوں نے ٹرسٹیوں کی موجودگی میں وصیت کی تحقیق شروع کی۔ شملہ سے میت کے ساتھ آنے والوں سے طویل بات چیت کی اور جب وہ اس نتیجے پر پہنچ گئے کہ وصیت کی کوئی حقیقت نہیں تو تابوت گاڑی سے اتار کر ایک پلنگ پر رکھا گیا اور اس پر ایک سفید دوشالہ ڈال کر جنازہ کالج میں لایا گیا۔ نماز جمعہ کے بعد نماز جنازہ ادا

ہوئی۔ طلبہ۔ ٹرسٹیان اور شہر کے لوگوں نے مرحوم کا آخری دیدار کیا اور میت کو سرسید مرحوم اور زین العابدین کی قبروں کے درمیان دفن کر دیا گیا۔

تیرے احسان تری یاد بھلانا دل سے
خونِ انصاف ہے احسان فراموشی ہے

محسن الملک کوئی گم نام آدمی تو تھے نہیں۔ انتقال کی خبر عام ہوتے ہی مسلمانوں میں صف ماتم بچھ گئی۔ مدارس بند کر دیے گئے۔ مساجد میں قرآن خوانی ہوئی۔ جگہ جگہ جلسے ہوئے۔ تعزیتی خطوط کا تانتا بندھ گیا۔ وائسرائے کی جانب سے بھی تعزیتی پیغام موصول ہوا۔

حکومت ہند کے تمام اعلیٰ عہدے داران نے تعزیتی پیغامات ارسال کیے۔ ان سب میں نواب صاحب کی خدمات کو خراجِ عقیدت پیش کیا گیا تھا۔

نواب صاحب کی یاد میں منعقد ہونے والے جلسوں میں یہ قرارداد پیش کی جا رہی تھیں کہ ان کی خدمات اور احسانات کی شکر گزاری یہ ہے کہ ان کی ایک ایسی شاندار یادگار قائم کی جائے جو زمانے کی ضرورت کے مناسب اور سارے ہندوستان کے مسلمانوں کے لیے مفید ہو۔

یہ صدائیں ہر طرف سے بلند ہوئیں تو کالج کے ٹرسٹی حضرات نے ایک جلسہ منعقد کر کے اس پر غور کیا اور بحث و مباحث کے بعد "یادگار" کی قرارداد منظور کر لی گئی اور یہ قرار پایا گیا کہ یادگار ایسی ہو جس سے ایک طرف محمڈن یونیورسٹی کا مقصد پورا ہوتا ہو اور دوسری طرف کالج کی کوئی اہم ضرورت پوری ہوتی ہو۔

ممبران نے تجویز کیا۔

"ایک لاکھ روپے کے سرمائے سے ایک بورڈنگ ہاؤس بنایا جائے اور اس کی آمدنی سے کالج میں علوم جدیدہ کی چند پروفیسر شپ قائم ہوں۔"

بعد میں ایک لاکھ کی رقم کم معلوم ہوئی اور اسے تین لاکھ تک بڑھا دیا گیا۔ فنڈ جمع کرنے کے لیے کمیٹی قائم ہوئی اور ہر ضلع میں اس کی شاخیں قائم ہوئیں۔

نواب وقار الملک کی جانب سے یہ اپیل شائع ہوئی۔

"یہ طے کیا گیا ہے کہ تین لاکھ روپے کے چندے سے مرحوم کی یادگار قائم کی جائے۔ اس رقم کی آمدنی سے کالج میں پروفیسر شپ قائم کی جائے گی۔ یہ روپیا کالج میں بورڈنگ ہاؤس میں لگایا جائے گا جو کہ نواب صاحب مرحوم کے نام سے نامزد کیا جائے گا۔ اس غرض سے ایک کمیٹی قائم ہو گئی ہے جس کا نام محسن الملک میموریل فنڈ کمیٹی ہے۔"

جو صاحب اس فنڈ میں کم سے کم ایک ہزار روپے دیں گے ان کا نام نامی کندہ کر کے بورڈنگ ہاؤس کے ایک کمرے پر لگایا جائے گا۔

مسٹر آرچبولڈ پرنسپل علی گڑھ کالج اس کمیٹی کے خزانچی ہیں اور روپیا بینک آف بنگال آگرہ میں جمع کرایا جائے گا۔

چندے کی تحریک ابھی شروع نہیں ہوئی تھی کہ قحط رونما ہو گیا۔ یہ فیصلہ کیا گیا کہ ابھی چندہ نہ کھولا جائے کیوں کہ لوگ ابھی اس حالت میں نہیں ہوں گے کہ چندہ دے سکیں۔

قحط کی حالت میں تخفیف ہوتے ہی چندے کی تحریک ہوئی۔ کچھ چندہ جمع بھی ہوا لیکن اس کے بعد ہی یونیورسٹی فنڈ جمع کرنے کی تحریک شروع ہو گئی اور کام کرنے والوں کی تمام توجہ اسے کامیاب بنانے پر مبذول ہو گئی۔

محسن الملک میموریل فنڈ کا کام رک گیا۔

ابھی تک جو عطیات جمع ہوئے تھے اتنے ضرور تھے کہ ایک عمدہ قسم کی عمارت بنانے کے لیے کافی ہوتے لیکن ہوا کچھ بھی نہیں اگر ہوا تو یہ کہ منٹو سرکل کا ایک بلاک محسن الملک کے نام سے منسوب کیا جاتا تجویز ہوا اور یہ بھی صرف تجویز ہی رہی۔ محسن الملک کا کتبہ نظر نہیں آیا۔

حیدر آباد میں ان کے کثیر التعداد دوست اور مداح موجود تھے۔ نہایت جوش کے ساتھ محسن الملک اسکالرشپ کمیٹی قائم ہوئی۔ کچھ چندہ فراہم بھی ہوا لیکن اتنا نہیں تھا کہ اسکالرشپ جاری ہوتی۔

یہ معاملہ بھی سرد ہو گیا۔

ہوا تو یہ کہ نواب صاحب کے انتقال کے چار ماہ بعد ان کی بیگم کا بھی انتقال ہو گیا۔ اولاد کوئی تھی نہیں کہ ان کی یادگار کہلاتی بس وہ کام یادگار رہ گئے جو انہوں نے اپنی زندگی میں کالج کے لیے کیے تھے۔

ماخوذ
از: حیات محسن
مرتبہ: مولوی محمد امین زبیری
سرسید نمبر، نگار

کراچی کراچی

عبداللہ احمد حسن

شہر کراچی سے تاریخی ورثہ ختم ہوتا جارہا ہے۔ جب کہ تاریخی ورثے کی حفاظت ہر مہذب معاشرے میں فرض ہے مگر ہم ان نوادر جیسی عمارتوں کو کھنڈر میں تبدیل ہوتے خاموشی سے دیکھ رہے ہیں۔ ایسا لگتا ہے کہ کچھ دنوں بعد اس شہر میں تاریخی عمارتیں گنتی کی رہ جائیں گی۔ کئی دہائی قبل کے کراچی کو سامنے لانے کے لیے ایک قابل ستائش تحریر۔

کراچی کی ایک مختصر اور دلچسپ تاریخی تحریر

ہمارے ایک دوست جن کا نام زبیر ہے قریب دس سال قبل وہ اچانک کباڑی بن گئے، جی نہیں آپ غلط سمجھے وہ جونا پرانا ڈبہ باٹلی کی آوازیں لگانے والے کباڑی نہیں بلکہ ان کو اچانک تاریخ سے دلچسپی ہوگئی اور وہ بھی کراچی کی تاریخ سے، سو انہوں نے کمر کس لی اور نیٹ پر تحقیق شروع کی پھر موٹر سائیکل پر اور اس کے بعد پیدل گھومے اور بہت سی عمارتوں اور جگہوں کا پتا لگایا۔ اس بار ہم کراچی گئے تو ان کے ساتھ ایک اتوار کا دن گزارا اور کچھ جگہیں دیکھیں، تو سوچا کہ ان معلومات کو سرگزشت کے حوالے کردیا جائے شاید قارئین میں سے کوئی یہ سب دیکھنا چاہے۔

کراچی تین سو سال قبل تک ایک چھوٹی سی بستی تھی جسے کلاچی کہا جاتا تھا (بعض لوگوں کو اس روایت پر اعتراض ہے) جہاں ماہی گیر رہتے تھے، جن کی نسلیں کھڈہ لیاری میں آباد ہیں۔ سترھویں صدی کے آخر میں یہاں سے مسقط عمان اور خلیجی ریاستوں کے ساتھ تجارت شروع ہوئی جس کے بعد اس بستی نے ایک چھوٹے سے شہر کا روپ دھارنا شروع کیا، 1795ء میں خان قلات نے منوڑا میں ایک چھوٹا سا قلعہ بنا کر سندھ کے حکمران کے حوالے کردیا۔ اس علاقہ کی تجارتی اہمیت کو دیکھتے ہوئے انگریزوں نے 1839ء میں سر چارلس نیپئر کی کمان میں حملہ کیا اور شہر پر قبضہ کرلیا، بعدازاں 1846ء میں کراچی کو برٹش انڈیا میں ایک ڈسٹرکٹ کی حیثیت دے دی گئی، اس وقت آبادی تقریباً نو ہزار نفوس پر مشتمل تھی۔ اسی سال کراچی میں ہیضہ کی وبا پھیل گئی جس سے نمٹنے کے لیے حکومت نے ایک کنزرویٹنسی بورڈ بنا دیا جسے بعد ازاں 1852ء میں میونسپل کمیشن میں بدل دیا گیا پھر 1853ء میں ترقی دے کر میونسپل کمیٹی میں تبدیل کر دیا گیا۔ 1857ء کی جنگِ آزادی میں باغی سپاہیوں نے کراچی

پر قبضہ کرلیا مگر جلد ہی یہ تحریک ناکام ہوگئی اور شہر کا قبضہ ایک بار پھر انگریزوں نے حاصل کرلیا۔ 1878ء میں شہر کو ریل کے ذریعہ باقی ملک سے جوڑ دیا گیا۔ مشہور تاریخی عمارات فریئر ہال اور ایمپریس مارکیٹ بنائی گئیں۔ اسی شہر میں 1876ء میں قائداعظم پیدا ہوئے جن کی قیادت میں 1947ء میں مسلمانوں نے پاکستان حاصل کیا۔ 1847ء میں کراچی سمیت سندھ کو بمبئی میونسپل کے تابع کردیا گیا اس وقت تک آبادی بڑھ کر ایک لاکھ پانچ ہزار تک پہنچ گئی تھی جن میں مسلمان، ہندو، پارسی، یہودی، ایرانی، لبنانی اور ان کے علاوہ گوا کے عیسائی تاجر بھی شامل تھے۔ 1900ء میں شاہراہوں پر بڑھتے ہجوم کے پیشِ نظر ہندوستان کا پہلا ٹراموے کا نظام یہاں متعارف کرایا گیا۔ ابتدا میں ٹرام کو گھوڑے کھینچتے تھے مگر بعد ازاں میکانکی گھوڑے یعنی انجن نے ان کی جگہ لے لی۔ 1933ء میں کراچی میونسپل ایکٹ تشکیل دیا گیا اور اسی سال کراچی میونسپل کارپوریشن بنا دیا گیا اس میں ستاون کونسلر منتخب کیے گئے جن کا تعلق مختلف مذہبی برادریوں سے تھا۔ جناب جمشید نسروانجی جو پارسی برادری سے تعلق رکھتے تھے، پہلے میئر منتخب ہوئے جو اس سے پہلے کراچی کے پرانے نظام کے تحت بیس سال تک صدر کے عہدے پر فائز رہے تھے۔ ان کی کئی یادگاریں آج بھی اس شہر میں بکھری ہوئی ہیں۔ ان کو ماڈرن کراچی کا باپ بھی کہا جاتا ہے کیونکہ ان کے دور میں کراچی نے کافی ترقی کی تھی۔ یہ ایک صاف ستھرا شہر تھا جہاں بڑی سڑکیں چوڑے فٹ پاتھ (جو اب ناپید ہیں) خوبصورت عمارتیں اور سب سے بڑی چیز شہریوں کے لیے بنیادی سہولیات تھیں جو بدقسمتی سے اب عنقا ہیں۔ یہاں مختلف اقوام اور مذاہب کے لوگ باہم اتفاق سے رہتے تھے، غرض یہ صحیح معنوں میں ایک کاسمو پالیٹن شہر تھا۔ 1936ء میں کراچی کو سندھ کے دارالحکومت کی حیثیت دے دی گئی۔ پاکستان بننے کے بعد کراچی کو ملک کا پہلا دارالحکومت بننے کا شرف حاصل ہوا جسے بعد میں اسلام آباد منتقل کردیا گیا مگر کراچی آج بھی ملک کا سب سے بڑا اور اہم شہر ہے اس کی آبادی ایک اندازے کے مطابق دو کروڑ تک پہنچ چکی ہے۔ یہ کراچی کا ایک مختصر تعارف تھا اب ہم اپنے سفر پر نکلتے ہیں۔

پرانی کتابوں کا بازار

ہمارا پروگرام یہ بنا تھا کہ صبح گیارہ بجے تک نکل جائیں

گے مگر زبیر کو کچھ تاخیر ہوگئی تو ہم نے زبیر کو فون پر مطلع کیا کہ ہم صدر جا رہے ہیں وہ تیار ہو کر وہیں آجائیں، سو ہم صدر میں ریگل چوک کے قریب لگنے والے پرانی کتابوں کے سنڈے بازار میں پہنچ گئے۔ کافی دن سے ہمارا ارادہ یہاں آنے کا تھا مگر موقع نہیں مل رہا تھا، آج آئے تو واقعی احساس ہوا کہ یہ جگہ صرف ایک بار نہیں بار بار آنے کے قابل ہے۔ وہاں گھوم پھر کر سب اسٹالز دیکھے کچھ خریداری بھی کی اتنے میں زبیر کی کال آگئی۔ ہم ان کے ساتھ گاڑی میں بیٹھے انہوں نے پوچھا کہ کہاں سے شروع کیا جائے تو ہم نے کہا صدر کے کسی پرانے ریستوراں میں لے چلو چائے پیٹیس سے شکم پری کر کے نکلتے ہیں۔

کیفے مبارک

وہ ہمیں انکلسریا اسپتال کے سامنے واقع کیفے مبارک میں لے گئے، یہ ایک پرانا ایرانی ریستوراں ہے جواب کسی بوہری صاحب کے پاس ہے۔ انہوں نے اس کا بڑا خیال رکھا ہے، ہر چیز نئی معلوم ہوتی ہے۔ دیواروں پر چلو مرغ و چلو کباب وغیرہ کے بورڈ اسی طرح لگے ہوئے تھے جیسے کسی زمانے میں ہم دیکھتے تھے۔ وہاں داخل ہوتے ہی ہمارے سامنے لڑکپن کا دور گھومنے لگا، وہی میز کرسیاں۔ ویسا ہی کاؤنٹر، فضا میں رچی یادوں کی خوشبو، اس وقت ہمارے احساسات کیا تھے ان کو بیان کرنے کے لیے ہمارے پاس

رہے ہوں گے اب چند کو چھوڑ کر باقی ڈھول سی میں الٹے پڑے تھے۔ برسوں سے ان کی نہ مرمت ہوئی ہے نہ رنگ و روغن کیا گیا ہے۔ ہر سو ایک حسرت بھری خاموشی گونج رہی تھی۔ جب پاکستان بنا تو کراچی میں پارسیوں کی خاصی آبادی تھی۔ ان کے بڑے کاروبار تھے اور وہ سیاست میں بھی حصہ لیتے تھے جیسے جمشید نسروانجی، جہانگیر کوٹھاری وغیرہ تھے۔ آج کراچی میں پارسی بہت کم رہ گئے ہیں۔ ان میں بھی بڑے کاروباری غالباً صرف بہرام ڈنشو جی آواری ہیں۔ نئی نسل تقریباً پاکستان سے جا چکی ہے، کچھ بوڑھے رہ گئے ہیں جو آہستہ آہستہ ختم ہو رہے ہیں، اب ان کی تعداد صرف چند ہزار رہ گئی ہے، ایک اندازے کے مطابق 2030ء کے بعد شاید پاکستان میں کوئی پارسی نہیں ملے گا۔

الفاظ نہیں ہیں۔ کتنی یادیں، کتنے چہرے، گویا ایک فلم سی دماغ میں چلنے لگی۔ خیر ویٹر کو بلایا تو پتا چلا پیٹس نہیں ہیں، زبیر نے کہا "کیوں کریں، اب ایک بجنے والا ہے تو کھانا ہی کھا لیتے ہیں۔ ہم نے بھی سوچا ٹھیک ہے اور آرڈر دے دیا۔

ویٹر نے سلیقے سے کھانا چنا اور جب ہم نے پہلا لقمہ منہ میں ڈالا تو ایک بار پھر ذہن نے ماضی کی طرف چھلانگ لگائی۔ اس زمانے میں کھائے ہوئے کھانے کا ذائقہ یاد آیا، اس وقت جو لقمہ منہ میں تھا اس میں وہی مزہ تھا۔ ہم نے خاصی رغبت سے کھانا کھایا پھر زبیر نے ایک چائے منگوائی وہی کیتلی اس کے ساتھ چینی ایک الگ پیالی میں اور وہ چھلنی جو کپ پر رکھتی تھی۔ ساتھ ہی ایک خالی کپ کیونکہ اس ایک چائے کے سیٹ میں دو کپ چائے ہوتی ہے۔ چائے کا گھونٹ لیا تو ایک بار پھر ماضی سامنے آ کھڑا ہوا۔ ہمیں لگا جیسے ابھی ہم چند دوست فلم دیکھنے آئے ہیں اور انتظار کا وقت ایرانی چائے پی کر گزار رہے ہیں۔ غرض یہ تجربہ اتنا شاندار رہا کہ کیا بتائیں ہم زبیر کے ممنون ہیں جن کی وجہ سے ہم نے حال میں رہتے ہوئے ماضی کا چکر لگا لیا۔

اسی جگہ ایک پارک بھی تھا مگر اس کا دروازہ مقفل تھا ہم نے سلاخوں سے دیکھا تو ایک چھوٹا مگر خوبصورت پارک نظر آیا، یقیناً یہاں شام کو بزرگ جمع ہو کر ہوا خوری کرتے ہوں گے اور باتوں میں وقت گزارتے ہوں گے۔ یہاں ایک آنکھوں کا اسپتال بھی نظر آیا بورڈ پر ڈاکٹر ایس ڈی انکلسر یا آئی اسپتال لکھا تھا۔ مگر بورڈ کی حالت خاصی بری تھی۔ رنگ اڑ چکا تھا اور زنگ آلود تھا، جبکہ ایک چھوٹا بورڈ قدرے بہتر حالت میں تھا۔ صدر میں واقع انکلسریا اسپتال بھی ایک تاریخی عمارت ہے جسے ڈاکٹر برجر انکلسریا اور گلبانو نے بنوایا تھا۔

پارسی کالونی

اب گاڑی کا رخ کترک پارسی کالونی کی طرف تھا جو سولجر بازار جمشید کوارٹرز میں واقع ہے۔ وہاں پہنچتے ہی یوں لگا گویا ہم کراچی میں نہیں ہیں، ہر سو خاموشی اور سکون تھا، نہ ٹریفک نہ لوگوں کا ہجوم، وہاں بڑے بڑے بنگلے تھے مگر اپنی خالت پر نوحہ کناں کیونکہ ان بنگلوں پر جو یقیناً کبھی شاندار

جانوروں کی سبیل

اب ہمارا رخ سولجر بازار ہی میں واقع ایک جگہ کی

طرف تھا جس کا اب صرف بورڈ رہ گیا ہے اصل چیز تجاوزات کا شکار ہو چکی ہے۔ پہلے کراچی میں گھوڑا گاڑیاں اور تانگے چلتے تھے مگر اب یہ سواریاں ناپید ہوتی جا رہی ہیں، پرانے کراچی میں کئی جگہ مخیر حضرات نے چھوٹے چھوٹے حوض بنائے ہوئے تھے جو ہر وقت صاف پانی سے بھرے رہتے تھے، جہاں سے پیاسے جانور پانی پیتے تھے۔ آج کے لوگوں کو عجیب لگ رہا ہوگا مگر ایک زمانے میں ایسا بھی تھا، آج یہاں انسان کو بھی کوئی سہولت نہیں ملتی بیچارے جانور تو کسی گنتی میں ہی نہیں ہیں۔ جی تو ذکر ہو رہا تھا سولجر بازار میں واقع جانوروں کی سبیل کا جہاں صرف بورڈ رہ گیا ہے جو بتاتا ہے کہ جناب فرامرز ای پنتھاکی نے یہ حوض بنوایا تھا۔ ذرا موازنہ کیجیے اُس وقت کے کراچی کا آج کے کراچی سے۔ اب یہاں کوئی حوض نہیں ہے اس کی جگہ دکان بنی ہوئی ہے۔

گرو مندر کا مندر

ہمارا اگلا اسٹاپ تھا گرو مندر، ہم ہمیشہ یہ نام سنتے تھے مگر اس کی وجہ تسمیہ کیا ہے آج پتا چلا، یہ ایک مندر ہے جو ذرا اندر کی طرف واقع ہے، اس کی وجہ سے اس علاقہ کو گرو مندر کہا جاتا تھا اور آج تک یہی کہلاتا ہے۔ یہ ایک چھوٹا چار دیواری میں گھرا ہوا مندر ہے۔ اس مندر پر لگی تختی کے مطابق آنجہانی سیٹھ شواجی بھائی سناری کی یاد میں ان کے بیٹے سونی ہیرجی بھائی نے مندر کی چار دیواری اور ٹائل وغیرہ کا خرچ اٹھا دیا تھا۔ وہاں چپلیں دیکھ کر ہم نے دروازے پر لگی گھنٹی بجائی مگر آج کراچی کے جو حالات ہیں ان میں ہر شخص دوسرے سے خوفزدہ ہے، شاید اسی وجہ سے کسی نے نہ دروازہ کھولا نہ جواب دیا۔

مندر کے شیر بنگلے پر

اب زبیر نے کہا ایک خاص چیز دکھاتا ہوں، ہم نے کہا چلو۔ ہم طارق روڈ کے علاقے میں پہنچے، زبیر نے ایک طرف اشارہ کیا دیکھا تو ایک بڑا سا بنگلا تھا جس میں گیٹ کے اوپر دو شیر بنے ہوئے تھے مگر کچھ عجیب سے لگ رہے تھے، ہمیں سمجھ نہیں آیا تو زبیر نے بتایا بنگلا نیا ہے مگر شیر بہت پرانے ہیں، میٹھادر کے علاقہ میں ایک جگہ گوگلی کے نام سے مشہور ہے وہاں ایک پرانا مندر ہے یہ شیر اصل میں اسی مندر میں لگے ہوئے تھے مگر ایک صاحب نے وہاں سے اکھاڑ کر اپنے بنگلے پر لگا لیے اب شاید وہ خود بنگلا بیچ کر وہاں سے جا چکے ہیں مگر شیر آج بھی وہیں لگے ہوئے ہیں۔ اب ہماری الجھن دور ہوئی دراصل یہ شیر اس عمارت کا حصہ نہیں لگ رہے تھے ان کی قدامت ظاہر ہو رہی تھی اسی لیے ہمیں کچھ عجیب لگ رہا تھا۔

صدر

اب ہم صدر میں ہیں، سامنے سینٹ پیٹرک چرچ کی عمارت ہے مگر داخلے کی اُمید نہیں، اس جگہ 1845ء میں غالباً سندھ کا پہلا چرچ بنایا گیا تھا اور اسے سینٹ پیٹرک کا نام دیا گیا تھا بعد ازاں یہاں موجودہ بڑا چرچ بنا دیا گیا مگر

چھوٹا چرچ بھی کام کرتا رہا یہاں تک کہ 1885ء میں آنے والے ایک طوفان نے چھوٹے چرچ کو تباہ کر دیا۔ اب ہم نے لکی اسٹار کا رخ کیا یہاں گوا سے آنے والے لوگ رہتے ہیں۔ یہ مذہباً عیسائی ہیں۔ لکی اسٹار پر ان کا کوون یونین ہال ہے۔ یہ عمارت 1888ء میں تیار ہوئی تھی۔ اس عمارت کی لوکیشن ایسی ہے کہ ایک پتلی سی عمارت نے روڈ کو دو حصوں میں بانٹا ہوا ہے ایک جانب طبی آلات کی دکانیں ہیں دوسری جانب اسلحہ فروشوں کی گویا اس عمارت نے زندگی اور موت کے درمیان حد فاصل قائم کی ہوئی ہے۔ اس عمارت کے سامنے جہاں اسلحہ فروش ہیں اسی جانب وہ جگہ بھی ہے جہاں پارسی اپنے مردے کو تیار کرتے ہیں، جیسا کہ آپ جانتے ہوں گے کہ پارسی نہ مردے کو دفن کرتے ہیں نہ جلاتے ہیں بلکہ وہ ان کو چیل کوؤں اور گدھ وغیرہ کی خوراک بننے کے لیے مخصوص مقام پر رکھ دیتے ہیں مگر اس سے پہلے جو مردے کی تیاری کا مرحلہ ہوتا ہے وہ یہاں انجام پاتا ہے۔

کچھ آگے آئیں تو دائیں ہاتھ پر ایک بورڈ نظر آئے گا یہ پارسیوں کی عبادت گاہ یعنی آتش کدہ ہے، بورڈ پر لکھا ہے 'دینچ جے بہرانا پارسی دار مہر' یہاں غیر پارسی کا داخلہ سختی سے منع ہے۔ یہ عمارت 1948ء میں تعمیر ہوئی۔

ایمپرس مارکیٹ

یہ صدر کا مشہور ترین اور پرہجوم مقام ہے۔ یہ مارکیٹ انگریز دور میں 1884ء سے 1889ء کے دوران تعمیر ہوئی اس کا نام ملکہ وکٹوریہ ایمپریس آف انڈیا کے لقب پر رکھا گیا۔ اس کی تعمیر کے لیے خوب سوچ سمجھ کر یہ جگہ چنی گئی تھی جہاں کوئی تعمیرات نہیں تھیں اس وقت یہ مارکیٹ دور سے واضح نظر آتی تھی۔ یہی وہ مقام تھا جہاں 1857ء میں بغاوت کرنے والے سپاہیوں کو بڑی بے رحمی کے ساتھ موت کی سزائیں دی گئی تھیں، تاکہ دوسرے عبرت پکڑیں، ان کو سرعام توپ کے گولوں سے اڑایا گیا تھا تاکہ کوئی اور بغاوت کا سوچ بھی نہ سکے۔ اس کی بنیاد بمبئی کے گورنر جیمس فرگوسن نے 1884ء میں رکھی تھی، اسی نے میری ویدر ٹاور جسے اب صرف ٹاور کے نام سے یاد کیا جاتا ہے کی بنیاد بھی رکھی تھی۔ اس کا ڈیزائن جیمس اسٹریچن نے بنایا تھا اور بنیاد ایک انگریزی فرم اے جے الفیلڈ نے بنائی جبکہ عمارت کی تعمیر ایک مقامی فرم محمود نوان اینڈ ودلو کھجو نے کی۔ اس میں تقریب دو سو اسی دکانوں اور اسٹالز کی گنجائش رکھی گئی تھی اور قریب ہی ایک تفریحی پارک بھی بنایا گیا تھا یوں سمجھیں یہ اس دور کا ایک شاپنگ مال تھا جہاں خریدار کو اپنی ضرورت کی تقریباً ہر چیز مل جاتی تھی، اور صرف یہی نہیں انگریزوں نے ایسی سات مارکیٹیں یا مالز کراچی میں مختلف مقامات پر بنائی تھیں۔

گلبائی میٹرنیٹی ہوم

ایمپرس مارکیٹ کی لائن میں صدر کی طرف بڑھیں تو کچھ آگے ایک پرانی عمارت آپ کو نظر آتی ہے، یہ گلبائی نسروانجی مہتا پارسی میٹرنیٹی ہوم ہے جو جناب جمشید نسروانجی

نے تعمیر کروایا تھا، احاطہ میں فوارہ کے پاس لگی ایک کتاب نما تختی پر لکھا ہے جشید نسروانجی نے اپنے والد رستم نسروانجی مہتا کی یاد میں 1920ء میں بنوایا۔ میٹرنیٹی ہوم کا سنگ بنیاد 1917ء میں رکھا گیا اور 1919ء میں اس کا افتتاح مسز جے ایل ریو نے کیا۔ یہاں خان بہادر نسروانجی مہتا کی یادگار بھی بنائی گئی ہے۔ احاطہ میں گھومتے ہوئے ہم عمارت کے عقب میں پہنچے تو دیکھا وہاں دو چھوٹی عمارتیں بنی ہوئی ہیں اور وہاں لوگ رہائش پذیر ہیں، ان سے بات کی تو ان کا بیان تھا کہ یہ عمارتیں اسپتال کے اسٹاف کے لیے بنائی گئی تھیں جو بعد میں ان کو مستقل رہائش کے لیے دے دی گئیں اور یہ لوگ ان ہی کی اولاد میں سے ہیں۔

رتن تلاؤ۔اردو بازار۔برنس روڈ

یہاں اب بھی بہت سی انگریز دور کی عمارات ہیں ایک عمارت جوانڈر کے روڈ پر ہے اس پر ہندوستان کے جھنڈے بنے ہوئے ہیں اور ہندی زبان میں سوراج بھون لکھا ہوا ہے۔ اردو بازار میں ایک عمارت ہے جس کی گیلریوں کی جالی پر گاندھی کی تصویریں بنی ہوئی ہیں، اور بھی کافی پرانی عمارتیں یہاں موجود ہیں جن پر ہندو نام لگے ہیں کسی پر دیوی دیوتاؤں کی مورتیاں بنی ہوئی ہیں۔

اوہ یہ کیا وہ اکیلا کھڑا ہے اداس درماندہ خستہ حال، جی ہاں یہ ایک لیٹر بکس ہے جسے دیکھنے کو آنکھیں ترس گئی ہیں آج برسوں بعد یہاں نظر آیا تو اس حال میں کہ اپنی حالت پر ماتم کناں تھا، ایک زمانہ تھا جب اس کی بڑی اہمیت تھی مگر آج سائنس کی ترقی نے اسے اس حال کو پہنچا دیا ہے کہ

MAIN BUILDING OF GURUDWARA RATAN TALAW

اب کوئی اس سے رجوع نہیں کرتا نہ کوئی خط ڈالتا ہے نہ ڈاکیا خط نکالنے آتا ہے۔ وہ زمانے بھی تھے جب لوگ خط آنے کا انتظار کرتے تھے۔ ڈاکیا اپنی سائیکل پر مخصوص گھنٹی بجا کر اپنی آمد کا اعلان کرتا تھا مگر وقت وقت کی بات ہے اب تو، جی ہاں اب یہ ای میل اور ایس ایم ایس کا دور ہے۔ اب ہم پہنچے ہیں برنس روڈ پر جو غالباً کراچی کی پہلی فوڈ اسٹریٹ ہے، یہاں لسی پی کر تازہ دم ہوکر پھر اپنے تاریخ کے سفر پر نکل گئے۔

خالقدینا ہال

یہ ایم اے جناح روڈ پر واقع غلام حسین خالقدینا ہال اینڈ لائبریری ہے۔ اس کا خوبصورت طرز تعمیر آپ کو اپنے سحر میں جکڑ لیتا ہے۔ اس کی تعمیر 1906ء میں ہوئی تھی کل لاگت تینتیس ہزار روپے تھی جس میں سے اٹھارہ ہزار غلام حسین خالقدینا نے دیے جبکہ باقی رقم بلدیہ کراچی نے دی۔

اس کی تعمیر ادبی سرگرمیوں کے لیے ہوئی تھی مگر اس عمارت کو خاص شہرت تب ملی جب مولوی شوکت علی اور مولوی محمد علی جوہر پر خلافت موومنٹ میں حصہ لینے کے الزام میں مقدمہ چلا، انگریزوں نے اس عمارت کو کورٹ بنا کر دونوں بھائیوں پر مشہور مقدمہ بغاوت چلایا تھا۔

آرام باغ

یہاں سکھوں کا ایک گردوارہ ہے، یہ گردوارہ اب بند ہے اس لیے ہم صرف باہر سے ہی دیکھ سکے۔ آگے روڈ پر ایک پرانی خستہ حال مگر خوبصورت عمارت نظر آئی جس کی تفصیل نامعلوم ہے۔

ہائی کورٹ

یہ بھی ایک خوبصورت پرانی عمارت ہے۔ اس کی تعمیر 1923ء میں شروع ہوئی اور 1929ء میں مکمل ہوئی، اس پر کل لاگت 3975248 روپے آئی۔ بعد میں پاکستان حکومت نے اس میں توسیع کی مگر اصل عمارت کو یونہی رکھا

اوراس سے متصل نئی عمارتیں بنوائیں۔

فری میسنز لاج

ہم پی آئی اے کے دفتر کے سامنے وائی ایم سی اے گراؤنڈ کی لائن میں واقع اس عمارت میں پہنچے جس پر محکمۂ جنگلی حیات کا بورڈ آویزاں ہے۔ اندر پہنچ کر ہماری نظر ایک تختی پر پڑی جس پر دجال کا نشان بنا ہوا تھا، یہ عمارت

1914ء میں فری میسنز ٹرسٹ نے بنائی تھی اور انہوں نے اس کو جادو گھر کا نام دیا تھا۔ اس عمارت کو فری میسنز نے کئی برس اپنے اجتماعات کے لیے استعمال کیا، اس وقت مقامی لوگوں کو کچھ پتا نہیں تھا کہ یہاں کیا سرگرمیاں ہو رہی ہیں، بالآخر 1972ء میں پاکستان میں فری میسنز پر پابندی عائد کر دی گئی اور یہ عمارت حکومت نے اپنے قبضہ میں لے لی جسے بعد ازاں محکمہ جنگلی حیات کو دے دیا گیا۔ یہاں اب بھی کئی جگہ تختیوں دیواروں اور لکڑی پر فری میسنز کا مخصوص نشان کندہ ہے اور اس عمارت کے بارے میں لکھا ہے۔

قائد اعظم ہاؤس میوزیم

یہ اسٹاف فلیگ ہاؤس کے نام سے بھی مشہور ہے۔ یہ میوزیم میٹروپول ہوٹل کے عقب میں ہے۔ یہ مکان انیسویں صدی کے آخر میں بنایا گیا تھا اور اس کی ملکیت 1922ء تک رام چند پکھی لوہانا کے پاس تھی۔ 1940ء سے برٹش انڈین آرمی نے اسے کرائے پر لے کر اپنے سینئر آفیسرز کو رہائش کے لیے دے دیا۔ جن میں جنرل ڈگلس ڈی گریسی بھی شامل تھے جو آزادی کے بعد پاکستان رویل آرمی کے سربراہ بنے تھے۔ اسی لیے اس کو فلیگ اسٹاف ہاؤس کے نام سے موسوم کیا گیا۔ یہ مکان قائداعظم کی ملکیت میں 1943ء میں آیا جب اسے کراچی کے ایک سابق میئر سے ایک لاکھ پندرہ ہزار روپے میں خریدا گیا۔ ستمبر 1947ء میں قائداعظم کا سامان ۱۰ اورنگزیب روڈ دہلی سے یہاں منتقل کیا گیا۔ قائداعظم نے اس کو گورنر جنرل ہاؤس کے طور پر استعمال کیا۔ 31 ستمبر 1948ء کو قائداعظم کی رحلت کے بعد محترمہ فاطمہ جناح یہاں منتقل ہو گئیں اور اس کو خاندانی رہائش کی حیثیت دے دی گئی۔ فاطمہ جناح یہاں 1964ء تک رہائش پذیر رہیں پھر وہ موہٹا پیلس یا قصر فاطمہ منتقل ہو گئیں، تاہم قائد کی بہن محترمہ شیریں بائی اپنی وفات تک یہاں رہیں۔ ان کے بعد یہ مکان قائداعظم ٹرسٹ نے سنبھال لیا۔ 1985ء میں یہ مکان حکومت پاکستان نے ٹرسٹ سے خرید لیا اور اس کو قائداعظم ہاؤس کا نام دے کر بطور میوزیم عوام کے لیے 25 نومبر 1993ء کو کھول دیا گیا۔ ہم یہاں چار بجے پہنچے تو ہمیں بتایا گیا کہ میوزیم کا وقت چار بجے ختم ہو جاتا ہے۔ خیر یہ پہلے بھی دیکھا ہوا ہے اس لیے ہم آگے بڑھ گئے۔

جوناگڑھ ہاؤس اور نواب صاحب سے ملاقات

کچھ آگے بڑھے تو دفعتاً زبیر نے ایک سبز رنگ کے گیٹ کے سامنے بریک لگا دیا جس پر مخصوص نشان بنا ہوا تھا (بعد میں پتا چلا کہ یہ ریاست جوناگڑھ کا شاہی نشان ہے) اور ہم سے کہا پتا ہے یہ کون سی جگہ ہے، ہم نے لاعلمی ظاہر کی تو انہوں نے بتایا کہ یہ نواب آف جوناگڑھ کی رہائش گاہ ہے۔

ہم نے اس بارے میں سنا ہوا تھا اور تھوڑا بہت جوناگڑھ کے بارے میں پڑھا ہوا بھی تھا، ہم نے زبیر سے پوچھا، کیا نواب صاحب سے ملاقات ممکن ہے۔ وہ بولے کچھ کہہ نہیں سکتے تو ہم نے گیٹ پر موجود گارڈ سے بات کی، ہم نے استفسار کیا، کیا نواب صاحب تشریف
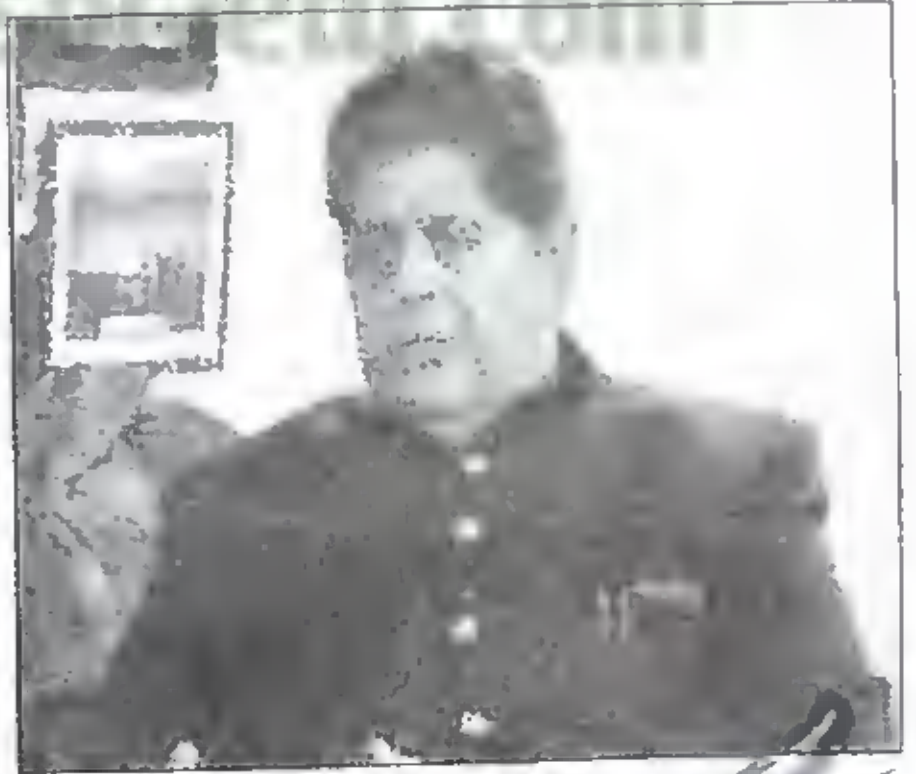
رکھتے ہیں۔ گارڈ نے اثبات میں جواب دیا تو ہم نے اپنا تعارف کروایا کہ ہم بیرونِ ملک سے آئے ہیں اور نواب صاحب سے ملاقات کرنا چاہتے ہیں۔ گارڈ نے نوابزادہ صاحب سے رابطہ کر کے ہم سے بات کروائی ہم نے اپنے بارے میں بتایا اور صاف کہہ دیا کہ ہم ملنا چاہتے ہیں مگر ہم چونکہ اچانک بغیر کسی پیشگی پروگرام کے آئے ہیں اس لیے باضابطہ طور پر وقت نہیں لیا ہوا تو اگر ملاقات ممکن ہو تو ہمارے لیے باعث صد افتخار ہوگی۔ انہوں نے اپنا اطمینان کر کے ہمیں آنے کی اجازت دی۔ ہمیں اندر ڈرائنگ روم میں بٹھایا گیا۔ کچھ دیر بعد نواب محمد جہانگیر خانجی صاحب تشریف لے آئے۔ ہم نے حیرت سے دیکھا کہ ہمارے سامنے جو شخصیت تھی وہ سادگی اور وقار کی تصویر تھی، جس میں غرور و تکبر کا نام و نشان تک نہ تھا، پھر ان کا اندازِ گفتگو، ذرا ہی سی دیر میں یوں محسوس ہو رہا تھا گویا ہم انہیں برسوں سے جانتے ہوں۔ کچھ ذاتی گفتگو ہوئی کچھ جوناگڑھ اسٹیٹ کے بارے میں ہوئی چونکہ وہ گفتگو آؤٹ آف ریکارڈ ہے اس لیے ہم یہاں تحریر نہ کرتے ہوئے آپ کو جوناگڑھ کے بارے میں مختصراً بتاتے ہیں۔

یہ ریاست کاٹھیاواڑ میں بحیرۂ عرب کے کنارے پوربندر اور امریلی کے درمیان واقع ہے۔ یہ ریاست مغلوں کے زمانے میں نواب صاحب کے اجداد کو دی گئی تھی جب مغل سلطنت کمزور ہوگئی تو بہت سی اور ریاستوں کی طرح جوناگڑھ نے بھی آزادی کا اعلان کر دیا اور اٹھارویں صدی سے ایک آزاد ریاست کے طور پر رہی۔ یہ ایک خوشحال ریاست تھی جس کے خزانے بھرے ہوئے تھے، اس کا رقبہ 3336 مربع میل تھا، یہ زرخیز زمین تھی، اس ریاست میں نواسی میل سمندری ساحل شامل تھا جس میں خوبصورت اور چمکدار سنہری ریت پر مشتمل بیچ بھی تھے۔ یہاں سولہ پورٹس تھیں اور 999 شہر، گاؤں اور قصبے تھے۔ دارالحکومت جوناگڑھ نامی شہر ہے جو گرنار اور داتار نامی پہاڑیوں کی ڈھلانوں پر واقع ہے۔ یہاں خوبصورت و دلچسپ غار ہیں اور مہاراج اشوک نے جو نقوش کالے گرینائٹ پر کھدوائے تھے وہ بھی ہیں، گرنار کی پہاڑیوں کے دامن میں گرنامی وسیع جنگل ہے جو 494 مربع میل پر مشتمل ہے جہاں جوناگڑھ کی مشہور جنگلی حیات پائی جاتی ہے جن میں ایشیائی ببر شیر بھی شامل ہیں۔ یہاں بارش کا اوسط تیس سے پینتیس انچ سالانہ ہے۔ ہندوستان کی تقسیم کا اعلان ہونے کے بعد اس وقت کے نواب مہابت خانجی صاحب جو موجودہ نواب صاحب کے دادا تھے پاکستان تشریف لائے مقصد تھا کہ جوناگڑھ کا الحاق پاکستان سے کر دیا جائے۔ اسی سلسلے میں نواب صاحب اور قائداعظم کے درمیان پندرہ ستمبر 1947ء کو معاہدہ ہو گیا کہ جوناگڑھ اب پاکستان کا حصہ ہے مگر نہرو نے کشمیر کی طرح جوناگڑھ پر بھی زبردستی قبضہ کر لیا، ہندوستانی فوج 9 نومبر 1947ء کو جوناگڑھ میں داخل ہو گئی۔ اس وقت وہاں کے دیوان یعنی وزیراعظم سر شاہنواز بھٹو تھے جو ذوالفقار علی بھٹو کے والد اور بینظیر بھٹو کے دادا تھے۔ تب سے اقوام متحدہ میں یہ کیس موجود ہے مگر کشمیر کی طرح یہ مسئلہ بھی ہنوز التواء کا شکار ہے۔

نواب صاحب نے اپنے صاحبزادے سے ملوایا جن کا نام نوابزادہ علی مختار خانجی ہے۔ ایک خوبصورت اور ناقابلِ فراموش ملاقات کی خوشگوار یادوں کے ساتھ ہم نے نواب صاحب سے رخصت مانگی اور وہاں سے نکل آئے۔

موہٹا پیلس

اب ہم اولڈ کلفٹن پر واقع موہٹا پیلس کے سامنے تھے۔ وقت تنگ تھا مگر ہمیں ٹکٹ مل گئے۔ یہ محل نما بنگلا راجستھان کے مشہور تاجر شورتن موہٹا نے 1927ء میں برصغیر کے

پہلے مسلمان آرکیٹکٹ آغا احمد حسین کے تیار کردہ ڈیزائن پر بنوایا تھا، آغا احمد حسین کا تعلق جے پور سے تھا وہ میونسپل کارپوریشن میں چیف سرویئر تھے انہوں نے جے پور کے فن تعمیر کے زیر اثر اسے اینگلو مغلیہ انداز میں بنایا۔ آزادی کے بعد حکومتِ پاکستان نے اس میں وزارتِ خارجہ کا دفتر قائم کر دیا، جب اسلام آباد دارالحکومت بن گیا اور دفاتر وہاں منتقل ہو گئے تو یہ عمارت محترمہ فاطمہ جناح کو رہائش کے لیے دے دی گئی۔ وہ یہاں اپنی وفات 1967ء تک رہیں ان کے بعد یہ جائیداد ان کی بہن شیریں جناح کو مل گئی تاہم ان کے انتقال کے بعد یہ متنازعہ جائیداد کی حیثیت اختیار کر گئی اور لاوارث عمارات کے زمرے میں آ گئی۔ 1995ء میں اسے سندھ حکومت کی مدد سے حکومت پاکستان نے باقاعدہ خرید کر ایک خود مختار بورڈ آف ٹرسٹیز کے حوالے کر دیا تاکہ اسے پاکستانی ورثہ کا میوزیم بنایا جا سکے۔ 15 ستمبر 1995ء کو تالپور حکمرانوں کے نوادرات سے اس کا افتتاح کیا گیا۔ تب سے اب تک یہاں مختلف نمائشوں کا اہتمام کیا جاتا رہا ہے۔ کہتے ہیں جب مستقل نوادرات مل جائیں گے تو اسے بھی مستقل میوزیم کی حیثیت دے دی جائے گی، ہمارے خیال سے تو یہ ایک لطیفہ ہی ہے این خیال است محال است و جنوں است کیونکہ پاکستان چوک پر واقع نیشنل میوزیم کی تباہی کو دیکھتے ہوئے کیا امید کی جا سکتی ہے۔

موہٹا پیلس کے عقبی حصہ میں چند بت رکھے ہیں جو انگریزوں کے دور میں سڑکوں پر آویزاں رہے ہوں گے ان میں ملکہ وکٹوریہ کا بت بھی شامل ہے۔ ارے یہ کیا ہے اچانک ہماری نظروں کے سامنے ہمارا بچپن گھومنے لگا، یہ ہم نے کیا دیکھ لیا...... جی وہاں دو شیروں کے دھاتی مجسمے رکھے ہوئے تھے اور ان مجسموں سے ہمارا بچپن جڑا ہوا تھا۔ یہ مجسمے چڑیا گھر میں لگے ہوئے تھے اور ہم نے انہیں وہیں دیکھا تھا اور نہ صرف دیکھا تھا بلکہ متعدد بار ان پر سوار ہوئے تھے ہم نے ان پر چڑھ کر تصویریں بنوائی تھیں اب یہ یہاں رکھے ہیں، آج کیفے مبارک نے ہمیں لڑکپن کی سیر کروائی تھی مگر ان شیروں نے تو ہمیں بچپن میں پہنچا دیا۔ ہمارے کانوں میں آنجہانی جگجیت سنگھ جی کی آواز گونجنے لگی، یہ دولت بھی لے لو یہ شہرت بھی لے لو، بھلے چھین لو مجھ سے میری جوانی، مگر مجھ کو لوٹا دو بچپن کا ساون، وہ کاغذ کی کشتی وہ بارش کا پانی۔

شری رتنیسور مھادیو مندر

ہم اب کلفٹن پر ہیں، یہاں یہ قدیم مندر ہے جو قریب ۱۵۰ سال پرانا ہے اور آج بھی یہاں پوجا ہوتی ہے۔ ہم نے اندر جانے کا پوچھا تو جواب ملا کہ ابھی پوجا ہو رہی ہے اگر آپ اندر جانا چاہتے ہیں تو منگل کی صبح کو آ جائیں ویسے اجازت نہیں ہے۔ بحریہ ٹاؤن کے موجودہ کام کی وجہ سے یہ مندر اور جہانگیر کوٹھاری پریڈ وغیرہ کو خطرہ پیدا ہو گیا تھا کیونکہ تاریخی آثار سے ایک مخصوص فاصلہ چھوڑ کر کام کیا جا سکتا ہے تاکہ ان آثار کو نقصان نہ پہنچے مگر یہ پاکستان ہے۔ جب اس مندر میں کریک پڑنے کی شکایات آئیں جس پر میڈیا اور سول سوسائیٹی نے فوری ایکشن لیا اور سندھ ہائی کورٹ نے آرڈر جاری کیا ورنہ شاید یہاں کچھ نہ بچتا۔

پلے لینڈ، فن لینڈ اور ماہی خانہ

ہر طرف ملک ریاض کی پھیلائی ہوئی مٹی اڑ رہی ہے۔ سامنے دیکھا تو پتا چلا کہ اب یہاں پلے لینڈ نامی کوئی چیز نہیں ہے۔ اس پر جو دکھ ہم نے محسوس کیا وہ بیان سے باہر ہے۔ ہماری طرح جن لوگوں کی بچپن کی یادیں پلے لینڈ سے جڑی ہوں گی وہی اس دکھ کو محسوس کر سکتے ہیں ہم اپنے بچپن میں یہاں آیا کرتے تھے جب کچھ بڑے ہوئے تو بہن بھائیوں کو لانا شروع کیا، بڑی یادیں وابستہ ہیں یہاں سے

انہوں نے تین لاکھ روپے خرچ کر کے یہ یادگار بنا کر کراچی کے شہریوں کو عطیہ کر دی۔ اس کی تعمیر 1919ء میں شروع ہوئی اور 1920ء میں پایۂ تکمیل کو پہنچی۔ افتتاح لیڈی لوئڈ نے خود اپنے ہاتھ سے کیا۔ اب اس میں توسیع کر دی گئی ہے اور سیڑھیاں کافی دور تک جاتی ہیں۔

جمشید نسروانجی بلڈنگ

کراچی کھارادر میں بانکڑا ہوٹل کے سامنے یہ بلڈنگ ایک سو سال سے کھڑی تھی، مالکان نے اس کو 1991ء میں فروخت کرنے کا فیصلہ کر لیا کہ خریدنے والا اس کو توڑ کر یہاں کوئی بڑی شاندار بلڈنگ یا مال کھڑا کر دے گا۔ انہی دنوں انڈس ویلی اسکول آف آرٹس اینڈ آرکیٹیکچر والوں کو اپنے پلاٹ واقع کلفٹن پر کیمپس بنانے کا خیال آیا، وہ کوئی ایسا ڈیزائن چاہتے تھے جو آرکیٹیکچر کا شاہکار ہو۔ چند ہی دنوں بعد انڈس ویلی کے بانیوں میں سے ایک شاہد عبداللہ نے خوشی سے اعلان کیا کہ مجھے ایک خوبصورت پرانی عمارت مل گئی ہے جو کھارادر میں ہے اور برائے فروخت ہے ہم اس کو ضائع ہونے سے بچائیں گے اور اپنے پلاٹ پر منتقل کریں گے۔ یہ پتھروں سے بنی ہوئی تین منزلہ عمارت ہے جو دو بلاکس پر مشتمل ہے۔

اس کی تعمیر 1903ء میں جمشید کے والد نسروانجی رستم جی مہتا نے کروائی تھی، انہوں نے اسے اپنی کمپنی کے آفیسز اور گوداموں کے طور پر استعمال کیا بعد ازاں جمشید نسروانجی نے 1919ء میں اس کا دوسرا بلاک بنوایا جو آر سی سی سے بنوایا گیا۔

اور آج...... آج یہاں صرف مشینوں کی گھڑگھڑاہٹ ہے اور چاروں طرف اڑتی ہوئی مٹی ہے، پلے لینڈ کی جگہ ایک خالی قطعہ زمین ہے۔ کاش اس لینڈ مارک کو یوں تباہ نہ کیا جاتا جس سے کئی لوگوں کی جذباتی وابستگی ہے۔ مگر شاید آج جذبات کچھ نہیں صرف پیسا ہی سب کچھ ہے۔

یہاں فن لینڈ ہوا کرتا تھا جسے کچھ فاصلے پر لے جایا گیا ہے۔ اور یہ ماہی خانہ ہے یعنی ہمارا مطلب ہے ایکوریم۔ بھئی یہ ایکوریم تو بہت بعد میں ہوا ہے ہم تو بچپن میں ماہی خانہ دیکھنے جاتے تھے اور اس ستون میں اتنی بہت سی سیڑھیاں چڑھتے تھے۔ ان سیڑھیوں پر ہر وقت لوگوں کا جمگھٹا لگا رہتا تھا یہاں ہم نے ایک نوجوان کو پھول بیچتے دیکھا تھا اب تو وہ بزرگ ہو چکا ہوگا مگر یہ برسوں پرانی بات ہے وہ پھول بیچتا تھا اور لوگوں کی فرمائش پر کبھی الاپ اور کبھی گانے سناتا تھا بہت ہی اچھی آواز کا مالک تھا اور سریلا بھی تھا۔ اب نہ جانے کہاں ہوگا۔

جہانگیر کوٹھاری پریڈ

پہلے ان سیڑھیوں کی تعداد اتنی نہیں تھی یہ کراچی گورنمنٹ نے اضافہ کیا ہے۔ اس کی تاریخ کچھ یوں ہے کہ بمبئی کے گورنر سر جورج لوئڈ کی بیگم لیڈی لوئڈ پیئر کو یہ جگہ پسند آئی تھی اور اس نے یہاں گھاٹ اور پریڈ بنانے کے لیے جناب جہانگیر کوٹھاری سے کہا۔ جہانگیر کوٹھاری چیمبر آف کامرس کے ممبر بھی تھے

جب اس عمارت کو خریدنے کا فیصلہ ہو گیا تو اگلا سوال آیا کہ کیا اس کی منتقلی ممکن ہے؟ اس سلسلے میں مختلف آراء آئیں کسی نے ماہرین کو بلانے کا کہا کسی نے یونیسکو سے رجوع کرنے کا مشورہ دیا الغرض آخر میں فیصلہ ہوا کہ ہمیں خودانحصاری سے کام لینا ہے۔ کام شروع ہوا پہلے اس کی ڈرائینگز بنائی گئیں نقشے تیار ہوئے بیشمار تصویریں اتاری گئیں۔ پھر تین بڑی کمپنیوں سے رابطہ کیا گیا کہ اس کو محفوظ طریقہ سے توڑ کر منتقل کرنا ہے اور وقت بھی بچانا ہے۔ قرعہ فال حاجی محمد شاہ اکرم بلوچ کے نام نکلا صرف اس لیے نہیں کہ انہوں نے کم پیسے لگائے تھے بلکہ اس لیے کہ انہوں نے سب کچھ دیکھ کر اور سوچ سمجھ کر ایک حکمتِ عملی بنائی تھی۔ اس پورے عمل کے لیے تین مہینے مختص کیے گئے، مگر جائداد منتقلی وغیرہ کے عمل میں تین سال گزر گئے تھے۔ اس دوران انڈس اسکول کا کیمپس تعمیر ہو چکا تھا جس میں نسروانجی بلڈنگ کے لیے خاص جگہ مختص کر دی گئی تھی۔ بالآخر اپریل 1995ء میں کام شروع کیا گیا۔ ایک ایک پتھر ایک ایک لکڑی کے ٹکڑے پر نمبر ڈالے گئے اور سب چیزوں کو محفوظ طریقہ سے نکال کر منتقلی کا عمل شروع ہوا۔ یہ کام دنیا میں کوئی پہلی بار نہیں ہوا اس سے پہلے بھی عمارتیں منتقل کی گئی ہیں خاص طور پر مصر میں ایک ہرم کی عمارت کو اپنی جگہ سے جہاں پانی آ گیا تھا ایک دوسری بلند و محفوظ جگہ منتقل کیا جا چکا ہے۔ یہ سارا عمل ہائی کوالیفائیڈ ماہرین کی زیرِ نگرانی ان مزدوروں نے کیا جنہیں خاص تربیتی عمل سے گزارا گیا تھا مگر یہاں خاص بات یہ تھی کہ یہ کام اَن پڑھ مزدوروں نے اور ناتجربہ کار ٹیم نے مل کر ایسے کیا کہ 26000 پتھروں میں سے صرف پچاس پتھر ٹوٹے یا خراب ہوئے جنہیں تبدیل کر دیا گیا۔ روزانہ جتنے پتھر یا لکڑی کے ٹکڑے اکھاڑے جاتے تھے انہیں احتیاط سے ٹرکوں میں بھر کر کلفٹن پہنچایا جاتا تھا جہاں انہیں دوبارہ نقشہ کے مطابق جوڑا جاتا تھا، اس لحاظ سے دیکھا جائے تو اس ٹیم کی جتنی بھی تعریف کی جائے وہ کم ہے کہ جنہوں نے اتنی بڑی ذمہ داری اٹھائی اور اسے بخوبی پایۂ تکمیل کو پہنچایا۔ آج یہ عمارت کلفٹن میں شان سے سر اٹھائے کھڑی ہے اس میں اسٹوڈیوز کے علاوہ نمائشی ہال اور آرٹ گیلری بھی ہے۔

آج کا سفر تمام ہوا۔ قارئین سے التماس ہے کہ ماضی کو کچرا سمجھ کر نہ پھینک دیں ان جگہوں کی اہمیت سمجھیں اور ان کا وزٹ ضرور کریں۔

سنکی

حسن

پاگل پن کی لاتعداد اقسام ہیں۔ انہی میں سے ایک قسم کو سنک کہا جاتا ہے۔ اس مرض میں مبتلا افراد نہ صرف اپنا بلکہ اپنے ارد گرد کے لوگوں کی زندگی بھی حرام کردیتے ہیں اور اگر وہ سنکی کسی بڑے عہدے پر فائز ہوں تو سمجھ سکتے ہیں کہ اس کا اثر معاشرے پر کیا پڑتا ہے۔ ایسے ہی کچھ مشہور و معروف سنکیوں کا تذکرہ۔

سنک میں مبتلا افراد کا ذکر خاص

پاگل پن، خبطی یا سنکی ہونا ایک عام سی بات ہے۔
آپ نے اپنے اردگرد ایسے بے شمار لوگوں کو دیکھا ہوگا جن کی عادتیں عجیب ہوتی ہیں۔ جن کی حرکتیں عجیب ہوتی ہیں جو کبھی کبھی اپنے اور دوسرے لوگوں کے لیے نقصان دہ ثابت ہو جاتے ہیں۔ پھر ایسے لوگوں کا علاج کیا جاتا ہے۔ انہیں ذہنی شفا خانے میں رکھ دیا جاتا ہے۔
یہ تو عام لوگوں کے ساتھ ہوتا ہے اور اگر ایسے لوگ کسی ملک کے حکمران یا بادشاہ ہوں تو پھر کیا صورتِ حال ہوتی ہو گی۔
کون ان کو روکنے والا ہوگا، چاہے وہ کچھ بھی کرتے پھریں۔ وہ تو زمین والوں کے لیے خدا کا عذاب بن جاتے ہوں گے۔
آئیں ایسے کچھ حکمرانوں کو دیکھتے ہیں کہ وہ کس مزاج کے ہوتے تھے۔
بازنطین حکمران جسٹس نامی شخص 565 سے 576 تک حکومت کرتا رہا تھا۔ اس نے بہت شان و شوکت اور دبدبے کے ساتھ حکومت کی لیکن آخری عمر میں سنکی ہوتا چلا گیا تھا اور اس کی سنک کا یہ عالم تھا کہ اچھا بھلا صحت مند ہونے کے باوجود وہیل چیئر پر گھوما کرتا۔
اس کا خیال تھا کہ وہ اتنا پاکیزہ اور مقدس ہے کہ اگر اس نے پاؤں زمین پر رکھے تو ناپاک ہو جائے گا۔ لہٰذا اس نے وہیل چیئر پر بیٹھنا شروع کر دیا۔

اس کے بستر تک اسے وہیل چیئر پر لایا جاتا اور اسے اتار کر بستر پر لٹا دیا جاتا۔ ایک بار لوگوں کا یہ خیال ہوا کہ شاید وہ مفلوج ہوگیا ہے۔ اس نے اس خیال کو غلط ثابت کرنے کے لیے کئی میل پیدل چل کر دکھایا۔ اس کے بعد پھر وہیل چیئر پر بیٹھ گیا۔

اس سنک کا کوئی جواب ہوسکتا ہے؟

اب ایک اور صاحب کو لیں۔

یہ تھے سلطنتِ عثمانیہ کے مشہور حکمران ابراہیم صاحب، ان کو موٹاپے کا شوق تھا۔ خود ہی اس کوشش میں رہتے کہ زیادہ سے زیادہ موٹے ہوجائیں اور اپنے اردگرد بھی موٹوں ہی کو دیکھنا پسند فرماتے تھے۔

موٹے لوگوں پر ان کی عنایات بہت خاص ہوا کرتیں۔ وہ ایسے لوگوں کو دربار میں اچھے عہدے دے دیا کرتے۔

موصوف کے حرم سرا میں بیویوں کے علاوہ 280 داشتائیں بھی تھیں اور سب کی سب بے تحاشا موٹی (ذرا اپنی چشم تصور سے یہ دیکھیں کہ جب 280 موٹی موٹی عورتیں ہر طرف گھوم رہی ہوں گی تو کیسا گول مٹول منظر ہوتا ہوگا)۔

لیکن شوق پھر شوق ہے۔ اتنا ہی نہیں۔ اب ذرا آگے کا بھی سنیں۔ ان کو یہ خبط بھی تھا کہ تعداد 280 ہی رہے۔ اب اتفاق سے کوئی موٹی خاتون حرم سرا سے باہر دکھائی دے گئی اور وہ انہیں پسند آگئی تو وہ اسے اٹھوا کر حرم سرا میں لے آتے اور کسی ایک پرانی والی کو نہر یا تالاب میں ڈبو کر مروا دیتے۔ تعداد 280 ہی رہتی۔

کہتے ہیں کہ انہوں نے اس طرح سینکڑوں عورتوں کو مروا بھی دیا تھا۔

فرانس کا کنگ چارلس، اس شخص پر دو قسم کی سنک سوار تھی۔ ایک سنک تو یہ تھی کہ اسے خون بہانے کا بے حد شوق تھا۔ وہ اپنے وفادار سرداروں کی وفاداری کا امتحان اس طرح لیا کرتا کہ ان کی گردنیں اڑا دینے کا حکم جاری کرتا اور لازم تھا کہ وہ بے چارے سردار مرتے وقت اس کی تعریف کرتے ہوئے مریں۔ اگر کوئی ایسا نہیں کرتا تو اس کے خاندان کو مار دیا جاتا۔

اس لیے مرنے والے سرداروں کو یہ تو معلوم تھا کہ وہ مر رہے ہیں اور اگر انہوں نے بادشاہ کی تعریف نہیں کی تو ان کا خاندان بھی مارا جائے گا۔ اس لیے وہ بے چارے بادشاہ کی شان میں قصیدے پڑھتے ہوئے مرتے تھے۔

چارلس کو ایک اور وہم بھی تھا۔ اس کا خیال تھا کہ قدرت نے اسے ایک ایسے شیشے سے بنایا ہے جو پانی لگنے سے تڑخ جائے گا اس لیے اس نے ساری زندگی نہانے سے گریز کیا۔

کون اندازہ کرسکتا ہے اس کے جسم سے اٹھنے والی بدبوؤں کو اہل دربار کس طرح برداشت کرتے ہوں گے، یہ وہی جانیں۔

روس کا بادشاہ انا، کو ایک شوق تھا اس نے اپنے دربار میں سنجیدہ لوگوں سے زیادہ مسخرے بھر رکھے تھے۔ جن کا فرض منصبی ہی یہی تھا کہ بادشاہ سلامت کو ہنساتے رہیں۔ اس لیے اس کے دربار میں کام تو کم ہوتا تھا لیکن لطیفے زیادہ سنائے جاتے تھے۔ ہر قسم کے لطیفے۔

پورا دربار ہر وقت ہنستا ہی رہتا تھا۔

اس کے بالکل برعکس سویڈن کے بادشاہ ایرک کو ہنسنے ہنسانے سے سخت نفرت تھی۔

ہنسی تو دور کی بات ہے اس کے دربار میں کسی کو مسکرانے کی بھی اجازت نہیں تھی۔ اگر کوئی ہنستا ہوا پایا جاتا تو اسے سخت سزا دی جاتی۔ اس کا خیال تھا کہ اسے زہر دے کر مارا جائے گا۔ کھانے پینے کی ہر چیز کو چیک کر کے اس کے سامنے رکھا جاتا تھا لیکن اس احتیاط کا کوئی فائدہ نہیں ہوا۔ اس کی موت زہر ہی سے ہوئی تھی۔

خبطی پن کی اس دوڑ میں خواتین بھی کسی سے کم نہیں تھیں۔ مثال کے طور پر جورجیا کے پرنسز الیگزینڈرا اس کو وہم تھا کہ وہ بچپن میں شیشے کا ایک گلاس نگل گئی تھی۔ اس لیے وہ اٹھنے بیٹھنے چلنے پھرنے میں انتہائی احتیاط کیا کرتی کہ کہیں وہ گلاس اندر ہی ٹوٹ نہ جائے۔

اس عورت کو صفائی کا اتنا خبط تھا کہ سب لوگ عاجز آگئے تھے۔ اس نے زندگی بھر سفید لباس پہنا۔ اس کا خیال تھا کہ شیشے والی عورتوں کو سفید لباس پہننا چاہیے۔

آسٹریا کا بادشاہ فرڈی نینڈ اتنا جنونی تھا کہ اس نے کبھی کچھ بول کر نہیں دیا۔ حالانکہ وہ گونگا ہرگز نہیں تھا لیکن اسے بولنے کا شوق ہی نہیں تھا۔

اس نے پوری زندگی میں شاید دو چار ہی جملے بولے ہوں گے۔ اس کا کہنا تھا کہ بولنا آنے کا مطلب یہ نہیں کہ بولو بھی۔

خاموشی سب سے بہتر ہوتی ہے۔ انسان کو خاموش رہنا چاہیے۔ اپنے سارے احکامات اشاروں سے دیا کرتا۔

اب چین کے ایک بادشاہ ژین ربے کا حال سن لیں۔ موصوف کا شوق بچوں والا تھا۔ وہ محل کے وسیع و عریض باغ میں رات کے وقت آنکھ مچولی کھیلا کرتے تھے اور یہ حکم تھا کہ ان کے

سارے وزراء اس کھیل میں ان کے ساتھ ہوں۔ لہٰذا پوری کابینہ رات کے وقت آنکھ مچولی میں مصروف ہوتی۔

وزیر خارجہ کسی درخت کے پیچھے چھپے ہوئے ہیں تو وزیر دفاع کسی فوارے کے نیچے دبکے ہوئے ہیں۔

اندازہ لگائیں کہ کیسی صورتِ حال ہوتی ہوگی۔

اب مصر کے آخری بادشاہ شاہ فاروق کی طرف آجائیں۔ ان کے شوق سب سے نرالے تھے۔

ایک بار مذاق میں چرچل کی گھڑی چوری کرلی تھی۔ اس پر جو لے دے ہوئی وہ ایک الگ کہانی ہے۔

ایک بار خواب دیکھا کہ وہ جنگل میں جا رہے ہیں اور کچھ شیروں نے ان پر حملہ کردیا ہے۔ دوسری صبح بیدار ہوکر انہوں نے اپنے وزیروں کو اپنا خواب سنایا اور یہ فرمائش کی کہ انہیں چڑیا گھر جانا ہے۔ بادشاہ کی خواہش تھی، کیسے پوری نہیں ہوتی۔ پورا قافلہ چڑیا گھر پہنچ گیا۔ وہاں جاتے ہی انہوں نے چڑیا گھر کے سارے شیروں کو گولی ماردی۔

کون اندازہ کرسکتا ہے ان کے زورِ بازو کا۔

پروشیا کے بادشاہ فریڈرک کا جنون بھی کسی سے کم نہیں تھا۔ اسے الٹے سیدھے تجربات کرنے کا بہت شوق تھا۔

ایک بار اس کے ذہن میں یہ بات آئی کہ اگر بہت لمبے آدمی کی شادی کسی چھوٹے قد کی عورت سے کرادی جائے تو اولاد کیسی ہوگی۔

بس اس خبط کے سوار ہوتے ہی اس نے پکڑ پکڑ کر لمبے آدمیوں کی شادیاں چھوٹی قد کی عورتوں سے کرادیں۔

خدا جانے اولادیں کیسی ہوئی ہوں گی۔ بہر حال یہ اس کا ایک دلچسپ مشغلہ تھا۔

چین ہی کا ایک بادشاہ خاکن شی۔ اسے یہ خوف تھا کہ رات کے وقت قتل کردیا جائے گا۔ اس لیے ساری زندگی کسی ایک بستر یا ایک کمرے میں نہیں سویا۔

کبھی ایک جگہ تو کبھی دوسری جگہ۔ کباب سیخ ہیں ہم کروٹیں ہر سو بدلتے ہیں۔ جو جل اٹھتا ہے یہ پہلو تو وہ پہلو بدلتے ہیں۔

اسپین کی ملکہ جوانا کا یہ خیال تھا کہ اس کا شوہر دنیا کا سب سے بے وفا شخص ہے۔ اس لیے اس نے ساری زندگی کسی عورت کو اپنے شوہر کے قریب نہیں آنے دیا۔

چلیں یہاں تک تو ایک عام سی بات ہوسکتی ہے لیکن کمال اس وقت ہوا جب شوہر کی موت واقع ہوگئی۔ اس نے لاش کے قریب بھی کسی عورت کو آنے کی اجازت نہیں دی۔ اس کا خیال تھا کہ وہ عورت کو دیکھتے ہی زندہ ہوکر اس سے فلرٹ کرنے لگے گا۔ ہے کوئی جواب اس پاگل پن کا۔

برانڈن برگ کی ماریا ایلونورا۔ اس ملکہ کو بیٹے کا شوق تھا لیکن بدقسمتی سے اس کے یہاں بیٹی پیدا ہوگئی۔ بس اس کی پیدائش کے بعد ہی اس کا پاگل پن شروع ہوگیا۔ وہ اپنی پیدا ہونے والی بیٹی کی دشمن بن گئی۔

اس نے کئی بار اس بچی کو مار دینے کی کوشش کی کبھی پانی میں پھینک کر، کبھی منہ پر تکیہ رکھ کر لیکن اس بچی کی خوش قسمتی یہ تھی کہ اس ملکہ کے شوہر کو بچی سے بہت محبت تھی۔ وہ ہر وقت ملکہ کی نگرانی کرتا رہتا۔ اور درجنوں بار اس نے اپنی بچی کی جان بچائی۔

سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ سب زندگی کے کیسے پہلو ہیں۔ انسان کی فطرت کیسی ہوتی ہے اور انسان ہی کی فطرت میں اتنا تضاد کیوں ہوتا ہے۔

آپ نے اس ملکہ کے بارے میں جان لیا جسے اپنی بیٹی سے شدید نفرت تھی۔

اب روس کے نیوزور کا حال سنیں۔ اس بادشاہ کو اپنی بیٹی سے بے انتہا محبت تھی۔ جب دو سال کی عمر میں اس کی بیٹی کا انتقال ہوا تو اس نے قسم کھائی کہ وہ پورے ملک کے ہر گرجا گھر میں جا کر اس کے لیے دعا کرے گا۔

اور اس نے ایسا ہی کیا۔ وہ پورے ملک کا دورہ کرکے ہر گرجا گھر میں جا کر دعائیں کیا کرتا۔ بڑی مشکلوں سے اسے سمجھا سمجھا کر اس قابل کیا گیا تاکہ وہ دربار و کاروبار سلطنت کی طرف توجہ دے۔

اسپین کا ایک بادشاہ تھا کارلوس۔ اس کا شوق بہت کھانا پینا تھا۔ یعنی وہ ہر وقت کچھ نہ کچھ کھاتا رہتا تھا۔ اس شخص کو کبھی فارغ نہیں دیکھا گیا۔

اس کے دربار میں غیر ملکی سفیر آتے تو وہ ان کے سامنے بھی اپنے پسندیدہ مشغلے میں مصروف رہتا تھا۔ یہ تو چند کا احوال تھا۔ ان کے علاوہ اور نہ جانے کتنے ہوں گے۔

پاگل پن یا خبطی ہونا کوئی غیر معمولی بات نہیں ہے۔ اس دنیا میں کروڑوں اس مزاج کے ہوں گے۔ لیکن ان کا نوٹس نہیں لیا جاتا۔

پرابلم وہاں ہوتی ہے جہاں حکمران اور بادشاہ حضرات پاگل پن یا سنکی پن کے مریض بن جائیں۔ اس وقت تاریخ ان کا نوٹس ضرور لیتی ہے۔ ان کے پاگل پن کو محفوظ کرلیا جاتا ہے۔

عجیب شخص

انور فرہاد

پاکستان کی فلمی صنعت محدود وسائل میں بھی کمال دکھاتی تھی، معمولی اخراجات میں اعلیٰ معیار کی فلمیں بنانا پاکستان کا خاصا تھا کیوں کہ ہمارے ہاں "ٹیلنٹ" کی کبھی کمی نہ رہی ہے۔ اس بار ہم ایک ایسے ہی ٹیلنٹڈ شخص کا تذکرہ کررہے ہیں جس نے ہر مرحلے پر کمال دکھایا۔ اس نے فلمی صنعت کے سورمائوں کے اندازوں کو ہر گام پر غلط ٹھہرایا۔

فلمی دنیا کی ایک نامور شخصیت کا تذکرہ خاص

ان دنوں میں ایک فلمی ہفت روزہ نگار میں تھا۔ کاپی پریس جاچکی تھی۔ میں آیندہ شمارے کے لیے مضامین منتخب کررہا تھا کہ میرے دوست خانزادہ آگئے۔ فلمی تبصرے میں وہ ایک مقام رکھتے تھے۔ ہم دونوں فلمی دنیا کے زوال پر باتیں کرنے لگے۔ ان کا خیال تھا کہ ایک سازش کے تحت فلمی صنعت کو تباہ کیا جارہا ہے۔ ہمارے ہاں ٹیلنٹ کی کمی نہیں اور چن چن کر ٹیلنٹ پرسن کو پریشان کیا جارہا ہے۔ لچے لفنگے اسٹوڈیو میں گھستے جارہے ہیں جس کی وجہ سے

عزت دار اپنا دامن بچانے کے لیے فلمی صنعت سے دوری رکھنے لگے ہیں۔ اس بحث میں اسلم ڈار کا بھی ذکر آیا تھا۔
اس واقعے کے کچھ عرصے بعد میں ہفت روزہ سے ایک دوسرے ہفت روزہ چلا گیا تو خانزادہ سے بھی ملاقات ختم ہو کر رہ گئی۔ آج اتنے عرصے بعد اس سے ملاقات ہوئی اس کے ہاتھ میں ایک فلمی اخبار تھا جس کی سرخی بتا رہی تھی کہ اسلم ڈار کا انتقال ہو گیا۔ میں نے اخبار لے کر دیکھا پھر کہا یہ تو پرانا ہے۔
''ہاں پرانا ہے مگر اس لیے ساتھ لیے گھوم رہا ہوں کہ اس میں فلمساز و ہدایت کار اسلم ڈار کے انتقال کی خبر ہے۔''
''ارے بھئی! یہ تو پرانی خبر ہے۔'' میں نے کہا۔
''مرحوم ایک اچھے فلم میکر تھے۔ ان کی فلمیں ہمیشہ ان کی یاد دلاتی رہیں گی۔'' ان پر ایک مضمون لکھنا ہے۔
''جی ہاں، اچھے لوگ اپنے اچھے کام کی وجہ سے ہمیشہ زندہ رہتے ہیں۔ مرنے کے بعد بھی نہیں مرتے۔ ہم قلمکاروں کا فرض ہے کہ قارئین کو یاد دلاتے رہیں۔''
''میں نے ان کی کوئی فلم نہیں دیکھی ہے۔ مگر ان کی فلم 'بشیرا اور دل لگی' کے بارے میں سنا ہے کہ بڑی اچھی فلمیں تھیں۔'' خانزادہ نے کہا۔
''ہاں وہ اس زمانے کے فلم ساز و ہدایت کار تھے جب لوگ فلم والوں کو گناہ گار تصور کرتے تھے۔ ان کے بارے میں آپ کیا جانتے ہیں کچھ بتائیں۔''
میں خیالوں کی دنیا میں کھو گیا تبھی خانزادہ نے کہا۔
''کیا ہوا۔ کیا سوچنے لگے؟''
''سوچ رہا ہوں کہاں سے شروع کروں؟''
''سوچنے کی کیا بات ہے۔ وہ جو کسی نے کہا ہے میں ابتدا سے کہتا ہوں، تا انتہا سنو۔ تو بس شروع ہو جائیں۔''
اور میں شروع ہو گیا۔ ''اسلم ڈار خالص لاہوری تھے۔ انہوں نے اسی شہر میں جنم لیا۔ قیام پاکستان کے وقت وہ آٹھویں جماعت کے طالب علم تھے۔''
''گویا وہ اپنے پیارے پاکستان سے عمر میں کوئی دس بارہ برس بڑے ہوں گے؟''
''ہاں ان کی عمر کچھ ایسی ہی ہوگی۔ 1950ء میں انہوں نے میٹرک پاس کر لیا تو ان کے جی میں آیا کیوں نہ فلم لائن جوائن کی جائے۔''
''ایسا انہوں نے کیوں سوچا؟ اس کی کوئی وجہ تو ہو گی؟'' خانزادہ پھر پوچھ بیٹھے۔
''ہاں بھئی! بغیر وجہ کے کوئی بات نہیں ہوتی۔'' میں نے انہیں سمجھایا۔ ''ایک وجہ تو یہ ہو سکتی ہے کہ لاہور کی لٹی پٹی فلم انڈسٹری نئے سرے سے بنائی اور سنواری جا رہی تھی اور دوسری وجہ ان کے والد محترم ایس ایم ڈار (محمد شفیع ڈار) تھے۔ وہ بھی فلم انڈسٹری کی طرف مائل تھے۔ انہوں نے 1951ء میں بطور اسسٹنٹ کیمرا مین فلمی دنیا میں قدم رکھ دیا تھا۔ نوجوان اسلم ڈار نے باپ کو فلم انڈسٹری کا حصہ بنتے دیکھا تو انہوں نے اپنی خواہش کا اظہار ان سے کر دیا۔ بڑے ڈار نے چھوٹے ڈار کو بھی عکاسی کے شعبے ہی سے فلمی کیریئر شروع کروایا۔ ان دنوں جعفر شاہ بخاری معروف عکاس تھے۔'' ایس ایم ڈار نے بخاری صاحب سے کہا۔
''میرا بیٹا بھی فلم لائن اختیار کرنا چاہتا ہے۔ میری درخواست ہے کہ آپ اسے اپنی شاگردی میں فلم فوٹو گرافی کی تربیت دیں۔''
''ٹھیک ہے اسے میرے پاس بھیج دیجیے گا۔''
''اس طرح اسلم ڈار، جعفر شاہ بخاری کے اسسٹنٹ بن کر ان سے عکاسی کی تربیت حاصل کرنے لگے۔'' شاہ جی نے نوجوان شاگرد سے کہا۔
''میاں صاحبزادے! اگر تم کچھ سیکھنا چاہتے ہو، کچھ بننا چاہتے ہو، انڈسٹری میں اپنا کوئی مقام بنانا چاہتے ہو تو تم محض میٹرک پاس ہو کر کچھ نہیں کر سکتے۔ اس لائن میں پڑھے لکھے لوگ ہی ترقی کرتے ہیں۔'' اسلم ڈار واقعی کچھ کرنا چاہتے تھے کچھ نام پیدا کرنا چاہتے تھے اس لیے انہوں نے استاد کی بات گرہ سے باندھ لی اور حسرت موہانی نے جس طرح جیل میں چکی کی مشقت کے ساتھ مشق سخن جاری رکھی تھی، اسی طرح اسلم ڈار نے بھی اسسٹنٹ کیمرا مینی کی تھکا دینے والی مشقت کے ساتھ ساتھ مزید پڑھنے لکھنے کا سلسلہ بھی جاری رکھا۔''
میں ذرا رکا تو خانزادہ بول پڑے۔ ''وہ دور بڑا اچھا تھا۔ نوجوان بڑوں کے کہے کو ہوا میں نہیں اڑاتے تھے۔ انہیں لاکھوں کا بول سمجھ کر ان پر عمل کرتے تھے اور کامیاب ہوتے تھے۔'' پھر مجھے مخاطب کر کے کہا۔ ''اب اپنی بات آگے بڑھائیں۔''
اسلم ڈار بڑی محنت، لگن اور دل جمعی کے ساتھ اسسٹنٹ کیمرا مین کے طور پر کام کرتے رہے۔ جعفر شاہ بخاری کی بہترین تربیت نے انہیں جلد ہی با اعتماد کیمرا مین بنا دیا۔ کئی سال کی مشقت کے بعد استاد نے ان کی کارکردگی

کے حوالے سے کہا۔

''اب تم مکمل عکاس بن گئے ہو اور آزادانہ طور پر فوٹو گرافی کر سکتے ہو۔''

''تو اسلم ڈار ان ڈی پنڈنٹ عکاس بن گئے۔''

''ہاں جس طرح تعلیم مکمل کرنے کے بعد لوگ ملازمت کرنے کے قابل ہو جاتے ہیں اسلم ڈار بھی عکاسی کی تربیت مکمل کرنے کے بعد بطور عکاس کام کرنے لگے۔ اس لحاظ سے ان کی پہلی فلم ''نوراں'' تھی جس کے ہدایت کار ایم اے خان تھے۔ یہ فلم 1957ء میں ریلیز ہوئی تھی۔ بطور عکاس ان کی کارکردگی بہت اچھی تھی اس لیے دوسرے فلم ساز و ہدایت کار اس ہونہار عکاس کی خدمات حاصل کرنے لگے۔ ایک کے بعد دوسری اور دوسری کے بعد تیسری فلم ریلیز ہوتی گئی۔ اس طرح اسلم ڈار کی بطور عکاس قابل ذکر فلموں میں سردار، سلطنت، چھومنتر، ڈولی، ناچے ناگن، بابے دی بین، شہباز حسن آف علی بابا، تاج اور تلوار، سمیرا، پھولی ای، خیبر پاس، رقاصہ، کونگا، البیلا، لالہ رخ اور مجھے جینے دو شامل ہیں۔''

''آپ نے بتایا تھا۔'' خانزادہ میرے خاموش ہوتے ہی بول پڑا۔ ''بڑے ڈار یعنی شفیع محمد ڈار نے بھی اسسٹنٹ کیمرا مین کی حیثیت سے اپنے کیریئر کا آغاز کیا تھا۔ کیا انہوں نے کوئی ترقی نہیں کی؟ بیٹا باپ سے آگے نکل گیا۔ باپ وہیں کھڑا رہا؟''

''ارے نہیں یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ بڑے ڈار چھوٹے ڈار سے پہلے اپنی تربیت مکمل کر کے پہلے فل فلیج عکاس بنے پھر ہدایت کاری شروع کر دی اور اپنی عکاسی کی طرح اس فیلڈ میں بھی اپنی صلاحیتوں کا لوہا منوایا۔ ایس ایم ڈار کی بطور ہدایت کار دلا بھٹی، سردار اور سلطنت جیسی کامیاب فلمیں ان کے نام کو ہمیشہ زندہ رکھیں گی۔''

''گویا اسلم ڈار نے اپنے والد کی فلم سردار اور سلطنت کی بھی عکاسی کی۔''

''ہاں سید صاحب! جب دوسرے ان کے بیٹے کی صلاحیتوں سے فائدہ اٹھا رہے تھے تو وہ کیوں اس سے محروم رہتے۔ بات مرحوم اسلم ڈار کے حوالے سے ہو رہی ہے تو یہ بتانا ضروری ہے کہ انہوں نے بھی عکاسی کو اپنی آخری منزل نہیں سمجھا۔ انہوں نے بھی باپ کے نقش قدم پر چلتے ہوئے اپنی دوسری اننگز کا آغاز ہدایت کاری سے کر دیا۔ ان کی بطور ہدایت کار پہلی فلم ''دارا'' تھی جو 1968ء میں نمائش پذیر ہوئی تھی۔ اسلم ڈار کی پہلی فلم ہونے کے باوجود یہ ایک کامیاب فلم ثابت ہوئی۔ اس فلم کی ہیروئن رانی اور ہیرو نصر اللہ بٹ تھے جو مسٹر پاکستان کا ٹائٹل رکھنے والے باڈی بلڈر تھے۔ دارا کی کامیابی نے انہیں جو حوصلہ دیا اس کی وجہ سے وہ بخی لٹیرا، آخری چٹان، مسٹر 303، مجرم کون، دل لگی، وعدہ، سیاہ اناڑی، بڑے میاں دیوانے، بشیرا، عشق نچائے گلی گلی، گوگا، زبیدہ، بابل صدقے تیرے، انوکھا راج، پھول، ہم تمہارے ہیں، قدرت دا انتقام، زرق خان، پہلی نظر جیسی کامیاب اور یادگار فلمیں بنانے کے قابل ہوئے۔ 1957ء میں اسلم ڈار نے بطور عکاس اپنی فلمی زندگی کی جو ابتدا کی تھی 1998ء میں بطور ہدایت کار اپنی آخری فلم ''ڈولی سجا کے رکھنا'' سے اس کا اختتام کیا۔''

''تو کیا انہوں نے ''ڈولی سجا کے رکھنا'' کے بعد کسی اور فلم کی ڈولی نہیں سجائی؟''

''نہیں۔''

''اس کی کوئی وجہ؟''

''سب سے اہم بات جو سمجھ میں آتی ہے وہ یہ ہے کہ وہ منفرد سوچ اور وژن کے فلم میکر تھے۔ وہ اپنی نئی فلم میں ایک Variation دیا کرتے تھے۔ یعنی ان کی ہر فلم اگلی سے یکسر جدا ہوتی تھی۔ جب کہ ڈسٹری بیوٹرز اور سینما والے چاہتے تھے کہ وہ بس ایک ہی طرح کی فلم بنائیں۔ ان کی پہلی فلم ''دارا'' سپر ہٹ ہوئی تو تقسیم کاروں نے انہیں مجبور کیا کہ وہ ایسی ہی ایکشن فلم بنائیں۔ اگرچہ انہوں نے ایک رومانی فلم کی پلاننگ کر رکھی تھی۔ مگر جو لوگ فلم خریدتے اور چلاتے تھے انہوں نے انہیں یہ فلم بنانے نہیں دی۔ مجبوراً انہیں ''بخی لٹیرا'' بنانی پڑی۔ یہ بھی ایکشن فلم تھی مگر ''دارا'' کا تسلسل نہیں تھی۔ اس کا تھیم اور موضوع مختلف تھا۔ ان لوگوں کی جانب سے ان پر یہ دباؤ اور پریشر بہت دنوں تک جاری رہا۔ یہاں تک کہ مجبوراً انہیں خود اپنا ڈسٹری بیوشن دفتر کھولنا پڑا۔ اس دوران چند فلمیں انہوں نے اپنی مرضی سے بنائیں مگر اس کے بعد بھی فلم ٹریڈ کے لوگوں نے ان کے ساتھ کوئی اچھا سلوک نہیں کیا۔ لہٰذا دل برداشتہ ہو کر انہوں نے فلم بنانا ہی چھوڑ دیا۔ لیکن فلم انڈسٹری اور فلم والوں سے پیار محبت کا رشتہ برقرار رکھا۔ وہ فلم انڈسٹری کی ہر دلعزیز شخصیت تھے۔ وہ تاحیات فلم ڈائریکٹرز ایسوسی ایشن کے صدر رہے۔ مرتے دم تک فلم انڈسٹری کی بحالی کے لیے سرگرم رہے۔ 22 دسمبر 2014ء کو انہوں نے ہدایت کار داؤد

بت سے بڑے خوشگوار انداز میں فون پر بات کی تھی اور کہا تھا میں 24 دسمبر کی شام کو ایورنیو اسٹوڈیو ضرور آؤں گا مگر وہ 24 دسمبر 2014ء کو حسبِ وعدہ ایورنیو اسٹوڈیو نہیں پہنچے۔ ایسا دل کا دورہ پڑا کہ اپنے مالکِ حقیقی کے پاس جا پہنچے۔

میں یہاں تک کہہ کر خاموش ہوا تو خانزادہ نے کچھ نہیں کہا۔ اچھے لوگ اپنی زندگی میں بھی سب کو متاثر کرتے ہیں اور مرنے کے بعد دنیا سے گزرنے کے بعد بھی۔ ذرا دیر بعد میں ہی بولا۔ ''اسلم ڈار نے اپنی فنی زندگی کے بیشتر ایام ایورنیو اسٹوڈیو میں گزارے تھے اور اسی اسٹوڈیو میں اپنی کئی خوب صورت فلمیں بنائی تھیں۔ 28 دسمبر کو اسی نگار خانے میں مرحوم کے فلمی احباب قرآن خوانی اور فاتحہ خوانی کے لیے جمع تھے اور ان کی روح کو ایصالِ ثواب پہنچا رہے تھے۔''

میں ایک بار پھر خاموش ہو گیا۔ کچھ دیر تک کمرے کی فضا اداس اور سوگوار رہی۔ پھر خانزادہ کی آواز نے خاموشی کا طلسم توڑا۔ ''اسلم ڈار ایک فلم والے تھے مگر اچھے انسان تھے۔ یہ ان کی اچھائی ہی تھی کہ آج اس وقت ہم ان کے گزر جانے کے ذکر پر اداس ہو رہے ہیں۔ وہ ایک پڑھے لکھے، تربیت یافتہ فلم میکر تھے۔ انہوں نے اچھی، کامیاب اور دلچسپ فلمیں بنا کر جہاں پاکستانی فلمی صنعت و تجارت کو فائدہ پہنچایا، تقویت بخشی وہاں عوام کو بھی صاف ستھری اور معیاری تفریح فراہم کی۔'' اتنا کہہ کر وہ ذرا رک کے پھر بولے۔ ''ابھی اسلم ڈار کے بارے میں جو باتیں بتائی گئیں، ان سے اندازہ ہو گیا ہوگا کہ فلم والوں میں بھی اچھے لوگ ہوتے ہیں اور اچھی اور ایسی فلمیں بھی بنائی جاتی ہیں جو تفریحی مقاصد پوری کرنے کے علاوہ ملک اور معاشرہ کی تعمیر و ترقی میں بھی مثبت کردار ادا کرتی ہیں۔''

''جی ہاں فلمیں ابلاغ کا سب سے مؤثر ذریعہ ہیں۔ اچھے پڑھے لکھے اور باشعور فلم والے اپنی فلموں کے ذریعے بھی عوام الناس کو اچھائی کی طرف راغب کرتے ہیں اور برائی سے دور رہنے کی ترغیب دیتے ہیں۔''

''آج کی اس نشست میں چونکہ ہم مرحوم اسلم ڈار کے حوالے سے باتیں کر رہے ہیں۔'' میں نے مزید کہا۔ ''اس لیے میں یہ بتانا ضروری سمجھتا ہوں کہ ایک اچھے ہدایت کار اور فلم ساز کو کن دشواریوں سے گزرنا پڑتا ہے۔ ان کے راستے میں کیا کیا رکاوٹیں آتی ہیں۔'' میں ذرا رکا پھر خانزادہ کو مخاطب کرتے ہوئے بولا۔ ''اسلم ڈار اپنی ایکشن فلم ''دارا'' کی کامیابی کے بعد ایک مکمل رومانوی فلم بنانا چاہتے تھے مگر فلم ٹریڈ کے لوگوں نے انہیں یہ فلم بنانے نہیں دی۔ یہ فلم ''دل لگی'' تھی۔ اسلم ڈار منفرد سوچ کے مالک تھے اور منفرد اور اچھوتے موضوعات کی فلمیں بنانے کے قائل تھے۔ انہوں نے اپنی پہلی فلم ''دارا'' بنانے کے دوران ہی اپنی دوسری فلم کی پلاننگ شروع کر دی تھی اور فیصلہ کر لیا تھا کہ ان کی دوسری فلم مکمل رومانوی اور سوشل ہوگی اور اس کا نام وہ دل لگی رکھیں گے۔ ''دارا'' سپرہٹ ثابت ہو چکی تو انہوں نے اپنے فلم ساز میاں مشتاق سے کہا۔ ''میں نے دوسری فلم کی منصوبہ بندی کر لی ہے۔ یہ معاشرتی موضوع پر ایک رومانٹک فلم ہوگی۔ میں نے اس کا ٹائٹل ''دل لگی'' سوچا ہے۔ آپ کا کیا خیال ہے؟''

میاں صاحب نے کہا۔ ''ٹھیک ہے یہی فلم بنایئے۔''

اپنے فلم ساز کی طرف سے رضامندی ملنے کے بعد اسلم ڈار نے ''دل لگی'' کے لیے کام کرنا شروع کر دیا۔ عام طور پر سب سے پہلے گانوں کی تیاری کا کام شروع ہوتا ہے۔ اسلم ڈار ایک دن اپنے موسیقار رفیق علی کے ساتھ گانوں کے سلسلے میں اہم صلاح و مشورہ کر رہے تھے۔ ان کے ساتھ شاعر مشیر کاظمی بھی موجود تھے۔ کیوں کہ ان ہی کو سارے گیت لکھنے تھے۔ ابھی ان کی بات چیت جاری ہی تھی کہ ان کے دفتر میں پنجاب سرکٹ کے معروف تقسیم کار نسیم پاپولر تشریف لائے۔ ان کے ساتھ کراچی کے اسٹار فلمز کے مشیر علی رمزی بھی تھے جنہوں نے کراچی میں دارا ریلیز کی تھی۔ سلام دعا کے بعد انہوں نے پوچھا۔ ''آگے آپ کا کیا پروگرام ہے؟''

اسلم ڈار بولے۔ ''میں اپنی اگلی فلم ''دل لگی'' کی تیاری کر رہا ہوں۔''

''یہ دل لگی'' کیا ہے؟'' انہوں نے پوچھا۔

''یہ ایک رومانٹک فلم ہے۔'' اسلم ڈار نے بتایا۔ ''ابھی میں نے اس فلم کے لیے ایک مکھڑا پسند کیا ہے۔ بڑا خوب صورت میوزک ہے۔ آپ سنیں گے تو ایک دم پھڑک اٹھیں گے۔''

آنے والے مہمان ایک دم بھڑک اٹھے۔ ''ہمیں کسی دل لگی ول لگی سے کوئی دلچسپی نہیں۔ تم اگر ''دارا'' جیسی کوئی ایکشن فلم بناؤ گے تو ہم اسے خرید لیں گے۔ ورنہ چائے پلاؤ ہم چلتے ہیں۔''

بے چارے اسلم ڈار نے انہیں قائل کرنے کی بڑی

کوشش کی کہ یہ ایک اچھا سبجیکٹ ہے اور یہ بھی بہت کامیاب ہوگی مگر ڈسٹری بیوٹرز اپنی بات پر اڑے رہے۔ چائے پی اور چلے گئے۔ ان کے جانے کے بعد یہ لوگ ایک دوسرے کا منہ تکتے رہ گئے۔ اسلم ڈار کو اس موقع پر یہ سوچنا پڑا کہ وہ مالی طور پر اتنے مستحکم نہیں کہ اپنی پسند کے موضوع پر فلم بنائیں۔ ڈسٹری بیوٹرز ان کی ضرورت تھے۔ اس سلسلے پر ان کے فلم ساز میاں مشتاق نے بھی ان کو مشورہ دیا کہ ہمارے لیے یہی بہتر ہے کہ ہم اسی پیٹرن کی فلم بنائیں جیسی تقسیم کار چاہتے ہیں۔ لہٰذا اس ''دل لگی'' کا پروگرام ملتوی کردیں اور اسلم ڈار کو ایسا ہی کرنا پڑا۔ انہوں نے ایکشن سے بھرپور ایک فلم ''آخری چٹان'' شروع کی۔ اس فلم میں بھی نصراللہ بٹ کو ہیرو اور رانی کو ہیروئن کے لیے منتخب کیا۔ جب کہ سلطان راہی کو پہلی بار سائیڈ ہیرو کے طور پر پیش کیا۔ دیگر کرداروں کے لیے ترانہ، ایم ڈی شیخ، گل زمان، ساقی، حامد حسن اور سلمٰی ممتاز کو کاسٹ کیا۔ یہ ایک کاسٹیوم ایکشن فلم تھی۔ اس فلم کی ابتدا ہی ہوئی تھی کہ نسیم پاپولر اور تنویر علی رمزی ہنستے مسکراتے ان کے دفتر آئے اور پنجاب اور کراچی سرکٹ کے لیے ''آخری چٹان'' کا سودا کرلیا۔ قصہ مختصر یہ کہ اس کی تقسیم کاری کا مرحلہ بڑی آسانی سے طے ہوگیا۔ فلم مکمل ہوئی تو سینما گھروں کی وصولیابی کے لیے ڈسٹری بیوٹرز کو کسی پریشانی کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔ اس کی نمائش ہوئی تو یہ فلم دارا سے زیادہ کامیاب ثابت ہوئی۔

''آخری چٹان'' کی نمائش کے بعد اسلم ڈار نے اپنی پسند کی فلم ''دل لگی'' کی پلاننگ دوبارہ شروع کردی۔ ایک بار پھر ڈسٹری بیوٹرز آئے اور انہوں نے کہا۔

''ڈار صاحب! آپ نے پھر وہی کچھ کرنا شروع کردیا جس سے ہم نے منع کیا تھا۔ آپ ایکشن کے ڈائریکٹر ہیں۔ اس لیے ایکشن فلم ہی بنائیں۔''

اس طرح اسلم ڈار کو ایک بار پھر ''دل لگی'' کو سیٹ کی زینت بنانے کا موقع نہیں ملا اور انہوں نے ایک نئی ایکشن فلم ''تخت لٹیرا'' شروع کردی۔ تخت لٹیرا میں بھی لیڈنگ رول نصراللہ بٹ اور رانی نے کیا۔ ادیب کو ایک اہم رول میں پیش کیا گیا جب کہ سلطان راہی کو ایک بزرگ مجاہد کے کردار کے لیے کاسٹ کیا گیا۔

یہاں تک کہہ کر میں ذرا رکا پھر خانزادہ کی طرف دیکھ کر مسکرا کر بولا۔ ''اس موقع پر یہ بات دلچسپی کا سبب ہوگی کہ ایک کردار بزرگ مجاہد کے بیٹے کا بھی تھا جس کے لیے ڈار صاحب نے ایک اداکار سے بات کی تو اس نے بہت زیادہ معاوضہ مانگا۔ ڈار صاحب نے کہا۔ ''یار! یہ ایک مختصر سا کیریکٹر ہے۔ لہٰذا پیسوں میں بھی کچھ کمی کرو۔''

''نہیں ڈار صاحب! پیسوں میں کوئی کمی نہیں ہوسکتی۔ ایکٹنگ بہت مشکل کام ہے۔ ہر ایک کے بس کی بات نہیں کہ اداکاری کرے۔ اس لیے کردار چھوٹا ہو یا بڑا میں اپنے معاوضے میں کوئی کمی نہیں کرسکتا۔''

''اور میں تمہیں تمہارا طلب کیا ہوا معاوضہ نہیں دے سکتا۔''

یونٹ کے لوگوں نے سمجھا کہ ڈار صاحب اب کسی اور سے اس کردار کے لیے بات کریں گے مگر ایسا کچھ نہیں ہوا۔ اسلم ڈار نے اعلان کردیا۔ ''اب یہ کریکٹر میں خود کروں گا۔''

سارے لوگ چونک پڑے کہ ڈار صاحب نے یہ کیا فیصلہ کرلیا۔ اگلے روز اس رول کی مناسبت سے انہوں نے لباس زیب تن کیا اور میک اپ کروایا۔ اس کے بعد سیٹ پر جاکر شاٹ دیا۔ جب وہ شاٹ دے رہے تھے تو سیٹ پر وہ اداکار بھی موجود تھا جس نے یہ کردار کرنے سے انکار کردیا تھا۔ دیگر لوگوں کی طرح اسے بھی یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ فلم کے ڈائریکٹر نے اتنی کامیاب اداکاری کی۔ شاٹ مکمل ہونے کے بعد وہ ان کے پاس آیا اور ان کے گھٹنوں کو ہاتھ لگا کر بولا۔ ''گروجی! آپ تو بہت بڑے ایکٹر ہیں۔''

''مجھے ایکٹنگ کا کوئی شوق نہیں۔'' اسلم ڈار نے اسے جواب دیا۔ ''میں تو ایکٹر میکر ہوں اور اس بات پر فخر محسوس کرتا ہوں۔ تمہارے انکار پر مجھے ایکٹنگ پر آمادہ ہونا پڑا۔ یاد رکھو کہ ہر بڑے ہدایت کار میں ایک بہت بڑا ایکٹر چھپا ہوتا ہے۔ ورنہ وہ بڑا ڈائریکٹر کیسے بن سکتا ہے۔'' اس کے بعد وہ اپنی فلموں میں ضرورتاً چھوٹے موٹے کردار ادا کرتے رہے۔''

''واقعی! یہ تو بڑا دلچسپ اور یادگار واقعہ تھا۔ ایک اداکار کے انکار پر ہدایت کار اداکار بن کر اداکاری کرنے پر تیار ہوگیا۔'' خانزادہ نے کہا۔

''اسلم ڈار نے غلط نہیں کہا تھا کہ ڈائریکٹر تو ایکٹر میکر ہوتا ہے۔'' میں نے کہا۔ ''اس وجہ کا ایک واقعہ متحدہ ہندوستان میں نامور ہدایت کار محبوب خان کے ساتھ پیش آیا تھا۔ جب کامیڈین یعقوب نے یہ کہنا شروع کردیا تھا کہ فلمیں میری وجہ سے کامیاب ہوتی ہیں۔ محبوب صاحب

یہ بات تسلیم کرنے کو تیار نہیں تھے۔ انہوں نے یعقوب کو اپنے یونٹ سے علیحدہ کر کے ایک بس کنڈیکٹر کو اپنی فلم میں چانس دیا جو ایک بڑا اداکار بن کر ابھرا۔ یہ شیخ مختار تھا۔ خیر بات ''دل لگی'' کے حوالے سے ہو رہی تھی۔ ''سچی لٹیرا'' کے بعد اسلم ڈار صاحب نے ایک بار پھر ''دل لگی'' بنانے کی کوشش کی۔ لیکن اس بار بھی وہی ہوا جو اس سے پہلے ہو چکا تھا۔ لہٰذا ''دل لگی'' پھر پینڈنگ میں چلی گئی اور اس کی جگہ ''مسٹر 303'' کے پروجیکٹ پر انہیں کام کرنا پڑا۔ واضح رہے کہ جس دور میں ''مسٹر 303'' بن رہی تھی اس دور میں پاکستان میں فیلڈ مارشل ایوب خان برسراقتدار تھے۔ اسی دور میں حکومت نے 303 آفیسرز مختلف محکموں سے نکال دیے تھے۔ اب یہ محض اتفاق تھا کہ ڈار صاحب کی فلم کا نام بھی ''مسٹر 303'' تھا۔ اس زمانے میں فلمیں اسلام آباد میں سنسر ہوتی تھیں۔ فلم مکمل کرنے کے بعد جب اسلم ڈار یہ فلم سنسر کرانے اسلام آباد گئے تو اس وقت کے سنسر بورڈ کے چیئرمین نے فلم دیکھنے کے بعد کہا۔ ''کیوں نہ اس فلم کو بینڈ کر دیا جائے؟''

''اگر واقعی اس فلم میں کوئی قابلِ اعتراض بات ہے تو اسے بینڈ کر دیں۔''

چیئرمین صاحب بولے۔ ''ہم نے آپ کی فلم فل بینچ کو ریفر کر دی ہے۔'' یہ کہتے ہوئے انہوں نے ڈار صاحب کو فلم سے کاٹے ہوئے حصے دیے جو اتنے زیادہ تھے کہ وہ فلم لگائی ہی نہ جائے۔ جن اعتراضات کو بنیاد بنا کر کاٹ چھانٹ کی گئی وہ بڑے مضحکہ خیز تھے۔ مثلاً یہ کہ اگر کسی آدمی کو گولی لگتی ہے، وہ چاہے کوٹھے پر کھڑا ہے یا اپنے گھر میں بیٹھا ہو۔ وہ گولی لگنے کا ایکشن دے مگر زمین پر نہ گرے۔ اس کے بعد فلم فل بینچ میں گئی تو انہوں نے بھی اپنی رپورٹ میں وہی باتیں لکھیں جو پہلی رپورٹ میں لکھی گئی تھیں اور کہا گیا اگر ان باتوں کو فلم سے خارج کر دیں تو فلم ریلیز ہو سکتی ہے ورنہ بینڈ۔''

''مسٹر 303'' کو فل بورڈ نے بھی مسترد کر دیا تو اسلم ڈار نے فل بورڈ کو ہائی کورٹ میں چیلنج کر دیا۔ یہ کیس گیارہ ماہ تک چلتا رہا۔ اس کے بعد نمائش کا مرحلہ آیا تو اس وقت بھی یہ فلم اپنی اصلی حالت میں نہیں تھی۔ بری طرح فلاپ ہو گئی۔ جو ہونا ہی تھا۔ اس فلم کے بعد اسلم ڈار نے ایک فلم ''مجرم کون'' بنائی۔ یہ فلم انہوں نے کسی اور پارٹی کے لیے بنائی تھی۔ ضیا محی الدین کو انہوں نے اس فلم میں بطور ہیرو کاسٹ کیا تھا۔ غالباً اس سوچ کے ساتھ کہ اس کی بین الاقوامی شہرت کی وجہ سے اس فلم پر اچھا اثر پڑے گا۔ مگر نتیجہ اس کے برخلاف ہوا۔ یہ فلم ضیا محی الدین کے موڈ مزاج کی نہیں تھی۔ بری طرح فلاپ ہو گئی۔

اس کے بعد ڈار صاحب کے ذہن میں ایک بڑا زبردست سبجیکٹ آیا۔ یہ ''بشیرا'' کا سبجیکٹ تھا۔ ڈار صاحب اس پارٹی کے پاس گئے جس نے ان کی فلم مجرم کون پروڈیوس کی تھی اور اس پارٹی سے کہا۔ میں نے اپنی آنے والی فلم کا جو خاکہ تیار کیا ہے، وہ ایک بڑی فلم ثابت ہو گی۔ میں چاہتا ہوں کہ یہ فلم بھی آپ ہی پروڈیوس کریں تاکہ اس کی کامیابی سے پہلی فلم کی ناکامی کا بھی ازالہ ہو جائے مگر دودھ کا جلا چھاچ بھی پھونک پھونک کر پیتا ہے۔ پارٹی نے صاف انکار کر دیا۔

''نہیں صاحب! ہمیں آپ سے کوئی فلم نہیں بنوانی۔''

مگر اسلم ڈار کو تو بہرحال یہ فلم بنانی تھی۔ ان کا کام ہی یہی تھا۔ ان کے ایک دوست اور محلے دار قمر بٹ تھے جو ان سے اکثر کہتے تھے کہ میرے ساتھ مل کر فلم بنائیں مگر ڈار صاحب یہ کہہ کر ٹال جاتے تھے کہ بٹ صاحب! فلم کا کام بڑا رسکی ہے۔ اس لیے میں نہیں چاہتا اگر فلم توقعات پر پوری نہ اتری تو ہماری آپ کی دوستی اور محلے داری میں دراڑ پڑ جائے گی۔ ''بشیرا'' کے لیے جب انہیں فنانسر کی ضرورت پڑی تو تمام سابقہ باتیں بھلا کر قمر بٹ کے پاس پہنچ گئے۔

''یار بٹ صاحب! ایک بڑی زبردست فلم کی پلاننگ کی ہے۔ جس کی کامیابی صد فیصد یقینی ہے۔ اس لیے میں چاہتا ہوں یہ فلم تمہاری شراکت داری میں بناؤں تاکہ میرے ساتھ تمہیں بھی کمانے کا موقع ملے۔''

قمر بٹ بخوشی راضی ہو گئے کیوں کہ وہ جانتے تھے کہ ڈار ایک اصول پسند آدمی ہے اور مجھے کسی عنوان سے کبھی دھوکا نہیں دے گا۔ بٹ سے وہ پارٹنر شپ ایگریمنٹ کے بعد ''بشیرا'' کا کام شروع کر دیا گیا۔ یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ بشیرا اسلم ڈار کی پہلی پنجابی فلم تھی۔ اس فلم کا ٹائٹل رول سلطان راہی کو دیا گیا۔ سلطان راہی ''دارا'' کے بعد بننے والی ان کی ہر فلم میں چھوٹے موٹے کرداروں میں شامل ہوتا تھا۔ ڈار صاحب اس کی محنت، لگن، جدوجہد اور تعاون سے بہت متاثر تھے اور انہوں نے اس سے کہہ رکھا تھا کہ اگر اللہ نے کبھی موقع دیا تو تمہیں کسی بڑے کردار میں بھی پیش کروں

گا۔ اب اللہ نے انہیں موقع دیا تھا۔ سلطان راہی ان کی فلم میں ٹائیٹل رول کر رہا تھا۔
فلم انڈسٹری بھی بڑی عجیب و غریب لوگوں کی دنیا ہے۔ کسی چھوٹے اداکار کو اچانک کسی بڑے کردار میں کام کرتے دیکھ کر کچھ لوگ باتیں بنانے لگے۔ کسی نے کہا۔
''ڈار صاحب! یہ آپ کیا کر رہے ہیں۔ اتنے چھوٹے اداکار سے اتنا بڑا کردار کروا رہے ہیں۔ اس طرح تو فلم دو کوڑی کی ہو کر رہ جائے گی۔''
کوئی بولا۔ ''یہ رول تو صرف ساون صاحب ہی کر سکتے ہیں۔ آپ انہیں کاسٹ کریں۔''
اداکار ساون ان دنوں اپنے عروج پر تھے۔ کچھ لوگوں نے یہ افواہ اڑا دی کہ ڈار صاحب ساون صاحب کے پاس گئے تھے۔ ان سے معاملہ طے نہ ہو سکا اس لیے انہوں نے سلطان راہی کو لیا۔ اگرچہ ایسی کوئی بات نہیں تھی۔ سلطان راہی ''بشیرا'' کے لیے پہلی اور آخری چوائس تھے جس پر اسلم ڈار قائم رہے۔ سلطان راہی نے جی جان لگا کر محنت کی اور اپنی فنی صلاحیتوں کا بھرپور مظاہرہ کیا۔ فلم مکمل ہوگئی تو ڈار صاحب سوچنے لگے کہ جس طرح ہماری پہلی فلمیں بکی ہیں یہ فلم بھی اسی طرح آسانی سے بک جائے گی مگر آسانی سے کیا کوشش بسیار کے باوجود نہیں بکی۔ انہوں نے اپنے پرانے ڈسٹری بیوٹر ہیم پاپولر سے شکایت کی۔
''میری نئی فلم ''بشیرا'' مکمل ہو چکی ہے۔ اس کے بارے میں بھی کچھ سوچیں۔ کچھ کریں۔''
''کیا سوچیں۔ کیا کریں کہ تم نے کام ہی ایسا کیا ہے کہ ہم کچھ نہیں کر سکتے۔''
''میں نے کون سا ایسا غلط کام کر دیا ہے؟''
''اول تو تم نے پنجابی فلم بنا کر غلطی کی ہے۔ دوسرے ایک نئے لڑکے کو بشیرا بنا دیا۔''
یہ اور اس قسم کے ریمارکس کر کے ہر تقسیم کار انہیں مایوس کرتا رہا۔ اس طرح ان کی پریشانی روز بروز بڑھتی گئی۔ وہ سب سے یہی کہتے تھے یہ فلم بہت اچھی ہے۔ بہت کامیاب ہوگی۔ بہت کمائے گی۔
ایک دن ہیم پاپولر نے ان سے کہا۔ ''اگر آپ کو اپنی فلم پر اتنا ہی بھروسا ہے تو آپ خود ریلیز کیوں نہیں کرتے؟ اپنا دفتر بنا کر اپنی فلم خود ریلیز کریں۔''
ہر طرف سے مایوس ہونے کے بعد ڈار صاحب نے ایسا ہی کیا۔ ایک دفتر کرائے پر حاصل کر کے اس میں اپنا تقسیم کار ادارہ قائم کر لیا۔ دفتر کھول کر بیٹھ گئے کہ سینما والے ان کے پاس آئیں گے۔ سینما والے ایڈوانس رقم ادا کر کے فلم بک کروا لیا کرتے تھے۔ ان کے دفتر میں جب کوئی سینما والا نہیں آیا تو ان لوگوں نے خود ایبٹ روڈ کے تمام سینماؤں کا دورہ کیا اور مالکان سے کہا آپ ہماری فلم بشیرا لگائیں۔ ہم آپ سے پیشگی رقم بھی نہیں لیں گے۔ اس کے باوجود کسی سینما والے نے بشیرا بک نہیں کروائی۔
ایسی مایوس کن صورت حال دیکھ کر ڈار صاحب کے پارٹنر قمر بہت مایوس ہو گئے۔ انہوں نے کہا۔ ''میں یہ پارٹنر شپ ختم کرتا ہوں۔ جب بھی تمہاری فلم ریلیز ہو میرا لگایا ہوا پیسا مجھے واپس کر دینا۔''
اسلم ڈار نے انہیں بہت سمجھایا مگر وہ نہ مانے۔ وہ بے چارے بھی کیا کرتے۔ کہاں تک پریشانیوں کا مقابلہ کرتے۔ اس لیے پارٹنر شپ ختم کرنے پر مجبور ہو گئے مگر کچھ دنوں کے بعد اپنے ایک دوست اور پارٹنر شیخ صدیق کے سمجھانے پر ڈار صاحب سے شراکت داری کا رشتہ دوبارہ استوار کر لیا۔
جب ایڈوانس رقم نہ لینے کی شرط پر بھی کسی سینما والے نے ''بشیرا'' کی نمائش سے انکار کر دیا تو ڈار صاحب ایک ایسے سینما گھر پہنچ گئے جو صرف پرانی فلمیں چلاتا تھا۔ یہ صنوبر سینما تھا جو ایبا تر سینما کے نام سے آج بھی موجود ہے۔ فلم کے پروڈیوسر اور ڈائریکٹر نے صنوبر سینما والوں سے کہا۔
''میرا نام اسلم ڈار ہے۔ آپ میرے نام سے واقف ہوں گے۔ میں نے دارا، آخری چٹان اور نئی لیرا جیسی کامیاب فلمیں بنائی ہیں۔''
''جی ہاں، اس حوالے سے ہم آپ کو پہچانتے ہیں۔''
ڈار صاحب خوش ہوئے اور بولے۔ ''میں نے ایک نئی فلم بنائی ہے ''بشیرا''۔ یہ بھی میری سابقہ فلموں کی طرح انشاء اللہ کامیاب ہوگی۔ میں چاہتا ہوں کہ یہ فلم آپ اپنے سینما میں دکھائیں۔''
پرانی فلمیں چلانے والوں کو نئی فلم مل رہی تھی۔ اس کے باوجود انہوں نے اپنی کاروباری ذہنیت کا ثبوت دیا۔ ''آپ کہتے ہیں تو ہم آپ کی فلم دکھا دیں گے مگر آپ کو پیشگی رقم نہیں دے سکیں گے۔''
ڈوبتے کو جس طرح تنکے کا سہارا بھی مل جائے تو اسی کو غنیمت سمجھتا ہے۔ اس طرح اسلم ڈار نے یہ شرط بھی منظور کر لی۔ صنوبر سینما والے یہ سوچ رہے تھے کہ پرانی فلم کے

مقابلے میں تو یہ نئی فلم بہرحال بہتر بزنس کرے گی۔ ایک دو ہفتے چل جائے گی تو ہمیں کچھ نہ کچھ فائدہ ہو ہی جائے گا اور ان بیوقوفوں کی خواہش بھی پوری ہو جائے گی۔

شاید وہ یہی سمجھ رہے تھے کہ یہ اناڑی اور ناسمجھ لوگ ہیں یا پھر ان کی فلم میں کوئی جان نہیں لیکن جب ''بشیرا'' صنوبر جیسے خستہ حال سنیما گھر میں ریلیز ہوئی تو اس کی قسمت ہی بدل گئی۔ ہر شو فل، ٹکٹ کے حصول کے لیے دنگا فساد، ایڈوانس بکنگ، دو دو چار چار دن پہلے کے ٹکٹ حاصل کرنا بھی دشوار ہو گیا۔

شہر میں کوئی فلم ایسی چلے اور اس کی خبر دوسرے سنیما والوں کو نہ ہو، ناممکن ہے۔ فلم انڈسٹری میں بھی کھلبلی مچ گئی۔ اسلم ڈار کی نئی فلم بھی ہٹ ہو گئی۔ ایسی فلم جس کے بارے میں کسی کو بھی امید نہیں تھی کہ اسے کوئی شوق سے دیکھے گا۔ پسند کرے گا۔ اس کا کھڑکی توڑ بزنس ہو رہا تھا۔ فلم والوں نے مبارک سلامت کے پیغامات بھیجنے شروع کر دیے۔ دوسری طرف سنیما والوں کا تانتا بندھ گیا ان کے دفتر میں۔ سب ہاتھوں میں ایڈوانس رقم لے کر درخواست گزار تھے کہ ہمیں بھی اپنی فلم ریلیز کرنے کا موقع دیں۔

نسیم پاپولر اور دوسرے تقسیم کار جنہوں نے یہ کہہ کر اسلم ڈار کو دلی صدمہ پہنچایا تھا کہ تم اردو فلموں کے ہدایت کار ہو، تم نے پنجابی فلم کیوں بنائی اور فلم کا ٹائٹل رول ایک نئے لڑکے سے کیوں کروایا؟ آج کفِ افسوس مل رہے تھے کہ اپنی غلط سوچ کی وجہ سے انہوں نے اس فلم کے حقوق حاصل نہیں کیے۔ ورنہ اس فلم کی وجہ سے وہ لاکھوں کما لیتے۔ قدرت کے بھید کوئی نہیں جانتا۔ اللہ رب العزت اسلم ڈار کو آزمائش میں ڈال کر اسے زیادہ سے زیادہ نوازنا چاہتا تھا۔ اس لیے مخالفین کے شور پر اس نے اپنا تقسیم کار ادارہ بھی قائم کر لیا۔ ''بشیرا'' کی بلاک بسٹر کامیابی کے بعد یہ تقسیم کار ادارہ مستحکم ہو گیا۔ فلم کی ساری آمدنی اسلم ڈار کو حاصل ہوئی۔ اور وہ اس قابل ہو گئے کہ اپنی فلم خود پروڈیوس کر سکیں۔

اس فلم کی لازوال کامیابی نے جہاں اسلم ڈار کی بنیادیں مستحکم کر دیں وہیں سلطان راہی کے بارے میں فلم انڈسٹری میں جو منفی سوچ تھی اور اسے نیا سمجھ کر کوئی اہمیت نہیں دیتا تھا اس تاثر کو بھی مسترد کر دیا۔ ''بشیرا'' کی فقید المثال کامیابی کے بعد اسے ایک کامیاب اداکار تسلیم کر لیا گیا بلکہ اپنی موت سے پہلے تک فلموں کی کامیابی کی ضمانت سمجھا جاتا رہا۔

اسلم ڈار کی دلی خواہش تھی کہ وہ رومانس سے بھرپور فلم بنائیں۔ مگر یکے بعد دیگرے انہیں ''دل لگی'' کی بجائے دوسری فلمیں بنانا پڑیں۔ کیوں بنانا پڑیں۔ اس کا ذکر ہو چکا ہے۔ اب جب اللہ تعالیٰ نے انہیں اس پوزیشن میں کر دیا تھا کہ وہ خود اپنی فلم پروڈیوس کر سکیں تو انہیں ''دل لگی'' کے پروجیکٹ کو عملی جامہ پہنانے کا خیال آیا۔ اب انہیں اس فلم سے روکنے اور منع کرنے والے کسی شخص کا خوف دامن گیر نہیں تھا لیکن شاید قدرت اس معاملے میں مہربان نہیں ہوئی تھی۔ اس لیے ''دل لگی'' کا پروگرام ایک بار پھر التوا کا شکار ہو گیا۔ وجہ کیا تھی؟ وجہ یہ تھی کہ ان دنوں ہمارا وطن عزیز دو لخت ہو گیا۔ مشرقی پاکستان بنگلہ دیش بن گیا۔ یہ ہماری تاریخ کا بدترین واقعہ تھا۔ لاکھوں محبانِ وطن کو اس سانحے کا جو صدمہ پہنچا اسلم ڈار بھی اس صدمے سے دوچار ہوئے اور ان کا دل و دماغ اس قدر متاثر ہوا کہ انہوں نے خود ''دل لگی'' کا پروگرام ملتوی کر دیا اور اس کی جگہ ''رزق خان'' کے نام سے ایک فلم شروع کر دی۔ یہ فلم دراصل اسلم ڈار کے جذبات اور دکھوں کا اظہار تھی۔ وہ دکھ جو انہیں مشرقی پاکستان کے سانحے کے بعد ملا تھا۔ انہوں نے ''رزق خان'' میں جتنے بھی کیریکٹر پیش کیے تھے وہ سارے اس دور کے حکمرانوں سے مشابہت رکھتے تھے۔ اگرچہ ان کے نام مختلف رکھے گئے تھے۔ ڈار صاحب نے اس فلم کے ذریعے اپنے ملی اور قومی جذبات کا اظہار بھرپور انداز میں کیا تھا۔ لوگوں نے ان کے جذبات کو سراہتے ہوئے اس فلم کو بہت پسند کیا اور باکس آفس پر بھی یہ بڑی کامیاب فلم ثابت ہوئی۔ اسلم ڈار خود بھی اس فلم کو اپنے لیے قابلِ افتخار سمجھتے ہیں۔ اس فلم میں بھی سلطان راہی کو انہوں نے بطور ہیرو پیش کیا تھا۔

''رزق خان'' کی تکمیل، نمائش اور کامیابی کے بعد ایک بار پھر ''دل لگی'' سے دل لگانے کا خیال آیا تو ڈار صاحب نے بڑے عزم و ارادے کے ساتھ کہا۔ اب یہ فلم میں خود بناؤں گا۔ ''دارا'' سے ''رزق خان'' کے پہلے تک ہر فلم کے بعد میں نے اس فلم کو بنانے کی کوشش کی مگر نہ اس کے لیے فنانسر ملے نہ تقسیم کاروں نے اس کی خریداری میں دلچسپی کا اظہار کیا بلکہ مجھے مجبور کیا کہ میں ایکشن فلم بناؤں لیکن اب نہ مجھے کسی فنانسر کی ضرورت ہے نہ کسی تقسیم کار کی۔

''دل لگی'' بنانے کا خیال جب پہلی بار ڈار صاحب کو آیا تھا تو انہوں نے فیصلہ کیا تھا کہ وحید مراد کو بطور ہیرو

کاسٹ کریں گے لیکن جب وہ اپنی فلم ''آخری چٹان'' بنا رہے تھے انہی دنوں ندیم کی پہلی فلم ''چکوری'' ریلیز ہوئی جسے دیکھ کر اسلم ڈار نے ہیرو کے سلسلے میں اپنا ارادہ بدل دیا اور وحید مراد کی جگہ ندیم کو ''دل لگی'' کا ہیرو بنانے کا عزم کرلیا۔ ''آخری چٹان'' کے گانوں کی مکس بندی کے لیے جن دنوں ڈار صاحب سوات میں موجود تھے انہی دنوں ندیم اقبال شہزاد کی فلم ''بازی'' کی شوٹنگ سوات میں کر رہے تھے۔ ڈار صاحب ان کے ہوٹل پہنچ گئے اور ان سے کہا۔

''میں فلم ڈائریکٹر اسلم ڈار ہوں۔ میں ایک فلم ''دل لگی'' کے نام سے بنانا چاہتا ہوں جس میں آپ کو ہیرو لینا چاہتا ہوں۔''

ندیم نے اپنے طور پر لوگوں سے ڈار صاحب کے بارے میں جاننے کی کوشش کی کہ یہ کیسے ہدایت کار ہیں مگر اس کے آگے معاملہ نہیں پہنچا۔ کیوں کہ ''دل لگی'' مسلسل سات سال تک التوا کا شکار ہوتی رہی پھر جب ''دل لگی'' شروع ہونے کا وقت آیا۔ اس وقت تک ندیم کی 9 فلمیں فلاپ ہوچکی تھیں۔ ''دل لگی'' شروع کرنے پر جن لوگوں نے انہیں مبارک باد دی جب انہوں نے پوچھا۔ آپ کی اس رومانوی فلم کا رومانوی جوڑا کون ہوگا؟ تو ڈار صاحب بولے۔

''شبنم اور ندیم۔''

''یہ آپ کیا غضب کررہے ہیں۔'' انہوں نے چھوٹتے ہی کہا۔ ''شبنم کی حد تک تو ٹھیک ہے مگر ندیم آپ کو پتا ہے اس کی مسلسل نو فلمیں فلاپ ہوچکی ہیں۔ ایک پٹے ہوئے ہیرو کو لے کر آپ اپنی فلم کا ستیاناس نہیں کریں گے؟''

یہی بات دیگر فلموں والوں نے بھی ان سے کہی جب انہیں معلوم ہوا کہ ندیم کو وہ ہیرو لینا چاہتے ہیں مگر ان کے پائے استقلال میں جنبش پیدا نہ ہوئی۔ وہ اپنے ارادے میں اڑے رہے۔ شاید وہ اس بات کے قائل تھے کہ فلم کسی ایک شخص کی وجہ سے کامیاب ہوتی ہے نہ ناکام۔ انہیں منع کرنے والوں میں جغادری قسم کے ڈسٹری بیوٹرز بھی تھے اور سنیما مالکان بھی مگر اب اسلم ڈار کو کسی کے مشورے کی ضرورت تھی نہ رہنمائی کی۔ وہ عزم و ارادے کے بڑے پکے تھے جس کا ایک ثبوت یہ فلم بھی تھی کہ سات سال تک مختلف وجوہ کی بنا پر تعطل کا شکار ہونے کے باوجود اس کے بنانے کے ارادے سے وہ دستبردار نہیں ہوئے تھے۔

قصہ کوتاہ، جب ڈار صاحب ندیم کے گھر ایگری منٹ کرنے گئے اور ان سے کہا۔ ''آپ کو یاد ہوگا جب آپ سوات میں اقبال شہزاد کی فلم ''بازی'' کے گانے پکچرائز کروا رہے تھے ان دنوں میں آپ سے ملا تھا اور کہا تھا کہ میں اپنی ایک فلم ''دل لگی'' میں آپ کو ہیرو لینا چاہتا ہوں۔''

''جی ہاں، یاد ہے مگر اس بات کو تو خاصا عرصہ گزر گیا۔''

''اور میں آپ کے پاس نہیں آیا۔ آپ یہی کہنا چاہتے ہیں نا؟''

''جی ہاں۔''

''آپ کے پاس اتنے دنوں تک نہ آنے کی وجہ یہ تھی کہ میری وہ فلم ''دل لگی'' کسی نہ کسی وجہ سے التوا کا شکار ہوتی رہی۔ اب اس لیے آیا ہوں کہ اب وہ فلم میں نے شروع کردی ہے اور آپ سے اس فلم کے لیے ایگری منٹ کرنے آیا ہوں۔ میری شرط صرف یہ ہے کہ میں تین مہینے میں فلم مکمل کرنا چاہتا ہوں۔ آپ بتائیے، آپ تین مہینے تک مجھے وقت دے سکیں گے یا نہیں اور اگر دیں گے تو کیا معاوضہ لیں گے؟''

ندیم بیگ جو ایک سلجھی ہوئی سوچ اور فکر کے انسان ہیں۔ انہوں نے یقیناً یہ سوچا ہوگا وہ شخص جو اتنا عرصہ گزر جانے کے بعد بھی اپنی کمٹمنٹ پر برقرار ہے جب کہ اسے یہ بھی معلوم ہوگا کہ آج میری وہ پوزیشن نہیں جو ''بازی'' کے زمانے میں تھی۔ اس کے باوجود اس کا میرے پاس آنا اس بات کی دلیل ہوسکتی ہے کہ وہ معمولی اعصاب اور صلاحیتوں کا بندہ نہیں۔

ندیم نے نہ صرف ''دل لگی'' میں کام کرنے کی رضامندی ظاہر کردی بلکہ تین مہینے تک مسلسل ٹائم دینے کی بات بھی مان لی اور جب معاوضے کا مرحلہ آیا تو وہ رقم مانگی جو ان کے اس وقت کے مقابلے میں بہت کم تھی۔

سات سال تک التوا کا شکار رہنے والی فلم ''دل لگی'' سیٹ کی زینت بن گئی۔ ڈار صاحب نے ندیم سے ہر مہینا پندرہ پندرہ دن لے کر ان کا کام وقت پر مکمل کرلیا۔ فلم وقت پر تیار ہوگئی۔ وہ اپنے دفتر میں بیٹھ کر ڈسٹری بیوٹرز اور سنیما مالکان کا انتظار کرنے لگے مگر ''بشیرا'' کی طرح اس بار بھی انہیں مایوس ہی ہونا پڑا۔ ڈسٹری بیوٹرز یہ سوچ کر ان کے پاس نہیں آئے کہ اسلم ڈار ایکشن فلمیں بناتا ہے۔ اس رومانی فلم میں اس نے کیا تیر مارا ہوگا۔ تب ڈار صاحب نے

سوچا۔ چلو ہم خود ہی اس کی نمائش کا بندوبست بھی کر لیتے ہیں تو سینما والوں نے ان کے آگے گھاس نہیں ڈالی۔ دستور کے مطابق جو پیشگی رقم ادا کرتے تھے۔ اس سے انکار کر دیا۔ ایک سینما والے سے بڑی مشکل سے ان کا معاملہ طے ہوا مگر اس نے بھی ایڈوانس میں دی ہوئی رقم واپس لے لی کہ فلم فلاپ ہو گئی تو اس کی رقم بھی ڈوب جائے گی۔ اسلم ڈار اور ان کے پارٹنر قمر بٹ کو اس موقع پر جو ذہنی اذیت برداشت کرنا پڑی وہ ناقابلِ فراموش ہے مگر وہ جو کہتے ہیں کہ ناخدا جس کا نہ ہو، اس کا خدا ہوتا ہے۔ ان کی مشکل بھی اللہ نے آسان کی۔ اس آزمائش کے وقت بھی انہوں نے اللہ ہی سے مدد مانگی۔ کسی نہ کسی طرح ''دل لگی'' سینما گھروں میں لگی اور ایسی لگی کہ پھر اترنے کا نام نہیں لیا۔ کامیابی کے لحاظ سے اس نے اردو فلموں کے اس وقت تک کے سارے ریکارڈ توڑ دیے۔ یہ وہ فلم تھی جس نے پاکستان کے ہر اسٹیشن پر پندرہ پندرہ ہفتے چلنے کا ریکارڈ قائم کیا بلکہ بعض اسٹیشن ایسے بھی ہیں جہاں اس سے بھی زیادہ چلی۔ اس فلم نے پلاٹینم جوبلی کا جھومرا اپنے ماتھے پر سجایا اور وہ ندیم جس کی تو فلمیں فلاپ ہو چکی تھیں ایک بار پھر اس کی ساکھ بحال ہو گئی اور وہ کامیاب اداکاروں کی صف اول میں شامل ہو گیا۔

''دل لگی'' ایک اچھے سبجیکٹ پر ایک اچھی بلکہ بہت اچھی فلم تھی۔ جس کی پلاننگ ایک اچھے ڈائریکٹر نے کی تھی اور اسے کامل یقین تھا کہ شائقین فلم اسے بہت پسند کریں گے مگر وہ لوگ جن کے ہاتھوں میں فلم ٹریڈ کی لگام ہوتی ہے وہ انہی فلم میکرز کا ساتھ دیتے ہیں جو ان کی پسند کی فلمیں بنا کر انہیں دیتے ہیں۔ اچھی فلمیں بنانے والوں کو بھی بسا اوقات اپنی پسند کے برخلاف دوسروں کے موڈ مزاج کی فلمیں بنانی پڑتی ہیں۔ جو فلم میکرز فلم ٹریڈ کے جغادریوں کے کہنے پر نہیں چلتے انہیں سزا دیتے ہیں وہ کوئی کسر نہیں چھوڑتے۔ ''بشیرا'' اور ''دل لگی'' باکس آفس کے لحاظ سے بہت بڑی فلمیں تھیں لیکن چونکہ ڈسٹری بیوٹرز کی پسند کو پیش نظر رکھ کر نہیں بنائی گئی تھیں۔ اس لیے انہوں نے ان کے ساتھ سوتیلی ماں سے بھی بدتر سلوک کیا۔

''فلم ٹریڈ سے تعلق رکھنے والوں کا یہ رویہ کل کی طرح آج بھی برقرار ہے۔ رنگیلا نے جب اپنی پہلی فلم ''دیا اور طوفان'' بنائی تھی تو اس کی حوصلہ افزائی کرنے کی بجائے اس کی ہر طرح حوصلہ شکنی کی گئی مگر جب ایک چھوٹے سے تقسیم کار نے اس پر ترس کھا کر ان کی فلم ریلیز کی تو اس کا مذاق اڑانے والوں کے ہوش اڑ گئے۔ آج بھی ڈسٹری بیوٹرز اور سینما مالکان فلم میکرز کے ساتھ اچھا سلوک نہیں کرتے۔ اپنے دیس میں بنی فلموں سے زیادہ اہمیت غیر ملکی فلموں کو دیتے ہیں۔ اوّل تو ملکی فلموں کو سینما گھر دستیاب نہیں ہوتے ہیں تو دوسرے تیسرے ہفتے اچھی خاصی چلتی ہوئی فلم کو اتار کر نئی غیر ملکی فلم لگا دیتے ہیں۔''

''فلم بنانا اسلم ڈار کا پیشہ تھا۔ ان کا بزنس اور کاروبار تھا اور اب تو ان کے راستے کی بہت سی رکاوٹیں بھی ختم ہو گئی تھیں۔ ان کا اپنا ڈسٹری بیوشن کا دفتر بھی تھا اور اس دفتر کے سہارے بشیرا، رزق خان اور دل لگی سے بہت اچھی کمائی بھی کر چکے تھے۔ پھر بھلا فلمیں کیوں نہ بناتے؟ ان کے بارے میں غالباً پہلے بھی کہا جا چکا ہے کہ وہ دوسروں سے ذرا ہٹ کر تھے۔ ان کی سوچ اور فکر دوسرے فلم میکرز سے مختلف تھی۔ وہ مختلف، منفرد اور اچھوتے خیالات کی حامل فلمیں بنانے کے قائل تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ ان کی ہر فلم پہلی فلموں سے مختلف ہو۔ جب تک وہ بے بس تھے۔ ڈسٹری بیوٹرز اور سینما مالکان کے دباؤ پر ایکشن فلمیں بناتے رہے۔ چونکہ ان کی پہلی فلم ''دارا'' ایکشن فلم تھی جو ہٹ ہوئی اس لیے تقسیم کاروں نے یہ سمجھ لیا کہ وہ ایکشن فلمیں ہی بنا سکتے ہیں۔ اس مجبوری کے دور میں بھی انہوں نے جو ایکشن فلمیں بنائیں ان میں بھی یکسانیت نہیں آنے دی۔ ہر فلم کی کہانی مختلف موضوع اور تھیم کے لحاظ سے بھی ایک دوسرے سے کوئی مشابہت نہیں رکھتی تھی لیکن اب جب وہ آزاد تھے اور اپنی پسند کی فلمیں بنا سکتے تھے تو فلمیں کیوں نہ بناتے۔ ''دل لگی'' کے بعد انہوں نے بابل صدقے تیرے، پہلی نظر، بڑے میاں دیوانے، وعدہ، زبیدہ، انوکھا راج، قدرت دا انتقام، عشق نچائے گلی گلی، گوگا، پھول، ہم تمہارے ہیں، سیاں اناڑی وغیرہ بنائیں۔''

''جی ہاں یاد ہے۔''

''سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ایسے حالات میں جب وہ ہر طرح سے آزاد تھے۔ سرمایہ کاری سے لے کر ڈسٹری بیوشن تک خود کرتے تھے اور فلم بنانا ان کا پیشہ بھی تھا۔ پھر انہوں نے 1998ء میں فلمیں بنانا کیوں ترک کر دیں؟'' خانزادہ نے سوال کیا۔

'' ڈار صاحب نے جب اپنی پسند کی فلمیں بنانا شروع کیں تو اپنے بیٹے کو ڈسٹری بیوشن آفس میں بٹھا دیا اور

کہا۔ ''اب یہ دفتر تمہارا ہے۔ ڈسٹری بیوشن کا سارا کام تم کروگے۔'' تقسیم کاری کی ساری ذمہ داری بیٹے کو سونپ کر وہ اپنے موڈ مزاج کی فلمیں بنانے لگے۔ ہر فلم دوسرے سے بالکل مختلف نئے سبجیکٹ اور نئے معاشرتی مسائل کے پس منظر میں کبھی سنجیدہ کبھی کامیڈی، کبھی اردو کبھی پنجابی زبان میں۔

ایک دن ان کے بیٹے نے ان سے کہا۔ ''پاپا! آپ یہ کیسی فلمیں بناتے ہیں؟ آپ ویسی ہی فلمیں بنائیں جیسی لوگوں کی ڈیمانڈ ہے۔''

بیٹے کی زبانی یہ باتیں سن کر ڈار صاحب یہ سوچنے پر مجبور ہو گئے کہ ان کا بیٹا بھی دوسرے ڈسٹری بیوٹرز کی طرح مارکیٹ کے رنگ میں رنگ گیا ہے۔ ''میرے بیٹے کے سوچنے کا انداز مجھ سے مختلف ہو گیا ہے۔'' اس خیال نے ان کے دل و دماغ کو دھچکا لگایا۔ ''میں تو یہ سمجھتا تھا کہ میرا بیٹا میرے بعد میرے مشن کو جاری رکھے گا۔ میری طرح منفرد اور اچھوتے موضوع کی فلمیں بنائے گا مگر وہ تو مجھ ہی کو ایسی فلمیں بنانے سے روک رہا ہے۔''

انہوں نے بیٹے سے کہا۔ ''میرے مرنے کے بعد تم فلمیں نہ بنانا۔''

''کیوں پاپا! آپ نے یہ بات کیوں کہی؟''

''اس لیے کہ تم ایک ڈسٹری بیوٹر ہو۔ تمہارا موڈ مزاج ڈسٹری بیوٹروں ہی جیسا ہو گیا ہے۔ تم پروڈیوسر نہیں اس لیے پروڈیوسروں جیسی تمہاری سوچ اور فکر نہیں۔''

''مگر پاپا! میں تو سوچ رہا تھا جس طرح آپ نے اپنے پاپا کی طرح فلم ڈائریکشن کو اپنایا اسی طرح میں بھی......''

''نہیں...... تمہارے لیے یہ سب کچھ بہت مشکل ہو گا۔ تم اسٹوڈیوز کے ماحول سے واقف نہیں۔ تم یہ نہیں جانتے کہ پروڈیوسرز کو فلم بناتے وقت کن دشواریوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔''

''نہیں پاپا! میں تو فلم بناؤں گا۔ اتنا عرصہ فلم ٹریڈ میں گزارنے کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ مجھے اپنے باپ دادا کی طرح فلم ہی بنانا چاہیے۔''

بیٹے کی زبانی یہ باتیں سن کر ڈار صاحب کی مایوسی کچھ کم ہوئی انہوں نے کہا۔ ''اگر ایسی بات ہے تو اس ڈسٹری بیوشن آفس سے اٹھو اور اس جنگل میں چلو جس کا نام اسٹوڈیو ہے تاکہ تمہیں وہاں کے لوگوں کی نفسیات کا علم ہو اور تم میرے مرنے کے بعد وہاں فلمیں بناتے رہنا۔''

''آپ کے بعد کیوں؟ آپ کی موجودگی میں کیوں نہیں؟''

''اگر ایسی بات ہے تو یہی سہی۔''

اس کے بعد اسلم ڈار نے ایک فلم ''ڈولی سجا کے رکھنا'' شروع کی جس کا پروڈیوسر بیٹے کو بنایا اور فلم کے متعلق تمام معاملات کی ذمہ داری بیٹے کو سونپ دی تاکہ اسے بخوبی اس بات کا علم ہو کہ کن کن مرحلوں سے فلم بنانے کے لیے گزرنا پڑتا ہے۔

ڈار صاحب کے کام کرنے کا ایک اصول تھا۔ وہ اپنی فلم کے لیے آرٹسٹوں سے شیڈول طے کرکے تاریخیں دے دیتے تھے اور پھر پوری کوشش کرتے تھے کہ شیڈول کے مطابق کام ہو جائے تاکہ وقت کے مطابق فلم مکمل ہو جائے۔ ایسا ہی شیڈول ''ڈولی سجا کے رکھنا'' کے لیے بھی تیار کیا گیا مگر اس بار بدقسمتی سے کچھ ایکٹروں کی وجہ سے ان کا شیڈول متاثر ہوا اور وہ فلم جو تین مہینے میں مکمل ہو جانی چاہیے تھی اسے دس ماہ لگ گئے۔ جیسے جیسے فلم لیٹ ہوتی گئی ان کا بیٹا دل برداشتہ ہوتا گیا۔ آخر کار اس نے کہہ دیا۔ ''پاپا! یہ میرے بس کا کام نہیں۔ یہ آپ ہی کا حوصلہ ہے کہ آپ اس لائن سے وابستہ ہیں اور ان لوگوں کے ساتھ کام کررہے ہیں مگر میں ہرگز ان لوگوں کے ساتھ کام نہیں کرسکتا۔''

''ڈولی سجا کے رکھنا'' مکمل ہونے کے بعد بڑی بے دلی کے ساتھ ان کے بیٹے نے اسے ریلیز کیا تو یہ فلم ناکام ہوگئی۔

پھر یوں ہوا کہ ایک دن ان کے بیٹے نے ڈسٹری بیوشن آفس کی چابی بھی ان کے حوالے کرتے ہوئے کہا۔ ''اب یہ کام بھی میں نہیں کروں گا۔ آپ نے مجھ سے کہا تھا نا۔ میرے مرنے کے بعد فلم نہیں بنانا۔ میں آپ کی زندگی میں ہی اس کام سے توبہ کرتا ہوں۔''

16 سال تک ڈسٹری بیوشن آفس میں بطور ڈسٹری بیوٹر کام کرنے کے بعد فلم پروڈیوس کرنے کے چکر میں بیٹا اس قدر دل برداشتہ ہوا کہ تقسیم کاری کے کام سے بھی متنفر ہو گیا۔ باپ کے ہاتھ میں دفتر کی چابیاں دے کر رہ گیا تو پھر کبھی اس کی طرف رخ نہیں کیا۔ باپ کو اس کا جو صدمہ ہونا چاہیے تھا وہ ہوا۔ ان کی تیسری پشت فلم انڈسٹری اور ٹریڈ میں قدم نہ جما سکی۔ اس بات کا انہیں بڑا دکھ ہوا۔

ڈار صاحب کی ذمہ داریاں اب بڑھ گئی تھیں۔ اب

انہیں فلمسازی کے ساتھ ساتھ ڈسٹری بیوشن کا کام بھی کرنا پڑا تو ان کے لیے مشکلات پیش آنے لگیں۔ بڑھتی ہوئی عمر کا تقاضا تھا کہ اب ان کا ہاتھ بٹانے والا ان کا ساتھ دینے والا کوئی ہو مگر ساتھ دینے والا ہی جب ساتھ چھوڑ گیا تو وہ آہستہ آہستہ ہمت ہار بیٹھے۔ کچھ دنوں تک تو وہ نئی فلموں کی پلاننگ کرتے رہے پھر یہ خیال بھی دل سے نکال دیا لیکن فلم انڈسٹری سے اپنا ناتا نہیں توڑا۔ اس کی بہبود اور بھلائی کے لیے کام کرنے کو ہی اپنا مقصدِ حیات بنالیا۔

”بات دراصل یہ ہے کہ جس طرح ہمارے ملک میں زیادہ تر لوگ قومی مفادات سے زیادہ ذاتی فائدے کے لیے کام کرتے ہیں اسی طرح ہماری فلمی دنیا میں بھی انڈسٹری اور ٹریڈ کی جڑیں مضبوط کرنے کی بجائے زیادہ تر فلم والے ذاتی مفادات کو زیادہ اہمیت دیتے ہیں اور اس مقصد کے لیے ان لوگوں کو بھی اپنے راستے پر چلنے کے لیے مجبور کرتے ہیں جو اچھی فلمیں بنا کر اپنی فلم انڈسٹری اور ملک و قوم کا نام روشن کرنا چاہتے ہیں۔ آپ نے سنگیتا کے بارے میں تو سنا ہوگا کہ ”سوسائٹی گرل“ اور ”مٹھی بھر چاول“ جیسی فلمیں بنا کر اس نے پاکستانی فلمی صنعت کو ایک نئی جہت دی تھی۔ ایسی تخلیقی صلاحیتوں سے مالا مال ہدایت کارہ کو مفاد پرست لوگوں نے گھٹیا برانڈ فلمیں بنانے پر مجبور کردیا۔“

مگر اسلم ڈار کا مسئلہ سنگیتا سے قدرے مختلف تھا۔

اسلم ڈار سنگیتا کی طرح مجبور نہیں تھے۔ اسلم ڈار کے راستے میں شروع میں مفاد پرستوں نے ضرور رکاوٹیں کھڑی کی تھیں مگر جب وہ بااختیار ہوگئے، خودمختار ہوگئے، اس وقت انہوں نے خود اپنے آنے والے دنوں کو آسان بنانے کی کوئی تدبیر نہیں کی۔ ان کا بیٹا ان کا ساتھ دے سکتا تھا۔ ان کا ہاتھ بٹا سکتا تھا۔ ان کے مشن کی تکمیل کرسکتا تھا۔ ان کی تیسری پشت کو بھی فلم انڈسٹری میں باپ دادا کی طرح زندہ رکھ سکتا تھا مگر ان کے لیے اسلم ڈار کو جو کرنا چاہیے تھا وہ انہوں نے نہیں کیا۔ وہ اپنی نت نئی فلموں کے لیے تو بہت اچھی پلاننگ کرتے تھے مگر انہوں نے اپنے مستقبل کے لیے کوئی اچھی منصوبہ بندی نہیں کی۔ اگر وہ سولہ برس تک اپنے بیٹے کو ڈسٹری بیوشن آفس میں بٹھائے رکھنے کی بجائے فلم پروڈکشن میں اسے اپنے ساتھ رکھتے، اسٹوڈیوز کے ماحول، آرٹسٹوں سے نمٹنے، فلم سازی کے نرم گرم حالات سے نبرد آزما ہونے

کی تربیت دیتے تو اس سولہ سال کی مدت میں وہ ان کی طرح ایک طاقت ور اور توانا اعصاب کا فلم میکر ثابت ہوتا۔ انہوں نے اپنے آبائی پیشے سے بیٹے کو وابستہ کرنے کی بجائے اسے ڈسٹری بیوشن آفس میں بٹھا کر اسے عضوئے معطل بنا دیا۔ اس دوران اس میں ایک ڈسٹری بیوٹر کی خو بو تو پیدا ہوگئی اور وہ دوسرے تقسیم کاروں کی طرح ان کی فلموں کو تنقید تبصرے کا نشانہ تو بنانے لگا لیکن اس قابل نہیں رہا کہ کوئی اور کام کر سکے۔ ایسے حالات میں اسے پروڈیوسر بنانا اور ایک پوری فلم کی ذمہ داریاں اس پر ڈالنا اسلم ڈار کی زبردست بھول تھی۔ ایسی زبردست غلطی کا خمیازہ انہیں یہ بھگتنا پڑا کہ اس نے فلم سازی سے ہمیشہ کے لیے توبہ کرلی اور ڈسٹری بیوشن کی ذمہ داری سے بھی دستبردار ہوگیا۔ ڈار صاحب نہ ادھر کے رہے نہ ادھر کے رہے۔

ڈار صاحب نے تقسیم کاروں کے سلوک سے مجبور ہو کر اپنی فلموں کی خود تقسیم کاری کا فیصلہ کیا۔ یہاں تک تو وہ قابلِ معافی ہیں مگر اپنی اولاد کو اپنے آبائی پیشے کی تربیت دینے کی بجائے ڈسٹری بیوشن آفس میں دفن کردینا، ان کا ناقابلِ معافی جرم تھا جس کی انہیں سزا ملی۔

”ابھی کئی بار اسلم ڈار کی تیسری پشت کا ذکر ہوا ہے۔“ خانزادہ بولے۔ ”ان کی پہلی پشت یعنی اسلم ڈار کے والدِ محترم کے بارے میں بھی کچھ بتایئے۔“

”شاید آپ بھول گئے۔ ان کے بارے میں ابتداء میں بتا چکا ہوں۔“

”جی نہیں، میں بھولا نہیں، ایس ایم ڈار صاحب کے بارے میں آپ نے بتایا ہے مگر بہت اختصار کے ساتھ میں چاہتا ہوں کہ ذرا تفصیل کے ساتھ بتائیں۔ آخر انہوں نے ایک فلمی گھرانے کی بنیاد رکھی تھی تو ان کے متعلق ٹھیک ٹھاک معلومات تو حاصل ہونا چاہیے نا۔“

”محمد شفیع ڈار کا خاندان ڈیڑھ سو سال سے بھی کچھ زیادہ عرصے سے لاہور میں آباد تھا۔ انہوں نے جب بی اے پاس کرلیا تو انہیں فلموں سے دلچسپی پیدا ہوئی۔ انہوں نے اس شوق کے تحت ایک فلمی پرچہ نکالا۔ یہ ایک ہفت روزہ تھا جو انگریزی زبان میں نکالا گیا تھا اور اس کا نام تھا ”مووی فلش“۔ اس کا دفتر انہوں نے 8 نمبر میکلوڈ روڈ میں قائم کیا تھا۔ یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ پنجاب کے حوالے سے یہ پہلا فلمی جریدہ تھا جس کا اجرا انگریزی زبان میں ہوا تھا۔ کچھ عرصہ کے بعد ایس ایم ڈار صاحب نے پہلے پرچہ کے ساتھ ایک اور پرچہ ”فلم پکچو ریل“ کے نام سے نکالا۔ یہ پندرہ روزہ پرچہ تھا۔ ان پرچوں کے لیے وہ ہندوستان کے تمام فلمی مراکز کلکتہ، بمبئی اور مدراس آیا جایا کرتے تھے۔ وہاں کی فلموں کی خبریں اور فیچرز شائع کرتے اور ان کے اشتہار بھی لے کر آتے۔

تھوڑے ہی عرصے میں دونوں پرچے پورے متحدہ ہندوستان میں مقبول ہوگئے تھے۔ واضح رہے کہ ان دنوں لاہور بھی ایک فلمی مرکز تھا اور یہاں بننے والی اردو اور پنجابی فلمیں پورے ہندوستان میں دیکھی جاتی تھیں۔ پھر ایک وقت آیا جب لاہور فلم انڈسٹری سے تعلق رکھنے والے بہت سے فلم والے بمبئی اور کلکتہ چلے گئے۔ جن میں فلمساز و ہدایت کار اے آر کاردار اور نذیر صاحب بھی تھے۔ جنہوں نے بمبئی جاکر بڑا نام کمایا۔ اے آر کاردار سے ایس ایم ڈار صاحب کی بڑی دوستی تھی۔ انہوں نے بمبئی جاکر جب اپنی صلاحیتوں سے ایک اعلیٰ مقام حاصل کرلیا تو اپنے صحافی دوست شفیع محمد ڈار کو بمبئی آنے کی دعوت دی اور کہا کہ آپ یہاں آکر میرے اسٹوڈیو اور میرے کاروبار کے نظم و نسق کو سنبھال لیں۔ ڈار صاحب اپنے دوست کے بلانے پر بمبئی چلے گئے اور لاہور سے شائع ہونے والے اپنے دونوں فلمی پرچے اپنے بھائی ایم ڈی ڈار کو سونپ گئے۔ ان کے یہ بھائی چونکہ ان جریدوں کے سلسلے میں پہلے سے ان کے ساتھ تھے اس لیے انہیں اس بات کا یقین تھا کہ وہ دونوں پرچے سنبھال لیں گے۔

ایس ایم ڈار صاحب پڑھے لکھے اور سمجھ دار آدمی تھے۔ جلد ہی کاردار اسٹوڈیو کا کام بڑی خوش اسلوبی سے انجام دینے لگے۔ کاردار صاحب بھی ان کے کام سے بہت خوش تھے اور چاہتے تھے کہ ان کی فیملی کو بھی بمبئی بلوالیں مگر قدرت کو کچھ اور ہی منظور تھا۔ تقسیم ہند کا مرحلہ آیا تو ہندو مسلم فسادات شروع ہوگئے اور ڈار صاحب کو اپنی فیملی بمبئی لانے کی بجائے خود لاہور واپس لوٹ آنا پڑا۔

اس دوران لاہور میں بھی بڑا خون خرابہ ہوا اور املاک کو نقصان پہنچا۔ لاہور کے اسٹوڈیوز بھی تباہی و بربادی سے بچ نہ سکے۔ جب کچھ عرصہ بعد حالات آہستہ آہستہ نارمل ہوئے تو فلم والوں نے دوبارہ فلمسازی شروع کی۔ ایس ایم ڈار صاحب نے جو کاردار

اسٹوڈیو میں فلمسازی کے ہر شعبے کو بہت قریب سے دیکھ چکے تھے یہ فیصلہ کیا کہ انہیں بھی فلم انڈسٹری سے وابستہ ہو کر اپنی نئی اننگز کا آغاز کرنا چاہیے۔ لہٰذا عملی طور پر اس کی ابتداء انہوں نے فلمی فوٹوگرافی سے کی۔ باضابطہ اس کی تربیت حاصل کی۔ پھر تربیت مکمل ہونے کے بعد مکمل عکاس کی حیثیت سے متعدد فلموں کی عکاسی کی مگر یہ ان کی آخری منزل نہیں تھی۔ انہوں نے اللہ کا نام لے کر ہدایت کاری شروع کردی اور اپنی ذہانت، محنت اور لگن کی وجہ سے کئی کامیاب اور یادگار فلمیں بنائیں۔ یہ بات دلچسپی سے خالی نہیں ہوگی کہ ان کی ایک فلم ''سردار'' کے پروڈیوسر روزنامہ جنگ کے مالک و مدیر میر خلیل الرحمٰن اور ماہنامہ ''رومان'' کے غنی دہلوی تھے۔ یہ فلم سلور اسکرین کے بینر پر بنی تھی اور ایک کاسٹیوم اور ایکشن فلم تھی جس میں اس وقت کے نامور فنکاروں صبیحہ، سنتوش، الیاس کشمیری، نیر سلطانہ، شیخ اقبال، نذر، آشا بوسلے، ایم اسماعیل اور غلام محمد نے کام کیا تھا جب کہ اس کے فوٹو گرافر اسلم ڈار تھے۔ یہ اسلم ڈار کی آزاد عکاس کے طور پر ابتدائی دور کی فلم تھی۔ باپ نے یعنی ایس ایم ڈار نے بیٹے اسلم ڈار کو اس شرط پر اس کی فوٹوگرافی کرنے کی اجازت دی تھی کہ اگر پہلے دن تم نے صحیح شوٹنگ کرلی تو تم سے پوری فلم شوٹ کروائی جائے گی ورنہ تمہاری جگہ ہم کسی اور سے عکاسی کروائیں گے۔ اس زمانے میں ہوتا یہ تھا کہ جو شوٹنگ آج کی گئی ہے اس کی پرنٹ نکال کر دوسرے روز کی شوٹنگ سے قبل دیکھا جاتا تھا۔ اسلم ڈار اپنے پہلے دن کی شوٹنگ میں کامیاب قرار دیے گئے تو انہیں پوری فلم کی عکاسی سونپ دی گئی۔ چھوٹے ڈار نے بڑے ڈار کی دوسری فلم ''سلطنت'' کی بھی عکاسی کی۔

یہاں تک کہہ کر میں چند لمحوں کے لیے رکا۔ پھر خانزادہ کو مخاطب کر کے کہا۔

''میرا خیال ہے اسلم ڈار کی پہلی پشت کے بارے میں آپ کو بہت سی باتوں کا علم ہو چکا ہوگا۔ اب اگر کچھ پوچھنا ہو تو اسلم ڈار کے بارے میں پوچھیں کہ آج ہمارا موضوع گفتگو وہی ہے۔''

''اسلم ڈار صاحب کے بارے میں کچھ ایسی باتیں بتائیں جو اب تک کی گفتگو میں نہیں کی گئی ہیں مگر انہیں ان کا طرۂ امتیاز کہا جاسکتا ہے۔''

''اسلم ڈار حقیقتاً ایک بہت اچھی سوچ فکر اور روشن کے تخلیق کار تھے۔'' میں نے اپنی بات سمجھاتے ہوئے کہنا شروع کیا۔ ''جب فوٹوگرافی ترک کر کے انہوں نے فلمیں بنانے کا ارادہ کیا تو سب سے پہلے یہ سوچا۔ فلمیں تو بہت سے لوگ بنا رہے ہیں اگر میں نے بھی انہی کی طرح فلمیں بنائیں تو اس کا کیا فائدہ ہوگا؟ یہ وہ زمانہ تھا جب انور کمال پاشا، شوکت حسین رضوی، مسعود پرویز، خلیل قیصر، حسن طارق، جعفر ملک اور منشی دل جیسے نامور ہدایت کاروں کا فلم انڈسٹری پر راج تھا۔ اگر میں ان سب سے ہٹ کر کوئی ایسی فلم بناؤں جو ہمارے ہاں اب تک نہیں بنائی گئی ہے تو یہ میرا ایکسٹری بیوشن ہوگا۔ لوگ اسے خاص طور پر دیکھنے آئیں گے۔ اس طرح فلم بھی کامیاب ہوگی اور مجھے بھی کامیاب فلم میکر تسلیم کیا جائے گا۔ لہٰذا بہت سوچ بچار کے بعد انہوں نے یہ فیصلہ کیا کہ وہ ٹارزن جیسی ایک فلم بنائیں گے۔ یورپ میں ایسی کئی فلمیں جو ٹارزن کی کہانی پر بنائی گئیں ان سب نے بہت کامیابی حاصل کی۔ اس سوچ کے بعد انہوں نے ''دارا'' کے نام سے جو فلم بنائی وہ ٹارزن نما تھی اور اس کا ٹائٹل رول انہوں نے نصر اللہ بٹ سے کروایا جو اداکار نہیں، انعام یافتہ باڈی بلڈر تھا۔ اس فلم کی بہت سی فلم بندی سابق مشرقی پاکستان کے مشہور جنگل سندر بن میں ہوئی جس میں بہت سے ہاتھیوں نے بھی حصہ لیا۔ اسلم ڈار نے جیسا سوچا تھا ویسا ہی ہوا۔ یہ پاکستان کی پہلی ٹارزن نما فلم تھی۔ اس نے خاطر خواہ کامیابی حاصل کی۔ نصر اللہ بٹ اپنے تن و توش کی وجہ سے ٹارزن کے کردار میں خوب جچا۔ ان کی دوسری ایکشن فلم ''آخری چٹان'' تھی۔ اس فلم میں بھی نصر اللہ بٹ اور رانی نے کلیدی رومانوی کردار کیے تھے۔''

''دارا'' کے بارے میں یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ جب پروڈیوسر میاں مشتاق نے انہیں اپنی فلم ڈائریکٹ کرنے کی دعوت دی تو کس شرط پر انہوں نے میاں صاحب کی آفر قبول کی۔ اسلم ڈار نے میاں مشتاق سے کہا۔ ''میری چند شرطیں ہیں۔ جو یہ ہیں کہ میرا جو دل چاہے گا میں اس موضوع کو فلماؤں گا۔ اگر خدانخواستہ فلم ناکام ہوگئی تو میں آپ سے ایک پیسا بھی نہیں لوں گا مگر کامیابی کی صورت میں فلم کی لاگت نکال کر آپ اپنے فائدے کا چوتھائی حصہ مجھے دیں گے۔''

یہ باتیں ایک ایسا شخص کہہ رہا تھا جس نے اب تک

کوئی فلم ڈائریکٹ نہیں کی تھی جب کہ عام طور پر نیا ہدایت کار پروڈیوسرز کے ہر حکم پر سر تسلیم خم کرتا ہے۔

میاں صاحب اس نوجوان عکاس کی صلاحیتوں سے واقف تھے کیوں کہ وہ ان کی دو فلموں "چھومنتر" اور "رقاصہ" کی عکاسی کر چکا تھا۔ اس ایک واقعے سے ڈار صاحب کی خود اعتمادی کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

خود اعتمادی کے ضمن میں ہی نئے چہروں کے انتخاب کی بات کی جا سکتی ہے۔ انہوں نے اپنی فلموں میں کئی نئے چہرے پیش کیے جن میں سلطان راہی کا نام خصوصی طور پر پیش کیا جا سکتا ہے۔ ایکسٹرا کے طور پر چھوٹے چھوٹے کردار کرنے والے سلطان راہی کو انہوں نے اپنی ایک بہت بڑی فلم "بشیرا" کے ٹائٹل رول میں پیش کیا جس کی پوری انڈسٹری نے مخالفت کی کہ یہ ان کا غلط فیصلہ ہے مگر وہ اپنے ارادے میں اٹل رہے۔ "بشیرا" کی نمائش کے بعد ثابت ہو گیا کہ ان کا فیصلہ کتنا درست تھا۔

سلطان راہی تو پھر بھی ایکسٹرا کے طور پر ہی سہی فلموں سے وابستہ تھے مگر دو چھوٹے قد کے کامیڈین رفیق موچھے اور ٹینگو مینگو کا انتخاب بھی ان کی فن شناس نگاہوں کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ جن دنوں "آخری چٹان" زیر تکمیل تھی۔ ڈار صاحب اس فلم کا کامیڈی کیریکٹر رنگیلا سے کرانا چاہتے تھے مگر ان دنوں رنگیلا اپنی دوسری فلم "دل اور دنیا" بنانے میں مصروف تھے۔ ڈار صاحب رنگیلا کو سائن کرنے کی نیت سے ایورنیو اسٹوڈیو گئے تھے مگر انہیں حد سے زیادہ مصروف دیکھا تو سمجھ گئے رنگیلا ان کی ضرورت کے مطابق انہیں وقت نہیں دے سکے گا۔ وہ وہاں سے مایوس لوٹ رہے تھے کہ وہیں اسٹوڈیو میں انہیں ایک پستہ قد شخص نظر آیا۔ اسے دیکھتے ہی ڈار صاحب کی دوربین نگاہوں نے اندازہ لگا لیا کہ اس میں ایک کامیاب کامیڈین بننے کی صلاحیت موجود ہے۔

"آخری چٹان" کے ہدایت کار نے اس سے پوچھا۔ تمہارا کیا نام ہے؟"

"رفیق۔"

"تم یہاں کیا کام کرتے ہو؟"

"میں دربین صاحب کے دفتر میں کام کرتا ہوں۔"

"تم فلموں میں کام کرو گے؟"

رفیق غیر متوقع سوال سن کر چونکا۔ "جی...... میں کچھ سمجھا نہیں۔"

"میں تمہیں اپنی فلم "آخری چٹان" کے کامیڈی رول میں پیش کرنا چاہتا ہوں۔"

"آپ...... آپ "دارا" والے اسلم ڈار تو نہیں؟"

"ہاں میں وہی ہوں۔"

اور اس طرح ڈار صاحب نے ایک معمولی چپراسی نما شخص کو ایک کامیاب کامیڈین بنا دیا اس کے ساتھ ایک اور چھوٹے قد کے لڑکے ٹینگو مینگو کا پیئر بنا کر "آخری چٹان" میں پیش کیا تو تماشائیوں نے بطور مزاحیہ اداکاران دونوں کی خوب پذیرائی کی۔ رفیق موچھے نے ڈار صاحب کی دیگر فلموں "بشیرا" دل لگی اور کئی فلموں میں کام کیا۔ "بشیرا" میں رفیق موچھے کی "رنگیلا" اور "دل لگی" میں لہری کے ساتھ جوڑی بنائی گئی۔

"سید صاحب!" میں نے ذرا توقف کے بعد کہا۔ "اسلم ڈار نے اپنے فلمی کیریئر میں ایک ایسا جرأت مندانہ کام کیا ہے جو شاید برصغیر کے کسی ڈائریکٹر نے نہیں کیا ہے۔ ہمارے ہاں اگر کوئی پیئر کسی ایک حیثیت میں کامیاب ہو جائے تو اسے دوسری حیثیت میں پیش نہیں کرتے مثلاً کسی فلم میں اگر کوئی ہیرو ہیروئن کے روپ میں پیش ہوئے ہیں تو اسے دوسری فلموں میں بھائی بہن یا باپ بیٹی کے کیریکٹرز میں پیش نہیں کیا جاتا مگر اسلم ڈار نے یہ رسک بار بار لیا۔ "بشیرا" میں ڈار صاحب نے عالیہ اور سلطان راہی کو بہن بھائی کے کردار میں پیش کیا۔ ان کی لازوال اداکاری کے نتیجے میں یہ فلم سپرہٹ ہوئی ہے تو "زرق خان" میں عالیہ اور سلطان راہی ہیروئن اور ہیرو کے روپ میں نمودار ہوتے ہیں۔ تماشائی اس مرتبہ بھی دونوں کو اس حیثیت میں پسند کرتے ہیں اور جب ڈار صاحب "بابل صدقے تیرے" بناتے ہیں تو عالیہ اور سلطان راہی کو باپ بیٹی کے رول میں پیش کرتے ہیں۔ اس بار بھی ڈار صاحب دونوں سے ایسی متاثر کن اداکاری کرواتے ہیں کہ فلم دیکھنے والوں کو اس بات کا خیال نہیں آتا کہ یہ وہی آرٹسٹ ہیں جنہوں نے بہن بھائی یا ہیرو ہیروئن کے کیریکٹر کیے تھے۔"

"اسی لیے برصغیر میں زیادہ تر آرٹسٹ اپنے اوپر کوئی مخصوص چھاپ لگوانا نہیں چاہتے۔" خانزادہ بول پڑے۔ "غالباً وہ یہی چاہتے تھے کہ آرٹسٹ اپنے دلوں کو اس خوف سے آزاد کر دیں۔ اچھا آرٹسٹ وہ ہوتا ہے جو ہر طرح کے کردار میں فٹ ہو جائے بشرطیکہ اس سے کام لینے والا اسلم ڈار جیسا ہدایت کار ہو۔"

کالا چھپرا

حسن رزاقی

کراچی میں بنایا گیا ایک عجوبۂ روزگار شیڈ جس کا صحیح معنوں میں افتتاح نہ ہو سکا پھر بھی اس پر حکومتِ برطانیہ نے ایک خطیر رقم خرچ کردی تھی۔ وہ بدقسمت شیڈ استعمال کی آس میں برسوں تک برساتیں جھیلتا رہا۔

وہ شیڈ جس کی تعمیر دھوم دھڑکے سے ہوئی لیکن استعمال نہ ہو سکا

آج کا دن بہت ہی خاص اور اہم دن تھا کہ آج ہم لوگوں کو ائرپورٹ جانا تھا۔ کسی ایسے شخص سے، جس نے ائرپورٹوں کے اَن گنت چکر لگائے ہوں، یہ جملہ دروغ گوئی میں شمار ہوگا۔ لیکن یہ اُس زمانہ کی بات ہے جب ابھی میری ائرپورٹوں سے شناسائی نہیں ہوئی تھی۔ یہ واقعہ پاکستان بننے کے صرف چند سال بعد کا ہے۔ مجھے اپنے ماموں کو لینے کے لیے اپنے والدین کے ساتھ کراچی ائرپورٹ جانا تھا۔

ہوائی جہازوں کی پروازوں کے اترنے اور بلند ہونے

سے جو شور شرابہ پیدا ہوتا ہے اس سے بچنے کے لیے ساری دنیا میں یہ رواج ہے کہ ائرپورٹ شہروں کی گنجان آبادی کے باہر بنائے جاتے ہیں۔ کراچی شہر کا ائرپورٹ بھی اسی اصول کے تحت شہری آبادی سے کئی میل دور بنایا گیا تھا۔ تقسیم ہند کے وقت کراچی شہر کی گنجان آبادی صدر کے علاقہ سے چند میل آگے آکر ختم ہو جاتی تھی۔ اس سے آگے بکھری بکھری سی آبادی ہوا کرتی تھی۔ کراچی ائرپورٹ کے نزدیک آتے آتے یہ آبادی تقریباً نہ ہونے کے برابر ہوا کرتی تھی۔ رات کے وقت یہ علاقہ بالکل سنسان ہوتا تھا۔ مگر اسی سنسان علاقے میں ائرپورٹ کی عمارت سے کچھ دور پہلے، ایک بہت بڑا ہینگر ہوا کرتا تھا جس کا رنگ کالا تھا۔ اس کالے رنگ کی مناسبت سے یہ ہینگر 'کالا چھپرا' کہلاتا تھا۔ کراچی کے منظر نامہ پر کالا چھپرا بہت عرصے تک نمایاں رہنے کے بعد ایوب خان کے دور حکومت میں ڈھا دیا گیا۔ کالا چھپرا سے متعلق ایک اہم تاریخی واقعہ منسلک ہے۔ بلکہ کالا چھپرا کا وجود اسی تاریخی واقعہ کا مرہون منت تھا۔

☆......☆

ہمارے پاس اپنی ذاتی گاڑی نہیں تھی۔ ہم لوگ والد صاحب کے ایک قریبی دوست کی گاڑی میں سفر کر رہے تھے۔ مغرب کا وقت ہو رہا تھا، اندھیرے کا راج شروع ہونے والا تھا سڑک پر روشنیوں کا کوئی خاص بندوبست نہیں تھا۔ لگتا تھا کہ ہم لوگ کسی انتہائی دور افتادہ مقام کے سفر پر رواں دواں ہیں۔ ائرپورٹ آچکا تھا میں دوڑتا ہوا ائرپورٹ کی عمارت میں داخل ہو کر اوپری منزل پر جانے کے لیے سیڑھیاں چڑھ رہا تھا۔

اوپری منزل پر جانے کی ایک خاص وجہ تھی۔ یہاں پر جہازوں کا نظارہ کرنے کے لیے وزیٹرز گیلری بنی ہوئی تھی۔ ٹارمک پر پارک کیے ہوئے جہازوں کے ساتھ ساتھ ٹیک آف اور لینڈنگ کرنے والے جہازوں کا نظارہ بھی کیا جا سکتا تھا۔ گیلری کے اوپر کھلے آسمان پر تاروں نے جگمگانا شروع کر دیا تھا۔ وزیٹرز گیلری میں پکنک کا سا سماں تھا لیکن پکنک کا سامان ساتھ لانے کی ضرورت نہیں تھی، چائے اور اس کے ساتھ کھانے کی متفرقات کا انتظام گیلری کے ریسٹورینٹ میں موجود تھا۔

شاہد ماموں کا جہاز اتر چکا تھا۔ امگریشن اور کسٹم سے فارغ ہو کر ہم لوگ گاڑی میں بیٹھ کر گھر جانے کے لیے روانہ ہو چکے تھے۔ ائرپورٹ سے واپسی پر کالا چھپرا ہمارے دائیں جانب پڑتا تھا لیکن اندھیرے کی وجہ سے صرف اس کا دھندلا سا ہیولہ دکھائی دے رہا تھا۔ جس کے اوپر سرخ رنگ کی بتیاں جل بجھ کر آنے جانے والے جہازوں کو اپنے وجود سے خبردار کر رہی تھیں۔ میں نے شاہد ماموں سے پوچھا
"آپ کالا چھپرا کے متعلق جانتے ہیں؟"
شاہد ماموں دانشور تھے ان کی معلومات بہت وسیع تھیں۔ انہوں نے مجھے کالا چھپرا کی کہانی سنائی مگر اتنی تفصیل سے نہیں جتنی تفصیل سے میں آپ کو سنانے جا رہا ہوں۔

☆......☆

سلطنت برطانیہ برٹش ایمپائر کا زوال شروع ہو چکا تھا۔ سورج جو سلطنت برطانیہ میں کبھی ڈوبتا نہیں تھا اب ڈوبنے کی تیاریاں شروع کر چکا تھا۔ لیکن برطانوی سلطنت کے مقتدر اس حقیقت کو کلی طور پر تسلیم نہیں کر پا رہے تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ 'راج' کی آخری سانسوں کو جمع کر کے کوئی ایسا کارنامہ یا کارنامے کر دکھائیں جو باقی دنیا میں ان کی گرتی ہوئی ساکھ کو بحال کر دیں یا کم از کم کچھ سہارا ہی دے دیں۔

اس زمانہ میں برطانوی حکومت "امپیریل کانفرنس" کا انعقاد کیا کرتی تھی۔ اس کانفرنس کا مقصد برطانیہ اور اس کے راج کے تحت جو ڈومین تھیں ان کو ایک میز پر لایا جاتا تھا۔ یہ اجتماع 1887ء میں شروع ہوئے اور 1937ء تک جاری رہے۔ سوائے 1894ء اور 1933ء کے اجتماع کے تمام کی تمام امپیریل کانفرنس کا انعقاد برطانیہ میں ہوا۔ 1894ء اور 1933ء کے اجتماع کینیڈا کے شہر آٹوا میں منعقد ہوتے تھے جو کینیڈا کا دارالسلطنت ہے۔ زیادہ اہمیت رکھنے والی کانفرنسوں میں 1887ء کا اجتماع ہے جس میں ملکہ وکٹوریا کی گولڈن جوبلی شامل تھی جبکہ 1897ء میں ان کی ڈائمنڈ جوبلی۔ 1911ء میں جارج پنجم کی اور 1902ء میں ایڈورڈ ہفتم کی تاجپوشی۔ 1937ء میں آخری امپیریل کانفرنس منعقد ہوئی جس میں جارج ششم کی تاجپوشی کا اہتمام تھا۔

امپیریل کانفرنس کا ابتدائی مقصد برٹش راج کی یکجہتی تھا مگر اس میں دوسرے اہم امور بھی شامل تھے۔ ان ہی میں سے ایک تاریخی سنگ میل 'بالفور ڈیکلیریشن' تھا جس کے تحت جتنی ڈومین تھیں ان کو سلطنت برطانیہ کے حلقے میں رہتے ہوئے ہی خود مختاری کا درجہ دیا گیا تھا۔ یعنی ایک طرح سے یہ سب سیاسی ہم پلہ ہو گئے تھے (پولیٹکل ایکول) دوسری جنگِ عظیم کے اختتام پر امپیریل کانفرنس کی جگہ 'دولت مشترکہ' کی کانفرنس کا انعقاد شروع کیا گیا۔

اس دور کے ہوائی جہاز طویل پروازوں کے لیے استعمال نہیں کیے جا سکتے تھے۔ ان جہازوں میں اتنی استطاعت نہیں تھی۔ برطانیہ اور اس کی ڈومین کے درمیان پانی کے جہاز استعمال کیے جاتے تھے جن کے سفر کا دورانیہ کئی ہفتوں تک بھی جاری رہ سکتا تھا۔

ہوائی جہاز ہوا سے بھاری ہوتے ہیں لیکن ایک ہوائی سواری ایسی بھی تھی جو ہوا سے ہلکی ہوتی تھی اور اس کو دور دراز پروازوں کے لیے استعمال کیا جا سکتا تھا۔ یہ سواری ائرشپ کہلاتی ہے۔ ہوائی جہاز تو اس قابل نہیں تھے کہ یہ برطانیہ کو اس کی ڈومین سے ملاتے لیکن اگر برطانیہ ایسے ائرشپ بنا سکے جو اس کو اس کی ڈومین سے ہوائی سفر کے ذریعہ ملا سکیں تو ایک پنتھ دو کاج۔ نقل و حمل کا مسئلہ بھی حل اور سلطنت کی گرتی ہوئی ساکھ کی بحالی کا بھی کچھ کچھ روشن امکان۔ ائرشپ کے ذریعہ مغرب میں لندن سے کینیڈا تک اور مشرق میں لندن سے ہندوستان تک کا سفر طے کیا جا سکتا تھا۔ ساری دنیا پر رعب ڈالا جا سکتا تھا۔

ائرشپ ایک لمبوترا سا ویو ہیکل اسٹرکچر ہوتا ہے۔ (اس کی شکل کچھ ایسی ہوتی ہے جیسے ایک گرتے ہوئے آنسو کو کھینچ کر لمبا کر دیا جائے)۔ ائرشپ کے اس لمبے سے آنسو نما ڈھانچے کو ہوا سے ہلکا بنانے کے لیے اس کے ڈھانچے کو ایک ہوا سے ہلکی گیس سے بھر دیا جاتا ہے۔ یہ گیس ہائیڈروجن ہے جو اس کرۂ ارض پر پائی جانے والی ہلکی ترین گیس ہے۔ لیکن ہائیڈروجن گیس کے ساتھ ایک بہت بڑا اور خطرناک مسئلہ بھی ہے۔ یہ ذوالاشتعال ہوتی ہے، بہت جلدی آگ پکڑ لیتی ہے۔ بالکل اسی طرح جس طرح عاشق کا دل آتش عشق میں جلنے کے لیے ہر لحظہ تیار رہتا ہے۔ ہائیڈروجن گیس کی موجودگی میں اگر ائرشپ میں آگ بھڑک اٹھے تو یہ اس آگ کو آناً فاناً پورے ائرشپ میں پھیلا دے گی۔ لیکن جس طرح سے عاشق کا توڑ رقیب روسیاہ سے کیا جا سکتا ہے اسی طرح سے ہائیڈروجن گیس کے بدلے ہیلیم گیس استعمال کی جا سکتی ہے کیونکہ ہیلیم بھی ہوا کے مقابلہ میں بہت ہلکی ہوتی ہے لیکن جس طرح سے رقیب روسیاہ عاشق کا بدل کامل نہیں ہو سکتا اسی طرح سے ہیلیم بھی ہائیڈروجن کا کامل بدل نہیں ہے۔ دو وجوہ سے۔ ایک تو یہ کہ اس کی کارکردگی ہائیڈروجن سے احقر ہے دوسرے یہ کہ یہ بہت کمیاب ہے۔ اس کے زیادہ تر ذخائر امریکا میں ہیں اور پہلی جنگ عظیم کے بعد امریکا سے ہیلیم کا ملنا اتنا آسان نہیں رہا تھا۔ ہیلیم کے برعکس ہائیڈروجن کا پیدا کرنا آسان ہے۔ بہت سی ایسی دھاتیں ہیں جن کے چھوٹے ٹکڑے یا برادہ سلفیورک ایسڈ میں ملایا جائے تو ان کے کیمیائی عمل سے ہائیڈروجن گیس خارج ہوتی ہے۔ لیکن جب بڑے پیمانے پر ہائیڈروجن گیس درکار ہو تو یہ پانی سے حاصل کی جاتی ہے۔ الیکٹرالیسس کے عمل کے ذریعہ جب پانی سے برقی رو گزاری جاتی ہے تو پانی ٹوٹ کر آکسیجن اور ہائیڈروجن میں تقسیم ہو جاتا ہے۔ کم خرچ بالانشین۔ ایک دفعہ جب ائرشپ میں گیس بھر دی جاتی ہے تو یہ ہوا سے ہلکا ہو کر اوپر اٹھ جاتا ہے۔ اگر آپ نے اس میں انجن بھی لگا رکھے ہیں تو آپ تھوڑا سا پیٹرول یا ڈیزل جلا کر دنیا کی سیر کر سکتے ہیں۔ یہی ہے ائرشپ کا بنیادی اصول۔ ائرشپ کی لفٹ یا اٹھان اسی طرح سے حاصل کی جاتی ہے۔ بمقابلہ ہوائی جہاز کے کہ جس کی اٹھان اس کے پروں کی مرہون منت ہوتی ہے۔ ہوائی جہاز جب ٹیک آف کے لیے دوڑ لگاتا ہے تو ایک رفتار ایسی آتی ہے کہ جس کے بعد ہوائی جہاز کے پروں کے اوپر سے گزرنے والی ہوا کا دباؤ کم اور پروں کے نیچے سے گزرنے والی ہوا کا دباؤ زیادہ ہو جاتا ہے۔ اس حالت میں اگر جہاز کا منہ اوپر کی طرف کر دیا جائے تو جہاز ہوا میں بلند ہو جائے گا اور اگر آپ کی جیب میں جہاز کا ٹکٹ موجود ہے تو آپ ائرشپ کی بجائے اس جہاز میں سفر کر سکتے ہیں۔ بزرگ حضرات مکہ مدینہ اور نوجوان لوگ اپنے خوابوں کی جنت امریکا جا سکتے ہیں۔

ائرشپ میں مسافروں اور عملہ کے کیبن ایک 'گنڈولے' ..... میں بنائے جاتے ہیں۔ گنڈولا ائرشپ کے ڈھانچے کے نیچے جڑا ہوا ہوتا ہے۔ ائرشپ اگر چھوٹا ہے تو اس کے انجن بھی گنڈولے میں ہی نصب کیے جا سکتے ہیں۔ بڑے ائرشپ کے انجنوں کے لیے الگ انجن روم بنائے جاتے ہیں جو گنڈولے سے متصل ہوتے ہیں۔ انجن روم کا عملہ کپتان کی ہدایات ٹیلیگراف کے ذریعہ وصول کرتا ہے۔ یہ ٹیلیگراف ای۔ او۔ ٹی کہلاتا ہے۔

برطانیہ اور کالونیوں کے درمیان رابطہ کا یہ سفید ہاتھی 'امپیریل ائرشپ اسکیم' کے نام سے پکارا گیا۔ برٹش راج کی کوئی بھی چیز 'امپیریل' سے کم نہیں ہو سکتی تھی۔ اس اسکیم کی داغ بیل 1921ء میں ڈالی جا چکی تھی مگر اس وقت یہ اسکیم زیادہ آگے نہ بڑھ سکی۔ اس کے بعد 1923ء میں جب کنزرویٹو حکومت برسراقتدار آئی تو اس نے اس اسکیم کو آگے بڑھایا۔ 1923ء کا ائرشپ کا یہ پروجیکٹ 'برنیز' اسکیم کہلایا۔ اس اسکیم کے تحت کل چھ ائرشپ بنائے جانے تھے۔ 1924ء میں

کنزرویٹو حکومت کو شکست کا سامنا کرنا پڑا۔ اگر حکومتِ پاکستان کی طرح کنزرویٹو حکومت نے اپنی پسند کا الیکشن کمیشن بنالیا ہوتا تو اس کو اس شکست کا سامنا نہ کرنا پڑتا۔ نئی آنے والی حکومت لیبر پارٹی کی تھی۔ افسوس کہ کنزرویٹو پارٹی کو ووٹ دوبارہ گنوانے کا خیال نہیں آیا۔ لیبر پارٹی کی حکومت وزیر اعظم ریمسے میکڈونلڈ کی سربراہی میں بنائی گئی۔

ریمسے کے ایک قریبی ساتھی تھے جن کا نام 'تھامسن' تھا۔ تھامسن نے بھی ریمسے کے ساتھ الیکشن لڑا تھا مگر قسمت کی دیوی کی ان سے اَن بن ہوگئی۔ وہ الیکشن ہار گئے۔ تھامسن الیکشن تو ہار گئے تھے مگر وزیر اعظم کے دل میں تھامسن کے لیے خاص جگہ تھی وہ تھامسن کو اپنی کابینہ میں شامل کرنا چاہتے تھے۔ اس مقصد کو حاصل کرنے کے لیے ان کو ایک خاص ترکیب کا سہارا لینا پڑا۔ یہ وہی آزمودہ ترکیب تھی جس کو استعمال میں لا کر ہمارے ایک سابق صدر نے اپنے پسندیدہ وزیر خزانہ کو وزیر اعظم کا عہدہ دلوایا تھا اور اسی ترکیب کو استعمال میں لا کر ہماری حکومتیں اپنی پسند کا نادرا کا چیرمین مقرر کرتی ہیں۔ ریمسے نے تھامسن کو لارڈ کا درجہ دے کر ان کو ہاؤس آف لارڈز کی گدی دلوادی۔ جس کے بعد ان کو ہوابازی کی وزارت کا قلمدان تھما دیا گیا۔ جب سیاں بھئے کوتوال تو ڈر کاہے کا۔ شکر کا مقام ہے کہ انگریز یہ سبق ہمارے سیاست دانوں کو بھی سکھا گئے ہیں ورنہ بیچارے ہمارے معصوم سیاستداں اپنے مذموم مقاصد کیسے حاصل کرتے۔

ہوابازی کی وزارت سنبھالنے کے بعد تھامسن نے امپیریل ائرشپ اسکیم کی طرف توجہ دی۔ انہوں نے کنزرویٹو پارٹی کی مجوزہ برنیز اسکیم کو رد کرتے ہوئے ایک نئی اسکیم تیار کی جس کے تحت دو ائرشپ بنائے جائیں گے۔ ان کو 101۔آر اور 100۔آر کا نام دیا گیا۔ 100۔آر موجودہ ٹیکنالوجی استعمال کرے گا مگر 101۔آر میں تا ہنوز غیر آزمودہ نئی ٹیکنالوجی استعمال ہوگی۔ 100۔آر کو 'وکرز' کی ایک ذیلی کمپنی ایک پہلے سے طے شدہ قیمت پر بنائے گی جب کہ 101۔آر وزارت ہوابازی کی زیر نگرانی بنایا جائے گا۔ کسی طور سے 100۔آر 'کیپیٹیلسٹ' ائرشپ اور 101۔آر 'سوشلسٹ' ائرشپ کہلائے جانے لگے حالانکہ 101۔آر انتہائی پرتعیش خطوط پر بنایا جانا تھا اس میں کوئی بھی چیز سوشلسٹ یعنی عام آدمی کے لیے نہیں تھی اس کے اندر مسافروں کے لیے ہر طرح کا عیش مہیا کرنے کا مکمل بندوبست کیا جانا تھا۔

ان میں سے ہر دو ائرشپ کا حجم 49 لاکھ کیوبک فٹ، وزن تقریباً 90 ٹن 40 عملہ کے ارکان اور 100 مسافر (یہ ہدف حاصل نہ ہوسکا) رفتار 63 میل فی گھنٹا۔ جی ہاں...... 63 میل فی گھنٹا...... آج کل کی سڑکوں پر چلنے والی گاڑیوں سے کہیں کم لیکن پاکستان میں چلنے والی ریل گاڑیوں کی برق رفتاری سے کہیں زیادہ...... لیٹ ہونے کا خدشہ بھی نہیں۔ ایندھن کا ذخیرہ تقریباً 60 گھنٹے کی پرواز کے لیے کافی ہونا چاہیے۔

ان دونوں ائرشپ کے بنانے کا کام جولائی 1925ء میں شروع ہوکر ایک سال کے عرصے میں مکمل ہوجانا چاہیے تھا۔ 101۔آر کی پہلی تجرباتی پرواز ہندوستان کے لیے جنوری 1927 کو روانہ ہونی تھی۔ لیکن جنوری 1927ء تک ائرشپ بنانے کے کام کا آغاز بھی نہ ہوسکا تھا۔ بالکل اسی طرح جس طرح ہمارے یہاں جیوڈیشل کمیشن بنانے کا آغاز نہیں ہوسکا۔

ائرشپ کے بنانے کا کام بیڈفورڈ شائر کے شہر 'کارڈنگٹن' کے ہینگر میں شروع کیا گیا۔ یہ ہینگر دوسری جنگِ عظیم کے دوران تعمیر کیا گیا تھا۔ پروگرام کے انچارج کا نام گروپ کیپٹن پیرگرائن فیلوز ان کے معاون کا نام کولمور۔ ڈائریکٹر ڈیزائین کی ذمہ داری لیفٹیننٹ کرنل رچمنڈ کو سونپی گئی۔ کرنل رچمنڈ کے کاندھوں پر بھاری بوجھ تھا اس لیے کہ 101۔آر کو نئی ٹیکنالوجی کے تحت بنایا جانا تھا جس کے لیے عمیق تحقیق کی ضرورت تھی۔ یہ تحقیق نیشنل فزیکل لیباریٹری میں کی جائے گی۔ یہ لیباریٹری بش پارک لندن میں واقع ہے اور انگلستان میں اپلائیڈ فزکس کا سب سے بڑا ادارہ ہے جو بیسویں صدی کے اوائل سے اس میدان میں خدمات انجام دے رہا ہے۔

ابتدائی ڈیزائین کے مطابق 101۔آر کی لمبائی 735 فٹ، چوڑائی 131 فٹ، رفتار 61 میل فی گھنٹا، مرکزی اسٹرکچر کا حجم 4،9 ملین کیوبک فٹ۔ اس کے ڈھانچے کے لیے کم وزن والے ڈیورالیومن کی بجائے اسٹینلیس اسٹیل استعمال کی جانی تھی۔ ڈیورالیومن ایلومینیم میں دوسری دھاتوں کو ملا کر تیار کی جاتی ہے۔ یہ ہلکی ہونے کے ساتھ ساتھ مضبوط بھی ہوتی ہے۔ خالص ایلومینیم میں وہ مضبوتی نہیں ہوتی ہے جو پرواز کے دوران جہاز پر پڑنے والی قوتوں کو برداشت کر سکے۔ جب ائرشپ کا ڈھانچا تیار ہوجاتا ہے تو اس کو فیبرک سے منڈھنا پڑتا ہے تاکہ اس میں پانی نہ جاسکے۔ فیبرک کو مضبوط اور واٹر پروف بنانے کے لیے اس پر پلاسٹک کی تہہ

چڑھائی جاتی ہے۔ پلاسٹک کی یہ تہہ فیبرک کو مضبوطی کے ساتھ ساتھ سختی بھی دیتی ہے۔ اب یہ فیبرک موسم کی سختیاں برداشت کرنے کے قابل ہو جاتا ہے۔ 101۔آر پر جو فیبرک منڈھا گیا تھا اس کے اوپر پلاسٹک کا ملمع پہلے ہی چڑھایا جا چکا تھا پری ڈوپڈ فیبرک۔

101۔آر چونکہ ہندوستان کی پروازوں کے لیے استعمال ہونا تھا جہاں کا درجۂ حرارت زیادہ ہوتا ہے، اس میں پیٹرول کی بجائے ڈیزل انجن استعمال ہوں گے۔ اس لیے کہ ڈیزل کا نکتہ اشتعال پیٹرول سے بہتر ہوتا ہے۔ پیٹرول کم درجۂ حرارت میں آگ پکڑ سکتا ہے۔ اس سے پہلے پہلی جنگ عظیم کے دوران رائل نیوی کے ائرشپ 38۔آر میں پیٹرول کے بخارات کے دھماکے سے آگ لگ چکی تھی جس میں کئی جانیں ضائع ہوئی تھیں جن میں اس وقت کے ائرشپ ٹیکنالوجی کے بڑے بڑے ماہرین بھی شامل تھے۔

ڈیزائین کے مطابق ائرشپ میں چھ سلنڈر والے چار انجن استعمال کیے جانے تھے لیکن یہ انجن مطلوبہ طاقت فراہم نہ کرسکے جس کی بناء پر آٹھ سلنڈر والے پانچ انجن استعمال کیے گئے۔ آٹھ سلنڈر حاصل کرنے کے لیے چار چار سلنڈر والے دو دو انجنوں کو جوڑ کر ایک انجن بنایا گیا۔ ایک 18 سال کی دلہن کی بجائے دو نو نو سال کی دلہنوں سے کام چلایا گیا۔ ضرورت ایجاد کی ماں ہے۔ ان انجنوں کا وزن بھی پلان کیے گئے انجنوں سے کہیں زیادہ نکلا۔ کپتان اور انجن روم کے رابطہ کا وہی طریق کار تھا جو ساس بہو کے رابطے کا پہلا اصول ہے...... دور دور سے۔ یہ رابطہ ای۔او۔ٹی...... ’انجن آرڈر ٹیلیگراف‘ کے ذریعہ کیا جاتا تھا۔ یہ کوئی برقی ٹیلیگراف نہیں ہوتا ہے بلکہ یہ ایک آٹھ دس انچ قطر کا ایک گیجٹ ہوتا ہے، جس کے ذریعہ کپتان انجن کے انجینئر کو بتاتا ہے کہ انجن کو کس طاقت پر چلانا ہے۔

مسافروں کے کیبن گنڈولے میں بنائے گئے تھے۔ گنڈولہ... دو منزلہ تھا اور حسبِ دستور ائرشپ کے مرکزی ڈھانچے کے نیچے جڑا ہوا تھا۔ اوپری منزل پر مسافروں کے لیے انتہائی پُرتعیش کیبن بنائے گئے تھے۔ نچلے ڈیک پر اسموک روم (مسافروں کی بیٹھک...... تمباکو نوشی کے لیے) بنایا گیا تھا جس کی دیواروں کو ایسبسٹوس کی چادروں سے ڈھانکا گیا تھا۔ یہ تدبیر آتشزدگی کے امکانات کو کم کرنے کے لیے اختیار کی گئی تھی۔ عملہ کے کیبن، باورچی خانہ اور کھانے کا کمرا بھی نچلی ڈیک پر ہی بنائے گئے تھے۔

101۔آر بن کر تیار ہو چکا تھا اس کی کارکردگی جانچنے کے لیے تجرباتی پروازوں کا آغاز کیا جا سکتا تھا۔ پہلی ٹیسٹ فلائیٹ 14 اکتوبر 1929ء کو عمل میں آئی۔ اس پرواز میں عملہ کے 38 ارکان کے ساتھ ساتھ 14 مسافر بھی مدعو تھے۔ یہ سب کھاتے پیتے لوگ تھے میری آپ کی طرح عام انسان نہیں تھے۔ ہماری قسمتوں میں ائرشپ کی سواری کہاں! ان اہم افراد میں 101۔آر کے چیف ڈیزائینر ونسنٹ رچمنڈ بھی شامل تھے۔ کھاتے پیتے لوگوں کو کھلانا پلانا بہت ضروری ہوتا ہے۔ اس غرض سے ان لوگوں کے لیے انتہائی پُرتکلف لنچ تیار کیا گیا تھا۔ اس شکم سیر لنچ میں سوپ، سلاد، روسٹ، سبزی، پھل اور پنیر شامل تھے۔ لنچ کے اہم شغل سے فارغ ہونے کے بعد مسافروں نے اسموک روم کا رخ کیا تاکہ تمباکو نوشی اور چائے سے لطف اندوز ہو سکیں۔

اس پرواز کے کپتان میجر جارج ہربرٹ تھے جو ایک انتہائی تجربہ کار ہواباز تھے۔ ائرشپ نے پہلے بیڈفورڈ کے گرد چکر لگائے پھر اس کے بعد براستہ آکسفورڈ شہر لندن کا رخ کیا۔ فاصلہ تقریباً 300 میل، رفتار 61 میل فی گھنٹا بلندی تقریباً دو ہزار فٹ یعنی ائرشپ کی لمبائی کی صرف تین گنی۔ اس ٹیسٹ سے موصول ہونے والی پہلی رپورٹ کے مطابق ائرشپ کی کارکردگی اطمینان بخش تھی۔ دوسری ٹیسٹ فلائیٹ 31 اکتوبر 1929ء کو عمل میں آئی جس کا نظارہ شاہ جارج پنجم اور ملکہ میری نے بھی کیا۔

گو کہ اڑان کے حساب سے 101۔آر کی کارکردگی تسلی بخش تھی، لیکن مسافروں اور سامان کے جس وزن کو لے جانے کے لیے یہ ائرشپ بنایا گیا تھا، یہ اُس وزن کا بار نہیں اٹھا سکتا تھا۔ ڈیزائین کے مطابق 101۔آر کو 60 ٹن وزن لے جانے کے قابل ہونا چاہیے تھا لیکن یہ صرف 35 ٹن وزن اٹھا سکتا تھا۔ اگر اس سے مطلوبہ 60 ٹن کے وزن کا بار اٹھوانا ہے تو اس کے ڈیزائین میں بڑی نوعیت کی تبدیلیاں کرنی پڑیں گی۔ اس کی لمبائی کو مزید کئی فٹ بڑھا کر 735 فٹ کی بجائے 770 فٹ کرنا پڑے گا جس کے لیے ائرشپ میں ایک 35 فٹ کا پیوند لگایا جائے گا۔ یہ بہت بڑا کام تھا۔ اس کی ایک ہی ترکیب تھی۔ پہلے ائرشپ کو بیچ سے دو ٹکڑے کیا جائے گا اس کے بعد اس میں یہ 35 فٹ کا ٹکڑا جوڑا جائے۔ اس ٹکڑے کے جوڑنے کے ساتھ ہی ساتھ ائرشپ میں ہائیڈروجن کی مقدار بھی بڑھانی پڑے گی جس کے لیے مزید گیس بیگ بھی لگائے جائیں گے جو ائرشپ کے اس اضافی

ٹکڑے کو ہوا سے ہلکا بنائیں گے۔ سارا کھیل ائرشپ کے ہوا سے ہلکے ہونے کا تھا۔ 1930ء کے موسم گرما تک یہ تمام تبدیلیاں مکمل ہو چکی تھیں۔ ان تبدیلیوں کے بعد 100۔آر اور 101۔آر برطانیہ سے کینیڈا اور ہندوستان کا سفر 50 ٹن وزن (پے لوڈ) کے ساتھ طے کر سکیں گے۔ (100 آر میں ابھی یہ تبدیلیاں نہیں کی گئی تھیں)

تمام تبدیلیوں (ماڈی فکیشن) کے بعد جب 101۔آر مکمل کیا گیا تو اس کی لمبائی 770 فٹ ہو چکی تھی۔ اس لمبائی کی ہیت کا اندازہ اس طرح لگایا جا سکتا ہے کہ بوئینگ کے 747۔بی کی لمبائی 232 فٹ ہوتی ہے (آج سے چند سال پہلے تک 747۔بی دنیا کا سب سے بڑا مسافر بردار ہوائی جہاز ہوا کرتا تھا) یعنی اگر 3 بوئینگ 747۔بی منہ سے دم لگا کر کھڑے کر دیے جائیں تو ان کی مشترکہ لمبائی کل 696 فٹ بنے گی۔ 101۔آر کی لمبائی اس سے بھی 74 فٹ زیادہ تھی۔ یعنی ایک اور چھوٹے جہاز کے کھڑے کرنے کی گنجائش موجود تھی۔ اور اس تمام تر لمبائی میں کتنے مسافر سما سکتے تھے۔ صرف 60...... جبکہ تین 747 اور ایک چھوٹے جہاز میں کل ملا کر 1400 کے لگ بھگ مسافر سما سکتے ہیں۔

نئے ڈیزائین کے مطابق تکمیل شدہ 101۔آر پہلی اکتوبر 1930ء کو اپنے ہینگر سے باہر لا کر مورنگ ماسٹ کے ساتھ ڈاک (پارک) کیا گیا اور اس کے عملہ نے 24 گھنٹے دورانیہ کی ٹیسٹ فلائیٹ کی تیاریاں شروع کر دیں۔ طے یہ ہوا کہ اگر ائرشپ کے ابتدائی ٹیسٹ اطمینان بخش ہوئے تو ٹیسٹ کا دورانیہ 24 گھنٹے سے کم کیا جا سکتا ہے۔ یہ ٹیسٹ فلائیٹ صرف 17 گھنٹا جاری رہی اس لیے کہ ائرشپ کی کارکردگی تسلی بخش قرار دی جا چکی تھی۔ کارکردگی تسلی بخش تو تھی مگر اس کے ساتھ ہی ساتھ سنجیدہ تحفظات بھی تھے کہ اس پرواز کے دوران موسم اچھا اور موافق تھا۔ خراب موسم کے لیے ائرشپ موزوں تھا یا نہیں اس کا اندازہ نہیں لگایا جا سکتا تھا جب تک کہ خراب موسم میں اس کو اڑایا نہ جائے۔

دو دن بعد 101۔آر کو ہندوستان کے لیے روانہ ہونا تھا۔ ڈائرکٹر ائرشپ ڈیویلپمنٹ کا کہنا تھا کہ 101۔آر کی ہندوستان کی پرواز کے لیے ضروری ہے کہ اس پرواز سے پہلے اس کو خراب موسم میں اڑانے کا تجربہ کیا جائے اور ساتھ ہی ساتھ انجنوں کو فل اسپیڈ (پوری طاقت) پر اڑا کر اس کا نتیجہ بھی دیکھا جائے کہ انجن فل اسپیڈ کا بوجھ سہار سکتے ہیں یا نہیں۔

دوسری طرف وزیر ہوابازی لارڈ تھامسن چاہتے تھے کہ وہ ائرشپ پر ہندوستان کا چکر لگا کر 20 اکتوبر کو ہونے والی اگلی امپیریل کانفرنس سے پہلے پہلے انگلستان واپس پہنچ جائیں تاکہ کانفرنس کے شرکاء اور ان سے زیادہ ساری دنیا پر ڈولتی ہوئی سلطنت برطانیہ کا رعب ڈالا جا سکے۔ امپیریل کانفرنس سے پہلے ہندوستان کی پرواز کا حکم انہوں نے واضح الفاظ میں نہیں دیا تھا صرف ڈھکے چھپے الفاظ میں اس کا اظہار کیا تھا۔ لیکن...... حکم حاکم مرگ مفاجات۔ مزید دو دن کی تیاری کے بعد بروز ہفتہ مورخہ 4 اکتوبر 1930-101۔آر عازم ہندوستان ہوا۔ ہندوستان میں اس کی منزل اپنا روشنیوں کا شہر کراچی تھا جو اس وقت اتنا روشن نہیں ہوا کرتا تھا۔ بنیادی طور پر اس کو مچھیروں کا شہر سمجھا جاتا تھا۔ کراچی کا نام ایک زمانہ میں کولاچی ہوا کرتا تھا۔ کراچی میں اس وقت اگر روشنیاں نہیں تھیں تو آجکل کی دہشت کا راج بھی نہیں تھا۔ پرسکون شہر تھا۔

لندن سے کراچی کا فاصلہ زیادہ تھا 101۔آر بغیر راستہ میں رکے ہوئے یہ سفر طے نہیں کر سکتا تھا۔ اس درمیانہ مستقر کی جگہ کے لیے مصر کے شہر اسماعیلیہ کو چنا گیا۔ اسماعیلیہ اور کراچی میں 101۔آر کو پارک کرنے کے لیے ہینگر تعمیر کیے گئے۔ کراچی میں تعمیر ہونے والا ہینگر ''کالا چھپرا'' کے نام سے موسوم ہو گیا۔ 101۔آر کا ہینگر بنانے کے لیے کراچی کو تین وجوہ کی بناء پر چنا گیا تھا۔ کراچی کا جغرافیائی محل وقوع، یہاں کا معتدل موسم اور رائیل ایئر فورس کا ڈرگ ایئر فیلڈ جو آج فیصل ایئر بیس کے نام سے موسوم ہے۔ ڈرگ ایئر فیلڈ میں ہر طرح کی فنی اور دیگر سہولتیں موجود تھیں۔ یہاں کا ایئرو کلب کنٹری کلب کے نام سے مشہور تھا جہاں دیگر تقریبات کے ساتھ ساتھ جوان جہان جوڑے شادی کے مقدس بندھن میں بندھ کر بعد میں پچھتایا کرتے تھے۔ ایرو کلب کی اپنی ایئر اسٹرپ بھی ہوا کرتی تھی جو چھوٹے ہوائی جہازوں کے پرواز کی اڑان پکڑنے اور اترنے کے لیے استعمال ہوتی تھی۔ یہ ایئر اسٹرپ آج کے گلشن اقبال کے قریب سے شروع ہو کر نیشنل اسٹیڈیم کے قریب تک جایا کرتی تھی۔ آج کی یونیورسٹی روڈ کنٹری کلب روڈ کہلاتی تھی اور اسی نام کی مناسبت سے نیشنل اسٹیڈیم کا وہ سرا جو اس سڑک کے رخ ہے ''کنٹری کلب روڈ اینڈ'' کہلاتا ہے۔

کراچی کے ایئرو کلب نے بہت سے مایہ ناز ہواباز

تیار کیے۔ کالا چھپرا اور ایئر شپ کو ڈاک کرنے کے لیے مورنگ ماسٹ کی تعمیر 1927ء میں شروع کی جا چکی تھی۔ کالا چھپرا کی لمبائی 850 فٹ، چوڑائی 180 فٹ اور اونچائی 170 فٹ۔ اس کی لمبائی 850 فٹ اس لیے رکھی گئی تھی کہ 101۔آر کے ساتھ ہی ساتھ اس کے اندر مستقبل میں بنایا جانے والا ایئر شپ 102۔آر بھی سما سکے جس کی لمبائی 822 فٹ ہوتی تھی۔

برطانوی ٹی وی پر ایک پروگرام نشر ہوا کرتا تھا جو بعد میں پاکستان ٹی وی پر بھی نشر ہونے لگا 'یس منسٹر'۔ بعد میں جب منسٹر صاحب کی ترقی ... ہوگئی تو یہ پروگرام بھی ترقی کی منزلیں طے کرتا ہوا 'یس پرائم منسٹر' بن چکا تھا۔ اس پروگرام کو دیکھنے کے بعد مجھ پر یہ عقدہ کھل چکا تھا کہ بیوی شوہر کا حکم ٹال سکتی ہے لیکن ماتحت عملہ منسٹر کا حکم نہیں ٹال سکتا۔ بیوی شوہر کے احکامات سے روگردانی کرسکتی ہے...... بلکہ شوہر کو نکی کا ناچ نچا سکتی ہے لیکن ماتحت عملہ منسٹر کے آگے چوں بھی نہیں کرسکتا۔ لہٰذا جب برطانیہ کے ہوابازی کے منسٹر لارڈ تھامسن نے خواہش ظاہر کی کہ وہ 4 اکتوبر 1930ء کو اس وقت کے ہندوستان کے شہر کراچی کا چکر لگا کر واپس آنا چاہتے ہیں تو کسی نے اس کی مخالفت نہیں کی حالانکہ تکنیکی ماہرین کو اس پرواز کے بارے میں سنجیدہ تحفظات تھے۔ لیکن آنے والی امپیریل کانفرنس سے پہلے ائرشپ کے ذریعہ ہندوستان کا سفر کر کے کانفرنس کے شرکاء اور باقی دنیا پر برٹش راج کا رعب جمانا وقت کی اہم ترین ضرورت بن چکا تھا۔

101۔آر 4 اکتوبر 1930ء شام ساڑھے چھ بجے ہندوستان کے لیے روانہ ہو چکا تھا۔ پہلے اس نے بریڈفورڈ کے گرد چکر لگائے پھر لندن کا رخ کیا۔ رات 8 بجکر 20 منٹ پر ائرشپ لندن کے اوپر سے گزرا۔ رات 9 بجکر 35 منٹ پر اس نے ہیسٹنگز کو کراس کیا۔ ائرشپ سے پیغام موصول ہوا کہ بارش شروع ہو چکی ہے، ہوائیں بھی تیز ہیں۔ ہوا کا رخ جنوب مغربی۔ رات ساڑھے گیارہ بجے ائرشپ انگلش چینل پار کر کے فرانس کی حدود میں داخل ہو چکا تھا۔ چینل کا فاصلہ تقریباً 60 میل۔ ائرشپ اس وقت 800 فٹ کی بلندی پر پرواز کر رہا تھا۔

آدھی رات ہو چلی تھی کارڈنگٹن میں پیغام وصول ہوا ''اس وقت ہم ایبے ول سے تقریباً 15 میل جنوب مغرب کی طرف ہیں۔ رفتار 33 ناٹ، بلندی 1500 فٹ، درجۂ حرارت 51 ڈگری فیرن ہائیٹ۔ وقفہ وقفہ سے بارش ہو

رہی ہے۔ رات دو بجے عملے نے گارڈ ڈیوٹی تبدیل کی۔ کوئی قابلِ ذکر بات نہیں ہوئی۔ اس موقع پر انجینئر لیچ نے انجن روم میں جا کر انجن چیک کیے ہر چیز معمول کے مطابق پائی۔ وہ سگار پینے اسموک روم چلے آئے۔ اس وقت ائرشپ بووے کے اوپر سے گزر رہا تھا۔ یکا یک اس نے ایک گہرے زاویے کا غوطہ لگایا۔ انجینئر لیچ نے اس کا جھٹکا اسموک روم میں محسوس کیا۔ اسموک روم کا فرنیچر آگے کو سرکنے لگا وہاں کھڑے ہوئے لوگوں کو اپنا توازن قائم رکھنے میں مشکل محسوس ہوئی۔ لیکن پائیلٹ نے جلد ہی اس غوطہ پر قابو پا لیا۔ بووے کا سمندری علاقہ ہوا کے خطرناک جھکڑوں کے لیے مشہور ہے۔ ائرشپ کا یہ غوطہ ان ہی جھکڑوں کی وجہ سے آیا تھا کہ یہ غوطہ 90 سیکنڈ کے دورانیے کا تھا۔ ہوا کی تندی کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ اس غوطے سے باہر نکلنے کے لیے ایلیویٹر اپنی پوری حد تک کھینچا جا چکا تھا لیکن اس کے باوجود ائرشپ کا منہ اُفق سے صرف 3 ڈگری اونچا کیا جا سکا تھا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ ائرشپ کا منہ بہت بھاری ہے۔ نوز ہیوی ہو چکا ہے۔ اس کی ایک ہی ممکنہ وجہ ہو سکتی تھی...... ائرشپ کے اگلے حصہ میں جو گیس بیگ نصب تھے ان میں سے ہائیڈروجن گیس خارج ہو چکی تھی۔ ہائیڈروجن کی جگہ ہوا نے لے لی تھی جس کی وجہ سے نوز کا ہلکا پن بری طرح سے متاثر ہو چکا تھا۔ اسی اثناء میں ائرشپ نے دوسرا غوطہ لگایا اور دائیں بائیں جھولنے لگا۔ 'اسیلیٹ' کرنے لگا۔ اگر یہ 'آسیلیشن' مزید بڑھ گئے تو ائرشپ کو سنبھالنا مشکل ہو جائے گا۔ ائرشپ نے ایک بار پھر نیچے کی طرف آنا شروع کر دیا یہاں تک کہ اس کا منہ زمین سے ٹکرا گیا۔ منہ زمین سے ٹکرایا ضرور تھا لیکن اس کی شدت امپیکٹ اتنی زیادہ نہیں تھی۔ ایک طرح سے یہ ایک ہلکی...... سافٹ لینڈنگ تھی۔ نوز کے ساتھ ساتھ ایک انجن کے پنکھ بھی زمین سے ٹکرا چکے تھے اور اس کی انجن کار تڑ مڑ گئی تھی۔ ائرشپ کی رفتار صرف 14 میل فی گھنٹا کے قریب تھی مسافروں کے بچنے کی اُمید تھی۔ لیکن یکا یک آگ بھڑک اٹھی جس نے پورے ائرشپ کو اپنی لپیٹ میں لیتے ہوئے اس کو جلا کر خاکستر کر دیا۔ قیاس ہے کہ اس آگ کی وجہ انجن کار کا تڑ مڑ جانا تھا جس کی وجہ سے انجن کی گرم ہوا نے گیس بیگ سے خارج ہوتی ہوئی ہائیڈروجن گیس کو بھڑکا دیا۔ جس کے بعد تمام گیس بیگ ایک کے بعد ایک زوردار دھماکوں سے پھٹنا شروع ہو گئے۔ عملہ اور مسافروں میں سے کل 8 افراد ائرشپ سے باہر نکلنے میں کامیاب ہو سکے۔

انجینئر لیچ اسموک روم میں تھے۔ وہ بچ گئے۔ ان کے علاوہ 3 مزید انجینئر اور ایک رگر اپنے اپنے انجن روم میں تھے۔ انجن روم گنڈولہ سے متصل مگر اس کے باہر تھے اس لیے یہ چاروں افراد بھی بچ گئے۔ ایک اور رگر جن کا نام چرچ تھا وہ بھی بچ گئے تھے مگر بعد میں زخموں کی تاب نہ لا سکے اور تین دن بعد اس دارِ فانی سے کوچ کر گئے۔

جاں بحق ہونے والوں کی چرچ سروس لندن کے سینٹ پال کیتھیڈرل میں منعقد کی گئی جس کے بعد مرحومین کے تابوت بذریعہ ٹرین بریڈفورڈ لے جائے گئے جہاں پر ان کے لیے کارڈنگٹن میں تدفین کا بندوبست کیا گیا تھا۔ 101۔آر کارڈنگٹن کے ہینگر سے ہی ہندوستان پرواز کے لیے روانہ ہوا تھا۔ پہنچی وہیں یہ خاک جہاں کا خمیر تھا۔ مرنے والوں میں وزیر ہوابازی لارڈ تھامسن بھی شامل تھے۔

101 آر کی تباہی تاج برطانیہ کے لیے ناقابلِ تلافی نقصان تھا۔ اس کی لمبی اور مکمل تحقیقات کی گئیں۔ اس سانحہ کا زیادہ تر ملبہ لارڈ تھامسن کے حصہ میں آیا کہ انہوں نے امپیریل کانفرنس کی وجہ سے 101۔آر کی اڑان میں جلد بازی کا مظاہرہ کیا۔ جس کی وجہ سے ائرشپ کے خراب موسم میں اڑان، انجن کا فل اسپیڈ ٹیسٹ اور بعض دوسرے ٹیسٹ نہیں کیے گئے۔ اپنے ایک مضمون میں سر موریس جے ڈین نے اس حادثہ کے بارے میں اس طرح اپنے خیالات کا اظہار کیا ''اگر لارڈ تھامسن نے 101۔آر کی اڑان میں جلدی کی تھی تو اس جلدی کی قیمت انہوں نے اپنی جان دے کر ادا کی۔''

101۔آر کی تباہی نے راج برطانیہ کی امپیریل ائرشپ اسکیم کے تابوت میں آخری کیل کا کردار ادا کیا۔ آخرش یہ اسکیم طاقِ نسیاں ہوگئی۔

100۔آر جو 101۔آر کے ساتھ ساتھ بنایا جا رہا تھا اس کو مکمل نہیں کیا گیا اور اس کے بعد بنائے جانے والے 102۔آر کے منصوبہ کو لپیٹ کے رکھ دیا گیا۔ کالا چھپرا کی ضرورت ختم ہو چکی تھی اب اس کو ڈھایا جا سکتا تھا۔ کالا چھپرا کی مثال اس دلہن کی سی ہے جو شب عروسی اپنے ساجن کی راہ تکتے تکتے سو گئی تھی اور ابھی نیند کے دوران اس کی نقدیٔ حیات ختم ہو چکی تھی۔

انوکھا گھر

ڈاکٹر عبد الرب بھٹی

مکانوں کی تعمیر بھی ایک فن ہے جب کہ ہم مکان تعمیر کرتے وقت چھوٹی چھوٹی اہم باتوں کو نظر انداز کردیتے ہیں جس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ ماحول بھی آلودہ ہو رہا ہے اور ہم بھی متاثر ہورہے ہیں۔ امریکا میں آئے بجلی کے بحران سے اس نے سبق حاصل کیا اور ایک ایسا گھر ڈیزائن کرلیا جو خود میں منفرد ہے۔

توانائی بچانے والے صحرائی گھر کی افادیت آپ کو حیران کر دے گی

توانائی کے اس شدید بحران اور لوڈشیڈنگ کے عذاب میں مبتلا لوگوں کے لیے روٹان کا یہ طریقہ آزمانا چاہیے، جب 1970ء میں امریکا توانائی کے ایک شدید بحران کا شکار ہوگیا تھا تو ایک عام سے مگر ذہین نوجوان نے کس طرح اس کا حل نکالا تھا یہ غور طلب امر ہے۔

صحرائے موجیو نامی ایک امریکی صحرا میں جب شدید گرم، خشک اور بدن کو جھلسا دینے والا دن ہو اور آپ اس... تمازت سے بچنے کے لیے ''برٹ روٹان'' اہرام نما صحرائی گھر

میں چلے جائیں تو یقیناً آپ محسوس کریں گے کہ ابھی ابھی پرندے چہچہانا شروع کر دیں گے۔

صحرائی اہرام نما یہ گھر جو کہ ایک عظیم تخلیق ہے، دیکھنے میں تو قدیم اہرام کی شکل کا ہے لیکن اس میں جدید دور کی فنی مہارت نظر آتی ہے۔ دن ڈھلے جب سورج تمام نمی کو جذب کر چکا ہوتا ہے اور آپ کار گھر کے سامنے والے دروازے سے اندر لاتے ہیں تو گھر میں داخل ہوتے ہی آپ کا خشک چہرہ ٹھنڈی اور نمدار ہوا کا جھونکا محسوس کرے گا اور آپ خود کو تر و تازہ محسوس کریں گے۔

اس وقت گھر کے اندر کا درجہ حرارت 79 ڈگری فارن ھائیٹ ہے۔ خواہ باہر کا درجہ حرارت 179 ڈگری فارن ھائیٹ ہی کیوں نہ ہو۔

روٹان کا کہنا ہے کہ جب اسے اور بھی کم درجہ حرارت درکار ہوتا ہے، مثلاً 75 ڈگری فارن ھائیٹ، تو وہ ایئر کنڈیشنر کو چند منٹوں کے لیے آن کر دیتا ہے۔ اس کے بعد ایئر کنڈیشنر کا تھرمو اسٹیٹ ایئر کنڈیشن کو بند کر دیتا ہے۔ ایئر کنڈیشنر کے چلنے کی آواز تو پانی کے چھوٹے چھوٹے تالابوں کے جوڑے میں بہنے والے پانی کی موسیقی میں ہی گم ہو جاتی ہے، جو ایک ٹھوس چٹان سے بنی ہوئی دیوار کے ساتھ بنے ہوئے ہیں۔

ان تالابوں کے پہلو میں لکڑیاں جلانے والا آتش دان ہے۔ یہ وہ چیزیں ہیں جو روٹان کے گھر کو ٹھنڈک اور حرارت کی توانائی فراہم کرتی ہیں۔

اس گھر کی دیواروں اور چھتوں میں بہت سا تھرمل میٹریل استعمال کیا گیا ہے۔ روٹان کہتا ہے کہ سردیوں کے موسم میں اس علاقے میں برف باری کی وجہ سے بہت زیادہ ٹھنڈک ہو جاتی ہے۔ مگر لکڑی کے دو ٹکڑے اس پورے گھر کو گرم رکھنے کے لیے کافی ہوتے ہیں، جو انگیٹھی میں جلائے جاتے ہیں۔ اس کے علاوہ گرمی کا ایک ذریعہ چٹان بھی ہے۔

1970ء میں توانائی کا جو شدید بحران آیا تھا اس کے بعد سے کم سے کم توانائی خرچ کرنے والا گھر بنانا اور ڈیزائن کرنا روٹان کا خواب تھا جو بالآخر پورا ہو گیا۔ اب تو روٹان خود کہتا ہے کہ اگر وہ جہازوں کا ڈیزائنر نہ ہوتا تو ایک آرکیٹیکٹ ہوتا۔

ورسا کیڈ (versacad) نامی... سافٹ ویئر استعمال کرتے ہوئے روٹان نے اپنے میکنٹوش ٹو Macintosh-2 کمپیوٹر کے ذریعے ایک مکان کا رف سا منصوبہ بنایا، جس میں برآمدہ اور کمروں کی ترتیب دکھائی گئی تھی۔ پھر اس نے اپنی ضروریات اور دیگر خصوصیات کی فہرست بنائی اور ایک ٹھیکیدار ڈگ اسٹون اور ایک آرکیٹیکٹ ڈیوڈ کیسل کی خدمات حاصل کیں۔

ایسے میں آرکیٹیکٹ ڈیوڈ کیسل نے ہی ایک نیا منصوبہ پیش کر دیا جو کہ روٹان کو بے حد پسند آیا۔ یہ نیا منصوبہ دراصل روٹان کی ضروریات کو مدنظر رکھتے ہوئے اور اس میں مزید کچھ سہولتوں کا اضافہ کر کے تیار کیا تھا۔

روٹان کا کہنا ہے کہ اس نے اصل میں ایک Super Insulated ڈھانچے کا ڈیزائن بنایا تھا جس میں ایک کھلی چٹان کو حرارت محفوظ رکھنے کے لیے شامل کیا گیا تھا۔

اس کے علاوہ اس میں کچھ حد تک سورج کی مدد سے گرم اور ٹھنڈا رکھنے کا سسٹم بھی شامل تھا۔ لیکن یہ ایک مربع نما گھر تھا۔

کیسل کے منصوبے میں جو گھر دکھایا گیا تھا وہ تین ہزار ایک سو مربع فٹ پر مشتمل ایک چھ کونوں والا گھر تھا جس کے ساتھ ایک چھ کونوں والا گیراج بھی منسلک تھا۔

اس گیراج میں تین کاروں اور ایک کشادہ دکان کی گنجائش رکھی گئی تھی۔

اہرامی چھتیں اس طرح کی تھیں کہ وہ سردیوں میں اندر کی حرارت کو محفوظ رکھ سکیں اور گرمیوں میں اسے خارج کر سکیں۔ لیکن اس روٹان نے اپنے کمپیوٹر پر اس میں بہت سی تبدیلیاں کیں لیکن اس نے بنیادی ڈھانچا وہی رکھا ہے۔ اس گھر پر تقریباً تین لاکھ چالیس ہزار امریکی ڈالر خرچ ہوئے، لہٰذا یہ اس علاقے کے مہنگے ترین مکانوں میں شامل ہوتا ہے۔ لیکن دیگر اخراجات جو کیلیفورنیا کے تقریباً اتنی ہی قیمت کے مکانوں کو ٹھنڈا یا گرم رکھنے کے لیے ہوتے ہیں یہ اس کا صرف پندرہ فیصد ہی خرچ کرتا ہے۔

روٹان نے اس گھر میں جو تبدیلیاں کیں ان میں سے ایک تبدیلی یہ تھی کہ دوہری کھڑکیوں کی تعداد کو نصف کر دیا جائے اور ان کو دیوار میں اوپر گہرائی میں لگایا جائے۔ اس تبدیلی کی وجہ یہ تھی کہ وہ خود دن کے وقت گھر میں نہیں ہوتا، تو اتنی ساری کھڑکیاں سورج کی روشنی اور زیادہ حرارت اندر لانے کے لیے بے مقصد تھیں۔ اب جس طرح کھڑکیاں نصب کی گئی ہیں، گرمیوں کے دنوں میں سورج کی حرارت

ان کے راستے اندر نہیں آتی۔ لیکن اس طرح کھڑکیوں کی واضح کمی ہو گئی تھی، جس کو پورا کرنے کے لیے اس نے مختلف آئینوں سے کام لیا۔

اس نے دیواروں پر مختلف جگہوں پر اس طرح آئینے نصب کروائے جس سے کھڑکیوں کی تعداد دگنی لگتی ہے۔ مثال کے طور پر ایک آئینہ Elevated Top کے سامنے نصب ہے، تو اس پر دوہرا اثر ہو گا۔

اس طرح روشنی کو گھر کے مختلف حصوں میں پہنچایا جا سکتا ہے، اس کے علاوہ صحرا کا منظر بھی آئینوں کے ذریعے بیڈ روم تک اس طرح لایا جا سکتا ہے کہ جیسے یہاں کھڑکی ہے۔

یہ گھر ایک جہاز کے ڈیزائنر کی اپنی اور کاروباری ضروریات پوری کرتا ہے۔ اس گھر میں ایک جدید حفاظتی نظام بھی نصب ہے۔ گھر کے مختلف حصوں میں نصب مقامی کمپیوٹروں کا نیٹ ورک بنانے کے لیے خاص وائرنگ بھی کی گئی ہے۔ دو کمروں میں میکنٹوش کمپیوٹر ہیں جن کے ساتھ ایک لیزر پرنٹر بھی منسلک ہے۔ غسل خانے میں ایک ایپل ٹو جو کمپیوٹر نیٹ ورک سے بالکل آزاد ہے۔ یہ مطالعہ کرنے کی بجائے گیم کھیلنے والوں کے لیے ہے۔

گھر میں کیبل ٹی وی کے لیے پیشگی وائرنگ بھی کروائی گئی ہے۔ اگر چہ روٹان کے پاس اپنا ڈش اینٹینا بھی ہے، ایک اضافی تھرمو اسٹیٹ بھی ہے، جو اس وقت کام آئے گا جب گھر کے گرم اور ٹھنڈا کرنے کے نظام کو کمپیوٹر سے منسلک کیا جائے گا۔

علاوہ ازیں کئی ٹیلی فون لائین بھی وائرنگ کے ذریعے پھیلائی گئی ہیں، ٹھوس کھوکھلی چٹان کا منصوبہ ختم کر دیا گیا ہے، کیونکہ یہ توانائی بچانے میں بہت کم کردار ادا کرتی اس کی وجہ یقیناً یہی تھی کہ روٹان ایسے گھر کو یقینی بنانا چاہتا تھا جس میں کم سے کم توانائی خرچ ہو۔

چھت بھی عام چھتوں کی طرح سیمنٹ سے بنائی گئی ہے۔ اس پر بارہ انچ فائبر گلاس انسولیشن اور اس پر پلائی وڈ کی تہہ لگائی گئی ہے۔ اس کے اوپر واٹر پروف ربڑ پلاسٹک کی تہہ چڑھائی گئی ہے، اور سب سے اوپر دو انچ اسٹائرو فوم اور پھر تار پیپر اور پھر سٹکو Stucco کے کئی کوٹ کیے گئے ہیں۔

سٹکو کے پہلے کوٹ میں فائبر گلاس فلامینٹ مضبوطی کے لیے استعمال کیے گئے ہیں، اور آخری کوٹ

سفید کیا گیا ہے تاکہ اگر حرارت منعکس ہو سکے اس چھت کا انسولیشن ریٹ R-55 حاصل ہوتا ہے۔

دیواریں بھی اس طرح ڈیزائن کی گئی ہیں کہ وہ حرارت کے بہاؤ کو روک سکیں۔ اندرونی آرائشی پلاسٹر کے پیچھے آٹھ انچ موٹائی کے کنکریٹ کے بلاکوں کی دیواریں بنائی گئی ہیں۔

تین انچ موٹا یوریتھین نامی فوم اور چار انچ موٹا اسٹار ٹروفوم بھی استعمال کیا گیا ہے۔

دیواروں کے ساتھ ریتیلی زمین کو چھت کے زاویے کے مطابق یعنی تیس ڈگری تک اٹھایا گیا ہے جس کے باعث سورج کی روشنی براہ راست دیواروں پر نہیں پڑتی ہے۔ تقریباً بارہ گھنٹے کے بعد دیوار سے گزر کر گھر کے اندر منتقل ہوتی ہے۔ یعنی رات کے درمیانی حصے میں اور یہ اس وقت ہوتا ہے جب باہر صحرا میں کافی خشکی ہوتی ہے اور رات کی ٹھنڈک دوپہر میں دیواروں کے اندر پہنچتی ہے۔

روٹان کا کہنا ہے کہ اسی طرح سے رات کی ٹھنڈک میں دیواریں کچھ حد تک گرم اور دوپہر کی گرمی میں ٹھنڈی محسوس ہوتی ہیں۔

ایک ایئر کنڈیشنر گھر کو اضافی ٹھنڈک پہنچاتا ہے۔ ایک سنگل راستہ یا نالی پورے گھر میں ہوا کی گردش کے لیے استعمال کی گئی ہے۔ ایک ایگزاسٹ فین گرم ہوا کو باہر خارج کرتا ہے۔ سردیوں میں گرم ہوا گھر کے اندر گردش میں رکھنے کا خاص بندوبست ہے۔

گرم علاقے میں ہونے کے باوجود گھر میں سارا دن موسم خوشگوار رہتا ہے۔

روٹان عام طور پر دن میں اگر ٹھنڈک میں اضافے کے لیے تھرموسٹیٹ کو 83 ڈگری پر کردے تو پھر چند ہی گھنٹوں کے بعد دوبارہ 77 پر کردیتا ہے کیونکہ ٹھنڈک خودبخود اعتدال پر آجاتی ہے، وہ کہتا ہے کہ اس گھر میں 24 گھنٹوں میں درجۂ حرارت میں صرف 1.5 ڈگری فارن ہائیٹ کا فرق آتا ہے، جبکہ اس علاقہ میں بنے دوسرے معیاری گھروں میں یہ تبدیلی 10 ڈگری تک ہوتی ہے۔

گھر کے فرش پر قالین نہیں ہیں، ماسوائے ماسٹر بیڈ روم کے، چھ کونوں پر مشتمل بڑی بڑی ٹائلیں سخت قسم کے کنکریٹ میں نصب کی گئی ہیں، جس کی وجہ سے فرش کا درجہ حرارت 65 ڈگری فارن ہائیٹ سے نہیں بڑھتا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ گھر کی کچھ حرارت فرش کے ذریعے زمین میں جذب ہوتی رہتی ہے، لہٰذا قالین کا استعمال سردیوں میں حرارت کو جذب ہونے سے روکنے میں مددگار ثابت ہو گا۔

سردیوں کے موسم میں ایک چھوٹے سے بجلی کے کوائل ہیٹر کو کچھ دیر چلانے سے بھی گھر کے لیے کافی حرارت مل جائے گی۔ لیکن روٹان کے مطابق بجلی کی لائنوں اور باورچی خانے کی چیزوں کے استعمال سے بھی حرارت حاصل ہوتی ہے۔

لکڑیاں جلانے والی انگیٹھی کی بھی ضرورت نہیں پڑتی۔ انگیٹھی کے قریب واٹر وہیل درجۂ حرارت اور نمی کی مقدار برقرار رکھتا ہے۔ یہ وہیل پانی کے تالابوں کے درمیان اس طرح ڈیزائن کیا گیا ہے کہ ایک تالاب اونچا اور دوسرا نیچا ہے ان دونوں تالابوں میں 300 گیلین پانی آتا ہے۔ یہ درجۂ حرارت کو موسم گرما میں 76 ڈگری فارن ہائیٹ پر مستحکم رکھنے میں اہم کردار ادا کرتا ہے۔

Plexi شیشے سے بنا ہوا یہ وہیل اپنی مرضی سے چلایا اور بند کیا جا سکتا ہے۔

اس کے اندر جب پانی داخل ہوتا ہے، یہ پانی کو اس انداز سے گردش دیتا ہے کہ پانی اس کے مختلف خانوں سے گزرتا ہوا پھوار کی شکل اختیار کرلیتا ہے۔ یہ پھوار گھر میں نمی کو برقرار رکھنے میں مدد دیتی ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ پانی گھر کی حرارت کو جذب کرتا رہتا ہے۔

اس گھر کا زیادہ تر فرنیچر بھی روٹان نے خود ہی ڈیزائن کیا ہے۔ اور کچھ چیزیں اپنے جہاز کے پلانٹ پر ڈیزائن کروائی ہیں، مثلاً کھانے کی میز اور کارنر ٹیبل وغیرہ۔

اس نے ایک دلچسپ اسکرین بھی ڈیزائن کی ہے۔ جس پر پروجیکٹر کی مدد سے ٹی وی دیکھا جا سکتا ہے۔

یہ اسکرین اس کے ماسٹر بیڈ روم کی کھڑکی کے آگے نصب ہے اور اس کی لمبائی آٹھ فٹ ہے۔ اس کی دوسری جانب ایک تصویر لگائی ہوئی ہے، جب ٹی وی نہ دیکھنا ہوتو بٹن دبانے پر ایک موٹر کے ذریعے اسکرین الٹی ہوکر کھڑکی کے نیچے دیوار پر پہنچ جاتی ہے، اور اسکرین کی بجائے دیوار پر تصویر نظر آنے لگتی ہے۔

روٹان کا کہنا ہے کہ یہ گھر میری آخری کوشش ہے اور میں اسے پسند کرتا ہوں۔

چالاک چیتا

اے آر راجپوت

وہ چیتا انتہائی چالاک تھا' ایسے عیار و مکار چیتے کا آدم خور بن جانا کسی شکاری کے لیے چیلنج سے کم نہیں' بہار اور بنگال کے سنگم پر واقع جنگل میں شکار اور شکاری کے درمیان آنکھ مچولی کھیلی جا رہی تھی

شکار کا شوق رکھنے والوں کے لیے

ان دنوں میں بنگال کے شہر بہرم پور میں تعینات تھا۔ بہرم پور کبھی ایک چھوٹا سا گاؤں تھا جو مرشد آباد سے بہت قریب اور دریا کے کنارے ہونے کی وجہ سے انگریزوں کو پسند آگیا۔ نواب سراج الدولہ کو شکست دینے کے بعد انگریزوں نے بہرم پور میں فوجی چھاؤنی بنالی اور آہستہ آہستہ یہ گاؤں شہر میں تبدیل ہو گیا۔ تمام سرکاری دفتر یہیں تھے۔ محکمہ جنگلات کے دفاتر بھی یہیں تھے۔ چیف فاریسٹ آفیسر ہونے کی وجہ سے مجھے شہر کے قلب میں دفتر

کے احاطے میں بنگلا ملا تھا۔ بنگلے کے سامنے بڑا سا لان تھا جہاں بیٹھ کر میں شام کی چائے پیتا تھا۔

اس دن بھی میں دوستوں کے ساتھ بیٹھا تھا کہ مجھے اطلاع ملی کہ ستر میل دور میں بڑھڑوا کے مقام پر ایک چیتا آدم خور بن گیا ہے اور اب تک بیسیوں انسانوں اور مویشیوں کو اپنا نوالہ بنا چکا ہے۔

جن دنوں اس چیتے نے اپنی وارداتوں کا آغاز کیا میں اپنے فرائضِ منصبی میں اس قدر اُلجھا ہوا تھا کہ فی الفور اس پر دھیان نہ دے سکا تھا۔ البتہ اس دوران چند معروف شکاریوں نے اس چیتے کی بیخ کنی کی اپنی سی کوششیں کر ڈالیں مگر ناکامی ان کا مقدر ٹھہری۔

کوئی بھی درندہ آدم خور بن جانے کے بعد زیادہ دیر زندہ نہیں رہ پاتا اور جلد یا بدیر حضرت انسان کا شکار ہو جاتا ہے۔ مگر مذکورہ چیتے نے محاورتاً نہیں بلکہ حقیقتاً، شکاریوں کو ناکوں چنے چبوا دیا تھا۔

بڑھڑوا بہار اور بنگال کے سنگم پر واقع ہے۔ کیول جنکشن سے صاحب گنج لوپ لائن ہے۔ اسی لائن پر بھاگلپور اور صاحب گنج ہے۔ صاحب گنج سے کلکتہ جانے والی لائن بڑھڑوا چھوٹا سا قصبہ ہے جو جنگل اور پہاڑوں میں گھرا ہوا ہے۔ وہاں سے آنے والی آدم خور کی وارداتوں کی خبریں سن سن کر میں تنگ آ گیا۔ بالآخر میں نے محکمے کو طویل المیعاد چھٹی کی درخواست دی اور چیتے کی تلاش میں نکل کھڑا ہوا۔

اگرچہ میں اپنی شکاری زندگی میں کئی مردم آزار درندوں کو موت سے ہمکنار کر چکا تھا، مگر یہ تسلیم کرنے میں مجھے کوئی عار نہیں کہ بڑھڑوا کے علاقے سے اپنی وارداتوں کا آغاز کرنے والا یہ چیتا کسی اور ہی مٹی کا بنا ہوا تھا۔ اس نے جس انداز میں اپنا بچاؤ کیا اور انسانوں کو ہلاک کرنے کے ساتھ ساتھ میرے تعاقب میں بھی لگا رہا، اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اس کی حسیات عام چیتوں کے مقابلے میں کچھ زیادہ ہی تیز تھیں۔

عام چیتے کی فطرت ہے کہ وہ کسی منصوبے کے تحت انسانوں یا جانوروں پر حملہ نہیں کرتا مگر وہ چیتا اپنے شکار پر حملہ کرنے سے قبل نہ صرف باقاعدہ منصوبے باندھتا بلکہ آنے والے واقعات کا اندازہ کر کے اپنی حفاظت کا بندوبست بھی کر لیتا۔ یہی وجہ تھی کہ وہ چالاک آدم خور درندہ اب تک شکاریوں سے محفوظ چلا آ رہا تھا۔

میں اکثر یہ سوچ کر حیران ہو جاتا کہ اس میں یہ نادر حس آخر کیوں کر بیدار ہوئی؟

بہر طور جیسے ہی میں نے اپنے مخصوص انداز میں اس کی تلاش کا آغاز کیا تو ایسے ایسے انکشاف ہوئے کہ میں انگشت بدنداں رہ گیا۔

مجھے یقین ہے کہ میری شکاری زندگی کا یہ باب پڑھنے کے بعد آپ بھی حیران ہوئے بغیر نہیں رہیں گے۔

میں نے سب سے پہلے ان تمام مقامات کا دورہ کیا، جہاں آدم خور گھومتا پھرتا دیکھا گیا تھا۔ میرا خیال تھا کہ کہیں نہ کہیں ہمارا آمنا سامنا ہو جائے گا مگر ایسا نہ ہو سکا۔

آس پاس کی بستیوں اور چند شکاریوں سے ملنے والی معلومات سے پتا چلا کہ چیتا دن کے وقت عموماً مغرب کی جانب کوئی پندرہ میل دور ایک ویران بستی میں آرام کرتا ہے۔ اس بستی میں پندرہ بیس گھر اور چند جھونپڑے تھے۔ چیتے نے ساٹھ ستر نفوس پر مشتمل اس بستی کے بیشتر مکینوں کو اپنا لقمہ بنا ڈالا تھا۔ بقیہ اپنی جانیں بچا کر دوسری بستیوں کا رخ کرنے پر مجبور ہو گئے تھے۔ اب تک تین کھاگ شکاری چیتے کی تلاش میں اس بستی کا رخ کر چکے تھے مگر ان میں سے ایک بھی واپس نہیں لوٹا۔

ہم اپنی مہم کے دوسرے روز ہم ڈھل پران نامی بستی پہنچ گئے جو چیتے کی آماجگاہ سے دس میل دور واقع تھی۔ یہ ایک بڑی بستی تھی۔ اس میں گرد و نواح کی کئی چھوٹی بستیوں کے بھاگے ہوئے... مکین بھی پناہ لے چکے تھے۔ ہر خاندان کا کوئی نہ کوئی فرد اس آدم خور کا نوالہ بن چکا تھا۔ ان میں سب سے اہم اس زمیندار کا بیان تھا، جس کے ملازم لڑکے کو آدم خور چار دن پہلے مویشیوں کے باڑے سے اُٹھا لے گیا تھا۔

زمیندار نے بتایا کہ اس نے اٹھارہ سالہ ایک یتیم لڑکا مویشیوں کی دیکھ بھال کے لیے رکھا ہوا تھا۔ وہ چونکہ ہندوؤں کی کم تر ذات سے تعلق رکھتا تھا، اسی لیے زمیندار کے گھر اس کا آنا جانا ممنوع تھا۔ اس کی رہائش مویشیوں کے باڑے میں ہی تھی، جہاں وہ ایک کونے میں چارپائی پر رات بسر کر لیتا۔

عام حالات میں باڑے کا دروازہ باہر سے زنجیر چڑھا کر بند کر دیا جاتا، مگر جب سے چیتا علاقے میں وارد ہوا تھا۔ زمیندار حفاظت کے پیشِ نظر کنڈی میں لکڑی پھنسا دیتا۔ لڑکا اندر سے خاصا وزنی پتھر دروازے کے ساتھ رکھ کر کھلنے کے امکانات کو ختم کر دیتا۔

ان تمام احتیاطی تدابیر کے باوجود چیتا اپنی

"واردات" اس صفائی سے کر گیا کہ گاؤں کے توہم پرست مکین پورے وثوق سے کہنے لگے کہ آدم خور درحقیقت ایک بھوت ہے، جو بند دروازے کھول کر گھروں میں گھسنے کی صلاحیت بھی رکھتا ہے۔

بعدازاں میں نے باڑے کا معائنہ کیا تو دروازے اور چوکھٹ پر درندے کے پنجوں کے نشانات نمایاں نظر آئے۔ میں نے اندازہ لگایا کہ کنڈی میں پھنسا لکڑی کا ٹکڑا چیتے کی جدوجہد کے دوران نکل گیا۔ جس کے بعد اس کے لیے زنجیر گرا کر دروازہ کھولنا مشکل نہ رہا۔

مویشیوں کا کمرا اندر سے دیکھنے کے بعد ہم دونوں حیرت زدہ ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ کمرا اتنا بڑا نہیں تھا کہ مویشیوں کے درمیان چیتے کو آزادانہ گھومنے پھرنے کی جگہ مل پاتی۔ لڑکے تک پہنچنے کے لیے اس نے درمیانی فاصلہ یقیناً مویشیوں کی ٹانگوں کے نیچے سے رینگ کر طے کیا ہوگا۔ اس دوران مویشی ڈکرائے ضرور ہوں گے۔ مگر لڑکے نے توجہ اسی لیے نہیں دی کہ مویشی یوں بھی رات بھر ڈکراتے رہتے ہیں۔ وہ یقیناً اس امر کا عادی ہو چکا تھا۔

بہرطور اس بات پر ہم دونوں حیرت زدہ تھے کہ دروازہ کھولنے کی جدوجہد کے دوران لڑکا بدستور نیند میں... کیوں کر مگن رہا؟ اگرچہ بظاہر یہ بات بھی ناقابلِ یقین لگتی ہے مگر میں اپنی آنکھوں سے دیکھ چکا تھا کہ گیارہ گائے بھینسوں میں سے کسی کو چیتے کے پنجوں سے خراش تک نہیں آئی تھی۔

وہ زمیندار ہمیں اپنے گھر لے گیا جہاں اس نے ہماری خاطر تواضع کی۔ اس کا تعلق برہمن ذات سے تھا۔ اس نے ہمارے رہنے کا بھی انتظام کر دیا۔ ہمارا ارادہ اگلی صبح آدم خور کی تلاش میں نکلنے کا تھا۔ میرا ذاتی خیال تھا کہ جس بستی کو چیتے نے ٹھکانا بنا رکھا ہے وہاں ہماری کامیابی کے امکانات زیادہ ہیں۔

اس بستی کو ایک طرف سے تو ندی تو دوسری طرف سے جنگل نے گھیر رکھا تھا۔ شمال میں وہ بستی تھی جہاں ہم مقیم تھے۔ جنوب میں جنگل سے ذرا ہٹ کر ایک چھوٹی سی جاگیر تھی، نام پیر پینتی تھا۔

کہتے ہیں کہ برسوں قبل اس علاقے میں ایک برگزیدہ ہستی نے آکر اسلام کی تبلیغ کی تھی۔ انہی کی تبلیغ نے آدی واسی یعنی جنگلیوں کو اسلام قبول کرنے پر راغب کیا۔ انہی کا مزار اس علاقے میں ہے اسی وجہ سے اس گاؤں کا نام پیر پائنتی پڑ گیا۔

اگلی صبح میرے ساتھی نے تجویز پیش کی کہ آدم خور والی بستی کا معائنہ کرنے سے قبل، جنگل کا ایک چکر لگا لیا جائے۔ میں نے اس کی رائے سے اتفاق کیا اور ہم ضروری سازوسامان سے لیس ہو کر جنگل کی طرف روانہ ہو گئے۔

جنگل کافی گھنا تھا، اور اس میں تناور برگد، پیپل، مہوہ اور املی کے درخت جابجا نظر آئے۔ اس روز ہمارا ارادہ صرف علاقے کا جائزہ لینا تھا۔ یوں بھی مجھے آدم خور سے مڈبھیڑ کی کوئی اُمید نہ تھی۔ میں آدم خور درندوں کی فطرت سے بہ خوبی واقف ہوں۔ کسی مخصوص علاقے میں، اوپر تلے وارداتیں کرنا، آدم خور کی خصلت کے خلاف ہے۔ پھر ہمارا پالا تو ایسے درندے سے پڑا تھا جو اپنی عیاری اور مکاری کے واضح ثبوت فراہم کر چکا تھا۔

ہماری نظریں اطراف کا بہ غور جائزہ لے رہی تھیں۔ جنگل کے قریب پہنچ کر ہم مزید محتاط ہو گئے۔ ہماری رفتار قدرے سست ہو گئی۔ راستہ ہر آن خطرناک اور دشوار ہوتا جارہا تھا۔ بے پناہ نشیب و فراز تھے پھر جابجا خاردار جھاڑیاں راہ میں حائل ہو کر مزید مشکلات پیدا کر رہی تھیں۔ ایک میل کا فاصلہ طے کرنے کے بعد ہم ایک پگڈنڈی نما راستے تک پہنچ کر رُک گئے۔

وہ راستہ جنگل کے وسط سے شرقاً غرباً گزرتا تھا۔

میں نے اس مقام پر زمین کا جائزہ لیا تو ایک نر چیتے کے نقوشِ پا بکثرت نظر آئے۔

نشانات دیکھ کر میں نے اندازہ لگایا کہ چیتا یہ راستہ باقاعدہ طور پر استعمال کرتا ہے۔

راجو نے مجھ سے اتفاق کیا۔ ہم نے باڑے کے آس پاس جو نشان دیکھے تھے، وہ ان نقوش سے گہری مماثلت رکھتے تھے۔ اب میری ڈھارس بندھی اور مجھے یقین ہو گیا کہ وہ راستہ آدم خور ہی کے زیرِ استعمال تھا۔

"اگر اس مقام پر گھات لگائی جائے تو باآسانی آدم خور کو جہنم واصل کیا جاسکتا ہے۔" راجو نے رائے دی۔

"لیکن میرا خیال ہے کہ ایسا کوئی قدم اُٹھانے سے قبل ہمیں وہ بستی بھی ایک نظر دیکھ لینی چاہیے جس کے بارے میں مشہور ہے کہ وہاں اُس چیتے نے اپنا ٹھکانا بنا رکھا ہے۔" میں نے دھیرے سے کہا۔ "مجھے یقین ہے یہ نقوشِ پا اسی بستی تک جارہے ہیں۔"

میرا اندازہ دُرست تھا۔ ایک گھنٹے بعد ہم ان کا تعاقب کرتے ہوئے اس بستی کی حدود میں داخل ہو

گئے۔ دور سے دیکھنے پر ہی وہ ویران معلوم ہوتی تھی۔ گھاس پھونس سے بنی تمیں چالیس جھونپڑیوں کے بارے میں ہمیں بتایا گیا تھا کہ چیتے کی آمد سے قبل وہاں لکڑ ہاروں کی رہائش تھی۔ آدم خور نے اپنی وارداتوں کا آغاز بھی اسی بستی سے کیا تھا۔ گھاس پھونس کی دیواریں توڑ کر شکار کرنے میں اسے یقیناً کوئی دقت نہ ہوئی ہوگی۔ تین چار وارداتوں کے بعد لکڑ ہاروں نے وہ مقام غیر محفوظ تصور کرتے ہوئے چھوڑ دیا۔ اُدھر چیتے کو اس بستی کی شکل میں ایک محفوظ ٹھکانہ مل گیا۔

جیسے جیسے ہم آگے بڑھے بستی کی ویرانی ہمارے دل و دماغ پر مسلط ہونے لگی۔ کبھی کبھی تو یوں لگتا جیسے وہ آدم خور اس بستی میں ہمارے ساتھ موجود ہے۔

وسط میں پہنچ کر ہم رک گئے۔ وہاں دو انسانی پنجر اس حال میں پڑے ہوئے تھے کہ ایک نظر ڈالتے ہی دل کانپ گیا۔ لباس کے چیتھڑوں سے ہم نے اندازہ لگایا کہ وہ دونوں آدم خور کا لقمہ بننے والے بدنصیب شکاری تھے۔

''آدم خور یقیناً بستی اور جنگل کے درمیان آزادانہ گھومتا پھرتا ہے۔'' میں نے محتاط نگاہیں چار سو پھیرتے۔۔۔ ہوئے کہا۔

''اس کا مطلب ہے صاحب! ہمیں ان دونوں مقامات کی نگرانی کرنی ہوگی۔'' افضل نے تائیدی انداز میں سر ہلا کر تجویز دی۔

''اس کے سواء کوئی چارہ نہیں۔'' میں نے جواب دیا۔

''ہمارا پالا نہایت ہی مکار درندے سے پڑا ہے۔ اگر ہم اکٹھے رہے تو بعید نہیں کہ ہماری توجہ آدم خور سے زیادہ ایک دوسرے پر مرکوز رہے اور ہم اسے شکار کرنے کی بجائے خود شکار ہو جائیں۔ لہٰذا میں بستی میں رُکتا ہوں۔'' میں نے فیصلہ کن انداز میں جواب دیا۔ ''تم جنگل میں نگرانی کرو اور زمین کی بہ نسبت تم کسی مضبوط درخت کی بلندی پر محفوظ بھی رہو گے۔''

افضل نے سر کو اثبات میں جنبش دی اور اپنا ساز و سامان سنبھال کر اس پگڈنڈی پر ہولیا جو جنگل کی طرف جاتی تھی۔

افضل کو روانہ کرنے کے بعد میں نے ایسی جھونپڑی کا انتخاب کیا جو بستی کے وسط میں واقع اور نسبتاً مضبوط تھی۔ اس کی تعمیر میں گھاس پھونس کے ساتھ ساتھ لکڑی کے تختے بھی استعمال کیے گئے تھے۔ جھونپڑی کا محل وقوع کچھ ایسا تھا کہ اگر کوئی اس کی طرف بڑھتا تو میں فوراً اُسے نشانے پر لے سکتا تھا۔ پھر میں نے جس کمرے کو مسکن بنایا اس کی دیواروں پر بنی درزوں سے میں باہر کا منظر بھی بہ خوبی دیکھ سکتا تھا۔

جھونپڑی کا دروازہ اندر سے بند کر کے میں کمرے میں نہیں بیٹھا بلکہ وقفوں وقفوں سے کھانس کر اور کبھی سیٹی بجا کر اپنی وہاں موجودگی کا احساس دلاتا رہا۔ جھونپڑی کے باہر چوہے اور گیدڑ حرکت کر رہے تھے۔ تین گھنٹے بعد چاند کی روشنی اس حد تک پھیل گئی کہ درزوں میں سے چاندنی چھن چھن کر اندر آنے لگی۔ مجھے یقین تھا کہ اگر چیتا کہیں آس پاس موجود ہوا تو میری بُو پا کر جھونپڑے کا رخ ضرور کرے گا۔ مزید تین گھنٹے یوں ہی گزر گئے مگر چیتے کی آمد کے آثار پیدا نہیں ہوئے۔

میں نے درزوں میں سے باہر جھانکا۔ چاند کی روشنی اس حد تک پھیل چکی تھی کہ چالیس پچاس فٹ دور پھیلی جھاڑیاں ۔۔۔ اور دوسرے جھونپڑے صاف نظر آرہے تھے۔ وقت چیونٹی ۔۔۔ کی رفتار سے رینگ رہا تھا۔ آخر میں اس خود ساختہ قید سے اُکتا گیا۔ جی میں آیا کہ دروازہ کھول کے باہر نکل جاؤں۔

ابھی میں یہ سوچ ہی رہا تھا کہ دور سے بندروں کے خو خیانے کی آوازیں سنائی دیں۔

تھوڑی دیر بعد ہی بستی کے باہر گیدڑ زور زور سے چلانے ۔۔۔ لگے۔ میں رائفل ہاتھ میں تھامے بے اختیار اُٹھ کھڑا ہوا۔ ۔۔۔ بندر اور گیدڑ مسلسل خو خیا اور چلا رہے تھے اور خبر دار کر رہے تھے کہ ''ہوشیار! دُشمن آرہا ہے۔''

میں کمرے سے نکلا تھا۔ جھونپڑی کے چھوٹے صحن کے وسط میں جا کھڑا ہوا اور لگا زور زور سے کھانسنے۔

جھونپڑی کی جس دیوار میں دروازہ نصب تھا، وہ تختوں سے بنائی گئی تھی اور میرا رُخ اسی جانب تھا۔ جانے کیوں مجھے یقین تھا کہ چیتا اسی طرف سے حملہ آور ہوگا۔ دفعتاً فضاء میں سکوت طاری ہو گیا۔ میں اپنی جگہ اب پتھر کے بُت کی طرح کھڑا تھا کہ اچانک درندے نے جھونپڑی کے دروازے کو زور سے ٹکر ماری اور پوری جھونپڑی جیسے لرز گئی۔ دہشت سے میرا بدن پتھر ہو گیا۔ پُر شور آواز کے ساتھ دونوں پٹ وا ہوئے اور چیتا عین میرے سامنے آن کودا۔

میں نے زندگی میں بیسیوں درندے شکار کیے ہیں مگر میں دعوے سے کہہ سکتا تھا کہ اس سے زیادہ قد آور درندہ میں

نے آج تک نہیں دیکھا۔

اگلے ہی لمحے اضطراری طور پر لبلبی دبا دی۔ دھما کا ہوا اور چیتا وہاں موجود ہی نہیں تھا۔ میں نے فوراً باہر نکل کر ادھر اُدھر دیکھا، مگر چیتے کا کہیں نام ونشان ہی نہ تھا۔

یہ میری خوش قسمتی ہی تھی کہ میں اس وقت زندہ سلامت اپنی جگہ کھڑا تھا۔ ورنہ میری بے خودی سے فائدہ اُٹھا کر درندہ میری تکا بوٹی بھی کر سکتا تھا۔

مجھ سے قبل آنے والے بدقسمت شکاریوں کے ساتھ اسی قسم کا حادثہ رونما ہوا ہوگا۔

میرے زندہ بچ جانے کی ایک ہی توجیہ پیش کی جا سکتی ہے اور وہ یہ کہ ابھی میری زندگی کے دن باقی تھے۔ بہر حال ایک خطرناک درندہ میرے ہاتھ سے نکل چکا تھا۔ میں نے جھونپڑے کی کنڈی چڑھا کر پائپ سلگایا، اور برآمدے میں بیٹھ گیا۔

میرا ذہن بھول بھلیوں میں بھٹک رہا تھا کہ صبح ہو گئی۔ اُجالا پھیلتے ہی افضل بھی مجھے ڈھونڈتے ہوئے وہاں آ گیا۔ ساری رات آنکھوں میں کاٹ دینے کے باوجود اس کا چیتے سے آمنا سامنا نہیں ہوا تھا۔ جب اسے میرے ساتھ پیش آنے والے واقعے کا علم ہوا تو وہ بھی ہراساں نظر آنے لگا۔

''آپ کی قسمت اچھی ہے صاحب! کہ زندہ بچ گئے۔''

وہ خوف زدہ لہجے میں گویا ہوا۔

''ہاں!'' میں نے ایک ہمکاری خارج کر کے جواب دیا۔ ''مگر افسوس کہ اس آدم خور چیتے کی قسمت مجھ سے بھی زیادہ اچھی ہے، میں نے اسے مارنے کا سنہرا موقع کھو دیا۔ خدا جانے اب وہ دوبارہ ہاتھ آئے گا بھی یا نہیں؟'' میں نے حسرت بھرے لہجے میں جواب دیا۔

ہم دل برداشتہ واپس گاؤں پہنچ گئے مگر ہم نے اپنی ناکامی کی خبر گاؤں والوں کو نہیں سنائی، ورنہ وہ مزید خوف زدہ ہو جاتے۔ ہم ناشتا کرنے کے بعد رت جگے کے باعث کسل مندی کا شکار ہو گئے۔ زمیندار کے مشورے پر ہم نے نیند پوری کرنا مناسب جانا۔

اگر دوپہر کے وقت شور وغل سے میری آنکھ نہ کھلتی تو خدا معلوم میں کب تک یونہی پڑا سویا رہتا۔ شور سن کر افضل بھی جاگ گیا تھا۔ ہم نے باہر نکل کر دیکھا تو لوگوں کا جم غفیر جمع تھا۔ پتا چلا کہ چیتا ابھی ابھی ایک بچے کو اُٹھا کر لے گیا ہے مگر کسی کو خبر نہیں تھی کہ وہ کس طرف گیا ہے؟

ہم دونوں فوراً جائے وقوع پر پہنچے، جہاں بچے کے والدین گریہ وزاری کر رہے تھے۔ مکان کے باہر ہم نے نشانات کا کھوج لگانا چاہا، مگر کوئی ایسا نشان نہ ملا جس سے معلوم ہوتا کہ درندہ شکار لے کر کس سمت گیا ہے۔ دراصل وقوعہ کے بعد وہاں کئی لوگ جمع ہو گئے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ ان کے قدموں سے چیتے کے نقوش مٹ گئے۔

میں نے لوگوں کو تاکید کی کہ ہمارے علاوہ کوئی گاؤں کی حدود سے باہر نہ جائے اور پھر میں راجو کو ساتھ لے کر گاؤں کے گرد چکر لگانے لگا کہ شاید کہیں نشانات کا سراغ مل جائے۔

ہم گھومتے ہوئے گاؤں کے مغربی حصے پہنچے تو زمین پر گھسیٹے جانے کے واضح نشان نظر آ گئے۔ مگر کچھ دور چل کر وہ نشانات غائب ہو گئے اور چیتے کے نقوش پارہ گئے۔ اسی لمحے میری چھٹی حس چیخ چیخ کر نادیدہ خطرے کا اعلان کرنے لگی۔ میں نے افضل سے پیٹھ جوڑ کر چاروں طرف نظریں دوڑائیں مگر وہاں کوئی ایسی جگہ نہیں تھی جہاں آدم خور چھپ سکتا ہو۔ معاً میرا دھیان اس درخت کی طرف گیا۔

اب جو میں نے نظریں اُٹھائیں تو میری نگاہیں درخت کے اس حصے پر جم کر رہ گئیں، جہاں شاخوں میں سے بچے کا ایک خون آلود ہاتھ جھانک رہا تھا۔ درخت بلندی پر جا کر خاصا پھیل گیا تھا اور وہاں کئی ایسی شاخیں تھیں جن پر چیتا بآسانی خود کو پتوں میں چھپا سکتا تھا۔

میں نے راجو کو خاموشی کا اشارہ کیا اور ہم دونوں اُلٹے پیروں درخت سے دور ہوتے چلے گئے۔ ہماری نگاہیں اور رائفلوں کے دہانے درخت پر مرکوز تھے۔

دس قدم دور ہو کر ہم رک گئے۔ درخت کے آس پاس زمین پر نگاہیں دوڑانے کے بعد میرے ذہن میں خطرے کی گھنٹیاں بج اُٹھیں۔

''جناب! چیتا اسی درخت پر چھپا بیٹھا ہے۔'' معاً افضل نے میرے کان میں سرسراتی سرگوشی کی، مگر میں کچھ اور ہی سوچ رہا تھا۔

''نہیں افضل!'' میں نے سر کو نفی میں جنبش دیتے ہوئے کہا۔ ''اگر یہ عام آدم خور ہوتا تو شاید تمہاری بات درست ہوتی مگر یہاں معاملہ دوسرا ہے۔ ہمارا پالا ایک چالاک اور شاطر درندے سے پڑا ہے۔''

افضل کبھی مجھے اور کبھی اس درخت کو دیکھتا جس پر سے میں نے اپنی رائفل کا دہانہ ہٹا لیا تھا۔

''آپ کا مطلب ہے کہ چیتا درخت پر موجود نہیں

ہے۔۔'' وہ متوحش انداز میں بولا۔
''اس نے ہمیں دھوکا دینے کے لیے لاش درخت پر چھپائی ہے، مگر یہ ثابت کیسے ہوگا۔؟''
''ایسے۔'' میں نے درخت کے دامن میں نظر آنے والے پنجوں کے نشانات کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔
اب افضل بھی اس طرف متوجہ ہوگیا۔ پنجوں کے نشانات جنگل کی طرف جارہے تھے۔
افضل کے منہ سے ایک طویل سانس خارج ہوگئی۔
''وہ ہمیں غچہ دینا چاہتا ہے۔'' میں نے کہا۔ ''تاکہ ہم اس امر کا انتظار کریں کہ وہ کب اپنا شکار کھانے واپس آئے۔ اور اس دوران وہ یہاں سے دور نکل جائے۔ لیکن میں ایسا نہیں ہونے دوں گا۔'' یہ کہہ کر میں نے اسے اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کیا۔ اور جنگل کی سمت بڑھ گیا۔
چیتا ذرا گھوم کر مشرق کی طرف سے جنگل میں داخل ہوا تھا۔ جنگل نے پوری رعنائی، دہشت اور پُرشور آوازوں کے ساتھ ہمارا استقبال کیا۔ درخت ہوا کے جھونکوں سے ہل رہے تھے اور چاروں طرف عجیب بھیانک آوازیں گونج رہی تھیں۔ ہم دونوں خاموش اور یوں چل رہے تھے کہ نہ قدموں کی آہٹ بلند ہو اور نہ خشک پتوں کے پیروں تلے روندے جانے کی چرچراہٹ اُبھرے۔
آدم خور کے شکار میں کامیابی اور حفاظت کا بہترین طریقہ یہی ہے کہ شکاری مکمل خاموشی سے پیش قدمی کرے۔
میری نظریں اطراف کا بہ غور جائزہ لے رہی تھیں۔ رفتہ رفتہ جنگل گھنا ہوتا گیا۔ زمین پر پھیلے خشک پتوں اور دوسرے جانداروں کے نقشِ پا کے درمیان چیتے کے نقشِ پا نظروں سے اوجھل ہوگئے۔ قریب ہی درختوں پر سرخ منہ والے بندروں کا غول چیخ رہا تھا۔ کچھ خرانٹ قسم کے بندر ہماری طرف متوجہ بھی ہوئے، لیکن اگلے لمحے ہم آگے بڑھ گئے۔
ابھی ہم نے جنگل کے اندر نصف فاصلہ ہی طے کیا تھا کہ پیچھے جھاڑیوں میں سرسراہٹ سن کر ہمارے قدم جہاں تھے وہیں منجمد ہوگئے۔
ہم نے پلٹ کر اس طرف دیکھا، جہاں آواز سنائی دی تھی۔ مگر ہمارے رُکتے ہی وہ آواز بھی بند ہوگئی۔ معاً بائیں طرف ایک درخت پر بیٹھے پرندے زور سے چیخے اور فضاء میں پرواز کر گئے۔ خطرے کا احساس ہوتے ہی میرے اندر کا شکاری چوکنا ہوگیا۔
ہم دونوں ایک دوسرے سے پیٹھ جوڑے، جنگل کے تاریک گوشوں کو گھور گھور کے دیکھنے لگے۔ مجھے ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے کہیں کسی گوشے میں چھپا بیٹھا کوئی ہماری حرکات و سکنات کا بغور جائزہ لے رہا ہے۔
میں نے افضل کو مخصوص انداز میں ٹھوکا دیا اور رائفل کے ٹریگر پر ہاتھ رکھے آگے بڑھا۔ بار ہا مجھے اپنے پیچھے کسی۔۔۔ جانور کے قدموں کی چاپ محسوس ہوئی، لیکن یہ فیصلہ کرنا میرے لیے مشکل ہوگیا کہ وہ کسی کھر دار جانور کی قدموں تلے روندے جانے والے پتوں کی آواز تھی یا گدی دار پیر والے چیتے کی۔ میں نے چند قدم پیچھے ہٹ کر رائفل کا دہانہ اسی طرف گھما دیا۔
اچانک ہمارے سامنے قدِ آدم درختوں سے پیچھے کوئی جانور کودا۔ اس سے قبل کہ ہم اس کا نشانہ لیتے، وہ اُونچی گھاس۔۔۔ میں کہیں گم ہوگیا۔ میں اسے دیکھتے ہی پہچان گیا۔
یہ وہی چالاک چیتا تھا جو ہمارے ساتھ ساتھ جھاڑیوں میں چھپتا چھپاتا چل رہا تھا۔
درندوں میں چیتا سب سے زیادہ مکار اور ہوشیار۔۔۔ جانور ہے۔ وہ شیر کی طرح نہ تو گرج کر حملہ کرتا ہے اور نہ ہی دوسرے درندوں کی طرح اپنی موجودگی کا احساس دلاتا ہے۔ وہ بلی کی طرح دبے قدموں شکار کا تعاقب کرتا موقع ملتے ہی اسے دبوچ لیتا ہے۔
معاً ہمارے سامنے قدِ آدم گھاس میں جنبش ہوئی اور مجھے چیتے کی دم کا بالائی حصہ نظر آیا جو سانپ کے پھن کی طرح دھیرے دھیرے لہرا رہا تھا۔ اگر دم نظر نہ آتی، تو میں کبھی یہ اندازہ نہیں لگا پاتا کہ وہ کہاں چھپا ہوا ہے۔
میں نے آنکھوں ہی آنکھوں میں افضل کو ساکت رہنے کا اشارہ کیا، آہستہ، بہت آہستہ سے رائفل اُوپر اُٹھائی اور پھر ہاتھوں کی ہلکی اور نرم جنبش سے اس مقام کا نشانہ لیا جہاں میرے اندازے کے مطابق چیتے کا دھڑ تھا۔
ابھی میری اُنگلیاں بہ مشکل لبلبی تک پہنچی تھیں کہ چیتے نے یکلخت سر اُٹھا کر مجھے دیکھا اور پھر ایک چنگھاڑ کے ساتھ میری جانب چھلانگ لگا دی۔ اس کے اور میرے درمیان ابھی چند گز کا فاصلہ تھا کہ میرے فائر کی آواز گونجی اور دوسرے ہی لمحے چیتا اپنی پوری طاقت اور وزن کے ساتھ میرے اُوپر گرا۔ یہ سب اتنی تیزی سے ہوا کہ میں کچھ سمجھ نہ سکا اور رائفل ہاتھوں سے چھوٹ گئی۔
چیتے کا ایک پنجہ زور سے میرے کاندھوں پر لگا اور میں لڑھکتا ہو گھاس میں جا گرا۔ چیتے نے چھلانگ لگائی اور غرا کر

میرے کاندھے میں دانت گاڑھ دیے۔ وہ لمحہ میں زندگی بھر فراموش نہیں کرسکتا۔ حد درجہ تکلیف کے ساتھ ہی موت کے احساس نے پل بھر کے لیے میرے اعصاب جکڑ لیے۔

میں اچھی طرح جانتا تھا کہ ایسے موقع پر افضل کبھی گولی نہیں چلائے گا۔ اب جو بھی کرنا ہے مجھے ہی کرنا تھا۔ گھٹنوں کے بل اُٹھنے کی کوشش کرتے ہوئے میں نے اپنے ... شکاری خنجر کے دستے پر ہاتھ جمایا اور اسے میان سے باہر نکالنے کی کوشش کرنے لگا۔ اسی لمحے چیتے نے غرا کر میرا کندھا چھوڑا، تو ایک جھٹکے کے ساتھ خنجر میرے ہاتھ میں آگیا۔ اس دوران چیتے کی تیز سانسیں مجھے اپنی گردن اور کان پر محسوس ہورہی تھیں۔ میں نے دیکھے بغیر خنجر اپنے پیچھے کھڑے چیتے کے جسم میں پیوست کردیا۔ چیتا خون آشام غراہٹ کے ساتھ تلملایا اور میری پیٹھ سے اُتر کر ایک طرف بھاگ گیا۔

راجو شاید اسی لمحے کا منتظر تھا۔ اس نے آن واحد میں کئی گولیاں فرار ہوتے چیتے پر داغ دیں مگر وہ پلک جھپکتے میں غائب ہوگیا تھا۔

افضل نے فوراً آگے بڑھ کر مجھے اُٹھایا۔ میرے زخمی کندھے سے اُبلتا خون سارے جسم کو تر کررہا تھا۔ اس نے مجھے کندھے پر اُٹھایا اور جنگل سے باہر دوڑ لگا دی۔ اس دوران میں درد کی شدت سے بے ہوش ہوگیا۔

جب مجھے ہوش آیا تو میں زمیندار کی حویلی کے صحن میں ایک چارپائی پر پڑا تھا۔ میری قمیص اتار کر زخموں کی مرہم پٹی شاید افضل نے خود کی تھی، کیونکہ وہ ادویہ کا بکس اٹھائے میرے سرہانے ہی کھڑا تھا۔ صحن میں گاؤں والوں کا ہجوم تھا۔ سب میری طرف پُرتشویش نظروں سے دیکھ رہے تھے۔

اس موذی نے مجھے اس قدر پریشان کردیا تھا کہ اس کا ہیولہ ذہن میں آتے ہی اپنے زخم کی تکلیف فراموش کرکے میں افضل کی مدد سے اُٹھ کر بیٹھ گیا۔ اب میں ہر قیمت پر اس چیتے کو موت کے گھاٹ اُتارنا چاہتا تھا۔ میں نے گاؤں والوں کو اکٹھا کیا اور ان سے کہا کہ وہ میرے ہمراہ اس زخمی چیتے کو تلاش کریں۔ کہیں نہ کہیں ضرور اس کا سراغ مل جائے گا۔ دراصل زخمی حالت میں اس کے فرار کے بعد میں خاصا پُراُمید ہوگیا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ وہ چند روز تک اپنے زخم چاٹے گا، اور اس جنگل سے نکل کر کہیں نہیں جائے گا۔

میری گردن، گھٹنے اور انگلیوں پر بھی گہری خراشیں آئی تھیں۔ ایک ہفتہ شدید تکلیف کے عالم میں بسر ہوا۔ اس دوران افضل کے علاوہ قریبی قصبے سے ایک ناتجربہ کار ڈاکٹر

منا (منیٰ)

مکہ معظمہ اور عرفات کے درمیان وہ مقام جہاں حج کے بعد قربانی دی جاتی ہے اور رمی جمرہ کی جاتی ہے۔ یہ مقام مکہ سے عرفات جانے والی سڑک پر مکہ کی مشرقی پہاڑیوں میں واقع ہے جو مکہ سے پانچ میل کے فاصلے پر ایک تنگ وادی میں ہے۔ یہی جگہ عقبہ بھی کہلاتی ہے۔ قصبے میں پتھر کے مکانات ہیں اور ہر طرف کنکریاں بکھری ہوئی ہیں۔ اسی جگہ تین جمرے ہیں جن پر حاجی کنکریاں مارتے ہیں۔ اسی مقام پر مسجد الخیف ہے جسے سلطان صلاح الدین ایوبی نے بنوایا تھا۔ تمام سال تو یہ جگہ سنسان پڑی رہتی ہے لیکن حج کے زمانے میں یہاں کی رونق اور مجمع دیکھنے سے تعلق رکھتا ہے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے زمانے سے یہ جگہ مقدس سمجھی جاتی ہے۔ حج کے موقع پر 8 ذی الحجہ کو ظہر کی نماز یہیں ہوتی ہے اور اگلی صبح تک یہیں قیام رہتا ہے۔ یہاں سے حاجی عرفات کو جاتے ہیں۔ وہاں سے فارغ ہوکر پھر منیٰ کو لوٹتے ہیں۔ یہیں قربانی کی جاتی ہے۔ بال ترشوائے جاتے ہیں۔ آخر میں طواف کعبہ کے بعد تین روز پھر یہاں قیام رہتا ہے اور گویا حج اس مقام پر اختتام پذیر ہوتا ہے۔ گو ابھی ایک اور طواف باقی رہتا ہے جسے طواف وداع کہا جاتا ہے اور یہ طواف مکہ معظمہ سے رخصت ہوتے وقت کیا جاتا ہے۔

مرسلہ: یمنیٰ سہیل۔ کراچی

میرے زخموں کی دیکھ بھال کرتا رہا، مگر تکلیف روز بہ روز بڑھتی گئی۔ بخار بھی رہنے لگا۔ میری ذاتی رائے تھی کہ چیتے کے دانتوں اور پنجوں کا زہر میرے خون میں سرایت کرچکا ہے۔ میری حالت کی خبر ڈپٹی کمشنر تک پہنچی تو انہوں نے اگلے ہی روز مجھے علاقے کے سول اسپتال میں داخل کرنے کے احکامات صادر کرڈالے۔

بھاگلپور اسپتال میں پڑے پڑے مجھے دو ماہ ہوگئے۔ اس دوران راجو نے میری خدمت کرنے میں کوئی کسر نہ چھوڑی۔ وہ صحیح معنوں میں میرا رفیق ثابت ہوا۔ مجھے آدم خور کی

"سرگرمیوں" کی بھی خبریں ملتی رہیں۔ وہ اتنا نڈر ہو چکا تھا کہ دن دھاڑے کسی نہ کسی کو پکڑ کر لے جاتا۔ ایک مرتبہ اس نے برھڑوا ریلوے اسٹیشن پر نمودار ہو کر سنسنی پھیلا دی۔ اس کے بعد متضاد خبریں آنے لگیں۔ کبھی معلوم ہوتا کہ آدم خور مارا گیا اور کبھی پتا چلتا کہ نہیں مرا۔

افضل بڑی بے قراری سے میری صحت یابی کی... دعائیں مانگا کرتا تھا۔ خود میری طبیعت اسپتال میں پڑے پڑے بیزار ہو چکی تھی۔ میں چاہتا تھا کہ جتنی جلدی ہو سکے اس کمرے سے نکلوں اور آدم خور سے بدلہ لے کر حساب چکتا کروں۔ مگر ڈاکٹروں نے میری ایک نہ چلنے دی۔

خدا خدا کر کے ڈھائی ماہ بعد مجھے اسپتال سے رُخصت ملی، تو میں افضل کے ہمراہ سیدھا ہوکرخان پہنچ گیا۔

اسٹیشن کے باہر سرکاری اہل کاروں نے اونچی اونچی بلیاں باندھ کر لوہے کی باڑ نصب کر رکھی تھی۔ ہر طرف عجیب سناٹا اور دہشت کی فضاء چھائی ہوئی تھی۔

آدم خور کے تعاقب میں مجھے دن کا چین تھا نہ رات کا ہوش۔ بس میرے دل و دماغ پر یہی دُھن سوار تھی کہ کسی طرح اسے جہنم واصل کر دوں۔ افضل سائے کی طرح میرے ساتھ تھا۔ مجھے یہ کہنے میں کوئی عار نہیں کہ اگر وہ میرا ساتھ نہ دیتا تو شاید میں بھی آدم خور کو جہنم واصل کرنے میں... کامیاب نہیں ہوتا۔ اس دوران ہمیں آدم خور کے بارے میں خاطر خواہ معلومات مل رہی تھیں۔

میری صحت یابی تک وہ منحوس درندہ ڈیڑھ سو افراد کو اپنا لقمہ بنا چکا تھا۔

تین دن بعد پیر پائنتی سے یہ خبر ملی کہ وہاں ایک چودہ سالہ لڑکے کو آدم خور اٹھا لے گیا ہے۔ یہ حادثہ پیر پائنتی کی پہاڑی ڈھلوانوں کے قریب پیش آیا تھا۔

ہم نے اسی وقت گھوڑے سنبھالے اور روانہ ہو گئے۔

ہمیں وہ جھونپڑی دکھائی گئی جہاں چیتے نے واردات کی تھی۔ وہ شکار منہ میں دبائے پہاڑی کی طرف بھاگ گیا تھا۔ لوگوں کے بیانات سے میں نے اندازہ لگایا کہ آدم خور لاش کو پہاڑیوں میں لے گیا تھا اور شاید اب تک وہیں ہو۔

کسی نے بھی اب تک چیتے کا تعاقب کرنے کی جرأت نہ کی تھی۔ اس جگہ مسلمانوں کی آبادی خاصی زیادہ تھی۔ شکار ہونے والا لڑکا بھی مسلمان ہی تھا۔ سمجھاتے بجھاتے پر ہمارے ہمراہ آٹھ نوجوان پہاڑیوں تک جانے کے لیے راضی ہو گئے۔ اگرچہ سورج غروب ہونے میں زیادہ دیر نہ تھی، لیکن میں آج ہی کھنڈر جانا چاہتا تھا۔

راستہ انتہائی دُشوار اور خطرناک تھا۔ جوں جوں ہم آگے بڑھے ہمارے ساتھ آنے والے نوجوان سراسیمگی کا شکار نظر آنے لگے۔ جب مجھے احساس ہوا کہ وہ آگے بڑھنے سے کترا رہے ہیں، تو میں نے مزید وقت ضائع کرنا مناسب نہیں سمجھا اور انہیں وہیں رکنے کی ہدایت دے کر افضل کے ہمراہ پتھروں کو پھلانگتا خاردار جھاڑیوں کی پرواہ کیے بغیر پہاڑیوں تک پہنچنے میں کامیاب ہو گیا۔

پہاڑیوں میں داخل ہوتے ہی میری چھٹی حس خطرے کا اعلان کرنے لگی۔ میں نے افضل کو اشارہ کیا، اور لبلبی پر انگلی جمائے چاروں طرف نظریں دوڑانے لگا۔

دائیں جانب واقع جھاڑیوں میں ہلکی کھڑکھڑاہٹ سن کر میں نے اپنی سماعت اسی جانب مرکوز کر دی۔ مجھے اپنی قوتِ سماعت پر کامل بھروسا تھا۔ جھاڑیاں مجھ سے تیس گز دور تھیں۔

میں عجلت کا مظاہرہ کر کے بنا بنایا کام بگاڑنا نہیں چاہتا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ آدم خور اپنی فطرت کے مطابق مجھے بے خبری میں دبوچنا چاہتا ہے۔

دفعتہ آدم خور کی سانسوں کی آواز ابھری اور میں برق سرعت سے اس جانب گھوم گیا۔ اسی لمحے جھاڑیوں میں دبکے ہوئے آدم خور نے اپنا سر اٹھایا اور اس کی آبگینوں کی... مانند دہکتی آنکھیں جیسے میرے وجود میں سوراخ کرنے لگیں۔

آدم خور کی اس تنومی قوت کا مجھے ماضی قریب میں... کافی تلخ تجربہ ہو چکا تھا۔ اس سے قبل کہ وہ جست لگا کر میرے سر پر پہنچتا، میری گولی اس کا داہنا شانہ توڑتی ہوئی نکل گئی۔ زخمی ہونے کے باوجود چیتا دل دہلا دینے والی غراہٹ کے ساتھ میری جانب جھپٹا۔ میں نے فوراً زمین پر لوٹ لگائی اور سیدھا ہوتے ہی دوسری گولی داغ دی جو اس کی گردن میں سوراخ کرتی ہوئی نکل گئی۔

تڑپتے تڑپتے وہ ایک بار پھر فضاء میں اُچھلا، لیکن فوراً ہی میری گولی اس کی کھوپڑی میں پیوست ہو گئی اور وہ دوبارہ نہ اٹھ سکا۔

جب میں اور افضل چیتے کی پیمائش کر چکے تو اسے ایک درخت کے سائے میں ڈال دیا گیا۔

اگلے روز صبح سے شام تک سینکڑوں مرد اور عورتیں اسے دیکھنے آتے رہے۔

امین بھایانی / کشمالہ حسن

خواب دیکھنا انسانی فطرت میں شامل ہے، ہر کوئی خواب دیکھتا ہے۔ بعض خواب سچے بھی ہوتے ہیں اور قبل ازوقت آگہی کا اشارہ بھی کہلاتے ہیں۔ خوابوں کا تذکرہ قرآن مجید میں بھی آیا ہے لیکن ہم خواب کیوں دیکھتے ہیں، کس وجہ سے خواب نظر آتے ہیں، خوابوں کی حقیقت کیا ہے، اس بارے میں ہمارا علم محدود ہے۔

ایک چشم کشا تحریر، قصۂ دلپذیر

"ارے بھئی شاکر! کن سوچوں میں گم ہو۔"

شاکر علی اس پنج ستارہ ہوٹل کی لابی کے بیش قیمت مخملی صوفوں میں دھنسا اطراف کے پُررونق ماحول اور رنگ و نور برساتے سماں کے باوجود نہ جانے کن خیالات میں گم تھا، یکدم چونک پڑا۔

کوئی آدھ گھنٹے قبل ہوٹل کی پول سائیڈ جہاں شہر کے ایوانِ صنعت وتجارت کی سالانہ تقریب ختم ہونے کے بعد ایک نہایت ہی پُرتکلف عشائیے کا آغاز ہوا تو شاکر علی

دھیرے دھیرے چلتا ہوا ہوٹل کی لابی میں آنکلا اور صوفے پر جا بیٹھا۔ اس دوران ایک ویٹر پاس آیا تو اسے "ون کافی وِد کریم" کہہ کر خود سوچوں میں گم ہو گیا۔ اب وہ کافی بھی صوفے کے سامنے لگی ٹیبل پر رکھی نہ جانے کب کی ٹھنڈی ہو چکی تھی۔

وہ اپنے حلقۂ احباب میں ایک زندہ دل انسان کے طور پر جانا جاتا تھا۔ ایوانِ صنعت وتجارت کی انتظامی کمیٹی کا فعال رکن ہونے کے سبب وہ ہمیشہ پیش پیش رہا کرتا اور اس قسم کی تقاریب کی تو جان سمجھا جاتا تھا۔ البتہ کچھ عرصے سے اس میں ایک تبدیلی ضرور آئی تھی۔ اکثر گم صم سا رہنے لگا تھا۔ باتیں کرتے کرتے اچانک چپ ہو کر نہ معلوم کن سوچوں میں ڈوب کر خلاؤں میں گھورنے لگتا۔

"کیا ہوا تم نے کھانا بھی نہیں کھایا؟ طبیعت تو ٹھیک ہے نا؟" شاکر کو مخاطب کرنے اور ساتھ والے صوفے پر بیٹھتے ہی اس نے فوراً دوسرا سوال داغ دیا۔

"ہاں یار جلال مرزا، وہاں گھٹن سی محسوس ہو رہی تھی۔ کچھ کھانے کو میرا جی بالکل بھی نہیں چاہ رہا تھا تو میں یہاں چلا آیا۔" شاکر علی کے چہرے پر ایک دھیمی سی مسکراہٹ تھی۔ پھر یکدم یوں چونکا جیسے کچھ یاد آ گیا ہو۔ "اور ہاں بھئی وہ خوابوں کی تعبیر بتانے والے تمہارے پروفیسر صاحب جن کے بارے میں ذکر ہوا تھا، آئے ہیں یا نہیں؟"

"ہاں ہاں بھئی، وہ آیا تو ہے مگر وہاں چند دوسرے دوستوں نے اسے گھیر رکھا ہے۔"

"یار مرزا، کیا وہ سچ مچ خوابوں کی تعبیر بتا سکتا ہے؟" شاکر کے چہرے پر بے یقینی کے بادل منڈلا رہے تھے۔ "کہیں یہ کوئی فراڈ بابا جی ٹائپ آدمی تو نہیں؟"

جلال مرزا بے اختیار ہنس پڑا پھر قدرے توقف کے بعد بولا۔ "پروفیسر مجید محسن اسکول کے زمانے میں میرا کلاس فیلو تھا۔ نفسیات میں پی ایچ ڈی کرنے کے بعد گزشتہ کئی سال سے ایک مقامی یونیورسٹی کے شعبۂ نفسیات میں تدریس کے فرائض سرانجام دے رہا ہے۔ خواب کے نفسیاتی پہلو پر تحقیق اس کا شوق ہے اور اس موضوع پر ایک تحقیقاتی کتاب بھی لکھ رہا ہے۔"

"مگر تم یقین سے کیسے کہہ سکتے ہو کہ وہ خواب کی تعبیر بالکل درست بتاتا ہے؟"

"اس کا کہنا ہے کہ وہ خوابوں کی تعبیر نہیں بتاتا بلکہ ان کا نفسیاتی تجزیہ کر کے ان میں مخفی پیغام ڈی کوڈ کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ یوں کہہ لو کہ وہ خوابوں کے بند دروازے کھولتا ہے۔"

"کیا مطلب!" شاکر علی کے چہرے پر شدید حیرت نمایاں تھی۔

"مجید کا کہنا ہے کہ ان دنوں امریکا بھر کی یونیورسٹیوں میں خواب پر ہونے والی تحقیقات سے یہ بات سامنے آئی ہے کہ اکثر خواب لاشعور کی جانب سے شعور کو ارسال کردہ کوڈ پیغام ہوتے ہیں۔"

"اور وہ جو ہم ایک زمانے سے سنتے آ رہے ہیں کہ خواب ہماری دبی خواہشات کا عکس ہوتے ہیں؟"

"دیکھو بھائی شاکر، میں کوئی مجید کی طرح ماہرِ نفسیات تو ہوں نہیں۔ میں تو وہی کچھ بتا رہا ہوں جو اس نے میرے ایک خواب کا تجزیہ کرتے ہوئے بتائی تھی۔"

"کیسا خواب؟"

"مجھے اکثر خواب آیا کرتا تھا کہ میں ایک جنگل میں اپنے گھر والوں کے ساتھ کھڑا ہوں۔ میرے ہاتھ میں ایک پٹا ہے جس سے ایک شیر بندھا ہے۔ سامنے وہ سب لوگ کھڑے ہیں جو مجھے ناپسند ہیں۔ شیر اپنی پچھلی ٹانگوں پر بیٹھا دم ہلاتے ہوئے کبھی میری طرف تو کبھی سامنے کھڑے لوگوں کو دیکھتا ہے کہ جیسے میری اجازت کا طلبگار ہو۔ میں سر ہلاتے ہوئے پٹا چھوڑ دیتا ہوں۔ شیر آزاد ہوتے ہی ایک خوفناک چنگھاڑ کے ساتھ ان لوگوں کی طرف چھلانگ لگا دیتا ہے۔ مگر اچانک پلٹ کر دھاڑتا ہوا مجھ سمیت میرے گھر والوں پر حملہ آور ہو جاتا ہے۔ شیر کو اپنی جانب آتا دیکھ کر ہم سب کے اوسان خطا ہو جاتے ہیں اور جان بچانے کی خاطر ادھر اُدھر دوڑ پڑتے ہیں۔ یہ سارا منظر دیکھ وہ لوگ زور زور سے قہقہے لگا کر ہمارا مذاق اڑانے لگتے ہیں۔"

"یہ تو بڑا ہی عجیب خواب ہے۔" شاکر علی کے منہ سے بے اختیار نکلا۔ "تو پھر پروفیسر مجید نے کیا بتایا؟"

"پہلے بہت سے سوالات کیے۔ میرے گھر والوں کے متعلق دریافت کیا۔ پھر میری عادات ومشاغل کے بارے میں پوچھا۔ اس دوران ایک ایسی بات سامنے آئی کہ اس نے خواب میں چھپے پیغام کو ڈی کوڈ کر لیا۔"

"کیسی بات؟"

"بس کیا بتاؤں!" جلال مرزا کے لہجے میں ایک ہچکچاہٹ سی تھی۔ "ہماری ملاقات محض ایوان کی میٹنگوں، عشائیوں یا پھر ویک اینڈ کی شام جم خانہ میں ہوتی ہے۔ ظاہر

ہے کہ تم میری سب عادات سے تو پوری طرح آگاہ نہیں ہو سکتے۔''

''اب ایسی کونسی عادت ہے جس کا تعلق اس عجیب وغریب خواب سے ہو سکتا ہے؟'' شاکر علی کے لہجے میں تعجب تھا۔

''بات یہ ہے کہ جب مجھے غصہ آتا ہے تو میں اپنے ہوش وحواس کھو بیٹھتا ہوں۔ ہتھے سے اکثر اکھڑ کر اوور ری ایکٹ کرتے ہوئے نہ جانے کیا اول فول بک جاتا ہوں اور بات بگڑ جاتی ہے۔ لوگ یہ سب دیکھ کر میرا تمسخر اڑاتے ہیں۔ اس غصے کے سبب میرے گھر والوں کی سبکی ہوتی ہے۔ اکثر ان کا بھی مذاق اڑایا جاتا ہے۔ مزے کی بات یہ ہے کہ جس بات پر مجھے شدید غصہ آتا ہے بعدازاں غور کرنے پر احساس ہوتا کہ وہ کوئی ایسی بہت بڑی بات بھی نہ تھی۔''

''تو پھر اس خواب میں تمہارے لیے کیا پیغام تھا؟''

''پروفیسر کے تجزیے کے مطابق وہ شیر میرا وہی غصہ ہے جس پر قابو نہ پا سکنے کی وجہ سے وہ بجائے دوسروں کے خود مجھے اور میرے گھر والوں کو ذہنی ونفسیاتی طور پر نقصان پہنچا رہا ہے اور میرا امیج بھی خراب ہو رہا ہے۔ سو اب میں کوشش رہا ہوں کہ اپنے غصے پر قابو پاؤں اور شکر الحمدللہ، مجید کے دیئے مشوروں پر عمل کر کے بڑی حد تک کامیاب بھی رہا ہوں۔''

''واقعی اگر غور کیا جائے تو تمہارا خواب بالکل روز روشن کی طرح عیاں تھا۔'' اب کی بار شاکر علی کے لہجے میں تحسین تھی۔

''اسی لیے میں نے اپنے مہمانوں کے کوٹے میں مجید کو بھی مدعو کر لیا۔ بڑی مشکل سے راضی ہوا۔ کہنے لگا کہ تم بیوپاریوں کے عشائیے میں مجھ جیسا کتابی کیڑا شخص بور ہی ہو سکتا ہے۔ مگر جب تمہارے خواب کا ذکر کیا تو وہ فوراً آنے کو تیار ہو گیا۔ ویسے مجید صرف اپنے قریبی دوستوں اور خاص جاننے والوں ہی کے خوابوں کا تجزیہ کرتا ہے۔ اس کا کہنا یہ ہے کہ اس طرح سے مختلف نوعیت کے کیسیز کی اسٹڈی کا موقع مل جاتا ہے۔ تم نے بہت اچھا کیا کہ پچھلے ہفتے جم خانہ میں اپنے خواب کا ذکر کیا۔ میں نے سوچا کہ کیوں نہ تمہاری ملاقات مجید سے کروا دی جائے۔''

''اچھا تو پھر کب ملنا ہے؟''

''ہاں بس وہ آ ہی رہا ہوگا۔ آرگنزائنگ کمیٹی کا کنوینر ہونے کے سبب منتظمین کے لیے ہوٹل میں جو کمرا بک کروایا گیا ہے اس کی چابی میرے پاس ہی ہے۔ میں نے وہ چابی مجید کو دے کر اسے وہیں آنے کا کہہ دیا تھا۔''

اچانک جلال مرزا کے فون کی گھنٹی بج اٹھی۔ اسکرین دیکھ کر چہرے پر ایک ہلکی سی مسکراہٹ آگئی۔ فون کان سے لگا کر کچھ دیر سنتا رہا پھر بولا۔'' ہاں بس، ابھی دو منٹ میں شاکر علی پاس آ رہا ہے۔ میری طرف سے معذرت، مجھے ذرا عشائیے سے متعلق معاملات بھی دیکھنے ہیں۔''

اتنا کہہ کر وہ صوفے سے اٹھ کھڑا ہوا اور شاکر علی کو اٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے بولا۔'' ارے بھئی ہم یہیں باتیں کرتے رہ گئے اور مجید کمرے میں تمہارا انتظار کر رہا ہے۔''

کچھ ہی دیر بعد ہوٹل کے ایک کمرے میں لگی میز پر وہ دونوں آمنے سامنے براجمان تھے۔

''جی شاکر صاحب، اب بتائیں اپنے خواب کے بارے میں جس نے آپ کو الجھن میں ڈال رکھا ہے؟'' کوئی چالیس بیتالیس کے لگ بھگ عمر کا متاثر کن چہرے مہرے اور شخصیت کا حامل پروفیسر مجید ذہانت کی چمک سے بھرپور آنکھوں کے ساتھ مسکرا کر مخاطب ہوا۔

''ان خوابوں میں ہمیشہ میں نے خود کو ایک بچے کی صورت دیکھا۔'' شاکر علی نے دور کہیں خلاؤں میں گھورتے ہوئے بولنا شروع کیا۔'' جو کبھی تو کبھی اپنے پالنے میں محو خواب ہے تو کبھی کسی میدان میں کھیل رہا ہے تو کسی باغ میں لگے جھولوں پر جھول رہا ہے تو کبھی کلاس روم میں اپنا سبق پڑھ رہا ہے تو کبھی کسی بات پر رو رو کر ہلکان ہو رہا ہے۔''

''تو پھر اس میں الجھن والی کونسی بات ہے؟''

''ان سارے خوابوں میں جو الجھن کی بات ہے، وہ ہے ماسٹر حیدر بخش!''

''ماسٹر حیدر بخش؟''

''جی! دراصل وہ ہمارے اسکول میں ریاضی کے استاد تھے اور انہوں نے ہی مجھے چھٹی جماعت سے لے کر میٹرک تک ریاضی پڑھائی۔''

''مگر ان کا آپ کے خوابوں سے کیا تعلق ہے؟ مگر ذرا ٹھہریں! کیا نام بتایا آپ نے! ماسٹر حیدر بخش!''

پروفیسر مجید اچانک سوچ میں ڈوب گیا۔'' ارے! کہیں یہ وہی تو نہیں، مشہور تعلیم پھیلاؤ تحریک کے بانی، جنہوں نے کئی سال پہلے اسکول کی ملازمت سے ریٹائرمنٹ کے بعد بے سروسامانی کے عالم میں تحریک کا آغاز کیا اور آج ان کی کوششوں سے ملک بھر میں انگنت غریب ونادار بچے مفت تعلیم حاصل کر رہے ہیں۔''

''جی جی بالکل درست پہچانا آپ نے۔'' شاکر علی سر ہلاتا ہوا بولا۔

''واہ صاحب، تو آپ اِن کے شاگرد رہ چکے ہیں؟''

''جی ہاں اور مجھے ہر خواب میں ماسٹر صاحب بھی ضرور نظر آتے ہیں۔ جو مجھے مشفقانہ نظروں سے دور کھڑے تک رہے ہوتے ہیں۔ ہر بار خواب کا اختتام کچھ یوں ہوتا ہے کہ اچانک میری نظر ان کی طرف پڑتی ہے تو میں مسکرا دیتا ہوں جواباً ان کے چہرے پر بھی محبت سے بھرپور مشفقانہ مسکراہٹ آجاتی ہے۔''

''ہاں تو بھلا اس میں ایسی کونسی الجھن والی بات ہے؟ دیکھیں شاکر صاحب، اپنے بچپن اور دورِ طالبعلمی میں جن اساتذہ سے متاثر ہوتے ہیں وہ نہ صرف ہمیں عمر بھر یاد رہتے ہیں بلکہ گاہے بگاہے خواب میں بھی نظر آتے ہیں۔''

''یہی تو الجھن والی بات ہے۔'' شاکر علی کے چہرے پر بیچارگی سے لبریز مسکراہٹ تھی۔ ''مجھے اپنے اسکول کے زمانے میں وہ بالکل بھی اچھے نہیں لگے اور چونکہ میرا شمار ہمیشہ سے ہی ریاضی کے پھسڈی طالبعلموں میں ہوا کرتا تھا تو ماسٹر صاحب بھی مجھے کچھ خاص پسند نہیں کرتے تھے۔ بلکہ اکثر میں ان کے زیرِ عتاب رہا کرتا۔''

''اوہ!''

''جی پروفیسر صاحب! مجھے یہ خواب گذشتہ کئی سالوں سے مسلسل آرہے تھے مگر پچھلے کچھ پانچ چھ ماہ سے آنے بالکل بند ہو گئے ہیں۔''

''انٹرسٹنگ۔'' پروفیسر مجید، شاکر علی کے سر کے اوپر خلا میں گھورتے ہوئے دھیرے سے بڑبڑایا۔ پھر جیسے اچانک کوئی سرا ہاتھ آ گیا ہو، شاکر علی کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بولا۔ ''اچھا جب وہ اپنی تحریک کے سبب مشہور ہو گئے تو کیا آپ نے کبھی ان سے ملنے کی کوشش کی۔''

''جی کبھی نہیں۔''

''وہ کیوں بھلا؟''

''جی وہ! میں پہلے ہی بتا چکا ہوں کہ میں ان کا ایک نالائق سا شاگرد تھا۔ کئی مواقعوں پر ان کی جھاڑیں اور جھانپڑیں دونوں ہی کھا چکا ہوں تو بھلا کیا منہ لے کر جاتا۔ ہاں البتہ ان کی تحریک کے لیے باقاعدگی کے ساتھ چندے کی ایک بڑی رقم کا چیک اپنی کمپنی کی معرفت ضرور ارسال کرتا ہوں۔''

''ارے! مگر ابھی تو آپ کہہ رہے تھے کہ آپ ان کو پسند نہیں کرتے؟''

''ارے صاحب، وہ تو نادانی کا دور تھا۔'' شاکر علی کھسیائے لہجے میں بولا۔ ''اپنے اچھے برے کی کچھ خبر نہ تھی۔ میں انہیں ایک ایسا ظالم اور اکھڑ استاد سمجھتا تھا جو بھری جماعت میں مشق درست نہ کرنے پر سب کے سامنے تھپڑ رسید کر دیا کرتا۔ ہر وقت روک ٹوک کرتا۔ جب میں میٹرک میں تھا تو وہ ان کا بھی ملازمت میں آخری سال ہی تھا۔ وہ ریٹائر ہو گئے اور میں کالج چلا گیا۔ اگر چاہتے تو وہ بھی اپنا ذاتی ٹیوشن، کوچنگ سینٹر وغیرہ یا پھر کوئی چھوٹا موٹا پرائیوٹ اسکول کالج کھول کر اس بہتی گنگا میں ہاتھ دھو بلکہ غسل کر سکتے تھے جن میں ان جیسے دیگر ریٹائرڈ اساتذہ دن رات ڈبکیاں لگاتے ہیں۔ یا پھر بیکار گھر بیٹھ کر اپنی پنشن کے سہارے بہت زیادہ نہ سہی پھر بھی کسی حد تک تو آرام کی زندگی گزار ہی سکتے تھے۔ مگر انہوں نے اپنی صلاحیتوں کو ملک وقوم کے مفاد میں استعمال کرنے پر ترجیح دی۔ اپنے جیسے ریٹائرڈ لوگوں کو ساتھ لے کر غریب و نادار بستیوں کے گھروں سے بچوں کو پکڑ لائے اور گلی محلوں کے فٹ پاتھوں، پارکوں اور ریلوے پلوں کے نیچے پڑھانا شروع کر دیا۔ میں کالج سے یونیورسٹی جا پہنچا۔ دورانِ تعلیم اِدھر اُدھر چھوٹی موٹی نوکریاں بھی کرتا رہا۔ باقاعدہ عملی زندگی کا آغاز ایک چھوٹے سے کاروبار سے کیا۔ اپنی شبانہ روز انتھک محنت سے ایک کامیاب بزنس مین بن گیا۔ اس دوران ماسٹر صاحب ایک ایسے محسنِ قوم کے طور پر سامنے آئے جن کا اٹھنا بیٹھنا، سونا جاگنا اور اوڑھنا بچھونا قوم کے نادار و مفلس بچوں کی تعلیم سے وابستہ ہے۔ اگر وہ اس کام کا بیڑا نہ اٹھاتے تو شاید لاکھوں نادار بچے تعلیم جیسی عظیم نعمت سے محروم رہ جاتے۔ میں غیر محسوس طور پر ان کا شیدائی بنتا چلا گیا اور سمجھ میں آیا کہ اگر وہ سختی کرتے تھے تو وہ میری ہی بھلائی کے لیے تھی۔ جس روز مجھے اپنے کاروبار کا پہلا منافع ملا۔ میں نے اپنی کمپنی کی جانب سے ایک بڑی رقم کا امدادی چیک خاموشی کے ساتھ انہیں روانہ کر دیا۔''

''ہوں۔'' پروفیسر مجید ایک بار پھر خلا میں گھورتے ہوئے بڑبڑایا۔ کچھ دیر سوچتا رہا پھر بولا۔ ''شاکر صاحب، آپ کے تعلقات اپنے والد کے ساتھ کیسے ہیں؟''

اِس سوال میں نہ جانے ایسی کیا بات تھی کہ شاکر علی کا چہرہ بجھ سا گیا اور اس نے اپنا سر جھکا لیا۔ پھر ایک گہری سانس لے کر دھیرے دھیرے اپنی ناک سے خارج کرتے ہوئے جب اس نے اپنا سر اوپر اٹھایا تو پروفیسر مجید نے دیکھا کہ اس

کی آنکھوں میں ایک عجب سی ویرانی تھی۔ پھر وہ اندھے کنویں سے آتی ڈوبی ڈوبی آواز میں بولا۔ ”جی۔ ابی کچھ خاص اچھے نہیں!“

”آپ اِس بات کی کچھ وضاحت کرنا پسند کریں گے؟“

”پروفیسر صاحب، میرے والد شروع سے ہی ایک بہت ایماندار اور اصول پسند انسان تھے۔ تمام عمر اعلیٰ سرکاری عہدوں پر کام کرتے رہے۔ ان کے دوسرے ساتھی افسران گاڑیاں، بنگلے، بینک بیلنس بناتے رہے۔ اپنی اولادوں کو بڑے بڑے بزنس کروادیے یا اعلیٰ تعلیم کے نام پر بیرونِ ملک بھجوا کر انہیں وہیں سیٹل کروادیا۔ سارے ننھیال اور ددھیال میں ہمارا ہی واحد گھر تھا جہاں ہمیشہ پیسے کی تنگی رہی۔ خاندان میں کم و بیش ہر کسی نے چھوٹی موٹی ملازمت سے ہی آغاز کیا۔ کبھی ہم سنتے کسی نے اپنا کاروبار شروع کرلیا تو کوئی بیرونِ ملک چلا گیا۔ ابو بہت پڑھے لکھے ذہین آدمی تھے۔ انہوں نے تو اپنی ملازمت کا آغاز ہی افسری سے کیا تھا۔ خاندان کے دوسرے مرد جو تعلیم و ذہانت میں کسی طور ابو کے پاسنگ بھی نہ تھے، ترقی پہ ترقی کرتے کہیں کے کہیں جا پہنچے۔ مگر ابو معیشت کی دوڑ میں وہیں کے وہیں کھڑے رہ گئے۔ لوگوں نے ان کو بہتیرا سمجھایا کہ بھئی فاخر علی دیکھو زمانہ قیامت کی چال چل کر کہیں کا کہیں پہنچ گیا اور تم نے ایمانداری اور اصول پرستی کو اپنی راہ کی دیوار بنا رکھا ہے۔ اگر اوپر کی کمائی نہیں کرنا چاہتے تو کوئی کاروبار وغیرہ ہی کرلو۔ مگر ابو نے نہ تو کبھی اوپر کی کمائی کو ہاتھ لگایا اور نہ ہی کبھی کاروبار کرنے کا سوچا۔ وہ کہتے کہ میں کاروباری ذہنیت کا آدمی ہی نہیں۔ میں ٹھہرا دو اور دو چار کے اصول والا اور کاروبار میں تو وہی کامیاب ہوسکتا ہے جو دو اور دو بائیس کرنا جانتا ہو۔ مجھ سے تو کاروبار نہ ہوگا۔ ہم دو بھائی اور ایک بہن ہیں۔ مجھے یاد ہے کہ ہم تینوں بہن بھائی خاندان میں ہونے والی ہر تقریب میں اپنے کزنوں اور دیگر رشتے دار بچوں سے کٹے کٹے سے رہتے۔ وہ سب شہر کے بڑے اور مہنگے ترین اسکولوں میں جاتے، بڑے بڑے گھروں میں رہتے۔ ہر تقریب میں ایک سے بڑھ کر ایک نئے اور قیمتی کپڑے پہن کر گاڑیوں میں سوار ہو کر آتے جبکہ ہم وہی ہمیشہ خاص خاص تقاریب کے لیے سنبھال کر رکھے گئے کپڑوں میں ابو اور امی کے ہمراہ بسوں اور اگر بہت ہوگیا تو رکشا ٹیکسی میں دھکے کھاتے پہنچتے کیونکہ ابو دفتر کی گاڑی نجی استعمال میں لانے کو حرام سمجھتے تھے۔“

شاکر علی جو کسی زاہد کی طرح آنکھیں بنا جھپکائے، ہوا میں گھورتا بس بولے چلا جا رہا تھا ایک لحظہ رکا اور میز پر رکھے پانی کے گلاس کو اٹھا کر ایک ہی گھونٹ میں آدھا خالی کر کے واپس رکھ دیا اور پھر ایک گہری سانس لے کر دوبارہ بولنے لگا۔

”میرے والد سیلف میڈ اور ایک سفید پوش گھرانے کے چشم و چراغ تھے۔ میرے دادا کثیر العیال ہونے کے سبب اپنی اولاد کو بہت زیادہ تعلیم نہ دلوا سکے۔ مگر ابو کو تعلیم حاصل کرنے کا ایک جنون سا تھا۔ نویں جماعت سے ہی کام کرنا شروع کردیا۔ بہتر سے بہتر تعلیمی نتائج کے حصول کے لیے ہر ممکن کوشش کی۔ تعلیم اور کام کا سلسلہ ساتھ ساتھ جاری رہا۔ بمشکل کوئی چند گھنٹے ہی سوتے۔ سارا سارا دن کام کرتے اور پھر شام کو کالج اور پھر یونیورسٹی جاتے۔ رات دیر گئے تک کبھی اپنے کسی دوست کے گھر تو کبھی گھر پر اپنا ذاتی کمرا نہ ہونے کے سبب صحن میں ہی گرمی سردی کی پروا کیے بغیر پڑھائی کرتے۔ تعلیمی مدارج طے کرتے کرتے بالآخر مقابلے کے امتحان میں جا بیٹھے اور کامیاب ہو کر اعلیٰ سرکاری افسر بن گئے۔ مگر چونکہ ایمانداری کا بھوت سوار تھا تو کبھی کسی ایک محکمہ میں جم کر کام نہ کرسکے اور یکے بعد دیگرے ان کے تبادلے ہوتے رہے اور اپنے اعلیٰ افسران کی گڈ بکس میں نہ ہونے کے سبب مزید ترقی بھی نہ کرسکے۔“

”اچھا تو ان سب باتوں کے سبب آپ اپنے والد کو پسند نہیں کرتے؟“ پروفیسر مجید نے اس وقفے سے فائدہ اٹھاتے ہوئے پوچھا۔

یہ تو مجھے خود بھی نہیں معلوم۔ ہاں مگر اتنا ضرور ہے کہ ہم دونوں کے درمیان ہمیشہ سے ہی ایک سرد مہری رہی۔ کئی بار میں ابو سے ان باتوں کے سبب الجھ بھی پڑتا۔

”کیا کبھی آپ کے والد نے اس سبب آپ پر ہاتھ بھی اٹھایا؟“ پروفیسر مجید نے سپاٹ لہجے میں دریافت کیا۔

”نہیں کبھی نہیں، ابو اس معاملے میں روایتی باپ کبھی نہیں رہے۔ ہاں وہ میری باتوں پر اکثر تلخ ضرور ہوجایا کرتے مگر انہوں نے مجھ پر یا میرے کسی دوسرے بہن بھائی پر کبھی ہاتھ نہیں اٹھایا۔“

اتنا کہہ کر شاکر علی ایک لحظہ رکا۔ اس کے بھینچے ہوئے ہونٹوں پر ایک ہلکا اداس سا تبسم ابھرا۔ پھر سوچ میں ڈوبی ہوئی آنکھوں پر زور ڈالتے ہوئے اس نے اپنے ہونٹوں کو مزید سختی سے بھینچ لیا جیسے اسے کوئی ایسی پرانی بات یاد آگئی ہو جس کا

ملال اسے اب بھی ہو اور وہ نہ چاہتا ہو کہ اس کے ہونٹ کھلیں اور وہ بات باہر نکل پڑے۔ پھر اپنے بھینچے ہوئے ہونٹوں کو دھیرے سے کھولتے ہوئے بولنا شروع کیا۔ ''ایک بار جب میں کالج کے سیکنڈ ایئر میں تھا۔ میں نے کاروبار کے سلسلے میں ان سے مدد اور سفارش کے لیے کہا۔ انہوں نے یہ کہتے ہوئے اپنی چیک بک میرے ہاتھ میں تھما دی کہ میاں یہ میری عمر بھر کی وہ تھوڑی بہت جمع پونجی ہے جو میں نے تم بہن بھائیوں کی تعلیم کے لیے پس انداز کر رکھی ہے۔ اس میں سے جو چاہو لے لو مگر میں اپنا نام، عہدہ اور تعلقات کے استعمال کی اجازت ہرگز نہیں دے سکتا۔ میرا جوان خون جوش میں آ گیا۔ میں نے چیک بک زور سے زمین پر پٹخ دی اور چلّا کر بولا کہ جائیں جا کے دیکھیں! والدین اپنی اولاد کی ترقی اور بہتر مستقبل کے لیے کیا کچھ نہیں کرتے! ایک آپ ہیں۔ ! آج تک آپ نے ہمارے لیے کیا ہی کیا ہے؟ حیرت انگیز طور پر انہوں نے کوئی ردعمل ظاہر نہیں کیا۔ بس ویران نظروں سے مجھے دیکھتے ہوئے جھکے اور فرش پر پڑی چیک بک اٹھالی۔ شاید اس روز ان کے اندر کوئی شے ٹوٹ سی گئی تھی۔ ان کی آنکھوں میں چھائی ویرانی دھیرے دھیرے ان کے سارے وجود کو اپنی لپیٹ میں لیتی چلی گئی۔ اس روز کے بعد ہم دونوں چپ چادر کی بکل مار کر ایک دوسرے سے اتنا دور ہوتے چلے گئے کہ ایک ہی چھت تلے رہتے ہوئے بھی ہم پھر کسی موڑ، کسی راہ پر مل نہ پائے۔''

''بس شاکر صاحب، میرے سوالات مکمل ہوئے۔'' پروفیسر سوچ میں ڈوبی آنکھوں کے ساتھ دانتوں سے اپنے نچلے ہونٹ کو ایک جانب سے مسلتا ہوا بولا۔

''تو کیا آپ میرے خوابوں کی تہہ تک پہنچ گئے؟''

''دیکھیں شاکر صاحب، ہمارا لاشعور ہمارے ہر کام، ہر مسئلے، ہر الجھن اور ہر پریشانی کا ہر لمحہ تجزیہ کرتا رہتا ہے۔ مگر ہمارے شعور کی طرح سے براہِ راست ہم سے مخاطب نہیں ہو سکتا۔ لہٰذا خوابوں کے ذریعہ تمثیلی طور پر یا پھر یوں کہہ لیں کہ اشارتاً ہمارے الجھے ہوئے معاملات کو سمجھنے میں مدد فراہم کرتا ہے۔ چونکہ لاشعور کے کام کا طریقۂ کار خود بہت پیچیدہ ہے تو فراہم کردہ تمثیلی اشارات بھی اکثر پیچیدہ ہوا کرتے ہیں۔''

''آپ کے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ میرے یہ سارے خواب دراصل میرے لاشعور کی جانب سے میری کسی الجھن کے حل کی طرف اشارے ہیں؟'' شاکر کے لہجے میں ایک بے یقینی سی تھی۔

''اچھا ایک بات اور بتائیں کہ ان سارے خوابوں میں آپ نے خود کو کتنی عمر کا دیکھا؟'' پروفیسر نے شاکر کی بات کا جواب دیے بغیر ایک اور سوال کر دیا۔

''پیدائش سے لے کر لگ بھگ آٹھ دس برس کی عمر تک کا۔'' شاکر علی اپنی آنکھیں سکیڑ کر سوچتے ہوئے بولا۔

''جبکہ آپ کا کہنا ہے کہ ماسٹر حیدر بخش آپ کے استاد چھٹی سے میٹرک تک کی جماعتوں کے دوران ہی رہے۔ لہٰذا یہ تو کسی طور بھی ممکن نہیں کہ... وہ آپ کو نوزائیدگی کے دوران پالنے میں لیٹے اور دورِ کمسنی میں پلے گراؤنڈ اور پارکوں میں کھیلتا دیکھتے رہے ہوں۔ تو اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ وہ شخص کون ہے جو ان سارے مراحل کے دوران نہ صرف آپ کو دیکھتا رہا بلکہ اس کے دیکھنے میں ایک خاص محبت و شفقت بھی تھی؟'' پروفیسر مجید نے بھرپور معنی خیز مسکراہٹ کے ساتھ شاکر علی کی طرف دیکھا۔

شاکر علی کے چہرے پر ایک لحظہ سوچ کی گہری لکیریں ابھریں مگر پھر وہ ساری لکیریں تیزی سے پھیلتی آنکھوں میں ڈوبتی چلی گئیں جہاں اب اچانک بے یقینی و حیرت کا ٹھاٹھیں مارتا سمندر نظر آ رہا تھا۔ ''مم! میرے ا۔ا۔ا۔ابو!'' شاکر علی لڑکھڑاتے لہجے میں فقط اتنا ہی کہہ سکا۔

''جی ہاں سو فیصدی درست۔'' پروفیسر کی معنی خیز مسکراہٹ اب ایک مطمئن سے تبسم میں ڈھل گئی۔ دراصل آپ کی زندگی میں آپ کے والد اور ماسٹر حیدر بخش کی نوعیت کم و بیش ایک سی ہی رہی ہے۔ دونوں آپ کو اپنے سخت اصولوں کے سبب ناپسند رہے۔ ماسٹر حیدر بخش سے تو ذہنی طور پر آپ نے کسی نا کسی طور سمجھوتا کر لیا مگر اپنے ابو سے سمجھوتا نہ کر پائے۔ حالانکہ لاشعوری طور پر آپ اپنے ابو سے بے حد محبت کرتے ہیں مگر شعوری طور پر کبھی نہ تو اس بات کا اقرار کیا اور نہ ہی ادراک۔ یہ سارے خواب آپ کے لاشعور کی طرف سے آپ کو اشارہ ہیں کہ جس طرح ماسٹر حیدر بخش جنہیں آپ ایک وقت میں بالکل پسند نہیں کرتے تھے نا صرف ان کے معتقد ہو گئے بلکہ متاثر ہو کر انہیں باقاعدگی سے چندے کی رقم بھی بھجوانے لگے۔ تو آپ کی زندگی میں آپ کے والد کا بھی ایک اہم مقام و کردار ہے۔ ان ہی کی کوششوں، محبتوں، شفقتوں کے سبب آپ وہاں پہنچنے میں کامیاب ہو پائے ہیں ماشاءاللہ جہاں آج آپ ہیں۔ اب یہ اور بات ہے کہ آپ اس بات کو جانتے ہوئے بھی نہ جانیں اور مانتے ہوئے بھی نہ مانیں!''

شاکر علی، پروفیسر مجید کی باتیں یوں سن رہا تھا جیسے کسی

جید عالم دین کا کوئی مرید کسی محفل میں بیٹھا اس کا کوئی ایسا وعظ سن رہا ہوں جسے سن کر اس کی روح کا پور پور بھیگ رہا ہو اور اس نمناک روح کی نمی آنکھوں کے راستے زاروقطار بہتی چلی جارہی ہو۔

''دیکھیں شاکر صاحب، میں آپ کی کیفیت کو بہت اچھی طرح سے سمجھ سکتا ہوں۔'' پروفیسر مجید نے میز پر رکھے ٹشو پیپر کے باکس میں سے ایک ساتھ بہت سارے ٹشوز نکال کر شاکر علی کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ وہ ٹشوز شاکر علی نے جھپٹ کر اپنی چھم چھم برستی آنکھوں سے یوں لگا کر سر جھکا لیا کہ جیسے وہ ٹشو پیپر نہ ہوں کوئی مقدس اوراق ہوں۔

''میں سمجھ سکتا ہوں کہ یہ سب آپ کے لیے بہت مشکل ہے۔'' پروفیسر مجید ہمدردانہ لہجے میں مخاطب ہوا۔ ''مگر آپ ایک بار اپنے ابو کے قریب تو جا کر دیکھیں، وہ آپ کو فوراً اپنے گلے سے لگالیں گے۔ بس ذرا اپنی انا کے خول سے باہر آنے کی ضرورت ہے۔ یہ کام اتنا بھی مشکل نہیں جتنا آپ سمجھ رہے ہیں۔''

''پروفیسر صاحب بات انا کی نہیں۔'' شاکر علی بھرائی ہوئی آواز میں سر جھکائے ہوئے ہی بولا۔

''تو پھر اور کیا بات ہے؟''

شاکر علی نے اپنا سر اٹھایا تو پروفیسر مجید نے دیکھا کہ اس کی سرخ متورم آنکھوں میں کرب کا ایک سمندر لہرا رہا تھا۔ نہ جانے کیوں پروفیسر مجید کو اس لمحہ شاکر علی پر بہت ترس آیا۔ اس کا جی چاہا کہ وہ آگے بڑھ کر شاکر علی کو گلے سے لگا کر اسے دلاسہ دے اور کہے کہ کوئی بات نہیں شاکر علی، ہمت سے کام لو۔ ہم سب انسان ہی تو ہیں۔ غلطیاں انسانوں ہی سے ہوا کرتی ہیں اور خیر یہ کوئی اتنی بڑی غلطی بھی نہیں کہ جس کا مداوا نہ ہو سکے۔ ایک بار اپنے باپ کے گلے لگ کر تو دیکھو۔ سینے میں چھپا سارے کا سارا پچھتاوا تمہارا باپ اپنی چھاتی میں نا سمو لے تو!

ابھی پروفیسر اتنا ہی سوچ پایا تھا کہ اچانک شاکر علی کے ہونٹ یوں پھڑپھڑائے جیسے کسی آتش فشاں کا دھانہ کھلنے سے قبل لرز رہا ہو۔ پھر ان پھڑپھڑاتے ہونٹوں سے بیجان لہجے میں ایک انجان سی آواز برآمد ہوئی۔

''پروفیسر صاحب! آج سے کوئی چھ ماہ قبل میرے ابو انتقال کر گئے!''

☆......☆

شاکر علی کے ساتھ جو کچھ ہوا یہ کیا ہے۔ اس سوال پر جب ہم غور کرتے ہیں تو جواب ملتا ہے کہ خوابوں کے بے شمار پہلو ہیں۔ بے شمار کیفیات ہیں۔ ایک امریکی ماہر نفسیات کا یہ کہنا ہے کہ خواب دراصل آپ کے اپنے وہ خط ہوتے ہیں جو آپ اپنے آپ کو بھیجتے ہیں۔ جس کا ذکر اوپر بھی ہوا ہے۔

اگر آپ ان خطوں کو پڑھنا سیکھ لیں تو بہت سی حقیقتیں واضح اور روشن ہو جائیں گی۔ بہت سے ابہام کھل جائیں گے۔

ہم نے اس موضوع کو کئی حصوں میں تقسیم کیا ہے۔ جن کو آپ ذیلی موضوعات سمجھ لیں۔

جیسے نیند کیا ہے؟

خواب کیا ہیں؟

دنیا کے لٹریچر میں خوابوں کا حال۔

خواب اور روحانیت، منتشر اور سچے خواب۔

قدیم اور جدید تہذیبوں میں خوابوں کا تصور۔

ہم خواب کیوں دیکھیں۔ خوابوں کی تعبیر وغیرہ۔

ان میں سے ہر موضوع اپنی جگہ بہت وسیع ہے۔ میں نے خوابوں کے اس سلسلے میں دن کے خوابوں کی بات نہیں کی ہے۔ انہیں میں نے شیخ چلی کے لیے رہنے دیا ہے حالانکہ کیتھارسس کے لیے وہ بھی ضروری ہیں۔

ہمارا موضوع وہ خواب ہیں، جو ہمیں اس وقت دکھائی دیتے ہیں جب ہمارا شعور سو چکا ہوتا ہے اور لاشعور اپنی ورکنگ شروع کر دیتا ہے۔

لیکن اس سے پہلے کہ ہم خوابوں پر جائیں، نیند کی مختلف کیفیات کا جائزہ بہت ضروری ہے۔ کیونکہ ہمارے خواب ہماری نیند سے مشروط ہیں۔

بلاشبہ نیند خدا کی عظیم ترین نعمتوں میں سے ایک ہے۔ آپ ذرا ان کے پاس جائیں جنہیں نیند نہیں آتی، جو بے خوابی Insomnia کے مریض ہیں۔

انہیں نیند کے لیے کیا کیا جتن کرنے پڑتے ہیں۔ خواب آور گولیوں سے لے کر سیلف ہپناسس تک۔ ساری رات کروٹیں لیتے ہوئے گزر جاتی ہے۔

پُرسکون، بےفکری اور بے نیازی کی نیند درویشوں کے یہاں پائی جاتی ہے۔

ایک سرمائے دار کو مزدور پر اس وقت رشک آتا ہے جب وہ مزدور کو اینٹوں کا تکیہ بنا کر سویا ہوا دیکھ لیتا ہے۔

فرینکلین نے کہا تھا کہ ''تھکن سب سے بہتر تکیہ ہے۔''

نیند نہ آنا ایک عذاب ہے۔
دوسری جنگِ عظیم میں قیدیوں کو زبردستی بھاگنے پر مجبور کیا جاتا تھا۔ ان کے پاس بے پناہ شور مچایا جاتا۔ انہیں میدان میں رات بھر دوڑایا جاتا اور جب وہ سونے لگتے تو ان پر سخت ٹھنڈا یا گرم پانی ڈال دیا جاتا تھا۔
جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ مالیخولیا کے مریض بن گئے۔ طرح طرح کے الیوژن ان کے سامنے آنے لگے اور آخر کار وہ پاگل ہو گئے۔
تجربات سے معلوم ہو چکا ہے کہ بے خوابی جسمانی افعال پر تو شاید اتنی اثر انداز نہ ہو لیکن ذہنی خلل ضرور واقع ہو جاتا ہے۔ بے خوابی کا مریض ارتکازِ توجہ کھو دیتا ہے اور الیوژن کا شکار ہو جاتا ہے۔ کیونکہ نیند ایک پُرسکون حالت کا نام ہے۔
جب آپ ٹینشن، ڈپریشن اور ہیجان وغیرہ سے نجات پا کر بستر کی آغوش میں چلے جاتے ہیں تو فطرت آپ کو تھپکیاں دے دے کر سلا دیتی ہے۔
نیند کے ساتھ آپ ایک مختلف برتاؤ بھی کر سکتے ہیں۔ آپ چاہتے ہیں کہ نیند آئے تو نیند کے متعلق سب بھلا دیں، کچھ اور کرنا شروع کر دیں۔
کسی اور معاملے میں اس قدر محو ہو جائیں جیسے نیند سے آپ کو کوئی مطلب ہی نہیں ہے۔ پھر آنے لگے گی۔ آپ اس کے قدموں کی آہٹ سنیں گے۔ پھر بھی اس پر توجہ نہ دیں۔ بالآخر وہ آپ کے پاس آ کر آپ کے گلے میں اپنی باہیں ڈال دے گی۔
نیند ایک مونث توانائی ہے۔ عورت چاہتی ہے کہ آپ اس کے پیچھے پیچھے پھریں۔ وہ آپ سے اس بات کی توقع نہیں رکھتی کہ آپ بس خاموش بیٹھ کر اس کے آنے کا انتظار کرتے رہیں۔ وہ آپ کو بے تابی چاہتی ہے۔ پھر بھی شروع شروع میں وہ آپ سے دور رہے گی لیکن اتنی دور نہیں کہ آپ اسے پکڑ نہ سکیں۔ اس کی رفتار بھی اتنی ہوتی ہے کہ آپ اسے گرفت کر سکیں۔ وہ یہ موقع خود فراہم کرتی ہے۔
نیند کی بھی یہی فطرت ہے جو اپنے محبوب کے پاس کسی اور کو برداشت نہیں کر سکتی۔ اس لیے جب آپ اس کی طرف سے توجہ ہٹا کر کسی اور کی طرف متوجہ ہو جاتے ہیں تو یہ اس کی برداشت سے باہر ہوتا ہے پھر وہ دوڑتی ہوئی آپ کے پاس آ جاتی ہے۔
پُرسکون نیند کے لیے پُرسکون ماحول کا ہونا بھی ضروری ہے۔

غالب نے کہا تھا۔
”نینداس کی ہے دماغ اس کا ہے راتیں اس کی ہیں
تیری زلفیں جس کے شانوں پر پریشاں ہو گئیں۔“
یہاں دیکھیں کہ پُرسکون نیند کی ساری محرکات موجود ہیں۔
نیند جو ہمارا موضوع بھی ہے۔
دماغ۔ خوف، ڈپریشن اور ہیجان سے پاک دماغ۔
راتیں۔ کیوں کہ نیند کا تصور راتوں سے ہے۔
زلفیں۔ جو ایک نرم اور خوب صورت احساس دلاتی ہیں اور شانے اور ان کے ساتھ ہی بستر اور تکیے کا تصور۔
ارتکازِ توجہ سے بھی نیند آ جاتی ہے۔ جیسے کتنی تسکین سی وابستہ ہے تیرے نام کے ساتھ۔ نیند کانٹوں پر بھی آ جاتی ہے آرام کے ساتھ۔
یہاں شاعر نے اپنے محبوب کو فوکس کر کے نیند حاصل کر لی ہے۔
دوسری طرف انتشارِ توجہ اور ہیجان کی ایک مثال دیکھیں۔ حائل تھی بیچ میں جو رعنائی تمام رات۔ اس دکھ سے ہم کو نیند نہ آئی تمام رات۔
تو یہ ہے انتشارِ توجہ اور ہیجان جو نیند اڑا دیتا ہے۔ اس کی ایک اور مثال لیں۔
موت کا ایک دن معین ہے۔ نیند کیوں رات بھر نہیں آتی۔
بہر حال اب آ جائیں نیند کے دوسرے معنی کی طرف اور یہ ہے غفلت۔ اوب میں جگہ جگہ اسی غفلت کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔
”کن نیندوں سو رہی ہے تو اے چشمِ گریہ ناک۔
مژگاں تو کھول شہر کو سیلاب لے گیا۔“
ایسی نیند سے روک دینے کی ضرورت ہے۔ جاگنا ہے جاگ لے افلاک کے سائے تلے۔ حشر تک سوتا رہے گا خاک کے سائے تلے۔
یا پھر۔ جاگ اے سایہ دیوار میں سونے والے۔ دھوپ چڑھتی ہوئی دیوار تک آ پہنچی ہے۔
نیند کا ایک خاص ردھم ہوتا ہے۔
اس ردھم کا تعلق چاند اور سورج کی گردش سے ہے اور یہ عین نظامِ قدرت ہے۔ اس ردھم کو Circardian کہتے ہیں۔
اگر یہ ڈسٹرب ہو جائے تو ہمارا پورا اعصابی اور جسمانی

نظام گڑبڑ ہو جاتا ہے۔ اس کا تجربہ لوگوں کو ہوا کرتا ہے جو جہاز سے سفر کر کے ایک براعظم سے دوسرے براعظم میں جاتے ہیں۔ اس وقت ان کا یہ ردھم ڈسٹرب ہو جاتا ہے اور اسے سیٹ ہونے میں کئی دن لگ جاتے ہیں۔

یا وہ لوگ جو مسلسل رات کی ملازمت کرتے ہیں ان کے ساتھ بھی یہی ہوتا ہے۔ کیونکہ وہ جو کچھ بھی کر رہے ہیں وہ قانونِ فطرت کے خلاف ہے۔ خدا نے رات اور دن کی تقسیم اس لیے کی ہے کہ دن کام کے لیے اور رات آرام کے لیے۔

اس سلسلے میں سورۂ انعام کی یہ آیت قابلِ غور ہے۔ جس کا مفہوم یہ ہے۔ وہی اللہ پردۂ شب کو چاک کر کے صبح نکالتا ہے۔ اس نے رات کو سکون کا وقت بنایا ہے۔ اس نے چاند اور سورج کے طلوع اور غروب کا حساب مقرر کیا ہے۔

تو پتا یہ چلا کہ دن ہمیں کام کی تلقین کرتا ہے اور رات ہمیں آرام کا مشورہ دیتی ہے۔ یہ سارے عناصر ایک دوسرے سے الگ الگ ہونے کے باوجود ایک دوسرے سے منسلک بھی ہیں اور نصرتِ انسان کے لیے ایک دوسرے سے تعاون بھی کر رہے ہیں۔

سورۂ نحل میں ارشاد ہوا۔ ''اس نے تمہاری بھلائی کے لیے رات اور دن کے سورج اور چاند کو مسخر کر رکھا ہے۔''

ہندوؤں کی مقدس کتاب رگ وید کا اشلوک ہے۔ ''اس نے دن اور رات بنائے۔''

ہم نیند کی بات کر رہے ہیں۔ قرآن شریف میں اصحابِ کہف کی نیند کا پورا حال بیان کیا گیا ہے۔ یہ سات وہ لوگ تھے جنہیں ان کے کتے کے ساتھ سلا دیا گیا ہے۔

اب ہم اس نیند کی طرف آتے ہیں جس کو طبی یا میڈیکلی نیند کہتے ہیں۔

جب آپ سو جاتے ہیں تو اس حالت میں جسم میں کئی تبدیلیاں رونما ہوتی ہیں۔ جیسے نبض اور دل کی رفتار کا مدھم ہو جانا۔ جسم کے درجۂ حرارت کا کم ہو جانا۔ یا نظامِ ہضم کا سست پڑ جانا وغیرہ۔

سونے کے ساتھ ہی آپ کے لاشعور کی ورکنگ شروع ہو جاتی ہے اور خواب دیکھنے کا پروسیس شروع ہوتا ہے۔

اب دیکھنا یہ ہے کہ آپ کی نیند کیسی ہے۔ دماغی کیفیات کیا ہیں۔

نیند کے دوران ذہن کی کیفیت کا معاملہ۔ مطالعہ خواب کے نکتۂ نظر سے بہت اہمیت رکھتا ہے۔ سائنس دانوں نے معلوم کیا ہے کہ دماغی عمل کی پیمائش برقی محرکات کی پیمائش سے ممکن ہو جاتا ہے۔ یہ پیمائش جس مشین سے کی جاتی ہے اسے EEg-Electro Enfeslograf کا نام دیا گیا ہے۔

لوگوں کے سروں پر الیکٹروڈز لگا کر دماغی عمل کا ریکارڈ حاصل کرتے ہیں۔

اب ذرا مختلف کیفیات بھی دیکھ لیں۔

شروع شروع میں جب کوئی آدمی سویا اور آدھا جاگا ہوا ہو تو اس مشین میں ایک متوازن لہر کی ریڈنگ آتی ہے۔ اس کو الفا ردھم کا نام دیا گیا ہے۔ یہ ایک ہلکی نیند ہوتی ہے۔ اس میں فون کی گھنٹی یا کوئی آہٹ فوراً بیدار کر دیتی ہے۔

اس پہلے اسٹیج کے بعد دماغ غشی کے دوسرے دور میں داخل ہوتا ہے۔ اس کے بعد آخر میں آدمی گہری نیند میں مبتلا ہو جاتا ہے۔

اب جو لہریں آتی ہیں وہ طویل اور گہری ہوتی ہیں۔ ان کو ڈیلٹا ویوز کہا جاتا ہے۔ ان لہروں کی وضع ایک مسلسل کے ساتھ تیز تر ہوتی ہے۔ اس حالت کو آرتھوڈوکس سلیپ Ortuodox Sleep کہا جاتا ہے۔

نیند کی ایک اور سطح بھی ہوتی ہے جس کو ظاہری نیند کہا گیا ہے یعنی پیراڈاکسیکل سلیپ۔

1950ء کے آخر میں ڈاکٹر Nathanilal نے تجربات کے ذریعے نیند اور خوابوں کے مطالعے سے کئی اہم انکشافات کیے۔

پتا چلا کہ لوگ نیند کے کئی وقفوں سے گزرتے ہیں۔ جب ایک گہری نیند کا عرصہ گزر جاتا ہے تو پھر نسبتاً کم گہری یا پایاب نیند شروع ہوتی ہے۔

وہ سو رہے ہوتے ہیں لیکن ان کی آنکھیں حلقوں میں جنبش کرتی رہتی ہیں اوپر نیچے اور دائیں بائیں۔ اگرچہ ان کی پلکیں بند ہوتی ہیں۔

اس عمل کو Rem کا نام دیا گیا ہے۔ یعنی Rapideyes Movement۔ اور یہی وہ وقت ہوتا ہے جب انسان خواب دیکھتا ہے۔ اگر اس دوران اسے اٹھا دیا جائے تو ستر فی صد کو اپنے خواب یاد رہ جاتے ہیں۔

آپ نے سنا ہوگا کہ صبح کے خواب یاد رہ جاتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ بیدار ہونے سے پہلے ریم کا عمل تیز ہو جاتا ہے۔

اس کے بعد شروع ہوتے ہیں خوابوں کے مراحل۔ خوابوں سے پہلے نیند کے مراحل سے گزرنا ضروری تھا۔

خوابوں تک پہنچنا آسان نہیں ہے۔ آپ یہ دیکھیں کہ اس سے پہلے کیسے کیسے مراحل آئے ہیں۔ آرام دہ بستر، پُرسکون ذہن، ڈپریشن اور ٹینشن سے پاک وغیرہ۔

دام ہر موج میں ہے حلقہ صد کام نہنگ۔ دیکھیں کیا گزرے ہے قطرے پر گہر ہونے تک۔

ابھی ہم براہِ راست خوابوں تک نہیں جارہے۔ بلکہ ہم خوابوں کے سماجی، نفسیاتی، ادبی، جنسی اور مذہبی محرکات کا جائزہ لے رہے ہیں۔

خواب بینی کا عمل نیند کے طبعی عمل سے جڑا ہوا ہے۔ دنیا بھر کے ادب میں خوابوں کو بہت اہمیت دی گئی ہے۔

ادیب اور شاعر چونکہ بہت حساس ہوتے ہیں۔ اس لیے ان کے خوابوں میں زندگی کا ہر پہلو موجود ہوتا ہے۔ ان لوگوں نے خوابوں کے حوالے سے اپنے آپ کو اور زندگی کو سمجھنے کی بہت کوشش کی ہے۔

فانی کا مشہور شعر ہے۔ ''اک معما ہے سمجھنے کا نہ سمجھانے کا۔ زندگی کا ہے کو ہے خواب ہے دیوانے کا۔''

ایک تو زندگی اتنی الجھی ہوئی ہے۔ پھر خواب اور وہ بھی دیوانے کا خواب۔ شاعر کو مرادی اور کامیابی دونوں سے واسطہ پڑتا ہے۔ کچھ خواب اسے ماضی کی تلخیوں کی یاد دلاتے ہیں۔ وہ ایسے خوابوں کو اپنی یادداشت کی تجوری میں نہیں رکھنا چاہتا۔

جاں نثار اختر نے کہا تھا۔ ''اسی سبب سے شاید عذاب جھیلتے ہیں۔ جھٹک کے پھینک دو پلکوں پہ خواب جھیلتے ہیں۔''

خواب دل کش بھی ہوتے ہیں اور پریشان کرنے والے بھی۔ خوابوں میں دل کشی عام طور پر الیوژن یا فریب نظر کی وجہ سے آتی ہے۔

سگمنڈ فرائڈ کا ایک مشہور قصہ ہے لیکن اس جملے سے پہلے مومن کا ایک شعر سن لیں۔ اس کے بعد وہ جملہ سمجھ میں آجائے گا۔

وہ شعر ہے۔ ''وہ کہاں ساتھ سلاتے ہیں مجھے۔ خواب کیا کیا نظر آتے ہیں مجھے۔''

اور وہ جملہ یہ ہے کہ خواب ہماری ناآسودہ خواہشات کی تکمیل کا ذریعہ ہیں۔ میرا خیال ہے کہ اس جملے کے بعد مومن کا یہ شعر واضح ہوگیا ہوگا۔

اب یہ دیکھیں کہ شاعروں کے خواب کیسی کیسی ذہنی گرہیں کھولتے ہیں۔

مومن ہی کا شعر ہے۔ ''شب وہ جو سور ہے مرے پاس آکے خواب میں۔ جاگے تھے بختِ خفتہ تمنا کے خواب میں۔''

محبوب جورات کو شاعر کے پہلو میں آکر سوگیا تو شاعر کا نصیب جاگ اٹھا۔ یہاں فرائڈ کے اس اصول کا اطلاق ہوتا ہے کہ بعض خوابوں کے پیچھے آدمی کی نامکمل جنسی خواہش کی تکمیل کا جذبہ ہوتا ہے۔

اب دوسرا شعر دیکھیں۔ آنکھوں کو بند کر کے وہیں کھول دیں گرہیں۔ یوسف کناں کے محو تماشا کے خواب میں۔

محو خواب شخص کے دماغ کے سوائے ہوئے حصے میں کسی بھی قسم کی صورت نمودار ہوسکتی ہے۔ لیکن جس کو دیکھنے کی آرزو انسان کے لاشعور میں دبی ہو۔ وہ صرف اس کو دیکھنا پسند کرتا ہے کسی اور کا نظارہ اسے پسند نہیں ہے۔ چاہے وہ یوسف جیسا حسین و جمیل ہی کیوں نہ ہو۔

اب خواب کی ایک اور قسم۔ ''کابوس میں بتاتے مجھے راہ تو رشک ہے۔ کاش اور کوئی آئے اطبا کے خواب میں۔''

پہلے تو کابوس کو دیکھیں۔ کابوس ایک ایسا مرض ہے جس میں دماغ میں رطوبت کی کثرت کی وجہ سے آدمی خواب میں خوفناک مناظر دیکھتا ہے۔ پھر مختلف حرکتیں کرتا ہے اور ڈر جاتا ہے۔

تو شاعر کا یہ کہنا ہے کہ محبوب جب میرے خواب میں آتا ہے تو میری کیفیت عجیب ہوجاتی ہے اور حکیم حضرات یہ سمجھتے ہیں کہ میں کابوس کے مرض میں مبتلا ہوں۔ کاش میرے محبوب جیسا کوئی ان حکیموں کے خوابوں میں آئے تو انہیں پتا چل جائے۔

اب ایک خواب اور دیکھیں۔ ایک نرم و نازک اور کومل سی لڑکی کا خواب۔ جو اس بے رحم معاشرے میں جینے کے لیے خوابوں کا سہارا ڈھونڈ رہی ہے اور خواب اسے آسودہ کرتے رہتے ہیں۔

''دھنک دھنک مری پوروں کے عذاب کردے گا۔ وہ لمس میرے بدن کو گلاب کردے گا۔''

شیکسپیئر نے بھی خوابوں سے بہت کام لیا ہے۔ خواب اس کے یہاں ایک مستقل علامت کے طور پر ہیں۔ اس کے مشہور ڈرامے جولیس سیزر میں سیزر کی بیوی کے ایک خواب کا

ذکر ہے۔ جس میں اس نے اپنے شوہر کو قتل ہوتے دیکھ لیا تھا۔
خوابوں کی یہ ایک اور قسم ہے۔ جن میں آنے والے چند واقعات کا پتا چل جاتا ہے۔
نیوڈور دوستو وسکی کے مشہور ناول جرم و سزا کا ماحول بھی خوابوں سے گندھا گیا ہے۔
اس طرح اور لاتعداد کہانیاں ہیں جن میں خواب اپنی پوری توانائی اور جذبات کے ساتھ سامنے آتے ہیں۔
فراق صاحب کا ایک خوب صورت شعر یاد آ رہا ہے۔
''ستارے جاگتے ہیں رات لٹ چھٹکائے سوتی ہے۔ دبے پاؤں کس نے آ کے خوابِ زندگی بدلا''
یہ تھے خوابوں کے کچھ ادبی پہلو۔ ہم نے یہ دیکھا کہ شاعروں کے پاس نہ صرف خواب دیکھنے کی صلاحیت ہے بلکہ وہ اس کے مناسب اظہار کا قرینہ بھی جانتے ہیں۔
خوابوں کا ایک اور مفہوم ایک اور پہلو خواہش بھی ہے۔ تعمیری اور مثبت خواہش۔ جیسے علامہ اقبال نے خوابوں کو ایک زبردست قوتِ عمل اور جدوجہد سے تشبیہ دی ہے۔
''ایک ہوں مسلم حرم کی پاسبانی کے لیے۔ نیل کے ساحل سے لے کر تابہ خاک کاشغر''
تو یہ کیا ہے۔ ایک زبردست خواہش۔ علامہ اقبال کی نظمیں، والدہ محترمہ کی یاد میں، تاتاری کا خواب وغیرہ۔ یہ سب اعلیٰ ترین خوابوں کی اعلیٰ ترین مثالیں ہیں۔
علامہ اقبال بھی فرماتے ہیں۔ ''ہے دید کا جو شوق تو آنکھوں کو بند کر۔ ہے دیکھنا ہمیں کہ نہ دیکھا کرے کوئی۔''
میں خواہش اور تمنا کے حوالے سے ایک تقریر کا ذکر کرنا چاہوں گا۔ یہ تقریر اگست 1928ء میں جونیئر مارٹن لوتھر کنگ نے کی تھی۔ کہا جاتا ہے کہ اس کی یہ تقریر ادب کا شاہکار ہے۔ اس نے کہا تھا۔ ''میں خواب دیکھتا ہوں کہ کھیتوں میں کام کرنے والے سیاہ فام غلام کسان اپنے گورے آقاؤں کے ساتھ بیٹھ کر ایک ہی دسترخوان پر کھا رہے ہیں۔''
تو یہ اس کی خواہش تھی جس کو اس نے خواب کا نام دیا تھا۔ شاید مارٹن لوتھر کو معلوم نہیں تھا کہ اس قسم کا عملی مظاہرہ حضور اور ان کے ساتھیوں کے زمانوں میں ہو چکا ہے۔
ایک ہی صف میں کھڑے ہو گئے محمود و ایاز۔ نہ کوئی بندہ رہا نہ کوئی بندہ نواز۔
خوابوں کے حوالے سے ایک بات بہت اہم ہے کہ خواب مایوس نہیں ہونے دیتے۔ اُمیدوں کی شمعیں روشن رکھتے ہیں۔

غریب ترین شخص بھی خود کو بادشاہ بنا ہوا ضرور دیکھتا ہے۔ ایسے خواب اس کی ناآسودہ خواہشات کی تکمیل کر رہے ہیں۔
یہ اور بات ہے کہ بے داری کے بعد زندگی اور بھیانک اور دشوار محسوس ہو۔ آپ اندھیرے میں ماچس کی تیلی جلائیں، تیلی کے جلتے ہی اچانک ذرا سی دیر کے لیے روشنی کا ایک جھماکا سا ہوتا ہے اور تیلی کے بجھتے ہی اندھیرا اور گاڑھا ہو جاتا ہے۔
جس کا خوشی ہے نام وہ قیمت نہ پوچھیے۔ رقصِ شرر کے بعد کی ظلمت نہ پوچھیے۔
لیکن جیسے بھی خواب دیکھے ہیں، مایوس نہیں ہوتا ہے۔ یہ خواب ہی تو آگے بڑھنے کا شوق دلاتے رہیں گے۔
یاد رکھیں کہ ایک امکان جب ختم ہوتا ہے تو اس وقت فطرت دوسرے امکان کا دروازہ کھول دیتی ہے۔ سورج غروب ہوتا ہے تو زمین چاند کا جھومر اپنے ماتھے پر سجا لیتی ہے۔
بات خوابوں کی ہو رہی ہے تو خواب تو ہمیشہ کے لیے انسان کے لیے معمہ رہے ہیں۔ وہ ان کی گتھیاں سلجھانے کی کوشش کرتا رہا ہے اور جب نہیں سلجھ سکیں تو خوابوں کو ایک پُراسرار عمل سمجھ لیا گیا۔ ''ہم جسے چھو نہ سکیں اس کو خدا کہتے ہیں۔''
آئیے اب یہ دیکھتے ہیں کہ دنیا کی مختلف تہذیبوں نے خوابوں کو کیا سمجھا ہے۔
میسوپوٹامیہ کے نظریات۔ تاریخ سے دلچسپی رکھنے والے ہر شخص کو معلوم ہے کہ انسانی تاریخ میں میسوپوٹامیہ تہذیب کی ایک اہمیت رہی ہے۔
انسان کی جانی ہوئی تہذیبوں میں میسوپوٹامیہ کے لوگ کتنے ایڈوانس تھے اس کا اندازہ اس بات سے لگائیں کہ وہ لوگ قبل از مسیح میں خوابوں پر ریسرچ کیا کرتے تھے۔
ان کے خوابوں میں بھی جنسی تشبیہات ہوا کرتیں۔ جن کی وہ اپنے انداز سے تشریح کیا کرتے۔ مثال کے طور پر اگر ایک شخص نے خود کو دیوار پر پیشاب کرتے ہوئے اس پیشاب کو گزرگاہ پر پھیلتے ہوئے دیکھا ہے۔ تو اس سے یہ مراد لی جاتی تھی کہ اس کے کئی بچے ہوں گے۔
فرائڈ نے اڑنے والے خوابوں کو جنسی خوشی کا نمائندہ بتایا ہے۔ لیکن میسوپوٹامی تہذیب کے افراد ایسے خوابوں کو خوف یا موت کی علامت سمجھا کرتے تھے۔

ان کا عقیدہ تھا کہ خواب بدروحوں یا آسیبوں سے پیدا ہوتے ہیں۔ ان کی ایک دیوی ماسو ہوا کرتی جس سے وہ دعا کیا کرتے کہ ان کے خواب کبھی پورے نہ ہوں۔

بائبل میں بابل کے ایک بادشاہ کے خواب کا ذکر ہے۔ اس نے ایک زبردست تیزی سے پروان چڑھتے ہوئے ایک درخت کو دیکھا۔ پھر کسی نے اسے بددعا دی تو وہ سوکھ گیا۔

اس زمانے میں حضرت دانیال موجود تھے۔ وہ خوابوں کے مفسر کے طور پر مشہور تھے۔ انہوں نے بتایا کہ تمہارا خواب تمہاری دیوانگی کی علامت ہے۔

بائبل میں لکھا ہے کہ ایک سال بعد بادشاہ پاگل ہو کر مر گیا تھا۔

یہ خواب مشہور ماہر نفسیات یونگ کے اس نظریے کی تائید کرتا ہے کہ خواب اپنی ہی ذات کا عکس ہوتے ہیں۔ جس طرح درخت بادشاہ کے ذہن کی علامت تھا۔

مصریوں نے بھی خوابوں میں بہت دلچسپی لی تھی۔ ان کے یہاں خوابوں کے حوالے سے بہت تجسس تھا۔ وہ خوابوں کی جڑیں تلاش کرتے پھرتے تھے۔

Old tastament خوابوں کی کہانیوں سے بھرا ہوا ہے۔ ان میں سب سے زیادہ مشہور اس مشہور فرعون کا خواب ہے۔

اس نے سات موٹی اور تازی گائیں دیکھیں۔ پھر سات سوکھی اور بدصورت گائیں دیکھیں۔ جس کی تعبیر حضرت یوسف نے بتائی تھی کہ سات برسوں تک خوب غلہ ہوگا۔ اس کے بعد سات برسوں کے لیے قحط پڑ جائے گا۔

خواب کے لیے جو مصری لفظ آتا ہے اس کے معنی ہی جھکائے رکھنا۔ یہ لفظ بتاتا ہے کہ قدیم مصر کے لوگ خوابوں کو ایک ایسے عمل سے تعبیر کرتے تھے جس کی بدولت اندھیرے میں پوشیدہ چیزوں کو جاننا اور دیکھنا ممکن تھا۔

خواب کے پیغامات پر ان کا اتنا گہرا عقیدہ تھا کہ مندر کے برابر میں ایک کمرا ہوا کرتا۔ جس میں خوابوں کی تعبیر بتانے والے ہوا کرتے تھے۔ لوگ ان سے خوابوں کی تعبیر معلوم کیا کرتے اور وہ معاوضہ لے کر تعبیر بتا دیتے تھے۔

چینیوں اور ہندوستانیوں نے خوابوں کی تعبیر اور ان کی توجیہہ پر اتنی دسترس حاصل کر لی تھی کہ ان کے بہت سے نظریات آج درست سمجھے جا رہے ہیں۔

چینی ماہرین اس دور میں انسانی شعور کے درمیان فرق قائم کر چکے تھے۔ جب کہ مغربی ماہرینِ نفسیات اب شعور اور لاشعور کی راہ پر بھی نہیں آئیں گے۔ منزل تو بہت دور کی بات ہے۔

چینیوں نے خوابوں میں نظر آنے والی تنبیہات اور علامات پر کئی کتابیں لکھ ڈالی تھیں۔ ان میں آئی چنگ نامی کتاب سب سے زیادہ مشہور ہے اور آج مغرب میں اس کتاب پر ریسرچ ہو رہی ہے۔

چینی ماہرین نے تعبیر بتانے والوں اور خواب دیکھنے والوں کی جسمانی حالت ان کی ذہنی کیفیت کے علاوہ موسم کی حالت کو بھی مدِنظر رکھنا ہے۔ انہوں نے خوابوں کو کئی اقسام میں بانٹ دیا۔ یہ اقسام 500 قبل از مسیح کی ایک کتاب لیوزو میں درج ہیں۔

اب ایک اہم نظریہ بھی سن لیں۔

دیگر قدیم اقدام کی طرح چینی قوم کا ہی یہ نظریہ تھا اور یہ نظریہ آج بھی بہت سے لوگوں کا ہے۔ وہ نظریہ یہ تھا کہ نیند میں جسم کا ایک حصہ بھٹکتے رہنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ جس سے اس شخص کو خوابوں کا تجربہ ہوتا ہے۔ اس لیے سونے والے کو بہت احتیاط سے آہستہ آہستہ اٹھایا جائے۔ کیوں کہ اس وقت اس کی روح آسٹرل پروجیکشن میں بھٹک رہی ہوتی ہے۔

جسم کی مختلف حالتوں کو قدیم ہندوستانیوں نے بھی محسوس کیا۔ انہوں نے یہ آئیڈیا دیا کہ جسم کے چار افعال ہوتے ہیں۔

(1) جاگی ہوئی کیفیت (2) خواب دیکھتی ہوئی کیفیت (3) بے خواب نیند کی کیفیت اور ایک چوتھی پُراسرار حالت۔ وہ ہے بھگوان سے رابطے کی۔

ہندوستانی خوابوں کی ایک قدیم کتاب اتیروید بھی ہے۔ جو پندرہ سو سے ایک ہزار سال قبل مسیح سے تعلق رکھتی ہے۔ ان کا خیال تھا کہ خواب یوں ہی نہیں ہوتے۔ ان کا ایک موقع ہوا کرتا ہے۔"

ان کے یہاں خوابوں کی دو اقسام تھیں۔

1۔ عام قسم کے خواب جو روز مرہ کی زندگی اور مشاہدوں سے تعلق رکھتے تھے اور نمبر 2 ایسے خواب جن کی کشادہ رمزیت ہوا کرتی۔

فرائڈ نے بتایا تھا کہ تلوار، کلہاڑی یا جھنڈا وغیرہ جنسی علامات ہیں۔ جب کہ ان کا خیال تھا کہ یہ مسرت کی علامات ہیں۔

آسمان سے سورج یا چاند کا گر جانا یا سمندر اور پہاڑوں

کے خواب خطرے اور خوف سے تعبیر کیے جاتے تھے۔

یونان اور روم کا قدیم دنیا میں خوابوں کو آنے والے دنوں کے آنے والے واقعات سے تشبیہ دی جاتی تھی۔ ہومر نے اپنی مشہور داستان ایلیڈ میں بھی خوابوں کے حوالے سے بہت کچھ لکھا ہے۔ اس نے یہ بھی بتایا کہ خوابوں کے ذریعے مرض کی صحیح تشخیص کر کے مریض کا علاج بھی کیا جاسکتا ہے۔

ہپوکریٹس نے بھی خوابوں کے حوالے سے ایک کتاب لکھی ہے جو کلاسیکی عہد کی باقی رہ جانے والی چند کتابوں میں سے ایک ہے۔

یہ وہی ہپوکریٹس ہے جس کے نام کی قسم کھائی جاتی تھی۔ Hipo cratic oath اور عام طور پر ڈاکٹر حضرات یہ قسم کھاتے تھے۔

افلاطون نے تشریح خواب کا جو نظریہ پیش کیا اس کی تائید فرائڈ نے بھی کی۔ وہ کہتا تھا کہ رات کو ہمارے اندر ایک وحشی جانور دوڑتا پھرتا ہے جب کہ Reasan سویا ہوا ہوتا ہے۔

یہی وحشی جذبہ ہمارے اندر بیدار ہو کر ہمیں مختلف جرائم کی ترغیب دیتا ہے۔

قدیم دنیا کے خوابوں کے بارے میں سب سے پہلی تصنیف آرتمیدورس کی تھی۔ اس شخص کا تعلق دوسری صدی عہد سے تھا۔ یہ شخص ساری زندگی خوابوں کے بارے میں مواد جمع کرتا رہتا تھا۔

آرتمیدورس کی رائے اس حقیقت پر مبنی ہے کہ کئی خوابوں کی شبیہات جنسی عنصر کی حامل ہوتی ہیں۔

جیسے کھیت میں ہل چلانا، گھوڑا اور گاڑی وغیرہ۔ فرائڈ نے بھی اس کے کام اور تھیوریز کو آگے بڑھایا ہے۔

بہر حال جتنی تہذیبیں ہیں اتنے ہی نظریات ہیں۔

اب ہم آجاتے ہیں خوابوں کے اسلامی نظریات پر۔ دیکھتے ہیں قرآن اور احادیث سے ہمیں کیا رہنمائی ملتی ہے۔

کئی خوابوں کا ذکر قرآن میں بھی آیا ہے۔ جیسے حضرت ابراہیمؑ کا وہ خواب جو مسلسل تین راتوں تک آتا رہا کہ اپنی سب سے عزیز شے کی قربانی دو۔ ظاہر ہے کہ نبی کا خواب سچا ہوتا ہے۔ اس لیے انہوں نے حضرت اسماعیلؑ کی قربانی دینے کا فیصلہ کرلیا۔ پھر حضرت یوسفؑ کا وہ خواب جو انہوں نے اپنے بچپن میں دیکھا تھا کہ گیارہ ستارے اور چاند اور سورج ان کو سجدہ کررہے ہیں۔

انہوں نے جب اپنے والد حضرت یعقوبؑ سے اس خواب کا ذکر کیا تو انہوں نے بیٹے کو منع کردیا کہ تم اس خواب کا تذکرہ اپنے بھائیوں سے مت کرنا۔ خدا تمہیں نبوت دے گا اور خوابوں کی تفسیر کا علم بھی عطا فرمائے گا۔

پھر فرعون کا خواب۔ جس میں اس نے سات دبلی پتلی اور سات موٹی تازی گائیں دیکھیں اور اس خواب کی تعبیر حضرت یوسفؑ نے بیان فرمادی۔

اب ایک خواب حضرت عبداللہ بن مبارکؒ کا ہے۔ انہوں نے دیکھا کہ دو فرشتے ان کے کمرے میں بیٹھ کر کوئی حساب کتاب کررہے ہیں۔

ان میں سے ایک نے کہا کہ اس سال چھ لاکھ آدمی حج میں شریک ہوئے تھے۔ ان میں سے صرف ایک آدمی کا حج قبول ہوا ہے اور وہ فلاں شہر کے فلاں محلے میں رہتا ہے اور پیشے کے لحاظ سے موچی ہے۔ آپ اس کی تلاش میں نکل کھڑے ہوئے۔ وہ موچی ملا۔ اس نے بتایا کہ وہ تو حج پر جا ہی نہیں سکا تھا۔ صرف اتنا ہوا تھا کہ اس نے حج کے لیے ساری زندگی جو کچھ جمع کیا تھا وہ اپنے ایک پڑوسی کو دے دی کیوں کہ اس کے یہاں کئی دنوں سے فاقے تھے اور وہ مردار کھا رہے تھے۔

حضرت عبداللہ بن مبارکؒ نے اس کا ہاتھ چوم لیا اور فرمایا خدا کے بندے تیری یہی بات تو خدا کے حضور قبول ہوئی ہے۔ اور چھ لاکھ انسانوں میں سے اس سال صرف تجھ ہی کو حج کا ثواب ملا ہے۔

تو اس قسم کے خواب بھی ہوتے ہیں اور یہ خواب القایا الہام کا درجہ رکھتے ہیں اور عام طور پر کسی کو ایسے خواب اس وقت آتے ہیں جب روحانی طاقتیں اس شخص کو کسی عظیم الشان مرتبے کے لیے تیار کررہی ہوتی ہیں۔

یعنی ایسے خواب اس کی ذہنی ٹریننگ اور قدرت کی پلاننگ کی وجہ سے آتے ہیں۔

آنحضرتؐ کی حدیث مبارک ہے۔ ”آثار نبوت میں سے اب کوئی شے باقی نہیں رہی۔ سوائے بشارت کے۔“ صحابہؓ نے دریافت کیا۔ ”حضرت یہ بشارت کیا ہے؟“ تو آپؐ نے جواب دیا۔ ”سچے خواب جو مومن دیکھتا ہے۔“

اس لیے ایک موقع پر ارشاد فرمایا۔ ”مومن کا خواب نبوت کا چھیالیسواں حصہ ہوتا ہے۔“ آپؐ نے یہ بھی فرمایا کہ اپنے خواب یا تو کسی ہمدرد اور مخلص دوست کے سامنے بیان کردیا کسی دانا کے سامنے۔ یعنی ہر ایک سے اپنے خواب بیان نہ کیا کرو۔“

”آپؐ نے یہ بھی فرمایا کہ زیادہ سچا خواب صبح کے وقت کا ہوا کرتا ہے۔“

”پھر آپؐ نے برا خواب دیکھنے والے کے لیے نصیحت فرمائی... اگر ایسا خواب دیکھنے کے بعد آنکھ کھل جائے تو فوراً لاحول پڑھ کر تین دفعہ بائیں طرف تھتکار دے۔ اس کے بعد دوسری کروٹ پر سو جائے۔“

حضرت علیؓ کا ارشاد ہے کہ اگر مومن کوئی خواب دیکھے یا کوئی اور مومن کو خواب میں دیکھے تو اس کی تعبیر جان لینا اس شخص پر لازم ہے تاکہ نیک خواب سے خوشی حاصل ہو اور برے خواب سے امان میں رہے۔

حضرت عبداللہ بن عباسؓ نے فرمایا۔ ”خواب ایک حقیقت ہے۔ ایک خواب کے ذریعے حضورؐ کو نبوت کی بشارت اور جبرئیلؑ کی زیارت حاصل ہوئی تھی۔“

ابن خلدون نے کہا کہ جب نفسِ انسان جسمانی مصروفیات سے فارغ ہوتا ہے تو وہ روحانیت کی طرف مائل ہو جاتا ہے۔ اس موقع پر خواب میں جو صورت حال پیش آتی ہے وہی رویائے صادقہ ہے۔

ان ہی کا کہنا ہے کہ تمام انسانوں اور انبیاء کے خوابوں میں فرق کی وجہ انبیاء کی روحانی صلاحیت ہے۔

ایک اور خواب کا ذکر سن لیں۔ خلیفہ مہدی کو خواب آیا کہ اس کے پورے چہرے پر سیاہی پھیل گئی ہے۔ اس کی تعبیر کوئی نہ بتا سکا۔ حضرت ابراہیم کرمانی نے تعبیر بیان فرمائی کہ خلیفہ کے یہاں لڑکی پیدا ہوگی۔

اس تعبیر کی تاویل انہوں نے قرآن کی آیت سے دی تھی۔ جس کا مفہوم یہ ہے کہ ”خواب میں بھی جب ان لوگوں کو لڑکی پیدا ہونے کی خوش خبری دی جاتی ہے تو ان کے چہرے پر غم کی سیاہی پھیل جاتی ہے۔“

سبحان اللہ، کیا لوگ تھے۔ بعد میں یہ خواب سچ ثابت ہوا تھا۔

خوابوں پر موسم، وقت، ماحول، صاحب خواب کی ذاتی زندگی، اس کے کردار، چاند کی تاریخوں وغیرہ کا بھی اثر ہوتا ہے۔

اس کے علاوہ خواب دیکھنے والے کی ذہنی کیفیت بھی دیکھی جاتی ہے۔ اس کے علاوہ یہ بھی دیکھا جاتا ہے کہ رات کے وقت صاحبِ خواب نے کیا کھایا تھا۔

مثال کے طور پر اگر کوئی شخص سانپ، بچھو یا کسی سیاہ چیز کو دیکھ کر ڈر جائے تو اس کا مطلب ہے کہ اس نے رات کے وقت کوئی ثقیل چیز کھائی تھی جو ہضم نہیں ہو سکی۔

اس لیے خواب کی تعبیر بتانے والے کو ان سب باتوں کا جاننا ضروری ہے اور اس لیے تاکید فرمائی گئی ہے کہ اپنے خواب ہر ایک سے بیان نہ کرو۔

اب یہ دیکھیں کہ مختلف اوقات کا خوابوں پر کیا اثر ہوتا ہے۔

کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ رات کے خواب کی تعبیر کچھ اور ہوتی ہے اور دن کے اسی خواب کی تعبیر کچھ اور ہوتی ہے۔

دن کا خواب رات کے خواب پر فضیلت رکھتا ہے۔

رات کے پہلے حصے کے خواب غیر معتبر (کیونکہ اس وقت وہ شخص اصفا لہروں کے تابع ہوتا ہے) اور نصف شب کے خواب پریشان کن اور صبح کے وقت جو خواب آئے وہ بڑی حد تک قابلِ اعتبار ہوتے ہیں۔

عام طور پر گہری رات کے خواب کی تعبیر پانچ سال بعد، آدھی رات کے خواب کی تعبیر چھ ماہ بعد اور صبح کے خواب کی تعبیر ایک ماہ میں سامنے آ جاتی ہے۔

اس کے علاوہ جو خواب چاند کی 6 تاریخ سے لے کر 16 تاریخ تک دیکھے جائیں وہ عام طور پر سچ ثابت ہوتے ہیں۔

اتنا ہی نہیں بلکہ ستاروں کی چال کے اثرات بھی خوابوں پر ہوتے ہیں کہ صاحبِ خواب نے کس رات خواب دیکھا۔ اس رات کون سا ستارہ کس برج میں تھا۔

علمِ تعبیر کی بہت بڑی فضیلت ہے۔ یہ پیغمبروں کا علم ہے۔ سورۂ یوسف میں ارشاد ہے کہ ”اس طرح ہم نے یوسف کو اس ملک میں سلطنت عطا فرمائی اور اس کو علمِ تعبیر سکھایا۔“

حضورؐ نے واقعہ معراج کے بعد ایک خواب دیکھا جس کا ذکر قرآن میں کچھ یوں ہے۔ ”کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول کے خواب کو سچ کر دکھایا۔“

تعبیرِ خواب ایک بہت بڑا علم، بہت بڑا فن ہے۔ میں اس وقت فرائڈ، یونگ اور ایڈلر وغیرہ کے حوالے سے بات نہیں کر رہا بلکہ اسلامی تاریخ سے چند نام پیش کر رہا ہوں جو اس فن کے ماہرین تھے۔

حضرت دانیالؑ، حضرت یوسفؑ، حضرت امام جعفر صادقؒ، حضرت محمد ابراہیم کرمانیؒ، حضرت محمد ابنِ سیرینؒ، حضرت اسماعیل بن اشف، امام ابن تیمیہ وغیرہ۔

اور اس فن کی کچھ کتابوں کے نام سن لیں۔

کتاب اصول، کتاب تفہیم، کتاب التعبیر اور ابنِ سیرین کی لاجواب تصنیف کتاب التعبیر وغیرہ۔

اکتوبر کی شخصیات

صائمہ اقبال

عیسوی کلینڈر کے اس دسویں مہینے سے جڑی ان اہم شخصیات کا مختصر مختصر سا تذکرہ جنہوں نے کارہائے نمایاں انجام دیے۔ جن کا تذکرہ دلچسپی سے خالی نہیں اور یہ تذکرہ صرف اس لیے دیا جارہا ہے تاکہ معلومات حاصل کرکے شائقین کی تشنگی دور ہو سکے۔

جلال الدین محمد اکبر

وہ ہندوستانی تاریخ کے عظیم ترین شہنشاہوں میں سے ایک تھا۔ ایک کرشماتی شخصیت۔ مغل حکومت کو جو قوت اس کے دور میں نصیب ہوئی، اس کی مثال نہیں ملتی۔

سلطنت مغلیہ کا یہ تیسرا فرماں روا جلال الدین محمد اکبر ہمایوں کا بیٹا تھا۔ ہمایوں نے اپنی جلاوطنی کے زمانے میں ایک ایرانی خاتون حمیدہ بانو سے شادی کی تھی۔ اکبر اُسی کے بطن سے 15 اکتوبر 1542ء کو عمر کوٹ میں پیدا ہوا۔

ہمایوں کی وفات کے وقت اکبر کی عمر چودہ برس تھی اور وہ اپنے اتالیق بیرم خان کے ساتھ سکندر سوری کے تعاقب میں تھا۔ باپ کی موت کی خبر اُسے کلانور ضلع گرداسپور کے مقام پر ملی۔ بیرم خان نے وہیں اکبر کی رسم تخت نشینی ادا کی اور خود اس کا سرپرست بنا۔

نئے بادشاہ کو کئی چیلنجز کا سامنا تھا۔ اُسے اپنے دادا شہنشاہ بابر کا مقام حاصل کرنا تھا۔ جو صلے بلند تھے۔ اس نے پانی پت کا معرکہ سر کیا۔ مشرق میں عادل شاہ سوری کے قدم اکھڑ گئے۔ دھیرے دھیرے سلطنت پھیلنے لگی۔

آگے کی کہانی حیرت ناک ہے۔ اپنے اتالیق کے مشوروں پر عمل کرتے [illegible] وہ تیزی سے آگے بڑھتا۔ 1556ء تک وہ دلی [illegible] پنجاب، [illegible] اجمیر اور جون پور سر کر چکا تھا۔ 1562ء میں مالوہ بھی اس کی سلطنت کا حصہ بن گیا۔ چتوڑ، گجرات بنگال بھی زیر تسلط [illegible] اس کی سلطنت [illegible] کابل، کشمیر، [illegible] اڑیسہ، احمد نگر کے علاقے شامل تھے۔ بنگال سے افغانستان تک اور کشمیر سے دکن تک پھیلی اکبر کی سلطنت طاقت کی انوکھی مثال تھی۔

گو وہ ناخواندہ تھا، جنگوں نے پڑھنے کا موقع فراہم نہیں کیا مگر قدرت نے اسے بلا کی ذہانت عطا کی تھی۔ ابوالفضل، فیضی، بیربل جیسے عالم اس کے دربار کا حصہ تھے جن کی صحبت نے اس کی ذہنی صلاحیتوں کو مزید جلا بخشی۔ وہ سیاسی طور پر انتہائی بالغ تھا۔ اسے اندازہ تھا کہ اکثریت پر اس کی مرضی کے بغیر زیادہ عرصے حکومت نہیں کی جاسکتی۔ اس نے

ہندوؤں کی تالیفِ قلب کی خاطر انہیں مراعات دیں، رشتے قائم کیے۔ اکبر کی جودھا بائی سے شادی بھی اسی پالیسی کا حصہ تھی جس سے اس کا بیٹا جہانگیر ہوا۔

کچھ مؤرخین اکبر کی روشن خیالی کو تنقید کا نشانہ بناتے ہیں۔ سیاسی افہام وتفہیم کے لیے وہ ایک ایسی راہ پر چل پڑا تھا جس نے اُسے دینِ الٰہی کے نام سے ایک نیا مذہب ایجاد کرنے پر مجبور کر دیا۔ یہ انتہا پسندانہ اقدام اکبر کے ہندو رتنوں کی مسلسل کوششوں کا نتیجہ تھا۔ دینِ الٰہی کی وجہ سے وہ مسلمان علماء کی نظروں میں ناپسندیدہ قرار پایا۔

اکبر ناخواندہ ضرور تھا مگر اس کے گرد عالموں کا ہجوم ہوتا۔ اسے بہترین سالار میسر تھے جن کی بدولت اُس نے پچاس سال بڑی شان و شوکت سے حکومت کی اور اپنے جانشینوں کے لیے ایک عظیم سلطنت چھوڑ گیا۔ اکبر کا 27 اکتوبر 1605ء کو انتقال ہوا۔

ہمارے ہاں اکبر کے بیٹے جہانگیر (سلیم) اور انارکلی کے عشق کی کہانی بے حد مشہور ہے۔ چند مؤرخین کا خیال ہے کہ اس قصے کا حقیقت سے کوئی تعلق نہیں۔

لیاقت علی خان

تحریکِ پاکستان کے عظیم قائد نواب زادہ لیاقت علی خان کو بلا مبالغہ فخرِ پاکستان کہا جاسکتا ہے۔ انہوں نے اس جدوجہد کو کامیابی سے ہم کنار کرنے میں کلیدی کردار ادا کیا اور پاکستان کے پہلے وزیر اعظم کی حیثیت سے خدمات انجام دیں۔

لیاقت علی خان 2 اکتوبر 1895ء کو ہندوستان کے علاقے کرنال میں پیدا ہوئے۔ وہ نواب رستم علی خان کی دوسری اولاد تھے۔ دینی تعلیم گھر سے حاصل کی۔ 1918ء میں ایم اے او کالج علی گڑھ سے گریجویشن کیا۔ 1918ء ہی میں اُن کی جہانگیر بیگم سے شادی ہوئی پھر وہ برطانیہ چلے گئے۔ انہوں نے آکسفورڈ یونیورسٹی سے قانون کی ڈگری حاصل کی۔

1923ء میں ہندوستان لوٹ کر انہوں نے مسلم لیگ میں شمولیت اختیار کر لی۔ 1924ء میں قائد اعظم کی زیرِ قیادت مسلم لیگ کا لاہور میں اہم اجلاس ہوا، جس کا مقصد مسلم لیگ کو دوبارہ منظم کرنا تھا۔ لیاقت علی خان نے اس اجلاس میں بھی شرکت کی اور ان کا شمار اہم رہنماؤں میں ہونے لگا۔ 1926ء میں وہ اترپردیش سے قانون ساز اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے۔ 1936ء میں وہ مسلم لیگ کے سیکرٹری جنرل ہو گئے۔

1940ء میں مرکزی قانون ساز اسمبلی کے رکن منتخب ہونے تک وہ یوپی کی اسمبلی کے رکن رہے۔ انہیں قائد اعظم کا دستِ راست تصور کیا جانے لگا۔

1932ء میں انہوں نے دوسری شادی کی۔ بیگم رعنا لیاقت علی ایک ماہرِ تعلیم اور معیشت داں تھیں۔ وہ لیاقت علی خان کی سیاسی زندگی میں بہترین معاون ثابت ہوئیں اور تحریکِ پاکستان میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ 1946ء میں وہ مشترکہ ہندوستان کے فنانس منسٹر ہو گئے۔ ان کے تیار کردہ بجٹ کو ماہرینِ معیشت ایک کارنامہ قرار دیتے ہیں۔ بٹوارے کے بعد انہوں نے پاکستان کے پہلے وزیر اعظم کی حیثیت سے حلف اٹھایا۔ وہ پاکستان کے پہلے وزیرِ دفاع بھی تھے۔ تقسیم کے بعد کشمیر اور کامن ویلتھ جیسی اہم وزارتیں ان کے پاس رہیں۔

انہیں سوویت یونین نے دورے کی دعوت دی تھی مگر لیاقت علی خان اور ان کی کابینہ نے امریکا سے ہاتھ ملانے کا فیصلہ کیا۔ اس دورے نے اس خطے پر گہرے اثرات مرتب کیے۔

16 اکتوبر 1951ء کی خونیں شام راولپنڈی کے جلسے میں سید اکبر نامی ایک افغانی باشندے نے گولی مار کر اس عظیم شخص کو شہید کر دیا۔ مرتے وقت لیاقت علی خان کی زبان پر ''اللہ۔ پاکستان'' کے الفاظ تھے۔ حملہ آور کو موقع ہی پر قتل کر دیا گیا۔

اس واقعے پر پوری قوم غم و غصے سے بھر گئی۔ اس کیس نے ایک معمے کی شکل اختیار کر لی۔ اَن گنت سوالات اٹھائے گئے۔ لوگوں نے اسے ایک سازش قرار دیا۔ اہم ترین سوال یہ تھا کہ اس جلسے میں پنجاب کے وزیر اعلیٰ ممتاز دولتانہ، مسلم لیگ کے سیکریٹری جنرل یوسف خٹک، آئی جی پولیس قربان علی خان کی عدم موجودگی کے کیا اسباب تھے۔

جلسہ گاہ میں فرائضِ منصبی پر مامور پولیس کا اعلیٰ ترین عہدے دار راولپنڈی کا ایس پی نجف خان تھا۔ کچھ رپورٹس کے مطابق گولی کی آواز سنتے ہی نجف خان نے پشتو میں چلّا کر

کہا ”اسے ماردو!“

سید اکبر کو ہلاک کرنے والا انسپکٹر محمد شاہ بھی پشتون تھا۔ پنڈی کے جلسے میں ایس پی کا پشتو میں حکم دینا ایک مشکوک فعل تھا، خصوصاً اس وقت جب قاتل کو زندہ گرفتار کرنا ضروری ہو۔ واضح رہے کہ سادہ لباس پولیس اہل کاروں نے سید اکبر کو قابو کرلیا تھا مگر انسپکٹر شاہ محمد نے اس پر ایک دو نہیں، پوری پانچ گولیاں چلائیں۔

لیاقت علی کے صاحبزادے اکبر لیاقت علی کا بھی یہی مؤقف تھا کہ سید اکبر کو خواہ مخواہ نشانہ بنایا گیا، اصل قاتل کوئی اور تھا۔ یہ بھی کہا گیا کہ لیاقت علی خاں کو گولی سامنے سے نہیں، عقب سے ماری گئی تھی۔ واضح رہے کہ جلسے میں کسی زخمی کو اسپتال لے جانے کے لیے ایمبولنس تک موجود نہیں تھی۔ اوپر سے پولیس نے ہوائی فائرنگ شروع کردی۔

تفتیش کے خاطر خواہ نتائج نہیں نکلے۔ عام رائے ہے کہ یہ قتل امریکی اور افغان خفیہ ایجنسیوں کی ملی بھگت کا نتیجہ تھا جس میں پاکستانی انتظامیہ کے بعض لوگ بھی شامل تھے۔

خواجہ ناظم الدین

خواجہ ناظم الدین کا شمار تحریک پاکستان کے مرکزی قائدین میں ہوتا ہے۔ قائداعظم کی وفات کے بعد انہیں گورنر جنرل چنا گیا۔ لیاقت علی خان کی شہادت کے بعد انہوں نے پاکستان کے دوسرے وزیراعظم کے طور پر حلف اٹھایا۔

انہوں نے 19 جولائی 1894ء کو نوابین ڈھاکا کے خاندان میں آنکھ کھولی۔ ابتدائی تعلیم برطانیہ سے حاصل کی۔ وہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے فارغ التحصیل تھے۔ بنگال سے سیاسی سفر کا آغاز کیا۔ جلد ہی ان کا شمار اہم سیاست دانوں میں ہونے لگا۔

1922ء میں ڈھاکا میونسپل کمیٹی کے صدر بنے۔ 1929ء وزیر تعلیم کا عہدہ سنبھالا۔ 1935ء میں بنگال کے وزیراعظم کا منصب سنبھالا۔ اس خطے میں انہوں نے مسلم لیگ کے لیے گراں قدر خدمات انجام دیں۔ 1943ء میں بنگال میں مسلم لیگی حکومت قائم کی۔ وہ آل انڈیا مسلم لیگ کی مجلس عاملہ کے صدر رہے۔ 1946ء میں اقوام متحدہ کے جنیوا میں ہونے والے اہم ترین اجلاس میں ہندوستان کی نمائندگی کی۔ کلکتہ سے ایک اخبار جاری کیا۔ کلکتہ میں مسلم ایوان تجارت قائم کیا۔ قیام پاکستان کے بعد وہ مشرقی پاکستان کے پہلے وزیراعلیٰ بنے۔ گورنر جنرل رہے۔ حلف لینے کے بعد 1953ء تک وزیراعظم کے عہدے پر فائز رہے۔

ان کے دور میں خارجہ پالیسی میں واضح تبدیلی نظر آئی۔ پالیسی کا اہم ترین نکتہ اسلامی ممالک کی حمایت اور ان کا اتحاد تھا۔ انڈونیشیا کے ساتھ خوشگوار تعلقات استوار ہوئے۔ البتہ سویز جنگ میں ان کا مؤقف مصر کے بجائے برطانیہ کی حمایت کرتا تھا۔

اُن کے دور میں پیدا ہونے والے گندم کے بحران کی وجہ سے انہیں کڑی تنقید کا نشانہ بنایا گیا۔ انہیں دستور سازی اور قانون ساز مجلس میں مشرقی و مغربی پاکستان کی برابر نمائندگی جیسے چیلنج درپیش تھے۔ ان ہی کے دور میں مشرقی پاکستان میں اردو کو قومی زبان بنانے پر فسادات ہوئے۔ ڈھاکا یونیورسٹی میں ہڑتال کی گئی۔ وہ سازشوں اور موقع پرستی کا بھی شکار ہوئے۔ گورنر جنرل ملک غلام محمد نے ان کی شرافت کا فائدہ اٹھاتے ہوئے انہیں وزارتِ عظمیٰ کے منصب سے برطرف کردیا۔ اس غیر قانونی اقدام کے خلاف انہیں اپنے مسلم لیگی رفقاء کی سرد مہری کا دلی صدمہ تھا۔ انہوں نے گوشہ نشینی اختیار کرلی۔ ایوب خان کی جانب سے انہیں کنونشن مسلم لیگ کی صدارت پیش کی گئی مگر آپ نے مادر ملت کے کہنے پر مسلم لیگ کو ازسرنو منظم کرنا اہم سمجھا۔ دسمبر 1962ء میں وہ لاہور تشریف لائے تو ان کا فقیدالمثال استقبال ہوا۔ مادر ملت کی صدارتی مہم میں انہوں نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ ان کے ہمراہ مشرقی اور مغربی پاکستان کے دورے کیے۔ اسی مہم کے دوران 22 اکتوبر 1964ء کو ڈھاکا میں ان کا انتقال ہوا۔

محمد علی بوگرہ

پاکستان کے تیسرے وزیراعظم محمد علی بوگرہ کا شمار صوبہ بنگال کے اہم مسلم سیاست دانوں میں ہوتا ہے۔ تحریک آزادی میں ان کا کردار نمایاں رہا۔ سفارت کاری کے میدان میں بھی اُنہوں نے گراں قدر خدمات انجام دیں۔

وہ 19 اکتوبر 1909ء کو باریسال میں نواب زادہ الطاف علی کے گھر پیدا ہوئے۔ ان کے دادا سید نواب علی

چوہدری ڈھاکا یونیورسٹی کے بانیوں میں شمار ہوتے ہیں۔ وہ بوگرہ میں پلے بڑھے۔ انہوں نے کلکتہ کے پریزیڈنسی کالج سے تعلیم حاصل کی۔ 1937ء میں انہوں نے مسلم لیگ کے پلیٹ فورم سے بوگرہ سے الیکشن لڑا اور بنگال کی قانون ساز اسمبلی کے رکن بنے۔ مسلم لیگ کو ایک سیاسی قوت بنانے میں ان کا کردار اہم رہا۔ 1946ء میں وہ سہروردی کی کابینہ میں وزیر رہے۔ انہوں نے ڈھاکا میڈیکل کالج اور کلکتہ لیک میڈیکل کالج کی بنیاد رکھی۔

پاکستان بننے کے بعد انہوں نے اردو کو اکلوتی قومی زبان قرار دینے کی مخالفت کی تھی۔ گو اس وقت اُن پر کڑی تنقید ہوئی مگر بعد کے حالات نے ان کے اندیشوں کو درست ثابت کیا۔ انہوں نے برما، کینیڈا اور امریکا میں سفیر کی حیثیت سے خدمات انجام دیں۔

1953ء میں انہوں نے وزیراعظم کا حلف اٹھایا۔ اس زمانے میں غلام محمد بطور گورنر جنرل طاقت کا مرکز تھے اور سازشیں شروع ہوچکی تھیں۔ اُن کے اور نہرو کے درمیان ہونے والے مذاکرات عالمی میڈیا کی توجہ کا مرکز رہے۔ آئین سازی کی کوششیں بھی قابلِ قدر تھیں۔ اس ضمن میں اُن کا بوگرہ فارمولا خصوصی اہمیت کا حامل تھا۔ انہوں نے وفاقی پارلیمانی نظام اختیار کرنے کی تجویز پیش کی۔ عوام کی جانب سے اسے سراہا گیا مگر گورنر جنرل غلام محمد نے 1954ء میں اسمبلی تحلیل کر دی۔ اسکندر مرزا نے ان کی جگہ سنبھال لی۔ شدید دباؤ پر انہیں استعفیٰ دینا پڑا۔

انہیں ایک بار پھر امریکا میں سفیر مقرر کیا گیا۔ وہ ایوب کابینہ میں وزیر خارجہ رہے۔ 1963ء میں ان کا انتقال ہوا۔ انہیں مشرقی پاکستان (موجودہ بنگلادیش) کے بوگرہ پیلس میں دفنایا گیا۔

غلام اسحاق خان

پاکستانی تاریخ کے بااثر ترین افراد کی فہرست بنائی جائے تو اُس میں 22 فروری 1915ء کو پیدا ہونے والے غلام اسحاق خان بنگش کا نام بھی شامل ہوگا۔ پاکستان کے اس سابق صدر نے سیاست میں آمد سے قبل بیوروکریسی میں اہم عہدے سنبھالے۔

وہ ضلع بنوں کے گاؤں اسماعیل خیل میں پیدا ہوئے۔ پشاور سے گریجویشن کرنے کے بعد انڈین سول سروس میں شمولیت اختیار کی۔ صوبہ سرحد میں وزیراعلیٰ کے سیکرٹری اور ہوم سیکرٹری رہے۔ قیام پاکستان کے بعد سیکرٹری اطلاعات مقرر ہوئے۔ ون یونٹ کے زمانے میں مغربی پاکستان کے سیکریٹری آبپاشی کے عہدے پر کام کیا۔ واپڈا کے سربراہ کی حیثیت سے مصروف رہے۔ چھ برس سیکریٹری خزانہ رہے۔ وہ ایک بااختیار سیکریٹری تھے۔ 20 دسمبر 1971ء کی جس تصویر میں یحییٰ خان ذوالفقار علی بھٹو کو اقتدار منتقل کر رہے ہیں، اس تصویر میں تیسرے آدمی غلام اسحاق خان ہیں جو اقتدار منتقلی کی دستاویز پر دستخط کروا رہے ہیں۔ بھٹو دور میں وہ گورنر اسٹیٹ بینک رہے۔ سیکریٹری جنرل برائے دفاع کا قلمدان ان کے پاس تھا۔ اس حیثیت میں وہ پاکستان کے جوہری پروگرام کے نگراں رہے۔ مارشل لا نے ان کے سیاسی سفر پر کسی قسم کے اثرات مرتب نہیں کیے۔ پہلے مشیر خزانہ، پھر وزیرِ خزانہ بنائے گئے۔ اسی زمانے میں انہیں ستارۂ پاکستان اور ہلال پاکستان کے اعزازات سے نوازا گیا۔ 1984ء میں انہیں سینیٹ کا چیئرمین بنایا گیا۔ 17 اگست 1988ء کو ضیا الحق کا طیارہ تباہ ہونے کے بعد عام انتخابات میں پیپلز پارٹی اکثریتی جماعت کے طور پر ابھری۔ پی پی پی اور آئی جے آئی کی مشترکہ حمایت سے غلام اسحاق خان دسمبر 1988ء میں پاکستان کے ساتویں صدر منتخب ہو گئے۔ آٹھویں آئینی ترمیم کے تحت وہ ایک بااختیار صدر تھے۔ بے نظیر بھٹو اور میاں نواز شریف سے ان کے شدید اختلافات رہے۔ پہلے بے نظیر بھٹو اور پھر نواز شریف حکومت اٹھاون ٹو بی کا شکار ہوگئیں۔

سپریم کورٹ نے 1988ء اور 1990ء میں تو صدر کی جانب سے حکومت کی برطرفی کو غیر آئینی قرار نہیں دیا، البتہ

شریف حکومت کی برطرفی کو غیر آئینی قرار دیتے ہوئے مئی 1993ء میں اس کی بحالی کا حکم جاری کر دیا۔ اس کے نتیجے میں ڈیڈلاک ہوگیا۔ آخر بری فوج کے سربراہ جنرل عبدالوحید کاکڑ درمیان میں آئے۔ یوں وزیر اعظم اور صدر دونوں ہی کو گھر جانا پڑا۔

غلام اسحاق خان ایک محنتی آدمی تھے جن کے کیریر پر کرپشن کا کوئی داغ نہیں، البتہ سیاست میں حصہ لینے والے ان کے دامادوں پر کرپشن کے الزامات لگے۔ صدارت کے منصب سے الگ ہونے کے بعد وہ پشاور میں رہے۔ 27 اکتوبر 2006 کو نمونیا کے حملے سے ان کا انتقال ہوا۔

نصرت بھٹو

70 کی دہائی میں جن خواتین نے پاکستانی سیاست میں کلیدی کردار ادا کیا، ان میں بیگم نصرت بھٹو کا نام سرفہرست ہے۔

23 مارچ 1929ء کو اصفہان میں پیدا ہونے والی نصرت بھٹو پاکستان پیپلز پارٹی کے بانی چیئرمین ذوالفقار علی بھٹو کی دوسری بیگم تھیں۔

انہوں نے ایک متمول گھرانے میں آنکھ کھولی۔ Humanities کے مضمون میں اصفہان یونیورسٹی سے گریجویشن کیا۔ کراچی میں ذوالفقار علی بھٹو سے پہلی ملاقات ہوئی۔ ستمبر 1951ء میں وہ رشتۂ ازدواج میں بندھ گئے۔ بھٹو صاحب سے ان کے چار بچے (بینظیر بھٹو، مرتضیٰ بھٹو، شاہنواز بھٹو، صنم بھٹو) ہوئے۔ خاتون اوّل کی حیثیت سے ان کا کردار نمایاں رہا، تاہم بھٹو صاحب کی گرفتاری کے بعد ان کے سیاسی سفر کا حقیقی معنوں میں آغاز ہوا۔ مارشل لا کے سخت ترین زمانے میں اُنھوں نے پیپلز پارٹی کی قیادت کی اور بحالی جمہوریت کی تحاریک میں کلیدی کردار ادا کیا۔ اس دور میں قید و بند کی صعوبتیں سہیں۔ کبھی گھر میں نظر بند، کبھی جیل یاترا۔ قذافی اسٹیڈیم میں ان پر پولیس اہل کاروں نے تشدد کیا۔ 1982ء میں طبی بنیادوں پر انہیں بیرونِ ملک جانے کی اجازت دی گئی۔ بعد میں بے نظیر بھٹو نے پارٹی کی قیادت سنبھالی۔ بعض تجزیہ کار اس واقعے کو پی پی پی کی نظریاتی سیاست میں تبدیلی کا اوّلین اشارہ گردانتے ہیں۔

آنے والے برسوں میں وہ دو بار رکن قومی اسمبلی منتخب ہوئیں۔ وہ کیبنٹ منسٹر اور ڈپٹی پرائم منسٹر رہیں۔ مرتضیٰ بھٹو کی سیاست میں آمد کے بعد وہ ایک نئے روپ میں نظر آئیں۔ انہوں نے اپنے بیٹے کا ساتھ دیا۔ مرتضیٰ بھٹو کے قتل نے ان پر گہرے اثرات مرتب کیے۔ چند حلقوں کے مطابق یہی سانحہ ان کے ذہنی توازن بگڑنے کا سبب بنا۔ اپنی زندگی کے آخری چند برس وہ اپنی بیٹی کے ساتھ رہیں۔ 23 اکتوبر 2011ء کو ان کا دبئی میں انتقال ہوا۔

فاروق احمد خان لغاری

سیاست فاروق لغاری کی گھٹی میں تھی۔ وہ خداداد صلاحیتوں کے مالک تھے۔ وہ 29 مئی 1940ء کو جنوبی پنجاب کے ضلع ڈیرہ غازی خان کے نواحی علاقے چوٹی زیریں کے ایک زمیندار گھرانے میں پیدا ہوئے، جو علاقائی سیاست میں نمایاں مقام کا حامل تھا۔ لاہور سے گریجویشن کرنے کے بعد انہوں نے برطانیہ کا رخ کیا۔ آکسفورڈ یونیورسٹی میں زیر تعلیم رہے۔ وطن لوٹ کر سول سروس کا حصہ بن گئے۔ والد کی وفات کے بعد سول سروس سے علیحدہ ہوگئے اور پیپلز پارٹی میں شمولیت اختیار کی۔ سیاسی مراحل تیزی سے طے کیے۔ ذوالفقار علی بھٹو کے دورِ حکومت میں وہ سینیٹ کے رکن بنے۔ پھر پیداوار کی وزارت کا قلم دان سنبھالا۔ 1988ء میں وہ پنجاب کی وزارت اعلیٰ کے مضبوط امیدوار تھے مگر پی پی وہاں حکومت قائم نہیں کر سکی تو انہوں نے وفاقی کابینہ میں بجلی کے وزیر کا عہدہ سنبھالا۔ 1990ء میں پیپلز پارٹی کے ڈپٹی پارلیمانی لیڈر رہے۔ نگراں حکومت میں وزیر خزانہ بھی رہے۔

1993ء میں رکن قومی اسمبلی منتخب ہونے کے بعد وزیر خارجہ کا منصب سنبھالا۔ صدارتی انتخابات میں انہوں نے وسیم سجاد کو شکست دی۔ کچھ عرصے بعد ان کے اور

بینظیر بھٹو کے درمیان اختلافات پیدا ہوگئے۔ نومبر 1996ء میں انہوں نے 58 ٹو بی کے ذریعے اسمبلیاں تحلیل کردیں۔ پی پی رہنما ملک معراج خالد نگراں وزیراعظم بنے۔ اسی دور میں احتساب آرڈیننس نامی قانون متعارف کرایا تھا جو بعد میں نواز شریف کے دور میں احتساب ایکٹ کہلایا۔ پرویز مشرف نے اس قانون کو نیب یعنی قومی احتساب بیورو کا نام دیا۔

اس آرڈیننس کی وجہ سے وہ تنقید کی زد میں رہے۔ 1997ء میں میاں صاحب نے وزیراعظم بننے کے بعد صدر سے اسمبلی توڑنے اور فوجی سربراہان کی تقرری کا اختیار واپس لینے کا فیصلہ کیا۔ اس ترمیم کی حزب اختلاف کی قائد بینظیر بھٹو نے بھی مکمل حمایت کی۔ حالات اس نہج پر پہنچ گئے کہ انہیں استعفیٰ دینا پڑا۔ کچھ عرصہ بعد انہوں نے ملت پارٹی کی بنیاد رکھی۔ چند برس بعد اسے ق لیگ میں ضم کردیا۔ 2008ء میں وہ رکن قومی اسمبلی منتخب ہوئے مگر اب وہ بیماریوں میں گھرے ہوئے تھے۔ 20 اکتوبر 2010ء کو ان کا انتقال ہوگیا۔

حکیم سعید

پاک و ہند میں حکمت سے وابستہ شاید ہی کسی شخص کو وہ مقام ملا ہو جو حکیم سعید کے حصے میں آیا۔ اس کا سبب ان کی گراں قدر علمی و تحقیقی خدمات اور کارنامے تھے۔

یہ نیک طینت انسان 9 جنوری 1920ء کو دہلی کے ایک علمی و ادبی گھرانے میں پیدا ہوا۔ دہلی ہی میں ان کے اجداد نے ہمدرد دوا خانے کی پہلی اینٹ رکھی تھی۔ دہلی یونیورسٹی سے گریجویشن کرنے کے بعد وہ خاندانی دوا خانے سے وابستہ ہوگئے۔

تقسیم کے بعد جما جمایا کاروبار چھوڑ کر خالی ہاتھ پاکستان آگئے۔ کراچی کو اپنا مسکن بنایا اور ثابت کردکھایا کہ بے سروسامانی میں بھی ایک پُرعزم آدمی اپنی دنیا آباد کرسکتا ہے۔

1948ء میں انہوں نے اپنا مطب قائم کیا۔ انہوں نے تدریس کا پیشہ اختیار کیا تھا مگر ایوب دور میں ایسے حالات پیدا ہوگئے کہ انہوں نے ملازمت چھوڑ کر مشرقی ادویہ کی اہمیت اور افادیت اجاگر کرنے کو اپنا مشن بنالیا۔

اس مایۂ ناز حکیم نے نہ صرف پاکستان، بلکہ اسلامی دنیا کے لیے اہم خدمات انجام دیں۔ مذہب، طب اور حکمت پر 200 سے زائد کتب تصنیف و تالیف کیں۔ ان کی ادویہ اور پراڈکٹ کی دنیا بھر میں مانگ تھی۔ حکیم صاحب کے ہاتھ میں شفا تھی۔ وہ پاکستان کے بڑے شہروں میں ہفتہ وار مریضوں کو دیکھتے تھے۔

1985ء میں انہوں نے ہمدرد یونیورسٹی قائم کی۔ اس درس گاہ اور اس کے تحت مدینۃ الحکمت جیسے شہر کی تعمیر کو ان کی علمی و تعلیمی تحریک کا سنگ میل قرار دیا جاسکتا ہے۔

انہوں نے ہمدرد کے نام سے بچوں کا رسالہ شروع کیا جسے رجحان ساز قرار دیا جاتا ہے۔ نونہال ادب کے نام سے بچوں کے لیے کتب کا ایک خوبصورت سلسلہ شروع کیا۔

1993ء میں انہیں سندھ کا گورنر بنایا گیا۔ وہ چند ہی ماہ اس عہدے پر رہے۔ 17 اکتوبر 1998ء کو اس درویش صفت انسان کو شہید کردیا گیا۔ اس کا الزام مختلف سیاسی گروہوں پر عائد کیا گیا۔ کچھ لوگوں کو سزائیں بھی ہوئیں، البتہ آج بھی کئی سوالات حل طلب ہیں۔

ن م راشد

بیسویں صدی میں اردو شاعری کے افق پر جو نابغۂ روزگار شخصیات ظاہر ہوئیں، ان میں ایک نام ن م راشد کا بھی ہے۔ ناقدین ان کا موازنہ فیض اور جوش سے کرتے ہیں۔

ان کا اصل نام نذر محمد راشد تھا۔ وہ 1910ء میں ضلع گوجراں والا کے قصبے وزیرآباد میں پیدا ہوئے۔ اوائل عمری میں علامہ مشرقی کی خاکسار تحریک سے بہت متاثر تھے۔

گورنمنٹ کالج لاہور سے اکتسابِ علم کیا۔ شاعری میں جدید رجحانات کے حامل تھے۔ اردو شاعری کو بین الاقوامی دھارے میں شامل کرنے والوں میں ان کا اور میراجی کا نام سرفہرست ہے۔ ناقدین کے مطابق ان دو شعرا کی آمد سے قبل اردو نظم سیدھی

لکیر پر چل رہی تھی، موضوعات پر خارجی اثرات غالب تھے مگر انہوں نے ردیف و قافیہ کی بندش سے آزاد ہو کر داخلی، علامتی اور تجریدی نوعیت کے موضوعات کا چناؤ کیا۔

1942ء میں ان کا پہلا مجموعہ "ماورا" شائع ہوا، جسے آزاد نظم کا پہلا باقاعدہ مجموعہ قرار دیا جاتا ہے۔ راشد کے اسلوب، موضوعات اور پیشکش کے انداز نے پوری نسل کو گرویدہ بنالیا۔ "ایران میں اجنبی" اور "لا = انسان" ان کے دیگر مجموعے تھے۔ کتاب "گمان کا ممکن" ان کی موت کے بعد شائع ہوئی۔

لوگوں نے راشد کا تقابل فیض سے تو کیا اور فیض صاحب بھی راشد کی قابلیت کا اعتراف کرتے تھے، البتہ سنجیدہ ناقدین اسے غیر ضروری قرار دیتے ہیں کہ دونوں کی شاعری کا انداز اور دائرہ الگ ہے۔

اظہار کی نارسائی ان کا پسندیدہ موضوع تھی۔ ان کی نظم "حسن کوزہ گر" ایک ایسے فن کار کا المیہ بیان کرتی ہے، جو کوزہ گری کی صلاحیت سے محروم ہو گیا ہے۔ اس شاہکار نظم کی تفہیم سے متعلق مباحث ایک عرصے جاری رہے۔

راشد نے جدید دور کا انسان اور مذہب کے موضوع پر بھی قلم اٹھایا۔ ان کی بعض نظموں پر مذہبی حلقوں کی طرف سے خاصی لے دے ہوئی۔ راشد کا انتقال 9 اکتوبر 1975ء کو لندن میں ہوا تھا۔ ان کی آخری رسوم کے وقت صرف تین افراد موجود تھے۔ ایک ان کی انگریز بیوی شیلا، دوسرے عبداللہ حسین اور تیسرے ساقی فاروقی۔ ان کی آخری رسومات سے متعلق بھی طرح طرح کے قصے مشہور ہیں۔

کرنل محمد خان

گو جدید اردو نثر کی عمر زیادہ طویل نہیں مگر اس مختصر عرصے میں مشتاق احمد یوسفی، ابن انشا اور شفیق الرحمان جیسے ممتاز مزاح نگار سامنے آئے جنہوں نے اس فن کو اوج بخشا۔ اس فہرست میں چوتھا نام کرنل محمد خان کا ہے، جن کی شگفتہ نثر اور متاثر کن بیان نے قارئین کے دل موہ لیے۔

محمد خان 5 اگست 1910ء کو ضلع چکوال کے ایک گاؤں بلکسر میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم گاؤں ہی سے حاصل کی۔ 1931ء میں اسلامیہ کالج لاہور سے بی اے کیا۔ 1934ء میں ایم اے اقتصادیات کا مرحلہ طے کیا۔ کچھ عرصہ درس و تدریس میں گزرا۔ 1940ء میں فوج میں شامل ہو گئے۔ عراق، مصر اور لیبیا کی لڑائیوں میں شریک رہے۔

1945ء میں ان کا ایجوکیشن کور میں تبادلہ ہوا۔ 1957ء میں کرنل کے عہدے پر فائز ہوئے۔ وہ ڈائریکٹر آرمی ایجوکیشن مقرر ہوئے۔ 1969ء میں اسی عہدے سے ریٹائر ہوئے۔

لکھنے پڑھنے کی عادت بچپن ہی میں پڑ گئی تھی۔ گاؤں کے زمانے میں ایک کہانی لکھی، جو ڈرتے ڈرتے بچوں کے رسالے "رہنمائے تعلیم" میں بھجوائی۔ کہانی شائع ہوئی تو لکھنے کی مزید تحریک ملی۔ پیشہ ورانہ سفر میں قلم اور کاغذ ہمیشہ ساتھ رہے۔ ان کی پہلی کتاب "بجنگ آمد" نے مزاح نگاری کی دنیا میں مقبولیت پائی۔ ان کی پختہ نثر، برجستگی اور صورتِ حال سے پر مزاح پہلو برآمد کرنے کا ہنر متاثر کن تھا۔ اگلی دو کتابیں "بسلامت روی" اور "بزم آرائیاں" کا بھی بڑا چرچا ہوا۔ چوتھی کتاب "بدیسی مزاح" مغربی ادب کا سلیس اردو ترجمہ ہے۔ یوں تو ہر کتاب قابلِ ستائش مگر پڑھنے والے "بجنگ آمد" کے سحر سے نہیں نکل سکے۔

ڈاکٹر انور سدید لکھتے ہیں "کرنل محمد خان کا شمار ان مزاح نگاروں میں ہوتا ہے، جو زندگی کے بجھے ہوئے ماحول میں داخل ہوتے ہیں۔ پھولوں کو فضا میں بکھیرنا شروع کرتے ہیں۔ ماحول پہلے انہیں حیرت کی نظر سے دیکھتا ہے اور پھر فضا میں ہر طرف اڑتے ہوئے پھولوں کو سمیٹنے لگتا ہے۔"

قاری میں خوشی کی کیفیت جگانے والے اس تخلیق کار کا 23 اکتوبر 1999ء کو لاہور میں انتقال ہوا۔

شان الحق حقی

الفاظ اپنی وقعت کھو چکے، آج ہر دوسرے قلم کار کو ہمہ جہت قرار دینے کی وبا عام ہے۔ حقیقت میں تو یہ ترکیب شان الحق حقی جیسے تخلیق کاروں کو زیب دیتی ہے جنہوں نے زندگی تحقیق میں صرف کر دی۔ جتنے بڑے عالم، اتنے بڑے ادیب۔ باکمال شاعر۔ مستند ماہر لسانیات۔ ماہر مترجم۔ سنجیدہ محقق۔ اس پر مستزاد، تمام حلقوں کے لیے قابلِ احترام۔

اصل نام شان الحق تھا۔ حقی تخلص کرتے۔ وہ 15 ستمبر 1918ء کو دہلی میں پیدا ہوئے۔ (کچھ جگہ تاریخ پیدائش

1917ء درج ہے)۔

لکھنے پڑھنے کا شوق وراثت میں ملا۔ ان کے والد مولوی احتشام الدین حقی اپنے زمانے کے مشہور ماہر لسانیات تھے۔ انہوں نے علی گڑھ یونیورسٹی سے گریجویشن کیا۔ سینٹ اسٹیفنز کالج، دہلی سے انگریزی میں ایم اے کی سند حاصل کی۔ بعد ازاں لندن سے صحافت کا ایک کورس کیا۔

وہ ہندوستان کے شعبۂ اطلاعات کے مشہور پرچے "آج کل" سے وابستہ رہے۔ 1950ء سے 1968ء تک حکومت پاکستان کے محکمۂ مطبوعات و فلم سازی کا حصہ رہے۔ پاکستان ٹیلی ویژن سے بطور ڈائریکٹر سیلز منسلک رہے۔ ایک طویل عرصہ اردو بورڈ میں خدمات انجام دیں، اس کی تنظیم اور مستند لغت کی تیاری میں کلیدی کردار ادا کیا۔

وہ ممتاز ادبی جریدے ماہ نو کے مدیر رہے۔ اس عرصے کتنے ہی قلم کاروں کو متعارف کروایا۔ وہ ثقافتی اداروں میں کلیدی عہدوں پر فائز رہے۔ کتب کی فہرست طویل ہے، جن میں سے درجہ ذیل نمایاں ہیں۔ انتخاب ظفر، انجان راہی (ترجمہ)، تار پیراہن (منظومات)، دل کی زبان، پھول کھلے ہیں رنگ برنگے (منظومات)، نکتۂ راز (تنقیدی مقالات)، لغات تلفظ، آپس کی باتیں، افسانہ در افسانہ (خودنوشت سوانح)، حرف دل رس، اوکسفرڈ انگریزی اردو لغت، شاخسانے۔

شان الحق حقی کی ادبی خدمات پر انہیں حکومت نے ستارۂ امتیاز سے نوازا۔ 11 اکتوبر 2005ء کو اس عالم کا کینیڈا میں انتقال ہوا۔

محمد حفیظ

پروفیسر کی عرفیت سے پہچانے جانے والے پاکستانی ٹی 20 ٹیم کے سابق کپتان اور معروف آل راؤنڈر محمد حفیظ کو ہرفن مولا کہا جائے تو غلط نہیں ہوگا۔ گو بولنگ ایکشن کی پابندی کی وجہ سے ان کی اثر پذیری میں کمی آئی ہے مگر بلے بازی اور فیلڈنگ میں مہارت کی وجہ سے وہ ٹیم کا مستقل حصہ تصور کیے جاتے ہیں۔ ٹیسٹ کرکٹ میں انہوں نے بنگلادیش کے خلاف 224 رنز کی شان دار اننگز کھیلی۔ ناصر جمشید کے ساتھ 224 رنز کی شراکت بھی یادگار تھی۔

محمد حفیظ 17 اکتوبر 1980ء کو سرگودھا میں پیدا ہوئے۔ 3 اپریل 2003ء کو زمباوے کے خلاف اپنے ون ڈے کیریر کا آغاز کیا۔ پہلا ٹیسٹ اسی برس اگست میں بنگلادیش کے خلاف کھیلا۔ ٹی 20 فارمیٹ میں اتنے کامیاب رہے کہ مصباح کے بعد انہیں کپتان چنے گیا، تاہم 2012ء کے ٹی 20 ورلڈ کپ میں ناکامی کے بعد کچھ تنازعات کا شکار ہو کر کپتانی سے الگ ہو گئے۔

محمد حفیظ نے 44 ٹیسٹ میچز میں 2,970 رنز اسکور کیے، جن میں آٹھ سنچری شامل ہیں۔ اس فارمیٹ میں 51 وکٹیں لیں۔ 166 ون ڈے میچز میں وہ دس سنچریوں کے ساتھ پانچ ہزار رنز اسکور کر چکے ہیں، جب کہ 129 وکٹیں ان کے حصے میں آئیں۔

وہ پہلے کھلاڑی ہیں، جنہوں نے ٹی 20 کرکٹ میں ہزار رنز اسکور کیے اور 40 وکٹیں لیں۔ پہلے پاکستانی کپتان، جنہوں نے اس فارمیٹ میں لگاتار تین نصف سنچریاں اسکور کیں۔ وہ پاکستان کے دوسرے کھلاڑی ہیں جنہوں نے ایک ہی ون ڈے میں سنچری اسکور کی اور چار وکٹیں لیں۔ 2011ء میں وہ کیریر کے عروج پر تھے جب کہ انہوں نے دس بار مین آف دی میچ کا ایوارڈ حاصل کیا۔

اسلم خان خٹک

صوبہ سرحد (موجودہ خیبر پختون خوا) کی سیاست اور بیوروکریسی پر اسلم خان خٹک نے گہرے اثرات چھوڑے۔ یہ اسلم خان خٹک ہی تھے جنہوں نے چوہدری رحمت علی کی مشہور کتاب "اب یا کبھی نہیں" کی تدوین میں ان کا ہاتھ بٹایا۔ پیشہ ورانہ سفر میں انہوں نے کلیدی عہدوں پر خدمات انجام دیں۔ اسلم خان خٹک 5 اپریل 1908ء کو چترال میں پیدا

ہوئے۔ ان کے والد محمد قلی خان کا شمار نمایاں سیاسی شخصیات میں ہوتا تھا۔ انہوں نے آکسفورڈ یونیورسٹی سے ایم اے کی ڈگری حاصل کی۔ ریڈیو اسٹیشن پشاور کے پہلے ڈائریکٹر مقرر ہوئے۔ بعد ازاں محکمۂ تعلیم صوبہ سرحد کے ڈائریکٹر رہے۔ ڈائریکٹر صنعت وحرفت کی حیثیت سے ریٹائر ہوئے۔

وہ افغانستان اور عراق میں پاکستان کی سفیر رہے۔ 1965ء وہ رکن اسمبلی منتخب ہوئے۔ بھٹو دور میں سرحد اسمبلی کے اسپیکر رہے۔ 1973ء تا 1974ء صوبہ سرحد کے گورنر کا عہدہ سنبھالا۔ ضیاء دور میں مجلس شوریٰ کے رکن رہے۔ 1985ء کے غیر جماعتی انتخابات کے بعد محمد خان جونیجو کی کابینہ میں شامل ہوئے۔ نواز شریف کی کابینہ کا بھی حصہ رہے۔ اپنے علاقے کرک کی ترقی میں اہم کردار ادا کیا۔ انڈس ہائی وے جیسا منصوبہ بھی ان کی وزارت میں شروع ہوا۔

سیاسی بکھیڑے انہیں لکھنے پڑھنے سے دور نہیں کر سکے۔ وہ متعدد زبانوں پر عبور رکھتے تھے۔ انہوں نے کئی کتابیں لکھیں۔ عمر کے آخری حصے میں سیاست سے دستبردار ہوگئے۔ اکتوبر 2008ء میں ان کا انتقال ہوا۔

سلیم ناصر

پی ٹی وی نے کتنے ہی اداکاروں کو اوج بخشا۔ البتہ کچھ ایسے اداکار بھی گزرے، جن کی انفرادیت نے پی ٹی وی ڈرامے کی شہرت اور مقبولیت کے لیے مہمیز کا کام کیا۔ کردار میں ڈوب کر اداکاری کرنے والے سلیم ناصر ایسے ہی شخص تھے۔

ان کا اصل نام سید شیر خان تھا۔ وہ 15 نومبر 1944ء کو ضلع مردان کے ایک پشتون گھرانے میں پیدا ہوئے۔ گو انہیں اپنی لسانی اور خاندانی حیثیت پر فخر تھا مگر اردو سے بھی اتنی ہی محبت تھی، جتنی پشتو سے۔ وہ اتنی خوبصورتی اور پختگی سے اردو بولتے کہ اندازہ ہی نہیں ہوتا کہ یہ ان کی مادری زبان نہیں۔

گریجویشن کے بعد وہ ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی کراچی میں پی آر او ہوگئے مگر سرکاری ملازمت نے ان کے اندر کے اداکار کو بے چین رکھا۔ وہ جانتے تھے کہ بیورو کریسی ان کی منزل نہیں۔ بالآخر شناخت کے سفر پر نکل پڑے۔ 1976ء میں وہ وحید مراد اور شمیم آرا کے ساتھ فلم ''زیب النساء'' میں نظر آئے۔

اس زمانے کے ٹی وی پروڈیوسر سچے پارکھ تھے۔ انہوں نے نوجوان میں چھپے فنکار کو پہچان لیا۔ آنے والے برسوں میں یوں تو سلیم ناصر نے کئی کردار کیے مگر انور مقصود کے ڈرامے ''آنگن ٹیڑھا'' میں اکبر کے کردار نے انہیں شہرت کی بلندیوں پر پہنچا دیا۔ ''ان کہی'' ان کی صلاحیتوں کا ایک اور ثبوت۔ ایک آرٹ کریٹک کے مطابق اگر سلیم ناصر کے کردار کو ''ان کہی'' سے نکال دیا جائے، تو ڈراما بے رونق ہوجائے گا۔ نشانِ حیدر سیریز میں ''کیپٹن سرور شہید'' کے مرکزی کردار کے ساتھ بھی سلیم ناصر نے مکمل انصاف کیا اور مزاح کے بعد سنجیدہ کرداروں میں بھی اپنی صلاحیت تسلیم کرائی۔ تاریخی ڈراما سیریل ''آخری چٹان'' میں وہ اوج پر نظر آئے، جہاں انہوں نے سلطان جلال الدین خوارزم شاہ کا کردار ادا کیا۔ کچھ لوگوں کے مطابق وہ ان کے کیریر کی بہترین اداکاری تھی۔ مکالموں کی پُرتاثر ادائیگی اور ہر کردار میں ڈھل جانے کی صلاحیت نے انہیں اپنے زمانے کا منفرد اداکار بنا دیا تھا۔ ''جانگلوس'' ان کا آخری ڈراما تھا۔

انہوں نے ٹی وی ٹیمپو کے نام سے شوبز کا ایک معروف پرچا نکالا۔ 19 اکتوبر 1989ء کو حرکتِ قلب بند ہونے کے باعث وہ انتقال کر گئے۔ اس منفرد فنکار کو بعد از مرگ تمغۂ حسن کارکردگی سے نوازا گیا۔

بدر منیر

بدر منیر کو پشتو فلموں کا بے تاج بادشاہ کہا جاتا ہے۔ انہوں نے اپنے کیریر میں پشتو اور اردو کی پانچ سو کے لگ بھگ فلمیں کیں۔

عملی زندگی کا آغاز کراچی کی سڑکوں پر ایک رکشا ڈرائیور کی حیثیت سے کیا تھا۔ فلموں میں کام کرنے کی خواہش ان کے اندر سلگتی رہتی۔ پھر ایک ترکیب سوجھی۔ رکشا چھوڑ کر کار چلانی سیکھی اور وحید مراد کے اسٹوڈیو میں ڈرائیور لگ گئے۔

وحید مراد کی مشہور زمانہ فلم ''ارمان'' کے جشن والے روز

بدرمنیر نے اُن کے سامنے فلموں میں کام کرنے کی خواہش کا اظہار کیا۔ وحید مراد مان گئے اور یوں فلم ''جہاں ہم وہاں تم'' میں انہیں ایک چھوٹا سا کردار کرنے کا موقع ملا۔ وہ ہمیشہ وحید مراد کے احسان مند رہے اور اُن کی ناکامیوں کے دور میں اپنی پشتو فلم ''پختون پہ ولایت کمبا'' میں انہیں کاسٹ کیا۔

1970ء میں قسمت کی دیوی ان پر مہربان ہوگئی۔ یاسمین خان کے ساتھ ان کی فلم ''یوسف خان شیر بانو'' بلاک بسٹر ثابت ہوئی۔ 1970ء تا 1990ء یہ کامیاب جوڑی کئی فلموں میں دکھائی دی۔ ان کی مقبولیت کے پیشِ نظر اردو اور پنجابی فلموں کے پروڈیوسرز نے بھی انہیں کاسٹ کیا۔ وہ نشو، نیلی، بابرہ شریف، دیبا، چکوری اور روحی بانو کے مدمقابل نظر آئے۔ وہ پنجابی نہیں جانتے تھے۔ پنجابی فلموں میں وہ پشتون لب ولہجے میں اردو بولتے نظر آتے۔

بدرمنیر کی آخری پشتو فلم ''زمانہ پاگل جانانہ'' 2005ء میں ریلیز ہوئی مگر پھر انہیں بیماریوں نے گھیر لیا۔ وہ آخری بار ایک ٹی وی شو میں نظر آئے۔ 11 اکتوبر 2008ء کو ان کا انتقال ہوا۔

سید کمال

60 اور 70 کی دہائی میں جن اداکاروں نے فلم بینوں کو گرویدہ بنایا، ان میں سید کمال کا نام نمایاں ہے۔ وہ ایک تخلیقی آدمی تھے۔ فقط اداکاری نہیں کی، اسکرپٹ لکھے، ہدایت کاری کی۔ مزاحیہ اداکاری میں انہیں ملکہ حاصل تھا۔ شہرت کی ایک وجہ اور تھی۔ ان کی شکل معروف ہندوستانی اداکار اور ہدایت کار راج کپور سے بہت ملتی تھی۔ اسی وجہ سے انہیں پاکستان کا راج کپور کہا جاتا تھا۔

27 اپریل 1934ء کو سید کمال میرٹھ میں پیدا ہوئے۔ تقسیم کے بعد پاکستان آگئے۔ 1958ء میں فلم 'ٹھنڈی سڑک' بنائی۔ فلم ''توبہ'' نے اُنہیں شائقین کی آنکھ کا تارہ بنا دیا۔ جلد ہی ان کا شمار معروف اداکاروں میں ہونے لگا۔

کمال نے ہر قسم کے کردار کیے۔ انہوں نے شمیم آرا، دیبا، زیبا، نسیمہ خان، نشو، ممتاز اور زوزینہ کے ساتھ کئی ہٹ فلموں میں کام کیا۔ ان کی ڈائریکٹ کی ہوئی فلموں میں شہنائی، انسان اور گدھا، ہنی مون، دوسری ماں، درد دل اور جوکر قابلِ ذکر ہیں۔

''بہن بھائی'' کو کچھ لوگ ان کی بہترین فلم قرار دیتے ہیں، جس کے لیے انہیں نگار ایوارڈ سے نوازا گیا۔ کمال نے سیاست میں بھی حصہ لیا مگر یہ شعبہ انہیں راس نہیں آیا۔ بعد میں انہوں نے ''سیاست'' کے نام سے ایک فلم بنائی۔ انڈسٹری کے زوال کے بعد وہ ٹی وی کی سمت آگئے۔ کئی ڈرامے کیے۔ کراچی سینٹر سے نشر ہونے والے ''کمال کا شو'' کو خاصا پسند کیا گیا۔ آج کل ان کے صاحبزادے غالب کمال بھی ٹی وی پر شو کر رہے ہیں۔ سید کمال طویل عرصے سے عارضہ قلب میں مبتلا تھے۔ یکم اکتوبر 2009ء کو 75 برس کی عمر میں کراچی میں انتقال کرگئے۔

نصرت فتح علی خان

فن گائیکی کے افق پر شاید ہی کوئی ایسا ستارہ چمکا ہو، جو اپنے فن کی پہچان بن جائے۔

استاد نصرت فتح علی خان ایسی ہی نابغۂ روزگار شخصیت تھے، جس کے فن نے پوری دنیا کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ بطور قوال شروع ہونے والا سفر ایسی بلندیوں پر لے گیا جس کا تصور بھی محال ہے۔ جاپان میں انہیں دیوتا سے تشبیہ دی جاتی تھی۔

نصرت فتح علی خان 13 اکتوبر 1948ء کو فیصل آباد میں پیدا ہوئے۔ اجداد کا تعلق جالندھر سے تھا۔ والد فتح علی خان اور تایا مبارک علی خان اپنے وقت کے معروف قوال تھے۔ فن گھٹی میں تھا۔ جلد موسیقی کے اسرار و رموز سمجھ لیے۔ پہلے علاقائی سطح پر خود کو منوایا، پھر آڈیو کیسٹ اور ریڈیو کے ذریعے ان کی جادوئی آواز ملک بھر میں پھیلی۔ ''علی مولا'' اور ''میرا پیا گھر آیا'' ان ہی دنوں کی یادگار ہیں۔ انہوں نے لوک

گیتوں کے ساتھ ہم عصر شعرا کا کلام گا کر کامیابی کے جھنڈے گاڑے اور قوالی سے لگاؤ نہ رکھنے والے طبقے کو بھی اپنی جانب راغب کیا۔

یہ غیر ملکی دورے تھے، جنھوں نے انہیں اوج بخشا۔ انہوں نے مغربی ممالک میں اس ڈھب سے قوالی پیش کی کہ وہ افراد جو اُن کی زبان نہیں جانتے تھے، ان کی آواز اور سروں پر جھومتے نظر آئے۔ قوالی کو ایک بین الاقوامی صنف کا درجہ ان ہی کے طفیل ملا۔ ان کی کوششوں سے صوفیاء کا کلام دنیا کے کونے کونے میں پہنچا۔

ان کی گائیکی اور دھنوں نے جنہیں گرویدہ بنایا، ان میں برطانوی موسیقار اور گلوکار پیٹر گیبریل بھی شامل تھے۔ ان ہی کی دھنوں پر خان صاحب نے مشہور زمانہ قوالی ''دم مست قلندر مست مست'' پیش کی۔ بین الاقوامی سطح پر ان کا پہلا شاہکار 1995ء میں ریلیز ہونے والی فلم ''ڈیڈ مین واکنگ'' کا ساؤنڈ ٹریک تھا۔ انہوں نے ہالی ووڈ کی فلم ''دی لاسٹ ٹیمپٹیشن آف کرائسٹ'' اور پھولن دیوی کی زندگی پر بننے والی فلم ''بینڈٹ کوئین'' کے لیے موسیقی ترتیب دی۔ جدید مغربی موسیقی اور مشرقی کلاسیکی موسیقی کے ملاپ سے ایک نیا رنگ پیدا کیا، جس نے قوالی کو یکسر بدل ڈالا۔ کچھ حلقے اس عمل پر تنقید بھی کرتے ہیں۔

17 اگست 1997ء کو وہ 48 برس کی عمر میں انتقال کر گئے۔

جاوید شیخ

ایسے اداکار کم ہی ہوں گے جنھیں چھوٹے اور بڑے پردے پر یکساں پزیرائی ملے، جو اپنے دلیر فیصلوں اور تخلیقی اپچ کے طفیل رجحان ساز ٹھہرائے جائیں۔ جاوید شیخ ان ہی کمیاب کلاکاروں میں سے ایک ہیں۔ وہ فقط اداکاری تک محدود نہیں رہے۔ بطور ہدایت کار یادگار فلمیں بنائیں۔ اہم ترین پہلو یہ کہ جس زمانے میں اردو سینما زوال کی جانب گامزن تھا، لوگ فلموں پر پیسے لگانے کو تیار نہیں تھے، انہوں میگا بجٹ فلمیں بنانے کا رسک لیا۔

وہ 18 اکتوبر 1954ء کو راولپنڈی میں پیدا ہوئے۔ اداکاری کی صلاحیت بدرجۂ اتم موجود تھی۔ 1974ء میں جب پہلی فلم دھماکا ریلیز ہوئی، اس وقت فقط انیس برس کے تھے۔ جلد ان کی صلاحیتوں کو شناخت کیا جانے لگا۔ آنے والے برسوں میں وہ کئی ڈراموں اور فلموں میں نظر آئے اور ان کا شمار نمایاں اداکاروں میں ہونے لگا۔
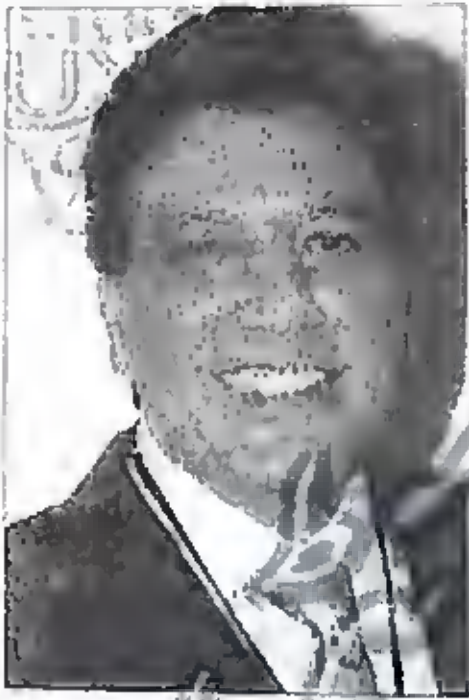
ہدایت کاری کا سفر 1995ء میں ریلیز ہونے والی فلم ''مشکل'' سے شروع ہوا، جسے ناقدین نے خاصا سراہا۔ 1995ء میں ریلیز ہونے والی ''یہ دل آپ کا ہوا'' اس وقت کی مہنگی ترین فلم تھی۔ اس کے ذریعے جاوید شیخ نے پاکستانی انڈسٹری کو بین الاقوامی دنیا سے جوڑنے کی کوشش کی۔ فلم نے نو نگار ایوارڈ اپنے نام کیے۔

انہوں نے ہندوستانی فلموں میں بھی خود کو منوایا۔ ''اوم شانتی اوم'' اس کی نمایاں مثال تھی۔ 2008ء میں بھارتی سرمایہ کاری سے بننے والی ان کی فلم ''کھلے آسمان کے نیچے'' ریلیز ہوئی۔ آج بھی وہ بڑے پردے پر اپنے جلوے بکھیر رہے ہیں۔ ان کے بھائی سلیم شیخ اور بہنوئی بہروز سبزواری بھی انڈسٹری کی نمایاں شخصیات ہیں۔ ان کا بیٹا اور بیٹی بھی شوبز انڈسٹری سے وابستہ ہیں۔

فیصل قریشی

اگر ورسٹائل اداکاروں کا تذکرہ ہو، مارننگ شوز کے مقبول میزبانوں کی بات ہو، تو ہمہ جہت فنکار فیصل قریشی کا نام ذہن میں آئے گا۔ اوائل عمری میں شوبز کی دنیا میں قدم رکھنے والے فیصل قریشی کو شہرت تو فلموں سے ملی مگر شناخت ٹی وی ڈرامے بنے۔

فیصل قریشی 26 اکتوبر 1974ء کو لاہور میں پیدا ہوئے۔ اُن کی والدہ افشاں قریشی بھی شوبز انڈسٹری سے وابستہ تھیں۔ اُن کے ساتھ وہ اکثر ٹی وی سیٹ پر جایا کرتے۔ اس مشق نے خود میں چھپے اداکار کو شناخت کرنے کا موقع فراہم کیا۔

چائلڈ آرٹسٹ کی حیثیت سے پی ٹی وی سے سفر شروع کیا۔ ''اندھیرا اجالا'' اور ''ایمرجنسی وارڈ'' میں نظر آئے۔ 1992ء میں ریلیز ہونے والی ''سزا'' پہلی نمایاں فلم تھی۔ اس وقت عمر فقط اٹھارہ برس تھی۔ اگلے چند برسوں میں کئی فلموں میں کام کیا مگر فلم انڈسٹری کا زوال شروع ہو چکا تھا۔ دھیرے دھیرے وہ ٹی وی کی سمت چلے آئے۔ اوائل میں تو چھوٹے موٹے رول کیے مگر ''بونا فرام ٹوبہ ٹیک سنگھ'' سے لاکھوں لوگوں کو گرویدہ بنالیا۔ ''چاند پور کا چندو'' میں بھی ان کا کردار بہت مضبوط تھا۔ آنے والے سالوں میں انہوں نے پرائیویٹ پروڈکشن کے کئی کامیاب ڈراموں میں اپنی صلاحیتوں کے جوہر دکھائے۔ مارننگ شوز کے میدان میں، جہاں خواتین کا غلبہ ہے، فیصل قریشی نے خود کو منوایا۔ انہوں نے تین شادیاں کیں۔

وحید مراد

ان کا شمار جنوبی ایشیا کے مقبول ترین اداکاروں میں ہوتا تھا۔ وہ نوجوانوں کے لیے رول ماڈل تھے۔ ان کا ہر انداز کاپی کیا جاتا۔ جو شہرت ہندوستان میں دلیپ کمار کو ملی، وہی پاکستان میں اُن کے حصے میں آئی۔ گو فقط 24 فلموں میں کام کیا مگر ان کے اثرات سینکڑوں فلمیں کرنے والے اداکاروں سے زیادہ ہیں۔ احمد رشدی کی آواز پر اُن کی پرفارمینس نے کتنے ہی گیتوں کو لازوال بنادیا۔

یہ چاکلیٹی ہیرو وحید مراد کا ذکر ہے، جو 2 اکتوبر 1938ء کو سیالکوٹ میں پیدا ہوئے۔ وہ فلم ڈسٹری بیوٹر نثار مراد کے بیٹے تھے۔ کراچی گرامر اسکول سے ابتدائی تعلیم حاصل کی، ایس ایم آرٹس سے گریجویشن کیا، کراچی یونیورسٹی سے انگریزی ادب میں ماسٹرز کیا۔

کیریر کا آغاز بطور پروڈیوسر کیا تھا۔ ''انسان بدلتا ہے'' پہلی فلم تھی۔ یہ زیبا کی تجویز تھی کہ وہ فلموں میں بطور ہیرو آئیں۔ معروف ہدایت کار اور ان کے دوست پرویز ملک نے بھی اس کی تائید کی۔ ''اولاد'' سے فنی سفر کا آغاز کیا، جس میں اُن کے سپورٹنگ رول کو بہت سراہا گیا۔ ''ہیرا اور پتھر'' میں پہلی بار بہ طور ہیرو نظر آئے۔ ان کے پروڈکشن ہاؤس کی فلم ''ارمان'' کو پاکستانی انڈسٹری میں سنگِ میل کی حیثیت حاصل ہے۔ اس نے باکس آفس کے تمام ریکارڈ توڑ ڈالے۔ اس کے گیت ''کوکورینا''، ''اکیلے نہ جانا'' اور ''بے تاب ہو'' آج بھی سماعتوں میں رس گھولتے ہیں۔ ان کی فلم ''دیور بھابی'' کو بھی شاہکار کا درجہ حاصل ہے۔ 60 کی دہائی کے آخر میں ان کی پروڈکشن کمپنی تنازعات کا شکار ہوگئی۔ پرویز ملک الگ ہوگئے۔

مقبولیت .... نے مزید اختلافات کو جنم دیا۔ ان کی شہرت سے خوفزدہ لابی متحرک ہوگئی۔ کہا جاتا ہے کہ زیبا، شبنم اور نشو کو اُن کے شوہروں نے وحید مراد کے ساتھ کام کرنے سے منع کر دیا تھا۔ یوں وہ صفِ اوّل کی اداکاراؤں سے محروم ہوگئے۔ اس رکاوٹ کے باعث اہم ڈائریکٹرز اور پروڈیوسر ان سے دور ہونے لگے۔ انہیں جان بوجھ کر سپورٹنگ کرداروں میں کاسٹ کیا جانے لگا۔ اداکار ندیم کا ستارہ اوج پر تھا۔ پھر 80ء میں ان کا ایکسیڈنٹ ہوگیا، جس میں ان کا چہرہ شدید زخمی ہوا۔ اس واقعے کے بعد وہ یاسیت میں اتر گئے۔ ناکامیوں سے دل برداشتہ وحید مراد 23 نومبر 1983ء کی صبح انتقال کر گئے۔ ''ہیرو'' ان کی آخری فلم تھی، جو 1985ء میں ریلیز ہوئی اور سپر ہٹ ثابت ہوئی۔

اُنہیں نگار ایوارڈ اور ستارۂ امتیاز سمیت کئی اعزازات ان کے حصے میں آئے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ وہ کسی ایوارڈ کے محتاج نہیں تھے۔ اُن کے مداحوں کی جتنی بڑی تعداد آج پاکستان میں موجود ہے، وہ کسی اور ہیرو کو نصیب نہیں ہوسکی۔

علی حیدر

پاکستانی پاپ انڈسٹری کو استحکام بخشنے اور اوج پر لے جانے والے گلوکاروں میں ایک نام علی حیدر کا بھی ہے۔ جن کے گانے ''پرانی جینز'' نے شہرت کے تمام ریکارڈ توڑ ڈالے تھے۔ اس گانے کی شہرت ہندوستان بھی پہنچی۔

90 کی دہائی میں انہوں نے ایک کے بعد ایک ہٹ آڈیو البم دیے۔ ان کے گانے چارٹ پر نمبر ون کی پوزیشن پر براجمان رہتے۔ ''قرار''، ''ظالم نظروں سے''، ''دلبر جاناں'' اور ''چاند سا مکھڑا'' ان کے مقبول گیتوں کی فقط چند مثالیں ہیں۔ اُنہوں نے ٹی وی ڈراموں میں بھی اپنے فن کے جوہر دکھائے۔ پاکستانی فلم ''چلو عشق لڑائیں'' میں نظر آئے۔

وہ کراچی کے ایک متوسط گھرانے میں پیدا ہوئے۔

گائیکی کے کیریر کا آغاز اس وقت کیا، جب وہ این ای ڈی میں زیرِ تعلیم تھے۔ 1988ء میں آنے والا ''جانے جاں سن'' پہلا البم تھا۔ اس کے بعد ''چاہت''، ''ترنگ'' اور ''قرار'' آئے۔ ''قرار'' ان کے کیریر کا عروج ثابت ہوا۔ شہرت اسکینڈلز بھی ساتھ لائی۔ بعد کے برسوں میں وہ ذاتی مسائل میں الجھے نظر آئے۔ انہیں دھمکیاں ملنے کی بھی خبریں آئیں جن کی وجہ سے وہ انڈسٹری سے دور ہوگئے۔ واپسی کے بعد ان کی توجہ کا اصل محور نعتیں اور صوفیانہ کلام رہا۔

شمس الدین عظیمی

پاکستان کے جن روحانی اسکالرز کو عالمی توجہ ملی، ان میں خواجہ شمس الدین عظیمی نمایاں ہیں۔ اس کا سبب ان کی روحانیت اور سائنس کو قریب لانے کی منظم و مربوط کوششیں ٹھہریں، جو مراقبہ ہال، اکیڈمی، کتب، مقالات اور سیمینارز کی صورت ظاہر ہوئیں۔ انہوں نے مابعد الطبیعیات کی تفہیم کی نئی صورت پیدا کی۔ ان کا شروع کردہ ''روحانی ڈائجسٹ'' اس موضوع پر اردو کا مقبول ترین پرچہ ہے۔ کلر تھراپی، یعنی رنگوں کے ذریعے علاج ان کا مقبول سلسلہ ہے۔ ان کے قلمی سفر کا آغاز اخبارات و رسائل میں قارئین کے خطوط کا جواب اور خوابوں کی تعبیر جیسے سلسلوں سے ہوا۔ آج اُن کے شاگرد یہ سلسلے سنبھالے ہوئے ہیں۔

خواجہ شمس الدین عظیمی معروف بزرگ قلندر بابا اولیا کے مرید ہیں، جن کا تعلق بابا تاج الدین ناگوری کے خاندان سے تھا۔ وہ 17 اکتوبر 1927ء کو ضلع سہارنپور، یوپی میں پیدا ہوئے۔ زندگی کا کچھ زمانہ مشرقی پاکستان میں گزرا۔ یہاں آکر انہوں نے قلندر بابا اولیا کی نگرانی میں سلوک کی منازل طے کیں۔ انہوں نے سیرت، روحانیت، پیراسائیکلوجی اور دیگر موضوعات پر 61 کتابیں تصنیف کیں۔ انگریزی اور روسی سمیت ان کی کتب کا کئی زبانوں میں ترجمہ ہوچکا ہے۔ ان کے مقالات کئی درس گاہوں میں نصاب کا حصہ بنے۔ خواجہ شمس الدین عظیمی نے پاکستان اور بیرونِ پاکستان کی یونیورسٹیز، تعلیمی اور دیگر اداروں میں لیکچرز دیے۔

ان کے نزدیک انسان کی زندگی کا مقصد روحانی علوم کا حصول اور روح کی بالیدگی ہے، جس کے لیے پیغمبروں اور صوفیاء کے نقشِ قدم پر چلنا ضروری ہے۔ وہ روحانی بالیدگی کے لیے مراقبے کو شرط تصور کرتے ہیں۔ ان کی تعلیمات میں مرد اور عورت کو یکساں مقام حاصل ہے۔

راشد لطیف

حب الوطنی کے جذبے سے سرشار راشد لطیف پاکستانی کرکٹ میں حق گوئی کا استعارہ ہیں۔ جس زمانے میں انہوں نے میچ فکسنگ جیسے ناسور کی نشان دہی کی، اس وقت کلمۂ حق کہنے کے لیے بڑی جرأت درکار تھی۔

اس باصلاحیت کھلاڑی نے 37 ٹیسٹ میچز میں 1381 رنز اسکور کیے۔ ویسٹ انڈیز کے خلاف 150 رنز ٹیسٹ کیریر کی سب سے بڑی اننگز۔ ٹیسٹ میں وکٹوں کے پیچھے سے 130 شکار کیے۔ جن 37 ٹیسٹ میچز میں راشد نے دستانے سنبھالے، اُن میں سے 25 میں پاکستان نے کام یابی حاصل کی۔ 166 ون ڈے میچز میں اُن کے بلے نے تین نصف سنچریاں اگلیں۔ وکٹوں کے پیچھے 220 شکار کیے۔

وہ 14 اکتوبر 1968ء کو کراچی کے ایک متوسط گھرانے میں پیدا ہوئے۔ 84ء میں میٹرک کرنے کے بعد گورنمنٹ سائنس کالج ملیر کینٹ سے انٹر کیا۔ این ای ڈی یونیورسٹی میں داخلہ مل گیا مگر کرکٹ کے عشق کے باعث تعلیمی سفر ادھورا رہ گیا۔

''قائد اعظم کرکٹ کلب'' سے کلب کرکٹ کا آغاز

ہوا۔ پھر بلیر جیم خانہ کا حصہ بن گئے۔ 87ء میں کراچی انڈر 19 کا حصہ بنے۔ 90-89 کے ڈومیسٹک سیزن میں 47 شکار کیے۔ 92ء میں انگلینڈ کا دورہ کرنے والی ٹیم کے لیے منتخب ہوئے۔ ٹیسٹ ڈیبیو پر شان دار نصف سنچری اسکور کی۔ ٹیم آسٹریلیا گئی، تو وہاں بھی کارکردگی متاثر کن رہی۔ یوں وہ قومی ٹیم کا مستقل حصہ بن گئے۔ چار سال بعد میچ فکسنگ کے انکشافات سامنے آئے۔ وہ زمبابوے کا ٹور چھوڑ کر واپس پاکستان آگئے۔ ڈیڑھ برس سچ کہنے کی پاداش میں ٹیم سے دور رکھا گیا۔ 96ء میں واپسی ہوئی تو آسٹریلیا کے خلاف آٹھ شکار کرکے وسیم باری کا ریکارڈ توڑا۔

انگلینڈ کے دورے پر انہوں نے اپنی جگہ معین خان کے لیے خالی کرکے انوکھی مثال قائم کی۔ 98ء میں انہیں قیادت سونپی گئی۔ آنے والے برسوں میں کئی نشیب و فراز آئے۔ کبھی ٹیم سے باہر ہو جاتے۔ لوٹتے تو کپتان بنا دیے جاتے۔ ورلڈ کپ 2003ء میں پاکستان کی مایوس کن کارکردگی کے بعد ٹیم کی تشکیل نو کا فیصلہ کیا گیا تو قیادت پھر ان کے حصے میں آئی مگر ایک بار پھر حالات بگڑنے لگے۔ آئی سی سی نے ان پر چند میچز کی پابندی عاید کردی۔ اس کے بعد انضمام الحق کو قیادت سونپ دی گئی۔ کچھ عرصے بعد انہوں نے ریٹائرمنٹ کا اعلان کردیا۔

انہوں نے 2000ء میں کراچی میں راشد لطیف اکیڈمی کی بنیاد... رکھی جس کے طفیل پاکستان کرکٹ کو کئی باصلاحیت کھلاڑی ملے۔

جسٹس جاوید اقبال

یوں تو شاعر مشرق کا بیٹا ہونا ہی ایک مضبوط حوالہ ہے مگر ڈاکٹر جاوید اقبال کی قانون اور فلسفے کے میدان میں خدمات بھی کسی صورت نظر انداز نہیں کی جاسکتیں۔

عصری اسلامی نظریہ اور سیاسی فلسفے پر گراں قدر تحقیق کرنے والے یہ صاحب 5 اکتوبر 1924ء کو علامہ اقبال کی دوسری زوجہ سردار بیگم کے بطن سے پیدا ہوئے۔ ابھی

گیارہ برس کے تھے کہ والدہ کا انتقال ہوگیا۔ کچھ عرصے بعد والد کا سایہ بھی سر سے اٹھ گیا مگر وہ ان سانحات سے ابھر آئے۔ 1944ء میں گورنمنٹ کالج لاہور سے گریجویشن کرنے کے بعد فلسفے اور انگریزی میں ایم اے کیا۔ 1954ء میں برطانیہ کی کیمبرج یونیورسٹی سے ڈاکٹریٹ کی ڈگری لی۔ لندن سے قانون کی تعلیم حاصل کی۔ دو امریکی درس گاہوں نے انہیں ڈاکٹریٹ کی اعزازی ڈگریاں عطا کیں۔

انہوں نے لاہور سے پریکٹس شروع کی۔ قابلیت جلد جج کے منصب پر لے گئی۔ وہ لاہور کورٹ کے چیف جسٹس رہے۔ سپریم کورٹ میں ذمے داریاں سنبھالیں۔ سینیٹ کے رکن بھی رہے۔ انہوں نے بطور قانون دان اسلامی طرز سیاست، سیاسی نظریات، پاکستان اور اپنے والد کے فلسفے کے موضوع پر مقالات اور کتابیں لکھیں۔ انہوں نے کئی حساس موضوعات پر قلم اٹھایا اور اپنی بصیرت کی روشنی سے قوم کی رہنمائی کی۔ ان کی زوجہ ناصرہ اقبال بھی لاہور ہائی کورٹ کی جج رہیں۔

ان کی شہرت کا ایک حوالہ علامہ اقبال کی کتاب جاوید نامہ بھی ہے۔ ناقدین کے نزدیک اقبال نے اپنی نظموں میں جب نوجوان نسل کو مخاطب کیا تو جاوید اقبال ہی کو سامنے رکھا۔

صبیحہ خانم

16 اکتوبر 1936ء کو گجرات میں پیدا ہونے والی صبیحہ خانم کا اصل نام مختار بیگم ہے۔ ان کے کیریر کی کہانی دل چسپ ہے۔ 1948ء میں سیالکوٹ میں ہونے والی ایک تقریب میں مختار بیگم نے فلم سسی پنوں کا ایک گیت گایا، تو سامعین سے شان دار ردعمل ملا۔ معروف ڈراما رائٹر اور شاعر نفیس خلیلی کو ان کی قابلیت نے متاثر کیا۔ انہوں نے ہی نے مختار بیگم کا نام صبیحہ خانم رکھا، ان کی درخواست پر مسعود پرویز نے ''بیلی'' میں انہیں موقع دیا۔ اس کے بعد وہ ''دو آنسو'' میں نظر آئیں۔ فلم ''آغوش'' میں بھی ان کی صلاحیتیں ابھر کر

سامنے آئیں۔ 50 کی دہائی میں وہ فلم بینوں کے دلوں کی دھڑکن تھیں۔ 1953ء میں انور کمال پاشا کی فلم "غلام" میں ان کی اداکاری نے سب کو چونکا دیا۔ سنتوش کمار اور ان کی جوڑی بہت مقبول ہوئی۔

ان کی معروف فلموں میں وعدہ، پاسبان، شیخ چلی، سات لاکھ، گمنام، دیوانہ، سسی، سوہنی، چھوٹی بیگم، داتا، سنگل، پرواز، طوفان، موسیقار، سرفروش نمایاں ہیں۔ کنیز، دیور بھابی، پاک دامن، انجمن، محبت، تہذیب، ایک گناہ اور سہی میں انہوں نے کریکٹر رول کیے۔ انہوں نے اردو اور پنجابی دونوں زبانوں کی فلموں میں اپنے یکساں جوہر دکھائے۔ وہ پاکستانی سلور اسکرین کی پہلی خاتون تھیں جنہیں پرائڈ آف پرفارمنس ملا۔

مرزا قلیچ بیگ

شمس العلماء کا خطاب پانے والے مرزا قلیچ بیگ ایک عہد ساز شخصیت تھے۔ سندھی ادب میں جدید رجحانات متعارف کروانے کا سہرا ان ہی کے سر ہے۔ اس زبان کے ابتدائی ماہر لسانیات میں ان کی گنتی ہوتی ہے۔ ان کے افکار نے اس خطے پر گہرے اثرات مرتب کیے۔

وہ 7 اکتوبر 1853ء کو موجودہ حیدرآباد میں پیدا ہوئے۔ ان کے اجداد کا تعلق جورجیا سے تھا۔ ان کے والد مرزا فریدوں بیگ ایک جنگی قیدی کی حیثیت سے عثمانی اور ایرانی درباروں سے ہوتے ہوئے تالپور دربار تک پہنچے۔ اپنی ذہانت اور قابلیت کے طفیل وہ جلد ہی شاہ کے نزدیک آگئے۔ انگریزوں کے قبضے کے بعد انہوں نے دریائے سندھ کے

کنارے ایک چھوٹی سی بستی میں رہائش اختیار کی۔ وہیں مرزا قلیچ بیگ کی پیدائش ہوئی۔

انہوں نے انتہائی قلیل عرصے میں سندھی، عربی اور فارسی پر عبور حاصل کرلیا۔ ان کے والد جدید تعلیم کی اہمیت سے واقف تھے۔ ان ہی کی کوششوں سے مرزا قلیچ بیگ نے 1872ء میں میٹرک کیا۔ پھر اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے بمبئی چلے گئے۔ کچھ عرصے وہ بمبئی یونیورسٹی میں پڑھاتے بھی رہے مگر والدہ کی وفات کی وجہ سے سندھ لوٹ آئے۔ یہاں انہوں نے سرکاری ملازمت اختیار کی۔ وہ شکار پور کے تحصیل دار ہوگئے اور ترقی کرتے کرتے کلکٹر کے عہدے تک پہنچے۔ وہ سندھ میں اس عہدے تک پہنچنے والے پہلے مقامی تصور کیے جاتے ہیں۔ 1910ء میں ریٹائر ہوئے۔

ان کی زندگی علم و ادب کی ترویج کے لیے وقف تھی۔ انہوں نے عالمی ادب کا سندھی میں ترجمہ کیا اور ایسی بہت سی کتابیں تصنیف کیں، جو سندھی ادب میں رجحان ساز ثابت ہوئیں۔ 3 جولائی 1929ء کو ان کا انتقال ہوا۔

نعمت اللہ خان

2001ء میں کراچی کے ناظم کا عہدہ سنبھالنے والے نعمت اللہ خان کا شمار موجودہ جماعت اسلامی کے اہم رہنماؤں میں ہوتا ہے۔ وہ کراچی کے ناظم کی حیثیت سے بھی خدمات انجام دے چکے ہیں۔

وہ یکم اکتوبر 1930ء کو اجمیر میں پیدا ہوئے۔ شاہ جہاں پور سے ابتدائی تعلیم حاصل کی۔ پاکستان آنے کے بعد انہوں نے انتہائی کسمپرسی کے حالات میں سفر شروع کیا۔ پنجاب یونیورسٹی سے گریجویشن کیا۔ کراچی یونیورسٹی سے قانون اور صحافت کی ڈگریاں لیں۔ پھر وکالت کا پیشہ اختیار کیا۔

جماعت اسلامی کا حصہ بننے کے بعد کلیدی عہدوں پر فائز رہے۔ جماعت کو شہر کراچی میں منظم کرنے میں مرکزی کردار ادا کیا۔ تمام تحاریک میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ 85ء کے انتخابات کے بعد وہ سندھ اسمبلی میں اپوزیشن

لیڈر رہے۔ جماعت اسلامی کے تحت کام کرنے والے فلاحی تنظیم الخدمت کی ذمے داریاں سنبھالیں۔ 2002ء میں کراچی کے ناظم بنے۔ ان کے زمانے میں شہر میں کئی ترقیاتی منصوبے شروع کیے گئے۔ ان کے مخالفین بھی ان کا ذکر بڑے احترام سے کرتے ہیں۔

معراج محمد خان

مایۂ ناز ترقی پسند سیاست داں، معراج محمد خان 19 اکتوبر 1938ء کو ناگ پور، ہندوستان میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد، تاج محمد خان طبیب تھے۔ وہ ممتاز صحافی رہنما منہاج برنا کے چھوٹے بھائی ہیں۔

وہ جامعہ ملیہ، دہلی میں زیر تعلیم رہے۔ 56ء میں پنجاب یونیورسٹی سے میٹرک کیا۔ ایس ایم آرٹس کالج کراچی میں سوشلسٹ نظریات سے متعارف ہوئے۔ 57ء میں نیشنل اسٹوڈنٹس فیڈریشن کا حصہ بنے۔ 58ء میں امریکی صدر، آئزن ہاور کی پاکستان آمد کے موقع پر احتجاج کی منصوبے بندی کے الزام میں پہلی بار گرفتار ہوئے۔ ایوب سرکار کے خلاف طلبا کو منظم کیا اور کئی تحریکوں کی قیادت کی۔ مارشل لا کورٹ نے انہیں ایک سال کی سزا سنائی۔ 62ء میں انہیں شہر بدر کر دیا گیا۔

پولو گراؤنڈ، کراچی میں کنونشن مسلم لیگ کا پہلا ہوتا تھا جلسے کو سبوتاژ کرنے والوں کی قیادت معراج محمد خان ہی کر رہے تھے۔ اس جرم میں پھر شہر بدری کا حکم صادر ہوا۔ 64ء کے صدارتی انتخابات میں فاطمہ جناح کا ساتھ دیا۔ گو حکومت نے خریدنے کی کوشش کی مگر وہ ڈٹے رہے۔ ایوب خان کی کابینہ سے الگ ہونے کے بعد جب بھٹو صاحب نے پیپلز پارٹی کی بنیاد رکھی، تو یہ معراج محمد خان ہی تھے، جنہوں نے ان کا پیغام ملک بھر کے طلبا تک پہنچایا۔ اسی زمانے میں بھٹو صاحب نے انہیں اپنا جانشین مقرر کیا۔ انہوں نے مشرقی پاکستان میں ہونے والے فوجی آپریشن کی مخالفت کی۔

پیپلز پارٹی کی حکومت میں وہ وزیر تھے مگر اصولوں پر سمجھوتا نہیں کیا۔ پیپ کی حکومت کے خاتمے پر وزارت سے استعفیٰ دے دیا۔ اس جرأت کی پاداش میں قید و بند کی صعوبتیں برداشت کیں۔ بھٹو سے اختلافات تھے مگر ضیاء الحق کا ساتھ دینا گوارا نہیں تھا۔ انہوں نے "ایم آر ڈی" کے پلیٹ فارم سے بحالی جمہوریت کے لیے آواز اٹھائی۔ بعد کے برسوں میں وہ مختلف ترقی پسند جماعتوں کے پلیٹ فورم سے سرگرم رہے۔ 98ء میں "تحریکِ انصاف" کا حصہ بن گئے مگر 2003ء میں اختلافات کے بعد راستے جدا ہو گئے۔

حمید اختر خان

ایسی شخصیات کم ہی ہوتی ہیں، جو صلے کی خواہش سے بے پروا ہو کر اپنی زندگی انسانیت کی خدمت کے لیے وقف کر دیں۔ درویش صفت حمید اختر خان بھی ایسے ہی شخص تھے۔ وہ ایک ترقی پسند مفکر اور زرعی و عمرانی سائنس داں تھے، جنہیں اس خطے میں دیہی ترقی کے لیے شروع کردہ پروگراموں کا بانی تصور کیا جاتا ہے۔

وہ 15 جولائی 1914ء کو آگرہ میں پیدا ہوئے۔ مطالعے کے طفیل تاریخ، سیاست اور معیشت جیسے موضوع میں دلچسپی پیدا ہوئی۔ آگرہ کالج اور میرٹھ کالج میں زیر تعلیم رہے۔ 1934ء میں ماسٹرز کرنے کے بعد تدریس کی سمت آگئے۔ بعد از ان سول سروس کا حصہ بن گئے۔ کلکٹر کی حیثیت سے انہیں بنگال کے دیہی علاقوں میں کام کرنے کا موقع ملا۔ 1943ء کے قحط نے گہرے اثرات مرتب کیے۔ انہوں نے انڈین سول سروس سے استعفیٰ دے دیا۔ پھر جامعہ ملیہ دہلی کا حصہ بن گئے۔ 1950ء میں پاکستان چلے آئے۔

اگلے آٹھ برس مشرقی پاکستان کے کومیلا وکٹوریا کالج کا حصہ رہے۔ اسی زمانے میں دیہی مسائل ان کی توجہ کا محور بنے۔ انہوں نے نہ صرف ان پر تحقیق کی، بلکہ دیہی ترقی کے موضوع پر امریکا سے تربیت بھی حاصل کی اور کومیلا میں پاکستان اکیڈمی فار رورل ڈیولپمنٹ اور کومیلا کا پریٹو پائلٹ پروجیکٹ کی بنیاد رکھی، جس نے اس علاقے کا نقشہ بدل

دیا۔ ان کی خدمات کو کئی اداروں کے ساتھ بیرون ملک بھی سراہا گیا۔ کئی اداروں نے انہیں اعزازات سے نوازا۔

مشہور ہونے کے بعد پاکستان چلے آئے۔ انہوں نے حکومت کو کومیلا ماڈل کو پاکستان کے پسماندہ دیہی علاقوں میں اطلاق کی پیشکش کی مگر سیاسی بنیادوں پر اس مخلصانہ پیشکش کو رد کر دیا گیا۔ انہوں نے ہمت نہیں ہاری۔ وہ مختلف پلیٹ فورمز سے اپنے خیالات لوگوں تک پہنچاتے رہے۔ اورنگی ٹاؤن میں انہوں نے اورنگی پائلٹ پروجیکٹ کی بنیاد رکھی۔ انہوں نے چھوٹے قرضوں کے انقلابی تصورات متعارف کروائے۔ 9 اکتوبر 1999ء کو ان کا امریکا میں انتقال ہوا۔

سعید اجمل

جب [illegible] آف اسپنر [illegible] بہترین دنیا کے [illegible] سے رخصت ہو رہے تھے تب ایک ایسے پاکستانی [illegible] نے میدانوں میں قدم رکھا جو صلاحیتوں میں یکتا تھا۔ کئی برس بعد انہیں [illegible] کہہ کر پکارا جانے لگا۔ مگر کیریئر کے اوج پر [illegible] مشکوک ایکشن کا آسیب پیچھے لگ گیا۔ [illegible] اپنی کھوئی ساکھ [illegible] حاصل کرنے میں جتے ہیں۔

یہ سعید اجمل کا تذکرہ ہے، جنہوں نے 14 اکتوبر 1977ء کو فیصل آباد میں آنکھ کھولی۔ 18 برس کی عمر میں فرسٹ کلاس کرکٹ کھیلنی شروع کی۔ اس فارمیٹ میں نمایاں کامیابیاں اپنے نام کیں مگر قومی ٹیم کا حصہ بننے کے لیے انہیں تھوڑا انتظار کرنا پڑا۔ انہوں نے 33 ٹیسٹ میچز میں 169 وکٹیں حاصل کیں۔ دس وکٹیں لینے کا کارنامہ چار بار انجام دیا۔ ایک اننگز میں سات وکٹیں لینا ان کی بہترین کارکردگی تھی۔ 110 ون ڈے میچز میں ان کی وکٹوں کی تعداد 182 ہے۔ اپنے کیریئر میں انہیں مصباح الحق کی بھرپور حمایت حاصل رہی۔

ون ڈے کیریئر کا آغاز 2 جولائی 2008ء کو انڈیا کے

خلاف کیا۔ 2009ء میں سری لنکا کے خلاف انہیں ٹیسٹ میں موقع ملا۔ جلد وہ ٹیم کا مستقل حصہ بن گئے۔ ان کی گیند "دوسرا" بلے بازوں کے لیے دردِ سر تھی۔ ان کا شمار دنیا کے خطرناک ترین کھلاڑیوں میں ہونے لگا تھا۔

2011ء میں انہوں نے پچاس وکٹیں لے کر اپنی عظمت ثابت کردی۔ 2012ء میں انگلینڈ کے خلاف ٹیسٹ سیریز میں انہوں نے 24 کھلاڑیوں کو پویلین کا راستہ دکھایا۔

کامیابی اپنی جگہ مگر تنازعات نے کبھی پیچھا نہیں چھوڑا۔ 2009ء میں ان کا ایکشن پہلی بار مشکوک قرار دیا گیا۔ 2015ء میں اسی باعث وہ ورلڈ کپ اسکواڈ سے باہر ہوگئے۔ ثقلین مشتاق کی نگرانی میں ان کا ایکشن درست کیا گیا۔ تجزیہ کاروں کا خیال ہے کہ ایکشن کی تبدیلی کے بعد اب وہ پہلے جتنے مؤثر نہیں رہے۔

حمید نظامی

جدید اردو صحافت کے نمایاں ترین مدیران میں حمید نظامی کسی روشن ستارے کی مانند ہیں۔ پاکستانیت کے اس علم بردار کی زندگی جدوجہد سے عبارت تھی۔ انہوں نے پوری ایک نسل کی آبیاری کی۔

وہ اکتوبر 3 اکتوبر 1915ء کو لائل پور (موجودہ فیصل آباد) کے مضافات میں پیدا ہوئے۔ انہوں نے اسلامیہ کالج سے گریجویشن کیا۔ پنجاب یونیورسٹی سے انگریزی میں ایم اے کا مرحلہ طے ہوا۔

زمانۂ طالب علمی وہ سیاست میں خاصے متحرک رہے۔ وہ مسلم لیگ کی ذیلی تنظیم پنجاب فیڈریشن آف مسلم لیگ کے بانیوں میں سے تھے۔ اس کے صدر کی حیثیت سے فعال کردار ادا کیا۔

صحافت میں قدم رکھا، تو قلم کو نظریات کی ترویج کا ذریعہ بنایا جس کی وجہ سے مسلم لیگی قائدین میں انہیں پسند کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔

1940ء میں انہوں نے نوائے وقت شروع کیا جس نے اردو صحافت پر دیرپا اثرات مرتب کیے۔ پہلے یہ ماہ نامہ تھا مگر قبولیت نے جلد ہی اسے ہفت روزہ اور پھر 1944ء میں روزنامے کے قالب میں ڈھال دیا۔ ان پر فکرِ اقبال کے گہرے اثرات تھے۔ ان کے اداریے شاعرِ مشرق کے نظریات کی تشریح میں خاصے معاون تھے۔

مسائل اور محدودات کے باوجود انہوں نے نوائے وقت کو عوام کی آواز بنادیا۔ ان کی تحریروں نے تحریکِ پاکستان کو نظریاتی قوت عطا کی۔ قیامِ پاکستان کے بعد انہوں نے جمہوریت کی بھرپور حمایت کی۔ وہ اسکندر مرزا اور ایوب مارشل کے آمرانہ اقدامات کے مخالفین میں شمار ہوتے تھے اور آمریت کو سیاہ رات کہا کرتے تھے۔ کمیونزم پر بھی ان کا موقف خاصا سخت تھا۔

25 فروری 1962ء کو ان کا لاہور میں انتقال ہوا۔ اس واقعے پر ملک بھر میں سوگ منایا گیا۔ تجزیہ کاروں کے مطابق انہوں نے اردو صحافت میں جو رجحان متعارف کروائے، انہوں نے باقاعدہ ایک اسکول کی شکل اختیار کرلی جس کے ماننے والے آج بھی ہزاروں کی تعداد میں ہیں۔

سلمان بٹ

انسان جو بوتا ہے، وہی کاٹتا ہے، سلمان بٹ اس کی ایک بڑی مثال ہیں۔ ایک کھلاڑی جس کے روشن مستقبل کی پیش گوئیاں کی جارہی تھیں جو پاکستانی ٹیم کی کپتانی کے نزدیک پہنچ گیا تھا، اسپاٹ فکسنگ کے چنگل میں پھنس کر خود تباہ کر بیٹھا۔

پانچ سال کی پابندی اور جیل بھگتنے کے بعد اب سلمان بٹ انٹرنیشنل کرکٹ میں واپسی کے لیے کوششیں کررہے ہیں۔ ان کی صلاحیتوں سے انکار نہیں مگر راہ میں حائل رکاوٹیں اور ان کے بارے میں پائے جانے والے منفی تصور کی وجہ سے یہ سہل نہیں ہوگا۔

بائیں ہاتھ سے بیٹنگ کرنے والے سلمان بٹ نے 7 اکتوبر 1984ء کو لاہور میں آنکھ کھولی۔ اپنی قابلیت کے بل بوتے پر انیس برس کی عمر میں قومی ٹیم کا حصہ بن گئے۔ 2003ء

میں بنگلادیش کے خلاف اپنا پہلا ٹیسٹ کھیلا۔ اگلے برس ویسٹ انڈیز کے خلاف انہوں نے ون ڈے ڈیبیو کیا۔ جلد وہ ٹیم کا مستقل حصہ بن گئے۔ انہوں نے 33 ٹیسٹ میچز میں تین سنچریوں کی مدد سے 1,889 رنز اسکور کیے۔ 78 ون ڈے میچز میں آٹھ بار سو کا ہندسہ عبور کیا۔

جولائی 2010ء میں ٹیسٹ ٹیم کی کپتانی سونپی گئی۔ انہوں نے انگلینڈ کو اس کے ہوم گراؤنڈ پر شکست دی۔ تجزیہ کاروں کو امید تھی کہ وہ طویل عرصے تک کپتانی کے عہدے پر فائز رہیں گے مگر اسپاٹ فکسنگ کے زلزلے نے پاکستان کرکٹ میں کہرام مچا دیا۔ یہ دنیائے کرکٹ کے تہلکہ خیز اسکینڈلز میں سے ایک تھا جس میں وہ براہ راست ملوث تھے۔ انہیں کپتانی اور ٹیم میں اپنی جگہ سے ہاتھ دھونا پڑا۔ پانچ برس کی سزا سنائی گئی۔ انہیں محمد آصف اور محمد عامر کے ساتھ جیل جانا پڑا۔ گو وہ انٹرنیشنل کرکٹ میں واپسی کے لیے پُرامید ہیں مگر تجزیہ کاروں کے مطابق ان کا مستقبل ابہام کی دھند میں لپٹا ہے۔

جسٹس ایم آر کیانی

پاکستان کی عدالتی تاریخ پر جن منصفوں نے انمٹ نقوش چھوڑے، ان میں جسٹس ایم آر کیانی کا نام بھی شامل ہے۔ آمریت کے خلاف توانا ترین آواز تصور کیے جانے والے یہ صاحب 1958ء سے 1962ء تک مغربی پاکستان کے چیف جسٹس رہے۔

وہ 18 اکتوبر 1902ء کو کوہاٹ میں خان بہادر عبدالصمد خان کیانی کے گھر پیدا ہوئے۔ انہوں نے کوہاٹ کے اسلامیہ ہائی اسکول سے میٹرک کرنے کے بعد ایڈورڈ کالج لاہور سے ایف اے کیا۔ گورنمنٹ کالج لاہور سے انگریزی میں ماسٹرز کی سند حاصل کی۔

سول سروس سے اپنا کیریر شروع کیا۔ 1938ء میں ان کا تبادلہ قانون کے محکمے میں ہوگیا۔ 1949ء میں وہ پنجاب ہائی کورٹ کے جج بنے۔ آنے والے برسوں میں وہ کئی اہم عہدوں پر فائز رہے۔

عدالت میں دیے جانے والے ان کے ریمارکس ان کی دلیری، ذہانت اور بذلہ سنجی کی مثال تھے۔ ان کی تقریر میں کاٹ اور گہرے معنی پوشیدہ ہوتے۔ اخبارات میں ان ریمارکس کو خصوصی توجہ دی جاتی۔ حق گوئی کے ایسے تیر کہ صدر پاکستان کو بھی رعایت نہیں دیتے تھے۔ ان کی تقاریر Not the Whole ،The Whole Truth اور Half Truth ،Truth A judge May Laugh کے زیرعنوان کتابی صورت میں آئیں اور بیسٹ سیلر ثابت ہوئیں۔

وہ 1962ء میں ریٹائر ہوئے۔ ماہرین کا خیال تھا کہ وہ مستقبل کے چیف جسٹس بننے کی پوری صلاحیت رکھتے ہیں مگر شاید آمریت کا ناقد ہونے کی وجہ سے انہیں اس عہدے کے لیے مناسب خیال نہیں کیا گیا۔ عوام کی جانب سے انہیں "کیانی پاکستان" کا خطاب دیا گیا۔ وہ کہا کرتے تھے کہ ان کے بیانات کا مقصد مشکل کے دنوں میں عوام کا مورال بلند رکھنا اور انہیں ڈپریشن سے نکالنا تھا۔ وہ مشرقی پاکستان میں بھی بہت مقبول تھے۔ نومبر 1962ء میں انہوں نے ڈھاکا بار کی دعوت پر دورہ کیا۔ وہیں ان کا انتقال ہوا۔ بستر کے قریب میز پر ان کی نامکمل تقریر دھری تھی جو وہ اس شام کرنے والے تھے۔

فواد عالم

جن کھلاڑیوں کو پاکستان کرکٹ کا مستقبل کہا جاتا ہے، ان میں ایک نام فواد عالم کا بھی ہے۔ ورلڈ کپ 2015ء کے بعد انہیں کپتانی کا مضبوط امیدوار تصور کیا جارہا تھا مگر قرعہ فال اظہر علی کے حق میں نکل آیا۔

بائیں ہاتھ سے بلے بازی کرنے والے فواد عالم نے 8 اکتوبر 1985ء کو کراچی میں آنکھ کھولی۔ کرکٹ کا شوق وراثت میں ملا۔ ان کے والد فرسٹ کلاس کرکٹ کے ایک جانے مانے کھلاڑی تھے۔ فواد نے اپنے باصلاحیت والد کے نقوش پا کا تعاقب کیا۔ 17 سال کی عمر میں فرسٹ کلاس کیریر کا

آغاز کرنے والے اس نوجوان نے اس فارمیٹ میں کامیابیوں کی کتنی ہی داستانیں رقم کیں۔ اس وقت وہ نیشنل بینک اور پاکستان اے ٹیم کی کپتان ہیں۔ انہوں نے 2007ء میں سری لنکا کے خلاف اپنا پہلا ون ڈے کھیلا۔ دو برس بعد اسی ٹیم کے خلاف ٹیسٹ ڈیبیو کیا۔ کو ٹیسٹ میں انہوں نے 168 رنز کی ایک یادگار اننگز کھیلی مگر انہیں فقط تین میچز ہی میں موقع مل سکا۔ انہوں نے 35 ون ڈے میچز میں 948 رنز اسکور کیے۔ 24 ٹی 20 میچز میں پاکستان کی نمائندگی کی۔ وہ الٹے ہاتھ سے گیند کرنے والے اچھے پارٹ ٹائم بولر ہیں۔ ان کا شمار موجودہ نسل کے بہترین فیلڈرز میں ہوتا ہے۔

خواجہ خورشید انور

خواجہ خورشید انور کو دھنوں کا جادوگر کہا جائے تو غلط نہیں ہوگا۔ مہدی حسن کی دل کش آواز میں ریکارڈ ہونے والا گیت ''مجھ کو آواز دے'' اور میڈم نورجہاں کے گائے ہوئے ''دل کا دیا جلایا'' اور ''رم جھم رم جھم پڑے پھوار'' ان ہی کی دھنوں پر مشتمل تھے۔

خواجہ خورشید انور 21 مارچ 1912ء کو میانوالی میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد خواجہ فیروز الدین ایک معروف وکیل تھے۔ انہوں نے 1935ء میں گورنمنٹ کالج لاہور سے فلسفے میں ایم اے کیا۔ 1936ء میں آئی سی ایس کا امتحان پاس کیا، لیکن ان کے انقلابی نظریات اور بھگت سنگھ کی تنظیم بھارت سبھا سے وابستگی راہ میں رکاوٹ بن گئی۔

سُروں سے دوستی بچپن ہی میں ہوگئی تھی۔ تخلیقی سفر کا آغاز 1939ء میں آل انڈیا ریڈیو، لاہور سے ہوا۔ 1941 میں بطور موسیقار فلمی انڈسٹری میں قدم رکھا۔ جلد اپنی جگہ بنا لی۔ 1953ء میں لاہور منتقل ہوگئے۔ پاکستانی فلم انڈسٹری میں ان کی آمد تازہ ہوا کا جھونکا ثابت ہوئی۔ انہوں نے انتظار، ہیر رانجھا اور کویل جیسی کامیاب فلموں کی موسیقی دی۔ فلم انتظار کا گانا ''چاند ہنسے دنیا بسے'' بہت مقبول ہوا، جو میڈم نورجہاں کی آواز میں ریکارڈ ہوا۔

شاعری اور ہدایت کاری بھی ان کی شناخت کا اہم حوالہ تھا۔ انہوں نے ہمراز، چنگاری اور گھونگھٹ جیسی معیاری فلمیں بنائیں۔ فیض احمد فیض کے ساتھ ان کی بہت اچھی دوستی رہی۔ خواجہ صاحب نے کبھی اصولوں پر سمجھوتا نہیں کیا۔ اس منفرد فن کار نے 30 اکتوبر 1984ء کو جہان فانی سے کوچ کیا۔ ان کی موت پر احمد راہی نے کہا تھا: ''عزت کی روٹی تو سب کھاتے ہیں لیکن عزت سے بھوکا رہنا صرف خورشید صاحب کو آتا تھا۔''

نعیم بخاری

ہیں تو وہ وکیل مگر شہرت کا اصل حوالہ ٹی وی شوز کی میزبانی۔ اس میدان میں وہ رجحان ساز قرار پائے۔

27 اکتوبر 1948ء کو لاہور میں پیدا ہونے والے نعیم بخاری کی بذلہ سنجی، بے ساختگی اور گفتگو میں پنجابی زبان کے تڑکے نے انہیں اپنے ہم عصروں میں نمایاں مقام عطا کیا۔

ان کے والد ڈاکٹر سید الطاف حسین بخاری ایک جانی مانی شخصیت تھے۔ نعیم صاحب معروف ٹیسٹ کرکٹر سلیم الطاف بخاری کے چھوٹے بھائی ہیں۔ انہوں نے پی ٹی وی کے کئی معروف شوز کی میزبانی کی۔ جیو ٹی وی کے مقبول

پروگرام ''خبرناک'' کی میزبانی بھی کی۔

بطور وکیل بھی ایک معروف شخصیت ہیں۔ متنازعہ بھی رہے۔ 2007ء میں ان کے چیف جسٹس افتخار چوہدری کے خلاف لکھے خط ہی کو اس عدالتی بحران کا بنیادی سبب تصور کیا جاتا ہے۔ اس کے بعد پرویز مشرف نے افتخار چوہدری کو معطل کر دیا تھا۔ اس واقعے کے بعد پنجاب بار کونسل نے ان کی ممبر شپ منسوخ کردی تھی۔

مرثیہ نگاری کے امام میر ببر علی انیس (1803تا1874) ایک روز مشق سخن میں محو گھر میں ٹہل رہے تھے۔ اہلِ بیت طیبین وطاہرین کی مدح میں ایک مصرع تو موزوں ہو گیا تھا۔ مگر اس پہ گرہ نہیں لگ رہی تھی مصرع تھا کہ۔

بانوئے نیک نام کی کھیتی ہری رہے

اسی کیفیت میں خاصی دیر گزر گئی میر انیس تخلیق کے سمندر میں غوطہ زن رہے۔ لیکن قدرت کی طرف سے یہ تاخیر خالی از علت نہیں تھی۔ تخلیق کے اس سفر میں کسی اور نے بھی ہم سفر بنا تھا۔ تخلیق کی لذت کہ جس کے آگے اس مادی دنیا کے تمام ذائقے ہیچ ہیں۔ بالآخر زندگی کی شریکِ سفر میر انیس کی اہلیہ محترمہ بول اٹھیں۔ ''حضرت! کس الجھن میں ہیں آپ؟''

میر انیس بولے۔ ''بیوی! ایک مصرع موزوں ہوا ہے اس پہ گرہ نہیں لگ رہی۔'' اس پر شریکِ حیات نے استفسار کیا۔ ''اجی۔ میں بھی تو سنوں۔ مصرع کیا ہے؟''

شاعرات

محمد ایاز راہی

ادب میں شاعری کو ایک خاص اہمیت حاصل ہے۔ اس صنف سخن کے گیسو کو سنوارنے میں شاعرات کی تعداد بھی کم نہیں اس دور میں جب لڑکیوں کو ابجد تک سکھایا نہیں جاتا تھا، اس دور میں بھی کئی شاعرات نے اعلیٰ درجے کی شاعری میں نام پیدا کیا۔

میرانیس نے مصرع سنایا۔

بانوئے نیک نام کی کھیتی ہری رہے

خاتونِ خانہ فوراً بولیں۔

صندل سے مانگ بچوں سے گودی بھری رہے

میرانیس بے ساختہ واہ کہہ اٹھے۔ یقیناً کسی بھی فن وہنر میں کامیاب مرد کے پیچھے عورت کا ہاتھ ہوتا ہے۔ شاعری کلی طور پر عطیہء خداوندی ہے۔ اسی لیے شاعر کو تلمیذ الرحمٰن (اللہ کا شاگرد) کہا جاتا ہے۔ بہ قول غالب

آتے ہیں غیب سے یہ مضامین خیال میں

غالب صریرِ خامہ نوائے سروش ہے

موزونیِ طبیعت یا ذہن انسان کا طرۂ امتیاز ہے فرشتے جنات یا کوئی دیگر مخلوق اس وصف سے عاری اور تخلیق کی لذت سے ناآشنا مخلوق ہے۔ خود قرآن پاک اعلیٰ نثر، نظم اور موزوں کلام سب کچھ ہے۔ سورہ رحمٰن کا صوتی آہنگ اور سورہ کوثر کا شاعرانہ انگ کسی تعارف کا محتاج نہیں، فنونِ لطیفہ میں شاعری کا شمار اولین اور بنیادی عنصر کے طور پر ہوتا ہے۔ دنیا بھر کا مذہبی ادب نیز ادب عالیہ کا بیشتر حصہ شاعری اور موزوں کلام پر ہی مبنی ہے۔ وہی بات کہ بہ قول انگریز شاعر جان کیٹس (31-10-1795 تا 23-02-1821)۔ ”شاعری رقص ہے اور نثر پیدل چلنے کا نام“۔ شاعری میں جہاں مردوں نے نام کمایا وہاں خواتین شعرا بھی نمایاں نظر آتی ہیں۔ مرد شعراء خدایان سخن کہلائے تو خواتین شعراء نے بھی صنف شاعری میں اَن مٹ نقوش چھوڑے اور دوام پایا۔ عورت ذات بنیادی طور پر تخلیق کا کام کرنے کے لیے وجود میں آئی ہے اسی لیے اسے باری (پیدا کرنے والی جنس) بھی کہا گیا اور پھر جہاں ہر دو تخلیقی کام (افزائش نسل اور ادب نگاری) ایک ہی ذات میں جمع ہو جائیں تو پھر عورت مرد سے یکسر علیحدہ، منفرد اور یکتا نظر آتی ہے چنانچہ یہ ذاتِ باری خدا اور انسان دونوں کا تخلیقی رنگ اپنا کر خود کو لافانی روپ میں ڈھالتی ہے۔ ایسے میں چند نابغہء روزگار خواتین نے مردوں کا چراغ بھی نہ جلنے دیا۔ گو کہ ایسی خواتین بہت کم کم ہیں مگر تاریخ کے صفحات پر نقش اور امر ہیں۔ ان کے فن اور عظمت کا اعتراف اپنے اپنے دور میں اپنوں پرایوں، مرد وزن اور چھوٹوں بڑوں سبھی نے کیا۔ عورت جس کا منصب چار دیواری کے اندر گھر کو جنت بنانا ہی ہوتا ہے اور جو چراغ خانہ کہلاتی ہے کہ اسی میں اس کی عزت وآبرو ہے۔ مگر پھر بھی چند خواتین نے اپنے علم وفن کے زور سے نہ صرف گھر بلکہ باہر پوری دنیا میں اجالا کیا اور ثابت کر دیا کہ

وجود زن سے ہے تصویر کائنات میں رنگ

نسوانی جمال۔ فن وہنر میں ڈھل کے اک چکاچوندی پیدا کر دیتا ہے۔ چند باکمال خواتین کا تعارف نذر قارئین ہے۔

سیفو (سافو) SAPPHO (600 قبل از مسیح)

یہ لازوال شاعرہ آج سے تقریباً دو ہزار چھ سو سال پہلے گزری ہے۔ اصل نام پسافو تھا یونان کی بہت بڑی شاعرہ اور نجیب الطرفین خاتون تھی۔ جزیرہ لیسبوس کی رہنے والی تھی مگر زندگی کا زیادہ حصہ شہر ”موتی لے نے“ میں بسر کیا جو ماں کا آبائی شہر تھا۔ باپ غالباً جزیرہ لیسبوس اور ایتھنز کی کسی جنگ میں مارا گیا تھا۔ اپنے خاندان یا سسرال کی سیاسی سرگرمیوں کی بناء پر سیفو کو جلاوطنی بھی کاٹنی پڑی اور کچھ عرصہ وہ جزیرہ سسلی (صقلیہ) میں بھی پناہ گزیں رہی۔ یہ وہی جزیرہ سسلی ہے جہاں سیفو سے کوئی تین سو سال بعد مشہور عالم انجینئر ریاضی دان ارشمیدس (287 تا 213 قبل از مسیح) علم وہنر کی روشنی پھیلاتا رہا اس کے دریافت کردہ علم وحکمت کے اصول آج بھی مسلم ہیں۔ سیفو عام سی شکل وصورت، چھوٹے قد اور سانولے رنگت کی خاتون تھی مگر قدرت نے اسے تخلیقی دولت سے مالا مال کر رکھا تھا۔ اس زمانے میں یونان کی قدیم ریاستوں میں عورت آزادی سے ابھی آشنا نہیں تھی مگر جزیرہ لیسبوس اس سلسلے میں قدرے آزاد تھا۔ چناں چہ سیفو نے لڑکیوں کے لیے باقاعدہ تربیت گاہ (اکیڈمی) کھول رکھی تھی۔ جہاں اچھے گھرانوں کی لڑکیوں کو تہذیب وآداب، گانا بجانا، رقص اور سکھڑاپے کی تعلیم دی جاتی تھی۔ تربیت گاہ میں حسن کی دیوی الفروڈائیٹ (وینس۔ زہرہ۔ ناہید۔ سوک۔ رتی وغیرہ) سے عقیدت کا خاص اہتمام ہوتا۔ دیوی کی مدح میں مل جل کر گیت گائے جاتے جو سیفو کی تخلیق بھی ہوتے، رقص بھی ہوتا، سیفو خود بھی کھل کر اپنے اندرونی جذبات اور احساسات کا اظہار کرتی اور دیگر لڑکیوں کی بھی حوصلہ افزائی کرتی۔ سو وہ ہم جنس پرست کے طور پر مشہور ہوگئی جو کہ بالکل غلط ہے اس کی آزاد خیالی اور روشن طبع کو غلط رنگ دیا گیا۔ سیفو شادی شدہ اور ایک بچی کی ماں تھی جسے اپنی بچی سے بے حد پیار تھا۔ اس کی اپنی زندگی میں اس کی شہرت بے داغ رہی مگر بعد میں صرف اس کے آزاد کلام کو دیکھ کر کسی نے اسے طوائف کہا تو کسی نے ہم جنس پرست۔ سیفو کا کلام سات یا نو کتابوں پر مشتمل ہے۔ مگر تمام نظمیں ادھوری اور ٹوٹی پھوٹی ہیں پھر بھی ان بے

ترتیب نظموں میں کم و بیش پچاس بحروں کا سراغ ملتا ہے۔ سیفو کی صرف ایک نظم ''رفعت مآب کے بارے میں'' تقریباً مکمل ہے۔ جب کہ ایک ہی نظم۔ ''الفروڈائیٹ دیوی سے التجا۔'' پوری اور مکمل ہے جس میں وہ حسن کی دیوی الفروڈائیٹ سے التجا کرتی ہے کہ۔ ''آؤ اور مجھ دکھیاری کی بگڑی بناؤ۔'' ایک نظم میں سیفو نے یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ شاعری، سخن ور کو غیر فانی بنا دیتی ہے۔ مغربی ادب میں یہ اوّلین تصور و خیال ہے۔ افلاطون (429 تا 347 قبل از مسیح) نے سیفو کو شاعری کی دسویں دیوی قرار دیا تھا۔ افلاطون جو بالآخر خیر کی فضیلت کا قائل ہو گیا تھا۔ سیفو کا ایک قول بھی انہی خیالات کا مظہر ہے کہ ''جو حسین ہے اس کے حسن تک نظر کی رسائی ہو سکتی ہے لیکن جو نیک ہے وہ بھی تو حسین ہوگا۔'' سیفو نے گیت میں داخلی جذبے کا اظہار کیا۔ گویا تنقیدی شعور کے ساتھ گیت کی صنف کو ہیئت کی موزونیت کے اعتبار سے داخلی جذبات کے اظہار سے وابستہ کر دیا۔ اسی کی کوکھ سے ODE (غنائیہ نظم) نے جنم لیا اور کورس گیت وجود میں آئے۔ بدقسمتی سے ہوا یوں کہ تقریباً سترہ صدیوں بعد 1071 عیسوی میں روم اور قسطنطنیہ میں عیسائیوں نے سیفو کے تمام کلام کو سر بازار آگ لگا کر راکھ کر دیا کہ یہ فحش اور مسیحی اخلاق کے خلاف ہے۔

الخنساء (575 تا 645 عیسوی)

جزیرہ عرب بلکہ عربی ادب کی سب سے بڑی مرثیہ نگار شاعرہ۔ عہد جاہلیت میں عکاظ کے سالانہ میلے میں اس شاعرہ کے خیمے پر جھنڈا نصب ہوتا جس پر لکھا ہوتا کہ۔ ارثی العرب۔ یعنی عرب کی سب سے بڑی مرثیہ گو۔ اسلام سے پہلے اور بعد میں بھی یکساں طور پر مقبول و معروف شاعرہ۔ عربی دنیا کی سب سے بڑی، جامع، کامل ترین اور زندہ زبان ہے خود کو عرب (بولنے والا) اور باقی دنیا کو عجم (گونگا) کہنے والے سماج میں ''ارثی العرب'' کا دعویٰ اور پھر اس دعوے کو برقرار رکھنا اس پہ پورا اترنا۔ اللہ اللہ۔ اک شخصی معجزہ ہی تو ہے۔ خنساء کس پائے کی عالمہ اور شاعرہ تھی۔ آیئے۔ دیکھتے ہیں۔ بازار عکاظ کے مشہور سالانہ میلے میں بڑا مشاعرہ تھا۔ صدارت نابغہ الذبیانی کر رہا تھا۔ خنساء نے بڑا زوردار قصیدہ پیش کیا۔ صدر مشاعرہ بے اختیار کہہ اٹھے کہ ''ابھی اگر ابو بصیر الاعشیٰ نے پہلے اپنا قصیدہ نہ سنا دیا ہوتا تو میں فیصلہ دے دیتا کہ ''اے خنساء۔ اس میلے میں جتنے شعراء ہیں نہ صرف ان میں تو سب سے بڑی شاعرہ ہے بلکہ انسانوں اور جنات میں بھی تو سب سے بڑی شاعرہ ہے۔'' اس موقع پر حسان بن ثابت بھی موجود تھے۔ انہوں نے جب نابغہ کے منہ سے خنساء کی یہ تعریف سنی تو بولے۔ ''نابغہ! میں تجھ سے اور اس خنساء سے بھی بڑا شاعر ہوں۔''

نابغہ بولا۔ ''بات ایسی تو نہیں۔'' پھر خنساء کو جواب دینے کا اشارہ کیا۔ سو۔ خنساء نے حسان سے کہا کہ اچھا۔ ابھی آپ نے اپنا جو قصیدہ پڑھا ہے اس کا سب سے اچھا شعر کون سا ہے؟ حسان نے کہا میرا یہ شعر کہ۔

لنا الجفنات الغر یلمعن بالضحیٰ
واسیافنا یقطرن من نجدۃ دما

شعر سن کو خنساء نے تنقید کی کہ آپ نے اپنے اس شعر میں اپنے فخر کو محدود اور کم زور طریقے سے ظاہر کیا ہے اور سات آٹھ جگہ نقص پیدا کر دیا ہے۔ حسان نے پوچھا وہ کیسے؟ تو خنساء بولیں آپ نے جفنات کا لفظ استعمال کیا ہے جو دس سے کم کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ جفان کہا ہوتا تو زیادہ مناسب ہوتا پھر آپ نے الغر کہا ہے اور الغرہ صرف پیشانی کی سفیدی کو کہتے ہیں۔ یہاں۔ بیض۔ کا لفظ مناسب لگتا۔ اسی طرح آپ نے یلمعن۔ کا لفظ لیا ہے اور لمعان اس چمک کو کہتے ہیں جو مستقل نہیں رہتی آتی جاتی رہتی ہے۔ یہاں یشرقن (دیرپا چمک) لفظ لگانا تھا آپ نے بالضحیٰ کہا ہے، بالدجی کہنا تھا۔ معنی بھرپور ہو جاتے۔ اسی طرح ''اسیاف'' دس سے کم تلواروں کو کہتے ہیں۔ آپ یہاں سیوف کہتے تو بہتر تھا۔ یقطرن کی بجائے یسلن زیادہ کے معنی دیتا ہے۔ آپ نے ''دما'' لفظ رکھا ہے حالانکہ ''الدما'' کے لفظ میں زیادہ وسعت ہے۔ اس پر حسان خاموش رہے اور کچھ بھی نہ بول سکے۔ حضور علیہ السلام خود خنساء سے اشعار سنتے اور داد دیتے، فرماتے۔ ''ہاں بھئی خناس۔ کچھ سناؤ۔''

اس نادر روزگار شاعرہ کا اصل نام تماضر تھا۔ عربی میں خنساء چپٹی ناک کو کہتے ہیں چوں کہ تماضر کی ناک پیدائشی چپٹی تھی۔ اس لیے الخنساء (چپٹی ناک والی) لقب پڑ گیا۔ وہ عرب کے مشہور قبیلے مضر سے تھیں۔ باپ قبیلے کا سردار۔ دونوں بھائی معاویہ اور صخر خاندان کا فخر تو قبیلے کی آنکھ کا تارا تھے۔ اس خاندانی پس منظر کے ساتھ خنساء ایک خوددار، باوقار اور بھاری بھر کم شخصیت کی حیثیت سے ابھریں۔ بھائیوں سے بہت پیار تھا۔ وہ بھی بہن پر جان دیتے تھے۔ بدقسمتی سے دونوں بھائیوں کا قتل خنساء کو ہمیشہ کے لیے رلا گیا۔ آگے چل کر جنگ قادسیہ میں چار جوان بیٹوں کی شہادت اسے تنہا کر گئی یوں کلام کا رنگ۔ بدل گیا۔ عربی ادب کی پہلی شاعرہ جس نے

دل گداز مرثیہ گوئی کی بنیاد ڈالی اور اس میں مردوں کو بھی مات کر دیا بلکہ ضرب المثل بن گئی۔ خنساء کا مکمل دیوان موجود ہے۔ کئی بار چھپ چکا ہے۔

قرۃ العین طاہرہ

(1817تا1852-08-27عیسوی)

فارسی زبان کی بے بدل شاعرہ۔ ایک طرف علم وفن پر مکمل دست رس تو ساتھ ہی قدرت کا عطا کردہ بے پناہ حسن اور جمال۔ نتیجہ یہ کہ اپنے وقت میں بڑے بڑے دینی علماء ادباء اور خصوصاً شعراء کو بے بس کر ڈالا۔ وہ بلند پایہ حسین عالمہ شاعرہ کہ بعد میں شاعر مشرق علامہ اقبالؒ۔ رابندر ناتھ ٹیگور۔ پنڈت جواہر لال نہرو۔ بلبل ہند سروجنی نائیڈو اور دیگر بہت سے بڑے لوگ متاثر رہے۔ اہلِ مغرب بھی اس نادر روزگار خاتون کے مداح ہیں۔ یہ یکتائے زمانہ خاتون انیسویں صدی کی دوسری دہائی کے آخر میں وہاں ایران کے شہر کہنہ قزوین جو اب تہران کے مضافات میں ہے حاجی ملا صالح کے گھر اس نے جنم لیا۔ اپنے تایا حاجی ملا تقی کی بہو ٹھہری۔ بچی کی ذہانت کے پیش نظر والد نے گھر پہ ہی تعلیم دی کہ اس زمانے میں ایرانی معاشرہ عورتوں کی آزادی کے سخت خلاف تھا اور اصل بادشاہ ناصرالدین قاچار (1831-07-16 تا 1896-05-01عیسوی) برائے نام بادشاہ تھا اصل حکومت علمائے دین کی تھی۔ اس عظیم شاعرہ کا پیدائشی نام فاطمہ برغانی تھا۔ برغانی خاندان کا نام تھا۔ والد پیار سے زرین تاج کہتے اور باقی خاندان والے اسے ام سلمٰی کے نام سے پکارتے تھے۔ اس خاتون نے بعد میں جب بزرگ عالم سید کاظم رشتی سے خط کتابت کا سلسلہ شروع کیا تو سید صاحب بڑے متاثر ہوئے اور اسے قرۃ العین (آنکھوں کی ٹھنڈک) کا لقب دیا۔ گو کہ دونوں کی ملاقات کبھی نہیں ہوئی۔ آگے چل کر قرۃ العین نے جب علی محمد باب کا ایجاد کردہ نیا دین بابی مذہب اپنایا تو علی محمد باب نے اسے طاہرہ (پاک صاف) کا لقب دیا۔ ان دونوں کی بھی ملاقات کبھی نہ ہو سکی۔ بابی یا بہائی مذہب کے راہنما اور پیروکار اسے ام عالم کے نام سے یاد کرنے لگے۔ مگر تاریخ میں یہ خاتون قرۃ العین طاہرہ کے نام سے ہی مشہور ومعروف ہوئی اور باقی ساری عمر بہائی مذہب کی پُرجوش مبلغ رہی۔ ایرانی حکومت جان کے درپے ہوئی تو روپوشی کی حالت میں نگر نگر گھومتی تبلیغ کرتی رہی۔ لوگ لعنت ملامت اور کلوخ اندازی کرتے مگر یہ ڈٹی رہی۔ بہائی مذہب کے پیروکار ہر دم اس کے ساتھ رہتے اور حسن بن صباح کے فدائین کی مانند ہر وقت جان دینے اور جان لینے پہ آمادہ وسرگرم رہتے۔ کرمان شاہ میں قرۃ العین طاہرہ نے وقت کے مجتہد عبداللہ سیانی کو مناظرے میں شکست دے دی۔ وہ بھی اس طرح کہ شاہ قاچار کے دربار میں مناظرہ ہو رہا تھا۔ ایک جانب مجتہد عبداللہ سیانی تھے اور ان کے ساتھ تقریباً پچاس علما جبکہ دوسری جانب قرۃ العین اور اس کے ہمنوا بہائی گروہ مناظرہ شروع عروج پہ پہنچا اور قرۃ العین کی شکست یقینی تھی کیونکہ علما نے قرآنی آیات اور ٹھوس دلیل سے ثابت کرنا شروع کر دیا تھا کہ آقائے دو جہاں ختم الرسل ہیں اور ان کے بعد کوئی رسول کوئی نبی نہیں آ سکتا۔ اسی دوران قرۃ العین اپنی جگہ سے کھڑی ہوئی اور اس نے سر سے چادر اتار دی۔ علما اس کے حسن جہاں سوز پر گھبرا اٹھے اور لاحول پڑھتے ہوئے دربار سے باہر نکل گئے۔ اس کا کہنا تھا کہ بہائی مذہب میں پردے کا تصور نہیں ہے اور علما کا کہنا تھا کہ ہم بے پردہ عورت سے مناظرہ نہیں کریں گے۔ جب کہ مفتی بغداد اور دیگر کئی اہم دینی علماء اس ساحرہ کے حسن سے متاثر ہو کر بہائی مذہب اپنا چکے تھے۔ سخت ترین حالات میں بھی قرۃ العین طاہرہ اگر کچھ کہتی بھی تو بس اتنا ہی کہتی کہ یہ محبوب کی باتیں بیان کرنے میں جو بھی مصیبتیں تکلیفیں آئیں کم ہیں۔ بالآخر گرفتار ہو کے قیدی کی صورت ایلخانی (شاہی) باغ میں لائی گئی۔ مشیدی جلاد کو قتل کرانے کے لیے بھیجا گیا مگر وہ فوراً واپس بھاگ آیا کہ نہیں میں اتنی خوبصورت عورت کا گلا نہیں گھونٹ سکتا۔ جلاد کو دوبارہ ڈرا دھمکا کے بہ زور بھیجا گیا تھوڑی دیر بعد آ کر وہ رونے لگ گیا۔ ”تم لوگوں نے مجھ سے آج کتنا بڑا گناہ کا کام کرایا ہے۔“ شاہی ملازموں نے جا کر دیکھا تو قرۃ العین طاہرہ آخری سانسیں لے رہی تھی اسے اسی زندہ حالت میں قریبی کنویں میں دھکیل دیا گیا اور کنواں پاٹ دیا گیا یوں انسانی حسن اور حسن بیاں عبرت ناک انجام سے دوچار ہوا۔

دیکھو مجھے جو دیدہ عبرت نگاہ ہو

قرۃ العین طاہرہ کا کلام اور دیگر تحریریں جلا کر راکھ کر دی گئیں۔ تینوں شاعرات (سیفو۔ الخنساء اور قرۃ العین طاہرہ) کے درمیان تقریباً بارہ بارہ صدیوں کا فاصلہ ہے۔ علامہ اقبالؒ نے قرۃ العین طاہرہ کی انگریز پیروکار اور مداح مارتھا روٹ (1872-08-10تا1939-09-28) سے ملاقات کی اور قرۃ العین طاہرہ کی شاعری اور اس پر مارتھا روٹ کا کیا گیا تحقیقی مواد بھی حاصل کیا۔ مارتھا روٹ بہائی ہو گئی تھی۔

سفرِ امریکا

علیم شاہد

تیسرا حصہ

سفر وسیلہ ظفر کہلاتا ہے مگر اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ سفر تجربے کی دولت سے بھی مالا مال کرتا ہے۔ علیم شاہد کا تعلق قلم قبیلے سے ہے اس لیے انہوں نے اس سفر کو ایک نئے زاویے سے احاطہ تحریر میں لایا ہے۔ اس سفر نامے میں آپ کو امریکا ایک نئے انداز میں سامنے آتا محسوس ہو گا۔

سفرنامہ پسند کرنے والوں کے لیے ایک جداگانہ تحریر

گولڈن گیٹ برج کا اوپر ذکر آیا ہے اس کے متعلق لکھنے کا سوچتا ہوں تو قلم ساتھ نہیں دیتا کہ یہ حسین، یہ خوب صورت، یہ عظیم پل کس طرح بنایا گیا ہے۔ یہ پل سان فرانسسکو کی وجہ سے مشہور ہے یا سان فرانسسکو شہر اس پل کی وجہ سے مشہور ہے۔ اس پل کی خوب صورتی میلوں دور سے نظر آتی ہے جیسے آسمان اور سمندر کی درمیانی فضا نے گلے میں سونے کی چمپاکلی پہن رکھی ہے۔ جس علاقے میں یہ پل ہے یہاں سمندر کی لہریں اپنی بھرپور قوت سے جوار بھاٹا دکھاتی ہیں۔ یہاں پل کے دونوں طرف پکی پتھریلی اور پانی سے بہت اونچی سنگین چٹانیں ہیں۔ یہاں 80-90 میل فی گھنٹے کی رفتار سے ہوائیں چلتی ہیں۔ یہاں بادل تیرتے ہیں، دھند چھا جاتی ہے اور دور تک فضا کو اپنی لپیٹ میں لے لیتی

ہے۔ جب بادل اور دھند فضا میں چھاتے ہیں تو روشنی سے
آنکھ مچولی ہونے لگتی ہے اور پل بھی اس آنکھ مچولی میں شامل
ہو جاتا ہے۔ کبھی غائب ہو جاتا ہے صرف اس کے پلرز نظر
آتے ہیں۔ کبھی صرف جھولا نظر آتا ہے۔ کبھی ایک کنارہ نظر
آتا ہے کبھی دوسرا کنارہ نظر آتا ہے۔ یہ پل سان فرانسسکو
کے اور شمالی علاقے ساسی لوٹو کے درمیان ایسی جگہ واقع ہے
جہاں اس کا بنانا آج بھی انسان کی سوچ سے بالاتر ہے۔ لیکن
خدا جسے توفیق دے۔ اس پل کا خواب اور تصور جوزف۔ برمین
اسٹراس کا مرہونِ منت ہے۔ برمین شکاگو کا انجینئر تھا جس
نے بہت سے پل ڈیزائن کیے تھے۔ برمین صبح کی چہل قدمی
کرنے جب اس پہاڑی چٹان کے قریب پہنچا تو بارش ہو چکی
تھی اور Ranbow یعنی قوس و قزح، سات رنگوں کی
دھنک کے ایک ہالہ نور نے سمندر کی دونوں جانب پہاڑیوں
کو ملا دیا تھا۔ اسے اسی وقت خیال آیا کہ اس دشوار گزار
علاقے میں جہاں گہرا اور پھرتا سمندر ہے جہاں دونوں
طرف اونچی سنگین پہاڑی چٹانیں ہیں صرف ایسے ہی پل بن
سکتا ہے جیسا کہ قدرتی دھنک کے کنارے دونوں پہاڑ کی
چوٹیوں پر ٹل رہے ہیں۔ یعنی دونوں طرف پہاڑیوں پر سنگین
چبوترے ہوں اور مضبوط فولاد کے ستون ہوں اور ستونوں
کے درمیان جھولے کی شکل کا برج ہو۔ برج کو سنبھالنے کے
لیے کیبل روپس ہوں یعنی تاروں سے بٹی ہوئی رسیاں ہوں
اور ان رسیوں کو ستون سنبھالیں۔ غرض بڑی کاوش، محنت اور
کثیر سرمائے سے یہ پل 1937ء میں وجود میں آیا۔ اس پل
کی تعمیر پر ساڑھے تین کروڑ ڈالر خرچ ہوئے۔ اس کے ٹاور
746 فٹ اونچے ہیں جن پر سے 2 بڑے کیبل تاروں کے
گچھے جن کی موٹائی 36 انچ ہے اتارے گئے ہیں۔ ہر 50
فٹ پر لوہے کی رسیاں ان دو کیبلوں سے لٹکتی ہیں اور نیچے
کنکریٹ کی پل کی سڑک اور سڑک کے سائیڈ پیدل چلنے
والوں کی گلیوں کو سنبھالتی ہیں یعنی پل کے ٹریک کو آہنی رسیاں
ہر 50 فٹ سے سنبھالتی ہیں اور 36 انچ موٹے بڑے کیبل
ان رسیوں کو سنبھالتے ہیں اور فولادی ستون دونوں جانب
ان کیبلوں کو سنبھالتے ہیں اور فولادی ستون چٹانوں کے
سنگین پلیٹ فارم سنبھالتے ہیں۔ گولڈ گیٹ امریکا کی ہائی
وے سڑک 101 سے جڑ جاتا ہے۔ یہ عظیم سڑک میکسیکو سے
کناڈا تک پیسفک کوسٹ کے ہمراہ کھنچی چلی جاتی ہے۔ یہ
سڑک سان فرانسسکو شہر کو ساسی لوٹو، میرین کاؤنٹی اور کیلی
فورنیا کے شمالی حصوں سے ملاتی ہے۔ اس پل نے سان
فرانسسکو کی رگوں کو شمالی کاؤنٹیز میں پھیلا دیا ہے۔ جو شہر کے
لوگوں کو پسندیدہ ذہنی آسودگی اور تازگی مہیا کرتی ہے۔ اس
پل کا ایک حصہ پانی میں ہے جو ساحل کی سطح سے 1125
فٹ نیچے ہے۔ برج کے دونوں کناروں کے ہیوج پاکٹس
یعنی بھاری چبوتروں کو پتھریلی سنگین چٹانوں کے ساتھ ہیوی
کنکریٹ سے جوڑا گیا ہے۔ ہر ستون کے چبوترے پر تیس
ہزار مکعب فٹ کنکریٹ استعمال کی گئی ہے۔ برج کی تعمیر پر لوہا
80,000 ٹن استعمال ہوا۔ اس پل کی لمبائی 8981 فٹ
ہے جب کہ درمیانی جھولا 4200 فٹ ہے جھولے کی
اونچائی سطح سے 220 فٹ بلند ہے۔ پل کی چوڑائی 90 فٹ
ہے۔ پل پر سے روزانہ ایک لاکھ گاڑیاں گزرتی ہیں۔ اس
پل کا رنگ اورنج ہے لیکن سورج کی شعاعیں اسے گولڈن
گیٹ میں تبدیل کر دیتی ہیں۔ یہ پل دو علاقے کے لوگوں کی
سہولت کے لیے بنایا گیا تھا لیکن اس کی بناوٹ اس کی خوب
صورتی، اس کی جھلملاہٹ اس کے قریب کے باغات، ہری
بھری پہاڑیوں، اس کے قریب کی ساحلی چٹانوں، پچیز نے
اسے سان فرانسسکو بلکہ کیلی فورنیا کی بلکہ امریکا کی حسین
خوشگوار تفریح گاہ بنا دیا ہے۔ جہاں بارہ مہینے دنیا بھر کے
سیاحوں کا میلہ لگا رہتا ہے۔ یہاں آ کر پل کی صناعی دیکھ کر
قدرت کے نظاروں اور موسم کے کرشموں سے اپنی آنکھوں
اور روح کو سرشار کرتے ہیں۔ بے انتہا فوٹوگرافی کرتے
ہیں۔ غرض گولڈن گیٹ امریکا کا تاج محل ہے۔

ایک دن حسب معمول میں 7 بجے سان فرانسسکو
پاول اسٹیشن سے واپس آ رہا تھا۔ جلدی میں غلط ٹرین میں
بیٹھ گیا جو ڈائریکٹ ڈبلن نہیں جاتی تھی۔ لہٰذا میں بے ایریا
کے Lake Merit اسٹیشن پر اتر گیا تاکہ دوسری ٹرین
پکڑ لوں جو ڈبلن جاتی ہو۔ دسمبر کا مہینا، سخت سردی، کھلا
پلیٹ فارم سنسان پڑا تھا، ہوائیں سرسر چل رہی تھیں۔ ایک
روشنی کے پول کے ساتھ لگی ایک سنہرے بالوں والی گوری
حسینہ کھڑی تھی اور بے تحاشا رو رہی تھی۔ آواز نہیں آ رہی تھی
لیکن ہچکیاں رک نہیں رہی تھیں۔ تنہائی کے خوف میں بھی
مجھے اس سے ہمدردی ہوئی لیکن قریب جانے کی ہمت نہیں
ہوئی۔ اتنے میں گاڑی آ گئی میں اندر گیا اور سیٹ پر بیٹھ گیا۔
اسی دروازے سے وہ عورت بھی اندر آئی اور میرے قریب
ہی بیٹھ گئی۔ کمپارٹمنٹ خالی تھا صرف چند ہی مسافر بیٹھے
تھے۔ میں نے ہمت کر کے اس سے پوچھا۔ If you
not mind کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ آپ اتنی افسردہ

اور رنجیدہ کیوں ہیں۔ اس نے میری جانب دیکھا۔ میرے ہاتھ میں رومال تھا وہ میں نے اس کی طرف بڑھا دیا اور کہا آپ چہرہ صاف کر لیجیے۔ اس نے رومال مجھ سے لے کر چہرہ جو آنسوؤں سے تر تھا خشک کیا اور بہت ہلکی سنجیدہ مسکراہٹ سے میرا شکریہ ادا کیا۔ تھوڑا توقف کیا اور کہنے لگی تھوڑی دیر پہلے میرا شوہر سے جھگڑا ہو گیا اور اس نے میری بے عزتی کی اور مجھے چھوڑ کر چلا گیا۔ میں اپنے شوہر سے پیار کرتی ہوں۔ اس کا ہر طرح خیال رکھتی ہوں۔ اس قسم کے سلوک کا نہ مجھے اندازہ تھا نہ تجربہ۔ لہٰذا مجھ سے برداشت نہ ہو سکا اور بے اختیار میں پلیٹ فارم پر اکیلی روتی رہی۔

میں نے اندازہ لگایا کہ امریکی خواتین پڑھی لکھی، دبنگ اور حوصلہ والی ہوتی ہیں۔ سروس اور کاروبار کرتی ہیں۔ اکیلے سفر بھی کرتی ہیں لیکن اندر سے روایتی عورت ہی ہوتی ہیں۔ یعنی نازک بدن، حساس اور نازک خیال۔ کسی کی دی ہوئی خوشی سے نہال ہو جاتی ہیں اور بے رخی، بے عزتی کو برداشت نہیں کر پاتیں اور آزردہ ہو جاتی ہیں۔

میں نے اسے بتایا کہ نووارد ہوں، ٹورسٹ ہوں لیکن آپ کی بے چینی، بے کیفی سے میں بھی رنجیدہ خاطر ہوا ہوں۔ اگر آپ میری بات مانیں تو گھر جائیں اور شوہر سے صلح کر لیں۔ شوہر اور بیوی دکھ سکھ کے ساتھی ہوتے ہیں۔ ہمدم و ہمراز ہوتے ہیں۔ ایک دوسرے کے لیے جیتے ہیں۔ دونوں میں چھوٹی موٹی غلط فہمیاں اور جھگڑے ہوتے رہتے ہیں کیوں کہ یہ انسان کی فطرت ہے۔ مرضی کے خلاف چھوٹی سی بات پر بگڑ بھی جاتا ہے اور چھوٹی سی خوشی سے جھوم بھی اٹھتا ہے اور بڑا مزہ اس ملاپ میں ہے جو کسی رنجش کسی اختلاف کے بعد ہوتا ہے۔ میری باتوں کو وہ غور سے سنتی رہی۔ اس کی کلفت بہت حد تک ختم ہو گئی۔ چہرہ جو سفید پڑ رہا تھا اس پر ہلکی سی سرخی کی رمق، مسکراہٹ اور بشاشت آ گئی۔ کہنے لگی اس وقت آپ کی ہمدردی نے مجھے بڑا سکون اور ڈھارس دی ہے۔ میں آپ کا بہت شکریہ ادا کرتی ہوں۔ حالانکہ میرا ارادہ ماں کے گھر جانے کا تھا لیکن جیسا آپ نے کہا میں گھر جاؤں گی۔ اپنے شوہر کو راضی کروں گی اور آپ کی غیر موجودگی میں ہم دونوں آپ کے مشکور ہوں گے۔ دیکھتے ہی دیکھتے Castro Velly کا اسٹیشن آ گیا اور Dorothy مجھ سے اجازت لے کر ٹرین سے اتر گئی۔ میرا اگلا اسٹیشن ڈبلن تھا۔

☆......☆

سان فرانسسکو بھی ایک عجوبۂ روزگار شہر ہے۔ یہاں کی ہر چیز قابلِ ذکر ہے۔ یہاں کے دانش وروں نے بڑی محنت، حکمت اور دور اندیشی سے اس شہر کی پلاننگ کی ہے۔ ہر جگہ، ہر تعمیر میں ایک رنگ ہے، ایک ڈھنگ ہے اور ایک سلیقہ ہے۔

شہری زندگی میں وہ سہولتیں عوام کو مہیا کی گئی ہیں کہ ان کو اس ملک سے بے حد لگاؤ اور اپنے شہروں سے پیار ہو گیا ہے۔ قانون کی پاسداری، اصول کی پابندی، زندگی کے معاملات میں ترتیب و تنظیم یہاں کے مزاج میں رس بس گئی ہے۔ شہر میں بڑے بڑے اسٹور ہیں جو ضرورت کے سامان، سامان تعیش، کپڑے، جوتے، کراکری اور سامان، الیکٹرونک سے بھرے پڑے ہیں۔ دنیا کے بہترین اور ہر ملک کے ریستوران ہیں۔ بڑے بڑے ہوٹل ہیں۔ میوزیم ہیں۔ آرٹ گیلریز ہیں غرض انسان کی دل بستگی کا ہر سامان آسان اور مہیا ہے لوگ محنت کرتے ہیں۔ اپنے آپ کو بنا سنوار کے رکھتے ہیں۔ خوش رہتے ہیں۔ دوسروں کی خوشی میں حائل نہیں ہوتے اور امن سے رہتے ہیں۔ یہاں کی آرٹ گیلریز بھی دنیا کے مصوروں کے فن پاروں سے سجی رہتی ہیں۔ یہاں De-Young میوزیم ہے جس نے دنیا کے عظیم نامور مصور کی شاہکار نادر روزگار تصویروں، پینٹنگز کی یادگار نمائش کا اہتمام کیا تھا۔ مجھے بھی شوق ہے میں بھی پہنچ گیا۔ ٹکٹ فیصل نے بک کرا دیا تھا۔ سینئر ہونے کی وجہ سے 26 ڈالر کا ٹکٹ 18 ڈالر میں ملا۔ میں اندر گیا تو حیران رہ گیا سب سے پہلے تو میوزیم کی عمارت ہی ایک منفرد شاہکار تھی۔ بہت عمدہ ریسپشن، انکوائری پر رہنمائی کرنے والے خوش لباس، خوش اخلاق لوگ۔ بہت خوب صورت کمرے، منزلیں، راہداریاں۔ عمدہ ڈیکوریٹڈ فرنیچر، بہترین لائٹنگ کا انتظام، کیفے ٹیریا، سووینیر شاپس، اجلے اجلے مسکراتے ویل ڈریسڈ منتظمین رہنمائی کے لیے موجود تھے۔ یہ نمائش فرانس کی مشہور زمانہ آرٹ گیلری Musee de Orsay کے تعاون سے لگائی گئی تھی۔ فائن آرٹس میوزیم آف سان فرانسسکو کے لیے بڑے فخر اور اعزاز کی بات تھی کہ اس نے دنیا کی بہترین تصاویر کی فرانس کے تعاون سے امریکا میں پہلی اور آخری اس معیار کی نمائش کا اہتمام کیا تھا (ایسی نمائش کا مستقبل میں فرانس کی گیلری سے باہر امکان نہیں ہے)۔ ہر کمرے میں نایاب شاہکار پینٹنگز کو اس خوب صورتی سے اس سلیقے

سے سجایا گیا تھا جیسا کہ ان کا حق تھا۔ امریکا بھر کے آرٹ کے شوقین، بڑے بڑے شاعر، رائٹرز، میڈیا کے لوگ، یونیورسٹیوں کے پروفیسرز، آرٹ کے طالب علم اور دانشور جمع تھے اور اپنے علم کی پیاس بجھا رہے تھے۔ کسی کمرے میں وان گوگ کے فن پارے تھے جن میں Starry Night کی جگمگاہٹ نے کمرے کو روشن کر دیا تھا۔ کہیں پال گاگن کی تصویروں میں Tahiti Women کو سجایا گیا تھا۔ کسی جگہ جارج مسیورت اور پاک سگنیک کی The Sircus اور Women at Well بہار دکھلا رہی تھیں۔ کسی راہداری میں ہنری روسو The Snake Charmer چمک رہی تھی۔ کسی کمرے میں پیری بونارڈ کی The checked Blouse تھی اور کسی جگہ پال سوزانے کی Still Life With Onions تھی۔ شائقین سے کمرے بھرے ہوئے تھے۔ لوگ بڑی توجہ سے بڑی تمیز سے ان تصویروں کو دیکھ رہے تھے۔ سمجھ رہے تھے۔ بنانے والوں کے حالات زندگی پڑھ رہے تھے۔ نوٹ کر رہے تھے۔ میں صرف چند تصویروں کے عنوان نوٹ کر سکا تھا جب کہ ہر فن پارہ انمول تھا۔ جن کا نیلام اگر ہو تو ہر پینٹنگ کی بولی دو دو، چار چار سو ملین ڈالر سے اوپر جائے۔ یہ تمام تصویریں انیسویں صدی کے آخر کی ہیں۔ ہر تصویر کی قیمت آج 25 سے 50 کروڑ روپے یا اس سے بھی زیادہ بنتی ہے۔ مجھے نادر روزگار، دنیا کے نامور آرٹسٹوں کی پینٹنگز دیکھنے کا شوق ضرور ہے لیکن اس فن کو سمجھنے کی صلاحیت نہیں ہے۔ پھر بھی ان مشہور زمانہ تصاویر کو دیکھ کر میں حیران تھا کہ آسمانوں کی، زمینوں کی، فضاؤں کی، سمندروں کی، انسانوں جانوروں کی، پھولوں پھلوں کی حقیقت سے قریب، رنگوں اور زندگی سے بھرپور، منہ بولتی ہوئی یہ تصویریں آج سے ڈیڑھ سو دو سو سال پہلے کے آرٹسٹوں نے بنائی تھیں۔ جن کی زندگیاں فاقہ مستی میں، کرائے کے مکانوں میں، یتیم خانوں میں گزر گئیں۔ کسی نے زندگی کے بوجھ سے تنگ آکر خودکشی کر لی۔ کوئی خیراتی اسپتال میں مر گیا۔ آج ان کی تصویروں کی نمائش کا اہتمام بینک آف امریکا۔ امریکا اور یورپ کے ارب پتی ادارے کرتے ہیں۔ سیکیورٹی کے حساس ادارے گیلریوں کی حفاظت کرتے ہیں۔

ان پینٹنگز نے آج کی ترقی یافتہ، تہذیب یافتہ اور دنیا کی شہرت یافتہ گیلریوں کو سجا دیا ہے۔ ان تصویروں کے بنانے والوں کا کمال یہ ہے کہ ان کے بعد مصوری کے شوق کو بڑا عروج حاصل ہوا۔ ان کی تصویروں کو دیکھ کر ان سے سیکھ کر آرٹسٹ ہزاروں پیدا ہو گئے لیکن ڈیڑھ صدی گزر گئی ایسی تصویریں کوئی نہ بنا سکا۔

آج دنیا کے تعلیم یافتہ اور دانش وران تصویروں کو ان پینٹنگز کو دیکھنے سبق لینے دور دور سے آتے ہیں۔ گھنٹوں کھڑے ہو کر دیکھتے ہیں۔ مصوروں کے حالات زندگی کا مطالعہ کرتے ہیں اور چلے جاتے ہیں۔ میں بھی دیکھتا رہا اور دیکھتا چلا گیا۔

میں میوزیم سے باہر آیا۔ 44 نمبر کی mussi بس پکڑی اور ڈاؤن ٹاؤن اتر گیا۔ چھ بج گئے تھے۔ سردی بڑھ رہی تھی۔ شہر میں رونق عروج پر تھی پورا ڈاؤن ٹاؤن روشنی سے جگمگ کر رہا تھا۔ سیاحوں، خریداروں، تفریح کرنے والوں، دنیا کے بہترین فیشن کرنے والوں کا ہجوم تھا۔ اونچی اونچی عمارتیں تھیں۔ فائیو اسٹار ہوٹل تھے بڑے بڑے ریستوران تھے۔ ہر گلی میں اسٹور تھے۔ ابھی میں آرٹسٹوں کی پینٹنگز دیکھ کر آرہا تھا اب شہر میں قدرت کے شاہکار دیکھ رہا تھا۔

کل من علیہا فان کہتا ہوا میں سوک سینٹر بارٹ اسٹیشن میں اتر گیا۔ ٹکٹ بچ گیا۔ ڈبلن پلیزنٹن بارٹ پکڑی جس نے ایک گھنٹے میں مجھے ڈبلن پہنچا دیا۔ راحت آئی اور مجھے لے گئی۔

اس عظیم الشان نمائش کے انعقاد پر فرانس کے صدر سرکوزی نے بھی اظہار خیال کرتے ہوئے جس انداز سے مصوری کی تاریخ پر روشنی ڈالی۔ وہ قابل توجہ ہے اور ذہن کے دریچوں کو کھول دیتی ہے۔ فرماتے ہیں۔ ''مصوری کا فن وہ ہے جو سب کی توجہ کا مرکز ہے۔ جس کا سفر دنیا کے ہر گوشہ پر ہو ہر عہد میں ہو۔ ایسے فنی شاہکار جو عالمی مزاج رکھتے ہوں وہ کسی بھی فرد کے ہوں وہ باہمی ملکیت و مقبولیت کے حامل ہوتے ہیں۔ میوزیم کا کردار ان فن پاروں، شاہکاروں کی دیکھ بھال رکھنا اور ان کی حفاظت کرنا ہوتا ہے۔ میوزیم اچھی مصوری کو پروڈیوس کرتے ہیں روشناس کراتے ہیں اور اشاعت کے ذمہ دار بھی ہوتے ہیں۔ Musee-de-Orsay کئی سالوں سے نمائش اور مظاہرے کے اہتمام کر رہا ہے۔ 2010ء اور 2011ء میں فرانس میں اپنی گیلریز کو سجانے اور اس کی آرائش کے

دوران اپنے بہترین مصوری کے ذخیرے کے کچھ حصہ کے ساتھ سفری نمائش کا اہتمام دوسرے ممالک میں بھی کیا ہے جو فرانس کے ساتھ مضبوط، دراز، باہم ربط وضبط اور دوستی کا باعث بنتا ہے۔ خاص طور پر ثقافتی کلچرل سطح پر سان فرانسسکو کے فائن آرٹ میوزیم نے اپنے یہاں دوایسی بے مثال کامیاب نمائشوں کی میزبانی اور سان فرانسسکو میں Orsay Year منانے کا a Creative Veritable فیصلہ کیا۔

پہلی نمائش کا اہتمام Transformation of impressionism کے دوران کیا گیا۔ انہی دنوں مصوری کی اجتماعی نمائش رونمائی کی گئی جس میں Eugene, Berthe, Morisot, Pissaro, Degas, Moust, Cerame, Boadin اور Renoir کے فن پارے پیش کیے گئے۔

دوسری نمائش Cerane-Guagin-Von gog and beyond کے عنوان سے اب پیش کررہے ہیں جس میں great impressionist Painters کی طرز خاص 1886ء کے بعد کی ترقی میں پیش کی جارہی ہے جب سے ان کی آخری مجموعی ذخیرے کی نمائش اور 1900ء کے بدلتے ہوئے ماحول میں A vant garde نے قدیم آرائشی شاہکاروں پر حملہ کیا۔

Movet and Villard کی محنت اورکام گواہ ہے اس عظیم تبدیلی کا۔ ان دونوں نمائشوں میں ماسٹر پیس شاہکار پیش کیے گئے ہیں۔

اس مرتبہ جب یہ شاہکار Musee de Orsay کی گیلریوں میں واپس جائیں گے تو آئندہ کبھی کسی بھی نمائش کے لیے مہیا نہ ہوسکیں گے۔ یعنی فرانس کے باہرایسی منفرد عظیم نمائش دوبارہ ناممکن ہوگی۔

مجھے اُمید ہے کہ یہ نمائش امریکی عوام کی دلچسپی میں اضافہ کرے گی اور دونوں ملکوں کے تعلقات مضبوط بنانے کا ذریعہ ثابت ہوگی۔''

☆.....☆

سان فرانسسکو جو بڑی بڑی آرٹ گیلریوں اور میوزیم کا شہر کہلاتا ہے میں ایشین آرٹ میوزیم ہے۔ اس میوزیم میں ایشیا کے صدیوں قدیم آرٹ اور نوادرات کا ذخیرہ اکٹھا کیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ ایشین ممالک کے تعاون سے آرٹ اور کلچر کی نمائشیں ہوتی رہتی ہیں۔

اس مرتبہ انہوں نے جاپان کے تعاون سے Five Centuries of Japan Screen کی خصوصی نمائش کا اہتمام کیا ہے۔ میں نے جاپان سے بزنس کیا ہے۔ میں 1978ء میں جاپان گیا ہوں۔ جاپان کی طلسماتی الیکٹرونک ٹیکنالوجی کو دیکھا بھی ہے اور متاثر بھی ہوا ہوں لہٰذا ڈی یونگ میوزیم کی سیر کے بعد میری اس نمائش میں دل چسپی بڑھ گئی اور اگلے ہفتے ہی ٹکٹ بک کرا کے میں ایشین آرٹ میوزیم لارکن اسٹریٹ پہنچ گیا۔ یہ عمارت بھی شاندار ہے۔ شائقین کے لیے Reception اور رہنمائی کا بہترین بندوبست ہے۔ بہت بڑی Sovenior شاپ ہے، کافی شاپ اور ریسٹورنٹ ہے اور معلومات کی عمدہ سہولتیں مہیا کی گئی ہیں۔ کمرے، راہداریاں، ایسکیلیٹرز منزلیں، روشنی کا عمدہ انتظام فرنیچر اور سجاوٹ دیکھنے سے تعلق رکھتے ہیں۔ یہاں ہر منزل یا اس کے حصہ میں پاکستان، جاپان ہندوستان اور فارایسٹ کے ممالک کی گزری ہوئی تہذیبوں کی یادگاریں، آرٹ اور نوادرات کا خزانہ امریکا نے دنیا بھر کے عجائب خانوں کے تعاون سے جمع کیا ہے اور بڑی ترتیب سے بڑی تنظیم سے بڑے سلیقے سے ان کی نمائش کا اہتمام کیا ہے۔ بیشتر خزانے ان ملکوں میں بھی موجود نہیں ہوں گے جن کی یہ یادگاریں نمائندگی کرتی ہیں۔

گراؤنڈ فلور کی پوری منزل سب سے زیادہ سجی ہوئی تھی جس میں جاپان کی پانچ صدیوں کا سرمایہ تھا۔ پرانے نامور مصوروں کی شاہکار تصاویر تھیں۔ انمول ظرفے تھے، قدیم نسخوں کے ٹائیٹل پیج تھے، پتوں پر، پرتوں پر، پردوں پر صدیوں پرانی تحریریں تھیں۔ وڈ بلاک پرنٹس تھے۔ مختلف دھاتوں پر مینا کاری، نگل کاری۔ سادہ کاری اور انگریونگ تھی۔

18ویں اور 19ویں صدی میں مغربی ممالک کے آرٹسٹوں نے جو کام کیا ہے اس میں جاپانی فن سے گہری وابستگی موجود ہے۔ وان گوگ جیسے عظیم مصور نے اپنی تصویروں کو جاپانی پرنٹس اور رنگوں سے کاپی کر کے Dcorate کیا ہے۔ یورپ کے چھاپے خانوں نے کاغذ پر چھپائی میں جاپانی وڈ بلاک پرنٹنگ کا گہرا اثر قبول کیا۔ جاپانی وڈ بلاک پرنٹس میں یعنی چھپائی میں مہارت اور

استادی کا درجہ رکھتے ہیں۔ یورپ کے مصوروں نے اس میں خصوصی دلچسپی لی اور اسے اپنے فن اور آرٹ میں شامل کیا۔ وہ خاکے جو امپریشنسٹ اور پوسٹ امپریشنسٹ فنکاروں نے تخلیق کیے۔ ان کی فضائی حس، برنگ وروپ ان کی جاپانی مصوری سے بے انتہا لگاؤ اور محبت کے آئینہ دار ہیں۔ غرض یہاں میوزیم میں فن پارے، شہ پارے اعلیٰ قسم کے شوکیسوں میں مختلف قسم کی روشنیوں سے سجائے گئے ہیں۔ ہر فن پارے کا تعارف، ہر فن کار کے مختصر حالات ہمراہ درج ہیں۔ جاپانی تصویریں جن میں درخت، پھول، پتے، موسم اور اس کی فضا پُر اثر حقیقت کے بہت قریب خوب صورت اور رنگین ہوتا ہے مجھے بہت پسند آئیں۔ پردوں اور کاغذوں کی تحریریں بھی منفرد اور لاجواب تھیں۔ مجھے تو جاپانی تحریریں بھی گل دستے ہی لگیں۔ زبادہ نہ میں تحریروں کو سمجھ سکا نہ تحریر کرنے والوں کو جان سکا لیکن وہ جاپان کے لیجنڈ تھے، ماسٹر تھے، نامور رائٹرز تھے، خوش نویس تھے، ڈیزائنر تھے، مصور تھے انھوں نے صدیوں پہلے سیاہی سے مدھم اور چمکدار رنگوں سے، سونے چاندی کے پانی سے یہ تحریریں لکھی تھیں، چھاپی تھیں۔ سونے چاندی کے باریک دھاگوں جیسے تاروں سے یہ تحریریں اور تصویریں بنائی تھیں، بنی تھیں، میرے جیسے ناقص العقل کے لیے ایسی نادر روزگار نمائش میں شرکت ہی بڑی بات تھی۔ میں دیکھ رہا تھا، میں سوچ رہا تھا کہ جن پتوں پر جن پرتوں پر جن پردوں پر، جن کپڑوں پر، جن دھاتوں پر، مختلف قسم کی لکڑیوں پر، درختوں کی چھالوں پر یہ تحریریں، یہ تصویریں بنائی گئیں، لکھی گئیں چھاپی گئیں بنی گئیں۔ انگریو کی گئیں وہ میٹریل صدیاں گزرنے کے باوجود محفوظ تھا۔ سیاہی اور دوسرے رنگ قائم تھے۔ سونے چاندی کے رنگوں کی چمک محفوظ تھی۔ یہ جاپانی قوم کا کردار ہے۔ یہ جاپانیوں کی اپنے لوگوں اپنے مصوروں اپنے فنکاروں سے بے پناہ محبت اور قدر دانی کا ثبوت ہے کہ انھوں نے بڑی محنت سے اس سرمایہ کی حفاظت کی ہے جب کہ اس دوران جاپان بڑے Disasters اور انقلابات سے گزرا۔ یہ نمائش جاپان کے تعاون سے امریکا میں پہلی بار منعقد ہوئی ہے اس کے اہتمام اور انتظام میں امریکا کے یونین بینک اور انفارمیشن ٹیکنالوجی کے بڑے اداروں، امریکا جاپان کے ارب پتی تاجروں نے کی۔ میں نے اس نمائش میں جاپانی لوگوں کو مالا جپتے، سر دھنتے اور گہری سوچوں میں غرق ہوتے دیکھا۔ اس میں شک نہیں کہ دیکھنے والا ہر شخص sophisticated تھا۔ Well educated تھا۔ جھ میں علم کی کمی تھی میں باہر نکل گیا۔ کافی شاپ میں بیٹھ کر کافی پی، ریسٹ کیا اور ایسکیلیٹرز سے اوپر پاکستانی کمرے میں پہنچ گیا۔ مجھے یہاں موہنجوداڑو اور ہڑپہ کے بیش قیمت نوادرات دیکھنے کا موقع ملا۔ جن میں قدیم مٹی کے برتن، کانسی کے ظروف اور چھوٹی بڑی قدِ آدم مورتیاں قابلِ ذکر ہیں۔

ہندوستان کی سینکڑوں سال کی بلکہ ہزاروں سال پرانی تہذیب کی بھی نادر روزگار نشانیاں بڑی محنت اور جانفشانی سے اکٹھی کی گئیں ہیں اور سجائی گئی ہیں۔ جنھیں بے شمار مٹی کے چھوٹے بڑے مختلف ادوار کے ظروف، دھات کے بنے ہوئے برتن جن پر اس دور کی نقش نگاری، مینا کاری، سادہ کاری کی ہوئی تھی۔ بادشاہوں، فاتحین، سپہ سالاروں اور سرداروں کے خنجر، تلواریں، فولادی ٹوپیاں، کانسی، چاندی، سونے اور ہاتھی دانت کے زیورات نمایاں تھے۔ بلکہ ہر دور کے بھرے پڑے تھے۔ سن تاریخ اور حوالے درج تھے۔ دیکھنے والا پڑھتا ہے سوچتا سمجھتا ہے اور حیران رہ جاتا ہے۔ اس کے علاوہ قدیم مندروں جن کی دیکھ بھال اپنے وقت کے راجوں مہاراجوں نے کی تھی ان کے نوادرات بھی تھے۔ جو بڑی مشکل اور محنت سے حاصل کیے گئے تھے۔ کسی مندر کی مورتی تھی۔ کسی مندر کی منقش کھڑکی تھی، کسی قدیم مندر کی گھنٹی تھی۔ کوئی مورتی پتھر تراش کے بنائی گئی تھی، اتنی عمدہ کہ سینکڑوں سال گزرنے کے باوجود اس کی نفاست اور چکناہٹ میں فرق نہیں آیا۔ کوئی مورتی پیتل کی تھی، کوئی لوہے یا کانسی کی تھی۔ اس طرح جو چیز بھی نظر آئی وہ سینکڑوں سال پرانی تھی۔ جس زمانے میں مشینوں کا تصور بھی نہیں تھا۔ تعلیم بھی عام نہیں تھی اس زمانے کی یہ ہاتھ سے بنی ہوئی چیزیں اتنی عمدہ، اتنی پائیدار، اتنی نفیس تھیں کہ صدیوں کے انقلاب ان کی چمک دمک پائیداری پر اثر انداز نہیں ہو سکے۔ بہت سے ظروف اور مورتیاں ایسی دیکھیں جو خراش، کھردرے پن اور زنگ سے بھی محفوظ تھیں۔ ایک ایک چیز کو حفاظت سے شوکیسوں میں سجایا گیا تھا اور ساتھ ہی مختصر، تاریخی اور تحقیقی تعارف بھی تحریر کر دیا گیا تھا اس کے علاوہ چینی، جاپانی، تائیوانی، کورین، قدیم بدھسٹ تہذیب کا وہ سمندر پیش کیا گیا تھا جس میں غوطے کھانے والا مشکل سے باہر آسکتا ہے۔ غرض میوزیم کیا ہے یونیورسٹی ہے اور اس یونیورسٹی کے کرتا دھرتا اور اس کو

سنبھالنے والے امریکا کے Intellectual Orthodox، متمول، باحیثیت، بااختیار ادارے ہیں جن کی پہنچ دنیا بھر میں ہے جن کے نمائندے ساری دنیا کے تحقیقی اداروں سے منسلک ہیں۔ مجھے تو صرف دیکھنے کا شوق تھا لیکن تاریخ اور قدیم تحقیق کے متوالے اور طالب علم، یونیورسٹیوں کے پروفیسرز، آرکیالوجیکل ماہرین دنیا جہان سے اپنے علم کی پیاس بجھانے، اپنی تحقیق کی آبیاری کرنے، اپنے تھیسس، مقالوں اور Ph.D کی تیاری کرنے یہاں آئے ہوئے تھے اور خاموشی سے تندہی سے فکر سے ایک ایک یادگار کے مطالعے میں مصروف تھے۔ مجھے اب چار گھنٹے ہو چلے تھے۔ میرے لیے ایسی یونیک انٹرنیشنل سلیبریٹی میں شرکت ہی بڑی بات تھی۔ باہر نکلا اور خراماں خراماں ڈبلن کی راہ لی۔

☆......☆

مجھے پتا چلا کہ سٹی میں یہودیوں کا میوزیم ہے جس میں ان کی مذہبی ثقافتی نمائش ہو رہی ہے۔ میرے لیے یہ ایک دلچسپ معلوماتی وزٹ تھا لہٰذا حسب سابق ٹکٹ کا بندوبست کیا اور جیوش میوزیم پہنچ گیا۔ بلڈنگ یہ بھی شاندار ہے یہاں بھی ہر قسم کی سہولت موجود ہے لیکن وزیٹرز کی چیکنگ ایسی ہے جیسے ایئرپورٹ پر ہوتی ہے۔ چیکنگ کے بعد سیڑھیاں چڑھ کر اوپر جاتے ہوئے انتہا درجے کی خاموشی تنہائی اور ماحول میں پُراسراریت کا احساس ہوا۔ وہ گہما گہمی جو اس سے پہلے کی نمائشوں میں دیکھی تھی یہاں نظر نہ آئی۔ بہرحال لوگ موجود تھے جن میں زیادہ یہودی Typical Orthodox اور روایتی طالب علم تھے۔ یہ نمائش بڑے پیمانے پر یہودی مذہب، مذہبی تعلیم، مذہبی تحقیق، مذہبی تبلیغ اور ترویج و اشاعت کے لیے ترتیب دی گئی تھی جس میں امریکا اور اسرائیل کی مذہبی تنظیموں کا تعاون شامل تھا۔ مبہم خیالی اور تصوراتی خاکوں کے ذریعے حضرت موسیٰ کے دور کے مشہور واقعات کو دکھایا گیا تھا جو دیواروں پر آویزاں تھے۔ حضرت موسیٰ کو اللہ کا پیغام پہنچاتے ہوئے برائیوں سے روکتے ہوئے بتوں کی پرستش سے منع کرتے ہوئے دکھایا گیا۔ فرعون سے جنگ اور اللہ کے حکم سے پیدا ہونے والے دریائے نیل کے راستے سے محفوظ زندگی کی طرف سفر اور تعاقب میں آنے والے اسی فرعون کا غرق ہو جانا۔ یہ وہ حقائق ہیں جن کا ذکر قرآن میں ہے اور مسلمان قوم ان واقعات کو تسلیم کرتی ہے مختلف تصاویر میں یہودی قوم کی جدوجہد، پریشانیاں اور صحراؤں میں بھٹکتے رہنا بھی دکھایا گیا۔

اس کے علاوہ توریت جو عبرانی زبان میں ہے اس کی تلاوت آڈیو کے ذریعے سنائی گئی۔ تورات کے فرمان، احکام، اقوال، ہدایات کو طغروں کی شکل میں دیواروں پر سجایا ہوا تھا۔

توریت بے شک اللہ کا کلام ہے جو ہمارے نبی حضرت موسیٰ پر اترا ہے۔ وہ اگر تحریف یا تبدیلی سے پاک ہو تو وہ ساری ہدایات وارشادات ربانی جو اس میں ہیں وہی مذہب اسلام میں بھی ہیں۔ توریت پڑھنے کے طریقے، لکھنے کے ڈھنگ بتائے گئے، اتنی احتیاط اور تحقیق سے کہ غلطی کی گنجائش نہ رہے اور صحت لفظی مکمل ہو جائے۔

توریت کے قدیم اوراق مختلف ادوار کے بڑی محنت سے ساری دنیا کے سائناگاگ اور معبد خانوں اور لائبریریوں سے جمع کیے گئے، محفوظ کیے گئے، تحقیق کی گئی اور یہاں آویزاں کیے گئے۔ چمڑوں پر، پیڑ کی چھالوں پر، لکڑی پر مختلف دھاتوں پر لکھے، چھاپے اور کھودے گئے ان کی تشریحات ترجمے عبرانی، عربی اور انگریزی میں کیے گئے۔ قدیم دور میں توریت کے اوراق کو بڑی فنکاری اور خوش نویسی سے لکھا گیا۔ لکھنے کے طریقوں پر توجہ دی گئی۔ چاندی سونے کے پانی سے لکھا گیا۔ لکھنے کے لیے رنگوں اور سیاہی کو بنانے پر خصوصی توجہ دی گئی۔ مختلف قسم کے قلم بنائے گئے۔ لکھنے کے لیے تراشے گئے تاکہ توریت کو لکھنے کے فن کو خصوصی اہمیت حاصل ہو۔ پرانے زمانے کے لوگوں نے علم کے ساتھ قلم کو بھی بڑی اہمیت دی ہے۔ بہت ساری عمدہ قسموں کے لکڑی، ہاتھی دانت، لوہے، چاندی، سونے کے بڑے انمول خوشنما نقشین قلم بنائے گئے اور ان کی تراش پر بہت زور دیا گیا تاکہ معیاری اور حسین رسم الخط میں طرزِ خاص سے توریت کو لکھا جائے۔ نمائش میں ایسے بہت سے قلم موجود تھے جن کو نامور خوش نویسوں نے استعمال کیا تھا۔ جن کی تاریخ صدیوں پر محیط تھی۔ اس طرح قدیم اوراق کو محفوظ کرنے کے لیے صاحبانِ اقتدار نے بڑے قیمتی جزدان، غلاف، قیمتی لکڑی اور قیمتی دھاتوں کے گول ڈبے، صندوقچیاں ان پر اس زمانے کے بہترین نقش و نگار بنائے جن کو آج محفوظ دیکھ کر حیرانی ہوتی ہے۔ غرض کچھ سمجھ آیا بہت کچھ سمجھ نہ آیا اور میں واپس ڈبلن کی پہاڑیوں اور ٹاسا ہارا کی رانچوں میں گم ہو گیا۔

☆☆☆

جادو

واقعات کے غیر فطری طور پر ظہور میں لانے کا فن۔ یہ علم ہر زمانے میں ہر قوم کے افراد کے عقیدے میں داخل رہا ہے اور مختلف اشخاص ہر جگہ اس کا دعویٰ کرتے چلے آئے ہیں۔ قدیم مصر کے پجاری اسی دعوے پر اپنی عبادت اور مذہب کی بنیاد رکھتے تھے۔ چنانچہ قربانیاں جادو ہی کی بنیاد پر کی جاتی تھیں۔ قدیم مصری، بابلی، ویدک اور دیگر روایتوں میں دیوتاؤں کی طاقت کا ذریعہ بھی جادو ہی کو خیال کیا جاتا تھا۔ یورپ میں باوجود عیسائیت کی اشاعت کے جادو کا رواج جاری رہا۔ افریقا میں اب تک ایسے ڈاکٹر موجود ہیں جو جادو کے ذریعے علاج کرتے ہیں۔ سیاہ علم یا کالا جادو، جنوں، دیوتاؤں اور بدروحوں کے ساتھ تعلق پیدا کرنے کا ذریعہ ہے اور علم سفید یعنی سفید جادو نیک روحوں اور فرشتوں کے ساتھ ملاتا ہے۔ اس کے علاوہ قدرتی جادو قدرت کے واقعات میں تصرف کے قابل بناتا ہے۔ جوتش اور نجوم بھی اسی کی شاخیں ہیں جو توہم پرستی پر مبنی ہیں مگر رمل، جعفر اور استخارہ کے بالکل الگ علم ہے۔ ہمارے ہاں بھی جادو کئی شکلوں میں تسلیم کیا جاتا ہے۔ مثلاً جن اور بھوت کا چمٹنا اور اتارنا وغیرہ۔ جادو کے لیے عربی زبان کا لفظ ''سحر'' مستعمل ہے جس کا مطلب ہے امر خفی اور پوشیدہ شے، شرعی اعتبار سے اس کا مطلب ہوا وہ امر جس کا سبب پوشیدہ اور وہ اصل حقیقت کے خلاف خیال آنے لگے۔ سورۃ الزمر آیات 38-39 میں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: (اے پیغمبر اسلام) آپ ان سے کہہ دیں کہ تمہارا خیال ہے کہ اگر مجھے کوئی نقصان پہنچانا چاہے تو کیا

پہلی مرتبہ 1998ء میں فیصل، نجمہ اور میں کار میں لاس اینجلس Batterfield سے ہوتے ہوئے اورنج کاؤنٹی پہنچے تو دارا صاحب سے ملاقات ہوئی۔ دارا خان اور ان کی بیگم ہمارے ناظم آباد کے پرانے پڑوسی ہیں۔ اورنج کاؤنٹی میں شاہنواز کے نام سے ریسٹورنٹ ہے۔ ہم سے مل کر بہت خوش ہوئے۔ رات کا وقت تھا لہٰذا اپنے ریسٹورنٹ میں پُرتکلف کھانا کھلایا پھر گھر لے گئے وہاں قریب میں رہنے والے دوسرے احباب کو بلوا لیا اس طرح ہماری ملاقات

عشرت آپا ان کے بیٹے انجم سے بھی ہوگئی۔ پرانے ہمسائے ملے رات دیر تک ناظم آباد کی باتیں ہوتی رہیں۔ فیصل کے پاس وقت کم تھا لہٰذا صبح واپس ہوگئے۔ راستے میں ہم نے یونیورسل اسٹوڈیو اور ہالی ووڈ ڈاؤن ٹاؤن کی سیر کی اور واپس سان لیانڈرو پہنچ گئے۔

دوسری مرتبہ 2006ء میں، میں اور عدیل بذریعہ کار اسی راستے پر سان یاگو تک آئے۔ ہم عدیل کے ماموں ڈاکٹر نیئر صدیقی کے پاس ٹھہرے جن کا سان یاگو میں ساحل کے قریب Cardif drive میں خوب صورت مکان ہے نیئر بھی میرے پرانے پڑوسی ہیں بڑی محبت سے پیش آئے ساحلی علاقوں کی سیر کرائی بہترین افغانی ریسٹورنٹ میں ڈنر دیا۔

سان یاگو ڈاؤن ٹاؤن کے ایک ریسٹورنٹ میں ہماری ملاقات مزمل بھائی اور ان کے بیٹے معظم سے ہوئی، یہ لوگ بھی اس ملاقات سے بہت محظوظ ہوئے، اپنی بیٹی کے گھر لے گئے، چائے پلائی۔ بھابی رخشی، بیٹی اور داماد سے ملوایا اور یہ سب لوگ مجھے چھوڑنے کارڈیف ڈرائیو آئے۔ رات کافی دیر تک ناظم آباد نمبر 4 کے پرانے ہمسائے آپس میں ملتے رہے۔ اپنے محلے کی خوشیوں اور غموں کا تذکرہ کرتے رہے اور رخصت ہوگئے۔

فیصل چونکہ شوروم بند کرکے آئے تھے لہٰذا دوسرے دن ہم نے واپسی کا سفر اختیار کیا اور راستے میں کچھ وقت یونیورسل اسٹوڈیو اور ہالی ووڈ ڈاؤن ٹاؤن کی سیر میں گزارا۔ یہ شہر لاس اینجلس جاتے ہوئے پہلے پڑتا ہے لہٰذا لاس اینجلس اور سان یاگو جانے والے یہاں ضرور آتے ہیں۔ ہالی ووڈ میں بڑے بڑے ایکٹروں، ایکٹریسوں، فلمسازوں، فلم پروڈیوسرز، ٹیکنیشنز، سنگرز، میوزک ڈائریکٹرز کی رہائش گاہیں ہیں لہٰذا ہالی ووڈ اس صوبہ کا پوش ایریا مانا جاتا ہے۔ ڈاؤن ٹاؤن میں داخل ہوتے ہیں تو فٹ پاتھ پر ماربل چپس کے ستارے بنائے گئے ہیں، ان ستاروں کے اندر عظیم نامور ہیرو، ہیروئنوں کے نام پیتل کے حرفوں سے لکھے گئے ہیں جن کو روز پالش سے چمکایا جاتا ہے۔ ٹورسٹ آتے ہیں۔ ان ستاروں اور ستاروں میں چمکتے فلمی ستاروں کے نام دیکھتے ہیں اور تصویریں بناتے

تمہاری یہ دیویاں (جن کو تم اللہ کی بیٹیاں کہتے ہو) جنہیں تم اللہ کو چھوڑ کر پکارتے ہو مجھے اس کے پہنچائے ہوئے نقصان سے بچائیں گی؟ یا اللہ مجھ پر مہربانی کرنا چاہے تو کیا یہ اس کی رحمت کو روک سکیں گی؟ بس ان سے کہہ دو کہ میرا اللہ ہی کافی ہے بھروسا کرنے والے اس پر بھروسا کرتے ہیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ سات مہلک امور سے اجتناب کرو۔ صحابہؓ نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ وہ مہلک امور کون کون سے ہیں حضورؐ نے فرمایا۔ ((1 اللہ کے ساتھ شرک کرنا ((2 جادو کرنا ((3 بلا جرم کسی کو قتل کرنا ((4 سود کھانا ((5 یتیم کا مال ہڑپ کر جانا ((6 میدان جنگ سے پیٹھ پھیر کر بھاگ جانا ((7 پاک دامن عورتوں پر تہمت لگانا۔ اس ضمن میں متعدد احادیث میں حضورؐ نے جادو کرنے، جادو کا توڑ کرنے والوں کو پسندیدگی کی نگاہ سے نہیں دیکھا ایک حدیث میں آپؐ نے فرمایا۔ شگون، ہامہ اور صفر (اسلام کی نظر میں) کوئی چیز نہیں اور نہ ان کی کوئی اصل ہے۔ ایک دوسری حدیث میں کتے کی قیمت، زنا کی اجرت، کاہن کو ہدیہ دینے سے منع فرمایا۔ ایک اور حدیث میں حضورؐ نے فرمایا کہ (سجھ لو تباہ کرنے والی چیزوں میں ایک چیز اللہ کے ساتھ شرک اور جادو ہے) ان (چیزوں سے بچو۔ حضرت ابو موسیٰ الاشعری سے روایت ہے کہ رسول اللہ نے فرمایا کہ تین اشخاص جنت میں داخل نہ ہو سکیں گے۔ (1) دائمی شراب خور (2) جادو کو ماننے والا (3) رشتے کو ختم اور منقطع کرنے والا۔

اقتباس رواہ احمد ابن حبان فی صحیحہ۔

مرسلہ: ایاز راہی۔ مانسہرہ

ہوئے گزر جاتے ہیں۔

ہالی ووڈ وہ شہر ہے جس میں عالمگیر شہرت کے فنکار، فلموں کے ہیرو، ہیروئن جنہوں نے نصف صدی تک دنیا میں اپنی لازوال اداکاری سے اپنے چاہنے والے پیدا کیے ان کے دلوں پر حکمرانی کی۔ فلمی دنیا کے آسمان پر چاند سورج کی طرح چمکے اور یہاں کی مٹی کی نذر ہو گئے۔ ہالی ووڈ میں Disnay Land اور عظیم یونیورسل اسٹوڈیو قائم ہے۔

اسٹوڈیو کیا ہے فلمی دنیا ہے جس میں رہائشی بنگلے، مکانات، فیکٹریاں، جھونپڑے، سڑکیں، گلیاں، بازار، سوئمنگ پول، چڑیا گھر، پنجرے، جانور، جھولے، مصنوعی پہاڑ، دریا، سمندر، ساحل، اسٹیشن، ایئرپورٹ، غرض ہر وہ چیز مہیا کی گئی ہے جس کی فلم بنانے میں ضرورت پڑتی ہے۔ ایک ہی علاقے میں فلم کا ہر سین فلمایا جا سکتا ہے۔ یہاں دنیا بھر کے ماہر ٹیکنیشنز، فوٹو گرافروں اور سیٹ بنانے والوں کی فوج ہے جو کم وقت میں ایسے سیٹ بناتے ہیں، ایسا ماحول بناتے ہیں...... ایسے Effects Create کرتے ہیں کہ فلم دیکھنے والا اس ماحول میں گم ہو جاتا ہے۔

ہم بھی ہالی ووڈ کی بھول بھلیوں میں گم ہوتے ہوئے جن راستوں سے گئے تھے انہی راستوں سے واپس الامیڈا اپنے گھر پہنچ گئے۔

جواد اور فاریہ جاتے ہوئے یہ اصرار سان یاگو کی دعوت دے گئے تھے لہٰذا فیصل کو چھٹیوں کا انتظار تھا۔ 24 دسمبر کی صبح ہم مرسڈیز میں فیصل، راحت، نجمہ اور میں سوار ہوئے اور گاڑی ڈبلن سے Tray Liver more اور Modests سے ہوتی ہوئی جنوب کی جانب روانہ ہو گئی۔ یہاں آبادیوں کی سڑکوں کے قریب سے ہی بائی پاس فری وے مل جاتے ہیں جو بہت کشادہ ہوتے ہیں۔ 4-3 رو کی سڑکیں ہوتی ہیں جن پر 60 سے 70 میل کی رفتار سے دور دراز کا سفر بغیر کسی رکاوٹ کے آسانی سے کیا جا سکتا ہے۔ ہم 580 پر سفر کر رہے تھے اب ہم لاس اینجلس کے لیے High Way 5 پر آ گئے۔ 24 دسمبر کا دن تھا بہت سے اداروں میں چھٹیاں تھیں۔ روڈ صاف پڑے تھے، چھوٹے موٹے ٹاؤنز اور پلین علاقوں، کھیتوں سے گزرتے ہوئے ہم Bur Bank کے پہاڑوں پر پہنچ گئے۔ لاس اینجلس کے راستے میں 4/5 ہزار فٹ تک اونچائی کے ہرے بھرے پہاڑ آتے ہیں اور گاڑی پہاڑی راستوں اور وادیوں میں سفر کرنے لگتی ہے۔ یہاں سردی بڑھ جاتی ہے اور پہاڑوں کے درمیان دن میں اندھیرا چھا جاتا ہے ہم تقریباً ساڑھے چھ گھنٹے میں لاس اینجلس یعنی امریکا پیسفک اوشن کے کنارے بڑے عظیم شہر میں تھے۔ تھوڑی دیر رستا کے ہم دوبارہ سان یاگو کی جانب روانہ ہو گئے اور ڈیڑھ گھنٹے بعد ہم سن یاگو میں داخل ہو گئے۔ سن یاگو بھی پیسفک اوشن کے کنارے ہے۔ اس کے جنوب میں میکسیکو کی

سرحد لگتی ہے۔ سن یا گو بڑا شہر ہے۔ بڑے بڑے سرسبز پہاڑوں، پہاڑیوں اور وادیوں کا شہر ہے۔ بڑے بڑے جنگلوں کا شہر بڑے بڑے رانچوں کا شہر ہے۔ دنیا کے بہترین ساحلوں اور بیچیز کا شہر ہے۔ مجھے پھر حیرانی ہے کہ اس قدر دشوار گزار پہاڑوں میں اتنا خوب صورت شہر کس طرح آباد ہوگیا۔

پہاڑ اور پہاڑیاں بھی قدرت کی عجیب کاریگری ہیں۔ ان کی اونچائی بادلوں کو اپنی طرف متوجہ کرتی ہیں لہٰذا ان علاقوں میں بارشیں کثرت سے ہوتی ہیں۔ یہ علاقے ٹھنڈے رہتے ہیں، ان میں بڑے بڑے جنگلات جنم لیتے ہیں اور پہاڑ سرسبز رہتے ہیں۔ سبزے، رزق اور محفوظ پناہ گاہ کی تلاش میں جانور پہاڑوں کا رخ کرتے ہیں اور بڑے خطرناک جانوروں کی آماجگاہ بن جاتے ہیں۔ پہاڑوں کے درمیانی راستے وادیاں کہلاتی ہیں جن میں انسانی زندگی کا وجود بھی ہوتا ہے۔ انسانوں اور جانوروں کی مسلسل صدیوں سے آمدورفت سے چڑھائی اور اترائی کے راستے یعنی پگڈنڈیاں بنتی رہتی ہیں۔ مسلسل ہوتی بارشیں، جھرنے اور چشمے بھی راستے بناتے ہیں۔ پہاڑی علاقے ٹھنڈے، تازہ فریش آب و ہوا سے بھرے ہوتے ہیں۔ صحت افزا ہوتے ہیں۔ صدیوں سے انسان ایسے پُرسکون قدرت کے نظاروں سے مزین صحت افزا مقامات کی تلاش میں رہتا ہے۔ جب کسی پہاڑی علاقے کو ترقی دی جاتی ہے۔ آباد کیا جاتا ہے تو یہ پگڈنڈیاں ہی رہنمائی کرتی ہیں۔ ان کچے پکے اونچے نیچے دشوار گزار خطرناک راستوں کو ہی اکٹھا کیا جاتا ہے اور پھر بڑی محنت سے یہاں سڑکیں بنائی جاتی ہیں اور سڑکوں کے کنارے آبادیاں بنتی چلی جاتی ہیں۔ امریکا میں یہ محنت مسلسل پانچ سو سال سے جاری ہے، شاید یہاں کے لوگ پانچ سو سال سے سوئے نہیں ہیں۔ شاید یہاں کے لوگوں نے زندگی میں کبھی آرام نہیں کیا، کیوں کہ صرف صوبہ کیلی فورنیا میں ہزاروں اونچے نیچے پہاڑ پہاڑیاں ہیں جن میں لاکھوں سڑکیں بنی ہوئی ہیں، اتنی سڑکیں بنائی ہیں کہ آدمی سفر کرتے کرتے پاگل ہو جائے۔ لاکھوں گاڑیاں دن رات ان پر سفر کرتی ہیں۔ یہاں کے لوگوں کا شوق جستجو اور جدوجہد کا یہ عالم ہے کہ ان کا بس چلے تو سمندر کی تہہ میں اور پہاڑ کی چوٹیوں پر مکان بنائیں۔ نہ صرف اپنا شوق پورا کریں بلکہ وہ سہولتیں بھی مہیا کریں کہ آپ ان کے پاس جا سکیں، دیکھ سکیں، رہ سکیں۔

دنیا بھر کی بڑی اور بہترین کاروں کی فیکٹریوں کو ان سڑکوں نے جنم دیا ہے۔ یہاں ہر شخص کے پاس گاڑی ہے کیوں کہ یہاں گیراج پارکنگ اور راستوں کی بے حد سہولت مہیا کی گئی ہے لہٰذا ساری دنیا میں گاڑیوں کے سب سے بڑے شورومز امریکا میں ہیں۔ ہم جس سڑک سے گزر رہے ہیں، ایک ایک دو دو اور تین تین میل لمبے گاڑیوں کے ڈسپلے گراؤنڈ ہیں، گاڑی پسند کرنے کے لیے بھی گاڑی میں سفر کرنا پڑتا ہے۔ سن یا گو اوپر بیان کیے ہوئے ماحول پر مشتمل پہاڑی علاقہ ہے۔ وادیوں پر پہاڑیوں پر، بڑی عمدہ پلاننگ کے ساتھ آبادیاں بنائی گئی ہیں۔ خوب صورت رہائشی علاقے، کمرشل بازار، اسکول، کالج، یونیورسٹیاں، غرض ہر شہری سہولت۔ ہر تھوڑی دور پر کسی میدان میں کسی فٹ ہل پر کسی ڈھلوان پر، کسی چوٹی پر نظر آتی ہے۔ کسی پہاڑ کے ایک طرف اندھیرا ہے تو دوسری طرف چمک دمک روشنی ہے۔ غرض انہیں پہاڑی راستوں میں گم ہوتے ہوتے ہم رات 7 بجے البرٹو ڈرانچو جواد کے گھر پہنچ گئے۔ دونوں میاں بیوی مل کر بہت خوش ہوئے۔ ان کا چھوٹا سا خوب صورت سا اپارٹمنٹ ہے۔ رات ہم نے کھانا کھایا اور سو گئے۔ 25 دسمبر کی صبح ناشتے کے بعد جواد ہمیں مشہور Coronado Lahoya بیچ لے گئے۔ یہ بیچ سان یاگو کے مغرب میں ڈاؤن ٹاؤن سے 10 منٹ کی ڈرائیو پر واقع ہے۔

سان یاگو کا موسم شمالی علاقوں کی نسبت معتدل گرم رہتا ہے لہٰذا گرمیوں میں یہاں کے بیچ مقامی لوگوں، تفریح کرنے والوں اور سیاحوں سے کھچا کھچ بھرے رہتے ہیں جو کھلے نیلے سمندر کی دودھیا لہروں میں نہاتے اور شفاف ریت پر سارا دن لیٹے سن باتھ لیتے رہتے ہیں۔ Lohia بیچ میں پانی کی بپھرتی لہریں جگہ جگہ سے پہاڑی چٹانوں سے سر ٹکراتی ہوئی راستے بنائی ہوئی ریت پر دم توڑتی ہیں۔ اس پانی میں ہزاروں لوگ نہاتے اور اپنی عمریں بڑھاتے ہیں۔ ہم ساحلی پہاڑیوں کی لہراتی سڑک پر دور تک ٹہلتے رہے اور قدرت کے شاہکار نظاروں میں منہمک رہے۔ سان یاگو آنے والے ان بیچوں پر ضرور آتے ہیں لہٰذا یہ ساحلی پہاڑی حصہ سارا سال گھومنے پھرنے اور فوٹو گرافی کرنے والوں سے بھرا رہتا ہے۔ یہاں سے ہم لوما پوائنٹ گئے۔ لوما پوائنٹ South میں اونچے پہاڑ پر ایک تفریحی مقام ہے جہاں سے سارا سان یاگو شہر نظر آتا ہے۔ شہر کیا نظر آتا ہے پہاڑ سے نیچے چھوٹے سرسبز پہاڑ اور جنگل نظر آتے ہیں۔ سرسبز پہاڑیاں نظر آتی ہیں۔ وادیاں نظر آتی ہیں۔ پہاڑی چوٹیوں پر پہاڑی ڈھلوانوں پر فٹ ہل

پر بنی آبادیاں نظر آتی ہیں۔ ان کو چھوتی ہوئی بل کھاتی اوپر چڑھتی نیچے گرتی ہوئی سڑکیں نظر آتی ہیں۔ ڈاؤن ٹاؤن کے بازار نظر آتے ہیں، غرض ایک پھولا پھلا گلشن نظر آتا ہے۔ اس گلشن سے ہم گھر کی جانب چل پڑے۔

☆......☆

آج ہم بالبوا پارک گئے۔ سن یاگو کے پارکوں میں یہ اپنی نوعیت کا سب سے بڑا سب سے خوب صورت پارک ہے جس میں میلوں گھاس کے تختے، ہریالی پھول پودے اور لاکھوں درخت ہیں۔ اس پارک کی دیکھ بھال اور اس کی نوک پلک درست رکھنے کے لیے بے شمار افراد کام کرتے ہیں۔ پارک کے داخلے پر چہار طرفہ بڑے بڑے سنگین ستونوں والے گیٹ بنائے گئے ہیں، ان پر مینا کاری اور ڈیزائن اتنی خوب صورتی سے بنائے گئے ہیں کہ 100 سو سالہ وکٹورین تہذیب سامنے آگئی۔ دروازوں کے ساتھ ساتھ محرابوں اور ستونوں والی راہداریاں دور تک چلی گئی ہیں۔ یہ پارک کا انٹریئر نہیں بلکہ کسی آرٹسٹ کا بڑا سا کینوس معلوم ہوتا ہے۔ راہداریوں کے پیچھے بڑے بڑے ہال، سجے ہوئے فرنیچر سے آراستہ کمرے، اتنے زیادہ کہ وقت کم پڑ جائے۔ ٹانگیں اور آنکھیں جواب دے جائیں۔ کہیں جاپانی طرز کا کافی ہاؤس ہے کہیں Cafeteria ہے۔ کوئی کانفرنس ہال ہے اور کسی حصے میں آرٹ گیلری ہے، کہیں Biological Museum ہے، کہیں بڑے بڑے فوارے چل رہے ہیں۔ کہیں سوینیر کی دکانیں ہیں۔ سارے جہاں کے سیاح مسافر فیملیوں کے ہمراہ ان راہداریوں میں گھوم رہے ہیں اور حیران ہیں کہ باغ میں یہ سیکڑوں کمرے، راہداریاں اور ستون سو، سوا سو سال پہلے کس لیے بنائے گئے تھے۔ میری سمجھ میں کچھ کچھ آرہا ہے کہ ان چیزوں کے بنانے کا یہی مقصد تھا کہ ساری دنیا کے لوگ ہمیشہ یہاں آتے اور سر دھنتے رہیں کہ کتنا اچھا بنایا ہے۔

اس چہل قدمی میں وقت بھی لگا اور کچھ تھکن بھی محسوس ہونے لگی۔ ہم لوگوں نے کافی پی، فوٹو گرافی کی اور واپس آگئے۔ شام جواد مجھے، نجمہ، فیصل، فاریہ، راحت، فائزہ کو لے کر باہر نکلے۔ ہم نارتھ کی جانب پھر ہرے بھرے پہاڑوں، اونچی نیچی سڑکوں پر سفر کر کے ڈیڑھ گھنٹے میں Anahim پہنچ گئے۔

انا ہیم لاس اینجلس کاؤنٹی کا چھوٹا سا خوب صورت سا شہر ہے جس میں قدیم علاقے کو بھی محفوظ رکھا گیا ہے اور جدید کنسٹرکشن سے بھی سجایا گیا ہے۔ یہاں ایک مشہور مسلم چائنیز ریسٹورنٹ Maaz ہے جو عمدہ مزیدار سی فوڈ ڈشز اور دوسری ڈشز کے لیے مشہور ہے۔ یہاں انڈین، پاکستانی، چائنیز جمع ہوتے ہیں۔ ملتے ہیں، کھاتے پیتے ہیں اور خوشی خوشی رخصت ہو جاتے ہیں۔ ہمیں بھی یہاں بہت سی پاکستانی فیملیز نظر آئیں۔

ہم نے بھی یہاں حلال چکن، بیف اور ہری مرچ سے تیار کردہ سی فوڈ کی ڈشز سے انصاف کیا اور رات گئے گھر لوٹ گئے۔

صبح بیدار ہوئے، رخصتی ناشتہ کیا۔ گاڑی میں بیٹھے اور جواد کے بتائے ہوئے ایسے راستے پر سفر اختیار کیا جس پر ٹریفک جام نہ ہوا اور 8 گھنٹے میں ڈبلن پہنچ گئے۔

☆......☆

آج دوپہر ڈبلن سے بارٹ میں بیٹھ کر ڈاؤن ٹاؤن گیا اور امبار کو ڈیرو اسٹیشن اتر گیا۔ یہ اسٹیشن دو منزل زیر زمین ہے پہلی منزل پر میونی ریل میٹرو چلتی ہے۔ یہ ٹرین زیادہ تر زمین کے پرانے ٹریک پر چلتی ہے اور صرف سان فرانسسکو شہر کو کور کرتی ہے۔ میں نے N ٹرین پکڑی جو امبار کو ڈیرو سے باہر نکل کر ساحل کے ساتھ چلتی رہی۔ اس علاقے میں فش ہاربر اور مختلف علاقوں میں جانے والی فیریوں کے اسٹیشن گیٹ اور ساحلی بلڈنگیں ہیں۔ چند چھوٹے چھوٹے اسٹاپس کے بعد کالٹرین اسٹیشن بلڈنگ آگئی۔ کالٹرین سان فرانسسکو کاؤنٹی کے ساتھ میں 100 سالہ پرانی لائنوں، ٹریک پر سفر کرتی ہے اور جنوبی شہروں کے مسافروں کو سہولت مہیا کرتی ہے۔ یہ دو منزلہ نہایت آرام دہ، تیز رفتار اور خوب صورت ٹرین ہے۔ میں نے ساڑھے آٹھ ڈالر کا ڈے پاس مشین سے لیا اور ٹرین میں بیٹھ گیا۔ سان فرانسسکو کے مشرقی ساحلی علاقوں پر بچھی ہوئی ریلوے لائنوں پر سفر کرتی ہوئی یہ ٹرین جنوب کے چھوٹے چھوٹے شہروں اسٹیشنوں سے گزرتی ہوئی سان ہوزے تک جاتی ہے۔ اوپر کی منزل پر بیٹھ کر سفر کرنے سے سارے شہر سڑکوں گلیوں اور بازاروں کا دور تک نظارہ ہوتا رہا کیوں کہ یہ ٹرین کہیں شہروں کے کنارے کہیں پہاڑوں کے دامن میں اور کہیں شہروں کے بیچوں بیچ سفر کرتی ہے میں نے اس سفر میں San, Matio, Barlin game, San Bruno, Palu Alto, Red Wood City, Bellmont اور Mount View کے شہر دیکھے جو تقریباً 120 میل کا علاقہ کور کرتے ہیں۔ مجھے گوروں

کے بسائے ہوئے بیل مونٹ اور Mount View شہر بہت پسند آئے۔

بیل موٹ شہر میں خاموشی، صفائی، سلیقہ، قرینہ جوں کا توں قائم ہے جیسے یہ شہر اپنے بنانے والوں کے انتظار میں ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ ہری بھری پہاڑی کے دامن میں 100 سال سے اس شہر کے ماحول، موسم اور طرزِ زندگی میں تبدیلی نہیں آئی۔

بیل مونٹ اسٹیشن شہر کے کنارے واقع کھلا صاف ستھرا اسٹیشن ہے۔ اسٹیشن پر چھوٹی چھوٹی تختیاں لگی ہیں جن پر Bellmount لکھا ہے اور ہدایات درج ہیں۔ جب تک سگنل گرین نہ ہو ریلوے لائن پار نہیں کی جا سکتی۔ تھوڑی تھوڑی دور پر بنچیں بچھی ہیں جن پر شیڈ ہیں۔ ٹکٹ کی مشینیں لگی ہیں۔ ریلوے ٹریک، پلیٹ فارم، صفائی اور سادگی ایسی کہ پلیٹ فارم پر ہی رہنے کو جی چاہے۔ اسٹیشن سے ملا ہوا فٹ پاتھ اور بس اسٹاپ ہے۔ سڑک کے اس پار ڈاؤن ٹاؤن، بازار اور رہائشی مکانات شروع ہو جاتے ہیں۔ یعنی گھر کی کھڑکی سے یا دکان سے یا راہ چلتے ہوئے دیکھا کہ ٹرین آرہی ہے۔ بھاگ کر اسٹیشن گئے اور ریل میں بیٹھ گئے۔ ٹرین ہر گھنٹے بعد آتی اور جاتی ہے۔ سان فرانسسکو سے نیچے کی طرف سفر کرتے ہوئے چھوٹی چھوٹی جھیلوں باغات اور انڈسٹریل علاقوں، بڑے بڑے کارخانوں، ویئر ہاؤسز، گاڑیوں کے بڑے بڑے Scrap Junks اور کچرے کے بڑے بڑے ڈھیر بھی نظر آئے۔ Recycling Plants، پانی کے جوہڑ، تالاب، پرانے اور شکستہ مکانات بھی نظر آئے۔ غرض اس ٹرین میں سانس فرانسسکو شہر کو شمال سے جنوب تک خوب دیکھا۔ ماؤنٹ ویو سے دوبارہ ٹرین پر بیٹھا اور اسٹیشنوں کے، شہروں کے، پارکوں کے، محلوں بازاروں کے، سڑکوں گلیوں، ہائی ویز، فری ویز کے، اسکائی اسکریپرز کے نظارے کرتا ہوا ملبرائے اسٹیشن پر اتر گیا۔ یہاں سے بلو لائن پکڑی اور ڈبلن پلیزنٹن اتر گیا۔ فیصل راحت آکر مجھے لے گئے۔ میں 250 میل کا سفر کر کے 6 گھنٹے بعد گھر آکر لیٹ گیا۔ ساڑھے سات بجے راحت آئی کہ تیار ہو جائیں آج ڈنر کا پروگرام شالی مار میں ہے۔ عتیق کی فیملی بھی آرہی ہے۔ میں نے مزید پندرہ منٹ آرام کیا۔ اٹھا، فریش ہوا اور ان کے ہمراہ فری مونٹ شالی مار کے لیے روانہ ہو گیا۔ شالی مار ایک پاکستانی ریسٹورنٹ ہے جس نے عرصہ بیس سال سے پاکستانی خالص روایتی ذائقوں کی ڈشز روشناس کرائی ہیں اور دھوم مچا دی ہے۔ پہلے یہ ریسٹورانٹ صرف ڈاؤن میں تھا۔ اب فری مونٹ میں بھی شاخ کھل گئی ہے۔ یہاں سیخ کباب، چکن تکا، نہاری، بکرے کے پائے، جنجر بوٹی، بیخ بوٹی اور بریانی قورمہ کھانے کے لیے دور دور سے پاکستانی اور ہندوستانی کھنچے چلے آتے ہیں۔ اب ان روایتی ذائقوں میں افغانی، چینی اور گورے بھی گرفتار ہو رہے ہیں۔ ریسٹورنٹ کے ریسپشن پر لائنیں لگی ہوتی ہیں۔ آدھے پون گھنٹے سے پہلے ٹیبل نہیں ملتی ہے۔ فیصل اور عتیق کے ان لوگوں سے دوستانہ تعلقات ہیں جلد میز مل گئی۔ عتیق، سعدیہ، معیز، نجمہ، راحت، فیصل، شکی اور میں نے جی بھر کے کھانا کھایا، کھیر کھائی، چائے پی، گاڑیوں میں بیٹھے، اندھیری پہاڑیوں سے ہوتے ہوئے ڈبلن پہنچ گئے۔ تھوڑی دیر بیٹھے واپسی کا پروگرام بناتے رہے۔ میں اوپر آیا تھکن تھی نیند آگئی۔

☆......☆

امریکا میں اپنے لوگوں کا عام تاثر یہ ہوتا ہے کہ یہ ملک یہاں کا رہن سہن، طور طریقے بہت مختلف ہیں لہٰذا ان لوگوں سے میل جول بات چیت میں احتیاط رکھنی چاہیے جب کہ میں سمجھتا ہوں کہ انسان کسی بَرِّاعظم کا ہو کسی ملک کا ہو کسی قوم کا ہو بنیادی اور فطری نیچر میں یکساں ہوتا ہے۔ غلط ہر جگہ غلط ہے صحیح کو سب قبول کرتے ہیں اور ضرورت کے تحت لچک بھی انسانی فطرت کا خاصہ ہے۔ میں عموماً اکیلا ہی امریکا میں گھومتا رہتا تھا اور مجھے مختلف لوگوں سے ملنے اور نئے تجربات سے

جائیداد Property

فارسی لفظ بمعنی ملکیت، مال اسباب جاگیر، اثاث البیت، پیداوار۔ اقتصادیات اور معاشیات میں وہ تمام چیزیں کسی شخص کی جائیداد کہلائیں گی جنہیں وہ حصولِ دولت کے لیے استعمال کرتا ہے۔ جائیداد دو طرح کی ہوتی ہے منقولہ اور غیر منقولہ۔ تمام ایسی چیزیں جو ایک جگہ سے دوسری جگہ نہ لے جائی جا سکیں جائیداد غیر منقولہ کہلاتی ہیں۔ زمین، مکانات، زمین سکنی، زمین مزروعہ وغیرہ جائیداد منقولہ کے ضمن میں آتی ہیں۔ اس کے مقابلے میں جائیداد منقولہ مثلاً مال اسباب، غلہ، زیور، نقدی وغیرہ کو ایک جگہ سے دوسری جگہ لے جا سکتے ہیں۔

مرسلہ: فہیم خان اچکزئی۔ ڈی آئی خان

گزرنے کا شوق بھی ہے۔

مجھے بذریعہ کالٹرین San Jose جانا تھا۔ لہٰذا میں حسب معمول ڈبلن سے بارٹ میں بیٹھا اور سان فرانسسکو کے Embarcodero اسٹیشن اتر گیا۔ وہاں سے Metro منی ٹرین کے ذریعے کالٹرین کے سینٹرل اسٹیشن پر پہنچ گیا۔ یہ بڑا اسٹیشن ہے اور اس کی بلڈنگ شاندار ہے، یہاں سے جنوب کی جانب بہت سارے اسٹیشنوں پر Calrrain سفر کرتی ہسان ہوزے پہنچتی ہے۔ ٹکٹ مشین پر سان ہوزے کا کرایہ پانچ ڈالر درج تھا۔ لہٰذا میں نے مشین سے واپسی سمیت دو ٹکٹ دس ڈالر میں نکلوا لیے اور سان ہوزے کے لیے روانہ ہو گیا۔ راستے میں ٹکٹ چیکر آیا۔ میں نے ایک ٹکٹ اسے دیا۔ اس نے نشان لگا کر واپس کر دیا۔ ٹکٹ پر تحریر عبارت پڑھنے پر معلوم ہوا کہ آج کا ٹکٹ ڈے پاس ہے یعنی ایک ٹکٹ پر صبح سے رات نو بجے تک جتنا چاہو سفر کر لو۔ شام کو میں اسی ٹکٹ سے سان ہوزے سے واپس آ گیا۔ چھ بج رہے تھے۔ اسٹیشن پر ساڑھے چھ بجے والی گاڑی کے ٹکٹ لینے والوں کی مشین پر لائن لگی ہوئی تھی۔ میں نے ایک صاحب سے کہا کہ میرے پاس ڈے پاس ہے آپ لے لیں۔ وہ آگے بڑھ گئے۔ ان کے پیچھے ایک محترمہ جلدی میں تھیں میں نے کہا میڈم مجھے پیسے نہیں چاہئیں آپ اس ٹکٹ کو استعمال کر لیں۔ انہوں نے ڈے پاس کو دیکھا اور کہنے لگیں میں فری نہیں لوں گی۔ بٹوہ کھولا اس میں کھلے چار ڈالر تھے وہ میرے ہاتھ میں تھمائے اور تیزی سے گاڑی کی جانب دوڑیں جو چلنی شروع ہو گئی تھی۔ اب میرے پاس ایک فریش ڈے پاس بچا تھا لیکن یہ بھی نو بجے رات ختم ہو رہا تھا۔ میں اسٹیشن پر دس منٹ ٹہل کر مشین کے پاس آ گیا اب سات بجے والی گاڑی کے ٹکٹ کے لیے کچھ لوگ مشین پر کھڑے تھے میں نے ایک محترمہ سے یہی کہا کہ ٹکٹ فریش ہے مجھے جانا نہیں ہے مجھے پیسے نہیں چاہئیں آپ استعمال کر لیں تو ضائع ہونے سے بچ جائے گا۔ محترمہ نے ٹکٹ الٹ پلٹ کر دیکھا۔ بٹوے میں سے دس ڈالر کا نوٹ نکالا اور مجھ سے باقی پیسے مانگنے میں نے پانچ ڈالر دیے وہ بھاگ کر ٹرین میں سوار ہوئیں اور میں نیا تجربہ لے کر گھر آ گیا۔ بچے بولے ابو آپ نے سان فرانسسکو کو کراچی بنا دیا ہے۔

☆.....☆

آج چھٹی ہے موسم شاندار ہے۔ فیصل، میں، نجمہ، راحت گاڑی میں سوار ہوئے۔ پہاڑوں کے درمیان سے ہوتے ہوئے Los gatos اور Scot Valley جیسے چھوٹے چھوٹے Cities سے گزر کر ہم پہاڑی سڑکوں سے باہر آئے تو سانتا کروز میں داخل ہو گئے۔ یہ جنوب مغربی ساحلی تفریح گاہ ہے۔ یہاں پانی کے کنارے ریت ہے اور پہاڑی پر دور تک دیوار کھنچی ہوئی ہے۔ دیوار کے ساتھ ساتھ دور تک چہل قدمی کے لیے۔ پانی کی لہروں کا نظارہ کرنے کے لیے پلیٹ فارم بنا ہوا ہے جس کے کنارے بڑے بڑے خوب صورت اور خطرناک جھولے لگے ہوئے ہیں۔ فوٹو شاپس ہیں چھوٹا سا سینما ہے کافی شاپس ہیں، آئس کریم کی دکانیں ہیں۔ سوونیئر کی بڑی بڑی دکانیں ہیں۔ مختلف وڈیو گیمز اور اسپورٹس کی دکانیں ہیں اور تفریح کا بہت سارا سامان موجود ہے۔ سوونیئر کی دکانوں میں پلاسٹک کی ٹرانسپیرنٹ ڈبیوں میں سنہری ڈلیاں دیکھیں پتا چلا یہ گولڈرش کی یادگار ہیں۔ دو سو سال پہلے سان فرانسسکو کے ساحل پر لہروں کے ہمراہ سونے کی ڈلیاں آتی تھیں۔ یہ واقعات اتنے عام ہوئے کہ ان ساحلوں پر لوگ مچھلی پکڑنے کی طرح چھوٹے باریک جال اور چھلنیاں لیے بیٹھے رہتے تھے اور جب انہیں یہ ڈلیاں مل جاتی تھیں تو باہر فٹ پاتھ پر بیٹھ کر خوانچہ سجا کر سونے کی ڈلیاں بیچا کرتے تھے۔ وہ دور بھی عجب دور تھا۔ جنوبی امریکا سے یورپ سے لوگ خاص طور سے سونا حاصل کرنے سان فرانسسکو کے ساحلوں پر آتے تھے۔ یورپ کے لوگ یہاں سے بے اندازہ سونا لے کر گئے۔ وہ گولڈرش کا دور کہلاتا ہے۔

یہاں سمندر کی شفاف لہریں جوار بھاٹا دکھاتی شور مچاتی ہوئی آتی ہیں اور پہاڑی کے دامن میں بچھی ریت پر دم توڑ دیتی ہیں۔ نہانے کے شوقین ریت میں اتر جاتے ہیں۔ چہل قدمی کرتے ہیں اور سن باتھ لیتے ہیں۔ یہ بہت ہی بارونق تفریح گاہ ہے لہٰذا یہاں ہمہ وقت ٹورسٹوں کا جمگھٹا لگا رہتا ہے۔ پہاڑی کے دوسری طرف سڑک کے ساتھ ہی دکانیں ہیں۔ دکانوں کے پیچھے خوب صورت ہٹس، خوب صورت فلیٹس اور خوب صورت بنگلے بنے ہوئے ہیں جو ہر وقت کرایہ پر دستیاب ہوتے ہیں۔ دور دراز سے لوگ یہاں فیملیوں خاص طور سے بچوں کے ہمراہ آتے ہیں۔ ان ہٹوں، فلیٹوں کو کرایہ پر لیتے ہیں۔ اپنی چھٹیاں، یہاں کا موسم، پانی کا کنارہ انجوائے کرتے ہیں، اپنی عمریں بڑھاتے ہیں اور چلے جاتے ہیں۔ ہم نے بھی کچھ وقت گزارا اور گاڑی ڈبلن کی جانب رواں دواں ہو گئی۔

جاری ہے

تاریخ عالم

منظر امام

یہ عالم رنگ و بُو لفظِ کُن سے خلق ہوا، سائنسدانوں نے کہا یہ تو بِگ بینگ سے وجود میں آیا۔ اس کرئہ ارض کے وجود میں آتے ہی زندگی نے انگڑائی لی۔ آدمی کا وجود سامنے آیا۔ آدمی نے ہی اس کرۂ ارض کی رنگینی میں اضافہ کیا۔ اس میں ترقی کا اسپ تیز رفتار دوڑایا۔ یہ دنیا ترقی یافتہ دنیا، رنگینیوں، آسائشوں سے بھری دنیا کوئی ایک دن کی کہانی نہیں۔ ہزاروں سال پر محیط کہانی ہے جسے نہایت مختصر مگر جامع انداز میں احاطہ تحریر میں لایا گیا۔

خوشی اس بات کی ہے کہ تاریخ عہد بہ عہد کے سلسلے کو پسند کیا جا رہا ہے۔ میرے پاس خطوط آ رہے ہیں۔ خطوط کے علاوہ ذاتی طور پر بھی لوگوں نے ملاقاتیں کی ہیں اور بتایا ہے کہ اس سلسلے کو پڑھنے کے بعد ان کی معلومات میں اضافہ ہوا ہے۔

یہ اچھی بات ہے۔ خدا کرے کہ لوگوں میں پڑھنے کا شوق اسی طرح برقرار رہے۔ بہر حال اس تمہید کے بعد ہم آتے ہیں اصل موضوع کی طرف۔

تاریخِ عالم کا جائزہ لیتے ہوئے ہم پندرھویں صدی قبل مسیح تک آ چکے ہیں۔ یہ وہ دور ہے جب انسانی ترقی کی رفتار تیز سے تیز تر ہوتی جا رہی ہے۔

اس نے زندگی کے ہر شعبے میں اپنا ہنر دکھانا شروع کر دیا ہے۔ تعمیرات، زراعت، سادہ مشینوں اور اوزاروں کا استعمال شروع ہو چکا ہے۔ ستارہ شناسی، طب، فلسفہ، حساب میں کمال حاصل ہو چکا ہے۔ بحری اور بری افواج کی تشکیل ہونے لگی ہے۔ غرض یہ کہ ہر شعبہ ترقی کر رہا ہے۔

مذہبیات میں بھی انقلابی تبدیلیاں آ رہی ہیں۔ دیوی دیوتاؤں کے فرسودہ زمانے کی جگہ اب خدا کے نبیوں اور نیک لوگوں کی تعلیمات کی گونج سنائی دے رہی ہے۔

ہم نے پندرھویں صدی قبل از مسیح تک کی تاریخ میں ایران کا جائزہ لے لیا ہے۔ اب ہم آتے ہیں ہندوستان کی طرف۔

ہندوستان (پاکستان) کی تہذیبوں اور یہاں کی تاریخ کا تذکرہ ہم ذرا تفصیل سے کرنا چاہیں گے۔ کیونکہ ہمارا تعلق اسی سرزمین سے ہے۔

پورے ہندوستان کی مجموعی تاریخ اور تہذیب کے حوالے سے ہم سب سے پہلے موجودہ پاکستان کی سرزمین کو دیکھتے ہیں کہ یہاں مختلف عہد میں کیا ہوتا رہا۔

ویسے ہم سرسری طور پر اس سرزمین کا تذکرہ کر چکے ہیں۔ پھر بھی تجدید مطالعہ کے لیے ہم مختصر طور پر یہاں کی تاریخ اور تہذیب کا جائزہ لیتے ہوئے آگے بڑھتے ہیں تاکہ ہمارے پڑھنے والوں کے ذہنوں میں یہ مراحل تازہ رہیں۔

سب سے پہلے آ جائیں موجودہ پاکستان کی قدیم تاریخ کی طرف۔

حجری (پتھروں) کے دور کے بعد ہمارے یہاں سوانی تہذیب یا سوانی تاریخ شروع ہوتی ہے۔ یہ تہذیب رادی وسوان (پوٹھوہار) کی تھی۔

اس دور کے لوگ کلہاڑیوں وغیرہ کے استعمال سے واقف تھے۔ وہ ابھی بھی چھوٹے چھوٹے گروہوں میں درختوں پر یا غاروں میں رہتے تھے۔ ہزارہ، پشاور اور مردان کے اضلاع میں ایسے کئی غار دریافت ہو چکے ہیں۔

پاکستان کا دوسرا حجری دور کھیتی باڑی کے فن سے شروع ہوتا ہے۔

دراصل کھیتی باڑی ہی وہ فن ہے جس کی بدولت انسان، انسان کہلانے کا مستحق ہوتا ہے۔ زراعت کا فن سیکھنے کے بعد وہ اپنی ضروریات زندگی خود پیدا کرنے لگا۔

پاکستان کے علاقوں میں اب تک چار دیہی یا زرعی تہذیبیں دریافت ہوئی ہیں۔

1۔ وسطی بلوچستان۔
2۔ وسطی بلوچستان اور بالائی سندھ۔
3۔ جنوبی بلوچستان۔
4۔ شمالی بلوچستان۔

سندھ اور بلوچستان کے آثار قدیمہ سے پتا چلتا ہے کہ اس خطے کے لوگ موئن جو دڑو اور ہڑپہ تہذیب کے عروج سے بھی پیشتر بہت ترقی یافتہ تھے۔

موئن جو دڑو، ہڑپہ کی تہذیب جس کو وادی سندھ کی تہذیب کہتے ہیں۔ اس وقت کانسی کے دور کا نقطۂ عروج تھا۔ یہ تہذیب کوہ ہمالیہ کے دامن سے لے کر کاٹھیاواڑ تک اور کوئٹہ سے راجستھان تک پھیلی ہوئی تھی۔

یہ تہذیب تقریباً ایک ہزار برس، ڈھائی ہزار قبل مسیح سے پندرہ سو قبل مسیح تک بڑی آن بان کے ساتھ زندہ رہی۔ موئن جو دڑو تجارتی بندرگاہ بھی تھا۔

ہندوستان کی تہذیب و تمدن میں ایک بہت بڑی تبدیلی آریاؤں کی آمد کے بعد شروع ہوئی۔ یہ آریہ اپنے ساتھ اپنی زبان، اپنا کلچر اور اپنے دیوی دیوتا لے کر آئے۔ یہ چونکہ زیادہ ترقی یافتہ اور منظم تھے۔ اس لیے یہاں کے باشندوں نے ان کی پیروی شروع کر دی اور دیکھتے دیکھتے ہر طرف آریاؤں کا تسلط ہو گیا۔

آریہ قبائل وسطی ایشیا کے رہنے والے تھے۔ یہ کابل اور بلند کی وادیوں سے ہوتے ہوئے کوہستان سلیمان کے دروں سے پنجاب میں داخل ہوئے۔

پنجاب میں ان کی آمد کا زمانہ پندرہ سو قبل مسیح سے بارہ سو قبل مسیح تک بتایا گیا ہے۔

یہاں میں ایک بار پھر واضح کر دوں کہ ہندوستان (پاکستان) کی تاریخ کا یہ جائزہ پندرہ سو قبل مسیح تک کا ہے۔ اس لیے وہ بہت سے کردار اس جائزے میں سامنے نہیں آئیں گے جنہوں نے تاریخِ عالم پر گہرے اثرات مرتب کیے تھے۔

دوسری قسط میں یا اس کے بعد والی اقساط میں پندرہ سو قبل از مسیح سے ایک قبل مسیح تک کا جائزہ لیا جائے گا۔

ابھی ہم ہندوستان (یا بھارت) کی تاریخ کا جائزہ پندرہ سو قبل از مسیح تک لے رہے ہیں کیوں کہ تاریخ نے

کروٹ بدلنا شروع کر دی تھی۔

آریہ قبائل نے جنوبی پنجاب میں اپنی مستقل نوآبادی قائم کی اور اس خطے کو متبرک سمجھنے لگے۔ اس خطے کا نام انہوں نے آریہ ورت رکھا۔

مہا بھارت میں لکھا ہے کہ آریہ قبائل جب پہلے پہل پنجاب میں داخل ہوئے تو خانہ بدوش قبائل کی صورت میں آئے تھے۔

قبیلوں کے سردار راجے کہلاتے تھے۔ اس زمانے میں مبازرت یعنی دو دو بہادروں کی لڑائیوں کا طریقہ رائج تھا۔

آریاؤں کی آمد کے بعد معاشرے کا اپنا سسٹم قائم ہو گیا تھا۔ باقاعدہ حکومتی نظام تھا۔ راجاؤں کے بیٹوں اور کشتری سورماؤں کی جنگی تربیت دینے کے لیے فوجی اسکول قائم کر دیے گئے تھے۔

راجے اور کشتری گوشت کھاتے تھے۔ دیوتاؤں کے لیے جانوروں کی قربانیاں دی جاتی تھیں۔ ایک سے زیادہ بیویاں رکھنے یا چار پانچ بھائیوں کی ایک ہی بیوی کے خاوند بننے کو معیوب نہیں سمجھا جاتا تھا۔

آریاؤں نے یہاں کے مقامی باشندوں پر بڑی حکمتِ عملی سے غلبہ حاصل کیا تھا۔ انہیں ذہنی طور پر اتنا مرعوب کر دیا تھا کہ آریا جس سمت اشارہ کرتے مقامی باشندے سدھائے ہوئے بھیڑوں کی طرح اس سمت چل پڑتے تھے۔

باذوق قارئین کی تاریخ سے دل چسپی کے لیے اگر آریاؤں کے نظام کو سمجھنے کی کچھ اور کوشش کی جائے تو بہت بہتر ہو سکتا ہے۔

وید کے لٹریچر کے مطالعے سے پتا چلتا ہے کہ اب سے ساڑھے تین ہزار برس پہلے سندھ میں دو قوموں یا دو نسلوں کے لوگ جگہ جگہ آباد تھے۔

ایک داسیو اور دوسرے آسور (آشور)، داسیو غالباً وہ قبیلے تھے جو آریوں کی یلغار سے پہلے بحر اسود سے پنجاب تک پھیلے ہوئے تھے۔

پارسیوں کی مقدس کتاب "اوستا" میں ان کو دیاؤ، داکھیو اور داہیلو کے نام سے یاد کیا گیا ہے۔

دیہہ (گاؤں) اور دیہاتی کی اصطلاح میں داسیو ہی سے متعلق ہیں اور شاید پنجاب کی ڈاہا قوم داسیوں کی اولاد ہے۔

مینٹگمری برنارڈ لاء

(1887ء۔1976ء)

برطانوی فوجی افسر۔ 1908ء میں وردک شائر رجمنٹ میں شامل ہوئے۔ پہلی جنگِ عظیم میں فرانس کے محاذ پر خدمات انجام دیں۔ دوسری جنگِ عظیم میں شمالی افریقا میں اتحادیوں کی آٹھویں فوج کی کمان سنبھالی اور اکتوبر 1942ء میں العالمین کے محاذ پر جرمن فوجوں کو شکست فاش دی۔ 1944ء میں نارمنڈی (شمالی مغربی فرانس) پر حملہ کرنے والی اتحادی افواج کے کمانڈر مقرر ہوئے۔ 1945ء میں ہالینڈ، بیلجیم، ڈنمارک کے بعد شمالی جرمنی کا علاقہ فتح کر لیا، اسی سال فیلڈ مارشل کے عہدے پر فائز ہوئے۔ 1946ء میں وائی کاؤنٹ بنائے گئے۔ 1948ء میں مغربی یورپ کی دفاعی کمیٹی کے صدر منتخب ہوئے۔ 1951ء تا 1958ء نیٹو کی افواج کے ڈپٹی سپریم کمانڈر رہے۔

ایرانی دیو مالا میں جس دہاک (ضحاک) کا بڑا گھناؤنا کردار پیش کیا گیا ہے۔ وہ داسیو قوم ہی کا کوئی سردار ہوگا جس سے آریاؤں کا سابقہ پڑا ہو۔

اس کے شانوں پر سے سانپوں کے ابھرنے کی روایت سے بھی اس قیاس کو تقویت ملتی ہے کیوں کہ یہاں کی پرانی قوموں میں ناگ کو بڑی اہمیت حاصل تھی۔

رگ وید داسیوں کے بارے میں لکھتا ہے۔ "ان کی ناک چپٹی اور رنگ کالا ہے اور وہ پھنگ (سانپ) کی پوجا کرتے ہیں۔"

آریوں کے نزدیک وہ لامہذب لوگ تھے اور کوئی مذہبی رسم ادا نہیں کرتے تھے۔ داسیوں کے اپنے راجن یا سردار ہوتے تھے۔ جن کو آریوں کے جنگی ہیرو اندرا نے چن چن کر مارا تھا۔ البتہ شاید بعض راجنوں نے بلا غیرے اطاعت قبول کر لی اور اپنی گدی بچالی۔

رگ وید میں لکھا ہے کہ دو داسیو (سرداروں) بلجوتا اور ترکسا نے ایک برہمن رشی وشا کو سواونٹ دان دیے۔

داسیو یا داس کا لفظ غلام کے معنی میں اس وقت رائج ہوا جب آریوں نے داسیوں پر غلبہ پا کر ان کو اپنا غلام بنا لیا۔

آسوروں میں دو اونچے طبقے ہوتے تھے۔ ایک ودتر اور دوسرے پانتری یا دانی۔ ودتر پروہت طبقہ تھا۔ اس کو تپسا کے سبب آسن آتے تھے اور وہ جادو ٹونے کا بھی ماہر تھا۔

پروفیسر بودھ پرکاش کا خیال ہے کہ موئن جودڑو اور ہڑپہ کے راجن یہی پروہت (ورتر) تھے۔
رگ وید کے مطابق وہ 99 شہروں کے مالک تھے۔ وہ بہت خوش حال اور طاقت ور تھے اور برسوں آریوں کا مقابلہ کرتے رہے۔ اس بنا پر رگ وید ان کو آریوں کا جانی دشمن خیال کرتا ہے۔
پانٹری یا دانی تجارت پیشہ لوگ تھے۔ اردو زبان کا لفظ بنیا اسی سے نکلا ہے۔ رگ وید کے مطابق یہ لوگ بڑے دولت مند، لالچی اور فریبی ہوتے تھے۔
رگ وید میں پچاس سے زائد مقامی سرداروں کا ذکر کیا گیا ہے۔ ان میں سے اکثر غالباً بہت چھوٹے چھوٹے قبیلوں کے سربراہ تھے۔ لہٰذا ان کو اطاعت پر مجبور کرنے میں آریوں کو زیادہ دشواری نہیں ہوئی لیکن بعض بہت طاقت ور تھے اور وہ عرصے تک حملہ آوروں کا مقابلہ کرتے رہے۔ مثلاً وو دریاؤں کا آقا ''نخوچی'' جس کی فوج عورتوں پر مشتمل تھی۔
اس زنانی فوج کو دیکھ کر اندرا کو بے اختیار ہنسی آگئی لیکن جب لڑائی چھڑی تو اندرا کا بس نہ چلا اور وہ عورتوں کو شکست نہیں دے سکا۔
تب اندرا نے مایا (مکر) سے کام لے کر نخوچی سے صلح کرلی اور موقع پا کر اس کا سر قلم کر دیا۔
رگ وید میں اندرا کے ہاتھوں ایک شہر نار موئی پر قبضے کی کہانی بھی ہے۔ محققین کے خیال میں وہ شہر موئن جودڑو تھا۔
جس زمانے میں سندھ اور پنجاب کے علاقوں میں یہ سب کچھ ہو رہا تھا اس زمانے میں ہندوستان کے دوسرے علاقوں میں بھی تہذیب انگڑائی لے رہی تھی۔
وادی سندھ کے قدیم لوگوں کے دیوی دیوتاؤں اور آریوں کی دیویوں اور دیوتاؤں کے درمیان ایک بہت بڑا بنیادی فرق تھا۔
وادی سندھ کے لوگوں کے دیوتا مادری یعنی مونث تھے جب کہ آریاؤں کے دیوتا پدری یا مذکر ہوا کرتے تھے۔ ان کا سب سے بڑا دیوتا اندر تھا جو جنگ اور طوفانوں کا دیوتا تھا۔ آریا اپنے آگ دیوتا کو اگنی دیوتا کہتے اور اس کے سامنے بھینٹ بھی چڑھاتے تھے۔
ابتدائی دور کے آریہ مورتی پوجا اور مندر کی ضرورت سے نا آشنا تھے۔ بعد میں آریاؤں کے چار وید بن گئے۔
رگ وید، سام وید، یجر وید اور اتھر وید۔
رگ وید کے اشلوک پڑھے جاتے تھے۔ سام وید کے بھجن گائے جاتے تھے۔ یجر وید میں مذہبی رسومات کی ادائیگی کے طریقے درج تھے اور اتھر وید میں ایسے مختصر اشلوک ہیں جو جھاڑ پھونک یا ٹونے ٹوٹکے کا کام دیتے ہیں۔ یہ آخری وید ہندوستان کے قدیم اقوام کے اثرات کا نتیجہ ہے۔ جن میں بھوری رنگت کی قدیم اقوام کی طرح جادو اور کالا علم بہت رائج تھا۔
رگ وید میں ایک خدا یعنی دیوتاؤں کے دیوتا رب الارباب کی حمد کے گیت ملتے ہیں۔ جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ قدیم آریاؤں کے مذہبی عقائد میں خدا کے ایک ہونے کا تصور بھی موجود تھا۔ ہندوستان کے قدیم باشندوں میں ہر طرح کے مذہبی عقائد رکھنے والے لوگ پائے جاتے تھے۔ ان میں سانپوں، درختوں، پہاڑوں، دریاؤں، بھوتوں، روحوں کو پوجنے والوں سے لے کر برہما، وشنو اور شیو یعنی پیدا کرنے والے خدا، پرورش کرنے والے خدا اور مارنے والے خدا کو ماننے کے قدیم ترین پیرو بھی تھے۔
دو توسروں کا ذکر ہو چکا ہے۔ آسور اور داسیو، آسور قوم غالباً زیادہ ترقی یافتہ تھی۔ کیوں کہ آسوروں کی دانائی کا اعتراف وید بھی کرتا ہے۔ وہ دھاتوں کے بڑے ماہر سمجھے جاتے تھے اور ان کی زبان بھی منفرد تھی۔
اتھر وید کے مطابق آسور عقل و حکمت میں رشیوں کی ہمسری کیا کرتے تھے۔ اسی باعث آریاؤں کے تسلط کے بعد کئی آسوریوں کو رشیوں کا مرتبہ بھی مل گیا تھا۔ البتہ تمیز کے لیے ان کے نام کے ساتھ آسور کا لفظ ضرور استعمال کیا جاتا تھا۔
ہندوستان (پاکستان) کی تاریخ اور تہذیب کا جائزہ لیتے ہوئے آریہ لفظ کا بہت استعمال ہوا ہے۔ آپ کی دل چسپی کے لیے تھوڑے سے حالات آریاؤں کے بتاتے ہوئے چلتے ہیں، ان واقعات سے ہندوستان کا قدیم پس منظر اور یہاں کی تہذیب بھی واضح ہوتی جائے گی۔
آریہ کسی نسل یا قوم کا نام نہیں ہے بلکہ آریہ وہ لوگ کہلاتے ہیں جن کا آبائی وطن خوارزم اور بخارا کا خطہ تھا۔ انہوں نے دو ہزار قبل مسیح کے لگ بھگ وسطی ایشیا کی چراگاہوں سے نکل کر جنوب مغربی ایشیا کا رخ کیا تھا۔ ان کو اپنی برتری کا بڑا گھمنڈ تھا۔ اس لیے وہ اپنے آپ کو آریہ کہتے تھے۔

سنسکرت میں آریہ کے معنی اونچی ذات، شریف اور آزاد کے ہیں۔ گھوڑا ان کی سواری کا جانور تھا جس کو وہ رتھ میں جوتتے تھے۔ پوشاک اونی ہوتی۔ عورت اور مرد دونوں پگڑی باندھتے تھے۔ البتہ عورتیں چوٹیاں رکھتی تھیں۔ گوشت ان کی مرغوب غذا تھی۔ شورا ان کا دل پسند مشروب' سوم رس مذہبی رسومات کے وقت پیا جاتا تھا۔

آریوں کا معاشرہ قبیلہ واری تھا مگر وادی سندھ کے برعکس قبیلہ اور خاندان دونوں کے سربراہ مرد ہوا کرتے تھے۔

گھرانے کے سب لوگ ایک ہی گھر میں رہتے تھے۔ ہر گھر میں آتش شالہ ہوتا تھا۔ گھر کے مالک کو رم پتی کہتے تھے۔ عورت کا درجہ مرد سے کم تھا۔ عام طور پر ایک مرد اور ایک عورت کا رواج تھا۔

آریوں کے بڑے دیوتا سب مرد تھے۔ دیویاں کتنی کی ہوا کرتیں اور وہ بھی دیوتاؤں کی بیویاں نہ تھیں بلکہ داشتائیں تھیں۔

وادی سندھ میں آریہ قبیلوں کی آمد دو ہزار قبل مسیح میں شروع ہوئی اور یہ سلسلہ تقریباً پانچ سو سال تک جاری رہا۔

آریہ قافلے درۂ خیبر یا درۂ بولان کی راہ سے داخل ہوتے۔ مقامی باشندوں کو زیر کرتے۔ ان کی زمینوں اور مویشیوں پر قبضہ کر کے ان کو غلام بنا لیتے تھے۔ رفتہ رفتہ انہوں نے پورے ملک پر اپنا تسلط جما لیا۔ البتہ جب وادی سندھ میں گنجائش نہ رہی تو ایک ہزار قبل مسیح کے قریب ان کے کئی قبیلوں نے وادی گنگ و جمن کا رخ کیا اور پورے شمالی ہندوستان میں پھیل گئے۔

یہاں سے ہندوستان کی تاریخ کا وہ دور شروع ہوتا ہے۔ جب آریوں اور مقامی لوگوں کے اشتراک سے ایک نئی تہذیب سامنے آئی۔

ویدانت تخلیق کیے گئے۔ رجواڑے بنے، ہندو فلاسفہ سامنے آیا۔

بہت سے محققین کا یہ خیال ہے کہ دنیا کی سب سے پرانی کتاب رگ وید سندھ میں تخلیق ہوئی تھی۔ رگ ویدیوں تو ایک ہزار سے زائد بھجنوں کا مجموعہ ہے لیکن ان میں جابجا ایسے واقعات کا ذکر بھی آتا ہے جن میں آریاؤں کی تہذیب کے خدوخال صاف دکھائی دیتے ہیں۔

رگ وید کا عہد تصنیف 1500 تا 1200 قبل مسیح ہے۔ پھر تین اور وید ہیں۔ سام وید، یجر وید اور اتھر وید۔

رگ وید سے پتا چلتا ہے کہ آریوں نے یہاں کے پرانے زرعی نظام کو نہیں بدلا۔ بلکہ زمین بدستور گاؤں یا قبیلے کے مشترکہ تصرف میں رہی۔ چنانچہ رگ وید میں زمین کے بٹوارے یا خرید و فروخت کا کوئی ذکر نہیں ہے۔

آریوں نے مقامی لوگوں کو غلام (داس) بنا کر ایک نئے سماجی نظام کی بنیاد ڈالی۔ (غالباً طبقاتی نظام اور چھوت چھات ہندوستان میں اسی دور سے شروع ہوئی ہے)۔

ریاستوں کی تشکیل اس طرح ہوتی رہی کہ ہر قبیلہ اپنی اپنی تعداد کے مطابق زمینوں پر قابض ہوتا چلا گیا۔

''راشٹر'' بنتے چلے گئے۔ آریا ریاست کو راشٹر کہا کرتے تھے۔ جو آج بھی استعمال میں آتا ہے جیسے سوراشٹر، مہاراشٹر وغیرہ۔

ریاست کے والی (مرکز) کو راجن کہا جاتا تھا۔ جیسے راجن پور، جو دریائے سندھ کے مغربی کنارے کا شہر ہے۔

ہندوستان کی تہذیب اور تاریخ کی اب تک جو صورت حال سامنے آئی ہے وہ کچھ یوں ہے۔

آریاؤں کی آمد سے پہلے اس سرزمین پر دراوڑوں یا آسور آباد تھے۔

ان کے یہاں مادری نظام رائج تھا۔ یعنی عورت کو مرکزی حیثیت حاصل تھی۔

یہ لوگ شہر بنا کر رہا کرتے۔ موئن جودڑو اور ہڑپہ اس کی مثالیں ہیں۔ آسور لوگ جسم ہی کو اصل شے مانتے تھے۔ روح، دیوتا اور دوسری دنیا کے قائل نہ تھے۔ یعنی وہ مادہ پرست ہوتے تھے۔

پھر آریاؤں کی آمد شروع ہوئی۔

یہ آریہ اپنا نظام زندگی ساتھ لائے تھے۔ یہ خانہ بدوش ہوتے تھے لیکن ذہنی طور پر مقامی لوگوں سے برتر بھی تھے اور ان میں جنگی صلاحیتیں بھی تھیں۔

آریاؤں نے اپنے لائے ہوئے دیوی اور دیوتا متعارف کروائے اور ہندوستان بھر میں ایک نئی تہذیب جنم لینے لگی۔

آگے چل کر ویدانت تصنیف ہوئے۔ مہابھارت اور گیتا کی تخلیق ہوئی۔ بڑی بڑی ریاستیں وجود میں آئیں۔

ہندوستان کے ان حالات کا تفصیلی ذکر آئندہ قسط میں ہوگا کیوں کہ ہم پندرہ سو قبل مسیح سے ایک قبل مسیح تک کا جائزہ لیں گے۔

جاری ہے

سراب

راوی : شہبازملک
تحریر: کاشف زبیر

قسط نمبر: 102

وہ پیدائشی مہم جو تھا۔ بلند وبالا پہاڑ، سنگلاخ چٹانیں، برف پوش چوٹیاں اور نگاہ کی حدوں سے آگے کی بلندیاں اسے پیاری تھیں۔اسے ان میں ایک کشش اور ایک للکارسی ابھرتی محسوس ہوتی کہ آؤ ہمیں دیکھو ،مسخر کرو اور ہمارے سحر میں مسحور ہو کر اپنا آپ مٹا ڈالو۔ اسے یہ سب حقیقت لگتا مگر کیا واقعی یہ حقیقت تھا یا محض سراب......ایسا سراب جو آنکھوں کے راستے ذہن ودل کو بھٹکاتا ہے، جذبوں کو مہمیز دیتا ہے مگر اسودگی اور اطمینان چھین لیتا ہے۔سرابی لمحوں کے فاصلے پر دکھائی دیتی ہے مگر وہ لمحہ حقیقت میں کبھی نہیں آتا۔ اس کی زندگی بھی سرابوں کے ایسے دائروں میں گزری اور گزرتی رہی۔وقت کے گرداب میں ڈوبتے ہوئے نوجوان کی سنسنی خیز اور ولولہ انگیز داستان حیات۔

بلند حوصلوں اور بے مثال ولولوں سے گندھی ایک تہلکہ خیز کہانی

(گزشتہ اقساط کا خلاصہ)
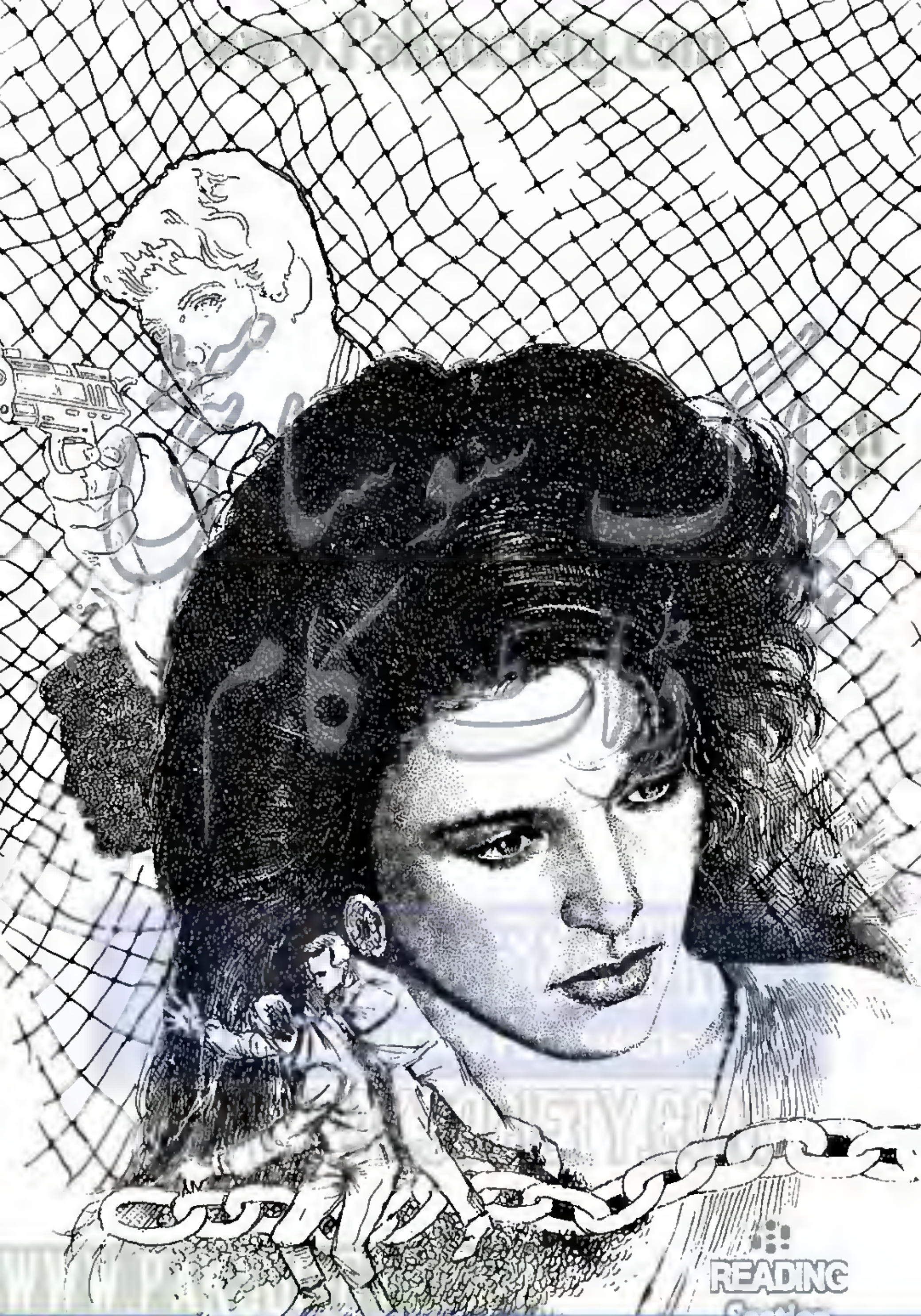
میری محبت سویرا، میرے بھائی کا مقدر بنادی گئی تو میں ہمیشہ کے لیے حویلی سے نکل آیا۔ اسی دوران میں نادر علی سے ٹکراؤ ہوا، اور یہ ٹکراؤ ذاتی انا میں بدل گیا۔ ایک طرف مرشد علی، فتح خان اور ڈیوڈ شا جیسے دشمن تھے تو دوسری طرف سفیر، ندیم اور وسیم جیسے جاں نثار دوست۔ پھر ہنگاموں کا ایک طویل سلسلہ شروع ہوگیا جس کی کڑیاں سرحد پار تک چلی گئیں۔ فتح خان نے مجھے مجبور کردیا کہ مجھے ڈیوڈ شا کے ہیرے تلاش کرنے ہوں گے، میں ہیروں کی تلاش میں نکل پڑا۔ میں شہلا کے گھر کی تلاشی لینے پہنچا تو باہر سے گیس بم پھینک کر مجھے بے ہوش کردیا گیا۔ ہوش آنے کے بعد میں نے خود کو انڈین آرمی کی تحویل میں پایا مگر میں ان کو ان کی اوقات بتا کر نکل بھاگا۔ جیپ تک پہنچا ہی تھا کہ فتح خان نے گھیر لیا۔ میں نے کرنل زرد بکی کو زخمی کرکے بساط اپنے حق میں کرلی۔ میں دوستوں کے درمیان آکرنی دی دیکھ رہا تھا کہ ایک خبر نظر آئی۔ مرشد نے بھائی کو راستے سے ہٹانے کی کوشش کی تھی۔ ہم مانسہرہ پہنچے۔ وہاں وسیم کے ایک دوست کے گھر میں ٹھہرے۔ اس دوست کے بیٹے نے ایک خانہ بدوش لڑکی کو پناہ دی تھی وہ لڑکی مہر دتھی۔ وہ ہمیں بریف کیس تک لے گئی مگر وہاں بریف کیس نہ تھا۔ کرنل زرد بکی بریف کیس لے بھاگا تھا۔ ہم اس کا پیچھا کرتے ہوئے چلے تو دیکھا کہ کچھ لوگ ایک گاڑی پر فائرنگ کر رہے ہیں۔ ہم نے حملہ آوروں کو بھگا دیا۔ اس گاڑی سے کرنل زرد بکی ملا۔ وہ زخمی تھا۔ ہم نے بریف کیس لے کر اسے اسپتال پہنچانے کا انتظام کردیا اور بریف کیس کو ایک گڑھے میں چھپادیا۔ واپس آیا تو فتح خان نے ہم پر قابو پالیا۔ پستول کے زور پر وہ مجھے اس گڑھے تک لے گیا مگر میں نے جب گڑھے میں ہاتھ ڈالا تو وہاں بریف کیس نہیں تھا۔ اتنے میں میری امداد کو انٹیلی جنس والے پہنچ گئے۔ انہوں نے فتح خان پر فائرنگ کردی اور میں نے ان کے ساتھ جاکر بریف کیس حاصل کرلیا۔ وہ بریف کیس لے کر چلے گئے۔ ہم واپس عبداللہ کی کوٹھی پر آگئے۔ سفیر کو دبئی بھیجنا تھا اسے ائرپورٹ سے سی آف کرکے آرہے تھے کہ راستے میں ایک چھوٹا سا ایکسیڈنٹ ہوگیا۔ وہ گاڑی ممتاز حسن نامی سیاست داں کی بیٹی منی کی تھی وہ زبردستی ہمیں اپنی کوٹھی میں لے آئی۔ وہاں جو شخص آیا اسے دیکھ کر میں چونک اٹھا۔ وہ میرے بدترین دشمنوں میں سے ایک تھا۔ وہ راج کنور تھا۔ وہ پاکستان میں اس گھر تک کس طرح آیا اس سے میں بہت کچھ سمجھ گیا۔ اس نے مجبور کیا کہ میں ہر روز نصف لیٹر خون اسے دوں۔ بحالت مجبوری میں راضی ہوگیا لیکن ایک روز ان کی چالاکی کو پکڑ لیا کہ وہ زیادہ خون نکال رہے تھے۔ میں نے ڈاکٹر پر حملہ کیا تو نرس مجھ سے چمٹ گئی پھر میرے سر پر وار ہوا اور میں بے ہوش ہوگیا۔ ہوش آیا تو میں انڈیا میں تھا۔ بانو بھی اغوا ہوکر پہنچ چکی تھی۔ وہ لوگ ہمیں گاڑی میں بٹھا کر... آگے بڑھے تھے کہ ہماری گاڑی کو دو طرف سے گھیر لیا گیا۔ وہ فتح خان تھا، اس نے ڈیوڈ شا کے اشارے پر مجھے گھیرا تھا۔ میں اس کے ساتھ ڈیوڈ شا کے پاس پہنچا۔ ڈیوڈ نے پُراسرار وادی میں چلنے کی بات کی۔ اس نے ہر کام میں مدد دینے کا وعدہ کیا۔ سعدیہ کو کنور پیلس سے آزاد کرانے کی بات بھی ہوئی اور اس نے بھرپور مدد دینے کا وعدہ کیا۔ ہماری خدمت کے لیے پوجا نامی نوکرانی کو مقرر کیا گیا تھا۔ وہ کمرے میں آئی تھی کہ اس کے مائیکروفون سے منشی دل جی کی آواز سنائی دی "شاہی، شہباز ملک کسی عورت کو چھڑانے آیا ہے۔" ڈیوڈ شا کا جواب سن نہیں پایا کیونکہ پوجا نے مائیک بند کردیا تھا۔ اس دن کے بعد سے پوجا کی ڈیوٹی کہیں اور لگادی گئی۔ میں ایک جھاڑی کی آڑ میں بیٹھ کر موبائل پر باتیں کر رہا تھا کہ کسی نے پیچھے سے وار کرکے بے ہوش کردیا اور محل میں پہنچادیا۔ مجھے پتا تھا ہر جگہ مائیکروفون لگا ہوا ہے۔ ابھی فائرنگ شروع ہوئی اور میں نے چیخ کر کہا "کنور ہوشیار" سادی کو لے کر چیمبر...... "مگر جملہ ادھورا رہ گیا اور سادی کی چیخ سنائی دی پھر منشی دل نظر آیا۔ اس کے آدمیوں نے بڑے کنور کے وفاداروں کو ختم کرنا شروع کردیا تھا۔ میں اس سے نمٹ رہا تھا کہ فتح خان نے آکر مجھے اور سادی کو نشانے پر لے لیا۔ تبھی راج کنور آگیا۔ اس نے گولی چلائی جو بیتو کی گردن میں لگی۔ میں نے غصے میں پورا پستول راج کنور پر خالی کردیا بیتو مر چکا تھا۔ اس کی لاش کو ہم نے چتا کے حوالے کیا اور ایک ہیلی کاپٹر کے ذریعہ سرحد تک پہنچے۔ وہاں سے اپنے شہر۔ وہاں پہنچا ہی تھا کہ ڈیوڈ کی کال آگئی اس نے تصفیہ کرانے کی بات کی اور کال کٹ گئی۔ ہم بنگلے میں بیٹھے باتیں کر رہے تھے کہ گیس پھینک کر ہمیں بے ہوش کردیا گیا اور جب ہوش آیا تو میں قید میں تھا۔ شا کی قید میں شا نے مجھے کہا کہ میں فاضلی کی مدد کروں کیونکہ میرے ہاتھوں میں ایک ایسا کڑا پہنا دیا گیا تھا جو فاضلی سے 500 میٹر دور جاتے ہی زہر انجیکٹ کردیتا۔ میں حکم ماننے پر تیار ہوگیا فاضلی نے مرشد کی جعلی خانقاہ پر حملے کا پروگرام بنایا۔ ہم نے فاضلی کے آدمیوں کے ساتھ مل کر حملہ کیا۔ حملہ کامیاب رہا فاضلی مارا گیا اور مجھے سانپ نے ڈس لیا مگر سانپ کا زہر مجھ پر کارگر نہ ہوا۔ فاضلی نے جو کڑا مجھے پہنایا تھا اس کا الٹا اثر ہوا اور وہ خود کڑے میں چھپے سائنائیڈ زہر سے مارا گیا۔ میں مرشد کی خانقاہ سے نکل کر دوستوں کے پاس پہنچا پھر راجا صاحب سے ملنے جیپ کے ذریعے ان کے علاقے کی طرف چل پڑا۔ راستے میں وہ علاقہ بھی تھا جہاں برٹ شا نے ہیرے چھپائے تھے۔ میں اسے تلاش کرنے کے لیے پیڑ پر چڑھا تھا کہ فائر ہوا اور میں پھسل کر نیچے گرا ہی تھا کہ فتح خان کی آواز آئی کہ تم ٹھیک تو ہے پھر وہ مجھے قید کرکے لے چلا۔ راستے میں اس کے ساتھیوں نے غداری کی مگر میری مدد سے فتح خان فتح یاب ہوگیا۔ مگر آگے جاکر میں نے فتح خان کو گولی ماردی اور واپس وہاں آیا جہاں گاڑی کرکے گیا تھا۔ وہ لاش پڑی تھی۔ ابھی میں اسے دیکھ ہی رہا تھا کہ پولیس والے آگئے اور مجھے تھانے لے آئے۔ وہاں سے رشوت دے کر چھوٹا پھر راجا صاحب کے محل پہنچا مگر وہاں کے حالات بدل چکے تھے۔ میں واپس ہوگیا کہ راستے میں ایک عورت اور دو نوجوانوں نے مجھے گھیر لیا اور میرے سر پر کسی چیز سے وار ہوا۔ میں بے ہوش ہوکر گر پڑا۔ ہوش آیا تو میں شیر خان کی قید میں تھا۔ وہ لوگ مجھے افغانستان کے راستے بھارت لے آئے تب پتا چلا کہ وہ لڑکی ڈیوڈ کی کارندہ ہے لیکن اس نے ڈیوڈ شاہ کے گلے لگ کر کہا "پاپا" تو میں حیران رہ گیا۔ میں نے خواب میں بھی ایسا نہیں سوچا تھا ڈیوڈ نے ادشا کو بھی وہیں قید کر رکھا تھا۔ وہیں میری ملاقات ایک نیپالی سے ہوئی جو انہیں کا کارندہ تھا اس نے مجھے ایک موبائل فون دیا جس سے میں نے ایمن

سے باتیں کیں مگر اس کا راز کھل گیا اور شانے اسے قتل کر دیا۔ دو دن کے بعد تاریک وادی کا سفر شروع ہو گیا۔ ہم آگے چلے جا رہے تھے کہ باسو کا پیر پھسلا اور وہ ایک کھڈ میں گرنے لگا۔ ہم سب برف پوش پہاڑوں پر چڑھنے کے لیے ایک ہی رسی میں خود کو باندھے ہوئے تھے اس لیے میرا توازن بگڑا اور میں آگے کی سمت گرا تھا کہ زیبی نے سنبھال لیا۔ کرنل نے باسو کو رسی پھینک کر بچالیا۔ ہمارا سفر جاری رہا۔ ایک جگہ برفانی آدمیوں کے ایک غول نے گھیر لیا۔ ان سے بچ کر نکلا تو راستہ بھٹک گیا اور ایک سرنگ میں پہنچ گیا جو برف والے آدمی کی تھی۔ برف والے سے ملاقات ہوئی برف والے نے کنپٹی دبا کر بے ہوش کر دیا جب ہوش آیا تو میرے سر پر تیر کمان سے لیس کچھ سپاہی کھڑے تھے انہوں نے مجھے گرفتار کر کے وادی کے حکمران ریناٹ کی قید میں پہنچا دیا، وہاں ایک ہمدرد گیرٹ نے مجھے فرار میں مدد دی اور میں برف والے کے کہنے کے مطابق سامیرا کی فوج کی مدد کرنے کے لیے اس کے علاقے میں پہنچ گیا۔ میں نے فوج کو از سر نو تیاری کرانا شروع کر دی تھی کہ ریناٹ کے قلعہ آرگون کی طرف سے قرنا پھونکے جانے کی آواز بلند ہوئی سامیرا کا چہرہ زرد ہو گیا اور اس نے زیرِ لب کہا ”اعلانِ جنگ“ میں نے فوراً ہی سامیرا کی فوج کو منظم کرنا شروع کر دیا۔ فوج کو رسد کی اشد ضرورت رہتی ہے۔ رسد کے لیے مناسب انتظام کیا۔ ایک روز معائنہ کے بعد واپس لوٹ رہا تھا کہ ایک بچے کے منہ سے برف والے کا پیغام ملا کہ رات سے پہلے ٹھکانے پر لوٹ آیا کرو۔ رات باہر نہ گزارنا۔ میں روبیر کے ساتھ علاقے کو دیکھنے کے لیے نکلا تو پہاڑیوں کے درمیان مجھے کچھ ایسے گول پتھر نظر آئے جنہیں اسلحہ کے طور پر استعمال کر سکتا تھا۔ ابھی میں انہیں دیکھ ہی رہا تھا کہ خونخوار اسمار نے گھیر لیا اور میں روبیر کے ساتھ ایک پہاڑی غار میں گھس گیا۔ پھر اسمار اور بندر نما جانور کے علاوہ ہارن سے بھی مڈبھیڑ رہی مگر اگلی صبح ہم بخیریت واپس سامیرا کے پاس آ گئے۔ سامیرا نے کہا کہ یہ بہت برا ہوا ہے۔ تبھی سومرو چند سپاہیوں کے ساتھ میرے کمرے میں داخل ہوا اور مجھے جکڑ لیا۔

اب آگے پڑھیں

جب سے عام زندگی چھوڑ کر جدوجہد کے مراحل سے گزر رہا تھا۔ میں نے کبھی موت کے آگے ہتھیار ڈالنے کا نہیں سوچا تھا۔ کبھی موت کو سامنے دیکھ کر آنکھیں بند نہیں کیں۔ چاہے وہ کتنی ہی یقینی کیوں نہ نظر آ رہی ہو۔ اس وقت بھی اسماروں کی صورت میں سامنے یقینی موت تھی اور ان میں سے ایک اڑتی ہوئی میری طرف آ رہی تھی۔ مگر میں نے آنکھیں بند نہیں کی تھیں اور میری نظر اس پر مرکوز تھی۔ آخری دم تک کوشش کرتے رہنا اور پُر امید رہنا میرا شیوہ رہا ہے اور شاید اس وجہ سے بھی بہت سے مواقعوں پر اوپر والے نے مجھے محفوظ رکھا۔ ابھی اسمار راستے میں تھا کہ میں نے بائیں طرف چھلانگ لگائی۔ میں زمین پر گرا اور فوراً ہی اچھل کر کھڑا ہوا تھا کیونکہ اسمار پہلی ناکامی کے بعد دوسرا حملہ کرنے میں تاخیر نہیں کرتا۔ گرنے کے دوران میں وہ سنسناتی آوازیں نہیں سن سکا تھا مگر اسمار کی خوفناک غراہٹ سن لی تھی۔

میں نے پلٹ کر دیکھا تو وہ جہاں چٹان سے ٹکرایا تھا وہیں گر گیا تھا اور اس کی وجہ چٹان سے ٹکر نہیں تھی۔ اسمار کے جسم میں کم سے کم نصف درجن تیر اترے ہوئے تھے اور ان میں سے ایک اس کی کھوپڑی کے آر پار ہو گیا تھا۔ یہی اس کی فوری موت کی وجہ بنا تھا۔ ابھی میں حیران ہو رہا تھا کہ اتنے تیر کس نے چلائے ہیں کہ تیروں کی دوسری بوچھاڑ آئی اور اس بار نشانہ بچ جانے والے دو اسمار تھے۔ تیر کھا کر وہ غرائے اور افراتفری میں فرار کے لیے پیچھے ہٹے مگر ان میں سے ایک کی قضا آ گئی تھی۔ چند سیکنڈ کے وقفے سے تیر دوبارہ اور سب کے سب اس کے جسم میں اتر گئے۔ اتنے تیر کھا کر اس کی ہمت جواب دے گئی۔ ایک تیر نے اس کے گلے کی مرکزی شریان کاٹ دی تھی اور یہی اس کے لیے باعث مرگ ثابت ہوئی تھی۔ چوتھا اسمار فرار میں کامیاب رہا تھا مگر وہ بھی اتنا زخمی تھا کہ اس کا پلٹ کر آنا محال لگ رہا تھا۔ مشکل سے ایک منٹ پہلے اسمار حاوی تھے اور میں زندگی و موت کی سرحد پر تھا اور اچانک ہی بازی پلٹی۔ موت اسماروں کے حصے میں آئی اور زندگی نے مجھے چن لیا۔ میدان صاف ہوتے ہی درختوں کے پیچھے سے ربیک اور روبیر پانچ دوسرے افراد کے ساتھ نکلے تھے۔ ربیک آگے آیا اور گرم جوشی سے میرے سینے سے لگا۔

”آپ نے کمال کر دیا۔ میں نے آج تک کسی کو اس طرح سے اسمار کا مقابلہ کر کے اسے ختم کرتے نہیں دیکھا۔“

”کمال تو تم نے کیا ہے۔ بالکل موقع پر آ گئے۔“ میں نے کہا تو روبیر نے ترجمہ کیا۔ میں نے روبیر کی طرف دیکھا اور خفگی سے پوچھا۔

”تم ٹیلے سے کیوں اتری تھیں؟“

وہ خفیف ہو گئی۔ ”میں نے ان لوگوں کو آتے دیکھ لیا تھا اور جب اسمار ہٹے تو میں انہیں خبردار کرنے گئی تھی۔“

”تب تو تم نے ٹھیک کیا۔ میں حیران تھا کہ سپاہیوں اور اسماروں کی آوازیں سننے کے بعد بھی تم نے نیچے اترنے کی حماقت کیوں کی؟“

”اس نے بہترین کام کیا ورنہ ہم بے خبری میں اسماروں کے سامنے آ جاتے اور ہمارا بھی وہی انجام ہوتا جو آرگون کے سپاہیوں کا ہوا ہو گا۔“

میں چونکا۔ ”تم ان کے بارے میں جانتے ہو؟“

ربیک نے سر ہلایا۔ ”ہم نے انہیں پہلے ہی دیکھ لیا تھا اور ان کا تعاقب کررہے تھے۔“

”یہ کون ہیں؟“ میں نے ربیک کے پانچ ساتھیوں کی طرف دیکھا جو مکمل فوجی لباس میں تھے۔

”یہ میرے ساتھی ہیں۔“ اس نے کہا اور تعارف کرایا۔ ”یہ شاٹ ہے، یہ راٹون، یہ ایمار، یہ مارٹ اور یہ ایرٹ ہے۔“

یہ سارے نوجوان تھے۔ میں نے دیکھا تھا کہ یہاں مردوں کے نام میں ٹ بہت زیادہ آتا ہے اور بہت کم ایسے تھے جن کے نام میں ٹ نہیں آتا تھا۔ اس وجہ سے مردوں کے نام خود بہ خود کرخت ہوجاتے تھے جب کہ یہاں عورتوں کے ناموں میں نرمی اور نغمگی تھی۔ ان میں ر، ب اور س جیسے نرم حروف زیادہ آتے تھے۔ ربیک نے بتایا کہ وہ نوجوان تھے جنہیں میں نے خاص چنا تھا اور یہ سب مجھ سے متاثر تھے۔ ان کو بھی یقین تھا کہ میرے خلاف سازش ہوئی ہے۔ انہیں روبیر کے ساتھ کیے جانے والے سلوک پر بھی افسوس تھا۔ وہ اسے زندہ اور میرے ساتھ دیکھ کر حیران مگر خوش بھی ہوئے تھے۔ مجھے ان سے بہت کچھ پوچھنا تھا مگر ابھی اس کا وقت نہیں تھا۔ ہمیں فوری طور پر سپاہیوں اور اسماروں کی لاشوں کو ٹھکانے لگانا تھا۔ میں نے ان سے کہا۔ ”ابھی ہمیں کام کرنا ہے۔“

تاریکی قریب تھی اس لیے مشعلیں جلالی گئیں اور ان کی روشنی میں آرگون کے مارے جانے والی سپاہ کی وردیاں اور ہتھیار حاصل کیے گئے۔ کچھ کے لباس اسماروں کی دست درازی کی وجہ سے پھٹ گئے تھے مگر انہیں کام میں لایا جاسکتا تھا۔ ہم سپاہیوں کے لباس اتار رہے تھے اور یہاں کرتے پاجامے کے نیچے کچھ پہننے کا رواج نہیں تھا۔ اس لیے روبیر ٹیلے پر چلی گئی۔ مارے جانے والوں کی لاشیں ٹھکانے لگانا اصل مسئلہ ثابت ہوا تھا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ یہ ٹیلے کے آس پاس رہیں۔ ایک تو آرگون کی طرف سے پھر کسی اور پارٹی کی آمد متوقع تھی اور دوسرے جانوروں کو بھی پتا چل جاتا کہ یہاں انسان ہیں اور ہمارے لیے سکون سے رہنا مشکل ہوجاتا۔ اس لیے ہم نے لاشیں اٹھا کر کوئی نصف کلومیٹر دور ایک چھوٹے سے گڑھے تک پہنچائیں۔ اس کام میں ایک گھنٹا لگا تھا۔ تین افراد لاشیں ڈھو رہے تھے اور چار حفاظت کا فریضہ انجام دے رہے تھے۔ وزنی اسماروں کی لاشیں اتنی دور لے جانا ممکن نہیں تھا اس لیے انہیں کھینچ کر ٹیلے سے دور کردیا گیا اور ان کے جسموں میں اترے تیر نکال لیے تھے۔ اس کے بعد سپاہیوں کا اسلحہ اور وردیاں ڈھو کر اوپر ٹیلے پر پہنچائیں۔ سب سے آخر میں ہم ندی میں نہائے دھوئے کیونکہ لاشیں اٹھانے سے سب ہی خون خون ہورہے تھے۔

ربیک نے مجھے آگاہ کردیا تھا کہ اب وہ مستقل مدد کے لیے آئے ہیں۔ کم سے کم یہ پانچ افراد میرے ساتھ رہیں گے۔ ربیک کمک اور رسد کے لیے واپس جاتا۔ وہ کھانے پینے کا اور دوسرا سامان اچھا خاصا لائے تھے۔ روبیر کی مدد کے بغیر میں ان سے بات نہیں کرسکتا تھا۔ اس لیے جب تمام کاموں سے فارغ ہوکر ٹیلے پر گئے۔ مچھلی اور ربیک کے ساتھ آنے والی خوراک سے ڈنر کیا گیا۔ کھانے سے فارغ ہوکر میں نے میٹنگ بلالی اور سب سے پہلے میں نے قلعوں میں کی جانے والی جنگی تیاریوں کا احوال لیا۔ ربیک نے بتایا کہ میں نے جو پروگرام شروع کیے تھے وہ زور و شور سے جاری تھے اور رضا کاروں کی تربیت ہورہی تھی۔ انہوں نے اچھی خاصی تربیت مکمل کرلی تھی اور اب وہ فوج کے ساتھ جنگ کے لیے تیار تھے۔ میں نے آرگون کی تیاریوں کا حال دریافت کیا۔

”یہی بات ہے ہم اس بارے میں زیادہ نہیں جانتے۔“ ربیک نے جواب دیا۔ میں پہلے ہی دیکھ چکا تھا کہ ساہیرا کے آرگون میں جاسوس زیادہ اہل نہیں تھے یا پھر ان کو صحیح گائیڈ نہیں کیا جارہا تھا۔ ربیک کے پاس جتنی معلومات تھیں اس سے زیادہ تو میرے پاس تھیں جو میں نے ربان کے ساتھ زیادتی کی کوشش کرنے والے سپاہیوں سے حاصل کی تھی۔ میں نے ربیک کے ساتھ آنے والے نوجوان کا مقابلہ کیا۔ یہ سب مضبوط جسموں اور تومند نوجوان تھے۔ کسی کی عمر بائیس سے زیادہ نہیں تھی۔ ان کی تیر اندازی کی مہارت میں دیکھ چکا تھا جب انہوں نے حملہ آور اسمار کو بہت درستگی سے نشانہ بنایا اگر وہ شدید گھائل نہ ہوتا تو میرا بچنا محال تھا۔ وہ زخمی حالت میں بھی میرا خاتمہ کرسکتا تھا۔ ربیک نے بتایا کہ وہ نہ صرف تیر اندازی بلکہ لاٹھی سے اور سنگی چاقو کے ساتھ دست بدست لڑائی کے بھی ماہر تھے۔ ان میں سے دو رسی سے بندھا پتھر پھینک کر مارنے کے ماہر تھے۔

میں نے ربیک سے پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ ان لوگوں کے سامنے سرنگ کی طرف جانے اور خفیہ راستہ تلاش کرنے کا ذکر نہ کرے۔ روبیر نے سر ہلایا تھا کہ وہ ذکر نہیں کرے گی۔ میٹنگ کے بعد میں نے سب سے آرام کرنے کو کہا۔ نوجوان اپنے ساتھ ہر ضروری چیز لائے تھے جن میں ان

کے بستر بھی تھے۔ انہوں نے اپنے بستر بچھائے اور لیٹ گئے۔ ٹیلے پر اس کے لیے خاصی جگہ تھی۔ میں نے ربیک کو کیبن میں بلایا اور اس سے پوچھا کہ کیا ان نوجوانوں کی کمی محسوس نہیں ہوگی کیونکہ یہ باقاعدہ فوج میں شامل تھے۔ اس نے کہا۔ ''انہیں سامیرا نے خصوصی کام کے لیے قلعوں سے باہر بھیجا ہے۔ باقی سب اتنا ہی جانتے ہیں۔''

میں فکرمند ہوگیا۔ میرے دشمن جانتے تھے کہ سامیرا ابھی بھی میری مدد کر رہی ہے۔ اس لیے ان نوجوانوں کی روانگی ان کی نظروں سے پوشیدہ نہیں رہی ہوگی۔ میں نے پوچھا۔ ''تم لوگوں کا پیچھا تو نہیں کیا گیا؟''

''میں نے اس کا بہت خیال رکھا۔'' ربیک نے کہا۔ ''کیونکہ سامیرا نے مجھے خبردار کیا تھا کہ قلعوں میں موجود آرگون کے جاسوس ہمارا پیچھا کر سکتے ہیں۔ مگر کوئی پیچھے نہیں آیا۔''

''پیچھا کرنے والے چھپ کر کرتے ہیں۔'' میں نے کہا۔ ''لیکن دیکھا جائے گا۔ اب تمہارا کیا ارادہ ہے؟''

''میں صبح ہوتے ہی واپس جاؤں گا۔'' اس نے کہا۔

''کیا ایسا نہیں ہوسکتا کہ آرگون کی طرف سے کوئی جنگی کارروائی شروع ہوتے ہی مجھے علم ہوجائے۔''

''آپ کو علم لازمی ہوگا کیونکہ جنگ کے لیے قرنا بجایا جائے گا۔ آپ اس کی آواز پہلے بھی سن چکے ہیں۔''

''ٹھیک ہے اس صورت میں تم فوراً میرے پاس آؤ گے اور ہو سکے تو مزید اعتماد کے سپاہی لے آنا۔''

وہ ہچکچایا اور پھر پوچھا۔ ''کیا آپ کا کچھ کرنے کا ارادہ ہے۔''

''بالکل، یہ جنگ میری بھی ہے۔ قطع نظر اس کے کہ میرے ساتھ کیا ہوا ہے۔ میں اب بھی سامیرا اور تم لوگوں کے ساتھ ہوں۔''

وہ پُرجوش ہوگیا۔ ''تب یہ جنگ ہم جیتیں گے۔ برف والے نے کہا آپ جس کے ساتھ ہوں گے جنگ وہی جیتے گا۔''

میں حیران ہوا کیونکہ یہ بات سامیرا تک محدود تھی۔ لیکن اب ایسا لگ رہا تھا کہ اس نے کسی مقصد کے تحت سب میں پھیلا دی تھی۔ ربیک نے تصدیق کی کہ نامعلوم ذریعے سے یہ خبر تینوں قلعوں کے عام افراد تک پہنچ رہی تھی۔ عام فرد کی برف والے کے ساتھ عقیدت غیر متزلزل ہے اس لیے لازمی دوسروں پر اس کا اثر پڑا تھا۔ رات کا دوسرا پہر تھا جب ہم سونے کے لیے لیٹے اور کیونکہ سب کا ہی تھکن سے برا حال تھا اس لیے سب ہی سو گئے۔ یہ غلطی تھی ہم میں سے ایک کا جاگتے رہنا ضروری تھا ورنہ اگر یہ جگہ دشمن کی نظر میں ہوتی تو ہم رات بڑی آسانی سے مارے جاتے یا اس کے قبضے میں آجاتے۔ میں صبح اٹھا تب بھی سب سو رہے تھے اور مجھے اپنی غلطی کا احساس ہوا کہ کسی کو پہرے پر لگانا چاہیے تھا۔ مجھے بیدار پا کر روبیر اندر سے نکل آئی۔ وہ بھی جاگ گئی تھی۔ اس کی حالت پہلے کے مقابلے میں بہت بہتر ہوگئی تھی۔ اس کے ہاتھ پیروں کی خراشیں مدھم پڑ گئی تھیں اور چہرے کی اصل رنگت بحال ہوگئی تھی۔ اس نے آہستہ سے کہا۔

''آپ نے ان لوگوں کو سرنگ والے راستے کا کیوں نہیں بتایا؟ کیا ان لوگوں پر شک ہے؟''

''بتاؤں گا لیکن ابھی نہیں۔'' میں نے کہا۔ ''مجھے شک نہیں ہے اور نہ میں بلاوجہ شک کرنے کا عادی ہوں۔ لیکن بعض اوقات احتیاط بہتر ہوتی ہے۔''

''آپ ٹھیک کہتے ہیں۔'' اس نے سر ہلایا۔ ''یہ لوگ برتن بھی لائے ہیں میں کھانا بنا لیتی ہوں۔''

وہ راشن کے ساتھ سبزیاں اور دوسری چیزیں بھی لائے تھے۔ روشنی ہونے سے پہلے ہی اس نے ناشتے کی تیاری شروع کر دی۔ کچھ دیر میں ربیک جاگ گیا تھا۔ اسے جلدی روانہ ہونا تھا اس لیے وہ جلد اٹھ گیا۔ اس کے ساتھی لمبی تان کر سو رہے تھے۔ میں نے اسے اور اس کے ساتھیوں کو پرسوں والے سفر اور اس سے حاصل ہونے والی معلومات اور چیزوں کے بارے میں نہیں بتایا تھا مگر میں خود آرگون کے سپاہی کی وردی میں تھا۔ اس نے دیکھ لیا تھا اور ناشتے کے دوران اس نے وردی کے بارے میں پوچھا۔ ''یہ کہاں سے ہاتھ لگی؟''

''ان سپاہیوں سے جن کی تلاش میں کل والا دستہ آیا تھا۔'' میں نے جواب دیا۔ ''میں اور روبیر جنگل میں ذرا آگے گئے تھے کہ وہ سامنے آگئے اور ان سے مقابلہ کرنا پڑا۔''

''شہباز نے تینوں کو ٹھکانے لگا دیا۔'' روبیر نے یوں فخر سے کہا جیسے خود اس نے یہ کارنامہ انجام دیا ہو۔ ''وہ بھی صرف نیزے کی مدد سے۔''

ربیک نے حیرت سے کہا۔ ''تین سپاہیوں کو نیزے کی مدد سے۔''

''نہیں اس میں سے ایک کو روبیر نے تیر سے نشانہ بنایا تھا۔'' میں نے سچ بیانی سے کام لیا۔ ''باقی دو سے مقابلہ کیا تھا۔''

''آرگون کے سپاہی بہت تربیت یافتہ ہوتے ہیں۔''

''وہ تربیت یافتہ ہوں گے۔'' میں نے تردید کی۔

مگر اب وہ ایک ظالم شخص کی سپاہ کا حصہ ہیں اور ان کی توجہ جنگ اور تربیت سے زیادہ ذاتی مفادات پر ہے۔

میں نے ریبک کو بتایا کہ سپاہیوں سے اصل میں کیسے سامنا ہوا تھا جب وہ ایک مجبور عورت کو اپنی ہوس کا نشانہ بنانے کے لیے جنگل میں لائے تھے۔ روبیر بولی۔ ''آرگون کی عوام ان لوگوں کے مظالم سہہ رہی ہے اور اگر ہم نے ریناٹ کی فوجوں کا حملہ روک کر انہیں یہاں الجھا دیا تو عقب میں بغاوت ہو جائے گی۔''

''ایسا ہی گا مگر یہ اتنا آسان نہیں ہے اور اس کے لیے ہمیں منظم ہو کر کام کرنا پڑے گا۔'' میں نے کہا اور ریبک کی طرف دیکھا۔ ''تم اتنے ہی آدمی اور لانے کی کوشش کرو مگر وہ مکمل اعتماد کے ہوں۔''

اس نے سر ہلایا۔ ''میں پوری کوشش کروں گا۔''

''سامیرا کو میرا پیغام دینا کہ وہ اپنے آدمیوں کو پوری طرح متحرک کرے اور ان کا حوصلہ بڑھائے۔ ریناٹ کی فوج جلد حرکت میں آنے والی ہے۔''

ریبک ناشتا کر کے روانہ ہوا تو میں اور اس کے ساتھی جواب میرے ساتھی تھے اسے چھوڑنے جنگل کی حد تک گئے تھے۔ اس سے آگے جانوروں کا خطرہ نہیں تھا۔ اسے چھوڑ کر واپس آئے تو باقیوں نے ناشتا کیا اور اس کے بعد ہم نیچے آئے۔ وہ اپنے ساتھ بڑے سائز کے مشکیزے لائے تھے جن کو پشت پر لادا جا سکتا تھا اور ایک مشکیزے میں آرام سے بیس بائیس لیٹر پانی آتا تھا اس سے پانی اوپر پہنچانے اور ذخیرہ کرنے میں بہت آسانی ہوئی تھی۔ ہم نے گزشتہ روز حاصل کی ہوئی وردیاں اور ہتھیار صاف اور مرمت کیے۔ ان پر لگا خون کل ہی صاف کر لیا تھا۔ وہ سامان میں سلائی کے لیے سوئی اور دھاگا بھی لائے تھے۔ یہ سوئی باریک ہڈیوں سے بناتے تھے اور دھاگا اسی ریشے سے جس سے یہ لباس بناتے تھے۔ اس کام سے فارغ ہو کر ہم نے تیروں کی مدد سے مچھلیاں شکار کیں اور اس طرح خاصی مچھلیاں مختصر وقت میں ہاتھ لگی تھیں۔ آگے ندی میں دو افراد موجود تھے اور جو مچھلی تیر کھا کر تیرتی ہوئی ان تک جاتی وہ اسے پکڑ لیتے تھے۔ ان سب کاموں سے فارغ ہو کر ہم نہائے اور پھر واپس ٹیلے پر آ گئے۔

دوپہر کے وقت ہم نیچے اترے اور لڑائی کی مشق کی۔ وہ سب ماہر تیر انداز تھے۔ نیزے اور دوسری طرح کی لڑائیوں کے بھی ماہر تھے۔ میں انہیں کچھ داؤ پیچ سکھانے لگا جس سے کسی بھی سخت جان حریف کو تیزی سے موت کے گھاٹ اتارا جا سکتا تھا یا اسے قابو کیا جا سکتا تھا۔ جسمانی طور پر وہ سب بہت چوکس اور مضبوط تھے صرف مہارت کی کمی تھی اور وہ میں نے پوری کرنے کی کوشش کی۔ میں انہیں ایسے چاق و چوبند دستے میں بدل دینا چاہتا تھا جو مل کر کسی مشن کی تکمیل کرے۔ میں ان کو ایسی لڑائی کی مشین میں ڈھالنا چاہتا جس میں ہر فرد اپنے حصے کا کام کسی مشین کے پرزے کی سی تیزی اور مہارت سے کرے۔ آرگون میں گھس کر کارروائی کرنا چند لوگوں کے بس کی بات نہیں تھی سوائے اس کے کہ ہم بہت زیادہ تیاری اور طے شدہ منصوبے کے ساتھ اندر داخل ہوں۔ دوپہر سے شام تک ہم اسی کام میں لگے رہے۔ روبیر اوپر ٹیلے پر پاؤں لٹکائے بیٹھی ہماری مشقیں دیکھ رہی تھی۔ کبھی کسی کی کارکردگی سے خوش ہوتی تو تالیاں بجاتی تھی اور شاباشی کا مستحق خوش ہو جاتا۔

وہ پیشہ ور سپاہی تھے مگر روبیر کے سامنے مشق میں بھی بہت جان مار رہے تھے۔ ایسا نہیں تھا کہ وہ روبیر سے متاثر تھے یا اس کے چکر میں پڑ گئے تھے۔ مگر آس پاس کوئی عورت ہو تو مرد اس کی توجہ سے خوش ہوتا ہی ہے۔ عورت کے ہونے سے ماحول ہی بدل جاتا ہے۔ چاہے وہ کسی بھی روپ اور رشتے میں ہو۔ شام کے قریب روبیر نے ہم سے اوپر آنے کو کہا تو ہم نے حکم کی تعمیل کی اور اس سے پہلے ندی پر جا کر خود کو مٹی اور پسینے سے آزاد کیا تھا۔ روبیر نے تواضع کے لیے مقامی چائے اور میٹھی ٹکیاں تیار کیں۔ اس دوران میں اس نے مچھلیوں کی صفائی کر کے ان کے قتلے بنا لیے تھے۔ صبح اس نے دلیہ نما چیز بنائی تھی۔ دوپہر میں کسی نے کچھ نہیں کھایا تھا۔ اس لیے اب سب ہی بھوک سے بے تاب تھے۔ سورج ڈوبتے ہی چولہا جلا لیا گیا اور ڈنر تیار ہونے لگا تھا۔ دلیہ خاصی مقدار میں تھا اور مچھلی کے قتلے بھونے جاتے۔ ان لوگوں کے پاس معدنی نمک نہیں تھا مگر یہ کچھ پودوں سے نمک حاصل کرتے تھے اور یہ قلیل مقدار میں ہوتا تھا اس لیے بہت کم ہی کسی کو ملتا تھا۔ شاٹ کے پاس اس نمک کی کچھ مقدار تھی جب اسے مچھلی کے قتلوں پر چھڑکا تو ان کا ذائقہ ہی کچھ اور ہو گیا تھا۔ مجھے یہاں آنے کے بعد پہلی بار نمک کا ذائقہ ملا تھا۔ ورنہ ان کے کھانے پھیکے یا میٹھے ہوتے ہیں۔ نمکین کھانوں کا یہاں رواج نہیں تھا۔

سپاہی ہونے کے ناطے وہ پانچوں وقت کے پابند تھے اور ڈنر کے کچھ دیر بعد ہی وہ سونے کے لیے لیٹ گئے۔ قلعے میں وہ صبح بلکہ رات کے آخری پہر اٹھ جاتے تھے۔ یہاں انہیں آرام کرنے کو زیادہ مل رہا تھا۔ وہ اسلے

بھی انجوائے کر رہے تھے۔ مگر اگلی صبح میں نے انہیں جلدی اٹھا دیا۔ میرے ذہن میں کچھ تجاویز تھیں اور میں چاہتا تھا کہ وہ ان پر عمل کریں اس طرح وہ مصروف بھی رہتے۔ وہ کھلی جگہ سوتے تھے۔ میں نے پتوں، شاخوں اور بیلوں سے چھپر بنانے کا کہا۔ یہاں جگہ جگہ ایسی گھاس تھی جو خشک ہونے کے بعد کسی بچھونے کی طرح نرم پڑ جاتی تھی۔ یہاں گدے اسی گھاس کو کپڑے میں بھر کر بنائے جاتے ہیں۔ وہ اس سارے دن اسی کام میں لگے رہے۔ اب ان کے لیے مناسب جگہ بن گئی تھی اگر رات کو بارش ہو جاتی تب بھی وہ آرام سے سوتے۔

مجھے ٹیلے کا دفاعی نظام بہتر بنانا تھا۔ یہ لوگ اپنے ساتھ بڑی تعداد میں رسیاں اور کچھ اوزار لائے تھے۔ میں نے رسیوں کی مدد سے ٹیلے سے آس پاس چند منتخب بلند درختوں تک آمد و رفت کا راستہ بنایا۔ بہ وقت ضرورت ہم ان رسیوں کی مدد سے بھی ٹیلے سے نکل سکتے تھے اور ہمیں نیچے اترنے کی ضرورت پیش نہیں آتی۔ رسیوں کو یوں لگایا گیا تھا کہ یہ ایک لیول پر تھی اور نیچے سے آسانی سے نظر نہیں آتیں۔ زمین سے رسیوں کی اونچائی کوئی پچاس فٹ تھی اس لیے دن میں بھی کوئی غور سے دیکھتا تب ہی یہ نظر آتیں۔ ٹیلے پر آنے جانے کے لیے لکڑی کی نصب سیڑھی تو تھی مگر میں نے دو عدد لکڑی اور رسی سے بنی سیڑھیاں اور بنوائیں اور انہیں اوپر اس طرح لگوا دیا کہ بہ وقت ضرورت ان کو صرف نیچے پھینکنا ہوتا۔ وہ دن ان ہی کاموں میں گزر گئے تھے۔ مگر اب ہم کہیں بہتر دفاعی پوزیشن میں تھے۔

کام کے ساتھ ساتھ میں ان لوگوں کو مشقیں بھی کرا رہا تھا اور درحقیقت میں خود کو تیار کر رہا تھا کیونکہ کچھ عرصے سے صرف بھاگ دوڑ ہو رہی تھی اور میری جسمانی حالت مثالی نہیں رہی تھی۔ میں اسے بہتر کرنا چاہ رہا تھا تاکہ آخری معرکے کے وقت میں پوری طرح فٹ رہوں۔ اس لیے جان بوجھ کر سب سے مشکل کام اپنے سر لیتا تھا۔ اس طرح دوران مشق میں بیک وقت کئی افراد سے لڑنے کی مشق کرتا تھا۔ میں گوشت خور قوم کا فرد ہوں اور گوشت کی کمی ہمیں جسمانی طور پر تو کمزور کرتی ہے ساتھ ہی ذہنی صحت پر بھی اثر ڈالتی ہے۔ اس اثر سے ہماری گھریلو خواتین اچھی طرح واقف ہیں کہ اگر وہ شوہر کو دو تین دن دال سبزی کھلا دیں تو اس کی حالت کیا ہوتی ہے؟ یہاں آنے کے بعد میرا گزارا بھی ایسی ہی چیزوں پر تھا۔ مگر اب مچھلی کی صورت میں مجھے گوشت مل رہا تھا اور یہ بہت اعلیٰ درجے کا پروٹین تھا۔ اس نے چند ہی دنوں میں میری صحت کو خاصا بہتر کر دیا تھا اور رہی سہی کسر ورزش اور مشقوں سے پوری ہو رہی تھی۔

روبیر مشقوں میں کسی حد تک شامل ہوتی تھی جیسے تیر اندازی یا نیزے سے لڑائی کی مشق میں۔ لیکن اس کا زیادہ وقت ہمارے لیے کھانے اور دوسرے انتظامات میں گزرتا تھا۔ جب کرنے کے لیے کچھ نہ ہوتا تو وہ سوئی دھاگا لے کر آرگون کے سپاہیوں کی پھٹ جانے والی وردیاں درست کرتی۔ رفتہ رفتہ اس نے ساری وردیاں بالکل درست حالت میں کر دیں۔ اب ہمارے پاس وردیوں کے آٹھ سیٹ تھے اور سپاہیوں کے زرہ بکتر سمیت کل چھ سیٹ تھے۔ ہتھیار اس سے زیادہ تعداد میں تھے۔ مگر میرے خیال میں ہمیں مزید وردیوں اور آرگون کے ہتھیاروں کی ضرورت تھی۔ میں سوچ رہا تھا کہ اب میرے پاس افرادی قوت تھی۔ کیا میں ان کی مدد سے آرگون کی فوج پر چھاپہ مار کارروائی نہیں کر سکتا تھا۔ ہم اچانک حملہ کر کے آرگون کے سپاہیوں کو ٹھکانے لگا کر ان کی وردیاں اور ہتھیار حاصل کر سکتے تھے۔ مگر فی الحال یہ خیال میں نے خود تک محدود رکھا تھا اور روبیر سے بھی اس کا ذکر نہیں کیا تھا۔ مجھے ربیک کا بھی انتظار تھا۔ وہ تیسرے دن آیا۔ وہ میرے لیے سامیرا کا پیغام اور کچھ سامان لایا تھا۔ سامان اس نے سب کے سامنے دیا مگر پیغام اکیلے میں دیا تھا۔

"سامیرا نے برف والے کا پیغام بھیجا ہے۔"

"کیسا پیغام؟"

"برف والے نے کہا کہ شہباز عجلت سے کام نہ لے اور اس کے ذہن میں جو خیال آیا ہے اس پر عمل کرے۔"

میں چونکا۔ برف والے نے ایک بار پھر میرا ذہن قبل از وقت پڑھا تھا۔ یقیناً اس کا اشارہ چھاپہ مار کارروائیوں کی طرف تھا۔ میں نے سر ہلایا۔ "ٹھیک ہے اور میں نے تم سے جو کہا تھا کہ مجھے مزید آدمیوں کی ضرورت ہے؟"

اس نے جواب دیا۔ "میں کوشش کر رہا ہوں۔ تین لڑکے اور ملے ہیں اور میری کوشش ہے کہ ایک دو دن میں اتنے ہی اور مل جائیں تو ان کو لے کر ایک ساتھ آؤں۔"

"قلعے میں تیاریوں کا کیا احوال ہے؟"

"بدستور جاری ہے۔ سامیرا نے تربیتی پروگرام کی خود نگرانی شروع کر دی اور مزید دو سو افراد کو تربیت میں شامل کیا ہے۔ بالکل اسی طرح جیسے آپ نے چنا تھا۔"

مجھے اطمینان ہوا کہ کم سے کم دفاع کے معاملے میں وہ لوگ کوئی کوتاہی نہیں کر رہے تھے۔ جو کام میں نے شروع

کیے تھے میں سامیرا کو باقاعدگی سے ان کی رپورٹ کرتا رہا تھا اور اسے ایک ایک چیز بتاتا تھا۔ اس لیے اب وہ میرے بنائے پروگرام کو اسی طرح کامیابی سے چلا رہی تھی جیسے میں چلا رہا تھا۔ دیکھا جائے تو دشمنوں کی سازش اس لحاظ سے ناکام رہی تھی کہ وہ مجھے سامیرا سے جدا کرنے میں ناکام رہے تھے اور قلعوں کا دفاع مضبوط ہو رہا تھا۔ دوسری طرف مجھے عموی ذمے داریوں سے نجات مل گئی تھی اور میں اب وہ کر رہا تھا جس کے لیے برف والے نے مجھے یہاں بھیجا تھا۔ ربیک زیادہ دیر نہیں رکا تھا۔ وہ چند گھنٹوں بعد چلا گیا تھا۔ دوپہر کا وقت تھا اور ابھی شام ہونے میں کئی گھنٹے باقی تھے۔ وہ روشنی میں ہی واپس قلعوں تک پہنچ جاتا۔

جس وقت میں ٹیلے اور اس پر رہنے والے انسانوں کے دفاع کو مضبوط بنانے کا سوچ رہا تھا تو جانوروں سے نمٹنے کے لیے میرے ذہن میں ایک ترکیب آئی تھی۔ اس ترکیب کو مدنظر رکھتے ہوئے میں نے اپنے آدمیوں کے ہمراہ جنگل سے بڑی مقدار میں دوشاخہ ہونے والی بڑی لکڑیاں تلاش کی تھیں اور پھر انہیں خشک ہونے کے لیے ٹیلے پر پھیلا دیا تھا۔ ان میں سے بہت سی پہلے ہی خشک تھیں۔ ان کے دو اور سہ شاخوں پر خشک گھاس کے پولے باندھے گئے تھے۔ ربیک کے جانے کے بعد میں نے سب کو تیاری کا حکم دیا۔ روبیر کو بھی۔ وہ سب تیار ہونے لگے اور کچھ ہی دیر میں تقریباً سب آرگون کی سپاہ کے حلیے میں آچکے تھے۔ حد یہ کہ روبیر نے سرخ لباس پہنا ہوا تھا حالانکہ آرگون کی فوج میں عورتیں نہیں ہوتی ہیں۔ سب نے ہتھیار لیے اور پھر سب نے وہ عدد دو شاخہ لکڑیاں اٹھائیں۔ روانگی سے پہلے میں نے انہیں بریف کیا۔

''ساتھیوں آج ہمارا پہلا امتحان ہے۔ ہمیں آرگون کے سپاہیوں کے کسی گشتی دستے پر یوں چھپ کر حملہ کرنا ہے کہ انہیں بھاگنے یا جوابی حملہ کرنے کا موقع نہ ملے۔ کم سے کم فرار سے لازمی روکنا ہے۔ تاکہ آرگون والے ہماری موجودگی سے واقف نہ ہوسکیں۔ ہمیں بہت احتیاط سے کام لینا ہوگا۔ جب تک میں حکم نہ دوں حملہ نہیں کرنا ہوگا اور نہ ہی دشمن کو متوجہ کرنے والا اور کوئی کام کرنا ہوگا۔ اپنی حفاظت اور رازداری سب سے اہم ہوگی۔ میری بات سمجھ آگئی ہے ورنہ تم لوگ سوال کرسکتے ہو۔''

روبیر میری تقریر کا ترجمہ کر رہی تھی اور اسی کے توسط سے ان سب نے سوالات کیے۔ میں جواب دیتے ہوئے ان کی حوصلہ افزائی کر رہا تھا کہ وہ ہر بات پوچھیں تاکہ صاف ذہن کے ساتھ یہاں سے روانہ ہوں۔ آگے چل کر ان سے کوئی غلطی نہ ہو۔ جب وہ مطمئن ہو گئے تو ہم ٹیلے سے نیچے آئے۔ لکڑی کی سیڑھی کو ممکنہ حد تک بیلوں سے چھپا دیا تھا۔ روانگی سے پہلے میں نے کچھ ایسی نشانیاں لگائیں۔ اگر کوئی یہاں آتا اور ٹیلے پر جاتا تو مجھے علم ہو جاتا۔ ہمارا رخ میدان کے ساتھ ساتھ پھیلے جنگل میں آرگون کی طرف تھا۔ ایک گھنٹے بعد ہم آرگون کے کھیتوں اور باغات تک پہنچ گئے تھے۔ درمیان میں صرف گھاس کا کوئی تین چار سو گز چوڑا میدان تھا۔ اس میدان کو باقاعدہ جھاڑیوں اور درختوں سے صاف رکھا جاتا تھا تاکہ جنگل اور کھیتوں کے درمیان حد فاصل رہے اور اگر کوئی جانور جنگل سے نکل کر آئے تو دور سے نظر آجائے۔ ان جانوروں سے نمٹنے کے لیے یہاں آرگون کی سپاہ کے دستوں کی موجودگی لازمی تھی۔

ہم ایک جگہ رکے۔ روبیر نے پوچھا۔ ''اب کیا کرنا ہے؟''

''انتظار۔'' میں نے کہا۔ ''ہم کھیتوں و باغات کی طرف جائیں گے تو بہت سی نظروں میں آسکتے ہیں۔ یہاں یقیناً نگرانی کی جارہی ہوگی۔ خاص طور سے گیارہ سپاہیوں کی گم شدگی کے بعد سے وہ لوگ بہت چوکنا ہوں گے۔ ایسے میں ہمارا اس طرف جانا مناسب نہیں ہوگا۔ ہمیں کسی دستے کے باہر آنے کا انتظار کرنا چاہیے۔''

''اگر اس طرف سے کوئی نکلا تو؟''

''تب ہم انہیں متوجہ کر کے اس طرف بلائیں گے۔''

روبیر مسکرانے لگی۔ ''اور جب وہ یہاں آئیں گے تو ان کا خاتمہ کر دیا جائے گا۔''

میں نے حکمتِ عملی مزید واضح کی۔ ''بالکل مگر کوشش کرنی چاہیے کہ ان میں سے کوئی زندہ بھی ہاتھ آئے۔ اس سے ہمیں آرگون کے اندر کی صورتِ حال کا علم ہوسکتا ہے۔''

روبیر سوچ رہی تھی۔ ''اگر سپاہی آئے تو انہیں کیسے یہاں متوجہ کیا جائے گا۔''

''ہم نے آرگون کے سپاہیوں کی وردی پہنی ہوئی ہے۔ وہ ہمیں اپنا آدمی سمجھیں گے۔''

ابھی ہم گفتگو کر رہے تھے کہ آٹھ یا نو سپاہیوں پر مشتمل ایک دستہ باغ سے برآمد ہوا۔ وہ آپس میں ہنسی مذاق کر رہے تھے اور ان کا انداز انجوائے منٹ والا تھا۔ شاید ان کی ڈیوٹی ختم ہوگئی تھی اور وہ اس وقت تھکن اتار رہے تھے۔ وہ باہر نکل کر گھاس پر دراز ہو گئے۔ ان کے پاس ہتھیار تھے جو انہوں نے جسموں سے اتار کر پاس رکھ لیے۔ ان میں سے اکثر لیٹ گئے تھے اور کچھ بیٹھے ہوئے تھے۔ وہ اپنے

پینے کا سامان ساتھ لائے تھے مگر یہ کہنا مشکل تھا کہ وہ جو پی رہے تھے وہ سادہ پانی تھا، کوئی قوت بخش مشروب یا مقامی شراب تھی۔ ہم انہیں دیکھ رہے تھے۔ ایمار اور ایرٹ میرے پاس تھے۔ میں نے محسوس کیا تھا کہ یہ دونوں نوجوان ذہن کا استعمال کرتے تھے اس لیے میں ان سے بات کرتا تھا اور ان سے مشورہ لیتا تھا۔ اس وقت بھی میں نے پوچھا۔ ''کیا خیال ہے انہیں کیسے قابو کیا جاسکتا ہے؟''

''انہیں متوجہ کر کے یہاں بلا کر۔'' ایمار نے کہا۔

''میرا خیال ہے ہم سب درختوں پر چڑھ جاتے ہیں۔'' ایرٹ نے اپنے ساتھیوں کی طرف اشارہ کیا۔ ''جب وہ یہاں آئیں تو انہیں تیروں سے نشانہ بنائیں۔''

''لیکن اس میں خطرہ ہے۔'' روبیر نے کہا۔ حسب معمول گفتگو اسی کے توسط سے ہو رہی تھی۔ ''ہوسکتا ہے وہ سب نہ آئیں اور ہوسکتا ہے کہ جس وقت ہم انہیں نشانہ بنا رہے ہوں۔ اندر سے مزید سپاہی نکل آئیں۔ اس صورت میں ہم خطرے میں پڑجائیں۔''

میں نے روبیر کی تائید کی۔ ''خطرے کا سامنا نہیں کرنا ہے کیونکہ یہ کام ہم مشق کے طور پر کر رہے ہیں۔''

''تب تم کیا کہتی ہو؟'' ایرٹ نے کسی قدر طنزیہ انداز میں پوچھا۔

روبیر نے میری طرف دیکھا۔ ''زبان والے واقعے سے اندازہ ہوگیا ہے کہ آرگون کے سپاہی آج کل بے قابو ہو رہے ہیں۔ اگر انہیں کوئی عورت نظر آئے تو کیا یہ اس کی طرف نہیں آئیں گے۔''

روبیر کی تجویز نے مجھے متاثر کیا۔ ''وہ بالکل آسکتے ہیں۔''

''اب ہم درختوں کے ذرا اندر ان کے لیے جال بچھاتے ہیں۔ ایرٹ کی تجویز کے مطابق یہ سب درختوں پر ہوں گے۔ میں اور آپ نیچے ہوں گے۔ ہم ہی انہیں متوجہ کریں گے۔''

''وہ کیسے؟'' ایمار نے پوچھا۔

روبیر کا چہرہ سرخ ہوا تھا۔ ''میں مظلوم لڑکی بنوں گی۔ میں درختوں سے یوں نکلوں گی جیسے آپ سے بچ کر بھاگ رہی ہوں اور آپ پیچھے سے آکر مجھے پکڑ لیں گے۔ اس دوران میں میں چیخ چلا کر ان کو متوجہ کرلوں گی اور پھر آپ مجھے زبردستی درختوں میں لے جائیں گے۔ وہ دیکھ لیں گے کہ ان کا ہی ایک ساتھی ہے تو وہ لازمی یہاں آئیں گے۔''

روبیر کا پلان اچھا تھا۔ سادہ اور مؤثر۔ اگر اس پر اچھے طریقے سے عمل کیا جاتا تو یقیناً یہ کامیاب ہو سکتا تھا۔ میں نے سر ہلایا۔ ''ٹھیک ہے لیکن پہلے ہمیں جنگل کے اندر کوئی ایسی جگہ دیکھنی ہوگی جہاں ان کو اس طرح گھیرا جائے کہ کوئی بچ کر نہ نکلنے پائے۔''

ہم پیچھے درختوں میں آئے۔ تقریباً پچاس گز اندر ہمیں ایک کسی قدر کھلی جگہ ملی جس کے چاروں طرف گھنی شاخوں اور پتوں والے درخت تھے اور گھات لگانے کے لیے یہ جگہ نہایت موزوں تھی۔ وہ پانچوں درخت پر چڑھنا چاہ رہے تھے مگر میں نے ایرٹ کو روک لیا۔ ''تم میرے ساتھ رہوگے۔ یہ بتاؤ کہ اگر ان لوگوں کو بتانا ہو کہ آرگون والے اس طرف آرہے ہیں تو کیسے اشارہ دیا جاسکتا ہے؟''

''میں ایک پرندے کی آواز نکال سکتا ہوں جو یہاں پایا جاتا ہے۔'' ایرٹ نے کہا اور آواز نکال کر دکھائی۔ آواز میں مصنوعی پن نہیں تھا۔ میں نے اسے اوکے کردیا۔

''ٹھیک جب تم ایک بار آواز نکالو گے تو مطلب ہو گا کہ دشمن ہماری چال میں آگیا ہے۔ دوبارہ آواز نکالو گے تو اس کا مطلب ہوگا دشمن اس طرف آرہا ہے اور تین بار آواز نکالنے کا مطلب ہوگا دشمن بالکل نزدیک آگیا ہے سب تیار رہیں۔''

روبیر نے سب کو بتایا تو وہ سمجھ گئے۔ مزید تسلی کے لیے کچھ سوال جواب کے بعد میں نے کہا۔ ''حملے کا اشارہ میں کروں گا اور جب میں چلا کر کہوں ٹوٹ پڑو تو حملہ کرنا ہے۔''

روبیر نے ان کو بتایا تو سب نے جلدی سے ''ٹوٹ پڑو'' کی گردان کی اور اسے ذہن نشین کرلیا۔ شاٹ، ایمار، رائٹون اور مارٹ میرے منتخب کیے درختوں پر چڑھ گئے۔ اس کے بعد ہم واپس آئے اور میں نے دو درخت اور منتخب کیے۔ یہ کھلے میدان سے ذرا ہی اندر تھے۔ ایرٹ اور روبیر نے ان پر اپنا سامان چڑھا دیا۔ اب بہ وقت ضرورت صرف ان کو اوپر چڑھنا پڑتا۔ جب سب ہوگیا تو میرا دھیان اصل مسئلے کی طرف گیا۔ روبیر نے بھی جنگلی وردی پہن رکھی تھی۔ وردی میں موجود کرتہ نہ تو زیادہ کھلا تھا اور نہ ہی یہ طویل تھا۔ یہ بمشکل گھٹنوں تک آتا تھا۔ اگر روبیر اسی وردی میں آرگون کے سپاہیوں کے سامنے جاتی تو انہیں شک ہو جاتا کہ دال میں کچھ کالا ہے۔ ہم اور کوئی لباس ساتھ نہیں لائے تھے۔ اس وقت اس کی ضرورت ہی محسوس نہیں ہوئی تھی مگر اب میں سوچ رہا تھا کہ ہمیں ایک سادہ لباس لانا چاہیے تھا تاکہ روبیر عام عورت ہونے کا تاثر دے سکتی۔ وہ وردی میں ہوتی تو آرگون والے ویسے ہی چوکنا ہو جاتے

اور پھر مشکل سے ہی ہمارے جال میں آتے۔ میں نے روبیر سے کہا۔

''یہ تو مسئلہ ہو گیا تمہارے لباس سے سارا تاثر ہی بدل جائے گا۔''

وہ بھی پریشان ہو گئی۔ ''یہ تو ہے۔''

''تب ہمیں پلان بدلنا ہو گا یا ترک کرنا ہو گا۔''

روبیر سوچ میں پڑ گئی پھر اس نے کہا۔ ''نہیں پلان تبدیل نہیں ہو گا۔''

''وہ کیسے؟'' میں نے پوچھا تو اس نے اریٹ کی طرف دیکھا۔

''تم درخت پر جاؤ۔''

اریٹ جانتا تھا کہ روبیر کا درجہ میرے بعد آتا تھا اور اس کا حکم ماننا بھی لازمی تھا اس لیے وہ خاموشی سے درخت پر چڑھ گیا۔ روبیر میرے ساتھ آگے آئی اور اس نے نظریں جھکاتے ہوئے کہا۔ ''میں لباس اتار دوں گی۔''

میں دنگ رہ گیا پھر میں نے ہڑبڑا کر کہا۔ ''کیا مطلب لباس اتار دو گی؟''

''میں یہ وردی اتار دوں گی۔'' اس نے وضاحت کی۔ ''پھر ان لوگوں کو شک نہیں ہو گا اور وہ اسے بالکل سچ سمجھیں گے۔''

میں اس کی بات سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ ''تب تم کیا پہنو گی یہاں کوئی اور لباس نہیں ہے۔''

اس کا سرخ چہرہ مزید سرخ ہو گیا۔ ''کچھ...... بھی نہیں۔''

میرا چہرہ بھی سرخ ہوا تھا مگر غصے سے۔ ''میں ایسا نہیں کر سکتا۔ میں نے آج تک اپنے مقصد کے لیے کسی عورت کو یوں استعمال نہیں کیا ہے۔ میرے نزدیک یہ اس کی توہین ہے۔''

''مجھے...... بس آپ ہی دیکھیں گے۔'' اس نے اٹک کر کہا۔ ''آرگون والے بہت دور ہیں۔''

''میرے سامنے بھی تم ایسا نہیں کرو گی میں کوئی الگ سے نہیں ہوں۔''

''میں آپ کو جانتی ہوں۔ میں خود یہ کام کرنے کے لیے تیار ہوں۔ آپ ہی نے تو کہا تھا کہ آدمی کو بزدلوں کی طرح خودکشی کرنے کی بجائے بہادروں کی طرح لڑ کر جان دینی چاہیے۔ تو اب میں ان لوگوں سے لڑنے کو تیار ہوں جنہوں نے شامین کو قید کیا ہوا ہے اور جو پوری وادی کو قید خانہ بنانا چاہتے ہیں۔''

''ٹھیک ہے مگر میں تمہیں یوں استعمال نہیں کر سکتا۔''

اس نے میرے ہاتھ تھام لیے۔ ''شہباز یہ میری التجا ہے۔ انسان جان اور مال کے ساتھ عزت بھی تو قربان کرتا ہے اگر مقصد بڑا ہو تو جو ہم کر رہے ہیں اس سے بڑا مقصد اور کیا ہو سکتا ہے۔ میرے لیے یہ معمولی سی قربانی ہے۔ بے لباسی کی ذلت میں نے سہی تھی۔ بے شک وہاں چند ہی افراد تھے مجھے قلعے سے دور لا کر لباس اتارنے کو کہا تھا۔ اس وقت میں مجبور تھی اور اب میں اپنی مرضی سے یہ کام کرنے کو تیار ہوں۔''

وہ رفتہ رفتہ مجھے قائل کر رہی تھی۔ میں نے بے بسی سے اسے دیکھا۔ ''روبیر یہ مجھے اچھا نہیں لگ رہا ہے۔''

''اگر آپ دیکھیں تو میں اصل میں آپ کے سامنے ہی بے لباس ہوں گی اور آپ کی نظروں کا مجھے علم ہے میں چاہے لباس میں ہوں یا بے لباس آپ مجھے ایک ہی انداز میں دیکھیں گے۔ اب یہ مت کہیے گا کہ آپ الگ سے نہیں ہیں۔ آپ میرے لیے سب سے الگ ہیں۔ رہے آرگون والے تو وہ اتنی دور ہیں کہ انہیں میری جھلک ہی نظر آئے گی اس سے پہلے کہ وہ نزدیک آئیں میں پھر سے لباس پہن لوں گی۔''

اس کی دلیلوں میں وزن تھا مگر میرا دل کسی صورت ماننے کو تیار نہیں تھا۔ یہ زندگی و موت کا مسئلہ تھا جس کے لیے میں روبیر سے اتنی بڑی قربانی لیتا اور شاید اس نے بھی میرے تاثرات سے بھانپ لیا تھا کہ میں اسے کسی صورت اجازت نہیں دوں گا۔ اس لیے اس نے دوسرا طریقہ اختیار کیا۔ ہم درختوں کے آخری سرے تک تھے اور یہاں سے آرگون کے سپاہی صاف نظر آ رہے تھے۔ انہوں نے شاید واپسی کی تیاریاں شروع کر دی تھیں۔ وہ گھاس سے اٹھ گئے تھے اور اپنا اسلحہ سمیٹ رہے تھے۔ ایک طرح سے یہ اچھا ہی ہوا کہ اب روبیر کی تجویز پر عمل نہیں ہو سکتا تھا۔ میں نے سکون کا سانس لیتے ہوئے سوچا اور پلٹا تھا کہ بھونچکا رہ گیا کیونکہ روبیر وردی اتار چکی تھی اور پھر وہ تیزی سے کھلے میدان کی طرف بھاگی۔ اس نے بہت زور سے چیخ ماری تھی۔ اس نے اپنی من مانی کر لی تھی اور اب اس کے پیچھے جانا اور منصوبے کے باقی حصے پر عمل کرنا ناگزیر ہو گیا تھا۔ میں چند لمحے کے وقفے سے اس کے پیچھے لپکا تو مجھے آتے دیکھ کر وہ جان بوجھ کر گری اور اس نے چلا کر کہا۔

''میرے پاس مت آنا۔''

چاہتا تو میں بھی یہی تھا کہ اس کے پاس نہ جاؤں مگر

اس نے مجھے مجبور کر دیا تھا۔ میں اس کے پاس آیا اور اس سے نظریں چراتے ہوئے اسے پکڑنے کی کوشش کرنے لگا۔ آرگون کے سپاہی ہماری طرف متوجہ ہو گئے اور ان کو دکھانے کے لیے میں نے روبیر کو ہلکا سا تھپڑ مارا مگر ان کو لگا جیسے میں نے بہت زور سے مارا ہے اور پھر میں اسے زبردستی گھسیٹ کر درختوں میں لے جانے لگا اور روبیر نام نہاد مزاحمت کرنے لگی اور اس دوران میں اس نے کئی بلند چیخیں ماری تھیں۔ اب اس ڈرامے میں حقیقت کا رنگ پوری طرح بھر گیا تھا۔ میرا رخ دوسری طرف تھا کہ میں اسے نہیں دیکھنا چاہتا تھا اس لیے میں سپاہیوں کو آتے ہوئے بھی نہیں دیکھ سکا۔ مگر روبیر پیچھے دیکھ رہی تھی۔ درختوں میں آتے ہی اس نے کہا۔ ''وہ آرہے ہیں۔''

''لباس پہنو۔'' میں نے غرا کر کہا اور تیزی سے ایرٹ والے درخت کے پاس آیا۔ ''ایرٹ۔''

اس نے اوپر سے جھانکا تو میں نے اسے اشارے سے سمجھایا آرگون کے سپاہی آنے والے ہیں۔ اس نے اثبات میں سر ہلایا۔ اس دوران میں روبیر بہت تیزی سے لباس پہن چکی تھی اور وہ اس درخت پر چڑھنے لگی جس پر اس کے ہتھیار تھے۔ میں نے جھانک کر دیکھا تو مجھے اطمینان ہوا کہ پورا دستہ درختوں کی طرف دوڑا آرہا تھا۔ میں نے روبیر سے کہا۔ ''ایک دو چیخیں اور مارو مجھے تمہارے ساتھ زیادتی ہو رہی ہے۔''

اس نے میری ہدایت پر عمل کیا اور ان چیخوں کے نتیجے میں آنے والے سپاہیوں کی رفتار میں خاطر خواہ تیزی آئی تھی۔ روبیر نے صرف منصوبہ نہیں بنایا تھا مجھے اس پر عمل کرنے پر بھی مجبور کر دیا تھا۔ مجھے غصہ تو آرہا تھا مگر یہ وقت غصہ دکھانے کا نہیں عمل کا تھا۔ اب میں تیزی سے پیچھے ہٹ رہا تھا۔ سپاہیوں کے اندر آنے سے پہلے میں ان کے لیے بنائے ہوئے جال والے مقام تک پہنچ گیا تھا۔ اس دوران میں ایرٹ نے ایک بار پرندے کی آواز نکال کر باقیوں کو ہوشیار کر دیا تھا۔ جب سپاہی اس کے پاس سے گزرے تو اس نے دوسری بار آواز نکالی۔ میں اس جگہ سے بھی پیچھے ہٹ گیا اور درختوں کے درمیان جا کر میں نے مردانہ غراہٹ کی آواز نکالی اور پھر تالی بجائی جس سے تاثر ہوا کہ کسی کو تھپڑ مارا گیا ہے۔ آنے والے سپاہی مجھے نظر نہیں آرہے تھے۔ مگر جب ایرٹ نے تیسری بار پرندے کی آواز نکالی تو میں نے جھانک کر دیکھا۔

سپاہی بے وقوف نہیں تھے کہ وہ ایک جگہ ہوتے وہ پھیلے ہوئے تھے اور ان میں سے گھات والی جگہ پانچ سپاہی تھے باقی ذرا فاصلے پر تھے۔ میں نے تیر کمان نکالا اور اپنے سب سے موجود نزدیک سپاہی کا نشانہ لینے لگا۔ وہ مجھ سے کوئی بیس گز کے فاصلے پر تھا اور اتنے فاصلے سے نشانہ لینا آسان نہیں تھا مگر میں نے اللہ کا نام لے کر تیر چھوڑ دیا۔ میں نے سینے کا نشانہ لیا تھا مگر تیر اس کی گردن میں اتر گیا۔ یہ بہتر ہوا تھا۔ اس کی آواز نہیں نکلی اور اس کے گھات والی جگہ موجود پانچ ساتھی بے خبر رہے تھے۔ وہ ڈگماتے ہوئے اپنی گردن سے تیر نکالنے کی کوشش کر رہا تھا۔ مگر تیر اس طرح گھسا تھا کہ نکل نہیں رہا تھا۔ اسے نشانہ بناتے ہی میں نے دھاڑ کر کہا۔ ''ٹوٹ پڑو۔''

فوراً ہی سنسناتی آوازیں آئیں اور سپاہیوں کی چیخیں بلند ہوئیں جن میں موت کا کرب رچا ہوا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ ان چاروں نے اپنے شکاروں کو موت کے گھاٹ اتار دیا ہوگا۔ میں نے جسے نشانہ بنایا تھا اس کے نزدیک ایک سپاہی اور تھا۔ اس نے مجھے دیکھ لیا اور نیزہ لے کر میری طرف لپکا۔ تیر استعمال کرنے کا وقت نہیں تھا۔ اس لیے میں نے کمان پھینک کر نیزہ سنبھال لیا۔ سپاہی وحشیانہ انداز میں دھاڑتا ہوا آیا تھا۔ وہ خاصا تنومند تھا اور اس کا انداز خوف زدہ کرنے والا تھا مگر میں پہلے بھی بارہا ایسے لوگوں کا سامنا کر چکا تھا۔ اس لیے جب اس نے ہوا میں اچھل کر نیزہ میرے جسم میں اتارنے کی کوشش کی تو میں آسانی سے درخت کی اوٹ لے کر بچ گیا۔ نیزہ درخت پر لگا اور ٹوٹ گیا۔ میں گھوم کر دوسری طرف سے نمودار ہوا تو سپاہی نے نیزے کی ڈنڈی مجھ پر کھینچ ماری اور اپنے پٹکے سے لگے ہوئے دو عدد سنگی چاقو نکال لیے۔

یہ کوئی چھ انچ لمبے پھل والے چاقو تھے جن کا دستہ بھی سنگی تھا اور انہیں ایک ہی پتھر سے تراش کر بنایا گیا تھا۔ میرے پاس نیزہ تھا اور میں دور سے اس پر وار کر سکتا تھا مگر مجھے اچھا نہیں لگا کہ اب نیزے سے مقابلہ کروں اس لیے میں نے بھی نیزہ پھینک کر چاقو نکال لیے۔ مجھے چاقو نکالتے دیکھ کر وہ سفاک انداز میں مسکرایا اور اس نے بیک وقت دونوں چاقو لہراتے ہوئے مجھ پر حملہ کر دیا۔ اس میں شبہ نہیں تھا کہ وہ چاقو کے استعمال کا ماہر تھا۔ اس نے پیٹ کا دھوکا دے کر الٹے ہاتھ والا چاقو میری گردن میں اتارنے کی کوشش کی تھی اور اگر میں پوری طرح چوکس نہ ہوتا تو وہ کامیاب بھی ہو جاتا۔ میں نے بروقت کلائی اس کے ہاتھ پر ماری اور اسے روک لیا۔ یہ اس کا فطری ہاتھ تھا کم سے کم

طاقت اور نپے تلے وار سے ایسا ہی لگ رہا تھا۔ اس کا دایاں ہاتھ میرے پیٹ اور سینے سے کچھ دور تھا۔ اس نے اب پیٹ پر وار کیا۔ جو میں نے بائیں ہاتھ سے روکا۔

اگر اس کا دایاں ہاتھ فطری ہوتا تو وہ شاید کامیاب ہو جاتا۔ میں نے دونوں ہاتھ روک کر اس کے پاؤں پر ٹھوکر ماری۔ چوٹ کھا کر وہ پیچھے گیا اور دوبارہ آگے آیا۔ اس بار اس نے دونوں چاقو سامنے رکھے اور میرے جسم کو نشانہ بنانے کی کوشش کی۔ یہ مہلک وار نہیں تھے اس کی کوشش تھی کہ مجھے زخم لگا کر کمزور کر دے اور وہ کسی حد تک کامیاب بھی رہا۔ ایک چاقو میری بائیں کلائی پر خراش ڈالتا ہوا نکل گیا۔ میں نے محسوس کیا کہ صرف چاقو بازی سے اسے روکنا محال تھا وہ مجھ سے زیادہ ماہر تھا۔ میں نے پھر پاؤں استعمال کیا اور اسے پیچھے دھکیل دیا۔ اس کے بعد میں نے ایک چاقو بھی پھینک دیا اب میرے پاس صرف ایک چاقو تھا میں نے چاقو زنی کے بجائے کراٹے والا انداز اپنایا اور جیسے ہی وہ آگے آیا میں نے نیچے بیٹھتے ہوئے سویپ کک ماری۔ اس کے لیے یہ وار غیر متوقع تھا اور وہ دھڑام سے نیچے گرا تھا۔

مگر وہ عام آدمی نہیں پیشہ ور سپاہی تھا۔ اس نے گرتے ہی میری طرف والا ہاتھ چلایا اور چاقو کی نوک اس بار میری پنڈلی کو چھو گئی۔ میں نے تڑپ کر پاؤں پیچھے کیا اور اس کا گھومتا ہوا ہاتھ قابو میں کرتا ہوا کھڑا ہو گیا۔ میں نے دوسرا ہاتھ اس کی کہنی کے نیچے رکھا تھا اور وہ کہنی ٹوٹنے سے بچانے کے لیے از خود کھڑا ہونے لگا مگر میری اٹھنے کی رفتار کہیں تیز تھی۔ دباؤ زیادہ آیا تو اس کی کہنی جوڑ سے نکل گئی۔ خشک ٹہنی ٹوٹنے جیسی آواز کے ساتھ اس کے حلق سے دھاڑ نکلی تھی۔ میں نے اس کا بازو چھوڑ کر عقب سے اس کی گردن جکڑی اور اس کا دوسرا ہاتھ قابو کر لیا۔ اس نے خود کو چھڑانے کی کوشش کی تو میں نے اس کے بائیں گھٹنے پر پیچھے سے پاؤں مار کر اسے نیچے گرایا اور گردن پر دباؤ بڑھانے لگا۔

اس دوران میں درختوں پر موجود میرے ساتھی اتر آئے تھے۔ ان میں سے ایک نے آگے آ کر اس کا دوسرا چاقو چھین لیا۔ وہ ویسے ہی بے دم ہو رہا تھا۔ میں اسے مارنا نہیں بے ہوش کرنا چاہتا تھا۔ مگر مجھ سے اندازے کی غلطی ہوئی اور میں نے بہت سختی سے اس کی گردن دبائی تھی۔ چاقو سے محروم ہونے کے بعد اس کا رہا سہا دم بھی جلد نکل گیا۔ اس کے ساکت ہونے پر میں نے اسے چھوڑ کر اس کی نبض چیک کی تو مجھے افسوس ہوا۔ نبض ساکت تھی اور وہ مر چکا تھا۔ میں نے ان لوگوں کی طرف دیکھا۔ ان سے پوچھنا بیکار تھا میری بات ان کی سمجھ میں کہاں آتی۔ میں گھات والی جگہ آیا تو وہاں چھ لاشیں پڑی تھیں۔ دو میں نے مارے تھے۔ مگر میرا خیال تھا کہ وہ نو تھے تو ایک کہاں تھا۔ میں نے چلا کر روبیر کو آواز دی۔ ”ایک بھاگ گیا ہے اسے روکو۔“

باقی میرے انداز سے سمجھ گئے کہ کوئی مسئلہ ہے۔ میں میدان کی طرف بھاگا تو وہ بھی میرے پیچھے آئے۔ ایرٹ اور روبیر درختوں سے اتر آئے تھے۔ میں نے ان کو اسی وجہ سے یہاں لگایا تھا کہ اگر کوئی بچ کر واپس بھاگے تو وہ اسے جانے نہ دیں۔ میں نے روبیر سے کہا۔ ”ان سے کہو ایک بچ گیا ہے اسے تلاش کریں۔“

روبیر نے میری بات کا ترجمہ کیا اور وہ فوری آس پاس پھیل گئے۔ روبیر نے کہا۔ ”یہاں سے کوئی نہیں گزرا ہے۔“

”وہ چالاک ہے شاید اس نے محسوس کر لیا کہ یہاں بھی گھات ہے تو وہ کہیں اور سے نکلے گا۔“ میں کہتے ہوئے روبیر کے ساتھ کھلے میدان میں نکل آیا مگر دائیں بائیں کوئی نظر نہیں آیا۔ فرار ہونے والا اتنی جلدی یہ میدان عبور نہیں کر سکتا تھا۔ ویسے تو پورے میدان میں گھاس تھی مگر کہیں کہیں زیادہ گھاس ہوئی تھی اور اس میں کوئی آدمی لیٹ جاتا تو دور سے نظر نہیں آتا۔ درختوں میں ایرٹ اور اس کے ساتھی بھاگنے والے کو تلاش کر رہے تھے۔ میں نے روبیر سے کہا۔ ”بڑھی ہوئی گھاس میں دیکھنا ہوگا ممکن ہے وہ اس میں چھپ گیا ہو۔“

”میں الگ دیکھتی ہوں آپ.....“

”نہیں تم میرے ساتھ رہو گی اکیلا پا کر وہ الٹا تم پر یا مجھ پر حملہ کر سکتا ہے۔“ میں نے اس کی بات کاٹ کر کہا۔ ”اب خاموش رہنا اور دبے قدموں چلنا، کوئی بات کہنی ہو تو اشارے سے کہنا۔“

روبیر نے سر ہلایا اور ہم نے اپنے تیر کمانوں پر چڑھا لیے اور اونچی گھاس والی جگہوں کو کھنگالنے لگے۔ میدان میں ایسی جگہیں بہت ساری تھیں مگر اس جگہ سے نزدیک چند ایک ہی تھیں اور وہ ان میں سے ہی کسی میں چھپ سکتا تھا۔ ہم نے جہاں دیکھا وہاں کوئی نہیں تھا۔ میدان کے تقریباً وسط میں اونچی گھاس تھی۔ میں اور روبیر دبے قدموں خاموشی سے اس کے نزدیک پہنچے تھے کہ ایک سرخ لباس والا سپاہی تڑپ کر اس میں سے نکلا اور باغوں کی طرف دوڑا۔ میں نے بے ساختہ تیر چلایا جو اس سے خاصے فاصلے سے گزر گیا۔ مگر روبیر نے فوری تیر نہیں چلایا۔ اس نے تیر کا رخ اس

کی طرف کیا اور پھر بتدریج اسے اوپر کرنے لگی۔ البتہ سمت اس نے وہی رکھی تھی۔ سپاہی دوڑنے کے ساتھ اب چلا بھی رہا تھا۔ ''مدد...... مدد...... حملہ ہوا ہے۔''

میں نے اضطراب سے کہا۔ ''روبیر اسے روکو۔''

وہ پورے انہماک سے نشانہ لے رہی تھی اور جب اسے یقین ہو گیا کہ سپاہی نشانے پر آ گیا ہے تو اس نے پوری طرح کھنچی کمان کی تانت چھوڑ دی۔ کمان کھینچنے کے دوران اس کا جسم خود کڑی کمان بن گیا تھا۔ تیر ہوا میں بلند ہوا تو دونوں کمانیں نرم پڑ گئیں۔ میری نظر تیر اور دوڑتے سپاہی پر بیک وقت لگی ہوئی تھی۔ وہ باغوں کے خاصا پاس پہنچ گیا تھا مگر جب دو چار ہاتھ لب بام رہ گئے تو اس کی اُمید کی کمند ٹوٹ گئی۔ تیر عقب سے اس کی گدی میں داخل ہوا اور دوسری طرف نکل گیا۔ وہ نیچے گرا اور ہاتھ پاؤں مارتے ہوئے دم توڑنے لگا۔ ایک بار وہ کھڑا ہوا اور لڑکھڑاتا ہوا چند قدم درختوں کی طرف چلا مگر پھر گر پڑا اور دوبارہ نہیں اٹھا۔ میں اور روبیر بیک وقت اس کی طرف بھاگے۔ اس دوران میں ایرٹ اور اس کے ساتھی بھی میدان میں نکل آئے تھے۔ میں نے ہاتھ کے اشارے سے انہیں درختوں میں جانے کو کہا اور انہوں نے حکم کی تعمیل کی۔ ہم سپاہی کی لاش کے پاس رکے اور روبیر نے پوچھا۔

''اس کا کیا کرنا ہے؟''

''اسے بھی واپس لے جانا ہے۔'' میں نے کہا اور اس کی دونوں ٹانگیں پکڑیں۔ روبیر نے تیر کھینچ لیا اور اسے زمین پر صاف کر کے ترکش میں لگا لیا۔ مگر اس سے پہلے کہ میں اسے واپسی کے لیے کھینچتا' تقریباً دو سو گز دائیں طرف باغات کی طرف سے تیز بولنے کی آواز آئی اور میں نے پھرتی سے سپاہی کی لاش کھینچی اور درختوں میں داخل ہو گیا۔ روبیر میرے ساتھ تھی۔ شام دھندلا گئی تھی اور کچھ ہی دیر میں تاریکی ہونے والی تھی۔ یہاں کینو جیسے درخت لگے تھے جو نیچے سے بھی گھنی شاخوں والے ہوتے ہیں۔ میں نے لاش ایک درخت کے اندر کی اور روبیر کو دوسرے میں جانے کا اشارہ کر کے واپس آیا۔ زمین پر سپاہی کا لہو پھیلا ہوا تھا اور یہ اچھا خاصا تالاب جیسا بن گیا تھا۔ خون والی جگہ مجھ سے صرف دو گز دور کھلے میں تھی مگر میں اس حد تک آتا تو ان لوگوں کی نظروں میں آ جاتا تو اب باہر نکل کر غالباً مدد کے لیے پکارنے والے کو تلاش کر رہے تھے۔ یقیناً مرنے والے سپاہی کی چیخ و پکار اندر سن لی گئی تھی اور یہ لوگ اسی پر آئے تھے۔

ان کی تعداد ایک درجن کے لگ بھگ تھی اور ان میں نو یا دس سپاہی تھے باقی عام لباس میں تھے۔ وہ پھیل کر دائیں بائیں دیکھ رہے تھے اور ان میں سے کچھ ہماری طرف آ رہے تھے۔ میں نے سوچا اور اپنی جگہ بیٹھے بیٹھے مٹی اٹھا کر خون پر پھینکنے لگا۔ میں زیادہ مقدار میں نہیں پھینک رہا تھا جو آنے والوں کو متوجہ کر لیتی۔ مٹی گرنے سے رفتہ رفتہ لہو کی سرخی غائب ہونے لگی۔ ایک منٹ میں خون بالکل غائب ہو گیا تھا اور اب کوئی آ کر یہاں مٹی کریدتا تب ہی اسے خون دکھائی دیتا۔ سپاہی کو کھینچنے سے جو گھاس دبی تھی وہ دوبارہ سیدھی ہو رہی تھی۔ باقی ایسا کوئی نشان نہیں تھا جو آنے والوں کی توجہ کھینچتا۔ میں واپس آیا تو روبیر خود کو ایک درخت میں اچھی طرح چھپا چکی تھی۔ میں نے اس سے مخالف سمت میں دوسرے درخت کا انتخاب کیا اور اندر گھس کر خود کو پوشیدہ کر لیا۔ پانچ منٹ بعد تلاش کرنے والے وہاں آ گئے تھے اور انہوں نے باغ کے اندر بھی جھانکا تھا۔ مگر کسی کو درختوں میں دیکھنے کا خیال نہیں آیا۔ کوئی بولا۔

''کسی نے مذاق کیا ہوگا۔''

''اگر یہ مذاق ہے تو بہت ہی بھونڈا مذاق ہے۔'' دوسرے نے کہا وہ لاش والے درخت کے پاس کھڑا ہوا تھا اور ذرا سا شاخیں ہٹا کر دیکھتا تو اسے بھونڈا مذاق کرنے والا فوراً نظر آ جاتا۔

''سوال ہے کہ مذاق کرنے والا بھی تو کوئی ہوگا۔ وہ مذاق کر کے کہاں غائب ہو گیا۔'' پہلے والے نے کہا۔

''یہاں موجود دستہ کہاں گیا؟''

''میرا تو خیال ہے وہ حرام خور پہلے ہی شہر کی طرف جا چکے ہیں جب کہ انہیں یہاں کام کرنے والوں کے ساتھ جانا تھا۔''

وہ دونوں عام لباس میں تھے اور ان کی باتوں سے لگ رہا تھا کہ وہ سپاہیوں سے خوش نہیں ہیں۔ وہ باتیں کرتے ہوئے آگے نکل گئے۔ ان کے دور جانے کے بعد میں درخت سے باہر آیا اور روبیر اپنی جگہ رہنے کا کہہ کر میں باغ کے کنارے تک آیا۔ باہر جھانکنے پر مجھے میدان میں پھیلے سپاہی نظر آئے مگر وہ جنگل کی طرف جانے سے گریز کر رہے تھے۔ البتہ چلا چلا کر ان لوگوں کو آوازیں دے رہے تھے جو اب ان کی کسی آواز کا جواب نہیں دے سکتے تھے۔ تاریکی بہت تیزی سے بڑھ رہی تھی اور کچھ ہی دیر جاتی تھی کہ تاریکی مکمل ہو جاتی۔ مجھے اور روبیر کو اس کا فائدہ اٹھاتے ہوئے یہاں سے نکلنا تھا۔ البتہ میں لاش کے

بارے میں متذبذب تھا کہ اسے یہاں چھوڑ کر جاؤں یا لے جاؤں۔ ایک بار لاش مل جاتی تو وہ لوگ ہوشیار ہو جاتے اور اس کے بعد ہمارے لیے کوئی کارروائی مشکل ہوتی۔

لاش یا لاشیں نہ ملنے کی صورت میں وہ بہت کچھ سوچ سکتے تھے۔ جیسے انہیں جانور کھا گئے یا پھر وہ فرار ہو کر سامیرا سے جا ملے۔ ایک شک کی کیفیت رہتی اور وہ اس کیفیت میں دس مفروضے قائم کرتے مگر کسی نتیجے پر نہیں پہنچ پاتے اور ہم ان کی اسی کیفیت کا فائدہ اٹھاتے ہوئے بعد میں بھی اپنی چھاپہ مار کارروائیاں جاری رکھتے۔ کسی قدر سوچ بچار کے بعد میں نے لاش لے جانے کا فیصلہ کیا اور روبیر سے کہا۔ ''سنو تم تاریکی چھاتے ہی یہاں سے نکل جاؤ گی۔''

''اور آپ؟''

''میں لاش لے کر آؤں گا۔ تم اس کے ہتھیار لے جاؤ گی۔''

روبیر تیار نہیں تھی مگر میرے حکم کے آگے مجبور ہو گئی۔ اس نے سپاہی کے ہتھیار جو اسی کے پاس تھے۔ سنبھال لیے اور جیسے ہی تاریکی مکمل ہوئی اور تلاش کرنے والے سمٹ کر باغوں کی طرف آئے وہ تیزی سے نکلی اور جنگل کی طرف روانہ ہو گئی۔ آسمان پر ابھی تک دھند تھی اور اگر تارے نکل آئے تھے تو ان کی روشنی نیچے نہیں آسکتی تھی۔ دھند کچھ دیر بعد ختم ہوتی۔ میں نظر جما کر دیکھ رہا تھا۔ روبیر کوئی پچاس گز تک نظر آتی رہی اور اس کے بعد نظروں سے اوجھل ہو گئی۔ گویا حد نظر پچاس گز تھی اگر میں اس حد سے نکل جاتا تو ان لوگوں کی نظروں سے بچ نکلتا۔ میں نے لاش درخت سے نکالی اور اسے اٹھا کر شانے پر لاد لیا۔ وہ متوسط جسامت کا ہلکے وزن والا آدمی تھا۔ پھر خون نکل جانے سے بھی اس کا وزن کم ہوا تھا۔ میں نے باآسانی اسے اٹھا لیا اور اللہ کا نام لے کر باغ سے نکل آیا۔ میں نے تیز رفتاری دکھائی مگر اتنی نہیں کہ ٹھوکر کھاؤں تو سنبھل نہ سکوں گی اور اسی وجہ سے شاید میں کسی کی نظر میں آیا۔ کوئی دائیں طرف سے چلایا۔

''وہ کون ہے؟''

''کہاں ؟...... کس طرف؟'' مختلف آوازیں آئیں۔ میں ذرا جھکا اور لاش سمیت نیچے گر گیا۔ پھر لیٹے لیٹے آگے سرکنے لگا۔ لاش میری پشت پر تھی اور بار بار پھسل رہی تھی اور اسے قائم رکھنا دشوار ہو رہا تھا۔ مگر میں نے کسی نہ کسی طرح اسے برقرار رکھا۔ اس دوران میں عقب سے آوازوں کا سلسلہ جاری تھا۔ ابھی کسی دوسرے فرد نے مجھے دیکھنے کا دعویٰ نہیں کیا تھا کیونکہ میں بروقت زمین پر لیٹ گیا تھا۔ اگر ایک دو افراد اور مجھے دیکھ لیتے تو لازمی میری تلاش شروع ہو جاتی۔ مگر اس وقت اس شخص کا مذاق اڑایا جا رہا تھا اور اسے وہم کا مریض کہا جا رہا تھا۔ بلکہ کسی نے موقع کی مناسبت سے چٹکلے سنانے شروع کر دیے تھے۔ اس طنز و مزاح کا فائدہ مجھے ہوا اور میں کوئی پچاس گز دور نکل آیا۔ زمین پر رینگنے سے میرا لباس خراب ہوا تھا اور ہاتھ پیروں پر خراشیں آئی تھیں مگر دشمنوں کی نظروں سے بچ گیا تھا۔ پچاس گز سے زیادہ دور آکر میں نے ایک بار پھر لاش شانے پر لادی اور آگے بڑھنے لگا۔

جنگل کے درختوں کا دیوار نما ہیولہ میری رہنمائی کر رہا تھا۔ یہ کہنا مشکل تھا کہ میں اسی طرف جا رہا تھا جہاں میرے ساتھی تھے یا میں بھٹک کر کسی اور طرف نکل رہا تھا۔ شاید میں نکل بھی جاتا تھا مگر اس وقت روبیر کی ذہانت کام آئی۔ درختوں میں داخل ہوتے ہی مجھے پرندے کی آواز سنائی دی جو یقیناً ایرٹ نکال رہا تھا۔ اس طرح وہ مجھے اپنے جائے وقوع سے آگاہ کر رہا تھا۔ میں سنبھل کر اس طرف بڑھنے لگا اور کوئی دس منٹ بعد میں ان کے پاس تھا۔ انہوں نے عقل مندی کرتے ہوئے اب تک روشنی نہیں کی تھی۔ کیونکہ اگر وہ روشنی کرتے تو امکان تھا کہ باغوں کے باہر موجود دشمن دیکھ لیتا۔ وہ چاہتے تھے کہ پہلے میں آجاؤں۔ اس دوران میں انہوں نے باقی تمام لاشوں کی وردیاں اور سامان اتار لیا تھا۔ روبیر کے توسط سے ایرٹ نے پوچھا۔ ''ان لاشوں کا کیا کرنا ہے؟''

لاشوں کی خاطر دور جانا خطرہ مول لینے کے مترادف تھا اور یہ کام بہت دشوار ثابت ہوتا۔ ہم اس اُمید میں بھی لاشیں یہاں چھوڑ کر نہیں جا سکتے تھے کہ انہیں اسمار یا دوسرے جانور تناول فرما لیں گے۔ اس لیے ایک ترکیب پہلے ہی میرے ذہن میں موجود تھی۔ میں نے کہا۔ ''انہیں درختوں پر چڑھا کر شاخوں سے باندھ دو۔''

یہ کام نسبتاً آسان تھا۔ ہم نے چند درخت منتخب کیے اور دو دو آدمی ایک درخت پر چڑھ گئے۔ لاشوں کو رسیوں کی مدد سے اوپر کھینچا جانے لگا اور پھر انہیں رسیوں کی مدد سے ہی یوں باندھ دیا گیا کہ وہ نیچے نہ گریں۔ روشنی کے لیے ہم نے دو مشعلیں جلائی تھیں اور کام کر رہے تھے۔ لاشیں اوپر لے جانے اور باندھنے کا کام ان پانچوں نے اپنے ذمے لے لیا تھا۔ میں اور روبیر انہیں نیچے سے لاشیں دے رہے تھے۔ آدھے گھنٹے میں یہ کام نمٹ گیا۔ اس کے بعد زیادہ مشعلیں

جلا کر باقی رہ جانے والے آثار مٹائے گئے اور جو رہ گیا اسے تقدیر پر چھوڑ کر ہم واپس ٹیلے کی طرف روانہ ہو گئے۔ اب ہر فرد کے پاس ایک مشعل تھی اور ہم اس طرح چل رہے تھے کہ آس پاس بھی نظر رکھی ہوئی تھی۔ ساتھ ہی ہم ان جگہوں سے دوری سے گزر رہے تھے جہاں کوئی جانور گھات لگا کر بے خبری میں ہم پر حملہ کر سکتا تھا۔ مجھے خدشہ تھا کہ جانوروں سے واسطہ پڑے گا اور ایسا ہی ہوا۔ یہ تین عدد گونز تھے جو اچانک سامنے آئے تھے۔ انہیں دیکھتے ہی میں نے حکم دیا۔

''دوشاخے جلا لو۔''

سب نے اپنے اپنے پاس موجود دوشاخے جلا لیے اور چند لمحے میں روشنی بہت زیادہ ہو گئی تھی۔ گونز جو پہلے ہی ہماری اتنی بڑی تعداد کی وجہ سے حملہ کرنے سے گریزاں تھے۔ روشنی ہوئی تو وہ گھبرا کر پسپا ہونے لگے۔ مگر ہم سے دور نہیں گئے تھے۔ اب روبیر اور دوسروں کو پتا چلا کہ میں نے یہ دوشاخے کیوں تیار کرائے تھے۔ دوشاخوں کی وجہ سے شعلہ بہت بڑا اور مہیب لگ رہا تھا اور جانور ویسے ہی آگ سے گھبراتے ہیں۔ ہم جارحانہ انداز میں گونز کی طرف بڑھے تو وہ اس بار بھاگ کھڑے ہوئے تھے۔ چند دوشاخے چھوڑ کر باقی بجھا دیے کہ آگے کام آئیں گے۔ مگر اس بار ضرورت نہیں پڑی اور ہم بہ خیریت ٹیلے تک پہنچ گئے۔ سب کا تھکن اور بھوک سے برا حال تھا۔ ہم تھے جیسی خشک چیز ساتھ لے گئے تھے اور راستے میں اسے کھا کر بھوک کا مداوا کیا تھا۔ روبیر بھی تھکی ہوئی تھی اس لیے میں نے اسے چولہا جلانے سے روک دیا۔ ''آج سب اسی سے گزارا کریں گے۔''

چنے برے نہیں تھے بس ذرا ہرے سے تھے۔ ہمارے چنوں کی طرح بالکل پیلے اور ذائقے والے نہیں تھے۔ کھا پی کر سب اپنی اپنی جگہوں پر لیٹ گئے تھے۔ مگر میں نے آج احتیاطاً پہرے کا بندوبست کیا تھا اور سب سے پہلے میں جاگتا رہا۔ دو گھنٹے بعد میں نے ایرٹ اور شاٹ کو اٹھا دیا۔ اب وہ پہرہ دیتے اور میں سو گیا۔ ان کے بعد دوسرے پہرہ دیتے رہے حتیٰ کہ صبح کی روشنی نمودار ہو گئی۔ میں اٹھا تو روبیر ناشتا بنا رہی تھی۔ آج ناشتے میں دلیہ نما کھیر کے ساتھ شہد اور پنیر بھی تھا۔ ناشتے سے فارغ ہو کر ہم نیچے آئے اور ندی پر گزشتہ روز کی حاصل کی ہوئی وردیاں اور دوسرا سامان دھویا جو خراب اور خون آلود ہو رہا تھا۔ خود بھی نہائے دھوئے اور آخر میں مچھلیاں پکڑیں۔ آج صرف تین مچھلیاں ہاتھ لگی تھیں، شاید ندی میں ان کی تعداد کم ہو گئی تھی یا پھر وہ بھانپ گئی تھیں کہ ندی میں اس جگہ ان کے لیے خطرہ ہے۔ بہر حال یہ تین بھی ہمارے لیے کافی تھیں۔

صبح بیدار ہونے کے بعد سے میری روبیر سے بات نہیں ہوئی تھی۔ میرے اندر اس کے خلاف ابھی بھی غصہ تھا۔ مجھے اس کا خود کو بے لباس کرنا بالکل اچھا نہیں لگا تھا۔ اس نے بے شک خلوص نیت سے یہ کام کیا تھا اور اسی کی وجہ سے ہمیں یہ کامیابی ملی تھی۔ اس کے باوجود مجھے اچھا نہیں لگا تھا۔ شاید اس نے بھی محسوس کیا کہ میں اس سے خفا ہوں۔ اس لیے جب باقی سب ایک ایک کر کے ٹیلے پر جانے لگے تو وہ نیچے اتر آئی اس وقت وہاں صرف ایمار تھا۔ میری خصوصی توجہ اور ان پانچوں کی طرف سے حکم بجا لانے پر اب روبیران پر پوری طرح حاوی ہو گئی تھی اور بہت تحکمانہ انداز میں بات کرتی تھی۔ اس وقت بھی اس نے ایمار سے کہا۔ ''یہاں سے جاؤ۔''

اس بے چارے نے بنا چوں چرا کیے تعمیل کی اور میں بھی یہ سمجھ کر جانے لگا کہ شاید اسے ندی پر کوئی کام ہے۔ اس نے سامنے آکر مجھے روک لیا۔ ''میں نے آپ سے نہیں کہا ہے۔''

''میں جھاڑیوں کے اس طرف ہوں۔'' میں نے اس کی طرف دیکھے بغیر کہا۔ ''تم ندی میں نہا لو۔''

''میں نہا لوں گی مگر اس وقت میں آپ سے بات کرنے آئی ہوں۔''

''کہو میں سن رہا ہوں۔''

''آپ مجھ سے ناراض ہیں۔''

''نہیں۔'' میں نے جواب دیا۔

''نہیں ہیں۔'' وہ اصرار کر کے بولی۔ ''میں نے آپ کی بات نہیں مانی تھی اور اپنی من مانی کی تھی۔''

''جب تم جانتی ہو تو پھر پوچھ کیوں رہی ہو۔''

میرا لہجہ سخت تھا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

''میں نے صرف اپنے لوگوں اور آپ کی خاطر یہ کیا ہے۔ مجھے کسی نے نہیں دیکھا سوائے آپ کے۔''

''تمہیں یوں دیکھنے کا حق مجھے بھی نہیں ہے۔''

''سمجھ لیں مجبوری تھی جیسی اس وقت تھی جب میں بھٹکتی ہوئی آپ کے پاس آئی تھی تب بھی تو لباس نہیں تھا میرے جسم پر۔''

مرد کا ذہن اللہ نے کچھ اس طرح کا بنایا ہے کہ وہ از خود عورت کی طرف متوجہ ہوتا ہے۔ اس کی جھلک، اس کی

آواز، لمس اور خوشبو از خود اپنے اندر محفوظ کر لیتا ہے۔ اور کسی سچویشن میں فوراً سامنے پیش بھی کر دیتا ہے۔ میں نے اسے جس طرح دیکھا اور محسوس کیا وہ سب میرے ذہن میں موجود تھا مگر میں اسے یاد کرنا نہیں چاہتا تھا۔ جب روبیر نے مجھ سے بات کی تو میرا ذہن مجھے جھلکیاں دکھانے لگا۔ اس لیے مجھے اس موضوع سے الجھن ہو رہی تھی اور اسے ختم کرنے کا واحد طریقہ مجھے یہی سمجھ میں آیا کہ بات ختم کر دوں۔ ''ٹھیک ہے، مگر اب تم میری مرضی کے خلاف ایسی کوئی حرکت نہیں کرو گی۔''

''آپ مجھ سے ناراض نہیں ہیں؟''

''نہیں۔'' میں نے کہا۔

''سچ۔'' اس نے کہا اور اچک کر میرا رخسار چوم لیا۔ وہ بالکل سامنے اور پاس تھی مجھے موقع ہی نہیں ملا کہ اس سے بچتا۔ میں جھینپ گیا۔ ''یہ کیا حرکت ہے؟''

''شکریے کا اظہار۔'' اس نے سادگی سے کہا۔

میں نے اسے نرمی سے سمجھایا۔ ''روبیر ہمارے ہاں عورتیں یا لڑکیاں اس طرح شکریہ ادا نہیں کرتی ہیں۔''

''اچھا آیندہ خیال رکھوں گی۔'' اس نے جلدی سے وعدہ کر لیا۔

میں نے ان لوگوں سے کہا تھا کہ ایک آدھ سپاہی کو زندہ گرفتار کرنے کی کوشش کرنی تھی مگر انہوں نے سب کو ہی مار دیا تھا۔ جس کو میں زندہ پکڑ سکتا تھا وہ میری غفلت سے مر گیا۔ روبیر اور دوسروں کا کہنا تھا کہ وہ سب خطرناک سپاہی تھے اور انہیں موقع مل جاتا تو وہ الٹا لینے کے دینے پڑ سکتے تھے۔ اس لیے مجبوراً انہیں کاری وار کرنے پڑے جو سب کے سب درست بیٹھے اور وہ سارے ہی مارے گئے۔ اس طرح فرار ہونے والے کو ہم نے خود ہلاک کر دیا تھا ورنہ بھانڈا پھوٹ سکتا تھا۔ میں نے حساب لگایا کہ اب تک آرگون کے انیس سپاہی ہمارے ہاتھوں یا ہماری وجہ سے مارے جا چکے تھے۔ اگرچہ ریناٹ کے پاس ہزاروں کی تعداد میں فوجی تھے لیکن یہ نقصان کم نہیں تھا جب کہ اسے جنگ کے لیے مزید سپاہیوں کی ضرورت تھی۔ اگر ہم جنگ سے پہلے اسی طرح کی چند اور چھاپہ مار کارروائیاں کر گزرتے تو ریناٹ کی فوج میں خوف پھیل جاتا۔ وہ جنگ میں اس کارکردگی کا مظاہرہ نہیں کر پاتے جو ایک بے خوف اور پُریقین فوج کر سکتی ہے۔

جدید دنیا میں اسی لیے اصل جنگ سے پہلے حریف ملکوں میں افراتفری کا ماحول پیدا کر کے اس کی فوج اور عوام کو ڈی مولرائز کیا جاتا ہے جیسا کہ آج کل وطن عزیز میں ہو رہا ہے۔ عالمی طاقتیں جس میں ہمارا پڑوسی بھی شامل ہے پاکستان کو ایک منظم منصوبے کے تحت انتشار کی نذر کر رہے ہیں۔ ان کے اہداف میں ایک ڈاکٹر، پروفیسر اور پروفیشنل سے لے کر بڑے فوجی اڈے اور اسٹریٹجک نوعیت کی جگہیں شامل ہیں۔ مسلسل ٹارگٹ کلنگ سے عوام میں خوف بھرا جاتا ہے۔ قانون نافذ کرنے والے اداروں کے اہم افسران کی ٹارگٹ کلنگ سے ان اداروں کو ڈی مولرائز کیا جاتا ہے اور فوجی تنصیبات پر حملے کر کے فوج کو بیک فٹ پر جانے پر مجبور کیا جاتا ہے۔ ایسا کرنے والے چاہے کسی بھی نام اور گیٹ اپ کے ساتھ آتے ہوں وہ اصل میں پاکستان اور اسلام کے دشمنوں کے ہاتھ میں کھیل رہے ہیں۔ ان کو اسلحہ اور پیسے کے ساتھ ساتھ تربیت اور گائیڈ لائن بھی ہمارے عالمی دشمنوں کی طرف سے فراہم کی جا رہی ہے۔

دنیا کے بہت سے ملکوں نے اس سے زیادہ خوفناک حالات دیکھے جب ان کی بقا کو شدید خطرات لاحق ہو گئے تھے۔ امریکا کو سول وار کی صورت میں ٹوٹ جانے کے خطرے کا سامنا ہوا۔ دوسری جنگِ عظیم میں سوویت یونین کو جرمنی سے خطرہ ہوا تھا۔ مگر دونوں ملکوں کے حکمرانوں نے عوام کی طاقت سے ان خطرات کو ٹال دیا۔ انسانوں اور قوموں کی زندگی میں مشکلات انہیں مضبوط بنانے کے لیے آتی ہیں۔ اگر وہ ان مشکلات کا ہمت اور حوصلے سے مقابلہ کرتے ہیں۔ اپنی سمجھ بوجھ اور ذرائع استعمال کرتے ہیں تو وہ پہلے سے زیادہ طاقتور ہو کر ابھرتے ہیں۔ اگر ہم بھی ایسا ہی کریں تو کوئی وجہ نہیں ہے کہ چند سال بعد ہمارا ملک بھی ان مشکلات کے بھنور سے نکل آئے۔ شرط یہ ہے کہ حکمران اور عوام ملک سے اخلاص اور محبت کا ثبوت دیں۔ مشکلات پر رونے دھونے کے بجائے استقامت، حوصلے اور عقل سے ان کا مقابلہ کریں۔

یہاں مزاحمت کاروں کو سامیرا کی صورت میں ایک بہترین اور مخلص رہنما میسر تھی جو بے لوث ہو کر ان کی آزادی کے لیے لڑ رہی تھی۔ اس نے اپنے لوگوں کو حوصلہ دیا تھا اور خود ان کے معیار کے برابر آ کر مساوات کی عملی وضاحت کر دی تھی۔ مزاحمت کار جانتے تھے کہ کامیابی میں ان کی بقا تھی، اگر ریناٹ کامیاب ہوا تو ہمیشہ کی نہ سہی لیکن ایک طویل مدت کی غلامی ان کے مقدر میں لکھ دی جائے گی۔ ان کے پاس ذرائع کی کمی تھی مگر وہ حوصلہ مند ضرور تھے۔ انہیں اپنے گھروں اور اپنے خاندانوں کا دفاع کرنا

تھا۔ اس کے لیے وہ جان بھی دینے کو تیار تھے۔ برف والے کی حمایت نے بھی ان کا حوصلہ بلند کیا تھا۔ وہ یہاں ایک اعلیٰ ترین، معزز ترین اور ماورائی حیثیت رکھنے والا شخص تھا جس سے برتر کوئی بھی نہیں تھا۔ مزاحمت کاروں کے لیے اس کا ساتھ بہت زیادہ تقویت کا باعث تھا۔ اب قلعے والے پہلے سے کہیں زیادہ پُرعزم اور پُریقین تھے کہ کامیابی ان کے قدم چومے گی۔ یہ تصویر ایرٹ اور اس کے ساتھیوں سے گفتگو کے نتیجے میں میرے سامنے آئی تھی۔

قلعے میں قیام کے دوران میرا عوام سے بس اتنا رابطہ تھا کہ وہ میرے حکم کی تعمیل کرتے تھے۔ وہ کیا سوچتے تھے اور ان کے مزاحمت کے حوالے سے کیا جذبات و احساسات تھے۔ اس کا اندازہ مجھے ان لوگوں سے گفتگو کر کے ہوا۔ سامیرا ان کے لیے ایسی ہستی تھی جس کے ایک اشارے پر وہ اپنی جان قربان کرنے کو تیار رہتے تھے۔ وہ اور ان کے اہلِ خانہ یہاں تنگی ترشی میں زندگی بسر کر رہے تھے۔ اگرچہ ان کو فقر و فاقے کا سامنا بھی نہیں تھا مگر ان کے پاس کھلا سامان بھی نہیں تھا۔ وہ تنگ اور کم جگہ والے گھروں میں رہتے تھے۔ بہت سی نعمتیں جن سے آرگون والے لطف اندوز ہوتے تھے وہ ان کے پاس نہیں تھیں۔ مگر انہیں آزادی کی نعمت میسر تھی جس سے آرگون کے شہری قطعی ناواقف تھے اور وہ ریناٹ کے آمریت کے ساتھ نظام کا جبر بھی برداشت کر رہے تھے۔ مزاحمت کار اب اس آزادی سے دست بردار ہونے کو تیار نہیں تھے جس سے سامیرا نے انہیں روشناس کرایا تھا۔ وہ اپنی آزادی کے دفاع کے لیے کسی بھی حد کو جانے کے لیے تیار تھے۔ وہ دشمن کی جان لے سکتے تھے اور اپنی جان دے سکتے تھے۔

ایرٹ اور اس کے ساتھی گزشتہ روز کے مشن سے بہت خوش تھے اور ان کی خواہش تھی کہ میں مزید مشن ترتیب دوں۔ مگر فی الحال میں نے اس بارے میں بات نہیں کی اور انہیں آج کے دن چھٹی دی کہ وہ آرام یا تفریح کریں۔ اس لیے وہ دوپہر کے کھانے کے بعد ٹیلے سے نیچے اتر گئے اور کوئی کھیل کھیلنے لگے۔ ان کا کھیل کچھ انوکھا تھا۔ اس میں ہر فرد کے پاس ایک گول لکڑی ہوتی تھی اور ایک اضافی لکڑی ہوا میں اچھالی جاتی اور پھر سب اسے حاصل کرنے کی کوشش کرتے تھے جو حاصل کر لیتا وہ تین بار ''میں نے پالیا'' کی گردان کرتا تو وہ فاتح ہوتا اگر تین بار کہنے سے پہلے لکڑی اس سے چھن جاتی تو کھیل جاری رہتا۔ کامیاب ہو جانے والا ایک طرف ہو جاتا اور باقیوں کے درمیان مقابلہ جاری رہتا۔ اس طرح دوسری، تیسری پوزیشن کا فیصلہ ہو جاتا اور باقی لوگ شکست خوردہ تصور کیے جاتے تھے۔ دیکھا جائے تو یہ زور آزمائی کا کھیل تھا۔ جیسے ہمارے ہاں کبڈی ہوتی ہے۔ سب سے پہلے شاٹ جیتا اور نعرہ مار کر ایک طرف ہو گیا۔ میں اور روبیر اوپر سے دیکھ رہے تھے۔ میں نے تالی بجائی تو شاٹ جھک کر آداب بجا لایا۔ روبیر نے کہا۔

''یہ سب آپ کے شیدائی ہو گئے ہیں آپ کی بہت تعریف کر رہے تھے۔''

میں مسکرا دیا اور بولا۔ ''شیدائی ہونا بھی کافی سے زیادہ ہے۔ میں تو اس پر راضی ہوں کہ یہ میرے مخالف اور دشمن نہیں ہیں، میری بات مانتے ہیں۔''

''جو شخص بھی کچھ دن آپ کے ساتھ رہے وہ آپ سے محبت کیے بغیر نہیں رہ سکتا۔''

میں ہنسا۔ ''میں بہت بہت دنوں تک دشمنوں کی قید میں اور ان کے ساتھ رہا مگر انہیں مجھ سے ذرا بھی محبت نہیں ہوئی۔''

''تب ان لوگوں میں انسانوں والی کوئی بات نہیں ہو گی۔ وہ جانور ہوں گے کیونکہ جانور کبھی نہیں بدلتے اور انسان دوسرے کے سلوک کے مطابق بدل جاتا ہے۔''

''ہاں میرے دشمن کچھ ایسے ہی جانور فطرت لوگ ہیں۔'' میں نے تسلیم کیا۔

''آپ سے محبت کرنے والے زیادہ ہوں گے۔''

''ہاں یہ اوپر والے کا احسان ہے۔''

''بہت سی لڑکیاں بھی آپ سے محبت کرتی ہوں گی۔'' اس نے کہا تو میں نے چونک کر اسے دیکھا اس نے آج تک اس بارے میں کوئی سوال نہیں کیا تھا۔ میرا ذاتی تجربہ ہے جب کوئی لڑکی کسی آدمی سے یہ سوال کرتی ہے تو درحقیقت وہ جاننا چاہتی ہے کہ وہ آدمی کسی اور لڑکی سے تو محبت نہیں کرتا یا کوئی لڑکی اسے تو نہیں چاہتی۔ پوچھنے والی کے دل میں لازمی اس آدمی کے لیے پسند کا جذبہ ہوتا ہے۔ مگر میں روبیر کو ایسا سمجھنے کو تیار نہیں تھا۔ وہ خود شامین سے محبت کرتی تھی اور محبت بھی کیسی کہ وہ اس کے لیے میری جان لینے سے لے کر اپنی آبرو تک سب قربان کرنے کو تیار ہو گئی تھی۔ میں نے جواب دیا۔

''ہاں کئی ہیں۔''

''آپ بھی ان کو پسند کرتے ہیں؟''

''سب کو نہیں۔''

''کسی ایک کو کرتے ہوں گے۔'' اس نے اصرار کیا۔

''ہاں ایک ہے۔'' میں نے تسلیم کیا تو بہت دنوں کے بعد سویرا میرے ذہن کے پردے پر آئی تھی۔ یاد تو اس کی کبھی نہیں جاتی تھی مگر میں نے اسے فرصت سے نہیں سوچا تھا۔ روبیر نے شاید دوسری بار پوچھا تو میں چونکا۔ ''کیا پوچھا تم نے؟''

وہ معنی خیز انداز میں مسکرائی۔ ''میں پوچھ رہی ہوں کہ وہ کون ہے؟''

''وہ کون ہے؟'' میں نے روبیر کا سوال دہرایا اور پھر اس کی طرف دیکھا۔ ''وہ میرا سب کچھ ہے۔ میرے لیے دنیا کی پہلی اور آخری عورت ہے۔''

میرا جواب بہت واضح تھا۔ روبیر کچھ دیر مجھے دیکھتی رہی اور پھر گہری سانس لے کر بولی۔ ''آپ جیسا آدمی ایسا ہی سوچ سکتا ہے۔''

''میں نہیں ہر محبت کرنے والا ایسا ہی سوچتا ہے۔''

''شاید۔'' اس نے کہا۔ وہ اداس نظر آنے لگی تھی۔

''شاہین کے لیے تم ایسی ہی ہو گی۔ وہ تم سے سچی محبت کرتا ہے تو کسی اور کے بارے میں سوچے گا نہیں۔''

اس نے پھر میری طرف دیکھا۔ ''وہ شاہین ہے اور ہر شخص شہباز نہیں ہوتا۔''

روبیر نے اگرچہ تجسس یا کسی اور مقصد کے تحت پوچھا تھا مگر اس کی باتوں سے مجھے میرے اپنے یاد آنے لگے۔ میری گم شدگی کو مہینا ہونے والا تھا یا ہو چکا تھا۔ وسیم، سفیر اور عبداللہ آرام سے نہیں بیٹھے ہوں گے۔ مجھے شبہ تھا کہ وہ میری تلاش میں چل پڑے ہوں گے اور وادی تک پہنچنے کی کوشش کر رہے ہوں گے۔ راجا عمر دراز پتا نہیں کہاں تھا۔ زندہ بھی تھا یا نہیں اور اوشا کے بارے میں مجھے اطمینان تھا کہ وہ برف والے کی حفاظتی تحویل میں تھی۔ اسے وہاں کوئی خطرہ نہیں تھا۔ میرے دشمن ڈیوڈ شا اینڈ کمپنی نیچے پہنچ گئے تھے اور وہ اس وقت ریناٹ کے مہمان تھے۔ ڈیوڈ شا نے یقیناً کوئی چکر چلایا تھا۔ دوسری قوموں میں مفاد پرست غدار تلاش کرنے میں انگریز اپنا ثانی نہیں رکھتے ہیں۔ یہ جہاں گئے انہوں نے اسی طرح سے غلبہ حاصل کیا اور پورے پورے ملکوں اور قوموں کو غلام بنا لیا۔ خاص طور سے برصغیر پر ان کا قبضہ ان کی مکارانہ سیاست کی مثال ہے۔

ڈیوڈ شا کا خیال آتے ہی میں بے چین ہو گیا تھا۔ وہ ریناٹ کے ساتھ تھا اور اس کی مدد سے ریناٹ کی طاقت دوگنی ہو گئی تھی۔ ڈیوڈ شا آتشیں اسلحہ ساتھ لایا تھا اور اس کا مقابلہ سامیرا کی سپاہ نہیں کر سکتی تھی۔ مجھے ان ہتھیاروں کا خیال آیا جو راجا عمر دراز لایا تھا اور وہ اس وقت برف والے کے پاس تھے پھر میں نے برف والے کے پاس دوسرے آتشیں ہتھیار بھی دیکھے تھے۔ اگر وہ مجھے مل جاتے تو میں کہیں بہتر انداز میں ڈیوڈ شا اور ریناٹ کا مقابلہ کر سکتا تھا۔ اب تک مجھے ان ہتھیاروں کا خیال نہیں آیا تھا۔ ورنہ میں کسی طرح سے برف والے تک اپنی بات پہنچا سکتا تھا۔ اب خیال آیا تو مجھے ربیک کا خیال بھی آیا۔ اسی کے توسط سے سامیرا تک اور سامیرا سے برف والے تک اپنی بات پہنچا سکتا تھا۔ جنگ سے پہلے مجھے یہ ہتھیار مل جاتے تو میری طاقت میں کئی گنا اضافہ ہو جاتا۔ وادی کے روایتی ہتھیاروں کے ساتھ میری طاقت بہت کم تھی۔

ربیک ایک دن پہلے ہی گیا تھا اور اب وہ پرسوں آتا۔ میں نے سوچا کہ درمیان میں ایک دن جو تھا اس میں ہم مزید کوئی مہم سر کر سکتے تھے۔ شام ہوتے ہی وہ سب اوپر آ گئے تھے۔ کھیل کے بعد وہ ندی کی طرف چلے گئے اور وہاں نہاتے دھوتے رہے تھے جب وہ نیچے ہوتے تو اپنے ہتھیار پاس رکھتے تھے اور پوری طرح چوکنا رہتے تھے اگرچہ اس دن مار کھا کر اسماروں نے دوبارہ یہاں کا رخ نہیں کیا تھا مگر ان کا یا دوسرے خطرناک جانوروں کا خطرہ بہرحال موجود رہتا تھا۔ رات کھانے کے بعد میں نے میٹنگ کی اور اگلے روز کی مہم کے بارے میں بات کی تو وہ سب پُرجوش ہو گئے تھے۔ یہ لوگ چھاپہ مار جنگ سے لاعلم تھے اور سیدھی جنگ سے واقف تھے جس میں دونوں طرف سے پوری قوت سامنے لائی جاتی تھی اور پھر لڑ کر فیصلہ کر لیا جاتا تھا۔ ایک نسل پہلے وہ سرے سے جنگ سے ہی ناآشنا تھے اور ان کی ساری جدوجہد فطرت اور وحشی جانوروں کے خلاف ہوتی تھی کیونکہ وہی ان کے لیے سب سے بڑا خطرہ تھے۔ اب وادی کے انسان ایک دوسرے کے مدمقابل آ گئے تھے۔ پہلی بار انہیں آپس میں لڑنا پڑ رہا تھا۔

مقابلہ آرائی انسان کی فطرت ہے۔ چیزوں اور زمین کے پیچھے انسان ابتدائی دور سے لڑتا آ رہا ہے۔ زن سے شروع ہونے والی لڑائی پھر زمین اور اب زر تک پھیل گئی تھی۔ ان سب کے پس پشت جذبہ حکمرانی کارفرما تھا۔ ان نوجوانوں کے لیے یہ بہت تھرل والا کام تھا۔ جنگ کا خطرہ تھا مگر انہیں اب تک اس کا براہِ راست تجربہ نہیں ہوا تھا۔ یہ پہلا موقع تھا جب انہوں نے آرگون کی سپاہ سے پنجہ آزمائی کی تھی اور اس میں کامیابی بھی حاصل کی تھی۔ اس کامیابی نے ان کا حوصلہ اتنا بڑھا دیا تھا کہ وہ براہِ راست دھاوے کا

بھی سوچ رہے تھے۔ ایرٹ نے ان کی طرف سے تجویز
پیش کی کہ ہمیں اب باغوں میں گھس کر وہاں موجود سپاہیوں
پر حملہ کرنا چاہیے۔ انہیں یقین تھا کہ آرگون والے ان کا
مقابلہ نہیں کر سکیں گے۔ میں نے نفی میں سر ہلایا۔ ''میرا یہ
مقصد نہیں ہے کہ باغ کے سپاہیوں پر حملہ کرتا رہوں۔''
ایرٹ حیران ہوا۔ ''تب آپ کا کیا مقصد ہے اور کل
والا حملہ کیوں کیا تھا؟''
''کل والا حملہ اور جو حملہ ہم کل کرنے کی کوشش کریں
گے یہ سب آنے والے بڑے مقصد کی تیاری ہے۔''
''بڑا مقصد؟''
میں نے سر ہلایا۔ ''ہم براہِ راست جنگ میں شامل
نہیں ہوں گے بلکہ جس وقت آرگون والے قلعے سے نکل کر
ہمارے قلعوں پر حملہ آور ہوں گے ہمیں آرگون میں گھس کر
وہاں قبضہ کرنا ہوگا۔''
یہ بات ان کے لیے ناقابلِ یقین تھی۔ ''آرگون پر
قبضہ اور ہم سات آٹھ افراد کریں گے؟''
''قبضے سے مراد شہر پر قبضہ نہیں ہے بلکہ ہمیں ان تمام
لوگوں کا خاتمہ کرنا ہے جو اس فتنے کے پیچھے ہیں۔ ان میں
ریناٹ اور اس کے ساتھی سرفہرست ہیں۔''
ایمار ہچکچایا۔ ''اب معبد والے بھی اس کے ساتھ ہیں۔''
''شاید تم کہنا چاہ رہے ہو کہ ہمیں مہا پجاری اور
دوسرے پجاریوں کا مقابلہ کرنا پڑے گا۔'' میں نے نرمی
سے کہا۔ ''اس کے لیے انہوں نے ہی ہمیں مجبور کیا ہے۔ وہ
غیر جانبدار رہتے تو ہم بھی غیر جانبدار رہتے مگر اب یہ ممکن
نہیں ہے۔ بہرحال ہمارا اصل نشانہ ریناٹ اور اس کے
ساتھی ہیں۔ ان میں وہ لوگ بھی ہیں جو باہر سے آئے ہیں
اور میرے اصل دشمن وہی لوگ ہیں۔''
بات رفتہ رفتہ ان کی سمجھ میں آنے لگی اور جب
میں نے اصل مہم ان کے سامنے رکھی تو ان کا جوش و جذبہ ذرا
ماند پڑا تھا اور وہ سنجیدہ ہونے کے ساتھ کسی قدر خوفزدہ بھی نظر
آنے لگے اور یہ اچھی بات تھی۔ وہ معاملے کی سنگینی کو محسوس کر
رہے تھے۔ اگر وہ اسے بے پروائی سے لیتے تو لازمی بات تھی
وہ اس کے لیے ویسی تیاری نہ کرتے۔ ایرٹ نے بھی وہی
بات کی۔ ''اس کا مطلب ہے ہمیں پہلے سے زیادہ تیاری
کرنی ہے۔ اتنی تیاری جو ہمیں کامیابی دلا سکے؟''
''بالکل، تیاری کے دوران ہم جتنے مشکل مراحل
سے گزریں گے آگے ہمیں اتنی مشکل نہیں ہوگی۔''
''ہمارے پاس افراد کم ہیں۔'' ایمار بولا۔ ''یہ اتنے یا
اور اتنے ہی لوگوں کے بس کی بات نہیں ہے۔''
میں نے سر ہلایا۔ ''تم ٹھیک کہہ رہے ہو ہمیں مزید
افرادی قوت کی ضرورت ہے مگر مجھے ایک ایک بندہ تم لوگوں
کی طرح چنا ہوا چاہیے۔ کوئی کمزور یا غدار ہمارے درمیان
آ گیا تو وہ پوری مہم کی ناکامی کا باعث بن سکتا ہے۔''
''ریبک اس معاملے میں بہت محنت کر رہا ہے۔''
ایرٹ نے کہا۔ ''اسی نے ہمیں چنا اور ہم سے بات کی۔ پھر
سامیرا سے ملاقات کرائی اور تب ہمیں آپ کے پاس آنے کا
موقع ملا۔ وہ اس کام کے لیے اور نوجوان بھی چن رہا ہے۔''
''درحقیقت ہمارے پاس وقت نہیں ہے کیونکہ
آرگون والے کسی وقت بھی حملہ کر سکتے ہیں۔''
''اگر انہوں نے کل حملہ کر دیا تو؟'' ایمار نے پوچھا۔
''تب ہمیں فوری آرگون کا رخ کرنا ہوگا۔'' میں نے
فیصلہ کن لہجے میں کہا۔ ''ہم مزید لوگوں کے آنے کا انتظار
نہیں کر سکتے ہیں۔''
''مگر ہم آرگون میں داخل کیسے ہوں گے؟''
ایرٹ کے اس سوال کا جواب میں نے ٹالنے والا
دیا۔ ''یہ میں تمہیں عملی طور پر دکھاؤں گا۔''
جب وہ سب سونے کے لیے لیٹے تو متفکر تھے۔ ان کا
کھلنڈرا پن مفقود ہو گیا تھا۔ یہ ضروری تھا کیونکہ جوانی کے
جوش کے ساتھ اگر ہوش شامل ہو جائے تو مقصد میں کامیابی
کے امکانات بڑھ جاتے ہیں۔ روبیر زیادہ تر ترجمہ کرتی رہی
تھی اور اس نے گفتگو میں حصہ نہیں لیا تھا مگر مجھے لگ رہا تھا
کہ وہ مجھ سے بات کرنے کے لیے بیتاب تھی۔ ایسا ہی ہوا
جب سونے کے لیے لیٹ گئے تو وہ کیبن سے باہر آئی اور مجھ
سے کہا۔ ''آپ سے بات کرنی ہے۔''
میں سمجھ گیا تھا۔ وہ مجھے کیبن میں لے جانا چاہتی تھی
مگر میں نے مناسب نہیں سمجھا کہ یوں سب کے ہوتے
صرف اس کے ساتھ کیبن میں چلا جاؤں۔ پہلے ہی اس کے
حوالے سے مجھ پر سنگین الزام لگ چکا تھا۔ اگرچہ یہ نوجوان
مجھ پر یقین کر رہے تھے مگر انسان کا ذہن ذرا سی بات سے
بھٹک جاتا ہے اور میں انہیں اس ذرا سی بات کا موقع ہی نہیں
دینا چاہتا تھا۔ اس لیے روبیر کے ساتھ ٹیلے کے سیڑھی والے
حصے تک آیا۔ نوجوان اس جگہ سے کسی قدر فاصلے پر تھے اور
وہ ہماری گفتگو نہیں سن سکتے تھے، مگر وہ ہمیں دیکھ رہے تھے
اور ہم ان کی نظروں کے سامنے تھے۔ روبیر نے چھوٹتے ہی
پوچھا۔ ''آپ آرگون میں داخل ہوں گے؟''
''یہ بات تو تمہیں معلوم ہے میرا اصل مقصد ہی شہر

کے اندر خاص حصے تک رسائی حاصل کرنا ہے۔"

"تو کیا میں ساتھ چلوں گی۔"

ہم ٹیلے کے کنارے پاؤں لٹکائے بیٹھے تھے اور یہاں مشعل کی ہلکی سی روشنی آرہی تھی۔ روبیر کے اس سوال سے واضح ہو گیا کہ وہ مجھ سے کیا بات کرنا چاہ رہی تھی۔ میں نے اس کی طرف دیکھا اور نرمی سے کہا۔ "مجھے شامین کا خیال ہے لیکن پہلے ہمیں ان لوگوں سے نمٹنا ہے جنہوں نے شامین اور اس جیسے بہت سے بے گناہوں کو قید کیا ہوا ہے۔ وہ ہمارے قابو میں آگئے تو شامین اور دوسرے خود آزاد ہو جائیں گے لیکن اگر ہم نے پہلے قیدیوں کو آزاد کرانے کی کوشش کی اور دشمن ہوشیار ہو گیا تو ہمارا پورا منصوبہ ناکام ہو جائے گا۔"

روبیر نے میرا جواب سمجھ لیا تھا، اس کی آنکھیں چمکنے لگیں مگر اس نے سر ہلایا۔ "میں سمجھ رہی ہوں اور میں آپ سے متفق ہوں۔"

"میں تم سے وعدہ کر چکا ہوں کہ شامین کو آزاد کرانے کی پوری کوشش کروں گا۔ یہ میرے مقاصد میں شامل ہے۔"

"مجھے یقین ہے آپ ایسا ہی کریں گے۔"

واپس آنے کے بعد اس نے جنگی وردی اتار کر اپنا سفید لباس پہن لیا تھا۔ مگر اس کے نیچے اس نے پاجامہ وردی والا ہی پہنا ہوا تھا۔ اس پر جنگی لباس بھی سج گیا تھا مگر وہ سفید کرتے میں ہی زیادہ اچھی لگتی تھی۔ اس نے اچانک نزدیک ہو کر مجھ سے لگتے ہوئے میرے شانے پر سر رکھ دیا اور آہستہ سے بولی۔ "مجھے آپ کا ہی سہارا ہے۔"

میں خفیف ہوا تھا کیونکہ وہ دیکھ رہے تھے۔ اگرچہ ہماری طرف متوجہ نہ تھے۔ ردِعمل میں میں نے اس کا سر تھپتھپایا۔ "تم بھی سو جاؤ کل شاید ایک اور سخت دن ہمارا منتظر ہے۔"

وہ چند لمحے اسی طرح لگی رہی پھر الگ ہو کر کھڑی ہو گئی۔ اس کے جانے کے بعد بھی میں ٹیلے کے کنارے بیٹھا رہا اور روبیر کے گزشتہ چوبیس گھنٹے کے طرزِعمل پر غور کرتا رہا۔ اس کے انداز میں تبدیلی آئی تھی مگر یہ اتنی خفیف تھی کہ اگر میں غیر معمولی حساس نہ ہوتا تو شاید مجھے پتا بھی نہ چلتا مگر میری چھٹی حس کہہ رہی تھی کہ میرے لیے روبیر کے اندر جذبات میں تبدیلی آئی تھی اور اس کی جسمانی حرکات اسی تبدیلی کے زیرِاثر تھیں۔ وہ جس طرح بار بار میرے نزدیک آرہی تھی۔ اپنے وجود کے حوالے سے میرے سامنے بے پرواہ ہو رہی تھی۔ لفظوں سے مجھ سے قربت جتا رہی تھی۔ یہ سب اشارہ کر رہے تھے اور مجھے سمجھا رہے تھے۔ بہرحال میرے لیے یہ نئی بات نہیں تھی اس سے پہلے بھی میرے نزدیک آنے والی کئی لڑکیاں میرے طرزِعمل سے غلط فہمی کا شکار ہوئیں یا پھر انہوں نے اسے اپنا استحقاق سمجھا۔ انہوں نے سمجھا کہ میں ان کی پیش قدمی کے آگے ہتھیار ڈال دوں گا۔ جیسا کہ مرد حضرات کا شیوہ ہے۔

مجھے دعویٰ پارسائی کبھی نہیں رہا۔ مگر میں صنفِ نازک میں ایک خاص حد سے زیادہ دل چسپی کا قائل نہیں ہوں۔ مجھے بھی وجودِ زن کا آس پاس ہونا اچھا لگتا ہے مگر ساتھ ہی میں ان سے ایسے محتاط رہتا ہوں جیسے گلاب کی خوشبو اور تازگی سے لطف اندوز ہونے والا اس کے کانٹوں سے ہوشیار رہتا ہے۔ جو گلاب توڑتے ہیں انہیں کانٹے بھی برداشت کرنا پڑتے ہیں۔ اس لیے جن جن خواتین نے پیش قدمی کی بالآخر انہوں نے جان لیا کہ میں اس فطرت کا آدمی نہیں ہوں۔ آدمی ایک عورت سے ہی محبت کرتا ہے۔ ممکن ہے بعض دو تین بار بھی محبت کر لیتے ہوں۔ مشتاق احمد یوسفی نے شادی کے حوالے سے کیا خوب کہا ہے کہ ایک شادی ضرورت، دوسری عیاشی اور اس کے بعد نری بدمعاشی ہوتی ہے۔ محبت کے بارے میں میرا تقریباً یہی خیال ہے۔

ضروری نہیں تھا کہ روبیر کے بارے میں میرا خیال درست ہوتا۔ وہ مجھ سے کسی اور انداز میں متاثر ہو سکتی تھی اس کے باوجود میں نے محتاط رہنے کا فیصلہ کیا۔ میں نے ٹیلے پر گھاس والا حصہ اپنے لیے مخصوص کر لیا تھا اور بستر آگئے تو میں اس پر بستر بچھا کر لیٹ جاتا تھا۔ آج بھی پہرے کے لیے میں ہی جاگ رہا تھا۔ اندازے سے نصف رات کے قریب میں نے ایرٹ اور شاٹ کو اٹھا دیا۔ ان سے کہنے کی ضرورت نہیں تھی۔ انہوں نے منہ پر پانی کے چھینٹے مارے اور مستعد ہو گئے۔ میں سونے کے لیے لیٹ گیا۔ صبح میری آنکھ روبیر کے ہلانے سے کھلی۔ وہ میرے شانے کو سہلا رہی تھی اور کہہ رہی تھی۔ "اٹھ جائیں ناشتا تیار ہے۔"

میں نے اس کا ہاتھ نہیں ہٹایا مگر یوں اٹھا کہ اس کا ہاتھ خود ہٹ گیا تھا۔ وہ صرف سہلا نہیں رہی تھی۔ اپنی ہتھیلی کی نرمی اور گرمی میرے شانے میں جذب کر رہی تھی۔ وہ گھٹنوں کے بل اتنے نزدیک ہی بیٹھی تھی کہ میں اس کے وجود سے اٹھتی مہک محسوس کیے بغیر نہ رہ سکا۔ میں نے دیکھا ان پانچوں میں سے وہاں کوئی نہیں تھا۔ وہ سب نیچے جا چکے تھے۔ میں نے ان کا پوچھا۔ "انہوں نے ناشتا کر لیا ہے۔"

"ہاں انہوں نے کر لیا ہے۔" وہ اٹھتے ہوئے

بولی۔ ”آپ بھی کرلیں۔“

پہلے میں نیچے آیا ضروریات سے فارغ ہوکر ندی کے سرد پانی سے خود کو تروتازہ کیا اور پھر ناشتے کے لیے اوپر آیا۔ ایرٹ اور اس کے ساتھی نیچے خوش گپیوں میں مصروف تھے۔ ویسے وہ پوری طرح تیار ہوگئے تھے۔ جب میں ناشتا کررہا تھا تو انہوں نے ٹیلے کے اوپر پانی پہنچایا۔ مچھلیوں کا شکار بھی انہوں نے کرلیا تھا بیل کی خشک ڈوریوں میں پروئی ہوئی کئی مچھلیاں ٹیلے پر کیبن سے لٹکی ہوئی تھیں۔ روبیر نے انہیں صاف کرنا شروع کیا اور پھر مجھ سے کہا۔ ”مجھے نہانا ہے۔“

”ٹیلے پر نہالو خاصا پانی ہے۔“

”نہیں۔“ اس نے مچل کر کہا۔ ”مجھے ندی میں نہانا ہے۔ آپ میرے ساتھ چلیں۔“

”وہ لوگ بھی نیچے ہیں۔“ میں نے جواب دیا۔

”مجھے صرف آپ پر اعتبار ہے۔ آپ وہاں موجود ہوں گے تو میں نہاؤں گی ورنہ نہیں نہاؤں گی۔“ اس نے منہ پھلا کر کہا اور میری تشویش بڑھ گئی کیونکہ یہ انداز محبوبی تھا۔

”تب ایسا کرتا ہوں ان لوگوں کو ٹیلے پر بلالیتا ہوں۔“

”اور اگر وہاں کوئی جانور آگیا تو......؟“

مجبوراً مجھے بھی نیچے آنا پڑا۔ اس نے ندی کی طرف جانے سے پہلے کہا۔ ”آپ جھاڑیوں کے اس طرف رہیے گا کوئی ندی کی طرف نہ آئے۔“

”کوئی نہیں آئے گا۔“ میں نے اسے یقین دلایا۔

روبیر ندی کی طرف چلی گئی۔ ایرٹ اور اس کے ساتھی رسی اور لکڑی کی سیڑھی کی مدد سے ٹیلے پر تیزی سے چڑھنے اور اترنے کا مقابلہ کررہے تھے۔ میں انہیں دیکھنے لگا۔ اچانک روبیر کی چیخ سنائی دی۔ چیخ میں خوف تھا مگر میں نے جھاڑیوں کے دوسری طرف جانے سے گریز کیا اور یہیں سے پوچھا۔ ”کیا ہوا ہے؟“

”شہباز آپ ادھر آئیں کوئی اور نہ آئے، جلدی۔“

روبیر کی چیخ ان لوگوں نے بھی سن لی تھی اور پھر اس نے دوسروں کو آنے سے منع کرتے ہوئے صرف مجھے بلایا تھا تو یہ بھی انہوں نے سنا اور جو آگے بڑھ رہے تھے وہیں رک گئے۔ میں جھاڑیوں کے دوسری طرف آتا تو روبیر سامنے والے حصے کو کرتے سے ڈھانپے ہوئے ندی کے کنارے پنجوں کے بل بیٹھی ہوئی تھی مگر اس نے کرتہ پہنا ہوا نہیں تھا صرف سامنے کیا ہوا تھا۔ اس کے بال اور جسم گیلا تھا۔ بہ ظاہر وہ ٹھیک لگ رہی تھی۔ ”کیا ہوا ہے؟“

”شہباز دیکھیں میری پشت پر کیا چپک گیا ہے مجھے بہت تکلیف ہورہی ہے۔“

اس کی پشت لباس سے خالی تھی۔ جیسے ہی میں اس کی پشت پر آیا اس کی شفاف کمر پر چپکی ہوئی سیاہی مائل سبز چیز نظر آگئی۔ وہ جس طرح چپکی ہوئی تھی۔ مجھے لگا کہ یہ جونک کی کوئی قسم ہے مگر جونک لگے تو تکلیف نہیں ہوتی ہے اور اکثر اوقات آدمی کو پتا بھی نہیں چلتا ہے، کیونکہ جونک چپکتے ہی جلد اور گوشت کو سن کرنے والا زہر انجکٹ کرتی ہے تاکہ جاندار کو پتا نہ چلے اور وہ تادیر اس کا خون پی سکے۔ میں نے ناخن سے اسے جلد سے الگ کرنے کی کوشش کی مگر وہ اتنی مضبوطی سے چپکی ہوئی تھی کہ شاید روبیر کی کھال کے ساتھ ہی الگ ہوتی۔ میں نے اس سے پوچھا۔ ”نہیں اور تکلیف تو نہیں ہے؟“

”نہیں۔“ وہ رو دینے والے انداز میں بولی۔ ”بس نہیں ہے۔ یہ کیا چیز ہے؟“

”کوئی کیڑا ہے جو سختی سے تمہاری کھال سے چپک گیا ہے۔ تم ندی سے ذرا آگے آ جاؤ ویسے یہ پانی میں ہی لگا تھا؟“

”ہاں میں نہا رہی تھی کہ کمر میں تکلیف ہوئی میں نے ہاتھ لگا کر دیکھا اور پھر اسے الگ کرنے کی کوشش کی مگر یہ الگ نہیں ہوئی۔ تب میں ندی سے باہر آگئی اور آپ کو پکارا۔“

میں نے دیکھا جونک نما کیڑے کا سائز بڑھ رہا تھا یعنی وہ خون پی کر بڑھ رہی تھی۔ میں نے سوچا اور روبیر کے توسط سے ایرٹ سے کہا۔ ”اوپر چولہے کے انگاروں سے ایک چاقو تیز گرم کرکے لے کر آؤ۔ جلدی چاہیے۔“

روبیر کی بات سن کر ایرٹ مستعدی سے اوپر چڑھ گیا۔ روبیر اسی طرح بیٹھی ہوئی تھی اور کرتے سے اپنا جسم ڈھانپنے کی کوشش کررہی تھی۔ میں نے اسے سے کہا۔ ”میں دوسری طرف جارہا ہوں تم پاجامہ اور کرتہ پہن لو۔“

”اور یہ......“ اس نے ہراساں انداز میں اپنی کمر سے چپکی جونک کی طرف اشارہ کیا۔

”اسے بھی نکالتا ہوں۔“ میں نے کہا اور دوسری طرف آگیا۔ دو منٹ بعد ایرٹ اوپر سے چاقو لیے نمودار ہوا اور میں نے اس سے چاقو لیتے ہوئے روبیر سے پوچھا۔ ”آجاؤں۔“

”جی۔“ اس نے کہا تو میں ندی کی طرف آیا۔ روبیر نے پاجامہ اور کرتہ پہن لیا تھا مگر عقب سے کرتا اٹھایا ہوا تھا۔ میں نے اس سے کرتہ پکڑنے کو کہا اور دہکتا ہوا سنگی چاقو کیڑے کو لگا دیا۔ چرچراہٹ کی آواز کے ساتھ ہی اس نے بل کھا کر روبیر کی کمر کو چھوڑنا شروع کردیا۔ میں چاقو اس کے جسم میں اتار رہا تھا اور ساتھ ہی کوشش کررہا تھا کہ روبیر کو

چاقو نہ لگے۔ مگر جب جونک اس کا جسم چھوڑ رہی تھی تب بھی اسے تکلیف ہوئی۔ وہ کراہنے لگی۔ ایک منٹ میں کیڑا اس حد تک الگ ہوا کہ میں نے کسی قدر ٹھنڈے ہو جانے والے چاقو سے کام لیتے ہوئے اسے اکھاڑ دیا۔ جہاں سے اسے زبردستی الگ کیا تھا وہاں روبیر کو زخم آیا اور اس نے چیخ ماری تھی۔ زخم سے خون چھلک آیا تھا۔ میں نے پہلے کیڑے کو نیچے گرا کر اسے جوتے سے مسل دیا۔ اس میں بھرا ہوا روبیر کا خون مٹی پر بکھر گیا تھا۔

”ہٹ گیا؟“ روبیر نے پوچھا۔

”ہاں لیکن زخم ہے۔“ میں نے بتایا۔ ”اوپر چلو اس پر دوا لگاتے ہیں۔“

ربیک اس بار دواؤں کا ایک تھیلا بھی لایا تھا اور اس نے مجھے بتایا تھا کہ کس قسم کی تکلیف یا بیماری میں کون سی دوا دینی ہوگی۔ یہ دوائیں سامیرا نے بھجوائی تھیں۔ میرے زخم ویسے تو تیزی سے بھر جاتے ہیں مگر پرسوں ہونے والے مقابلے میں لگنے والے زخموں پر میں نے یہ مرہم لگایا تھا اور اس وقت میرے ہاتھ اور پاؤں سے لگ ہی نہیں رہا تھا کہ یہاں کوئی زخم بھی لگا ہے۔ اوپر لا کر میں نے ربیک کے زخم پر وہی مرہم لگایا تو اسے تکلیف میں فوراً آرام آگیا۔ اس سے فارغ ہو کر میں نے ایرٹ اور اس کے ساتھیوں سے کہا کہ وہ اب ندی کی طرف جاتے اور وہاں نہاتے ہوئے محتاط رہیں۔ انہوں نے بھی مرا ہوا کیڑا دیکھا تھا۔ ایرٹ نے مجھ سے کہا۔ ”یہ بہت خطرناک ہوتا ہے آدمی کو ایک بار چپک جائے تو بہت مشکل سے چھوڑتا ہے۔“

”اسے چھڑانے کی واحد ترکیب یہی ہے کہ اسے گرم چیز لگاؤ۔ اسے تکلیف ہوگی تو یہ آدمی کو چھوڑ دے گا۔“

”اس کے چپکنے سے تکلیف بھی بہت ہوتی ہے کیونکہ یہ کانٹے نما پنجے کھال میں اتار دیتا ہے۔“

”بس تو اب محتاط رہنا۔“

”روبیر کو کچھ دوائیاں بھی لینا ہوں گی کیونکہ اس کا زہر طبیعت خراب کرتا ہے۔“

ایرٹ کا کہنا درست ثابت ہوا۔ ہم اوپر آئے تو روبیر بخار جیسی کیفیت میں تھی۔ اسے سانس لینے میں بھی دشواری ہو رہی تھی۔ ایرٹ نے دواؤں کے تھیلے میں سے دیکھ کر بتایا کہ اسے کون سی دوائیاں دینی ہیں اور میں نے روبیر کو وہ دوائیاں دے دیں۔ وہ نڈھال سی ہو کر لیٹ گئی۔ میں سوچ رہا تھا کہ آج کی مہم ملتوی کر دوں کیونکہ روبیر کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی اور میں اسے چھوڑ کر جانا نہیں چاہتا تھا۔ مگر ایرٹ اور اس کے ساتھی بیتاب تھے۔ ایرٹ نے کہا۔ ”جناب ہم شام کے قریب چلیں گے اور زیادہ دیر نہیں لگائیں گے۔“

میں نے انکار کیا۔ ”آرگون کی طرف جانے اور آنے میں بہت وقت لگ جاتا ہے اور میں روبیر کو اتنی دیر کے لیے اکیلا نہیں چھوڑ سکتا۔“

”اگر ہم قلعوں کی طرف جائیں اور وہاں آرگون کے باغات کا حصہ لگتا ہے۔ ہم وہاں کارروائی کر سکتے ہیں۔“ ایرٹ کا اصرار جاری رہا۔ ”اس میں آدھا وقت لگے گا۔“

خلافِ توقع روبیر نے اس کی تائید کی۔ ”یہ ٹھیک کہہ رہا ہے اس طرف آنے جانے میں اتنا وقت نہیں لگتا ہے۔ آپ چلے جائیں، مجھے کوئی مشکل نہیں ہوگی۔ میں آرام کرتی رہوں گی۔“

سامیرا کے قلعوں کی طرف جاتے ہوئے راستے میں پہلے آرگون کے باغ اور کھیت آتے تھے۔ یہ جگہ یہاں سے مشکل سے آدھے گھنٹے کی مسافت پر تھی۔ ان سے بچ کر قلعوں کی طرف جاتے ہوئے ہمیں جنوب کی طرف سے گھوم کر جانا ہوتا تھا۔ میں نے غور کیا اور راضی ہو گیا۔ روبیر سے کہا۔ ”تم آرام کرو، ہم جلد واپس آنے کی کوشش کریں گے۔“

”میں رہ لوں گی۔“ اس نے یقین سے کہا تو میں نے ایرٹ کی طرف دیکھ کر اثبات میں سر ہلایا۔ وہ خوش ہو گیا۔ اس دن دوپہر کا کھانا ہم مردوں نے تیار کیا۔ روبیر نے کھانے سے انکار کیا تھا۔ کھا پی کر کچھ آرام کیا اور شام ہوتے میں تیاری کرنے لگا۔ روبیر آرام کرتی رہی تھی اور پھر اسے دوا بھی مل گئی تھی اس لیے اس کی حالت بہت بہتر ہو گئی تھی۔ کچھ دیر میں ہم چھ افراد پوری طرح مسلح اور تیار ہو کر ٹیلے سے نیچے اترے۔ ایرٹ اور اس کے ساتھی جان گئے تھے کہ ان کی کہی بات میں براہِ راست سمجھ لیتا تھا مگر اپنی بات ان تک پہنچانے کے لیے مجھے روبیر کا سہارا لینا پڑتا تھا۔ روبیر ساتھ نہیں تھی اس لیے اب مجھے اپنی بات اشاروں سے سمجھانی تھی۔ روبیر کی مدد سے میں نے پہلے ہی طے کر لیا تھا کہ میں کون سا اشارہ... کروں تو اس کا کیا مطلب ہوگا۔ دس بارہ اشارے مخصوص کر لیے تھے اور ان کی مدد سے میں ان سے اپنی بات کہہ سکتا تھا۔ اس کے باوجود مجھے ان سے بات کرنے میں کچھ نہ کچھ دشواری پیش آتی۔ ہم جنگل سے باہر آئے اور جھاڑیوں سے بھرے میدان سے ہوتے ہوئے آرگون کی زمینوں کی طرف جانے لگے۔

اس طرف جاتے ہوئے ہمیں محتاط رہنا تھا کیونکہ یہاں آرگون اور سامیرا کے قلعوں اور دونوں طرف کی

زمینیں آپس میں مل رہی تھیں۔ آرگون والے میرے دشمن تھے مگر سامیرا کے سپاہی بھی اب میرے دشمن تھے۔ سومرد نے مجھے قلعے سے نکالتے ہوئے بتایا تھا کہ اگر میں قلعے کے سپاہیوں کو نظر آیا تو وہ مجھے گرفتار کرلیں گے اور اس بار عدالت سے مجھے سزائے موت سنائی جائے گی۔ ایرٹ اور اس کے ساتھی بھی جانتے تھے اس لیے وہ آگے تھے اور مجھے پیچھے رکھا تھا۔ حالانکہ اس کا کوئی فائدہ نہیں تھا اگر ان کا سامنا سامیرا کے سپاہیوں سے ہوتا تو ہماری وردیوں کی وجہ سے وہ ہمیں دشمن ہی سمجھتے اور اگر ہم وضاحت کی کوشش کرتے تو یہ وضاحت الٹا ہمارے گلے پڑ جاتی۔ آدھے گھنٹے بعد ہم باغات کے نزدیک تھے۔ یہاں باغ کم تھے اور کھیت زیادہ تھے جن میں اب گندم نما پودے کی فصل پانچ فٹ سے اوپر جا چکی تھی۔ اب اس میں روپوش ہونا زیادہ مشکل نہیں تھا۔

مگر ہمارا مقصد آرگون کے سپاہیوں کے خلاف چھاپہ مار کارروائی کرنا تھا۔ سپاہی باغوں میں ہی موجود ہو سکتے تھے۔ کھیتوں میں گھسنے کی کوئی تک نہیں تھی۔ ہمیں باغوں میں آرگون کے سپاہیوں کو تلاش کرنا تھا۔ یہاں گھاس کے میدان نہیں تھے کیونکہ یہاں خطرناک جانوروں کی... آمدورفت بہت کم تھی۔ اس لیے میدان صاف کرنے کی ضرورت بھی محسوس نہیں کی گئی تھی اور یہاں جابجا جھاڑیاں تھیں۔ ان کی آڑ لیتے ہوئے ہم ایک باغ کے نزدیک جانے لگے۔ فی الحال یہاں نہ تو کوئی سپاہی نظر آرہا تھا اور نہ ہی باغ میں کام کرنے والے۔ یہ چیز مجھے کھٹکی تھی کیونکہ کچھ نہ کچھ لوگ تو ہونے چاہیے تھے۔ جب ہم باغ کے بالکل نزدیک آگئے تب بھی وہاں زندگی کا احساس مفقود تھا۔ ان لوگوں نے بھی اس بات کو محسوس کرلیا۔ ایمار نے مجھ سے کہا۔ ''ایسا لگ رہا ہے جیسے یہاں کوئی نہیں ہے۔''

میں نے سر ہلا کر اس کی تائید کی اور پھر انہیں وہیں رکے رہنے کا اشارہ کر کے میں خود آگے بڑھا۔ درختوں کے درمیان آیا۔ یہاں تمام درخت منظم انداز میں لگائے گئے تھے۔ یعنی قطاروں میں اور ایک سرے سے دوسرے سرے تک تمام قطاریں بالکل سیدھ میں تھیں اس لیے یہ جاننا زیادہ مشکل نہیں تھا کہ وہاں کوئی ہے یا نہیں۔ اب تک کوئی نظر نہیں آیا تھا اس لیے میں پوری بے فکری سے باغ میں گھوم رہا تھا۔ میرے جسم پر آرگون کی جنگی وردی تھی اگر کوئی مجھے دیکھ لیتا تو اپنا ہی آدمی سمجھتا۔ مگر وہاں دیکھنے کے لیے کوئی نہیں تھا۔ میں نے چند منٹ میں پورا باغ دیکھ لیا تھا۔ ایسا لگ رہا تھا کہ اس باغ اور اس طرف کھیتوں میں کام کرنے والے افراد آج آئے ہی نہیں تھے اور جب وہ نہیں آئے تھے تو ان کی حفاظت کرنے والے بھی نہیں آئے تھے۔ میں نے پورا باغ گھوم کر دیکھ لیا۔

آرگون سے دور باغات کی پوزیشن کچھ یوں تھی کہ باغ تھا پھر کچھ حصہ کھیت پر مشتمل تھا اور پھر باغ تھا۔ یہ اصل میں چوکور ساخت کے قطعے تھے جو شطرنج کی بساط کے خانوں کی طرح بنے ہوئے تھے۔ اوپر سے دیکھا جاتا تو شاید یہ بساط ہی نظر آتی۔ میں نے پہلے آکر ایرٹ کو خبردار کیا کہ میں آگے جارہا ہوں۔ وہ اس باغ میں آگئے جس میں کوئی نہیں تھا۔ پھر میں اگلے باغ کی طرف بڑھا۔ کھیت جس سے میں گزر رہا تھا وہاں کوئی نظر نہیں آرہا تھا۔ اگلا باغ بھی ویران ثابت ہوا۔ میں یہاں سے آگے جانا چاہتا تھا اس لیے میں نے واپس آکر پھر ان لوگوں کو بتایا اور وہ اس باغ تک آئے۔ میں چاہتا تھا کہ ہم میں اتنا فاصلہ رہے کہ ایک پر کچھ گزر جائے اور دوسرے کو علم نہ ہو۔ وہ دوسرے باغ میں رکے تو میں آگے گیا۔

میرا اندازہ تھا کہ ہر باغ اور کھیت کا سائز ایک ہیکٹر تھا۔ یعنی سو میٹرز لمبا اور اتنا ہی چوڑا۔ چوتھے باغ میں بھی جب کسی کو نہیں پایا تو مجھے یقین ہو گیا کہ آج کوئی آرگون سے نہیں نکلا ہے۔ یہ امر ہر طرح سے تشویشناک تھا۔ اول یہ کہ ریناٹ کی فوج عنقریب حرکت میں آنے والی تھی اور اس لیے اب غیر عسکری افراد کو قلعے سے نکلنے کی اجازت نہیں تھی۔ دوسرے مسلسل تین فوجی دستوں کی گمشدگی نے انہیں چوکنا کر دیا تھا اور وہ اپنی سپاہ کی مزید گمشدگی نہیں چاہتے تھے اس لیے انہوں نے اپنے لوگوں کو قلعے سے باہر آنے سے روک دیا تھا۔ غور کرنے پر بھی ان میں سے کوئی وجہ حتمی طور پر میرے دل کو نہیں لگی تھی۔ میں واپس آیا اور اشاروں میں اپنے ساتھیوں کو صورتِ حال سے آگاہ کیا۔ ایرٹ نے کہا۔ ''ہم اگر باغوں کے ساتھ ساتھ آرگون کے سامنے والے حصے تک سفر کر کے دیکھیں تو صورتِ حال کا بہتر اندازہ ہو جائے گا۔''

''لیکن سامیرا کے آدمیوں سے سامنا ہو گیا تو؟'' میں نے اشاروں میں پوچھا۔

''ہم ان کی حد سے دور رہیں گے۔''

میں نے سوچا اور ایرٹ کی تجویز پر عمل کرنے کا فیصلہ کیا۔ ہم آگے روانہ ہوئے۔ ابھی ہمیں ایک گھنٹا بھی نہیں ہوا تھا۔ میں نے سوچا تھا کہ ہم دو سے ڈھائی گھنٹے میں واپس آجائیں گے۔ اس وقت تک تاریکی بھی چھانے لگے گی یا

چھا چکی ہوگی۔ بہرحال ہمیں بہت زیادہ دیر نہیں لگے گی۔ ہم آرگون کی زمین کے ساتھ ساتھ جھاڑیوں میں چل رہے تھے۔ تقریباً پون گھنٹے بعد ہم سامیرا کے قلعوں کی حدود کے پاس پہنچ گئے۔ یہاں ان کے کھیت اور باغات تھے اور ان میں کام کرتے افراد دور سے نظر آرہے تھے۔ دوسری طرف آرگون کے کھیتوں اور باغات میں اب تک ایک متنفس بھی نظر نہیں آیا تھا۔ صورتِ حال بہت واضح اور سنگین تھی۔ ریناٹ نے سب کو قلعہ بند کرلیا تھا اور اس کی طرف سے بہت جلد جنگی کارروائی ہوتی نظر آرہی تھی۔ دوسری طرف جیسے سامیرا کے لوگ معمول کے مطابق کام کرتے نظر آئے تھے حالانکہ انہیں صورتِ حال کا اندازہ کرکے اس کے مطابق ردِعمل دینا چاہیے تھا۔

ریک کے آنے کا پتا نہیں تھا مگر میں نے فیصلہ کیا کہ ایرٹ کو فوری قلعے کی طرف روانہ کروں گا مگر اس سے پہلے اسے بریف کرنا لازمی تھا اور بریفنگ کے لیے روبیر کا ہونا لازمی تھا۔ اگر وہ ساتھ ہوتی تو میں یہیں سے ایرٹ کو سامیرا کے لیے پیغام دے کر روانہ کردیتا۔ مگر اتفاق اور قسمت کی خرابی کہ اسے بھی آج ہی جونک لگنا تھی۔ اتنے دن سے اتنے لوگ ندی میں نہا رہے تھے اور کسی کو جونک نہیں لگی۔ وہ بھی روبیر کو لگی تھی۔ میں نے واپسی کا اشارہ کیا اور ہم واپس چل پڑے۔ آرگون کے قلعے کے سامنے تک آنے کے چکر میں ہم خاصے آگے نکل آئے تھے اور میرا اندازہ تھا کہ واپسی میں ہمیں رات ہوجائے گی اور ایسا ہی ہوا۔ ابھی ہم جنگل سے دور تھے کہ تاریکی چھانے لگی۔ ہم نے مشعلیں جلالیں اور جانوروں سے بچاؤ کے لیے دو شاخے ہمارے پاس تھے مگر ابھی انہیں آگ دکھانے کی ضرورت نہیں تھی۔ جب ضرورت پڑتی تو ایک لمحے میں انہیں جلا سکتے تھے۔

جنگل میں داخل ہونے سے پہلے تاریکی مکمل ہوگئی تھی اور اسی وجہ سے ٹیلے کے اوپر کی غیر معمولی روشنی ہمیں دور سے نظر آگئی۔ میں چونکا۔ یوں لگ رہا تھا جیسے ٹیلے کے اوپر کسی نے بڑا سا الاؤ جلایا ہوا ہے اور یہ معمول کی بات نہیں تھی۔ کیا کوئی خطرہ تھا اور روبیر اس طرح سے آگ جلا کر ہمیں اس سے خبردار کررہی تھی۔ یا وہاں کوئی حادثہ پیش آچکا تھا۔ میں نے جلدی سے اپنی مشعل بجھادی اور دوسروں نے بھی یہی کیا۔ میں نے اشاروں سے انہیں پھیل کر اور چھپ کر آگے بڑھنے کو کہا اور ہم ایک دوسرے سے فاصلہ رکھتے ہوئے ٹیلے کی طرف بڑھنے لگے۔ آگے آتے ہوئے میرا دل اس خدشے سے دھڑک رہا تھا کہ کوئی حادثہ پیش آچکا تھا۔ دراصل میری چھٹی حس اشارہ کررہی تھی۔ ٹیلے کے نزدیک آتے ہی صورتِ حال واضح ہوگئی۔ آگ اوپر کیبن میں لگی تھی۔

میرے ساتھ ایرٹ تھا میں نے اسے اشارے سے نیچے رکنے کو کہا اور خود لکڑی کی سیڑھی سے اوپر چڑھا۔ میں محتاط تھا اس کے باوجود سیڑھی کے چرچرانے سے آوازیں پیدا ہورہی تھیں۔ ایرٹ اور اس کے ساتھیوں نے تیر کمان سنبھال لیے تھے اور پوری طرح تیار تھے۔ میں اوپر آیا۔ آگ کیبن میں ہی لگی تھی۔ کسی کو نہ پاکر تیزی سے آگے بڑھا۔ روبیر کو آواز دی اور اس کی طرف سے جواب نہیں آیا۔ ایک منٹ سے بھی پہلے میں نے پورا ٹیلہ دیکھ لیا تھا۔ وہاں تباہی اور بربادی پھیلی ہوئی تھی جو صرف انسانی ہاتھوں کی مرہونِ منت تھی۔ تمام چیزیں توڑ پھوڑ کر برباد کر دی گئی تھیں۔ کیبن کو آگ لگا دی تھی اور روبیر غائب تھی۔ اس ٹیلے پر وہ صرف ایک جگہ ہوسکتی تھی یعنی جلتے کیبن کے اندر۔ مگر اس صورت میں وہاں گوشت جلنے کی بدبو ہوتی جب کہ وہاں ایسی کوئی بو نہیں تھی۔

جلتے کیبن کی روشنی اتنی تیز تھی کہ مشعل کی ضرورت ہی نہیں تھی۔ میں وہاں کا جائزہ لیتے ہوئے سوچ رہا تھا کہ اگر یہ آرگون والوں کی کارروائی تھی تو ان کے دستے کی آس پاس موجودگی بھی ممکن تھی۔ اس بات کا ننانوے فیصد امکان تھا کہ ٹیلے پر حملہ آرگون کی سپاہ نے کیا تھا۔ انہوں نے کسی طرح اس جگہ کا پتا چلالیا اور جب ہم یہاں نہیں تھے تب وہ یہاں آئے اور ہماری پناہ گاہ کو تہس نہس کردیا۔ مگر خطرہ اب بھی موجود تھا۔ میں تیزی سے کنارے تک آیا اور اشارے سے ایرٹ اور دوسروں کو اوپر بلالیا۔ وہ ایک ایک کرکے اوپر آئے اور جلتے کیبن اور برباد سامان کو دیکھنے لگے۔ پہلے ان کے چہرے اتر گئے اور پھر وہ غضب ناک نظر آنے لگے۔ میں نے اشارے سے کہا۔ ”یہ آرگون والوں کی کارروائی ہے اور ہم خطرے میں ہیں۔“

ایرٹ نے پوچھا۔ ”روبیر کہاں ہے؟“

میں نے گہری سانس لی اور پھر ہاتھوں کی زبان استعمال کی۔ ”میرا خیال ہے وہ اسے لے گئے ہیں۔ اگر وہ زندہ ہے تب بھی اس کی زندگی کی زیادہ امید نہیں کی جاسکتی ہے۔ میں دیکھ چکا ہوں آرگون والے عورت کے معاملے میں اور زیادہ سفاک ہیں۔“

ایرٹ کیبن کا جائزہ لے رہا تھا۔ اس نے کہا۔ ”اسے آگ لگے زیادہ دیر نہیں ہوئی ہے۔“

میں نے بھی کیبن کو دیکھا اور تسلیم کیا۔ شاید آدھا گھنٹا پہلے اسے آگ لگائی گئی تھی۔ اس کا مطلب تھا کہ روبیر کو لے جانے والے زیادہ دور نہیں گئے ہوں گے۔ میں نے اشارے سے یہ بات واضح کی تو ایرٹ پُر جوش لہجے میں بولا۔ ”ہم ان کے پیچھے جاسکتے ہیں۔ روبیر قیدی ہے اس کی وجہ سے وہ زیادہ تیز رفتاری سے سفر نہیں کرسکیں گے اور اگر ہم تیزی سے چلیں تو انہیں راستے میں روک سکتے ہیں۔“

مجھے افسوس ہوا کہ یہ خیال میرے ذہن میں کیوں نہیں آیا۔ مگر میں نے افسوس میں زیادہ وقت ضائع نہیں کیا اور ہم فوری روانہ ہوگئے۔ میں نے ذہن میں وہ مختصر ترین راستہ سوچا جو یہاں سے آرگون کی طرف جاتا تھا اور ہم اسی پر دوڑنے لگے۔ روشنی کے لیے ایک مشعل جلالی تھی تاکہ ہمیں راستہ دکھائی دیتا رہے اور آگے روبیر کو لے جانے والا دشمن زیادہ روشنی دیکھ کر ہوشیار نہ ہو۔ ہم درمیانی سے ذرا زیادہ رفتار سے دوڑ رہے تھے۔ یوں سمجھ لیں کہ ہمارا انداز طویل مراتھون میں حصہ لینے والے ایتھلیٹ کا سا تھا۔ جو کسی قدر کم رفتار مگر مستقل مزاجی سے بھاگتا ہے۔ ایرٹ کی بات درست تھی روبیر کو قیدی بنا کر لے جانے کی صورت میں وہ زیادہ تیزی سے سفر نہیں کرسکتے تھے۔ چاہے اور اسے پیدل لے جا رہے ہوں یا کسی نے اسے اٹھا رکھا ہو۔ دونوں صورتوں میں ان کی رفتار پیدل چلنے سے زیادہ نہیں ہوگی۔

جب میں نے تباہ شدہ ٹیلہ دیکھا تو مجھے شاک لگا تھا اور مجھے روبیر کی زندگی سے مایوسی ہوئی تھی۔ عورتوں کے ساتھ آرگون کے سپاہیوں کا رویہ میں دیکھ چکا تھا اور روبیر بہت حسین اور نوجوان تھی۔ اس کی زندگی کے ساتھ آبرو بھی خطرے میں تھی۔ اگر وہ فی الحال بچی ہوئی تھی تو یہ بچت زیادہ دیر کے لیے نہیں تھی۔ جنگل میں سپاہی رکنے کا خطرہ مول لے نہیں سکتے تھے اور شاید وہ واپس اپنے باغات تک پہنچنا چاہ رہے ہوں جہاں وہ کسی قدر محفوظ تھے اور پھر وہ روبیر کے ساتھ اپنی من مانی کرسکتے تھے۔ مگر انہیں اپنے باغات تک پہنچنے میں کم سے کم ایک گھنٹا لگتا۔ وہ یقیناً اس طرف نہیں گئے تھے جس طرف سے ہم آئے تھے۔ بلکہ انہوں نے اس طرف کا رخ کیا ہوگا جہاں ہم نے جال بچھا کر آرگون کے نو سپاہیوں کو ٹھکانے لگا دیا تھا۔ ایک گھنٹے کا یہ فاصلہ ہم نے تیز رفتاری سے آدھے گھنٹے میں طے کرلیا مگر جب گھاس والے میدان میں نکلے تو وہاں کوئی نہیں تھا۔ ایمار نے یہی بات مایوسی سے کی۔

”یہاں تو کوئی نہیں ہے۔“

”وہ باغ میں ہوں گے۔“ میں نے اشارے سے کہا اور مشعل بجھا دی۔ ہم اب تاروں کی چھاؤں میں آگے بڑھنے لگے۔ روشنی کم ہونے کی وجہ سے رفتار بھی کم تھی۔ سچی بات ہے کہ میں باغات کے نزدیک آنے تک پُر اُمید رہا تھا کہ ہم روبیر کو لے جانے والوں کو جالیں گے مگر جب مجھے یہاں تک ان کا نشان نہیں ملا تو میں اندر سے مایوس ہونے لگا کہ شاید ہم غلط سمت میں سفر کرتے رہے تھے اور روبیر کو لے جانے والے اسے کسی اور راستے سے لے گئے تھے۔ سمت میں ذرا سی تبدیلی سے بہت زیادہ فرق پڑسکتا تھا۔ کیونکہ باغات اور کھیتوں کا یہ سلسلہ مشرق سے مغرب کی طرف آتے ہوئے شمال کی طرف گھوم رہا تھا اور اس کی لمبائی دس میل سے بھی زیادہ تھی۔ وہ کسی بھی جگہ سے اندر جاسکتے تھے اور ایک بار وہ باغات کے اندر چلے جاتے تو ان سب جگہوں کو دیکھنے کے لیے ہم چھ افراد کیا ہزاروں کی فوج بھی ناکافی ثابت ہوتی۔

باغ کے پاس پہنچ کر میں نے سب کو دس دس گز کے فاصلے سے پھیل کر آگے بڑھنے کا اشارہ کیا اس طرح ہم تقریباً پورا باغ کور کرسکتے تھے۔ میں درمیان میں تھا اور ہم آگے بڑھنے لگے۔ خلاف توقع یہ باغ چوکور کے بجائے مستطیل ثابت ہوا اور اس کی لمبائی خاصی زیادہ تھی۔ ہم وسط تک پہنچے ہوں گے کہ کسی کا بدمست قہقہہ سنائی دیا۔ اس قہقہے نے میرے اندر دم توڑتی اُمید کو پھر سے زندہ کردیا تھا۔ قہقہہ کچھ دور درختوں کی طرف سے آیا تھا۔ اب میں نے غور کیا تو درختوں کے اوپری سروں پر روشنی بھی جھلک رہی تھی۔ وہاں آگ روشن تھی۔ کیونکہ درخت نیچے سے اتنے پھیلے ہوئے تھے کہ ان کی شاخیں زمین سے جا لگی تھیں۔ اس لیے ان کے نیچے سے روشنی نہیں جھلک رہی تھی۔ ایرٹ اور دوسروں نے بھی قہقہہ سن لیا تھا اور اب وہ بھی سمٹ کر اسی طرف آرہے تھے۔ ہم سب ہی ہوشیار اور دبے قدموں آگے جارہے تھے تاکہ ان لوگوں کو خبر نہ ہو۔ کسی بھی ناگہانی صورتِ حال سے نمٹنے کے لیے ہم نے اپنے ہتھیار سنبھال لیے تھے۔

اب اس طرف سے کئی افراد کے بولنے کی آواز آرہی تھی اور وہ جو باتیں کررہے تھے انہیں ایک انسان کی ذہنی گندگی ہی قرار دیا جاسکتا تھا جو وہ منہ کے راستے خارج کر رہے تھے۔ وہ کسی عورت کے بارے میں آپس میں محوِ گفتگو تھے۔ آگے بڑھتے ہوئے ہم سب اتنے نزدیک تھے کہ ایک دوسرے کو دیکھ سکتے تھے اور سب نے تیر کمان سنبھال لیے تھے۔ دبے قدموں ہم ان کے بالکل نزدیک جا پہنچے اور

شاخوں کی اوٹ سے دیکھا کہ ایک کسی کھلی جگہ گھاس پر سات سپاہی موجود تھے۔ ان کے درمیان میں الاؤ جل رہا تھا اور وہ جو چیز پی رہے تھے اسے ام الخبائث کہتے ہیں کیونکہ اس کا فتور ان کے لہجوں سے چھلکا پڑ رہا تھا۔ ان سے کچھ فاصلے پر روبیر بندھی حالت میں زمین پر کروٹ کے بل پڑی ہوئی تھی۔ اس کا لباس دست درازی کی وجہ سے بے ترتیب ہوا تھا مگر اس کے جسم پر سلامت تھا۔ اس کا رخ دوسری طرف تھا۔ میں نے سکون کا سانس لیا کہ اس کی جان اور آبرو محفوظ تھی۔ میں نے پلٹ کر ایرٹ کو اشارے سے بلایا اور ایک سپاہی کی طرف اشارہ کیا۔

وہ سمجھ گیا اور اپنی پوزیشن پر چلا گیا۔ اسی طرح میں نے ہر ساتھی کو بلا کر اس کا شکار واضح کیا تاکہ ہم سب الگ الگ کو نشانہ بنائیں۔ میں نے ان میں سے سب سے گرانڈیل شخص کو منتخب کیا تھا جو حلیے اور انداز سے ان سب کا سردار لگ رہا تھا۔ میں نے اس کی گردن کا نشانہ لیا اور تیر چلا دیا۔ مگر نشانہ کسی قدر خطا گیا اور تیر اس کی گردن کے وسط میں اترنے کے بجائے سائیڈ پر آر پار ہو گیا اور وہ خرخراتا ہوا کھڑا ہو گیا۔ باقی پانچ افراد کے چونکنے سے پہلے ہی تیر ان کے جسموں میں اتر گئے تھے اور وہاں صرف ایک شخص بچا تھا جو صحیح سلامت تھا۔ اس نے چھلانگ لگائی اور کسی چھلاوے کی طرح الاؤ کو پھلانگتے ہوئے روبیر کے دوسری طرف جا گرا۔ اسی وجہ سے وہ بچ بھی گیا کیونکہ روبیر کی وجہ سے سب نے ہی ہاتھ روک لیے تھے۔ پھر سب ہی ان کو مزید نشانہ بنا رہے تھے جن کو پہلے تیر مار چکے تھے تاکہ وہ مزاحمت کے قابل نہیں رہیں۔ وہ زخم کھا کر چیخم دھاڑ مچا رہے تھے اور آنے والے تیروں سے بچنے کی کوشش کر رہے تھے مگر وہاں کہیں جائے پناہ نہیں تھی۔

میں نے بھی گرانڈیل کو دوسری بار نشانہ بنایا اور اس بار تیر اس کے سینے میں عین دل کے مقام پر اتر گیا اور وہ کھڑا ہوا ڈگمگا رہا تھا پھر تیر کھا کر اوندھے منہ الاؤ پر گرا اور اس نے نصف سے زیادہ الاؤ بجھا دیا۔ روشنی یک دم ہی بہت کم ہوئی تھی اور روبیر کو پھلانگنے والا اس کا بھی فائدہ اٹھاتے ہوئے وہاں سے غائب ہو گیا۔ میں نے اشارے سے ایرٹ اور دوسروں کو اس کے پیچھے جانے کو کہا مگر وہ پہلے ہی حرکت میں آ گئے تھے۔ ایرٹ، شاٹ اور رانٹون اس کے پیچھے گئے۔ ایمار اور مارٹ میرے ساتھ تھے۔ انہوں نے سب سے پہلے گرانڈیل کی لاش الاؤ سے دور کی جو کسی قدر جل چکی تھی اور اس سے بدبو اور دھواں اٹھ رہا تھا۔ میں باقیوں کو دیکھ رہا تھا ان میں سے تین مر چکے تھے اور دو قریب المرگ تھے۔ مارٹ نے انہیں سنگی چاقو سے مارنا چاہا مگر میں نے روک دیا اور روبیر کی طرف بڑھا۔ اس سارے ہنگامے میں وہ پہلے کی طرح ساکت پڑی رہی تھی۔ وہ یقیناً بے ہوش تھی۔ میں نے اسے سیدھا کیا اور چونک گیا۔ وہ روبیر نہیں تھی۔

''یہ روبیر نہیں ہے۔'' ایمار نے مضطرب لہجے میں کہا۔

یہ بھی جوان لڑکی تھی اور خاصی دلکش تھی جسامت تقریباً روبیر جیسی تھی اس لیے ہم اسے روبیر ہی سمجھے تھے اس نے لباس بھی ویسا ہی سفید پہن رکھا تھا اور اس سے پہلے کسی نے توجہ نہیں دی کہ اس کا پاجامہ بھی سفید تھا جب کہ روبیر نے سرخ پاجامہ پہنا ہوا تھا۔ چند لمحے پہلے روبیر کو پا لینے اور ٹیلے کی تباہی کے ذمے داروں کو سزا دینے کی جو خوشی تھی وہ روبیر کو نہ پا کر ماند پڑ گئی۔ شاید یہ وہ لوگ نہیں تھے جنہوں نے ٹیلے پر حملہ کیا تھا۔ لڑکی بے ہوش تھی اور اس کی سانس بھی مدھم تھی۔ میں کچھ دیر کے لیے ساکت رہ گیا۔ روبیر کہاں تھی؟ میں ایک نئے خیال کے ساتھ واپس دم توڑتے سپاہیوں کے پاس آیا اور اشارے سے ایمار سے کہا۔ ''ان سے روبیر کا پوچھو۔''

ایمار نے ان سے روبیر کا پوچھا مگر وہ سسکتے رہے اور کوئی جواب دینے سے گریز کیا۔ اس پر ایمار نے ایک کے پیٹ میں اترا ہوا تیر پکڑ کر ہلایا تو وہ چلا اٹھا تھا۔ ایمار نے اپنا سوال دہرایا تو وہ ٹوٹے الفاظ میں بولا۔ ''میں...... روبیر...... کو نہیں...... جانتا۔''

''وہ جسے جنگل والے ٹیلے سے لایا گیا ہے ایسی ہی لڑکی ہے۔'' ایمار نے بے ہوش لڑکی کی طرف اشارہ کیا۔

''وہ اسے...... آرگون...... لے...... گئے۔'' اس نے بہ مشکل کہا۔

''کون؟'' ایمار نے اسے جھنجوڑا مگر وہ جواب دینے کے قابل نہیں رہا تھا۔ اس نے جھرجھری لی اور دم توڑ دیا۔ دوسرا ویسے ہی ہوش سے بیگانہ تھا۔ ایک منٹ سے پہلے اس نے بھی دم توڑ دیا۔ بہرحال سپاہی کے جواب نے واضح کر دیا تھا کہ یہی دستہ ٹیلے پر حملے اور روبیر کے اغوا میں ملوث تھا۔ یقیناً وہ زیادہ تھے۔ کچھ یہاں اس لڑکی کے ساتھ رک گئے اور باقی روبیر کو لے کر آرگون چلے گئے تھے۔ یہ تو واضح تھا کہ لڑکی آرگون کی تھی اور شاید اسے پہلے ہی سپاہی عیاشی کے لیے اغوا کر کے لے آئے تھے۔ انہوں نے سوچا ہوگا کہ جب ایک مہم پر جا رہے ہیں تو واپسی میں موج میلہ کر لیں گے۔ ویسے تو ان کو باہر نکلنے سے منع کر دیا گیا ہوگا اور شہر

میں اس قسم کے کام ذرا دشوار ہو جاتے۔ اگرچہ وہاں بھی انہیں روکنے والا کوئی نہیں تھا۔ ریناٹ نے اپنی فوج کو کھلی چھوٹ دے دی تھی۔ اسی اثنا میں ایرٹ اور دوسرے آ گئے۔ ایرٹ نے معذرت بھرے انداز میں کہا۔
''وہ نکل گیا۔ ہم اس کا پیچھا نہیں کر سکے۔''
میں سمجھ رہا تھا اس میں ان لوگوں کا قصور نہیں تھا۔ ان باغات میں کسی کا پیچھا کرنا یا اسے تلاش کرنا وہ بھی تاریکی میں بہت مشکل کام تھا۔ میں نے سپاہیوں کے ہتھیاروں اور دوسرے سامان کی طرف اشارہ کیا۔ ''انہیں سمیٹو۔''
ایرٹ کو چھوڑ کر باقی سب اس کام میں لگ گئے تھے۔ ایرٹ نے لڑکی کا پوچھا۔ ''اس کا کیا کرنا ہے؟''
''ساتھ لے جانا ہے۔'' میں نے جواب دیا۔ لڑکی کو اٹھانے کی ذمے داری ایرٹ کو سونپ دی اور اس نے خوشی خوشی یہ خوشگوار بوجھ اٹھا لیا۔ مرتے سپاہی کے آخری جواب سے واضح تھا کہ دوسرے سپاہی جو شاید ٹیلے پر ہونے والے حملے میں شامل تھے وہی روبیر کو آرگون لے گئے تھے۔ مگر یہ لڑکی کہاں سے آئی اس کا جواب یہ خود دے سکتی تھی۔ بہ ظاہر اس کے ساتھ زیادتی نہیں ہوئی تھی کیونکہ اس کا لباس سلامت اور جسم صاف ستھرا تھا۔ نہ جانے وہ کسی ضرب کی وجہ سے بے ہوش تھی۔ اسے کوئی دوا دی گئی تھی یا وہ ایسے ہی ہوش کھو بیٹھی تھی۔ کچھ دیر بعد ہم باغ سے نکل آئے۔ وہیں سے مشعلیں جلالی تھیں۔ بھاگنے والا آرگون یا کسی اور نزدیکی دستے کی طرف گیا ہوگا اور اسے مدد لے کر آنے میں یقیناً کچھ دیر لگتی۔ اتنی دیر میں ہم یہاں سے خاصی دور نکل سکتے تھے۔
مگر واپسی میں ہماری رفتار پیدل سے زیادہ نہیں تھی اور اگر ہمارے تعاقب کرنے والے اس رفتار سے آتے جس رفتار سے ہم ان باغات تک آئے تھے تو وہ بھی ہمیں راستے میں پکڑ سکتے تھے۔ جنگل میں داخل ہونے کے بعد ہم کچھ دیر رکے اور عقب کا جائزہ لیا۔ اگر کوئی تعاقب میں آ رہا تھا تو وہ ہمیں نظر آتا مگر کوئی نظر میں نہیں آیا تو ہم آگے روانہ ہو گئے۔ خوش قسمتی سے آتے ہوئے ہمیں کسی جانور سے واسطہ نہیں پڑا تھا اسی طرح واپس جاتے ہوئے بھی کوئی خطرناک جانور نہیں ٹکرایا۔ چند ایک چھوٹے موٹے جانور ملے جنہوں نے ہمیں دیکھتے ہی فرار کی راہ اختیار کرلی۔ ایک گھنٹے بعد ہم ٹیلے کے پاس تھے۔ اس پوری وادی میں آرگون اور سامیرا کے قلعوں کے بعد ایک یہی جگہ تھی جہاں ہم جانوروں کے خطرے سے بے فکر ہو کر رہ سکتے تھے۔
اگرچہ یہ جگہ آرگون کی فوج کی نظر میں آ چکی تھی اور وہ اسے تباہ بھی کر چکے تھے۔ مگر فی الوقت یہاں قیام ہماری مجبوری تھی۔ صبح ہم نہیں اور جا سکتے تھے۔ جب ہم ٹیلے کے اوپر آئے تو کیبن خاکستر ہو گیا تھا اور... اب اس کے ملبے میں انگارے سلگ رہے تھے۔ صبح تک یہ بھی بجھ جاتے۔ انسان کچھ دن جس گھر اور جگہ قیام کرتا ہے اسے خود بہ خود اس گھر اور جگہ سے انسیت ہو جاتی ہے اور وہ تباہ ہو جائے تو انسان دکھ محسوس کرتا ہے جیسا کہ میں کر رہا تھا۔ آگ نے کیبن کے آس پاس موجود جھاڑیوں اور پودوں کو بھی جلا ڈالا تھا۔ مگر جو پودے دور تھے وہ محفوظ رہے تھے۔ لان کی گھاس بھی بچ گئی تھی۔ البتہ گرمی نے اسے مرجھا دیا تھا۔ تباہ ہونے والی چیزوں میں ہمارا پانی اور اسے ذخیرہ کرنے والی چیزیں بھی شامل تھیں۔ مگر ہمیں آرگون کے سپاہیوں کے پاس سے بہترین قسم کی چھاگلیں اور مشکیں ملی تھیں۔ اس کے علاوہ کھانے پینے کا سامان بھی وافر مقدار میں تھا۔
اس لیے اس حد تک نقصان کا ازالہ ہو گیا تھا مگر روبیر ہمارے ہاتھ سے نکل گئی تھی اور یہ جگہ دشمن کی نظروں میں آ گئی تھی۔ یہ نقصان ناقابلِ تلافی تھے۔ کیبن کی آگ نے پورے ٹیلے کو گرما دیا تھا اور اس گرمائش سے سب پسینے پسینے ہو رہے تھے۔ مگر مجبوری تھی کوئی اس وقت نیچے نہیں جا سکتا تھا۔ گرمی کی وجہ سے سب بار بار پانی پی رہے تھے اور آتے ہی وہ لوگ کھانے کی چیزوں پر ٹوٹ پڑے تھے۔ سامان میں خشک کیا ہوا گوشت بھی تھا اور وہ اسے کیبن کے انگاروں پر بھون کر کھانے لگے۔ ایرٹ نے مجھے بھی پیشکش کی تھی مگر میں نے انکار کرتے ہوئے دلیے اور پھلوں کو ترجیح دی تھی۔ ظاہر ہے یہ گوشت میرے لیے حلال نہیں تھا۔ کھا پی کر سب کی جان میں جان آئی کیونکہ اس طویل مراتھون نے سب کے پیٹ اور حوصلے کے ٹینک خالی کر دیے تھے۔ اس لیے کھا پی کر وہ ستانے لگے تھے۔
لڑکی بدستور بے ہوش تھی۔ میں نے اس کی نبض دیکھی تھی جو سست تھی۔ مگر اس کی جان کو بہ ظاہر کوئی خطرہ نہیں تھا۔ میں نے اسے گھاس پر ڈلوایا تھا جو ٹیلے پر واحد ٹھنڈی جگہ تھی۔ کھا پی کر میں اس کے پاس آیا۔ ایرٹ نے ایک مشعل جلالی تھی جس کی روشنی کافی تھی۔ پہلے میں نے غور نہیں کیا تھا مگر اب دیکھا تو مجھے دل میں تسلیم کرنا پڑا کہ وہ روبیر سے زیادہ نہیں تو کم حسین بھی نہیں تھی۔ درحقیقت اس وادی میں حسن کا معیار عام تھا اور بیشتر خواتین و حضرات اس معیار پر پورا اترتے تھے۔ یہ لڑکی بھی بے پناہ حسن کی مالک

تھی اور اس کی عمر بہ ظاہر انیس بیس سے زیادہ نہیں
تھی۔ ڈھیلے لباس میں بھی اس کا جسمانی حسن نمایاں تھا۔
میں نے اس کے منہ میں تھوڑا پانی ڈالا جو اس نے پی لیا۔ پھر
تھوڑا تھوڑا کر کے اسی طرح خاصا پانی اس کے منہ میں ڈال
دیا۔ آخر میں اس کے منہ پر چھینٹے مارے تو وہ ہوش
میں آنے لگی اور فوراً ہی اس نے رونے کے انداز میں کراہنا
اور کہنا شروع کر دیا۔

”مجھے چھوڑ دو...... میرے بابا کو مت مارو......
میرے بابا کو مت مارو۔“

ایسا لگ رہا تھا کہ وہ خواب میں کچھ دیکھ اور رو رہی ہے۔
میں نے نرمی سے اسے ہلایا اور پھر مستقل ہلاتا رہا حتیٰ کہ وہ
چونک کر بیدار ہو گئی۔ مگر اس کے منہ سے سسکیاں بدستور نکل
رہی تھیں۔ جب اس کے حواس بحال ہوئے تو مجھے آرگون کی
فوجی وردی میں پا کر اس کے منہ سے چیخیں نکلنے لگی
تھیں۔ وہ بہت زیادہ خوفزدہ تھی۔ میں نے کچھ کہنے کے
بجائے پیچھے ہٹنا زیادہ مناسب سمجھا اور اشارے سے ایرٹ
سے کہا۔ ”اسے سمجھاؤ...... ہمارا تعلق آرگون سے نہیں ہے۔“

ایرٹ اور اس کے ساتھی ذرا فاصلے پر تھے۔ ایرٹ
نے نرمی سے کہا۔ ”ڈرو مت ہمارا تعلق آرگون سے نہیں ہے۔
ہم سامیرا کے لوگ ہیں۔“

مگر لڑکی کی آنکھوں میں شک تھا کیونکہ ہم آرگون کی فوجی
وردی میں تھے۔ اس نے یقین سے کہا۔ ”تم جھوٹ کہہ رہے
ہو تم لوگ آرگون کے درندہ صفت سپاہی ہو۔ تم لوگوں نے
میرے بابا کو مارا ہے اور اب مجھے بھی مار دو گے۔“

”غور سے دیکھو ہم وہ لوگ نہیں ہیں۔“ ایرٹ نے
اپنے اور ساتھیوں کی طرف اشارہ کیا۔ ”وہ لوگ اور تھے
جنہوں نے تمہیں باندھ کر رکھا ہوا تھا۔ ہم نے انہیں مار دیا
ہے اور تمہیں ان کی قید سے آزاد کرا لائے ہیں۔ تم اس وقت
بے ہوش تھیں۔“

”تم لوگ دوسرے ہو مجھے تمہارے حوالے کر دیا
ہے۔“ لڑکی ماننے کو تیار نہیں تھی اور پوری جرأت سے بات کر
رہی تھی۔ مجھے تسلیم کرنا پڑا کہ وہ حوصلے والی تھی۔ اس کی جگہ
کوئی دوسری لڑکی ہوتی تو اتنے مردوں کے درمیان ڈر کے
مارے اس کی آواز ہی نہ نکلتی۔ میں نے ایرٹ کو اشارے سے
اس سے روبیر کے بارے میں پوچھنے کو کہا۔ ایرٹ نے پوچھا
تو اس نے نفی میں سر ہلایا۔ ”میں کسی روبیر نامی لڑکی کو نہیں
جانتی اور نہ ہی میں نے اسے دیکھا ہے۔“

”تب تم کہاں سے ان کے ہاتھ لگیں۔“

وہ ایرٹ کو گھور رہی تھی۔ ”تم لوگ مجھے شہر کے قید
خانے سے لائے ہو اور مجھ سے ہی پوچھ رہے ہو۔“

ایرٹ نے عقل مندی سے کہا۔ ”تم ہمارے قبضے میں
ہو اور ہمیں تم سے جھوٹ بولنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔
ہم چاہیں تو تمہیں قتل کر دیں یا تمہارے ساتھ جو چاہیں کریں
کیا تم ہمیں روک سکتی ہو؟“

وہ سہم گئی۔ ”نہیں۔“

”تب ہماری بات تسلیم کرو۔“ ایرٹ نے کہا۔ ”اپنے
آس پاس دیکھو ہم آرگون سے بہت دور جنگل میں ہیں۔“

لڑکی کے حواس بجا ہوئے تھے تو خود اس نے بھی
محسوس کیا تھا کہ ہماری نظروں اور انداز میں اس کے لیے
کوئی خطرہ نہیں ہے۔ وہ کسی قدر مطمئن ہو گئی اور اٹھ بیٹھی۔
اس نے کہا۔ ”مجھے پیاس لگی ہے۔“

میں نے چھاگل اس کی طرف بڑھا دی۔ اس نے ایک
لمبا گھونٹ لیا اور چھاگل مجھے واپس کر دی۔ ایرٹ نے اسے
گوشت کا ایک ٹکڑا دیا جو اس نے بے صبری سے کھایا۔ البتہ
دوسرا ٹکڑا اس نے رک کر اور آرام سے چبا کر کھایا۔ ایسا لگ رہا
تھا کہ وہ کئی وقت کی بھوکی تھی۔ ایرٹ نے سوالات جاری
رکھے۔ ”کیا ان لوگوں نے تمہیں اغوا کیا ہے۔“

اس نے نفی میں سر ہلایا۔ ”میں پہلے سے ان کی قید
میں تھی۔ مجھے یہ قید خانے سے نکال کر لائے تھے۔“

”تمہیں کیوں قید کیا گیا اور تم اپنے بابا کے بارے
میں کہہ رہی تھیں کہ اسے مت مارو۔ کیا تمہارے بابا کو مار دیا
گیا ہے؟“

اس کا ہاتھ رک گیا اور آنکھوں میں نمی جھلملانے لگی
تھی۔ اس نے سر ہلایا۔ ”ان لوگوں نے بابا کو مار دیا۔“

”کیوں؟“

”ان پر الزام تھا کہ انہوں نے سامیرا کی مدد کی ہے اور
ایک آدمی کو قید سے فرار کرا دیا جسے سزائے موت ہو چکی تھی۔“

میں مضطرب ہو گیا اور اشارے سے ایرٹ سے
کہا۔ ”اس کے باپ کا نام پوچھو۔“

ایرٹ نے پوچھا تو اس نے کہا۔ ”میرے بابا کا نام
کیرٹ ہے وہ مہا پجاری کے نائب تھے۔“

باقی سب حیران تھے لیکن میں ششدر رہ گیا۔ وہ
کیرٹ کی بیٹی ساشا تھی۔ جب کیرٹ نے اس کا ذکر کیا تو
میں سمجھا کہ وہ کوئی نو عمر زیادہ سے زیادہ گیارہ بارہ سال کی
لڑکی ہو گی۔ مگر یہ میں نے نہیں سوچا تھا کہ خود جوان نظر آنے
والے کیرٹ کی کمسن نوجوان لڑکی ہو گی۔ میں نے بے ساختہ

کہا۔ ”ساشا۔“

اس نے چونک کر میری طرف دیکھا۔ ”تم میرا نام جانتے ہو؟“

میں نے سر ہلایا اور ایرٹ کے توسط سے اسے جواب دیا۔ ”میں ہی وہ شخص ہوں جسے فرار کرانے کی پاداش میں تمہارے باپ کو سزائے موت ہوئی تھی۔“

یہ سنتے ہی اس کی آنکھیں سپاٹ ہو گئیں اور اس نے کہا۔ ”تو میرے باپ کے اصل قاتل تم ہی ہو؟“

ایرٹ کی مدد سے اس سے گفتگو کرنا اور خاص طور سے بحث کرنا آسان نہیں تھا اس لیے میں نے یہ کام ایرٹ پر چھوڑ دیا اور خود اٹھ کر ٹیلے کے کنارے تک آیا۔ کیبن کے بجھتے انگاروں سے اب تک تپش اٹھ رہی تھی۔ ایرٹ اس سے کہہ رہا تھا۔ ”تم غلط مت سمجھو، تمہارے باپ نے ایک اچھے مقصد کے لیے جان دی۔ کیا تم اپنے باپ کو غلط سمجھ رہی ہو۔“

ساشا کا چہرہ متغیر ہوا۔ ”نہیں لیکن میرے باپ کو اس شخص کی وجہ سے موت کا سامنا کرنا پڑا۔“

”اب تم احمقانہ بات کر رہی ہو۔“ ایرٹ کا لہجہ سخت ہو گیا۔ ”کیا اس نے تمہارے باپ سے درخواست کی تھی کہ اس کی مدد کرے۔ تمہارے باپ نے اس کی مدد کی اور وہ اپنے مقصد کے لیے کی۔ اس وادی میں بسنے والے لوگوں کے لیے کی، جن سے اس کا کوئی واسطہ نہیں ہے۔ کیونکہ یہ باہر سے آیا ہے۔“

ساشا نے سر جھکا لیا تھا۔ میں ان کی گفتگو سن رہا تھا اور مجھے لگا کہ یہ لڑکی اپنے خیالات میں پختہ تھی اور اتنی آسانی سے خیال بدلنے والوں میں سے نہیں تھی۔ مجھے اس کے خیالات کی تبدیلی کی ضرورت بھی نہیں تھی۔ میں تو چاہتا تھا کہ وہ آرگون کے بارے میں معلومات فراہم کرے اور ہو سکے تو ہماری رہنمائی کرے۔ میں واپس آیا اور ایرٹ سے اشاروں میں تبادلۂ خیال کیا کہ وہ اس سے اس سلسلے میں بات کرے۔ ایرٹ کسی حد تک میری بات سمجھ گیا اور اس نے ساشا سے آرگون کے بارے میں پوچھنا شروع کیا۔ مگر اس انداز میں کہ ساشا کو محسوس نہ ہو کہ وہ اس سے پوچھ گچھ کر رہا ہے۔ ساشا کے پاس واقعی اہم معلومات تھیں۔ اس نے بتایا کہ شہر کی حفاظتی دستے اور فوج کو دو حصوں میں بانٹ دیا گیا تھا۔

ایک حصہ جو جنگ لڑنے والے سپاہیوں پر مشتمل تھا وہ اس وقت فصیل کے آس پاس مشقوں میں مصروف تھا۔ باغ اور کھیت میں کام کرنے والے افراد کی حفاظت پر مجبور افراد میں سے بہت بڑی تعداد باقاعدہ فوج میں شامل کر لی گئی تھی اور وہ بھی جنگی مشقیں کر رہے تھے۔ دوسرا حصہ جو زیادہ تربیت یافتہ اور اہل افراد پر مشتمل تھا وہ شاہی محلات اور سرکاری دفاتر کی حفاظت کے لیے تعینات تھا۔ اس وقت آرگون میں کرفیو کی سی کیفیت تھی اور عوام کو بہت کم نقل و حرکت کی اجازت دی جا رہی تھی۔ ان کا راشن اور دوسرا سامان جو پہلے انہیں ملتا تھا اب اچانک نصف کر دیا گیا تھا۔ شہر کی بعض اہم سڑکیں عوام کے لیے بند کر دی گئی تھیں اور لوگ ان شاہراہوں پر قدم بھی نہیں رکھ سکتے تھے۔ ساشا صرف سوال کرنے پر جواب دیتی تھی۔ جب ایرٹ نے اسے شہر کے اندر باغی گروپوں کے بارے میں پوچھا تو اس نے معصومیت سے نفی میں سر ہلایا۔

”میں ان کے بارے میں نہیں جانتی۔“

ایرٹ نے میرا سوال آگے کیا۔ ”کیا کیرٹ نے تمہیں اس بارے میں کچھ نہیں بتایا؟“

اس نے پھر نفی میں سر ہلایا۔ ”نہیں تو، بابا مجھ سے ایسی باتیں نہیں کرتے تھے۔“

”تب تمہیں فوج کے بارے میں معلومات کہاں سے ملیں؟“

”یہ تو میں نے خود دیکھا اور قید خانے کے سپاہی اس بارے میں بات کرتے تھے تو میں سن لیتی تھی۔“

”تمہیں کیوں قید کیا گیا؟“

”کیونکہ میں نے مہا پجاری سے شادی کرنے سے انکار کر دیا تھا۔“

میں دنگ رہ گیا۔ اس بڈھے شرابی فیرون کی نظر اپنے ہی ساتھی کی بیٹی پر تھی۔ مگر ان لوگوں کے نزدیک اخلاقیات فضول اور بیکار چیز تھی۔ وہ صرف اپنے مفاد پر نظر رکھتے تھے۔ ساشا جیسی حسین لڑکی سے وہ کیسے دست بردار ہوتا۔ بلکہ مجھے حیرت تھی کہ اس نے اسے قید کیوں کیا۔ وہ چاہتا تو زبردستی بھی اس سے شادی کر سکتا تھا۔ اتفاق سے ایرٹ نے اس سے یہی سوال کیا۔ ساشا نے اس سوال کا جواب دیا کہ اس کی شادی اس کے باپ کی مرضی سے ہو سکتی تھی اگرچہ ہونی کسی پجاری سے ہی تھی۔ باپ کے مرنے کے بعد پجاری کی بیٹی کی حیثیت سے یہ اختیار اب اس کے پاس آ گیا تھا۔ اس نے فیرون سے شادی کرنے سے انکار کر دیا تھا اور قانون کے تحت اسے مجبور نہیں کیا جا سکتا تھا کہ وہ فیرون سے شادی کرے۔

اس کے انکار پر ریناٹ نے اسے کیرٹ کی سازش

میں شامل ہونے کا الزام لگا کر جیل میں ڈال دیا اور اس پر واضح کیا کہ اسے اسی وقت معافی ملے گی جب وہ فیرون سے شادی پر آمادہ ہو جائے گی۔ میں سوچ میں پڑ گیا۔ اگر اسے اس وجہ سے قید کیا گیا تھا تو اس کی حیثیت ایک معزز قیدی کی سی تھی اور اسے یوں اوباش سپاہیوں کے حوالے کر دینا سمجھ میں نہیں آیا تھا۔ خاص طور سے اس صورت میں جب کہ مہا پجاری فیرون کی اس پر نظر تھی۔ اسے کسی صورت یہ سزا نہیں دی جا سکتی تھی۔ اس نے انکار کیا تھا مگر اسے قید ہوئے اتنا وقت بھی نہیں ہوا تھا کہ فیرون یا ریناٹ مایوس ہو کر اس قسم کا کوئی قدم اٹھاتے۔ میں نے ایرٹ کے توسط سے یہ سوال کیا تو ساشا نے بھی لاعلمی ظاہر کی کہ اسے نہیں معلوم کہ اسے کیوں ان سپاہیوں کے حوالے کیا گیا تھا جو اسے آرگون سے نکال کر باغات میں لے آئے تھے۔ میں نے پوچھا۔
''تمہیں کس وقت وہاں سے نکالا گیا؟''
''دن کی آخری روشنی میں۔'' اس نے جواب دیا۔
''تم بے ہوش کیسے ہوئیں؟'' میں نے سوال کیا تو اس پر دوہا الجھن میں نظر آئی۔ پھر اس نے جواب دیا۔
''مجھے نہیں یاد ہے۔ بس اتنا یاد ہے کہ قید خانے سے نکال کر مجھے ایک عمارت میں لے جایا گیا تھا اور پھر مجھے کچھ یاد نہیں ہے۔''
''جب تمہیں ہوش آیا تو تم بہت ڈری سہمی ہوئی تھیں جیسے تمہیں خطرہ ہو کہ تمہارے ساتھ برا سلوک ہوگا۔''
اس نے سر ہلایا۔ ''مجھے لگا کہ جیسے میں وحشیوں کے نرغے میں ہوں اور وہ میرے ساتھ برا سلوک کرنے والے ہیں۔''
اس کی کہانی کا یہ والا حصہ مجھے الجھن میں ڈال رہا تھا۔ جب وہ قید خانے سے نکل کر کسی عمارت تک گئی اور اس کے بعد اسے کچھ یاد نہیں تو اسے ہوش میں آنے پر یوں کیوں لگا جیسے اس کے ساتھ برا سلوک ہونے والا ہے۔ جب کہ اسے عمارت میں جانے کے بعد اس پر کیا گزری اسے بالکل یاد نہیں تھا۔ گفتگو کے دوران وہ گوشت کے کئی ٹکڑے اور پھر تازہ پھل کھا گئی تھی۔ پیٹ بھرنے کا خمار اس کی آنکھوں سے جھلکنے لگا تھا۔ ایرٹ نے اس سے کہا۔ ''اب تم سو جاؤ یہاں تم بالکل محفوظ ہو۔ کل تمہیں سامیرا کے پاس پہنچا دیا جائے گا۔''
یہ بات ایرٹ نے اپنی طرف سے کہی تھی اس لیے جب ساشا سونے کے لیے لیٹ گئی تو میں نے ایرٹ کو ایک طرف بلایا اور اسے کہا۔ ''یہ ہمارے ساتھ رہے گی۔ ہمیں اس کی ضرورت ہے۔''
اس نے ساشا کی طرف دیکھا۔ ''یہ کمزور لڑکی ہماری کیا مدد کرے گی؟ اسے روبیر کی طرح ہتھیار استعمال کرنا بھی نہیں آتے۔''
''یہ آرگون سے اچھی طرح واقف ہے اور ہمیں آرگون میں اس کی مدد کی ضرورت پڑے گی۔''
اس نے سر ہلایا۔ ''جیسے آپ کہیں۔''
''صبح ہم یہاں سے نکلیں گے اور قلعوں کی طرف جائیں گے پھر تم میں سے ایک دو اندر جا کر ربیک کو لے کر آئیں گے۔ تم ساشا کو بھی لے جاؤ گے اور سامیرا تک میرا ایک پیغام پہنچاؤ گے۔''
ایرٹ جو بات سمجھ جاتا تھا اسے الفاظ میں دوہرا کر مجھ سے پوچھتا تھا اگر بات درست ہوتی تو میں سر ہلاتا ورنہ اشاروں کی مزید مشق کرتا تھا مگر رفتہ رفتہ وہ تقریباً پوری بات سمجھ جاتا تھا۔ کیمپ کے انگارے بھی اب بجھنے والے تھے اور رات کی خنکی نے ٹیلے کی تپش بھی زائل کرنا شروع کر دی تھی اور اب ہم بہتر محسوس کر رہے تھے۔ سب کا سونا مناسب نہیں تھا اس لیے دو دو جاگ کر باری باری پہرہ دیتے رہے۔ میں نے حسب معمول پہلی باری میں پہرہ دیا اور پھر سو گیا تھا۔ صبح آنکھ کھلی تو روشنی ہونے والی تھی کیونکہ اوپر آسمان غائب ہو گیا تھا اور دھند اتر رہی تھی۔ مال غنیمت سے ناشتا کیا گیا اور اس کے بعد ہم وہاں سے روانہ ہوئے۔ ٹیلے سے اتر کر ہم نے پہلے جنوب کا رخ کیا اور پھر مشرق کی طرف مڑ گئے۔ اس طرح ہم آرگون اور سامیرا کے لوگوں کی زمین سے دور تھے۔ ساشا نے خود کو ہمارے رحم و کرم پر چھوڑ دیا تھا۔ جو ہم کہتے تھے وہ وہی کرتی تھی۔ روانہ ہونے سے پہلے میں نے ایرٹ کے توسط سے ساشا سے پوچھا۔
''تم شراب یا کوئی نشے والی چیز استعمال کرتی ہو؟''
''میں نے کبھی ایسی کوئی چیز استعمال نہیں کی۔'' اس نے جواب دیا۔
میں نے راستے میں ایرٹ کو سمجھایا کہ اسے جا کر سامیرا سے کیا کہنا تھا اور ساتھ ہی وہ ربیک اور دوسرے تیار ہونے والے نوجوانوں کو لیتا آئے۔ سامیرا کو ہوشیار کرنا تھا کہ قلعوں میں معمولات پر عمل ترک کر دیا جائے اور کسی بھی لمحے آرگون کی طرف سے حملے کے لیے تیار رہا جائے۔ ایرٹ، ساشا، شاٹ اور رائٹوں ہم سے ایک جگہ الگ ہو گئے۔ یہاں سے تینوں قلعوں کی پشت دکھائی دے رہی تھی۔ وہ سامیرا والے قلعے کی طرف روانہ ہوئے اور ہم ایک بلند چٹان پر چڑھ گئے جس پر کسی جانور کے چڑھنے کا امکان کم تھا۔ میں نے ایرٹ کے ہاتھ سامیرا کو اس ملحول کا

پیغام بھی بھیجا تھا جسے پینے سے خطرناک جانور پاس نہیں آتے تھے۔ کیبن میں آتش زدگی کے بعد وہ بھی تباہ ہوگیا تھا یا آرگون کے سپاہی اس کی بوتل لے گئے تھے۔ چٹان خالص پتھر کی تھی اور اس پر ذرا بھی مٹی یا نباتات نہیں تھے۔ کیونکہ کرنے کے لیے اور کچھ نہیں تھا اس لیے ہم تینوں ایک مناسب جگہ دیکھ کر آرام کرنے لگے۔

مجھے غور و فکر کا موقع ملا تو گزشتہ روز ہونے والے واقعات مجھے کچھ عجیب سے اور معمول سے ہٹ کر لگے تھے۔ اوّل آرگون کی طرف سے تمام ہی افراد کو قلعے میں روک لینا۔ مگر دوسری طرف ان کا کوئی دستہ تلاش کرتا ہوا بالآخر ہماری پناہ گاہ تک پہنچ گیا اور اس نے نہ صرف اسے تباہ کر دیا بلکہ روبیر کو بھی ساتھ لے گئے۔ اس کے بعد ہم نے ان کا تعاقب شروع کیا اور باغات میں انہیں جالیا مگر جب ہم نے ان پر حملہ کیا اور سب کو ختم کر دیا تو پتا چلا کہ جسے ہم روبیر سمجھ رہے تھے وہ دوسری لڑکی نکلی اور روبیر کو سپاہی آرگون لے جا چکے تھے۔ پھر دوسری لڑکی نائب مہا پجاری ایرٹ کی بیٹی ساشا نکلی اور اس کا رویہ بھی عجیب تھا۔ اس نے چھوٹتے ہی مجھے اپنے باپ کا قاتل قرار دے دیا اور اب بھی اس کے رویے سے لگ رہا تھا کہ اس نے اپنے خیال میں کوئی تبدیلی نہیں کی تھی۔

سوال یہ تھا کہ سپاہی اسے کس کی اجازت سے قید خانے سے نکال کر آرگون سے باہر لائے تھے؟ اور قلعے سے باہر لانے سے پہلے اسے کسی اور جگہ لے گئے تھے وہاں ساشا پر کیا گزری تھی؟ اس سارے قصے میں یہی بات مجھے ہضم نہیں ہو رہی تھی۔ لڑکی نے خود کو ساشا قرار دیا تھا۔ کیا واقعی وہ ساشا تھی یا کوئی اور لڑکی جو خود کو ساشا کے روپ میں پیش کر رہی تھی۔ آرگون میں بیٹھے مکاروں سے کچھ بعید نہیں تھا جن میں مہا مکار ڈیوڈ شا بھی موجود تھا۔ وہ اس قسم کے منصوبے بنانے کا ماہر تھا۔ بہر حال اس لڑکی کی حقیقت زیادہ دیر چھپی نہیں رہتی اور میں نے سوچ لیا تھا کہ اگر یہ کوئی سازش بھی ثابت ہوئی تو میں اس لڑکی کو استعمال کروں گا۔ اس دشت کی سیاحی میں مجھے بھی اس قسم کی سازشوں کا جواب دینا آ گیا تھا۔ اب مجھے سامیرا کے جواب کا انتظار تھا۔ میں نے ایرٹ سے کہا تھا کہ کوئی جلدی نہیں ہے وہ اپنا کام نمٹا کر ہی واپس آئے یعنی جو جو کام میں نے اس کے ذمے لگائے تھے انہیں بہر صورت انجام دے۔ اب میرے پاس سوائے آرام اور انتظار کرنے کے کوئی کام نہیں تھا۔

دوپہر کو چنوں سے پیٹ پوجا کی تھی اور اب شام کے لیے ہمارے پاس زیادہ چیزیں نہیں رہی تھیں لیکن اگر ایرٹ یا ربیک نہ آتے تب بھی گزارا ہو جاتا۔ ہم پانی کے کئی مشکیزے لے آئے تھے اس لیے پانی کی کوئی کمی نہیں تھی۔ یہ کئی دن کے لیے بھی کافی ہو سکتا تھا۔ ایمار اور مارٹ آپس میں گپ شپ کر رہے تھے اور میں ان کی گفتگو سن رہا تھا۔ مارٹ کہہ رہا تھا کہ اگر وہ اس جنگ میں زندہ رہا تو پھر اس کی شادی ہو جائے گی۔ اس نے لڑکی پسند کر لی تھی۔ ایمار کو شادی کا خاص شوق نہیں تھا۔ اس کی خواہش تھی کہ وہ فوج میں اوپر جائے اور اعلیٰ عہدہ حاصل کرے۔ شادی اور گھر بسانے جیسے معاملے بعد میں بھی دیکھے جا سکتے تھے۔ مزے کی بات تھی کہ مارٹ جس لڑکی کو پسند کرتا تھا وہ ایمار کی بہن تھی۔

مگر ان کے ہاں اس معاملے میں جذباتی ہونے کا رواج نہیں تھا۔ وہ اسے ایک فطری چیز سمجھتے تھے کہ کوئی ان کی بہن یا بیٹی کو پسند کرے یا وہ کسی کو پسند کرے۔ اسے یہاں غیرت کا مسئلہ نہیں بنایا جاتا تھا مگر ساتھ ہی وہ مرد اور عورت کے غیر قانونی تعلق کے بارے میں بہت حساس تھے۔ اس کا اندازہ میرے کیس سے لگایا جا سکتا تھا کہ میں ان کے لیے کتنا ضروری تھا مگر انہوں نے مجھے سزا سنا کر بلا تکلف اس پر عمل درآمد بھی کر دیا۔ اعلیٰ طبقہ جس میں حکمران اور پجاری شامل تھے۔ وہ بھی صرف اپنے حرم اور مخصوص کی ہوئی عورتوں سے جسمانی تعلق قائم کر سکتے تھے۔ یہاں ایک مرد کو ایک شادی کی اجازت تھی۔ جب تک اس کی پہلی بیوی زندہ رہتی یا ان کے درمیان علیحدگی نہیں ہو جاتی مرد دوسری شادی نہیں کر سکتا تھا۔ حرم کے لیے عورتیں حاصل کرنے کا ایک طریقہ کار تھا اور کسی سے زبردستی نہیں کی جاتی تھی مگر کچھ عرصے سے اس قانون پر عمل نہیں ہو رہا تھا۔ ہمارے سامنے مثالیں تھیں کہ آرگون میں سپاہ اور اوپری طبقے کو کھلی چھوٹ دے دی گئی تھی۔

سامیرا کے قلعوں میں ان قوانین پر جو مرد و عورت کے تعلق کو واضح کرتے تھے بہت سختی سے عمل کیا جاتا تھا۔ دیکھا جائے تو یہ اچھی بات تھی۔ ورنہ یہ مختصر سا معاشرہ بے راہ روی کے ہاتھوں آسانی سے تباہ ہو سکتا ہے۔ جیسا کہ ہماری دنیا میں بعض افریقی ملک ہو رہے ہیں۔ جہاں بیس فیصد سے بھی زیادہ آبادی ایڈز جیسے مہلک اور جان لیوا مرض کا شکار ہو چکی ہے اور اس کی وجہ بے راہ روی ہی ہے۔ آرام اور سوچ بچار میں شام ہوئی اور پھر رات آ گئی۔ ہم نے ایک مشعل جلائی تھی مگر اس کی روشنی کو اس طرح محدود کیا

کہ وہ دور سے نظر نہ آئے اور ہم تاریکی میں نہ رہیں۔ ایسا لگ رہا تھا کہ ایرٹ کو دیر ہو رہی تھی اور شاید وہ اب صبح ہی آتا۔ ہم تینوں نے بچی کچی اشیا سے ڈنر کیا۔ پیٹ تو نہیں بھرا مگر گزارا ہو گیا تھا۔ میں نے ایمار سے کہا۔ ''رات کو پہرہ دینا ہے کوئی ایک فرد جاگتا رہے۔''

''پہلے میں جاگتا ہوں۔'' ایمار نے پیش کش کی تو میں اور مارٹ لیٹ گئے۔ سخت چٹان کے باوجود مجھے نیند آگئی تھی۔ کچھ عرصے سے سخت جگہوں پر سونے کی عادت پڑ گئی تھی۔ ایمار کے بعد مارٹ نے پہرہ دیا اور صبح کے قریب اس نے مجھے جگا دیا۔ ابھی آسمان پر ستارے تھے اور دور کہیں چاند بھی تھا مگر اس کی روشنی وادی تک رسائی سے قاصر تھی۔ مجھے حاجت ہو رہی تھی میں چٹان سے نیچے آیا اور فارغ ہو کر دوبارہ اوپر کا رخ کیا۔ میرا اندازہ تھا کہ میں چھ گھنٹے سویا تھا اور اتنی نیند کافی تھی میں خود کو تازہ دم محسوس کر رہا تھا۔ کسی قدر پانی سے میں نے منہ دھویا اور پھر ہلکی ایکسر سائز کرنے لگا۔ اسی دوران میں اوپر روشنی نمودار ہونے لگی تھی مگر یہ روشنی ابھی وادی سے دور تھی۔ مزید ایک گھنٹے بعد ستارے غائب ہونا شروع ہوئے یعنی اوپری حصے میں دھند چھا رہی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ یہاں صبح کے نزدیک تاریکی زیادہ ہو جاتی تھی اور جب اوپر سورج نکل آتا تب نیچے روشنی ہوتی تھی۔

میرے جاگنے کے تقریباً دو گھنٹے بعد جب کہ ماحول ابھی تاریک تھا قلعوں کی طرف سے مجھے کچھ ہلکی روشنیاں حرکت کرتی دکھائی دیں۔ تقریباً ڈیڑھ میل دور قلعوں کی روشنیاں تو صاف دکھائی دے رہی تھیں مگر ان کے آس پاس ابھی تاریکی تھی۔ وہ روشنیاں اسی تاریکی میں حرکت کر رہی تھیں۔ میں چوکس ہو گیا مگر ان دونوں کو نہیں اٹھایا۔ پندرہ بیس منٹ بعد روشنیاں پاس آگئیں۔ یہ کوئی دس گیارہ افراد تھے۔ ان میں سے چار نے مشعلیں اٹھا رکھی تھیں اور باقیوں کے پاس دوسرا سامان تھا جو انہوں نے بڑے تھیلوں کی صورت میں اپنے شانے پر لاد رکھا تھا۔ جب ایرٹ اور دوسرے قلعوں کی طرف روانہ ہوئے تھے تو انہوں نے آرگون کے فوجی لباس اتار کر اپنے لباس پہن لیے تھے۔ آنے والوں میں ان چاروں کے علاوہ ربیک اور چھ دیگر نوجوان تھے۔ ان کے نزدیک آنے پر میں نیچے اتر آیا۔ ربیک گرم جوشی سے میرے سینے سے لگا اور بولا۔ ''اب میں آپ کی بات سمجھ سکتا ہوں۔''

''سامیرا نے تمہارے ساتھ بھی وہی عمل کیا؟'' میں نے حیرت اور خوشی سے پوچھا۔

''صرف میرے ساتھ ہی نہیں ایرٹ اور ساشا کے ساتھ بھی کیا۔ اب ہم تینوں آپ کی زبان سمجھ سکتے ہیں۔''

ساشا ان کے ساتھ تھی اور ایک طرف خاموش کھڑی تھی۔ میں ربیک اور ایرٹ کو ایک طرف لے گیا اور دھیمے لہجے میں پوچھا۔ ''سامیرا اس کے بارے میں کیا کہتی ہے؟''

''یہی ساشا ہے۔'' ایرٹ نے جواب دیا۔

''لیکن سامیرا نے پیغام دیا ہے کہ آپ اس سے محتاط رہیں۔'' ربیک نے کہا۔

''آپ کے پیغامات سامیرا تک پہنچا دیے ہیں اور انہوں نے کہا کہ آپ کی ہدایت پر پورا عمل ہوگا۔'' ایرٹ نے بتایا۔ ہم چٹان کے اوپر آئے۔ میں نے ایرٹ کے توسط سے جو پیغامات بھجوائے تھے۔ ان میں اس شخص کی تلاش بھی شامل تھی جو روبیر سے قید خانے میں ملا تھا اور اس نے اسے شاہین کی دھمکی دے کر اقبال جرم کرنے اور اس میں مجھے ملوث کرنے کو کہا تھا۔ پہلے مجھے اس کا خیال نہیں آیا تھا کہ اس شخص کو تلاش کرانا چاہیے اگرچہ ربیک کی مدد سے سامیرا کو ساری کہانی بتا دی تھی کہ روبیر کو کس طرح مجبور کیا گیا۔ مگر روبیر کے غائب بلکہ اغوا ہونے کے بعد اس شخص کی تلاش لازم ہو گئی تھی۔ وہ ہماری رہنمائی کر سکتا تھا کہ روبیر کو کیوں اغوا کیا گیا ہے اور ساشا کو ہم تک پہنچانے کے پیچھے کیا کہانی ہو سکتی ہے؟ سب سے بڑھ کر اس سے ہمیں آرگون کے اندر کے راز معلوم ہو سکتے تھے۔

ربیک اور ایرٹ کے ہم زبان ہونے سے مجھے خوشی ہوئی تھی کہ ابلاغ کا بہت بڑا مسئلہ حل ہو گیا تھا۔ ورنہ انہیں اپنی بات سمجھانے کے لیے مجھے اچھی خاصی ورزش کرنا پڑتی تھی۔ وہ دونوں ہی ذہین نوجوان تھے۔ میں ان سے اپنی بات کر سکتا تھا۔ میں نے صرف ساشا کے لیے کہا تھا کہ سامیرا اسے میری بات سمجھنے کے قابل بنا دے مگر اس نے ایرٹ اور ربیک کو اس قابل بنا کر میرا کام بہت آسان کر دیا تھا۔ میں نے روبیر کے اغوا اور ساشا کے ملنے کے بارے میں انہیں اپنے تاثرات سے آگاہ کیا۔ وہ حیران ہوئے تھے۔

''آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔'' ایرٹ نے کہا۔ ''یہ بات میرے ذہن میں نہیں آئی۔''

''یہ آرگون کی اہم ترین قیدی تھی۔'' میں نے ذرا دور بیٹھی ساشا کی طرف دیکھا۔ ''لیکن سپاہی اسے کسی عام لڑکی کی طرح قید خانے سے نکال کر اپنے ساتھ شہر سے باہر لے آئے۔ کیا یہ بات مشکوک نہیں ہے؟''

''بالکل مشکوک ہے۔'' ربیک نے کہا۔ ''مگر سامیرا نے تصدیق کی ہے بھی ساشا ہے کیرٹ کی بیٹی۔''
''اس میں مجھے بھی شبہ نہیں ہے مگر اس نے آتے ہی مجھے اپنے باپ کا قاتل قرار دیا۔ اس سے لگتا ہے کہ اس کے دل میں میرے خلاف کچھ نہ کچھ ہے۔''
''شہباز ٹھیک کہہ رہے ہیں۔'' ایرٹ بولا ''میں نے اس سے جو گفتگو کی ہے مجھے بھی لگ رہا ہے یہ شہباز کے خلاف اپنے دل میں عناد چھپائے ہوئے ہے۔''
ربیک فکر مند ہو گیا۔ ''اس صورت میں اسے اپنے ساتھ رکھنا خطرناک ہو سکتا ہے۔''
''ہم اسے قلعے میں چھوڑ سکتے ہیں۔'' ایرٹ نے تجویز پیش کی۔
''نہیں ہم اسے اپنے ساتھ رکھیں گے۔'' میں نے انکار کیا۔ ''میں دیکھنا چاہتا ہوں کہ میرے دشمن اسے کس طرح میرے خلاف استعمال کرتے ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ میں ان کی چال ان ہی پر پلٹ دوں۔''
''وہ کیسے جناب؟'' ربیک نے پوچھا۔
''یہ آنے والا وقت بتائے گا۔'' میں نے روشنی تیز ہوتے دیکھی تو کھڑا ہو گیا۔ ''ہمیں یہاں سے جانا ہو گا۔ باقی باتیں راستے میں ہوں گی۔''
ہم ٹیلے سے اترے اور وادی کے مغربی حصے کی طرف روانہ ہو گئے۔ ٹیلے کی طرف جانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ اگر ساشا نہ نکلتی تو میں ردبیر کی گم شدگی اور ہمارے ٹھکانے کی تباہی کو اتفاق سمجھتا مگر اب وہاں کا رخ کرنا دشمن کے کسی جال میں پھنسنے کے مترادف بھی ہو سکتا تھا۔ ہمیں اس سے ہٹ کر کوئی اور ٹھکانہ تلاش کرنا تھا۔ میرے ذہن میں ایک جگہ تھی۔ روشنی تیز ہوئی تو ہم نے ایک جگہ رک کر ناشتا کیا۔ ربیک اپنے ساتھ وافر مقدار میں کھانے پینے کا سامان لایا تھا۔ سامیرا نے اس کے ہاتھ اس محلول کی خاصی مقدار بھیجی تھی جس کی بو جانوروں کو ہم سے دور رکھتی تھی۔ دو گھنٹے بعد ہم ٹیلے کے عقب سے ہوتے ہوئے اندر جنگل میں جانے لگے۔ میں نے کوشش کی تھی کہ ٹیلے سے دور سے گزروں مگر ساتھ ہی وہ نظر میں بھی رہے کیونکہ اسی کی مدد سے میں اس جگہ پہنچتا۔ جنگل میں آتے ہی سب نے ہتھیار سنبھال لیے تھے۔
ربیک جن سپاہیوں کو ساتھ لایا۔ وہ سب مضبوط صحت مند اور تنومند نوجوان تھے۔ ان کے سخت ابھرے ہوئے مسلز ان کی سخت جانی کی گواہی دے رہے تھے۔ ان میں سے دو

قوتِ حافظہ

میں کبھی قوی حافظے کا مالک نہیں رہا اور اب تو یہ عالم ہو گیا ہے کہ رات کو کیا چیز کھائی تھی۔ صبح کو یہ بھی یاد نہیں رہتا۔ کئی مہینے کی بات ہے کہ تاروں کی چھاؤں میں ٹہلنے نکلا۔ واپسی پر اپنے گھر کا راستہ بھول گیا۔ وہ تو ایک میرے ہم عمر ٹہلتے مل گئے۔ میں نے ان سے پوچھا کہ یہیں کہیں برساتی نالے کے کنارے جو ایک گنبد والا مکان ہے کیا آپ اس کا راستہ بتا سکتے ہیں؟ انہوں نے کہا۔ ''کیا آپ جوش صاحب کے مکان جانا چاہتے ہیں؟'' میں نے کہا۔ ''جی ہاں۔'' اور ان نیک مرد نے مجھ کو میرے گھر تک پہنچا دیا اور رخصت ہوتے ہوئے انہوں نے مجھ سے کہا۔ ''آج سے چالیس بیالیس برس پیشتر میں نے جوش صاحب کو آگرے میں دیکھا تھا۔ میرا نام نصیر احمد ہے۔ جوش صاحب سے میرا سلام کہہ دیجیے گا۔'' اور میں نے فرط شرم سے یہ نہیں بتایا کہ میں ہی جوش ہوں اور تو اور آپ کو مشکل سے یقین آئے گا کہ ایک روز خط لکھنے کے بعد جب دستخط کی نوبت آئی تو اپنا تخلص بھول گیا۔ چند سیکنڈ تک مجھ پر عجیب کرب کی کیفیت طاری رہی۔ دل دھڑ دھڑ کرنے لگا اور اگر دو چار سیکنڈ کے اندر اپنا تخلص یاد نہ آ جاتا تو یقین فرمائیے میرا دم نکل جاتا۔ میں نے یہ بات اسی واسطے لکھ دی ہے کہ اگر میری زندگی کے کسی واقعے میں کمی بیشی یا تغیر و تاخیر نظر آئے تو آپ اسے میرا ارادی فعل نہ سمجھیں اور میری حالت پر ترس کھا کر اسے معاف کر دیں۔
(جوش ملیح آبادی کی ''یادوں کی برات'' سے اقتباس)
مرسلہ: منشی محمد عزیز مگے۔ لڈن دہاڑی

پتھر کے بھاری ہتھوڑے ہتھیار کے طور پر استعمال کرنا جانتے تھے۔ ایک رسی کے سرے پر بندھا بھاری پتھر گھما کر مارنے کا ماہر تھے اور باقی تین عام لڑاکے تھے مگر وہ بھی تیر اندازی اور نیزے بازی کے ماہر تھے۔ اب ہم سب ملا کر تیرہ جنگجو تھے اور ساشا آخری فرد تھی مگر وہ لڑنا نہیں جانتی تھی۔ ٹیلے کے پیچھے سے ہو کر ہم گھنے جنگل میں داخل ہوئے تو میں شمال کی طرف مڑ گیا۔ یہاں درخت اتنے اونچے اور گھنے تھے کہ روشنی بہ مشکل ہی نیچے تک آرہی تھی۔ مجھے خیال آیا کہ یہاں سبزے میں ہونے والا فوٹو سینتھیسس کا عمل بہت اعلیٰ درجے کا ہوگا ورنہ بنا دھوپ کے اتنا زیادہ سبزہ ہونا ممکن نہیں تھا۔

یورپ اور کینیڈا کے وہ خطے جہاں سال کے بیشتر وقت آسمان پر بادل رہتے ہیں۔ ان خطوں میں پائی جانی والی نباتات کو بھی اعلیٰ درجے کے فوٹو سینتھیسس کے عمل سے کام لینا پڑتا ہے۔ مگر باقی دنیا میں پائے جانے والے پودوں اور درختوں کو پھر بھی سورج کی روشنی ملتی ہے مگر ان پودوں اور درختوں کو یہ روشنی بالکل نہیں ملتی تھی۔ اس کے باوجود یہاں سبزے کی بہتات تھی۔ سبز رنگ کا ہر شیڈ یہاں موجود تھا۔ میں نے کہہ دیا تھا کہ جنگل میں سفر بالکل خاموشی سے ہونا ہے۔ اس لیے سب خاموشی سے سفر کر رہے تھے اور کوئی آپس میں بات نہیں کر رہا تھا۔ ساشا درمیان میں تھی اور وہ صبح سے اب تک یوں لاتعلق بنی ہوئی تھی جیسے ہماری قیدی ہو اور مجبوراً ہمارے ساتھ آئی ہو۔ اس نے مجھ سے یا کسی سے بھی بات کرنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ ہم میں سے بھی کسی نے اسے مخاطب نہیں کیا تھا اور جب سے میں نے محتاط رہنے کو کہا تھا تو ربیک اور ایرٹ بھی اس سے دور تھے۔ مجھے یہ بات درست نہیں لگی۔

یہاں چپ رہنے کی مجبوری تھی مگر میں نے سوچ لیا کہ جب ہم محفوظ جگہ پہنچ جائیں گے تو میں ایرٹ اور ربیک کی ڈیوٹی لگاؤں گا کہ وہ اس سے بات کریں اور اسے بات کرنے پر مجبور کریں۔ آدمی کے اندر کیا ہوتا ہے۔ اس کا پتا اس کے عمل یا زبان سے چلتا ہے۔ عمل سے پتا چلنے کی صورت میں دیر ہو چکی ہے۔ زبان سے آدمی قبل از وقت بھی ہوشیار ہو سکتا ہے۔ تقریباً آدھے گھنٹے بعد ہم اس چٹان تک پہنچ گئے جو بہ ظاہر چڑھائی کے قابل نہیں تھی اور اس کے ساتھ ہی وہ بڑا سا کھائی نما کنواں تھا جس کی گہرائی نامعلوم تھی۔ میں نے یہ سفر رات میں کیا تھا اور چٹان بھی رات میں دیکھی تھی۔ پھر اس پر چڑھنے کی کوشش روبیر نے کی تھی اور ناکام رہی تھی

میرا خیال تھا کہ میری کوشش ناکام نہیں رہے گی۔ ایک بار کوئی ایک فرد بھی اوپر پہنچ جاتا تو باقیوں کے لیے کام آسان ہو جاتا کیونکہ ہم کام آسان کرنے والی چیز یعنی رسی اور لکڑی سے بنی ہوئی سیڑھیاں ساتھ لائے تھے۔ چٹان کوئی ستر فٹ بلند اور اس کا گھیرا کوئی سو سے ڈیڑھ سو گز بیضوی قطر کا تھا۔ میں نے ربیک سے کہا۔

''ہمیں اس پر چڑھنا ہے۔''

ایرٹ نے کہا۔ ''میں یہ کام کرلوں گا۔''

اس نے اپنا سامان اتارا اور رسی کا ایک لچھا لے کر چٹان پر چڑھنے کے لیے مناسب جگہ تلاش کرنے لگا۔ چٹان تقریباً سیدھی اور اس کی دیواریں سپاٹ تھیں۔ ان میں رخنے بہت کم تھے مگر ربیک نے ایک جگہ تلاش کرلی جہاں سے وہ اوپر چڑھ سکتا تھا اور اس نے چڑھنا شروع کر دیا۔ وہ خالی ہاتھ اور پاؤں استعمال کر رہا تھا اس نے اپنا چرمی جوتا بھی اتار دیا تھا۔ تقریباً پچاس فٹ کے بعد ایک جگہ ہاتھ یا پاؤں جمانے کے لیے کوئی جگہ نظر نہیں آئی۔ سوائے ایک لٹکے ہوئے ایک ابھرے ہوئے پتھر کے اور ربیک اپنا جسم تولنے لگا۔ میں، ایرٹ اور دوسرے نیچے موجود اسے دیکھ رہے تھے۔ ہم تیار تھے کہ وہ گرے تو زمین کے بجائے وہ ہمارے ہاتھوں میں آئے اور شدید چوٹ سے محفوظ رہے۔ مجھے یہ خطرناک لگا تھا اور میں نے نیچے سے کہا۔ ''ربیک احتیاط سے۔''

مگر اس نے کوشش کی جہاں اس کے پاؤں جمے ہوئے تھے اس نے وہاں سے خود کو پوری قوت سے اوپر اچھالا اور اس کا ہاتھ پتھر تک پہنچا مگر اس پر جم نہ سکا۔ ایک ہلکی سی چیخ کے ساتھ وہ نیچے آیا اور ہم سب تیار تھے ہمارے ہاتھ ایک دائرے کی صورت میں پھیلے تھے اور وہ اس دائرے پر گرا۔ جھٹکے سے سب کے ہاتھ نیچے گئے اور ربیک پھر زمین پر گرا۔ مگر ہاتھوں نے اس کی گرنے کی رفتار کو اتنا کم کر دیا تھا کہ وہ زمین پر گرا تو کوئی خاص چوٹ نہیں آئی اور وہ کپڑے جھاڑتا ہوا کھڑا ہو گیا۔ اسے معمولی سی چوٹیں آئی تھیں۔ البتہ ہم سب اپنے ہاتھ سہلا رہے تھے جن کو جھٹکا آیا تھا۔ ربیک نے شرمندہ ہوتے ہوئے کہا۔ ''میں ناکام رہا۔''

''کوئی بات نہیں تم نے کوشش پوری کی اور اوپر تک پہنچ بھی گئے تھے۔'' میں نے اسے تسلی دی۔ اسی لیے ایرٹ نے حیرت سے کہا۔

''ارے اسے دیکھنا۔''

تب ہم نے دیکھا کہ ساشا چٹان پر چڑھ رہی تھی۔

اس نے ایک اور راستہ اختیار کیا تھا۔ یہ زیادہ مشکل تھا کیونکہ اس میں ہاتھ پاؤں جمانے کی جگہیں نہیں تھیں مگر اس کی دیوار کسی قدر کھردری اور زیادہ ترچھی تھی۔ ساشا کسی چھپکلی کی طرح اس پر چاروں ہاتھوں پاؤں جماتی اوپر جا رہی تھی۔ اسے چھریرے جسم اور ہلکے وزن کا فائدہ بھی تھا۔ اس جگہ کا پہلا چالیس فٹ کا مرحلہ دشوار تھا اس کے بعد یہ اوپری حصے میں زیادہ ڈھلان ہو جاتی اور اس ترکیب سے اس پر چڑھنا آسان ہو جاتا۔ اب ہم سب اس جگہ کے نیچے جمع تھے کہ ساشا کے گرنے کی صورت میں اسے بچا سکیں۔ مگر وہ نہایت مہارت سے منٹوں میں چٹان کے آخری حصے میں پہنچ گئی اور اب وہاں چٹان سے بالکل چپک کر سست روی سے آگے بڑھ رہی تھی۔ ہماری نظریں اس پر مرکوز تھیں۔ ڈھیلے اور مشکل لباس میں اس نے یہ کام اس طرح کیا تھا جیسے وہ اس کی عادی ہو۔

پھر اس نے یہ آخری مرحلہ بھی عبور کر لیا اور چٹان کے اوپر چڑھ گئی۔ چند لمحے بعد اس نے رسی نیچے پھینکی۔ ربیک رسی کے سہارے اوپر گیا اور اس نے رسی اور لکڑی سے بنی پہلی رسی نیچے پھینکی۔ ہم ایک ایک کر کے سامان سمیت اوپر جانے لگے اور پندرہ منٹ بعد سب ہی چٹان کے اوپر تھے۔ چٹان اوپر سے نہ صرف ہموار تھی بلکہ بعض جگہوں سے کنارے ابھرے ہوئے تھے۔ اس کے وسط میں پیالہ نما نشیب تھا جس میں گزشتہ بارش کا کائی زدہ پانی جما ہوا تھا۔ مگر چٹان پر کہیں بھی سبزہ نہیں تھا۔ یہ مکمل ننگی چٹان تھی اور اوپر سے ہموار ہونے کے باوجود اس پر نہ تو مٹی تھی اور نہ ہی سبزے نے جڑ پکڑی تھی۔ اصل میں یہ چٹان چٹانوں کے سلسلے کا آغاز تھی اور یہاں نباتات اور مٹی نہ ہونے کے برابر تھی اسی وجہ سے چٹان مٹی اور پودوں سے محروم تھی۔ اس کا ایک حصہ گہرے کنویں کے بالکل ساتھ لگتا تھا اور ساشا اس وقت اسی کنویں میں جھانک رہی تھی۔ میں اس کے پاس چلا آیا۔

''تم نے کمال کر دیا۔''

اس نے سرسری سے انداز میں میری طرف دیکھا۔ ''مجھے بچپن سے شوق تھا، میں بابا کے ساتھ آرگون سے باہر جاتی تھی اور چٹانوں پر چڑھتی تھی۔''

میں نے بھی سرسری سے انداز میں پوچھا۔ ''تمہیں ہتھیار چلانا آتے ہیں۔''

اس نے عجیب لہجے میں جواب دیا۔ ''اگر انسان کسی کو قتل کرنے کا فیصلہ کرلے تو ضروری نہیں ہے اسے ہتھیار چلانے آتے ہوں۔''

میں نے اپنا لہجہ بدستور سرسری رکھا۔ ''ایک ایسا شخص جسے ہتھیار چلانے نہیں آتے اگر وہ کسی کے قتل کا فیصلہ کرتا ہے تو لازمی اس کے پیچھے کوئی بہت بڑی وجہ ہونی چاہیے۔''

''تمہارا کیا خیال ہے آدمی کس وجہ سے کسی کو قتل کر سکتا ہے؟''

''اگر دوسرے نے آپ کے کسی عزیز کو قتل کیا ہو یا خود آپ کی جان کے لیے خطرہ بن گیا ہو۔''

وہ جب مجھے دیکھتی اس کی آنکھوں میں ایک عجیب سا سپاٹ پن آ جاتا تھا۔ اس وقت بھی اس کی آنکھیں سپاٹ تھیں۔ وہ کچھ دیر مجھے دیکھتی رہی پھر جھٹکے سے مڑ کر وہاں سے چلی گئی۔ میں گہری سانس لے کر رہ گیا۔ یہ لڑکی وہ نہیں تھی جو بہ ظاہر نظر آتی تھی۔ سوچتے ہوئے میں نے کنویں میں جھانکا۔ اس وقت دوپہر تھی اور سورج کو وادی کے عین اوپر ہونا چاہیے تھا۔ وادی میں سب سے زیادہ روشنی اسی وقت ہوتی ہے مگر یہ روشنی بھی کنویں کی تہ تک پہنچنے سے قاصر تھی۔ چٹان پر چھوٹے پتھر پڑے تھے میں نے ایک پتھر اٹھا کر کنویں میں اچھالا اور میں حیران رہ گیا جب مجھے اس کے گرنے کی آواز بھی نہیں آئی۔ کنواں اتنا گہرا تھا کہ اس میں اتنی بلندی سے گرنے والے پتھر کی آواز تک باہر نہیں آسکی۔ حالانکہ کئی کلوگرام وزنی پتھر خاصے دھماکے سے تہہ سے ٹکرایا ہوگا۔ مگر فاصلہ اتنا زیادہ تھا کہ آواز اسے طے کر کے یہاں ہماری سماعتوں تک نہیں آسکی تھی۔

ربیک میرے پاس آیا۔ ''یہ جگہ محفوظ ہے لیکن یہ آرگون اور ہمارے قلعوں سے بہت فاصلے پر ہے۔''

''مگر ہمیں جس جگہ جانا ہے اس سے زیادہ فاصلے پر نہیں ہے۔''

''ہمیں کہاں جانا ہے؟''

''جلد میں بتاؤں گا مگر فی الحال اس کے بارے میں مت پوچھو۔''

''مجھے روبیر کا خیال آرہا ہے اسے لے جانے والے درندے لوگ ہیں اور وہ اس کے ساتھ بدترین سلوک کر سکتے ہیں۔''

''ہمیں ذہنی طور پر اس کے لیے تیار رہنا چاہیے۔'' میں نے دھیمے لہجے میں کہا۔ ''صرف روبیر نہیں اس وقت آرگون کے بے شمار لوگ اور خاص طور سے عورتیں ان کے ظلم کا شکار ہیں۔ ہم روبیر کے لیے کچھ نہیں کر سکتے مگر ان تمام مظلوم لوگوں کے لیے یقیناً کر سکتے ہیں جو ربیاٹ اور اس کے کرگوں کے چنگل میں پھنسے ہوئے ہیں۔''

ربیک نے سر ہلایا۔ ''آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔

ہمیں صرف ایک روبیر کی بجائے ان تمام لوگوں کا سوچنا چاہیے۔''

''ان لوگوں کے بارے میں بتاؤ کیا تمہیں ان پر مکمل اعتماد ہے؟'' میں نے نئے آنے والوں کی طرف اشارہ کیا۔

''انہیں سامیرا نے چنا ہے اور انہوں نے ان کے ساتھ کچھ کیا بھی تھا۔ اس کے بعد انہوں نے مجھے کہا کہ اب میں ان پر آنکھیں بند کر کے اعتماد کر سکتا ہوں۔''

ربیک نے بتایا کہ سامیرا ہر نوجوان کو کچھ دیر سامنے بٹھا کر اس کی دونوں کنپٹیوں پر اپنے ہاتھ جما کر اور آنکھیں بند کر کے بیٹھی رہی تھی۔ شاید وہ ان کے ذہنوں کو جانچ رہی تھی۔ میں نے اسے یاد دلایا۔ ''لیکن ساشا سے محتاط رہنے کو کہا ہے۔''

''اب مجھے لگ رہا ہے سامیرا نے ٹھیک کہا ہے۔ ہم اسے عام سی لڑکی سمجھ رہے تھے اور یہ کتنی آسانی سے چٹان پر چڑھ گئی۔''

''ممکن ہے یہ ہتھیار استعمال کرنا جانتی ہو اس لیے سب اپنے ہتھیاروں کے معاملے میں محتاط رہیں۔''

''میں سب سے کہہ دوں گا۔'' ربیک بولا۔

لکڑی کی سیڑھی سے چٹان پر چڑھنا اور اترنا بہت آسان ہو گیا تھا۔ یہ خاص طرز سے اور بہت صفائی سے تیار کی ہوئی سیڑھیاں تھیں۔ ہمارے پاس ان کی تعداد تین تھی اور ہر سیڑھی کی لمبائی سو فٹ کے لگ بھگ تھی۔ مگر فی الحال ربیک نے ایک ہی سیڑھی لگائی تھی۔ بہ وقت ضرورت ہم مزید لگا سکتے تھے۔ کھانا کھا کر میں نیچے آیا۔ یہاں پانی کا منبع نظر نہیں آ رہا تھا اور ہمیں جلد یا بدیر پانی کی ضرورت پڑ جاتی۔ اس وقت تو ہمارے پاس خاصی مقدار میں موجود تھا۔ میں چٹان کے دوسری طرف بڑھا۔ مجھے یاد تھا کہ یہاں اوپر وادی کی دیوار سے آبشار گر رہی تھی اور اس کا پانی یقیناً یہاں کسی جھیل یا ندی کی صورت میں رواں ہوتا۔ مگر سامنے بلند چٹانیں ہونے کی وجہ سے اب وہ آبشار نظر نہیں آ رہی تھی جو فاصلے سے بالکل صاف دکھائی دیتی تھی۔ میں چٹان سے دور ہوا تو مجھے بلند چٹانوں کے عقب میں اڑتا ہوا پانی کا بھاپ نما بادل دکھائی دیا تھا۔

یہ جگہ ہماری چٹان سے کوئی نصف کلومیٹر کے فاصلے پر تھی اور میں اتنی دور اکیلے نہیں جانا چاہتا تھا۔ اس لیے میں نے ایرٹ اور ایمار کو نیچے بلایا اور ہم اس طرف روانہ ہوئے۔ سبزے نے پانی کی موجودگی کا اشارہ کیا اور بالآخر ہم اس چھوٹے سے دریا نما ندی تک پہنچنے میں کامیاب رہے۔ اس میں پانی بہت شوریدہ اور جھاگ والا تھا۔ اس کی قوت اتنی تھی کہ اس میں تیراکی یا نہانے کا سوچا نہیں جا سکتا تھا۔ اس لیے ہم نے اپنے کرتے اتار کر کنارے سے پانی لے کر خود کو دھویا اور صاف کیا۔ ایک دوسرے کی موجودگی میں ہم پاجامے نہیں اتار سکتے تھے ورنہ غسل مکمل کر لیتے۔ بہر حال اب ... طبیعت بہت تازہ ہو گئی تھی۔ پانی بہت سرد تھا مگر اس میں زندگی تھی۔ یہ جگہ دور تھی مگر بہت دور بھی نہیں تھی۔ نہا دھو کر ہم خوش خوش واپسی کے لیے روانہ ہوئے۔

میں نے خالی ہونے والے مشکیزے منگوا لیے تھے ہم نے وہ بھی بھر لیے اور چٹان کے پاس پہنچے تھے کہ اوپر سے ربیک نمودار ہوا اور اشارے سے ہمیں تیزی سے اوپر آنے کو کہا۔ ساتھ ہی اس نے خاموش رہنے کا اشارہ کیا تھا۔

میں نے ایرٹ اور ایمار کو اوپر جانے کو کہا اور جب تک وہ چڑھتے رہے میں آس پاس کا جائزہ لیتا رہا مگر مجھے کوئی خطرہ نظر نہیں آیا تھا۔ مگر ربیک اور دوسرے لوگ اوپر تھے اور وہ دور تک دیکھ سکتے تھے۔ انہوں نے یقیناً کسی خطرے کو اس طرف آتے دیکھ لیا تھا۔ جیسے ہی سب سے آگے جانے والے ایرٹ نے چٹان پر قدم رکھا میں بھی چڑھنے لگا۔ سیڑھی دو افراد کا بوجھ آسانی سے برداشت کر سکتی تھی مگر تین افراد کا بوجھ ڈالنا مناسب نہیں تھا۔ میں درمیان میں تھا کہ ایمار بھی اوپر پہنچ گیا اور ایک منٹ بعد میں بھی اوپر تھا۔ میرے پوچھنے سے پہلے ربیک نے دور شمال مشرقی جنگل کی طرف اشارہ کیا۔

''وہ دیکھیں۔ کچھ ہارن اسی طرف آ رہے ہیں۔''

میں نے دیکھا تو آنے والے ہارن ابھی دور تھے اور ان کی تعداد بھی واضح نہیں تھی مگر وہ کم سے کم نصف درجن ضرور تھے۔ وہ تقریباً چلنے کی رفتار سے اسی طرف آ رہے تھے۔ لیکن ان کی چہل قدمی کی رفتار بھی خاصی تیز ہوتی ہے۔ انہیں دیکھ کر میرے جسم میں سنسنی کی لہر سی دوڑ گئی۔ کیا ہارن نے ہماری پناہ گاہ جان لی تھی؟ اگرچہ یہاں ہم محفوظ تھے۔ کیونکہ وہ اس پر کسی صورت نہیں چڑھ سکتے تھے۔ مگر اس چٹان پر محصور ہونے کی صورت میں جلد یا بدیر ہمیں خوراک اور پانی کی قلت کا سامنا کرنا پڑتا۔ ایرٹ نے میرے اوپر آنے کے بعد سیڑھی بھی کھینچ لی تھی اور میری ہدایت پر سب سے کہہ دیا تھا کہ وہ چٹان کے کنارے جانے سے گریز کریں اور کوئی آواز نہ نکالیں جس سے ہارن کو یہاں ہماری موجودگی کا پتا چلے۔ پھر اس نے مجھ سے کہا۔ ''آپ بروقت آئے اگر کچھ دیر اور ہو جاتی تو آپ اوپر نہیں آ سکتے تھے۔''

وہ ٹھیک کہہ رہا تھا کیونکہ ہارن بے شک معمولی رفتار سے آ رہے تھے مگر یہ رفتار پھر بھی خاصی تھی اور اب وہ چٹان سے کوئی نصف کلومیٹر دور تھے۔ اتنے فاصلے سے ان کے لیے ہمیں دیکھ لینا مسئلہ نہیں تھا۔ میں چٹان کے کنارے لیٹا ہوا تھا اور ایرٹ میرے برابر میں تھا۔ ربیک ذرا فاصلے پر تھا۔ ہم تینوں ہی آنے والے ہارن کو دیکھ رہے تھے۔ ان کی تعداد چھ تھی۔ اس سے پہلے میں نے صرف دو ہارن دیکھے تھے۔ ایک جو معبد کے کنویں میں قید تھا اور جس کے آگے مجھے پھینکا گیا تھا۔ مگر او پر والے کو میری زندگی منظور تھی اس لیے میں بچ گیا تھا۔ پھر دوسری بار ہارن سے سامیرا کے قلعے کے عقب میں واسطہ پڑا اور اس بار بھی میں بچ نکلا۔ مگر دونوں مواقعوں پر میں نے ایک ہی ہارن دیکھا تھا۔ پہلا موقع تھا جو میں اس مخلوق کا پورا ریوڑ دیکھ رہا تھا۔

کچھ ہی دیر میں وہ چٹان کے پاس تھے۔ مگر انہوں نے چٹان کے اوپری حصے کی طرف کوئی توجہ نہیں دی تھی۔ اس کے بجائے وہ غراہٹ بھرے انداز میں شاید آپس میں محو گفتگو تھے۔ میری توجہ ایک بہت کمزور اور لاغر سے ہارن کی طرف گئی تھی۔ اس کی کھال ہڈیوں پر جھول رہی تھی اور اس کے سر اور ایال کے بال سفید ہو رہے تھے۔ ایک موقع پر اس نے منہ اوپر کیا تو اسے چہرے پر بہت بوڑھے ہو جانے والے انسانوں کی طرح جھریاں بھی نظر آئی تھیں۔ اس کی گدلی آنکھیں اندر دھنس گئی تھیں۔ ہارن کے آپس کے تبادلۂ خیال میں وہ شامل نہیں تھا اور ایک طرف خاموشی سے کھڑا تھا۔ یہ ہارن یا تو بیمار تھا یا پھر بہت زیادہ بوڑھا ہو گیا تھا۔ باقی تمام ہارن تنومند اور پوری طرح صحت مند نظر آ رہے تھے۔ وہی آپس میں گفتگو کر رہے تھے۔ ایرٹ نے میرے کان میں سرگوشی کی۔ ''یہ کس لیے یہاں آئے ہیں۔''

''پتا نہیں مگر مجھے نہیں لگ رہا کہ یہ ہمارے چکر میں یہاں آئے ہیں۔ اگر انہیں ہماری موجودگی کا پتا ہوتا تو یہ ایک بار سر اٹھا کر اوپر تو دیکھتے۔''

''آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔'' ایرٹ نے گویا سکون کا سانس لیا۔ ''یہ یہاں ہماری موجودگی سے واقف نہیں ہیں۔ اب یہ جتنی جلد یہاں سے چلے جائیں اتنا اچھا ہے۔''

''مگر یہ کسی نہ کسی کام سے یہاں آئے ہیں۔'' میں نے سوچتے ہوئے کہا۔ ''اگرچہ یہ جانور ہے لیکن بعض اوقات یہ مجھے انسانوں سے ملتے جلتے بھی لگتے ہیں تم دیکھ رہے ہو یہ آپس میں جیسے بات کر رہے ہیں۔''

ایرٹ نے غور کیا اور سر ہلایا۔ ''ہاں واقعی یہ تو جیسے آپس میں بات کر رہے ہیں۔''

لاغر ہارن کو چھوڑ کر باقی پانچ ہارن ایک دوسرے کی طرف منہ کیے تبادلۂ خیال کر رہے تھے۔ ان کے ہاتھ اور سروں کی جنبش سے ایسا ہی لگ رہا تھا کہ وہ آپس میں بات کر رہے ہیں مگر ہمیں جو سنائی دے رہا تھا وہ صرف غراہٹیں تھیں۔ کس غراہٹ میں کیا مفہوم پوشیدہ ہے یہ صرف ہارن جان سکتے تھے۔ ماہرین کہتے ہیں کہ جانوروں کے علاوہ نباتات بھی آپس میں بات کرتے ہیں مگر ان کی زبان صوتی تاثر سے عاری ہوتی ہے۔ سمندری مخلوق ڈولفن اور بڑی وہیل مچھلیاں بھی آپس میں گفتگو کرتی ہیں اور ان کی زبان میں خاصے الفاظ ہوتے ہیں۔ اگر کوئی مچھلی شکار دیکھ لے یا کسی مشکل میں گرفتار ہو تو وہ مخصوص الفاظ کے ذریعے اپنی ساتھیوں کو آگاہ کرتی ہے۔ تجربات سے ثابت ہوا ہے کہ دوسری مچھلی اس پر فوراً ردعمل ظاہر کرتی ہے۔ وہیل کا شکار کرنے والے بعض بڑے فشنگ ٹرالرز پانی میں ان ہی ریکارڈ شدہ آوازوں کا ٹیپ چلا کر وہیل مچھلیوں کو اپنی طرف بلاتے ہیں اور پھر ان کا شکار کرتے ہیں۔

یہاں ہارن بھی جس طرح آوازوں کے ساتھ جسمانی ردعمل دے رہے تھے اس سے لگ رہا تھا کہ وہ باقاعدہ گفتگو یا بحث کر رہے ہیں اور میری چھٹی حس نے اطلاع دی کہ یہ گفتگو یا بحث کا موضوع وہی کمزور اور بوڑھا ہو جانے والا ہارن تھا۔ جو اب رحم طلب نظروں سے اپنے ساتھیوں کو دیکھ رہا تھا۔ مگر یہ مخلوق جس طرح انسانوں کے لیے رحم سے عاری تھی اسی طرح اپنے ہم جنسوں کے لیے بھی بے رحم تھی۔ ان کی بے رحمی کچھ ہی دیر میں کھل کر سامنے آ گئی۔ جب انہوں نے متفقہ فیصلے پر پہنچنے کے بعد لاغر اور بوڑھے ہارن سے کچھ کہا اور وہ دونوں ہاتھ اٹھا کر نحیف آواز میں غرانے لگا۔ وہ شاید ان سے التجا کر رہا تھا مگر وہ اس کی التجا سننے کے نہیں بلکہ اپنے فیصلے پر عمل کرانے کے موڈ میں تھے۔ انہوں نے اسے گھیرے میں لے لیا اور ایک طرف دھکیلنے لگے۔ پہلے تو ہم سمجھے نہیں کہ وہ اسے کس طرف لے جا رہے ہیں مگر کچھ دیر میں واضح ہو گیا۔ ربیک نے بے ساختہ کہا۔

''یہ اسے کنویں کی طرف لے جا رہے ہیں۔''

واقعی وہ اسے دھکیل کر کنویں کی طرف لے جا رہے تھے اور لاغر ہارن مزاحمت کی کوشش کر رہا تھا مگر ان پانچ تنومند اور طاقتور ہارن کے سامنے اس کی کوشش سیلاب پر

بہنے والے تنکے کی مدافعت سے زیادہ نہیں تھی۔ وہ اب رونے والے انداز میں غرا رہا تھا اور خود کو روک رہا تھا مگر ہر دھکے پر جو اسے کسی ہارن کی طرف سے دیا جاتا تھا وہ کنویں کے نزدیک ہوتا جا رہا تھا۔ انہوں نے اسے یوں گھیر رکھا تھا کہ اس کے فرار کی راہ بھی مسدود کر دی تھی۔ اگر وہ کسی سے بچ کر واپس آنے کی کوشش کرتا تو دوسرے کو اپنی راہ میں حائل پاتا۔ یونہی دھکیلتے ہوئے وہ اسے کنویں کے کنارے لے آئے۔ اس منظر کو واضح دیکھنے کے لیے ہم بھی چٹان پر ان کے ساتھ ساتھ گھوم رہے تھے۔ اب لاغر ہارن کنویں کے بالکل کنارے کھڑا تھا اور باقی ہارن نے اسے دھکیلنا بند کر دیا تھا مگر ساتھ ہی وہ اس کے سامنے کسی سنگی دیوار کی طرح جمے ہوئے تھے۔ میں نے ایرٹ، ایمار اور ربیک سے کہا۔

''یہ اسے کنویں میں کودنے کا کہہ رہے ہیں۔''

''مگر کیوں؟'' ایرٹ بولا۔

''شاید یہ بہت بوڑھا اور کمزور ہو گیا ہے یا پھر اس سے کوئی ایسی حرکت ہوئی ہے جس کی سزا میں یہ اسے نیچے پھینکنا چاہتے ہیں۔''

''ان کا انداز بتا رہا ہے کہ یہ اس سے خود کود جانے کی توقع کر رہے ہیں۔'' ایرٹ بولا۔

''میرا بھی یہی خیال ہے۔'' میں نے کہا۔ ہارن ہمارے بالکل نیچے کوئی سو فٹ کے فاصلے پر تھے۔ ان کے خیال سے ہم بہت ہی دھیمی آواز میں بات کر رہے تھے۔ اگر وہ آپس میں مگن نہ ہوتے تو شاید ہماری آواز سن لیتے۔ مگر اس وقت انہیں اس کام کی پڑی تھی جس کے لیے وہ یہاں آئے تھے اور اب اس کی تکمیل چاہتے تھے۔ جب انہوں نے دیکھا کہ لاغر ہارن کودنے پر آمادہ نہیں ہے تو ایک دیوار کی طرح دباؤ ڈالنے کے لیے اس کی طرف بڑھے۔ اس کے قدم لڑکھڑانے لگے اور وہ کنارے پر جمے رہنے کی اپنی کوشش میں ناکام ہو رہا تھا۔ اچانک ایک ہارن نے اس کی گردن پر زور سے ہاتھ مارا۔ اس وار میں اتنی قوت تھی کہ لاغر ہارن کوشش کے باوجود خود کو نیچے جانے سے نہ روک سکا۔ اس کے منہ سے ایک عجیب سی آواز نکلی اور اس کا جسم کنویں میں گرنے لگا۔

چند ہی لمحوں میں وہ نظروں سے اوجھل ہو گیا تھا۔ میں منتظر تھا کہ اتنے وزنی جانور کے گرنے کی آواز تو آئے گی مگر اس کی آواز بھی نہیں آئی تھی۔ پتا نہیں یہ کنواں بہت زیادہ گہرا تھا یا اس کی تہہ میں پانی تھا جس میں گرنے کی وجہ سے آواز اوپر تک نہیں آئی تھی۔ باقی ہارن ذرا جھک کر دیکھ رہے تھے۔ شاید ان کی نظر اتنی تیز ہو کہ تاریکی میں بھی نیچے دور تک دیکھ سکتی ہو۔ وہ اپنے ساتھی کا انجام دیکھ رہے ہوں۔ چند لمحے بعد وہ پیچھے ہٹنے لگے۔ وہ یہاں سے جا رہے تھے اور کچھ دیر بعد ہم ان کے خوف سے آزاد ہو جاتے۔ مگر ابھی وہ چٹان کے ساتھ ہی پیچھے ہٹ رہے تھے کہ ہمارے عقب سے چھینک کی آواز آئی۔ یہ آواز اتنی نمایاں تھی کہ تمام ہی ہارن چونک گئے اور انہوں نے اوپر دیکھا۔ ہم چاروں تیزی سے پیچھے ہٹے تھے مگر اتنی تیزی سے نہیں ہٹ سکے کہ ان کی نظروں سے بچ پاتے۔ فوراً ہی ان کی دھاڑ نما غراہٹ بلند ہوئی۔

میں نے پلٹ کر دیکھا تو ساشا اپنے منہ پر ہاتھ رکھے ہوئے تھی اور اس کی آنکھوں میں خوف تھا۔ چھینک اسی نے ماری تھی۔ اگرچہ چھینک مارنے میں اس کا قصور نہیں تھا۔ مگر اس وجہ سے ہارن اس چٹان پر انسانوں کی موجودگی سے واقف ہو گئے تھے۔ وہ گھوڑوں کی طرح دوڑتے ہوئے چٹان کے چاروں طرف گھوم رہے تھے اور شاید کوئی راستہ تلاش کر رہے تھے جس سے وہ اوپر آ سکیں۔ مگر یہاں ایسا کوئی راستہ نہیں تھا اور ہارن سے ہمیں فوری کوئی خطرہ نہیں تھا۔ میں نے باقیوں کو پیچھے رہنے کو کہا اور خود چٹان کے سامنے والے رخ کی طرف آیا۔ جہاں ہارن موجود تھے اور اوپر ہی دیکھ رہے تھے۔ وہ غرا رہے تھے اور ہنکار رہے تھے۔ مجھے دیکھتے ہی ان کا جوش و خروش بڑھ گیا تھا۔ ایک تو باقاعدہ للکار رہا تھا کہ نیچے آ تجھے دیکھتے ہیں۔ مگر میرا اس کی للکار قبول کرنے کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ انہوں نے بھی چند منٹ کی بھاگ دوڑ کے بعد جان لیا کہ اس بلند چٹان پر چڑھنے کا کوئی امکان نہیں ہے۔ مگر انہیں معلوم تھا کہ ہم کبھی نہ کبھی چٹان سے ضرور اتریں گے اور وہ اسی خیال سے چٹان کے آس پاس کھڑے ہو گئے۔ ربیک اور ایرٹ میرے پاس چلے آئے تھے۔ ربیک نے تشویش سے کہا۔

''یہ جانے کے لیے تیار نہیں ہیں۔''

''اس کینہ پرور جانور کو میں نے جتنا دیکھا ہے یہ انسان کو دیکھ لینے کے بعد اسے مارنے کی انتہائی کوشش کرتا ہے۔'' میں نے کہا۔ ''یہ اتنی آسانی سے جان نہیں چھوڑیں گے۔''

ابھی الفاظ میرے منہ میں تھے کہ کہیں دور سے ایک آواز بلند ہوئی اور مجھے اپنے رونگٹے کھڑے ہوتے محسوس ہوئے یہ آرگون کے مخصوص قرنے کی آواز تھی جو جنگ یا کسی ہنگامی موقع پر بجایا جاتا تھا۔

(جاری ہے)

(نادیہ اصفہانی کا جواب)

عبدالجبار رومی........لاہور

کوچۂ دل میں بلایا تھا تمہیں چاہت سے
کیوں وطن بے وطنی شکوہ کناں ہے مجھ سے

انیس احمد خان........لاہور

کون ابھرا سرِ کنار یقیں
کون وہم و گماں میں ڈوب گیا

نسیم نیازی........سرگودھا

کب کا رخصت ہوا نظارۂ صحرا افروز
اب بھی رنگ آنکھوں میں لہرائے چلے جاتے ہیں

(نیلوفر شاہین اسلام آباد کا جواب)

منشی محمد عزیز مئے........لڈن وہاڑی

اس نے جب پلکوں کو جنبش دی عدم
رائیگاں سب گفتگو کے فن گئے

عرشیہ نیلوفر........مظفر گڑھ

اک ہمی پر رکھتے ہیں سب نام تیری بزم میں
اک ہمی ہیں موردِ الزام تیری بزم میں

عارف حسن........شہزاد کوٹ

اپنی دنیا میں نہیں ہے اب اندھیروں کا گزر
دن جو چھپتا ہے تو آنکھوں میں چمک جاتے ہیں خواب

(منظر علی خان لاہور کا جواب)

اعجاز عباس........فیصل آباد

یاس کا دھواں اٹھا ہر نوائے خستہ سے
آہ کی صدا نکلی بربطِ شکستہ سے

ندیم مرزا........اسلام آباد

کہاں گیا وہ غمِ عشق کا مریض حسین
تہی ہے دیر سے نورائے وقت کا آغوش

(سید امتیاز حسین بخاری سرگودھا کا جواب)

نکہت باری........جھنگ صدر

یوں کبھی سا پا دیتا ہے احساسِ قیام
جیسے گھر سے کہیں ہمسائے چلے جاتے ہیں

نگار........ملتان

یہ تنہائی اکیلا پن مجھے ہر دم رلاتا ہے
کٹھن ہے زندگی میری اسے آسان تو کر دے

(زاہد سلطانی کراچی کا جواب)

عرشیہ سید........سیالکوٹ

زندگی کی سنگ باری سے نہ گھبرا جاؤں میں
زخم کھاتا جاؤں پھر بھی مسکراتا جاؤں میں

عطیہ عباسی........لاڑکانہ

زہراب زمانہ پی پی کر جو اہلِ جنوں تھے راہ لگے
شاعر کو نشور اک زلف دوتا غم دے کے نہ سکی الجھا ہی گئی

رعنا رضوی........مانچسٹر یوکے

ہر چارہ گر کو چارہ گری سے گریز تھا
ورنہ جو ہم کو دکھ تھے بہت لادوا نہ تھے

عباس ندا حسین........کراچی

ہو گیا جسم اگر خاک تو کیا
روشنی ہے مری زندہ مجھ میں

اشفاق انصاری........حیدرآباد

ہزاروں دیپ جلا کر جو آپ بجھ جائے
ہم اس چراغ کے بجھنے کا غم نہیں کرتے

ارشد محمود........کراچی

ہائے جن گلیوں میں برباد ہوا میرا شباب
ان سے اب اٹھتی ہے ماتم کی صدا میرے بعد

(نسرین مشتاق کا جواب)

فہیم الدین صدیقی........کراچی

یہ مرے خون کی حدت ہے ورنہ اے واعظ
نشہ شراب میں ہوتا تو ناچتی بوتل

بی اے ریحان........کوٹ ادو

سوچ کر وہ کھڑکی سے جھانک لے شاید
گلی میں کھیلتے بچے لڑا دیے میں نے

خرم علی راؤ........ کراچی
یہ دنیا ہے یہاں امتحاں در امتحاں
نصرت خداوندی کے بنا کامیابی کا نہیں امکاں

افروز حسن........ رحیم یار خان
یوں چونک اٹھے وہ سن کر میرا شکوہ
جیسے انہیں بھی کوئی گلہ یاد آ گیا
(محمد احمد رضا انصاری کوٹ ادو کا جواب)

حسن سجاد........ شادی پور
یہ سمجھ لینا کوئی مشکل نہ تھا میرے لیے
درد کی پہچان کا رشتہ ہے کیا میرے لیے

عنایت خان........ دبئی (یو اے ای)
یہ دو آنکھیں تو آخر کتنے منظر دیکھ پائیں گی
کسے معلوم دنیا میں ابھی تو اور کیا کیا ہو
(ارم سلطانہ سکھر کا جواب)

ہادیہ ایمان ماہا ایمان........ ہارون آباد
وحشت دل کے تکلف کی ضرورت کے لیے
آج اس شوخ نے زلفوں میں سجائے پتھر

مریم کاشف........ حیدر آباد
وقت ایسا بھی کبھی آتا ہے
آدمی خود کو بھی برا لگتا ہے

نیاز سومرو........ سکھر
وابستہ کیا ہم سے نصیر ان نے کسی کو
خمیازہ مگر ہم ہی یہاں جھیل رہے ہیں
(ارم حارث کراچی کا جواب)

فلک شیر ملک........ شاہ گڑھ
ویران ہے مے کدہ خم و ساغر اداس ہے
تم کیا گئے کہ روٹھ گئے دن بہار کے

عرشیہ احمد........ منڈی بہاؤالدین
وہ رات دن مرے دستِ طلب میں ہے لیکن
قبول ہوتی ہیں کب تک دعائیں دیکھتے ہیں
(نوازش علی سید کا جواب)

سید امتیاز حسین بخاری........ سرگودھا
اجنبی لوگ سبھی یاد تو آتے ہیں مجھے
حسن والے تھے جدا ہو کے رلاتے ہیں مجھے

احمد حسن توفیق........ ملتان
اس قدر نازک ہے دل میرا کہ فضلی ڈر یہ ہے
زندگی کی سنگباری سے نہ گھبرا جاؤں میں

ارباز علی........ حیدر آباد
ازل تا فنا پذیرے آخر
ابد جاوداں میں ڈوب گیا

نصرت جاوید........ ملتان
اچھی گزر رہی ہے میری آپ کے
وعدوں کے درمیان بہانوں کے درمیان

ناہید افروز........ چنیوٹ
اپنی اپنی راحتوں سے جب کبھی فرصت ملے
دوسروں کا درد بھی دل میں جگا کر دیکھیے
(منشی عزیز مے لندن کا جواب)

مسرت........ سکھر
یوں لٹا خانہ دل یاس کے ہاتھوں ہمدم
کوئی حسرت نہ رہی کوئی بھی ارمان نہ رہا

ابرار احمد........ ساہیوال
یاد میں تیری جاگی رات بھر تنہا
اور آنسو تھے میرے ساتھ تنہا
(نسیم زہرہ لاہور کا جواب)

ہادیہ ایمان، ماہا ایمان........ ہارون آباد
نہ گل کھلے ہیں نہ ان سے ملے نہ مے پی ہے
عجیب رنگ میں اب کے بہار گزری ہے

مونس فریدہ راچہ........ کراچی
نغمہ در نغمہ مرے ہونٹوں پہ رکتی ہوئی آہ
جلوہ در جلوہ تری کم نگہی آج کی رات

اشفاق محسن........ راولپنڈی
نہیں فرصت یقیں مانو ہمیں کچھ اور کرنے کی
تری یادیں تری باتیں بہت مصروف رکھتی ہیں
(مائی احمد کا جواب)

منظر علی خان........ لاہور
ہر تمنا دل سے رخصت ہو گئی
آ بھی جاؤ اب تو خلوت ہو گئی

بیت بازی کا اصول ہے جس حرف پر شعر ختم ہو رہا ہے اسی لفظ سے شروع ہونے والا شعر ارسال کریں۔ اکثر قارئین اس اصول کو نظر انداز کر رہے ہیں۔ نتیجتاً ان کے شعر تلف کر دیے جاتے ہیں۔ اس اصول کو مدِ نظر رکھ کر ہی شعر ارسال کریں۔

علمی آزمائش
119
30 اکتوبر 2015ء

میرے خیال سے اس مرتبہ دریافت کی گئی شخصیت کا نام .... ہے۔

نام: ....

پتا: ....

....

انعام یافتہ ہونے کی صورت میں مجھے جاسوسی ☐ سسپنس ☐ پاکیزہ ☐ سرگزشت ☐ بھجوایا جائے

کسی ایک پر ☑ کیجیے۔

کوپن کے ہمراہ اپنے جوابات مورخہ 30 اکتوبر 2015ء تک علمی آزمائش 119 پوسٹ بکس نمبر 982 کراچی 74200 پر ارسال کریں۔

علمی آزمائش۔ 119

ادارہ

ماہنامہ سرگزشت کا منفرد انعامی سلسلہ

علمی آزمائش کے اس منفرد سلسلے کے ذریعے آپ کو اپنی معلومات میں اضافے کے ساتھ انعام جیتنے کا موقع بھی ملتا ہے۔ ہر ماہ اس آزمائش میں دیے گئے سوال کا جواب تلاش کر کے ہمیں بھجوایئے۔ درست جواب بھیجنے والے پانچ قارئین کو ماہنامہ سرگزشت، سسپنس ڈائجسٹ، جاسوسی ڈائجسٹ اور ماہنامہ پاکیزہ میں سے ان کی پسند کا کوئی ایک رسالہ ایک سال کے لیے جاری کیا جائے گا۔

ماہنامہ سرگزشت کے قاری ''یک سطری سرگزشت'' کے عنوان تلے منفرد انداز میں زندگی کے مختلف شعبوں میں نمایاں مقام رکھنے والی کسی معروف شخصیت کا تعارف پڑھتے رہے ہیں۔ اسی طرز پر مرتب کی گئی اس آزمائش میں دریافت کردہ فرد کی شخصیت اور اس کی زندگی کا خاکہ لکھ دیا گیا ہے۔ اس کی مدد سے آپ اس شخصیت کو بوجھنے کی کوشش کریں۔ پڑھیے اور پھر سوچیے کہ اس خاکے کے پیچھے کون چھپا ہوا ہے۔ اس کے بعد جو شخصیت آپ کے ذہن میں ابھرے اسے اس آزمائش کے آخر میں دیے گئے کوپن پر درج کر کے اس طرح سپرد ڈاک کیجیے کہ آپ کا جواب ہمیں 30 اکتوبر 2015ء تک موصول ہو جائے۔ درست جواب دینے والے قارئین انعام کے مستحق قرار پائیں گے۔ تاہم پانچ سے زائد افراد کے جواب درست ہونے کی صورت میں بذریعہ قرعہ اندازی انعام یافتگان کا فیصلہ کیا جائے گا۔

اب پڑھیے اس ماہ کی شخصیت کا مختصر خاکہ

1911ء میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم امین آباد ہائی اسکول لکھنؤ سے اور ایف اے سینٹ جانسن کالج آگرہ سے کیا اور بی اے مسلم یونیورسٹی علی گڑھ سے۔ پھر وہ لکھنؤ یونیورسٹی سے ایم اے کرنے لگے مگر کر نہ پائے۔ غضب کی شاعری کرتے تھے۔ قیامِ پاکستان سے قبل کے ماحول میں بھی وہ لڑکیوں کے پسندیدہ شاعر کہلاتے تھے۔ انہوں نے پاکستان کے لیے قیامِ پاکستان سے قبل ترانہ لکھا تھا۔ 5 دسمبر 1955ء کو انتقال کر گئے۔

علمی آزمائش 117 کا جواب

حسرت موہانی 1298ھ ہجری بمطابق 1875ء کو لکھنؤ اور کانپور کے درمیان واقع قصبہ موہان میں پیدا ہوئے اور 13 مئی 1951ء میں وفات پا گئے۔ اردو کے بڑے شعرا میں شمار ہوتا ہے۔ انگریز حکومت سے انتہا درجے کی نفرت کرتے تھے۔ زندگی کا بڑا حصہ جدوجہد آزادی میں بسر کیا۔ جیل کی صعوبت بھی برداشت کی۔ ایام اسیری میں بھی مشق سخن جاری رکھا مگر پاکستان نہ آئے اور بھارت میں ہی انتقال فرما گئے۔

انعام یافتگان

1۔ علی اکبر راجپوت، کراچی 2۔ عابدہ سلطانہ، سکھر 3۔ نصرت علی اعوان، فیصل آباد
4۔ محمد علی زیدی، چنیوٹ 5۔ نگار سلطانہ، لاہور

ان قارئین کے علاوہ جن لوگوں کے جوابات درست تھے۔

کراچی سے فرزانہ پروین، رفیق عباس، خالد سلطان، ایثار حسین، ظہور علی خان، نغمہ بتول زیدی، اصغر عباس، اصغر علی، فراز واصف، ندیم اکبر، لیاقت حسین، رفیق خانزادہ، اصغر حسین، رانا لیاقت، افضل خان، زاہد حسین زاہد، نادر پرویز،

خادم حسین صدیقی، ناصر افروز ملک، فیصل ندیم، احمد خان، نگار سلطانہ، ندیم علی، فیض حسن بھٹی، ملک اعجاز حسین، افشاں بھٹی، خالد پراچہ، فیض سلطان، شہباز جوکھیو، زوہیب رند، ممتاز علی بھوجانی، فہیم الدین، کوثر خان، اشفاق حسین سید، فرحت اللہ نیازی، افشین جونیجو، وہاب علی خان۔ لاہور سے منظر علی خان، اسلم ملک، عبدالجبار روی انصاری، نادر احمد نوشاہی، نور احمد نور، عدیل الرحمن، معراج علی سید، امجد فاروق حسن فاروقی، نیاز اختر، زریاب علی خان، جعفر علی خان، عابد علی جعفری، ملک شہباز، زاہد چیمہ، فہد علی بخاری، راؤ ستار ایوب۔ ملتان سے راحیل اشرف، فاروق خان، زاہد علی چنگیزی، ندیم بیگ، احمد خان، خورشید حیات، ناصر بیگ، عباس بھٹ، رونق افروز، عباس حیدر زیدی، اشفاق پراچہ، نعمان ربانی، سید رونق علی رضوی، خادم حسین ملک، فراز واصف، نگار افروز، سلطان خان۔ اسلام آباد سے سیف الرحمن خان، خالد بنگش، اصغر حسین سید، ملک عباس، رفیق خانانی، راحیل عثمانی، فاروق عباس نورانی، سید محمد علی زیدی، افتخار الاسلام، ملک نوروز۔ راولپنڈی سے استراج خان، ملک فصیح الحسن، نشاط فاطمہ عباسی شجاع الدولہ، ایس ایم تقی، خضر عباس پیاسا، ممتاز احسن، ناہید مشرف۔ پاراچنار کرم ایجنسی سے غلام عباس طوری۔ جہلم سے اریشہ امتیاز، سعید حسن، نادر اسلام، نکہت ملک نواز، سلطان زرین، فصیح ملک۔ سکھر سے فراست انصاری، اصغر حسنین، علی احمد ضیائی، عباس جوکھیو، تصدق پراچہ۔ گجرات سے احمد نصیر، انعام لاہوری، فاروق اطہر۔ گوجرہ غلام شاہ سے سید ایس ڈی ساغر، ڈاکٹر ایم رمضان۔ سرگودھا سے سید امتیاز حسین بخاری، نذر حسین شاہ، ضیاء الحسن فاروقی، فیض بخش میمن۔ ٹنڈو جان محمد سے تھری امولکھ۔ ہارون آباد سے سلیم کامریڈ۔ ساہیوال سے محمد افضل (فرید ٹاؤن)، رشید اشرف۔ چکوال سے محمد جہانگیر، طارق اکبر، فردوس علی۔ حیدرآباد سے خوشنود حسن صدیقی (لطیف آباد)، حیات کاشف، بینش اصغر، بابر زمان، خان بھائی، معظم علی، فرقان حیدر زیدی، ممتاز الحسن، دردانہ بھٹو، جمل شیخ، سانول شیخ۔ ڈیرہ غازی خان سے رفیق احمد ناز، ارباز نیازی، فضل کریم خان، خلیل الرحمن۔ پشاور سے شیر نواز گل، زہرہ بنگش، عابد علی طوری، انعام خواجہ، زاہد علی خان۔ مردان سے م انور (باڑی چم ہوتی)۔ ملتان سے عنبرین چشتی، حسن اکبر، نیاز عباس، منصور حیدر، چشتی غلام عباس، نیاز احمد قدوسی، عاصم اکبر، سید توقیر علی زیدی، انعام اشرف۔ بھکر سے محمد عارف قریشی۔ جامشورو سے نازنین (کوٹری)، احمد زریاب، اشفاق موسن، عین الرضا۔ شاہ گڑھ سے فلک شیر ملک (ترنڈہ سرائے خان)۔ ٹنڈو آدم سے سونیا جونیجو۔ حیدرآباد سے: زریاب فرحان' اقرا مظاہر۔ لطیف آباد' حیدرآباد سے: طہٰ یاسین' نسرین رانا' توقیر جمالی' نزہت پروین' مسکان بھٹو۔ پشاور سے: محمد شہزاد اعظم' کشمالہ مفتی' گلباز خان' مفتی اکبر خان' عمران وردگ' ہیم اتمان زئی' ڈاکٹر نعمان شہزاد خان۔ لاہور سے: امروز اسلم ملک' ثاقب سجاد' محمد عاقب جنید' سید محمد احسن نواز' عبدالخالق چوہدری' عبدالقادر' یاسمین ملک' فرزانہ مصطفیٰ' کائنات مرزا' شاہینہ اسلم چوہدری' روایت خان' کلثوم شہزاد' سرفراز اکرم خان' عنبرین شاہد' محمد اسلم۔ لالہ موسیٰ سے: بشریٰ اصغر صفدر ملک' ارشد محمد ولی' صبیحہ نواز۔ کھاریاں سے: شعیب اقبالی۔ طاہر پورہ' بہاولپور سے: شاہ رخ ہاشمی۔ کوٹلی' آزاد کشمیر سے: لیاقت علی۔ رحیم یار خان سے: ساجدہ عندلیب' فاخر حسین' مصباح الرضا۔ ننکانہ صاحب سے: جمیل چیمہ۔ واہ کینٹ سے: نور افضل خان خٹک' مجید الرحمٰن' ثانیہ فرید' مسز ثمین نصیر۔ تونسہ شریف سے: میاں محمد نوید۔ حب سے: شاہینہ رضوان۔ ملتان سے: علی محمد۔ خیرپور سے: گل باز خان' خالد آفریدی' ذکیہ ممتاز' عامر جمیل قریشی' محمد علی' صنوبر جوکھیو' صفہ بلوچ' ملک سرفراز۔ منڈی بہاؤالدین سے: جویریہ حلیم' محمد سلیم' حافظ محمد اقبال' مرزا الطاف حسین' نفیسہ جمال' صغراں بیگم' نواز علی' مہوش خان' اطہر احمد قریشی۔ مظفر گڑھ سے رانا محمد سجاد (شاہ جمال)، ظفر خان (کوٹ ادو)، موسن اجمل (شہر سلطان)۔ جھنگ سے کامل اختر، نادر انصاری، نادرہ خورشید۔ چنیوٹ سے اسد اللہ شیرازی، اکمل کمال، سعد فاروقی، نادر خان۔ تلہ گنگ سے ناہید بٹ، خان بیلہ سے اشرف خان گل پڑی۔ میانوالی سے نوروز حسن، کیف علی خان، زاہد خاکوانی، احمد شیراز۔ جھنگ فیصل آباد سے تفصیل بٹ، صدیق لغاری، عنایت اللہ شہپرا۔ رحیم یار خان سے احمد دین، عباس علی، نوشین ملک، فصاحت عباس۔ کوئٹہ سے ناصر چنگیزی، فرحت اللہ، صادق علی، نعمت اللہ خان، انور اللہ راؤ، نکہت، حسن عباس کاظمی، صولت چنگیزی۔ سرگودھا سے اشرف ممتاز، نادر شاہ، اشرف بیہانی، تقی حیدر۔ خانیوال سے زہرہ سید، بابو بھائی، حسن ضیائی۔ حاصل پور سے نعمان ادریس۔ بہاولپور سے کوکب واسطی، شذرہ محمد، عنایت مسیح، خالدہ کنول، قیصر حسن، شاوقار، منہال زیدی، سردار علی مینگل، شہ نواز، اطہر شاہ۔

بیرونِ ملک سے عباس فاروق (عمان سعودیہ)، نوید اسلم (فرنکفرٹ)، ضیاء عباس (مانچسٹر یو کے)، ارباز خان (شارجہ) فاروق علی انصاری الہندی (سلطنت اومان)۔

محترمہ عذرا رسول
سلام مسنون
میں ایک ریٹائرڈ اسکول ٹیچر ہوں اور پہلی بار ایک روداد لکھی ہے۔ یہ میری اپنی روداد ہے۔ اسے آپ بیتی بھی کہہ سکتے ہیں۔ میں نے جو تجربہ حاصل کیا یہ اس کا نچوڑ ہے۔ اس کہانی سے اگر کسی نے سبق حاصل کرلیا تو میں سمجھوں گا کہ میری محنت وصول ہو گئی۔

اسد اللہ
(لاہور)

صرف سولہ سال کی عمر میں ٹیچر ٹریننگ کورس کر کے میں نے ایک سرکاری پرائمری اسکول میں ملازمت کی تھی۔ پھر دوران ملازمت تعلیم بھی جاری رکھی۔ انٹرمیڈیٹ کے بعد بی اے کیا اور پھر بی ایڈ کیا۔ آخر میں ایم ایڈ کر کے ایڈوانس ایجوکیشن سسٹم کا کورس بھی کرلیا۔ اس وقت میں ایک سرکاری ہائی اسکول میں پرنسپل بن چکا تھا مگر وہاں کا جو معیار تعلیم تھا اسے میں اکیلے درست نہیں کرسکتا تھا۔ میرے ماتحت اساتذہ مجھ سے زیادہ طاقتور تھے کیونکہ معاشرے کے طاقتوران کے پشت پناہ تھے۔ جاگیرداروں کے نکمے بچے ان کی ایک جنبش قلم سے پاس اور کلاس میں فرسٹ آجاتے تھے اس لیے انہیں ہی طاقتور ہونا تھا۔ اگر میں ان کا راستہ روکنے کی کوشش کرتا تو میں ہی کمزور ثابت ہوتا اور کئی بار ثابت بھی ہوا۔ اس لیے پہلے میں نے مداخلت کرنا چھوڑی اور پھر ملازمت ہی چھوڑ دی۔

گھر میں ایک دن بھی خالی نہیں بیٹھا تھا۔ ریٹائرمنٹ سے پہلے ہی مجھے ایک اعلیٰ درجے کے نجی اسکول میں نائب پرنسپل کی جاب مل گئی تھی۔ اگلے دن سے میں وہاں جانے لگا۔ یہ اسکول لاہور کے نواح میں تھا۔ کسی زمانے میں اس کے آس پاس دیہات ہوتے تھے مگر اب یہاں جدید اسکیمیں بن رہی تھیں۔ جب میں نے اسکول میں ملازمت کی تو اس وقت یہاں کا دیہی ماحول کسی قدر برقرار تھا مگر اب یہ اتنا ہی ماڈرن علاقہ بن گیا ہے جتنا کہ باقی لاہور ہے۔ شروع میں یہاں ہر طبقے کے بچے پڑھنے آتے تھے۔ ویسے تو یہاں صرف دولت مندوں کے بچے ہی داخل ہو سکتے تھے کیونکہ اس وقت بھی یہاں کی فیس ہزاروں میں تھی۔ مگر ایک پالیسی کے تحت دس فیصد داخلے بالکل مفت دیئے جاتے تھے اور شرط صرف ذہانت کی ہوتی تھی۔ ایسے بچوں کے تمام اخراجات اسکول کے ذمے تھے۔

حکومت کی طرف سے نجی اسکولوں پر پابندی ہے کہ وہ کچھ فیصد بچوں کو مفت میں تعلیم دیں گے مگر اس پابندی پر عمل کوئی نہیں کرتا ہے۔ میرا اسکول ان چند اسکولوں میں سے ہے جہاں اس کی پابندی کی جاتی ہے اور یہی وجہ ہے کہ یہاں سے بہت سے غریب بچے جن کے والدین انہیں سرکاری اسکولوں میں پڑھانے کی بھی حیثیت نہیں رکھتے تھے یہاں سے اچھی تعلیم حاصل کر کے اوپر گئے تھے۔ یہ سب ذہین بچے تھے۔ آج وہ اچھی پوسٹوں پر کام کر رہے

ہیں۔ اپنے کیریئر میں، میں نے بچوں کو ریاضی پڑھائی تھی۔ اس لیے جب میں یہاں نائب پرنسپل بنا تو مجھ سے درخواست کی گئی کہ میں ضرورت پڑنے پر مختلف کلاسز کو ریاضی بھی پڑھا دیا کروں۔ مجھے کوئی اعتراض نہیں تھا بلکہ پڑھا کر مجھے خوشی ہوتی ہے۔ اب ہوتا یہ کہ ریاضی کا کوئی ٹیچر غیر حاضر ہوتا یا چھٹی پر گیا ہوتا تو اس کی جگہ میں اس کی کلاس کو پڑھاتا تھا۔ اس میں درجے کی کوئی تخصیص نہیں تھی۔ میں دوسری تیسری کلاس سے لے کر اونچی کلاسز تک کو پڑھاتا تھا۔

مجھے صرف پڑھانا پسند نہیں تھا بلکہ میں اپنے شاگردوں کو بھی جانچتا تھا کہ ان میں کیا قابلیت ہے اور وہ کس فطرت کے مالک ہیں اور آگے جا کر وہ کیا نکلیں گے؟ سرکاری اسکول میں بھی میں نے بہت سے لڑکوں کو جانچا اور ان کے مستقبل کے بارے میں پیش گوئی کی جو تقریباً پوری ہوئیں کیونکہ جس طرح ماں باپ اولاد کو جانتے ہیں اسی طرح ایک استاد بھی اپنے شاگرد کو اندر تک سے جان جاتا ہے، بہ شرط کہ وہ شاگرد سے مخلص ہو۔ میرا یہ دعویٰ تو نہیں ہے کہ میں اپنے سارے شاگردوں سے مخلص تھا مگر کچھ مجھے متوجہ کرتے تھے اور میں ان پر غور کرتا تھا۔ ان میں بہت ذہین اور محنت سے پڑھنے والے بھی تھے۔ ایسے بھی تھے جو محنتی تھے مگر ذہین نہیں تھے اور وہ اوسط درجے میں آتے تھے۔ کچھ ایسے تھے جو ذہین تھے مگر ان کو تعلیم سے دل چسپی نہیں تھی۔ ایک چوتھی کیٹیگری ان بچوں کی تھی جو نہ تو ذہین تھے اور نہ ہی انہیں محنت کرنا پسند تھا۔

میں نے نوٹ کیا کہ بچوں میں دس فیصد ذہین اور محنتی تھے۔ بیس فیصد کم ذہین مگر محنتی تھے۔ اتنے ہی ذہین مگر محنت سے جی چرانے والے تھے۔ بدقسمتی سے چوتھی کیٹیگری والے سب سے زیادہ یعنی کل بچوں کا پچاس فیصد بنتے تھے۔ مگر یہ تناسب سرکاری اسکول کا تھا۔ نجی اسکول میں بیس فیصد بچے ذہین اور محنتی تھے۔ بیس فیصد محنتی اور کم ذہین تھے۔ چالیس فیصد ذہین اور کم محنتی تھے جب کہ چوتھی کیٹیگری یہاں بیس فیصد تھی یعنی یہاں بھی اکثریت ان بچوں کی تھی جو رزلٹ کے معاملے میں پیچھے ہوتے تھے۔ سرکاری اور نجی اسکول میں ذہین اور اوسط درجے کے بچوں کے تناسب میں کوئی بہت زیادہ فرق نہیں ہے۔ آج بھی یہ فرق اسی طرح قائم ہے۔ وقت گزرنے کے ساتھ اس میں خاص فرق نہیں آیا۔ بلکہ عمومی ذہانت کے معیار میں بھی کمی آئی ہے۔ اس کی وجہ وہی ہمارا مجموعی معاشرتی زوال ہے جو ہر شعبے میں نمایاں ہے۔

جب میں نجی اسکول میں آیا اور یہاں بعض اوقات کلاسز کی ذمے داری بھی دی گئی تو میں نے تیسری کلاس میں چار بچوں کو خاص طور سے نوٹ کیا۔ یہ چاروں ان کیٹیگریز سے تعلق رکھتے تھے جو میں نے اوپر بیان کی ہیں۔ سلمان علی ذہین اور محنتی تھا۔ وہ نہ صرف مشکل سوالات آسانی سے سمجھ جاتا اور اسے عام طور سے دوسری بار بتانے کی ضرورت پیش نہیں آتی تھی۔ وہ اپنا ہوم ورک مکمل اور

بہت صفائی سے کرنے کا عادی تھا۔ ان چاروں میں وہ سب سے کم عمر تھا اور ابھی آٹھ سال کا بھی نہیں تھا۔ گورے چٹے اور معصومانہ نقوش والے سلمان کا تعلق ایک پڑھے لکھے اور مہذب گھرانے سے تھا۔ اس کا باپ واپڈا میں انجینئر اور بہت اچھے عہدے پر تھا۔ اس کی ماں ایک این جی او چلا رہی تھی۔ جس کا مقصد لوگوں کو پیٹ کی بیماریوں کے بارے میں آگاہ کرنا تھا۔ وہ اپنے چار بہن بھائیوں میں دوسرے نمبر پر تھا۔

دوسری کیٹیگری میں راشد صابر تھا۔ سیاہ بالوں اور کسی قدر موٹے مگر متناسب نقوش کے راشد کا تعلق ایک اوپری متوسط گھرانے سے تھا۔ باپ دبئی میں الیکٹریشن تھا اور وہاں سے کما کر بھیجتا تو یہاں سات افراد پر مشتمل کنبہ اچھی زندگی گزار پاتا تھا۔ راشد اپنے چھ بہن بھائیوں میں پانچویں نمبر پر تھا اور صرف وہی اس اسکول میں داخلہ لینے کا اہل قرار پایا تھا۔ راشد بھی ہوم ورک پورا اور صفائی سے کرتا۔ استاد جو پڑھاتے وہ سمجھنے کی پوری کوشش کرتا تھا۔ میں نے ہمیشہ اسے صاف ستھرا اور سلیقے والا بچہ پایا۔ وہ اسکول میں آکر خوش ہوتا تھا اس کا مطلب تھا کہ اسے گھر کی نسبت اسکول زیادہ اچھا لگتا تھا۔ وہ اساتذہ کا دیا ہوا سارا کام وقت پر کرتا تھا۔ ہر ٹیسٹ میں پاس ہوتا تھا۔ اسے شاید کبھی سزا یا سرزنش کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔ مگر وہ ان بچوں میں سے نہیں تھا جو پوزیشن لیتے ہیں۔ ہاں وہ ہمیشہ اوسط سے زیادہ نمبر لیتا تھا۔ ریاضی اس کا پسندیدہ مضمون تھا اور وہ عام طور سے اس میں سو میں سو نمبر لیتا تھا۔

ریاض فخر تیسری کیٹیگری میں آتا تھا۔ اس کی ذہانت آمیز چالاکی اس کے چہرے اور آنکھوں سے جھلکتی تھی۔ وہ کسی قدر سانولے رنگ مگر توجہ حاصل کرنے والے نقوش کے حامل ریاض نے تیسری کلاس میں ہی ٹیچرز اور کلاس فیلوز سے ایسے تعلقات قائم کرلیے تھے کہ اس کے بعد اسے تعلیم کے معاملے میں کبھی کسی مشکل کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔ اس کا ہوم ورک اس کے ساتھی کر دیتے تھے۔ ٹیسٹ اور امتحانات میں وہ دوسروں کی نقل کر کے پاس ہوتا تھا اور کوئی اسے منع نہیں کرتا تھا۔ ریاض کا تعلق ایک جاگیردار گھرانے سے تھا۔ وہ صبح اسکول وین کے بجائے لگژری گاڑی میں آتا اور جب وردی پوش ڈرائیور اتر کے اس کے لیے دروازہ کھولتا تو دوسروں کے دل اور ذہن کے دروازے اس کے لیے خود بہ خود کھل جاتے تھے۔ ریاض جانتا تھا کہ وہ دولت مند ہے مگر وہ یہ بھی جانتا تھا کہ دولت سے فائدہ کیسے اٹھاتے ہیں۔ اسے کبھی پوزیشن حاصل کرنے کی فکر نہیں رہی۔ وہ بس پاس ہونا چاہتا تھا۔ وہ پیچھے رہنا نہیں چاہتا تھا۔

چوتھا بچہ اعظم شاد تھا۔ کھردرے نقوش، مضبوط جسم اور عجیب سی آنکھوں والے اس بچے کو دیکھ کر مجھے حیرت ہوئی کہ وہ اس اسکول میں کیسے داخل ہوا۔ یہاں داخلہ ٹیسٹ کے بغیر نہیں ہوتا تھا۔ مجھے بعد میں علم ہوا کہ اس کی ماں نے اسکول کے مالک کے پاؤں پکڑ لیے تھے کہ اس کے بیٹے کو اسکول میں داخل کرلیں کیونکہ وہ اسے پڑھا نہیں سکتی ہے اور اس کی شدید خواہش ہے کہ اس کا بیٹا پڑھ لے۔ مالک انکار نہیں کرسکا۔ وہ خدا ترس آدمی ہے بھی دس فیصد بچوں کو فری میں داخلہ دیتا ہے۔ اعظم داخلہ ٹیسٹ میں مکمل فیل ہوگیا تھا۔ پاس ہونا دور کی بات ہے وہ بہت ہی کم نمبر حاصل کرسکا تھا۔ وہ پہلے سال ہی فیل ہوگیا۔ اگلے سال وہ بہ مشکل پاس ہوا۔ مگر دوسری میں وہ پھر فیل ہوگیا۔ عام طور سے اگر کوئی بچہ دوسری بار فیل ہو تو اسے اسکول سے نکال دیا جاتا ہے مگر اعظم پڑھتا رہا۔ دوسری بار فیل ہونے پر جب اس کی رپورٹ مالک کے پاس گئی تو اس نے اپنے نوٹ کے ساتھ اسے واپس کردیا۔ اس نے لکھا تھا۔ ''اگر یہ چالیس سال کی عمر تک بھی یہاں پڑھے تو اسے پڑھاؤ۔''

خصوصی استثناء تھا جو کسی اور بچے کو کبھی نہیں دیا گیا۔ اعظم تیسری کلاس میں دس سال سے اوپر کا ہوچکا تھا اور کلاس میں سب سے زیادہ عمر والا لڑکا تھا۔ میں نے اس کے بارے میں سوچا کہ وہ کبھی کچھ نہیں بن سکے گا۔ اس کا بہت زیادہ امکان تھا کہ وہ اسکول چھوڑ جائے گا اور محنت مزدوری کرے گا یا کوئی ٹھیلا لگا لے گا۔ اس سے زیادہ کچھ کرنا اس کے بس کی بات نہیں تھی۔ میں نے اس میں کوئی خوبی نہیں دیکھی تھی۔ وہ خاموش طبع تھا اور خود میں مگن رہتا تھا۔ ہاں میں نے ایک بات محسوس کی تھی کہ وہ خوفزدہ نہیں ہوتا تھا۔ ایک بار اسکول کے میدان میں سانپ نکل آیا اور تمام بچے چیختے چلاتے ہوئے عمارت میں گھس آئے۔ ایمرجنسی کا الارم بجا دیا گیا تھا۔ سانپ کا سن کر اسکول کے گارڈز جب میدان میں پہنچے تو وہاں اعظم موجود تھا اور ایک چھڑی سے سانپ سے کھیل رہا تھا۔ حالانکہ یہ کوئی تین فٹ لمبا اور خطرناک نظر آنے والا سانپ تھا۔ گارڈز نے بتایا کہ اعظم چھڑی سے اسے اشتعال دلاتا اور جب وہ حملہ کرنے کی کوشش کرتا تو چھڑی سے اسے ضرب

لگا تا۔ اس نے سانپ کو ادھ موا کر دیا تھا اور گارڈز کو اسے ٹھکانے لگانے میں کوئی دشواری پیش نہیں آئی۔ مجھے پتا چلا تو اسے بلایا۔ ”تمہیں سانپ سے ڈر نہیں لگا؟“

”نہیں جی۔“ اس نے سادگی سے کہا۔

”کیوں؟“

”کیا کرتا کاٹ ہی لیتا نا۔“

اس کے جواب سے میں نے اندازہ لگایا کہ وہ اتنے موٹے دماغ کا ہے کہ اسے اپنے نفع نقصان کا احساس ہی نہیں ہے۔ بہ ظاہر اس میں متوجہ کرنے والی کوئی بات نہیں تھی مگر میں اس کی طرف متوجہ ہوا اور اس کی پروگریس پر خاص نظر رکھنے لگا۔ اس کی رائٹنگ بہت خراب تھی۔ تیسری کلاس میں بھی اسے حروف تہجی اور الفابیٹ کی صحیح پہچان نہیں تھی اور وہ اکثر غلط لکھتا تھا۔ اس کے ٹیسٹ ایسے ہوتے تھے کہ انہیں دیکھنے کو دل نہیں چاہتا تھا۔ سالانہ امتحانات میں وہ نہ جانے کیسے پاس ہو جاتا تھا مگر یہ توقع عام طور سے دو سال بعد ہی آتا تھا۔ تقریباً ہر کلاس میں وہ دو دو سال پڑھتا رہا۔ یہی وجہ تھی کہ ہر سال اس کے اور اس کے کلاس فیلوز کے درمیان عمر کا فرق بڑھتا چلا گیا۔ جب اس نے چھٹی کلاس پاس کی تو اس کے ساتھ کے طلبہ میٹرک کر کے فرسٹ ایئر میں جا چکے تھے۔

اسکول بارھویں کلاس تک تھا اور طلبہ یہاں سے ہائی اسکول پاس کر کے ہی نکلتے تھے۔ ہاں کسی کو اچھے کالج میں داخلہ مل جائے تو وہ وہاں چلا جاتا تھا۔ مگر زیادہ تر یہیں سے ہائی اسکول پڑھنے کو ترجیح دیتے تھے تاکہ وہ بہترین نمبرز حاصل کر کے آگے پیشہ ورڈگری میں داخلہ لے سکیں۔ یہاں نہ صرف معیارِ تعلیم بہت اچھا تھا بلکہ طلبہ کو پریکٹیکل بہت اچھے کرائے جاتے تھے۔ اسکول کی ساکھ سے بھی اثر پڑتا تھا اور یہاں سے انٹر، ایف ایس سی اور آئی کام کرنے والے طلبہ بورڈ میں پوزیشن بھی حاصل کرتے تھے۔ میں سوچتا کہ ایسے طلبہ کے درمیان اعظم کا وجود ایسا ہی تھا جیسے کسی خوش رنگ اور خوب صورت پودوں والے باغ میں کوئی کانٹوں والا بدصورت پودا۔ مجھے نہیں اُمید تھی کہ وہ بورڈ کے امتحان کے مرحلے تک اسکول میں ٹکے گا۔ اس کے بارے میں میرا یہ اندازہ بالکل درست ثابت ہوا۔ وہ ساتویں میں تھا اور انیس برس کا ہو چکا تھا۔ اب تو اس کی داڑھی مونچھیں بھی نکل آئی تھیں اور ہنوز اس کے میٹرک میں جانے کے کوئی امکانات نظر نہیں آرہے تھے۔ اس نے بھی یہ بات محسوس کر لی اور بالآخر اسکول کی جان چھوڑ دی۔

سلمان علی کے بارے میں میرا اندازہ تھا کہ وہ ان سب سے آگے نکل جائے گا۔ وہ ذہین تھا اور اپنی ذہانت استعمال کرنے کا عادی بھی تھا یعنی اسے محنت کرنے میں کوئی عار نہیں تھی۔ اس کے بارے میں بھی میرا اندازہ درست نکلا جس سال اعظم نے اسکول چھوڑا اسی سال سلمان علی نے بورڈ میں ساتویں پوزیشن کے ساتھ ایف ایس سی کر لیا۔ سلمان نے چھٹی کلاس میں بھی پورے اسکول میں ریکارڈ نمبر لیے تھے اور اسے آٹھویں کلاس میں پروموٹ کیا گیا تھا۔ ایف ایس سی کے بعد اس نے انجینئرنگ یونیورسٹی میں داخلہ لیا تھا۔ اپنے باپ کی طرح اس نے بھی الیکٹریکل کا انتخاب کیا تھا۔ میں اس کے فیصلے سے کسی قدر مایوس ہوا تھا۔ میرے خیال میں وہ اس سے کہیں آگے جا سکتا تھا۔ وہ اس مشینری کو چلا سکتا تھا جس کا اب وہ ایک پرزہ بننے جا رہا تھا۔ مگر یہ تو آغاز تھا ہو سکتا تھا کہ وہ آگے جا کر مزید تعلیم حاصل کرتا اور مینجمنٹ لیول تک پہنچ جاتا۔ یہ حقیقت ہے کہ ہمارے ملک میں ہنرمندوں کی وقعت نہیں ہے وہ ہمیشہ فیصلوں کے لیے اوپر والوں کے محتاج رہتے تھے۔ ایک غلط فیصلہ ان کی ساری محنت اور دیانت پر پانی پھیر دیتا ہے۔ کرپٹ افسران اپنے ہنرمند ماتحتوں کو بھی کرپٹ بنا دیتے ہیں۔ انہیں ان کی قابلیت اور دیانت کا صلہ الٹا ہی ملتا ہے اور وطن عزیز سے ہنرمند ذہانت کے انخلا کی سب سے بڑی وجہ یہی ہے۔

راشد سلمان سے ایک سال پیچھے تھا کیونکہ اس نے پروموشن حاصل نہیں کی تھی اور ثابت قدمی سے ہر سال کلاس پاس کرتا تھا۔ وہ سلمان کے ایک سال بعد ہائی اسکول پہنچا اور اس نے یہاں کامرس کا انتخاب کیا۔ میں نے بتایا کہ اسے ریاضی میں بہت زیادہ دل چسپی تھی اور وہ عام طور سے اس میں ٹاپ کرتا تھا۔ اس لیے جب اس نے کامرس کا انتخاب کیا تو مجھے قطعی حیرت نہیں ہوئی بلکہ یہ میری توقع کے عین مطابق تھا۔ راشد نے کسی بھی سال پوزیشن حاصل نہیں کی مگر وہ اوسط سے اوپر نمبر لیتا رہا اور آخری سالوں میں اس نے زیادہ بہتر کارکردگی کا مظاہرہ کیا۔ میٹرک میں اس نے اے ون گریڈ لیا تھا جب کہ آئی کام میں اس نے اے گریڈ حاصل کیا اور اس کی پرسنٹیج تہتر فیصد آئی تھی۔ ان نمبروں کے ساتھ وہ بی بی اے میں داخلہ لے سکتا تھا اور میرا خیال تھا کہ وہ ایسا ہی کرے گا۔ مگر یہاں اس نے میری توقع کے خلاف

کام کیا۔ اس نے ایک اچھے کالج میں بی کام میں داخلہ لے لیا۔ اس کے لیے کاغذات کی کاپی تصدیق کرانے کے لیے وہ میرے پاس ہی آیا تھا اور میں نے اس سے پوچھا۔ ’’میرا تو خیال تھا تم ایم بی اے میں داخلہ لو گے۔‘‘

’’میری دل چسپی بی کام میں ہے۔‘‘

’’ٹھیک ہے تم بی کام کرلو گے پھر ایم کام بھی کرلو گے مگر زیادہ ویلیو تو ایم بی اے کی ہوتی ہے۔‘‘

’’آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔‘‘ اس نے دھیمے لہجے میں کہا۔ ’’لیکن میرا رجحان اس طرف نہیں ہے۔‘‘

’’جیسی تمہاری مرضی، مجھے امید ہے تم یہاں بھی اپنے ماں باپ اور اسکول کا نام روشن کرو گے۔‘‘

’’انشاءاللہ سر۔‘‘ اس نے جواب دیا تھا۔

سلمان علی نے سولہ سال کی عمر میں ہائی اسکول پاس کیا تھا۔ جب راشد صابر نے ہائی اسکول پاس کیا تو اس کی عمر اٹھارہ سال تھی۔ اعظم نے ساتویں کلاس میں اسکول چھوڑا مگر وہ انیس برس کا تھا۔ البتہ جب ریاض فخر نے ہائی اسکول پاس کیا تو وہ بیس سال کا ہو چکا تھا۔ اس نے سب سے آسان راستہ یعنی آرٹس کا انتخاب کیا اور اس میں آسانی سے ایف اے کرلیا۔ میٹرک میں وہ دو پیپرز میں رہا تھا اس لیے اسے ایف اے کرنے میں تاخیر ہوئی تھی۔ وہ ان چاروں میں سب سے آخر میں اسکول سے نکلا تھا۔ میرا اندازہ تھا کہ وہ آگے پڑھنے کی زحمت نہیں کرے گا اور اگر کی بھی تو وہ ایسی کسی آسان ڈگری میں داخلہ لے گا جسے حاصل کرنے کے لیے اسے زیادہ تگ و دو نہ کرنی پڑے۔ میرا اندازہ درست نکلا جب ایک اچھے آرٹس کالج میں داخلے کے لیے اس نے کاغذات تصدیق کے لیے میرے پاس آئے۔ وہ خود نہیں آیا تھا بلکہ اس کے جاگیردار باپ کا سیکریٹری کاغذات اور کاپیاں لے کر آیا تھا۔ ریاض بی اے میں داخلہ لے رہا تھا۔ اس کے بعد سے ان چاروں سے میرا تعلق عارضی طور پر ختم ہوگیا۔

☆☆☆

جب میں سرکاری اسکول میں تھا اور میرا اسکول دیہی علاقے میں تھا تو میری فیملی بھی وہیں رہتی تھی۔ اماں اور بابا نے وارننگ دے دی کہ وہ شادی کی تاریخ دے رہے ہیں۔ تب میں نے سرتسلیم خم کر دیا اور یوں راحیلہ میری زندگی میں آئی۔ وہ بھی اتفاق سے گورنمنٹ اسکول ٹیچر تھی اور شادی کے بعد اس نے بھی اپنی پوسٹنگ میرے اسکول کے نزدیک ایک گرلز ہائی اسکول میں کرالی۔ یہیں ہمارے چاروں بچے ہوئے۔ دو بڑی بیٹیاں ہیں۔ ساحل اور نبیلہ ایک سال کے وقفے سے ہوئیں۔ پھر نبیلہ کے تین سال بعد احد اللہ ہوا۔ پھر سب سے چھوٹی رامینا تھی۔

سرکاری ملازمت کے بعد جب میں نجی اسکول کی ملازمت میں آیا تو میں نے اسکول کے نزدیک لاہور کی ایک نواحی کالونی میں اپنا مکان لے لیا۔ اس وقت یہ کالونی آباد ہو رہی تھی اور یہاں پلاٹ اور مکان سستے تھے۔ مجھے ریٹائر منٹ پر جو پیسا ملا تھا وہ میں نے مکان اور دو عدد پلاٹوں کی صورت میں بدل لیا۔ مجھے معلوم تھا کہ پیسا گھٹ جاتا ہے اور خرچ ہو جاتا ہے لیکن زمین اور جائیداد کی قدر وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ بڑھتی رہتی ہے۔ دونوں پلاٹ میں نے ساتھ والی کالونی میں لیے تھے جہاں ابھی ترقیاتی کام بھی نہیں ہوئے تھے۔ مکان خاصا بڑا تھا۔ شروع میں تو سادہ تھا مگر جیسے جیسے وقت گزرتا رہا میں اسے تبدیلیوں سے گزارتا رہا اور کچھ عرصے بعد یہ خوب صورت بنگلے نما ہو گیا تھا۔ نجی اسکول میں تنخواہ اچھی تھی سارے خرچ پورے کر کے میں کچھ بچت بھی کر لیتا تھا۔ پہلے میرے پاس موٹر سائیکل تھی جب گھر ٹھیک کرا لیا تو اس کے بعد میں نے گاڑی بھی لے لی۔

ساحل اور نبیلہ نے ابتدائی اسکولنگ ایک اور اسکول میں کی تھی مگر جب میں نے نجی اسکول میں ملازمت کی تو پھر میرے چاروں بچوں کو اسی اسکول میں داخلہ مل گیا تھا۔ ملازم ہونے کی وجہ سے مجھے یہ سہولت تھی کہ نصف فیس معاف تھی یوں دو بچوں کی فیس معاف ہوگئی۔ اس سے بھی مجھے بہت سہولت ہوئی۔ کیونکہ یہاں فیس اتنی زیادہ تھی کہ میں چاروں بچوں کو نہیں پڑھا سکتا تھا۔ پھر میں بچوں کو ساتھ لے جاتا اور واپس لاتا تھا۔ واپسی میں کسی قدر تاخیر ہوتی تھی مگر میرے بچے وین کے جھنجٹ سے محفوظ رہے جو انہیں بہت سی جگہوں پر گھما کر لاتی اور وین والے بچے ٹھونس ٹھونس کر بٹھاتے ہیں۔ میرے ساتھ بچے آرام سے آتے جاتے تھے، اگر مجھے دیر ہوتی تو وہ اسکول میں ہی ہوم ورک کر لیتے تھے۔ میری ریٹائرمنٹ کے بعد بھی راحیلہ نے گورنمنٹ جاب جاری رکھی تھی۔ اس نے اپنا تبادلہ اب یہاں ایک نزدیکی اسکول میں کرا لیا تھا۔ وہ صبح ہمارے ساتھ ہی نکلتی تھی اور ہمارے گھر آنے سے پہلے وہ آ چکی ہوتی تھی۔

ہمارا گھر جس کالونی میں تھا۔ یہاں شروع میں آبادی

کم تھی اس لیے ایک دو پی ایم ٹیز بھی کافی تھیں مگر وقت گزرنے کے ساتھ آبادی میں اضافہ ہوا۔ اس لیے یہ پی ایم ٹیز ناکافی ہوگئیں اور اب روز ہی لو وولٹیج اور ٹرپنگ کا مسئلہ رہنے لگا۔ فریج اور اے سی جیسے بھاری آلات کام نہیں کرتے تھے۔ نازک الیکٹرانکس آلات آئے دن اڑ جاتے یا خرابی کا شکار رہتے تھے۔ ایک رات اوورلوڈنگ کی وجہ سے پی ایم ٹی اڑی تو اس کی تاریں پہلے ملیں اور اس وجہ سے گھروں میں جو چیزیں بھی آن تھیں وہ اڑ گئیں۔ خود میرا ٹی وی، نصف درجن انرجی سیور، تین پنکھے اور نصف درجن ہی چھوٹی ڈیوائسز بھی اڑ گئیں۔ فریج اسٹریلائزر کی وجہ سے بچ گیا ورنہ وہ بھی اڑ جاتا۔ لوگوں کا اس سے زیادہ نقصان ہوا تھا۔ شروع میں اکا دکا لوگوں نے درخواست دی مگر اس کا کوئی اثر نہیں ہوا۔ اس پر کالونی والوں نے ایک میٹنگ کی اور فیصلہ کیا کہ مل کر بجلی والوں کے دفتر جائیں گے اور وہاں کسی بڑے افسر سے بات کریں گے۔

مسئلہ یہ تھا کہ دفاتر کام کے دنوں میں کھلتے تھے اور سب ہی کام والے تھے۔ سب کو ایک ساتھ چھٹی ملنا بھی مسئلہ تھا۔ اس لیے یہ پلان ملتا رہا۔ گرمیاں نزدیک تھیں اور ایک رات جب اوورلوڈنگ کی وجہ سے پی ایم ٹی اڑ گئی تو لوگوں کے صبر کا پیمانہ لبریز ہوگیا اور انہوں نے اگلے دن چھٹی کی۔ تیس پینتیس کے قریب افراد مختلف گاڑیوں میں بھر کر بجلی کے مقامی دفتر پہنچے اور پی ایم ٹی کے مسئلے پر احتجاج کیا۔ اس پر وہاں عملے سے تلخ کلامی ہونے لگی۔ یہاں بیٹھنے والا انجینئر ابھی ڈیوٹی پر نہیں آیا تھا۔ وہ دس بجے آتا تھا اور ہم نو بجے ہی پہنچ گئے تھے۔ بہر حال دس بجے انجینئر آیا تو میں اسے دیکھ کر چونکا۔ اگرچہ وہ خاصا بدل گیا تھا۔ سامنے سے بال اڑ رہے تھے البتہ نقوش وہی تھے مگر اس سے پہلے کہ میں اسے کچھ کہتا وہ مجھے دیکھ کر چونکا۔ ''سر اسد اللہ؟''

''تم سلمان علی ہو؟''

''جی سر۔'' اس نے گرم جوشی سے مجھ سے ہاتھ ملایا۔ میں اسے پورے چودہ برس بعد دیکھ رہا تھا۔ ''کیسے ہیں آپ اور یہاں کیسے زحمت کی؟''

''تم لوگوں نے زحمت دی تو زحمت کی۔'' میں نے شکوہ کیا۔

دفتر کا عملہ اپنے انجینئر کا میرے ساتھ رویہ دیکھ کر الرٹ ہوگیا۔ سلمان نے میرے ساتھ موجود افراد کو دیکھا اور بولا۔ ''میرے ساتھ آئیں اور ان میں کچھ لوگوں کو لینا چاہیں تو ساتھ لے لیں۔ سب کا تو میرے کمرے میں آنا دشوار ہوگا۔''

میرے ساتھ کالونی کے کچھ افراد سلمان علی کے کمرے میں آئے۔ اس نے ٹھنڈے کا کہا لیکن میں نے منع کر دیا۔ ''یہ اچھا نہیں لگے گا کہ بس ہم چند افراد پی لیں اور سب کو پلانا تمہارے ساتھ زیادتی ہوگی۔ اس لیے کام کی بات کر لی جائے۔''

غالباً اسے پہلے ہی اطلاع مل چکی تھی۔ اس نے کہا۔ ''پی ایم ٹی کا مسئلہ ہے؟''

''بالکل بلکہ ایک نہیں کم سے کم چھ پی ایم ٹیز کا مسئلہ ہے۔'' میں نے کہا اور کیس فائل اس کے سامنے رکھ دی۔ ''تم خود دیکھ لو اتنی پی ایم ٹیز لگیں تو مسئلہ حل ہوگا۔''

ہم اچھے طریقے سے اپنا کیس تیار کر کے لائے تھے جس میں ماضی اور موجودہ صورت حال کے ساتھ ساتھ بجلی کے ترسیل کے نظام کا موازنہ بھی شامل تھا جو اپ ڈیٹ ہونے سے رہ گیا تھا اور یہی مسئلے کی جڑ تھی۔ سلمان نے مکمل فائل دیکھی اور میرے منع کرنے کے باوجود اس نے چپڑاسی کو بلوا کر سب کے لیے کولڈ ڈرنک منگوالی تھی۔ اس نے فائل دیکھ کر سامنے رکھی اور بولا۔ ''مسئلہ واضح ہے۔''

''تب اسے حل کیا جائے۔'' میرے ساتھ آئے زاہد صاحب نے کہا۔ وہ کسی زمانے میں واپڈا میں ملازم تھے اور انہوں نے بھی اپنا سارا اثر و رسوخ استعمال کر لیا تھا۔

''اگر میرے بس میں ہوتا تو میں آج اور ابھی اسے حل کر دیتا۔ لیکن میں اتنا کر سکتا ہوں کہ آپ کے کیس پر اپنے ریمارکس دے دوں۔''

''اس کے بعد؟''

''اس کے بعد آپ کو ہیڈ آفس جانا ہوگا اور وہاں یہ مسئلہ حل ہوگا۔''

''جناب آپ کوشش تو کریں۔'' زاہد صاحب نے اصرار کیا۔ ''دیکھیں آپ کے استاد آئے ہیں۔''

''میں ان ہی استاد کی دی ہوئی تعلیم پر عمل کر رہا ہوں۔'' سلمان علی نے ان کی بات کاٹ کر کہا۔ ''خدا گواہ ہے اس سیٹ پر آنے کے بعد میں نے بھی ایک روپیا حرام کا نہیں کمایا اور کسی کا ناجائز کام نہیں کیا چاہے وہ میرا خونی رشتے دار کیوں نہ ہوا اور نہ ہی کسی کا جائز کام روکا چاہے وہ میرا دشمن ہی کیوں نہ ہو۔''

''زاہد صاحب سلمان ٹھیک کہہ رہا ہے۔ اس کی سطح پر

یہ کام نہیں ہوسکتا اور یہ بات آپ بھی جانتے ہیں۔''

وہ مایوس ہوئے۔ ''یعنی اب ہیڈ آفس بھی جانا پڑے گا۔''

''تب ہی تو کام ہوگا اور آپ فکر نہ کریں ہم آج ہی جائیں گے اور آج یہ کام وہاں منظور کرا کے آئیں گے۔'' میں نے انہیں تسلی دی اور پھر درخواست کی۔ ''آپ لوگ ذرا زحمت کریں اور باہر کچھ دیر انتظار کرلیں میں اپنے شاگرد سے کچھ بات کرکے آپ کے پاس آتا ہوں پھر ہم ہیڈ آفس چلیں گے۔''

اس دوران میں سلمان فائل میں اپنے ریمارکس دے رہا تھا۔ میرے ساتھی اٹھ کر چلے گئے۔ سلمان نے اپنے سائن کرکے اور مہر لگا کر فائل میری طرف بڑھائی۔ ''آپ دیکھ لیں سر۔''

میں نے اس کے ریمارکس دیکھے۔ اس نے ہمارے مؤقف کی مکمل تائید اور پُرزور سفارش کی تھی کہ ہماری درخواست مان کر اس پر فوری عمل کیا جائے۔ میں نے پوچھا۔ ''کیا اس پر عمل بھی ہوگا؟''

''ٹیکنیکل سطح پر تو کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ ہر جگہ آپ سے کوآپریٹ کیا جائے گا لیکن جہاں تک نان ٹیکنیکل افسران بالا کا تعلق ہے۔ ان کی اپنی منطق ہوں گی۔ مگر آپ لوگ اسی طرح جائیں گے تو اُمید ہے کام ہوجائے گا۔ ہمارے ہاں لوگ سب سے زیادہ ہجوم سے گھبراتے ہیں۔''

میں نے فائل بند کردی۔ ''تم سناؤ، اسکول چھوڑنے کے بعد کیا کیا؟''

''جو کیا وہ آپ کے سامنے ہے۔'' اس نے مسکرا کر کہا۔ ''انجینئرنگ کے بعد دو سال مختلف جگہوں پر کام کیا پھر یہاں آگیا۔ مگر چھ سال سے یہیں اٹکا ہوا ہوں۔ میرے ساتھ آنے والے آگے نکل گئے۔''

''تم ذہین تھے اور میرا خیال تھا کہ تم ٹیکوکریٹ کی سطح پر آجاؤ گے۔ مگر تم بدستور اپنی فیلڈ میں ہو۔''

اس نے سر ہلایا۔ ''آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں، کچھ میری سستی اور کچھ حالات تھے۔ والد صاحب خاصے پہلے انتقال کر گئے اور ان پر کچھ قرض رہ گیا تھا۔ میری بھی شادی ہوگئی اور میں گھرداری میں پھنس گیا۔ اس لیے آگے نہ پڑھ سکا۔ آپ یقین کریں کہ انجینئرنگ کے بعد مجھے جرمنی سے اسکالرشپ بھی مل رہی تھی مگر ان دنوں والد صاحب کی حالت بہت خراب تھی اور میں کسی صورت ان کو چھوڑ کر نہیں جاسکتا تھا۔ بس اسی چکر میں آگے تعلیم کا سلسلہ رہ گیا۔ مگر اب میں یہاں کورس کررہا ہوں اور اس کے بعد ایم بی اے کا ارادہ ہے۔''

''اللہ تمہیں کامیاب کرے۔'' میں نے کہا اور اسے اپنا کارڈ دیا۔ ''میری کسی بھی مدد کی ضرورت ہو تو میں حاضر ہوں۔ آج کل اس اسکول میں پرنسپل ہوں اس حوالے سے بھی کوئی کام ہو تو مجھے بلاتکلف بتانا مجھے کرکے خوشی ہوگی۔''

''ضرور سر۔'' اس نے گرم جوشی سے ہاتھ ملایا۔ ''سچ کہہ رہا ہوں میں آپ کو کبھی بھولا نہیں اور آج اتنے سالوں بعد آپ سے مل کر بہت خوشی ہورہی ہے۔''

میں باہر آیا جہاں میرے ساتھی بے چینی سے میرا انتظار کررہے تھے اور ہم گاڑیوں میں سوار ہوکر ہیڈ آفس پہنچ گئے۔ سلمان نے ٹھیک کہا تھا۔ ہم ہجوم کی صورت میں اور بہت جارحانہ انداز میں دفتر میں داخل ہوئے تو وہاں کھلبلی سی مچ گئی۔ دروازے پر گارڈز نے ہمیں روکنے کی کوشش کی مگر ہم ان کو دھکیل کر اندر آگئے۔ ابھی ہم ریسیپشن پر بات کر رہے تھے کہ اندر سے ایک آدمی آیا اور اس نے اپنا تعارف ایڈمن آفیسر کے طور پر کرایا۔ ''آپ کا کیا مسئلہ ہے پلیز یہاں آیئے۔''

وہ ہمیں لابی میں لے گیا۔ مگر میں نے اسے مسئلہ بتانے سے انکار کردیا۔ ''اگر آپ مسئلہ حل کرسکتے ہیں تو میں بتا رہا ہوں لیکن یہ بھی واضح کردوں کہ پھر آپ کی طرف سے انکار نہیں ہونا چاہیے کہ مسئلہ آپ کے بس کی بات نہیں ہے اس صورت میں ہم اس سے بات کرنا پسند کریں گے جو مسئلہ حل کرسکتا ہے۔''

وہ سمجھدار آدمی تھا اس نے فوراً اپنی آگے کی ہوئی ناک پیچھے کرلی اور بولا۔ ''میں تو معمولی سا افسر ہوں لیکن اگر مسئلے کی نوعیت کا علم ہو تو میں گائیڈ کرسکتا ہوں۔''

''اتنے لوگ آئے ہیں تو مسئلہ پورے علاقے کا ہوا نا اور ہمیں کسی ڈائریکٹر لیول کے آدمی سے ملنا ہے۔'' میں نے کہا۔

''ڈائریکٹر تو اس وقت کوئی نہیں ہے۔''

''کوئی بات نہیں ہم انتظار کرتے ہیں۔'' میں نے کہا اور پہلے سے طے شدہ پروگرام کے مطابق ہم سب لابی میں داخلی دروازے کے آگے فرش پر یوں بیٹھ گئے کہ آنے جانے کا راستہ بند ہوگیا۔ اس کے بعد ہم نے مختلف ٹی وی چینلوں کو کالز شروع کردیں اور ان کو بتانے لگے کہ ہم نے

بجلی کے محکمے کے ہیڈ آفس میں گھس کر دھرنا دیا ہوا ہے جب تک ہمارا مسئلہ حل نہیں ہو گا ہم یہاں سے نہیں اٹھیں گے۔ یہ سب وہاں موجود کارکنوں کے سامنے ہو رہا تھا اور وہ دیکھ رہے تھے کہ ہم میڈیا کو کال کر رہے ہیں۔ اس کا فوری ردِعمل ہوا۔ وہی افسر اندر سے نمودار ہوا اور اس نے خوشامدانہ لہجے میں کہا۔ ''پلیز ایسا نہ کریں۔ آپ سے ملاقات کے لیے ایک ڈائریکٹر آ رہے ہیں۔''

''جب وہ آجائیں گے تو ہم یہاں سے اٹھ جائیں گے۔'' میں نے جواب دیا۔ ''اس سے پہلے ہمیں کوئی نہیں اٹھا سکتا۔ اگر زور زبردستی کی گئی تو اس کا نتیجہ بھی دیکھ لینا۔''

بہرحال ہماری پلاننگ کا نتیجہ یہ نکلا کہ آدھے گھنٹے بعد ہی وہ ڈائریکٹر صاحب آگئے اور میں انہیں دیکھ کر حیران رہ گیا کیوں کہ وہ کوئی اور نہیں بلکہ راشد صابر تھا۔ میں حیران ہو رہا تھا کہ آج میرا تعلق کیا اپنے سابق شاگردوں سے ہی پڑنے گا۔ شاگرد بھی وہ جنہیں میں خاص طور سے جج کرتا تھا۔ راشد صابر پہلے کے مقابلے میں بہت پالش ہو گیا تھا۔ اس کے سیاہ اور گھنے بال بہت اچھے اسٹائل میں بنے اور جمے ہوئے تھے۔ اس نے اعلیٰ درجے کا تھری پیس سوٹ پہن رکھا تھا اور اس کے ہاتھ میں قیمتی بریف کیس تھا۔ ایک تو وہ ڈائریکٹر تھا اور دوسرے اس کا انداز اوپری طبقے والا تھا لگ رہا تھا اس نے خاصی سے بھی زیادہ ترقی کر لی ہے۔ اس نے بے نیازی سے ہماری طرف دیکھا اور افسر سے پوچھا۔ ''یہ لوگ کون ہیں اور یہاں کیوں بیٹھے ہیں؟''

''یہ سوال ہم سے کرو اور ہم سے پہلے خود سے کرو کہ ہمیں یہاں آنے کی ضرورت کیوں پیش آئی؟'' میں نے آگے بڑھتے ہوئے کہا۔ ''ویسے راشد صابر میں نے تمہارے بارے میں نہیں سوچا تھا کہ تم ایک دن اس لیول تک پہنچ جاؤ گے۔''

اپنے نام پر وہ چونکا۔ ''آپ کون ہیں؟''

''اب مجھے زیادہ افسوس ہو رہا ہے کہ تم میرے شاگرد رہے ہو اور مجھے ہی نہیں پہچان رہے۔ بہرحال مجھے کسی قدر اندازہ ہو رہا ہے کہ تم یہاں کس طرح پہنچے ہو۔''

''سر اسد اللہ؟'' اس نے بے یقینی سے کہا۔ ''یہ آپ ہیں۔''

''ہاں میں ہوں۔''

اس نے آس پاس دیکھا۔ ''سر یہ لوگ کون ہیں اور اس طرح کیوں بیٹھے ہیں۔''

اس وقت میڈیا والے نہیں آئے تھے اور اس کے تجاہل عارفانہ پر میرا خون کھولنے لگا تھا۔ وہ لازمی راستے میں بریفنگ لیتا ہوا آیا تھا اور اسے سب پتا تھا مگر وہ یہاں انجان بن رہا تھا۔ ''کچھ دیر رک جاؤ۔ میڈیا والے آنے والے ہیں میں ان کے سامنے ہی سب بتاؤں گا کہ ہمارا مسئلہ کیا ہے اور اب تک کیوں حل نہیں ہوا۔''

اس نے فوری صورتِ حال بھانپ لی اور جلدی سے لہجہ بدل کر بولا۔ ''سر میرے ہوتے ہوئے آپ یہ سب کیوں کر رہے ہیں کاش کہ آپ مجھے ایک کال کر دیتے۔''

''اگر مجھے پتا ہوتا تو میں ضرور کرتا۔''

''سر میرے ساتھ آئیں اور پلیز ان لوگوں سے کہیں کہ یہ اٹھ کر یہاں کرسیوں پر بیٹھیں۔ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ آپ کا مسئلہ حل ہو جائے گا۔''

''میں اپنے کچھ ساتھیوں کے ہمراہ تمہارے ساتھ چل رہا ہوں لیکن باقی اس وقت تک یہیں رہیں گے جب تک کہ ہمارے مسئلے پر احکام صادر نہیں ہو جاتے۔''

راشد صابر عجلت میں مجھے اور میرے چند ساتھیوں کو اپنے شاندار اور عالی شان حد تک سجے کمرے میں لے گیا جہاں اے سی اس کی آمد سے پہلے پورے زور و شور سے چل رہا تھا اس نے کمرا فریج بنایا ہوا تھا۔ میں نے راشد صابر کے سامنے فائل رکھی جس میں سلمان علی کے ریمارکس بھی تھے۔ یہ ریمارکس دیکھ کر اس کا چہرہ ایک لمحے کو بگڑا تھا مگر فوراً ہی وہ مسکرانے لگا۔ ''سر یہ تو کوئی مسئلہ نہیں ہے۔''

''جب کوئی مسئلہ قابلِ حل ہوتے ہوئے بھی حل نہ ہو تو پھر اس صورتِ حال کو کیا کہیں گے؟'' میں نے طنزیہ لہجے میں پوچھا۔ ''جو لوگ اس کے ذمے دار ہیں ان کے بارے کیا کہیں گے؟''

''سر میری بات تو سنیں۔ مسئلہ فنڈز کا بھی ہے۔ بجلی کا سسٹم ہمارے ہاں کس حد تک خراب ہو چکا ہے یہ آپ جانتے ہیں۔''

''خراب نہیں کرپٹ ہو گیا ہے۔'' میں نے تصحیح کی۔ ''کوئی اسے ٹھیک نہیں کر رہا سب خراب کر رہے ہیں۔''

''مسئلہ فنڈز کی عدم دستیابی ہے۔'' اس نے گویا بحث کرنے سے گریز کیا۔ ''اس وجہ سے نہ صرف آپ کی کالونی بلکہ دوسرے بہت سے علاقوں میں سسٹم اپ گریڈ نہیں کیا جا سکا ہے۔''

"ہماری کالونی سے صرف دو میل کے فاصلے پر کچھ امرا اور وزرا کے فارم ہاؤسز ہیں اور وہاں چھ عدد پی ایم ٹیز ابھی حال میں لگی ہیں ان کے لیے فنڈز کہاں سے آیا؟"

"سر آپ جانتے ہیں سرکاری کام الگ ہوتے ہیں اور عوامی کام الگ طریقے سے ہوتے ہیں۔" اس نے کہا۔ "لیکن آپ اطمینان رکھیں آپ کا کام ہوگا۔ اس میں کچھ وقت لگے گا مگر یہ ہوگا ضرور۔"

"کتنا وقت لگے گا اور ابھی تو ہماری مین پی ایم ٹی اڑ گئی ہے اس لیے اگلی پی ایم ٹی بھی بند ہے۔ اس گرمی میں بجلی بالکل نہیں ہے۔"

"یہ کام ابھی ہو جائے گا۔" اس نے کہا اور فون اٹھاتے ہوئے کسی کو کال کی۔ "غیاث میں راشد بات کر رہا ہوں۔..... کالونی کی مین پی ایم ٹی اڑ گئی ہے..... ریجن کو بھول جاؤ، ابھی گاڑی اور سامان لے کر فوراً وہاں پہنچو اور دو گھنٹے کے اندر سب او کے کر دو۔ اٹس ارجنٹ۔" اس نے بات مکمل کرتے ہی کال کاٹ دی اور مجھ سے بولا۔ "سر آپ کا فی الحال یہ کام ہوگیا ہے۔"

"اور دوسرا؟"

"کل ہمارا سروے انجینئر آپ کی کالونی آئے گا۔ وہ لوڈ چیک کرے گا اور سروے مکمل کر کے دو دن میں رپورٹ کرے گا۔ جیسے ہی اس کی رپورٹ آئے گی میں اپروول کے لیے خود اوپر لے جاؤں گا اور مشکل سے ایک ہفتے میں آپ کا مسئلہ حل ہو جائے گا۔"

ہم سب ہی سمجھ رہے تھے کہ ایک ہفتے میں حل ہونے والا مسئلہ نہیں ہے لیکن اگر یہ ایک مہینے میں بھی حل ہو جائے تو ہماری خوش قسمتی ہوگی۔ مگر اس وقت اس نے کسی حد تک ہمارا مسئلہ زبانی ہی سہی لیکن حل کر دیا تھا۔ ہماری مزید تسلی کے لیے اس نے سروے انجینئر کو بھی اسی وقت حکم جاری کر دیا تھا۔ کام ہوگیا تھا اس لیے ہم وہاں سے اٹھ آئے۔ لیکن میرا دل نہیں چاہا تھا کہ میں سلمان کی طرح راشد سے بھی بات کروں۔ مجھے لگ رہا تھا وہ اپنی محنت اور قابلیت سے اس مقام تک نہیں آیا تھا۔ اس نے لازمی کوئی دو نمبری کی تھی۔ یوں سمجھ لیں کہ وہ سلمان سے کئی گریڈ اوپر کا افسر تھا اور سلمان جیسے اس کے درجنوں ماتحت ہوں گے۔ ہم واپس پہنچے تو بجلی کی گاڑیاں آچکی تھیں اور کام جاری تھا۔ کام کی نگرانی کرنے والے انجینئر نے ہم سے کہا۔

"آپ لوگوں کا لوڈ بہت زیادہ ہے اور یہ دو پی ایم ٹیز مشکل سے ایک تہائی لوڈ اٹھا رہی ہیں اس لیے مہربانی کر کے اے سی استعمال نہ کریں ورنہ پنکھوں سے بھی جائیں گے۔"

اس کی بات بھی درست تھی کہ لوگ اس بات کا خیال کیے بغیر کہ پی ایم ٹی اڑ جائے گی۔ اے سی چلاتے تھے اور یہاں تقریباً ہر گھر میں اے سی تھے۔ خود میرے گھر میں تین اے سی لگے تھے اگرچہ ہم بجلی کے بل کے خیال سے ایک ہی چلاتے تھے۔ مگر جو صاحبِ حیثیت تھے وہ سارے ہی اے سی چلاتے تھے اور اس وجہ سے پی ایم ٹی پر حد سے زیادہ لوڈ آجاتا تھا۔ انجینئر کی درخواست کے باوجود لوگوں نے اے سی چلانا جاری رکھے اور نتیجے میں ٹرپنگ کا مسئلہ ہوتا رہا۔ اگلے دن سے سرویئر نے اپنا کام شروع کر دیا وہ ہر گھر میں آکر لوڈ چیک کر رہا تھا تاکہ اسی لحاظ سے اگلی پی ایم ٹیز لگائی جائیں اور یہ مسئلہ حل ہو سکے۔ مگر ہمارا یہ اندازہ درست ثابت ہوا کہ مسئلہ ایک ہفتے میں حل ہونے والا نہیں تھا۔ سرویئر گیا اور اس کے بعد معاملہ ٹھنڈا ہو گیا۔ ایک ہفتے بعد میں نے چند افراد کے ساتھ جا کر راشد سے بات کی۔ وہ ملا مگر اس کا رویہ خاصا بدلا ہوا تھا اس نے کہا کہ وہ پوری کوشش کر رہا ہے کہ جلد از جلد پی ایم ٹیز کے فنڈز منظور ہو جائیں اور وہ پی ایم ٹیز لگوا دے۔ جب میں نے اسے اس کے الفاظ یاد دلائے کہ اس نے ایک ہفتے میں مسئلہ حل کرنے کا کہا تھا تو وہ ڈھٹائی سے بولا۔ "آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں مگر اس ملک میں ہر کام کہاں اسی طرح ہوتا ہے جس طرح کہا جاتا ہے۔ بہرحال میں کوشش کر رہا ہوں۔"

واپسی پر ہمارا خیال تھا کہ مسئلہ ایک بار پھر انگلیاں ٹیڑھی کرنے سے ہی حل ہوگا۔ کالونی کے ممبران نے میٹنگ کی اور مجھے راشد سے حتمی بات کرنے کو کہا۔ کیونکہ وہ باقیوں کو خاطر میں نہیں لا رہا تھا۔ اس سلسلے میں میری اس سے دو تین بار بات ہوئی۔ پی ایم ٹیز کا مسئلہ تو چلتا رہا لیکن رفتہ رفتہ یہ عقدہ کھلا کہ راشد یہاں تک کیسے پہنچا تھا۔ اس نے بی کام میں داخلہ لیا تو اسی وقت اس کے ذہن میں سول سروس کا سودا سمایا ہوا تھا۔ اس نے گریجویشن کرتے ہی ایم کام میں داخلہ لیا اور اس کے ساتھ ساتھ سول سروس کے امتحان کی تیاری شروع کر دی۔ محنتی وہ بہت تھا۔ اسے معلوم تھا کہ اصل چابی انگریزی میں مہارت ہے اور اس نے بہت محنت کر کے اس میں مہارت حاصل کر لی۔ جیسے ہی ایم کام کے پیپرز ہوئے اس نے سول سروس کے امتحان کے لیے درخواست

دے دی۔

اس کا ٹیسٹ اور انٹرویو اچھا ہوا۔ پیپرز بھی اچھے ہوئے تھے۔ جب نتیجہ آیا تو وہ سو پہلے امیدواروں میں شامل تھا۔ اس نے وزارتِ مواصلات اور توانائی کو منتخب کیا۔ چند سال وہ وزارت میں رہا اور پھر یہاں بجلی کے محکمے میں آ گیا۔ اس دوران میں اس نے بیوروکریسی کے طاقتور حلقوں سے تعلقات بنا لیے تھے اس لیے بہت جلد وہ پرموٹ ہوا اور اب یہاں ڈائریکٹر کے طور پر کام کر رہا تھا جب کہ اس کی عمر بہ مشکل اکتیس برس تھی۔ اس کے ساتھ کیا اس کے تمام ماتحت بھی اس سے عمر میں بڑے تھے۔ اس سے مجھے اندازہ ہوا کہ اس نے کتنی تیزی سے ترقی کی تھی۔ ان چند ملاقاتوں میں، میں نے یہ بھی محسوس کیا کہ اگر وہ چاہے تو ہمارا پی ایم ٹیز کا مسئلہ جلدی حل کرا سکتا ہے مگر وہ زیادہ دل چسپی نہیں لے رہا تھا۔ اس لیے میں نے آخری ملاقات میں اس سے کہا۔

"دیکھو تم میرے شاگرد رہے ہو اس لیے معاملہ ابھی میرے ہاتھ میں دیا ہوا ہے ورنہ اس کالونی میں رہنے والے لوگ معمولی حیثیت کے نہیں ہیں ان میں سب سے معمولی مجھے ہی سمجھو۔ ورنہ وہاں ایک سے بڑھ کر ایک آدمی ہے اور وہ اپنے تعلقات استعمال کرنے پر تل گئے تو اوپر سے آنے والے دباؤ کے بعد کام کرو گے۔ ممکن ہے تم کچھ فائدہ اٹھا لو لیکن یہ بھی ہو سکتا ہے کہ تمہیں تاخیر کا ذمے دار قرار دے دیا جائے۔ اس لیے بہتر ہے تم جلد از جلد اسے مکمل کر لو۔"

وہ سنجیدہ ہو گیا تھا۔ "آپ مجھے دھمکی دے رہے ہیں۔"

"نہیں، سمجھا رہا ہوں تم دس برس میرے شاگرد رہے اور بارہا ایسا ہوا کہ تم میرے سامنے آئے۔ تم کمزور اور معمولی سے بچے تھے کیا اس وقت تمہیں کبھی دھمکی دی، نہیں میں نے ہمیشہ تمہیں سمجھایا۔ تم آج بھی میرے لیے شاگرد ہو اور میں تمہیں آج بھی سمجھا رہا ہوں۔ آگے تمہاری مرضی ہے۔"

میں نے واپس آ کر کالونی والوں سے کہہ دیا کہ میرے بس میں جو تھا میں کر چکا ہوں اب جو حکم پنچوں کا۔ اگلے اتوار کو میٹنگ کال کر لی گئی، سب کا موڈ جارحانہ تھا اور شاید سب نے اپنے اپنے تعلقات استعمال کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ مگر اس سے پہلے ہی جمعے والے دن ٹرکوں میں لد کر پی ایم ٹیز کالونی پہنچ گئیں اور عملہ ان کو انسٹال کرنے لگا۔ دو دن تک پی ایم ٹیز لگتی رہیں اور ہم شدید گرمی میں بجلی کے بغیر بیٹھے رہے مگر ہم خوش تھے کہ کام ہو رہا ہے۔ تیسرے دن ہماری کالونی میں بجلی کا مسئلہ حل ہو گیا۔ اگرچہ لوڈ شیڈنگ جاری رہی جس کے اب ہم عادی ہو گئے ہیں مگر جب لوڈ شیڈنگ نہیں ہوتی تھی تب وولٹیج پورے آتے تھے اور آئے دن کی ٹرپنگ اور پی ایم ٹی اڑنے کے چکر سے نجات مل گئی تھی۔ کم سے کم رات سکون سے گزرتی تھی۔ میں نے کال کر کے راشد کا شکریہ ادا کیا۔

"میں خود یوں نہیں آیا کہ اگر تم میری لاج رکھتے ہوئے شروع میں یہ مسئلہ حل کر دیتے تو میں خود آتا مگر تم نے کچھ حساب کتاب کے بعد یہ کام کیا۔ بہرحال میں اور میری کالونی والے پھر بھی تمہارے شکر گزار ہیں۔"

یہ چھ سال پہلے کی بات تھی۔ وقت گزرتا رہا حکومتوں پر حکومتیں بدلتی رہیں۔ مگر ملک اور عوام کے حالات وہی رہے۔ کبھی پہلے سے بدتر ہو جاتے اور کبھی کسی قدر بہتر ہو جاتے۔ بدتر اس وقت ہوتے کہ کوئی دستیاب چیز اچانک ہی غائب ہو جاتی۔ کبھی بجلی، کبھی گیس اور کبھی پیٹرول۔ کھانے پینے کی اشیا کا ذکر میں نے یوں نہیں کیا کہ ان کی قیمتوں کے اتار چڑھاؤ کے ہم عادی ہو چکے ہیں۔ سی این جی تو بند تھی کچھ عرصے پہلے پیٹرول بھی غائب ہو گیا۔ ان دنوں میں، بیگم اور بچے کس طرح اسکول و کالجز آئے گئے یہ ہم ہی جانتے تھے۔ محلے والے ایک دوسرے کی گاڑیوں میں بھر کر دفتروں کو جا رہے تھے اور بعض اوقات ایک گاڑی میں سات آٹھ افراد ٹھنسے ہوتے تھے۔ جب یہ بحران گزر گیا اور اسی طرح دوسرے بحران گزر جاتے ہیں تو ہم بہتری محسوس کرتے ہیں۔

میں نے بتایا کہ جب میں اس علاقے میں آیا تو یہ لاہور سے باہر شمار ہوتا تھا۔ آبادی بہت کم اور زمین و مکان بہت سستے تھے۔ کم سے کم آج کل کی قیمتیں دیکھی جائیں تو یہ مفت ہی ملے تھے۔ میں نے مکان کے ساتھ دو عدد پلاٹ بھی لیے تھے۔ میرا ارادہ تھا کہ ایک بیٹیوں کی شادی کے لیے رکھوں گا اور دوسرا بیٹے کی تعلیم کے لیے۔ بیس سال پہلے جب ہمارے ملک میں نجی تعلیمی ادارے جو اعلیٰ پیشہ ورانہ تعلیم دیتے تھے ان کی تعداد سرکاری جامعات کے مقابلے میں بہت کم تھی۔ تب میں نے اندازہ لگایا کہ ایک وقت آئے گا جب سرکاری جامعات کا حال بھی سرکاری اسکولوں

اور کالجوں جیسا ہو جائے گا اور تب پیشہ وارانہ تعلیم بھی نجی اداروں کے ہاتھ میں چلی جائے گی اور اس وقت یہ بہت مہنگی اور سفید پوش طبقے کی پہنچ سے باہر ہو جائے گی۔ میں نے احد کی تعلیم کے لیے اسی وقت سے سوچ لیا تھا کہ مجھے شاید بہت بڑی رقم کی ضرورت پڑے جو ہم ملازمت پیشہ بچت کر کے جمع نہیں کر سکتے تھے اس لیے ایک پلاٹ احد کے لیے لیا تھا۔ یہ آدھے آدھے کنال کے دو پلاٹ تھے اور ساتھ ساتھ تھے۔ اگر دونوں کو ملا کر ایک کنال بنا کر فروخت کرتا تو ان کی زیادہ قیمت مل سکتی تھی۔

دو سال پہلے ساحل کی شادی کا سلسلہ شروع ہوا۔ اس کی منگنی اپنے چچازاد سے طے تھی۔ میرا بھتیجا آرمی میں کیپٹن ہے۔ بلکہ اس وقت کیپٹن تھا اب وہ میجر کی پوسٹ پر آ گیا ہے۔ میرے بڑے بھائی نے ساحل کو بچپن میں مانگ لیا تھا اور میں نے یہ رشتہ بڑے ہونے کے بعد ساحل کی رضامندی سے مشروط کر کے مان لیا تھا۔ ساحل نے بڑے ہونے کے بعد اس رشتے کو پسند کیا اور یوں شادی کا فیصلہ ہوا مگر ساحل ماسٹر کر رہی تھی اس لیے شادی میں تاخیر ہوئی تھی۔ اس کا ماسٹر مکمل ہو گیا تو میں نے پلاٹ فروخت کرنے کا سوچا۔ کئی سال ہو گئے تھے کہ میں پلاٹ دیکھنے بھی نہیں گیا تھا۔ حالانکہ وہ برابر والی کالونی میں تھے۔ وہاں سہولتیں بھی آ گئی تھیں۔ اس لیے مجھے اُمید تھی کہ ان کی قیمت اب اچھی خاصی ہو گئی ہو گی۔ مگر جب میں پلاٹ دیکھنے پہنچا تو وہاں بھینسوں کا باڑا بنا ہوا تھا اور چند بدمعاش قسم کے لوگ چارپائیوں پر استراحت فرما رہے تھے۔ میں نے پوچھا۔ ''اس باڑے کا مالک کون ہے؟''

''سرور شاہ جی۔'' ان میں سے ایک نے جواب دیا۔ ''تم کون ہو؟''

''سرور شاہ جی کہاں ہے؟''

''او جی وہ اپنے ڈیرے پر ہوتا ہے یہاں اس کا کیا کام۔'' دوسرے نے جواب دیا۔ ''کام کے لیے ہم بیٹھے ہیں، فرماؤ کیا بات ہے؟''

''بات یہ ہے کہ تم لوگ جس زمین پر بیٹھے ہو یہ میری ہے۔'' میں نے ملائمت سے کہا۔ ''اب تم سمجھ گئے ہو گے کہ میرا شاہ جی سے بات کرنا کیوں ضروری ہے۔''

ابھی میں نے بات مکمل بھی نہیں کی تھی کہ وہ کھڑے ہو گئے اور ان کے تیور خطرناک ہو گئے۔ ان میں سے ایک آگے آیا اور دھمکی آمیز لہجے میں بولا۔ ''باؤ چلا جا یہاں سے ایک پیس میں، اسی میں تیری خیریت ہے۔''

''مجھے شاہ جی کا پتا دے دو میں چلا جاتا ہوں۔''

دوسرے نے ایک گالی دی اور آگے بڑھا۔ ''دوں تجھے شاہ جی کا پتا۔''

میں اندر سے خوفزدہ ہوا تھا مگر اوپر سے ثابت قدم رہا۔ ''نہ دو وہ میں کہیں اور سے لے لوں گا مگر جب شاہ جی کو پتا چلے گا کہ تم نے مجھے اس کا پتا نہیں دیا اور بات خراب ہوئی تو وہ.....'' میں نے جان بوجھ کر جملہ ادھورا چھوڑ دیا اور میری توقع کے عین مطابق وہ دب گئے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ میں کوئی اونچی پارٹی ہوں اور مجھ سے ذرا ادب سے بات کرنا ان کے مفاد میں تھا۔ ان میں سے ایک نے کہا۔ ''ٹھیک ہے شاہ جی سے بات کر کے پوچھ لیتا ہوں۔''

''میں خود پوچھ لوں گا تم نمبر دے دو۔''

مگر وہ نہیں مانا اور اپنے موبائل سے کال کی۔ یہ لوگ دب گئے تھے مگر سرور شاہ جیسے لوگ کہاں دبتے ہیں اس نے اپنے کارندوں کو حکم دیا کہ وہ مجھے یہاں سے نکال دیں۔ میں گفتگو اور بات کرنے والے کے تاثرات سے سمجھ گیا تھا کہ شاہ جی کیا کہہ رہا ہے اس سے پہلے کوئی مجھے دھکے دیتا میں خود پلٹ گیا اور احاطے کے پاس رک کر اونچی آواز سے کہا۔ ''شاہ جی سے کہہ دینا جگہ خالی کر دے اسی میں اس کا بھی فائدہ ہے۔''

وہ میرے پیچھے دوڑے لیکن میں اس سے پہلے وہاں سے نکل گیا۔ یہ سب دیکھ کر میرا خون کھولنے لگا تھا۔ مگر تعلیم اور عمر نے مجھے سکھایا تھا کہ مسئلہ لڑائی سے اسی وقت حل ہوتا ہے جب آپ کے بازوؤں میں لڑنے کا دم ہو۔ یہ دم میرے پاس نہیں تھا اس لیے میں نقصان میں رہتا۔ میں نے دیکھ لیا تھا کہ اس کالونی میں بھی اچھے خاصے مکانات بن گئے تھے اور ان میں سے اکثر بہت اچھے بنے ہوئے تھے یعنی یہاں پیسے والے لوگ آباد تھے۔ اب یہ نہیں معلوم تھا کہ وہ سرور شاہ جی جیسے تھے یا محنت کر کے کمانے والے تھے۔ سڑکیں اور گلیاں پختہ تھیں اور تمام سہولتیں بھی آ گئی تھیں اس لیے مجھے اُمید تھی کہ ان پلاٹوں کی ویلیو تقریباً ساٹھ سے ستر لاکھ تک ہو گی۔ مگر قیمت تو اس وقت ملتی جب پلاٹ میرے قبضے میں ہوتے اور یہاں تو کوئی اور قبضہ کر کے بیٹھا ہوا تھا۔ ہماری کالونی میں ایک صاحب ناصر حسین ڈی آئی جی کے پی اے تھے۔ میں نے واپس آتے ہی ان سے بات کی اور انہیں مسئلہ بتایا تو انہوں نے کہا۔

''کوئی مسئلہ ہی نہیں ہے آپ کل ایک درخواست ڈی آئی جی کے نام لکھ کر لے آئیں اور میں ان سے بات کرلوں گا۔ تھانے کی ایک وین آپ کے ساتھ جائے گی اور ان کو وہاں سے اٹھا دے گی۔''

میں نے اگلے دن اسکول سے چھٹی کی اور ڈی آئی جی کے دفتر پہنچ گیا۔ میں نے درخواست ناصر حسین کو دی اور انہوں ڈی آئی جی تک پہنچائی۔ ڈی آئی جی نے اسی وقت ہمارے علاقے کے تھانے کال کی اور میرے بارے میں بتاتے ہوئے درخواست پر فوری عمل درآمد کرنے کو کہا۔ ناصر حسین نے مجھ سے کہا۔ ''آپ تھانے چلے جائیں وہاں سے یہ کام ہوگا۔''

میں نے درخواست کے ساتھ پلاٹوں کی ملکیت کی دستاویزات بھی لگائی تھیں۔ اس تیز رفتار کارروائی سے مجھے اُمید بندھی کہ شاید میرا کام اب آسانی سے ہو جائے گا۔ مگر جب میں تھانے پہنچا اور محرر سے بات کی تو اس نے بے نیازی سے کہا۔ ''ڈی ایس پی صاحب ابھی مصروف ہیں۔''

میرا ماتھا ٹھنکا۔ یہاں ڈی آئی جی کا حوالہ بھی کام نہیں کر رہا تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ دال میں کالا تھا۔ میں نے ایک طرف ہو کر ناصر صاحب کو کال کی اور انہیں صورتِ حال سے آگاہ کیا۔ وہ بھی فکر مند ہو گیا۔ ''اسد بھائی یہ تو کہانی کچھ اور لگ رہی ہے۔ میں دیکھتا ہوں۔''

ناصر صاحب نے کچھ کیا تو دس منٹ بعد ڈی ایس پی کے کمرے سے بلاوا آ گیا۔ میں وہاں پہنچا تو ایک ادھیڑ عمر اور صورت سے بدمعاش نظر آنے والا شخص وہاں پہلے سے موجود تھا۔ ڈی ایس پی نے بہت سرد انداز میں مجھے سامنے بیٹھنے کو کہا اور چھوٹتے ہی پوچھا۔ ''تم ہو اسد اللہ جو شاہ جی کی زمین کو اپنی ملکیت بتا رہے ہو۔''

اس نے کہتے ہوئے غیر محسوس انداز میں بدمعاش صورت کی طرف دیکھا تھا۔ میں نے کہا۔ ''ہاں اور کیا یہی سرور شاہ جی ہیں۔''

''میں ہوں سرور شاہ جی۔'' اس نے رعونت سے تعارف کرایا۔

''میں اسد اللہ اسکول پرنسپل ہوں اور یہ زمین میں نے بیس سال پہلے خریدی تھی۔ میرے پاس اس کے تمام کاغذات ہیں اور رجسٹرار آفس میں بھی یہ میرے نام ہے۔''

''اوہ میاں جی۔'' سرور شاہ تمسخرانہ انداز میں

اسلامیہ یونیورسٹی

پاکستان میں قائم ہونے والی پہلی اسلامی یونیورسٹی۔ اس کا قیام جامعہ عباسیہ بہاولپور کی حیثیت سے 1965ء میں ہوا اسے جامعہ ازہر قاہرہ مصر کی نہج پر اسلامی علوم کی تعلیم کے مرکز کی حیثیت سے متعارف کرایا گیا۔ 1964ء میں اس کا نام جامعہ عباسیہ سے تبدیل کر کے جامعہ اسلامیہ رکھ دیا گیا اور جدید سائنسی علوم کی تدریس کا آغاز ہوا۔ 1975ء میں پنجاب اسمبلی کے ایکٹ کے مطابق اسے ملک کی دیگر جامعات کے مساوی درجہ دے دیا گیا جس میں سائنس، سوشل سائنسز، لسانیات، ایم بی اے اور کمپیوٹر سائنس میں ایم اے، ایم فل اور پی ایچ ڈی کی سطح پر تدریس اور تحقیق کا آغاز ہوا۔ یہ ملک کی واحد یونیورسٹی ہے جس میں ایم اے/ ایم ایس سی کی سطح پر اسلامیات لازمی کا مضمون متعارف ہے۔ اسلامیہ یونیورسٹی بہاولپور کا کلیۂ علوم اسلامیہ پاکستان کے ممتاز کلیات میں شمار کیا جاتا ہے اور اسلامی علوم کی تحقیق کے حوالے سے اس کا ایک منفرد مقام ہے۔ 2002ء میں تین نئے شعبہ جات قائم کیے گئے جن میں (1 قرآن وتفسیر (2 حدیث وسیرت اور (3 تقابل ادیان شامل ہیں۔ شعبۂ علوم اسلامیہ، شعبۂ عربی زبان وادب، شعبۂ اسلامی تاریخ اور سیرت چیئر کا ایک ریسرچ سیل پہلے ہی سے کام کر رہا ہے۔ سیرت چیئر سیل کو یونیورسٹیز کی سطح پر پہلی انٹرنیشنل سیرت کانفرنس منعقد کرانے کا اعزاز حاصل ہے۔ اس سیل کے تحت اب تک چھ مستقل تحقیقات سامنے آ چکی ہیں۔ کلیۂ علوم اسلامی کا تحقیقی مجلّہ بھی شائع ہوتا ہے۔

مرسلہ: اقرار الحسن سومرو۔ خیر پور میرس

بولا۔ ”کہنے سے بیوی اور گھوڑی اپنی نہیں ہو جاتی۔ اس پر قبضہ رکھنا پڑتا ہے۔“

”شاید تم ایسا ہی کرتے ہو گے لیکن میں ایک شریف خاندان سے تعلق رکھتا ہوں ہمارے ہاں عورتوں کو عزت سمجھا جاتا ہے۔“ میں نے سکون سے کہا۔ ”تمہارے پاس کیا ثبوت ہے کہ وہ زمین تمہاری ہے؟“

”ثبوت جتنے چاہو مل جائیں گے۔ سیمی آٹومیٹک بھی اور آٹومیٹک بھی۔“ اس نے معنی خیز انداز میں کہا۔ میں نے بے نیازی سے موبائل میں لگے ڈی ایس پی سے کہا۔

”آپ اس کی بات سن رہے ہیں۔ یہ مجھے قتل کی دھمکی دے رہا ہے۔“

”او یار۔“ اس بار سرور شاہ کے تیور خطرناک ہو گئے۔ ”سرور شاہ دھمکی نہیں دیتا کر گزرتا ہے۔ اگر اپنی اور اپنے خاندان کی خیریت چاہتے ہو تو اس جگہ سے دور رہو۔ یہ مت سمجھنا کہ ڈی آئی جی کی ایک کال سے زمین مل جائے گی۔ تمہیں اور تمہارے گھر والوں کو زمین ملی بھی تو میانی صاحب میں ملے گی۔“

میں گہری سانس لے کر رہ گیا۔ اب میری سمجھ میں آ گیا تھا کہ مقامی پولیس اس معاملے میں پوری طرح ملوث تھی اور بات صرف میری زمین کی نہیں تھی یقیناً یہ کوئی قبضہ مافیا تھی جس نے بڑے پیمانے پر دوسروں کی زمین پر قبضہ کر رکھا تھا۔ ان لوگوں سے بات کرنا بیکار تھی میں کھڑا ہوا تو سرور شاہ میرے ساتھ باہر تک آیا اور اس نے برآمدے میں آہستہ سے کہا۔ ”پرنسپل میں تمہارا پتا جانتا ہوں اور یہ بھی کہ تمہارے بچے کہاں پڑھتے ہیں۔ تمہاری تین جوان بیٹیاں ہیں اور بیٹا تو ایک ہی ہے۔ خیال رکھنا بیٹے کی جان اور بیٹیوں کی عزت بہت قیمتی ہوتی ہے۔“

”سرور شاہ وہ پلاٹ میں نے حق حلال کی کمائی سے لیے اور مجھے یقین ہے کہ اسے کوئی مجھ سے چھین نہیں سکتا ہے۔ میری قسمت میں ہوں گے تو مجھے ضرور ملیں گے۔“ میں نے نرم لہجے میں کہا۔ ”ٹھیک ہے میں تم جیسے آدمی کا مقابلہ نہیں کر سکتا اور میرے بچوں کا ایک ناخن بھی اس زمین سے زیادہ قیمت رکھتا ہے۔ مگر تم یہ مت سمجھنا کہ میں ڈر جاؤں گا۔ میں نہ سہی لیکن ممکن ہے جلد کوئی تم سے تمہاری زبان میں بات کرے۔“

وہ سفاک انداز میں مسکرایا۔ ”اس کے لیے تو سرور شاہ ہمیشہ تیار رہتا ہے۔“

میں نے اسے جوابی دھمکی دے دی تھی مگر اس کا کوئی امکان نہیں تھا کہ میری طرف سے اسے کوئی اسی کے انداز میں جواب دے۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اب میں کیا کروں۔ ٹھیک ہے میرے خاندان میں بہت سے اعلیٰ سرکاری عہدوں پر تھے۔ پولیس اور فوج میں بھی تھے مگر بدمعاشوں سے کون لڑ سکتا ہے جب کہ وہ آپ کے بچوں کے حوالے سے دھمکی دے رہے ہوں۔ جب بیگم اور بچوں کو پتا چلا تو وہ سہم گئے۔ بیگم نے کہا۔ ”بھاڑ میں جائے ایسی زمین، ہمارے لیے جان اور عزت سے زیادہ قیمتی چیز اور کچھ نہیں ہے۔“

”مگر بیگم ہمارے پاس اثاثہ یہی پلاٹ ہیں۔ میں نے تو سوچا تھا کہ انہیں فروخت کر کے بچیوں کی شادی کریں گے اور احد کو اعلیٰ تعلیم دلائیں گے۔ اس نے ایف ایس سی کر لیا ہے اور اب اسے کسی یونیورسٹی میں داخلہ لینا ہے۔“

”سب ہو جائے گا مگر آپ ان بدمعاشوں کے پاس دوبارہ نہیں جائیں گے۔“

میں نے بیگم اور بچوں سے وعدہ کر لیا کہ میں ایسی کوئی کوشش نہیں کروں گا مگر اندر سے مجھے بے چینی تھی۔ مجھے یاد ہے جب میں نے یہ پلاٹ لیے تو میں اس حد تک خالی ہاتھ ہو گیا تھا کہ چند مہینے ہم نے بہت مشکل سے گزارا کیا تھا۔ میں نے کچھ قرض بھی لیا تھا، اسے اتارنے کے چکر میں ہم نے بعض اوقات تین کے بجائے دو وقت بھی کھایا تھا اور بیگم نے سال بھر ایک سوٹ بھی نہیں بنایا تھا۔ بچوں نے اپنا دل مارا تھا۔ صرف ان پلاٹوں کی خاطر اور آج جب ہمیں ضرورت تھی تو ان پر دوسرے قبضہ کر کے بیٹھے ہوئے تھے۔ میں نے پلاٹوں پر دوبارہ جانے اور سرور شاہ کے خلاف مزید کارروائی کی کوشش نہیں کی تھی۔ مگر میں ان کے بارے میں معلومات حاصل کرنے لگ گیا۔ میں اس کالونی میں گیا اور وہاں لوگوں سے ملا۔ اکثر نے تو کسی قسم کے تعاون سے انکار کر دیا کیونکہ ان بدمعاشوں سے سب ڈرتے تھے۔ اگرچہ وہ ان سے نفرت بھی کرتے تھے کیونکہ انہوں نے نہ صرف صاف ستھری کالونی کو قبضہ کر کے خراب کیا تھا بلکہ یہاں کا ماحول بھی گندہ کر رہے تھے۔

مگر ایک دو افراد نے تعاون کیا اور انہوں نے انکشاف کیا کہ سرور شاہ اصل میں سیاسی پشت پناہی کی بنیاد پر اتنا اکڑ رہا ہے۔ اس شخص کی کوئی ذاتی حیثیت نہیں ہے۔

سابقہ الیکشن میں اس نے جیتنے والے امیدوار کے لیے حلقے میں بہت کام کیے یعنی جتنے غنڈہ گردی والے کام تھے وہ اس نے اپنے ذمے لے لیے اور کامیابی کے بعد اس امیدوار نے اسے علاقے میں زمینوں پر قبضے کے لیے کھلی چھوٹ دی تھی۔ صرف اسی کالونی میں نہیں سرور شاہ نے بے شمار جگہوں پر قبضے کر کے وہاں اپنے بندے بٹھا رکھے تھے۔ جن زمینوں پر اس کا قبضہ پکا ہو جاتا اور وہ ان کے کاغذات کسی وجہ سے حاصل نہیں کر پاتا تھا تو ان کے جعلی کاغذات بنوا لیتا تھا۔ رجسٹرار آفس میں اس کے تعلقات تھے اور وہاں سے اصلی ریکارڈ غائب کروا دیتا تھا۔ یہ سن کر مجھے خدشہ ہوا کہ کہیں وہ میرے پلاٹوں کا ریکارڈ بھی غائب نہ کروا دے۔ میں اگلے دن ہی رجسٹرار کے دفتر گیا۔

وہاں کافی پاپڑ بیلنے کے بعد میری زمین کا ریکارڈ برآمد ہوا اس کی حالت سے لگ رہا تھا کہ یہ شاید ہڑپہ کی زمین کا ریکارڈ تھا۔ مگر یہ دیکھ کر میں نے اطمینان کا سانس لیا کہ یہ میری ہی زمین کا ریکارڈ تھا۔ جو آج کے کمپیوٹرائزڈ دور میں بھی خستہ حال فائلوں کی صورت میں تھا اگر اسے دیمک کھا جاتی تو میرے پاس کوئی ثبوت نہیں تھا کہ وہ پلاٹ میرے ہیں۔ اگرچہ قبضہ مافیا کی دیمک کا خطرہ تھا۔ مگر وہ ابھی میری زمین کے ریکارڈ تک نہیں پہنچی تھی اس لیے یہ برقرار تھا۔ میں نے موقع سے فائدہ اٹھا کر رجسٹرار سے اپنی فائلوں کی مصدقہ نقول حاصل کر لیں۔ شاید یہ دل کو تسلی دینے والی بات تھی کیونکہ سرور شاہ نے بنا کسی ہیرا پھیری کے خالص زور زبردستی سے میری زمین پر قبضہ کیا ہوا تھا اور شاید اسے ان چیزوں کی پرواہ بھی نہیں تھی ورنہ جیسا کہ میں نے سنا تھا وہ رجسٹرار آفس تک رسائی رکھتا تھا اور وہاں ریکارڈ غائب کرا دیا کرتا تھا۔

ہمارے علاقے کا ایم پی اے جو ملک صاحب کے نام سے مشہور تھا۔ میں اسے نہیں جانتا تھا اور نہ ہی میں نے گزشتہ انتخابات میں ووٹ کاسٹ کیا تھا میرے حساب سے کوئی جماعت ایسی نہیں ہے جسے آدمی ووٹ دے سکے۔ حد یہ کہ جو تبدیلی کا نعرہ لگا کر آئے وہ بھی ان کی نقل کر رہے تھے جو برسوں سے اس ملک پر حکمرانی کر رہے ہیں۔ مجھے کوئی تبدیلی نظر نہیں آئی اس لیے الیکشن والے دن میں باہر نہیں نکلا۔ سرور شاہ کی دھمکی میرے ذہن میں تھی اور میں اپنے بچوں کے حوالے سے ایک فیصد رسک بھی نہیں لے سکتا تھا اس کے باوجود میں اپنے پلاٹ نہیں چھوڑنا چاہ رہا تھا اور میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ میں کیا کروں۔ ایک ایم پی اے کے درمیان میں آنے کے بعد یہ توقع حماقت ہوتی کہ پولیس یا قانون میری مدد کرے گا۔ ناصر صاحب نے معذرت کر لی تھی کہ وہ اس سے زیادہ نہیں کر سکتے تھے۔ میں سمجھ رہا تھا کہ ان کی اور ڈی آئی جی کی کیا مجبوری ہو سکتی ہے۔

ایک اتوار والے دن سب گھر میں تھے اور میں ناشتے کی میز پر اخبار دیکھ رہا تھا کہ ایک خبر نے مجھے چونکایا۔ ہمارے حلقے کے ایم پی اے ملک صاحب کی ڈگری جعلی ہونے پر کورٹ نے اسے اسمبلی کے لیے نااہل قرار دے دیا تھا۔ تفصیلی خبر کے مطابق اس نے جس یونیورسٹی کی ڈگری اپنے کاغذات کے ساتھ لگا کر پیش کی تھی اس نے اسے اپنی ڈگری تسلیم کرنے سے انکار کر دیا تھا اور اب ملک صاحب کو جعلی ڈگری کیس میں مقدمے کا سامنا بھی کرنا تھا۔ مگر چونکا دینے والی چیز اس کی تصویر تھی اور یہ خاصی پرانی تصویر تھی اسی وجہ سے میں اسے شناخت کر پایا ورنہ اس کی تصویریں تو ہمارے علاقے میں ہر کھمبے پر تھیں مگر اب وہ بہت بدل گیا تھا اس لیے میں بھی نہیں جان سکا کہ ہمارا ایم پی اے ملک صاحب اصل میں میرا شاگرد ریاض فخر ہے۔ اس نے کناری دار مونچھیں رکھ لی تھیں اور سر کے بال جو کسی زمانے میں خوب صورتی سے کریو کٹ ہوتے تھے اب لمبے ہو گئے تھے اور آنکھوں پر گہرے رنگ کی عینک لگانے لگا تھا تاکہ آنکھوں کی سرخی نظر نہ آئے۔ میں کچھ دیر کے لیے دنگ رہ گیا تھا۔

اب مجھے پتا چلا کہ میرے پلاٹ پر اصل میں کس نے قبضہ کیا تھا۔ مگر وہ خود اپنی سیٹ سے بے دخل ہو گیا تھا۔ لازمی بات تھی اب یہاں کوئی دوسرا ایم پی اے آتا۔ مگر سرور شاہ اس کا آدمی تھا اور اگر وہ چاہتا تو سرور شاہ میرے پلاٹوں سے قبضہ چھوڑ سکتا تھا۔ میں نے بیوی بچوں میں سے کسی کو اس بارے میں نہیں بتایا ورنہ وہ شاید اس سے ملنے سے بھی منع کرتے۔ شام کو میں بہانے سے گھر سے نکلا اور ملک ہاؤس پہنچ گیا۔ وہ ایم پی اے ہمارے علاقے کا تھا مگر اس کی رہائش ماڈل ٹاؤن میں تھی۔ اتفاق سے خبر میں ملک ہاؤس کا پتا بھی تھا کیونکہ جعلی ڈگری کے عکس میں یہی پتا لکھا ہوا تھا۔ عام طور سے وہاں ملنے والوں کا ہجوم ہوتا ہوگا مگر اس وقت وہاں سناٹا تھا اور کوٹھی کے گیٹ پر گارڈز مستعد تھے۔ میں نے آمد کی وجہ ریاض فخر سے ملاقات بتائی اور حوالہ اس کے استاد کا دیا۔ تقریباً پندرہ منٹ بعد اندر سے

اجازت ملی کہ مجھے اندر آنے دیا جائے۔ ایک مستعد قسم کے سیکریٹری نے میرا استقبال کیا اور اس کے اشارے پر گارڈز نے میری تلاشی لی کہ میرے پاس کوئی ہتھیار تو نہیں ہے سیکریٹری نے اس سے پہلے معذرت کی تھی۔

''یہ سیکیورٹی پروسیجر ہے۔''

اس مرحلے سے گزر کر میں اندر ایک چھوٹی سی نشست گاہ میں پہنچایا گیا اور یہاں مزید آدھے گھنٹے انتظار کے بعد ریاض فخر یوں اندر آیا کہ اس کے دونوں ہاتھوں میں موبائل فون تھے اور وہ ایک پر کسی سے بات کر رہا تھا۔ ''میں سب سمجھتا ہوں، یہ اسی...... کی کارروائی ہے۔'' اس نے ایک فحش گالی کے ساتھ کہا۔ ''جب سے میں نے الیکشن جیتا وہ پیچھے پڑا ہوا تھا۔ عدالت میں کیس لے جانے کے پیچھے بھی اسی کا ہاتھ ہے۔ اچھا میں بعد میں بات کروں گا ابھی ایک ملنے والا آیا ہے۔'' اس نے اس موبائل کی کال کاٹی اور دوسرا کان سے لگا لیا۔ ''صاحب سے ملواؤ۔'' اس بار اس کا لہجہ مؤدبانہ تھا۔ ''سر یہ میرے خلاف سازش ہے...... وہ تو ٹھیک ہے۔'' اس کا لہجہ کمزور ہو گیا اور وہ دبی آواز میں بولا۔ ''سر یہاں تو سب جعلی ڈگری لیے بیٹھے ہیں...... میرا مطلب ہے سر......'' اس نے بات کرتے کرتے موبائل کو دیکھا اور زیرِ لب ایک اور فحش گالی دی تھی۔ پھر وہ میری طرف متوجہ ہوا تھا۔ شاید اسے ابھی تک دھیان نہیں آیا تھا کہ اس سے ملنے کون آیا ہے۔ مجھے دیکھ کر وہ چونکا۔ ''سر...... آپ؟''

''ہاں۔'' میں نے کہا۔ میں اس کی آمد پر کھڑا ہو گیا تھا اور اب تک کھڑا ہوا تھا۔ اس نے ہاتھ بڑھایا تو میں نے مصافحہ کیا۔ ''شکر ہے تم نے پہچان لیا۔''

''میں آپ کو بھولا نہیں تھا۔'' اس نے مکاری سے کہا۔ ''کیا آپ خبر دیکھ کر آئے ہیں؟''

''نہیں، لیکن خبر دیکھ کر مجھے پتا چلا کہ جعلی ڈگری میں معطل ہونے والا میرا ایک شاگرد ہے اور میرے اسکول سے پڑھا ہوا ہے۔ تم سوچ سکتے ہو کہ میرے لیے یہ کیسی خبر ہوگی؟''

اس نے تڑپ کر کہا۔ ''یہ دشمنوں کی سازش ہے۔ انہوں نے یونیورسٹی سے ساز باز کر کے میری ڈگری کا ریکارڈ غائب کرادیا۔''

''جیسے تمہارے آدمی رجسٹرار آفس میں لوگوں کی جائیداد اور زمینوں کا ریکارڈ غائب کراتے ہیں۔''

وہ چونکا۔ ''یہ کیا کہہ رہے ہیں آپ؟''

''سرور شاہ تمہارا آدمی ہے اس نے ...... کالونی میں میرے ایک کنال کے دو پلاٹوں پر قبضہ کر کے وہاں باڑا بنایا ہوا ہے۔ جب میں نے پولیس کی مدد حاصل کی تو سرور شاہ نے خود مجھے بتایا کہ وہ تمہارا آدمی ہے۔ اس وقت میں جانتا تھا کہ تم ملک صاحب ہو ریاض فخر کا مجھے پتا نہیں تھا۔''

''سرور شاہ کو میں جانتا ہوں لیکن وہ میرا آدمی نہیں ہے اور نہ ہی میں نے کبھی یہ کام کیا ہے۔''

''اگر تم نے نہیں کیا تب بھی وہ تمہارا نام استعمال کر رہا ہے اس نے مجھے دھمکی دی کہ اگر میں نے پھر پولیس یا کسی اور طریقے سے اس سے قبضہ چھڑانے کی کوشش کی تو بات میری بیوی بچوں تک آجائے گی۔''

ریاض فخر خاموش ہو گیا۔ وہ کسی قدر فکرمند لگ رہا تھا۔ اس نے کچھ دیر بعد کہا۔ ''سر میں وعدہ تو نہیں کرتا لیکن میں کوشش کروں گا۔''

میں نے گہری سانس لی۔ ''یعنی میرا آنا بیکار ثابت ہوا۔''

''یہ بات نہیں ہے۔'' اس نے بے چینی سے پہلو بدلا۔ ''آپ جانتے ہیں میں مشکل میں آ گیا ہوں۔ میں اب اپیل کروں گا اور مجھے اُمید ہے میں بحال ہو جاؤں گا۔ اس صورت میں سب سے پہلا کام میں آپ کا کروں گا۔''

میں نے کہا۔ ''میرا تو خیال ہے تم ابھی بھی اگر سرور شاہ سے بات کرو تو وہ سر آنکھوں پر مانے گا۔''

ریاض فخر کھسیا گیا۔ ''کہاں سر جی، اب وہ بات بھی نہیں کرے گا ہاں میں بحال ہو گیا تو وہ دوڑا آئے گا اور قدموں میں لوٹ جائے گا۔''

میں مایوس سا اس کے پاس سے اٹھ آیا۔ ریاض فخر حکمران جماعت میں شامل تھا مگر دوسری فون کال پر اس نے جس طرح سے بات کی تھی لگ رہا تھا اندرونِ خانہ یہاں بھی اس کے خلاف کوئی فیصلہ ہو گیا تھا اور اسے سائیڈ لائن کر دیا گیا تھا۔ سیاسی جماعتیں بھی جیتنے والے اُمیدواروں کو ترجیح دیتی ہیں ہارنے والوں اور اسمبلی سے باہر ہو جانے والوں کی ان کے نزدیک اتنی وقعت ہوتی ہے جتنی کہ ریس کے گھوڑے کی جو لنگڑا ہو جائے۔ اس نے مجھ سے میرا نمبر لے لیا۔ مگر مجھے اُمید نہیں تھی کہ وہ کچھ کر سکے گا۔ اول تو اس جیسے شخص سے مجھے یہ اُمید بھی نہیں تھی کہ وہ کچھ کرنے کی کوشش کرے گا۔ اسے مجھ سے کوئی مطلب نہیں تھا اور وہ بنا مفاد کے کسی کے لیے کچھ کرنے والا آدمی نہیں تھا۔ اب میں پچھتا

رہا تھا کہ میں اس سے ملنے آیا ہی کیوں۔

میں اس کی کوٹھی سے نکل رہا تھا کہ میں نے ایک جیپ اندر آتے دیکھی۔ یہ بڑے ٹائروں اور شاندار قسم کی فکسچر والی کھلی جیپ تھی جس کے سامنے والے اینگل آئرن پر نصف درجن سرچ لائٹس لگی تھیں۔ اس کی فرنٹ سیٹ پر ایک مضبوط جسم کا آدمی بیٹھا ہوا تھا۔ اس کے سر کے بال مختصر اور کلین شیو کے ساتھ اس نے بہت ہلکی سی مونچھیں رکھی ہوئی تھیں۔ وہ سرور شاہ جیسی کوئی چیز لگ رہا تھا۔ مگر اس کی آنکھوں میں ایک عجیب سا تاثر تھا۔ مجھے یہ تاثر جانا پہچانا لگا تھا۔ اس نے قریب سے گزرتے ہوئے مجھے دیکھا تھا۔ ڈرائیور کے علاوہ پیچھے تین عدد مسلح افراد موجود تھے اور ان کے ہاتھوں میں جدید خودکار رائفلیں اور شاٹ گنز تھیں۔ میری گاڑی باہر کھڑی ہوئی تھی۔ اسے اندر آنے کی اجازت نہیں ملی تھی اور یہ شخص اپنی جیپ اور مسلح آدمیوں سمیت اندر آ گیا تھا۔ شاید وہ بھی ریاض تخر کے خاص گرگوں میں سے تھا۔ میں ابھی گھر تک پہنچا تھا کہ میرے فون کی بیل بجی۔ نمبر اجنبی تھا میں نے کال ریسیو کی تو دوسری طرف سے کسی نے غضبناک لہجے میں کہا۔

''استاد تجھ سے کہا تھا کہ اب اس معاملے سے دور رہنا، مگر تو مانا نہیں۔''

''تم کون ہو؟'' میں نے دھڑکتے دل کے ساتھ پوچھا۔

''سرور شاہ بول رہا ہوں۔'' اس نے غرا کر کہا۔ ''اب انتظار کر تیرے ساتھ کیا ہوتا ہے۔''

''پہلے یہ بتاؤ میں نے کیا کیا ہے؟''

''تو ملک صاحب کے پاس گیا تھا۔ تجھے منع کیا تھا نا؟''

''مگر فائدہ کیا ہوا ملک نے انکار کر دیا۔''

''اسے انکار کرنا تھا وہ ہارا ہوا گھوڑا ہے اور سرور شاہ ہارے گھوڑے پر دوبارہ بازی نہیں لگاتا ہے۔ تجھے جلد پتا چل جائے گا۔'' اس نے کہتے ہوئے کال کاٹ دی۔ اگر میں کہوں کہ میں خوف زدہ نہیں ہوا تھا تو یہ سفید جھوٹ ہوگا۔ میں بہت زیادہ خوف زدہ ہو گیا تھا اور اس وقت تک گاڑی میں بیٹھا رہا جب تک میرے تاثرات نارمل نہیں ہو گئے اور میں اپنے گھر والوں کا سامنا کرنے کے قابل نہیں رہا تھا۔ پھر میں اندر آیا تھا۔ ساحل نے ماسٹر مکمل کر لیا تھا اور ان دنوں ایم فل کی تیاری کر رہی تھی۔ دراصل اس کا ہونے

آغا ہلالی

(1911ء۔2001ء)

پاکستان کے ممتاز سفارت کار۔ وہ آغا عبداللہ کے ہاں بنگلور میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم کے بعد مدراس یونیورسٹی سے 1933ء میں ایم اے اور کیمبرج یونیورسٹی سے قانون کی تعلیم پائی۔ کنگز کالج کیمبرج سے آنرز کے ساتھ بی اے کیا۔ 1936ء میں انڈین سول سروس میں شمولیت اختیار کی۔ ڈپٹی سیکریٹری جوائنٹ سیکریٹری اور مختلف ممالک میں ہائی کمشنر اور سفیر کی حیثیت سے خدمات انجام دیں۔ انہیں ان کی اعلیٰ سفارتی خدمات کے صلے میں متعدد انعامات دیے گئے۔ جن میں ہلال قائداعظم، ستارۂ پاکستان، گرینڈ کراس، آرڈر آف نارتھ اسٹار سویڈن وغیرہ شامل ہیں۔

مرسلہ: نعمان خان۔ پشاور

والا شوہر ایک سال کے کورس پر بیرونِ ملک گیا تھا تو اس نے تب تک مزید پڑھ لینا مناسب سمجھا۔ نبیلہ بی بی اے آنرز کے آخری سمسٹر میں تھی اور ڈیڑھ سال میں اس کا ایم بی اے مکمل ہو جاتا۔ احد کا میں بتا چکا ہوں۔ رامینا میٹرک میں تھی۔ اب وہ میرے اسکول میں موجود واحد اولاد رہ گئی تھی۔ سوائے ساحل اور احد کے باقی دونوں بچیاں یونیورسٹی اور اسکول جاتی ہیں۔ میں ان کو گھر کیسے روک سکتا تھا۔ مگر اس وقت میں ان کو جانے کی اجازت نہیں دے سکتا تھا۔ اس لیے میں نے گھر میں آتے ہی نبیلہ اور رامینا کو بلا کر کہا۔

''آپ دونوں چند دن کے لیے چھٹی کرو۔''

''لیکن کیوں پاپا۔'' نبیلہ بولی۔ ''ان دنوں بہت اہم لیکچر ہیں پھر چھٹیاں آنے والی ہیں۔''

''بس کہہ دیا نا۔'' مجھے غصہ آ گیا۔

راحیلہ کو پتا چلا تو وہ پوچھنے آ گئی۔ ''آپ بچیوں کو یونیورسٹی اور اسکول جانے سے کیوں منع کر رہے ہیں؟''

''راحیلہ مجھے پھر سرور شاہ کی کال آئی ہے وہ دھمکی دے رہا تھا۔''

راحیلہ چونکی۔ ''پھر مگر کیوں؟''

''مجھے نہیں معلوم۔'' میں نے جھوٹ بولنے کی کوشش کی مگر راحیلہ تاڑ گئی اور اس نے میرے پیچھے پڑ کر اگلوا لیا کہ

اصل بات کیا تھی۔ راحیلہ کا رنگ سفید پڑ گیا۔
''اسد یہ آپ نے کیا کیا؟''
''میرا خیال تھا کہ سرور شاہ ریاض فخر کا آدمی ہے تو شاید اس سے بات بن جائے۔''
''یوں تو بات بگڑ گئی اور وہ جس بل بوتے پر سرور شاہ کا باس بنا ہوا تھا وہ وجہ تو رہی نہیں تب وہ کیوں اس کی سنے گا۔''
میں نے سر تھام لیا۔ ''اس وقت میں نے سوچا نہیں تھا کہ بات اس حد تک بگڑ جائے گی۔''
''اسد آپ سرور شاہ کو کال کریں اور اس سے معذرت کر لیں۔ کوئی چیز بھی ہمارے بچوں کی جان اور عزت سے بڑھ کر نہیں ہے۔''
میں نے سوچا۔ ''تم ٹھیک کہہ رہی ہو۔ مگر راحیلہ وہ بدمعاش ہے۔ میں اس سے بات کروں اور معذرت کروں تب وہ بہ ظاہر بات ختم کر دے اور اس کے بعد اچانک کچھ کر گزرے تو ہم اس کا کیا بگاڑ لیں گے۔''
''ہم اپنے طور پر محتاط رہیں گے۔ آپ نے ٹھیک کیا جو بچوں کو منع کر دیا۔ مگر آپ اس سے بات ضرور کر لیں۔''
میں نے اس نمبر پر کال کی جس سے سرور شاہ کی کال آئی تھی۔ بیل جا رہی تھی مگر کوئی اٹھا نہیں رہا تھا۔ میں وقفے وقفے سے کوشش کرتا رہا مگر اس نے کال ریسیو نہیں کی۔ ایسا لگ رہا تھا کہ وہ اپنے طور پر بات ختم کر چکا تھا۔ اب وہ صرف اپنی دھمکی پر عمل کرتا۔ یہ سوچ کر میری اور میرے ساتھ راحیلہ کی نیند بھی اڑ گئی تھی۔ ہم دونوں میاں بیوی اس ساری رات جاگتے رہے۔ جب میں نے یہ گھر لیا تھا تو اس وقت یہ کھلے صحن والا تھا مگر جب میں نے اسے مزید تعمیر کرایا تو اس کی تمام کھلی جگہوں کو کور کرا لیا اور چھت کو بھی گرل اور دروازہ لگا کر بند کر دیا۔ اب کوئی بھی اندر گھس نہیں سکتا تھا۔ پھر جب سے ہم یہاں آئے تھے ایسا کوئی واقعہ بھی پیش نہیں آیا کہ کسی نے ہمارے گھر میں گھسنے کی کوشش کی ہو۔ مگر اس ساری رات ہمیں لگتا رہا کہ کوئی کہیں سے اندر گھسنے کی کوشش کر رہا ہے۔ ہم بار بار اٹھ کر دیکھتے رہے کہ سچ مچ ایسا ہی تو نہیں ہے۔ مگر وہ ہمارا وہم تھا۔ اگلے دن نہ تو میں اسکول گیا اور نہ ہی بچوں میں سے کسی کو باہر نکلنے دیا۔ اب بچوں کو بھی علم ہو گیا تھا۔ لڑکیاں تو سہمی ہوئی تھیں مگر احد غصے میں تھا اس نے کہا۔
''پاپا ہم کیوں ڈریں، کیا ہم نے چوڑیاں پہن رکھی ہیں؟''
''بیٹا ہم بزدل نہیں ہیں مگر ہم ان بدمعاشوں کا مقابلہ بھی نہیں کر سکتے۔''
''ٹھیک ہے ہم ان کو نہیں للکار رہے مگر اس طرح سے گھر میں بیٹھ جانا تو ٹھیک نہیں ہے پاپا۔''
ساحل نے بھائی کی تائید کی۔ ''ہاں پاپا آپ سوچیں ہم کب تک اس طرح گھر میں رہیں گے۔''
''کم سے کم آج کے دن کوئی باہر نہیں جائے گا۔'' میں نے کہا۔
''تمہارے پاپا ٹھیک کہہ رہے ہیں۔'' راحیلہ نے میری تائید کی۔ ''ہمیں ایک دو دن محتاط رہنا ہوگا۔''
بچے ہمارا حکم ماننے پر مجبور تھے۔ اس سارا دن اگر کوئی پڑوسی بھی دروازے پر آتا تو ہم پوری تسلی کر کے دروازہ کھولتے تھے۔ شام ہوئی تو کل والا خوف ایک بار پھر دل و دماغ پر طاری ہونے لگا۔ اس دن بھی میں وقفے وقفے سے اس نمبر پر کال کرتا رہا مگر سرور شاہ نے کال ریسیو نہیں کی تھی۔ نو بجے کے قریب کال بیل بجی تو میں فکر مند ہو گیا۔ سب کو اندر رہنے کا کہہ کر میں خود گیٹ تک آیا اور برآمدے سے پوچھا۔ ''کون ہے؟''
''سرور شاہ۔'' باہر سے کسی نے دھیمے لہجے میں کہا لیکن مجھے یقین نہیں آیا کہ سرور شاہ اس طرح بات کر سکتا تھا۔
''کون سرور شاہ؟'' میں نے پوچھا۔
''وہ جس نے آپ کے پلاٹوں پر قبضہ کیا ہوا ہے۔''
اس نے پھر اسی انداز میں کہا تو مجھے قطعی یقین نہیں آیا تھا۔ منع کرنے پر بھی راحیلہ میرے پیچھے آ گئی تھی اس نے سنا تو تڑپ کر مجھے منع کیا۔
''اسد آپ دروازے پر مت جایئے گا۔''
مین گیٹ اگرچہ لوہے کا بنا ہوا تھا مگر اس میں درمیان میں خلا تھے جن میں رنگین منقش شیشے جڑے ہوئے تھے۔ میں نے پلٹ کر اس سے کہا۔ ''تم اندر رہو۔'' پھر میں نے بلند آواز سے کہا۔ ''سرور شاہ کیوں آئے ہو؟''
''سر جی میں آپ سے معافی مانگنے آیا ہوں۔ میں نے آپ کے پلاٹوں پر قبضہ ختم کر دیا ہے۔ آج میں یہی کام کراتا رہا۔ ابھی مکمل ہوا ہے تو بتانے آیا ہوں۔''
اس کی بات اس کے تعارف سے بھی زیادہ ناقابلِ یقین تھی۔ میں بے ساختہ گیٹ تک آیا اور ایک سوراخ سے

باہر جھانکا تو سرور شاہ مجھے اکیلا اور خالی ہاتھ نظر آیا۔ اس نے شاید بھانپ لیا کہ میں دروازے تک آیا ہوں۔ اس نے کہا۔ ”سر جی میرا یقین کریں۔ میں آپ کو صرف یہی بتانے آیا ہوں۔ بے شک آپ دروازہ بھی نہ کھولیں اور جب کوئی آپ کو کال کر کے پوچھے تو اسے یہی کہیں۔“

”کون کال کر کے پوچھے گا؟“ میں نے پوچھا۔

”وہ آپ کو خود بتا دے گا۔“ اس نے جواب دیا۔ ”کیا آپ کو میری بات کا یقین آ گیا ہے اگر نہیں تو ابھی چل کر دیکھ لیں یا صبح دیکھ لیجیے گا۔“

”سچی بات ہے مجھے تمہاری بات کا یقین نہیں آ رہا ہے۔ کیا ریاض فخر نے تمہیں مجبور کیا ہے۔“

اس کا چہرہ بگڑ گیا تھا پھر اس نے کہا۔ ”اس کا نام نہ لیں جی اس سے ہماری دشمنی ہے۔“

”ٹھیک ہے تب تم کیا چاہتے ہو اور میں کس طرح تمہاری بات کا یقین کروں۔“

”چلیں یقین نہ کریں مگر جو شخص کال کرے تو اسے یہ سب تو بتا سکتے ہیں جو میں نے ابھی کہا ہے۔“

میں سوچ رہا تھا کہ اس میں سرور شاہ کی کوئی چال تو نہیں ہے ممکن ہے وہ کسی دباؤ کے تحت یہاں تک چلا آیا ہو مگر بعد میں وہ اچانک کچھ کر گزرے۔ وہ اچانک پلٹا اور گاڑی میں بیٹھ کر وہاں سے چلا گیا۔ میں اندر آیا تو راحیلہ اور بچے سب ہی دروازے سے لگے کھڑے تھے اور انہوں نے بھی سب سنا تھا۔ ساحل نے کہا۔ ”پاپا یہ کیا تھا؟“

”پتا نہیں بیٹا۔“ میں نے کہا اچانک ہی اندر سے میرے موبائل کی بیل سنائی دی اور میں تیزی سے اندر آیا۔ اجنبی نمبر سے آنے والی کال ریسیو کی اور پوچھا۔ ”کون بات کر رہا ہے۔“

”سر کیا سرور شاہ کچھ دیر پہلے آپ کے گھر سے ہو کر گیا ہے؟“ دوسری طرف سے بھاری آواز لیکن مؤدب لہجے میں کسی نے پوچھا۔

”ہاں وہ ابھی گیا ہے۔“

”کیا اس نے پلاٹوں کا قبضہ ختم کرنے کا کہا تھا؟“

”ہاں اس نے بتایا کہ قبضہ ختم کر کے اس پر کی جانے والی تعمیر ختم کر دی ہے۔ لیکن مجھے اس کی بات کا یقین نہیں آیا۔“

”آپ یقین کر لیں۔“ بھاری آواز والے نے کہا۔ ”سرور شاہ کے آدمی وہاں سے جا چکے ہوں گے اور آئندہ وہ کبھی آنکھ اٹھا کر آپ کو یا آپ کے بچوں کو نہیں دیکھے گا۔“

”میں کیسے مان لوں اور تم کون ہو؟“

”آپ نے مجھے پرسوں ریاض فخر کی کوٹھی سے نکلتے دیکھا تھا۔ میں جیپ کی فرنٹ سیٹ پر تھا۔“

تب میرے ذہن میں جھماکا سا ہوا اور میں نے جان لیا کہ وہ عجیب آنکھوں والا شخص کون تھا۔ وہ اعظم تھا۔ میرا سب سے نالائق شاگرد۔ میں نے کہا۔ ”تم اعظم ہو؟“

”آپ نے ٹھیک پہچانا سر، اس کا مطلب ہے میں آپ کو یاد تھا۔“

”اعظم ویسے تو مجھے اپنے بہت سے شاگرد یاد ہیں لیکن چار ایسے تھے جنہیں میں نے کبھی فراموش نہیں کیا ان میں سے ایک تم ہو لیکن تمہیں کیسے پتا چلا اور تم نے سرور شاہ جیسے آدمی کو کیسے سیدھا کیا؟“

”میں نے آپ کو پہچان لیا تھا باقی مجھے ریاض سے پتا چل گیا۔ سرور شاہ کے بھاگ جانے کے بعد اس نے مجھے بلایا تھا مگر میں نے اس کا کام کرنے سے انکار کر دیا۔ جہاں تک بات سرور شاہ جیسے کو سیدھا کرنے کی ہے تو سر وہ میرا ہی پٹھا ہے۔ کیسے سیدھا نہ ہوتا۔“

اعظم سے میری بس اتنی بات ہوئی اور اس کے بعد نہ تو اس سے بات ہوئی اور نہ ملاقات ہوئی۔ مگر اس نے میرا مسئلہ حل کر دیا۔ یہ کہانی سنانے کا مقصد اپنے مسائل اور ان کا حل بتانا نہیں ہے۔ بعد میں میں نے غور کیا تو میں نے خود کو بالکل غلط پایا۔ جس شاگرد کے بارے میں میں نے سوچا تھا کہ وہ سب سے ناکام نکلے گا وہی سب سے زیادہ کامیاب رہا۔ جو سب سے ذہین تھا وہ اس کا ماتحت بنا جو ذہانت میں اس سے کم تھا۔ جو تیسرے نمبر کا تھا وہ دوسرے نمبر والے سے زیادہ کامیاب رہا۔ بے شک اس کی ڈگری جعلی نکل آئی مگر مجھے یقین تھا کہ ریاض فخر اس کا کوئی نہ کوئی توڑ کر لے گا۔ اعظم جس سے مجھے کوئی توقع نہیں تھی وہ سب سے آگے نکلا۔ اس کے آگے ریاض فخر کی بھی نہیں چلتی کیونکہ وہ بدمعاشوں کا بدمعاش ہے وہ مافیا کا سربراہ ہے جو سب پر حاوی ہے۔ تو یہ ہے ہمارا نظام تعلیم اور اس کی پیداوار۔ اب اسے نظام جہالت نہ کہیں تو اور کیا کہیں؟ ہمیں معاشرے کو سدھارنا ہوگا ورنہ آنے والی نسلیں ہمیں معاف نہیں کریں گی اور یہ کام صرف اخلاق و کردار سے کرنا ہوگا۔

مکرم و محترم ایڈیٹر ماہنامہ سرگزشت
سلام تہنیت
میں نے اپنے محلے میں پیش آنے والے واقعے میں کہانی کے لوازمات شامل کر کے ایک اچھی کہانی بنا دی ہے تاکہ لوگ سمجھ لیں کہ جرم کی کھیتی کبھی پھلتی پھولتی نہیں ہے۔ ایک دن زوال ضرور ہے۔ اس لیے انسان کو ہر قسم کے جرائم سے خواہ وہ معاشرتی ہوں یا قانونی ان سے دور رہنا چاہیے۔

محمد عرفان رامے
(لاہور)

صبح سویرے دستک کی آواز پر گرم بستر کو الوداع کہہ دینا مجھ جیسے کاہل انسان کے لیے آسان نہیں تھا۔ لیکن مرتا کیا نہ کرتا۔ اُن دنوں زندگی کچھ اس انداز سے گزر رہی تھی کہ میں چاہتے نہ چاہتے ہوئے بھی یہ سب کرنے پر مجبور تھا۔ سچ تو یہ تھا کہ گزشتہ کئی دنوں سے میرے کان طلوعِ سحر سے پہلے ہی کسی خاص مہمان کی آمد پر بجنے والے اس نقارے کو سننے کے لیے بے چین ہو جاتے تھے۔
اُس روز بھی فلیٹ کے برسوں پرانے خستہ حال

دروازے پر فرزانہ کی نازک انگلیوں سے دی جانے والی مخصوص دستک نے میرے جسم میں بجلی سی بھر دی تھی۔ اگلے ہی لمحے میں نے اچھی طرح لپیٹے ہوئے گرم لحاف کو دونوں ٹانگوں سے اچھال کر مردہ جانور کی طرح دُور پھینکا اور پھر بیڈ سے اُتر کر ننگے پاؤں دروازے کی جانب بڑھا۔

یہ سلسلہ گزشتہ کئی ہفتوں سے جاری تھا پر آج بھی مجھے فرزانہ کو خوش آمدید کہنے کی اس قدر جلدی تھی کہ میں پاؤں میں چپل اور گلے میں قمیص پہننا تک بھول گیا تھا۔

دروازے کے قریب پہنچ کر میں نے کسی غیر مرئی آئینے میں اپنا حلیہ دیکھتے ہوئے اُلجھے بالوں میں انگلیاں پھیریں اور جھٹ سے لاک گھما کر دروازہ کھول دیا۔ راستہ ملتے ہی سامنے کھڑی فرزانہ نے لمحہ بھر کے لیے اِدھر اُدھر دیکھا اور پھر بجلی کی سی تیزی سے اندر داخل ہوتے ہی دیوار کے ساتھ ٹیک لگا کر یوں بری طرح ہانپنے لگی جیسے میلوں کی مسافت پیدل طے کر کے آئی ہو۔

فرزانہ کو خوف زدہ دیکھ کر میں نے مسکراتے ہوئے دروازہ بند کیا اور قریب پہنچ کر اُسے بازوؤں کے حصار میں لے لیا۔ میرے دل کی دھڑکن کو قریب سے محسوس کرتے ہی فرزانہ نے اپنی بے ترتیب سانسوں کو درست کیا اور اپنا سر میرے سینے پر ٹکا دیا۔ پھر وہ چند لمحے توقف کے بعد بولی۔

''جلال خان پانچ روز سے گھر نہیں آیا۔ کچن کا سامان بھی ختم ہو گیا ہے۔ صبح صبح چائے کی طلب ہو رہی تھی سوچا پڑوسیوں سے مدد مانگنے میں کاہے کی شرم، آخر ہمسائی کا بھی اپنے ہمسائے پر حق ہوتا ہے۔''

''تم ہر روز یہی رٹا رٹایا جملہ بولتی ہو، اور میں تمہیں بانہوں میں بھر کر یہی جواب دیتا ہوں کہ وہ ہمسایہ ہی کیا جو مصیبت کے وقت ہمسائی کے کام نہ آئے۔'' میں نے اُس کے کان میں سرگوشی کی تو فرزانہ چاہتے ہوئے بھی اپنا نقرئی قہقہہ نہ دبا سکی اور پھر مجھے دھکا دے کر صوفے پر گرانے کے بعد کچن کا رُخ کرتے ہوئے بولی۔

''تم پیو گے؟''

''کیوں نہیں۔ اتنے دن ہو گئے ہیں صبح سویرے میری نیند خراب کرتے ہوئے۔ اب تو تمہارے بغیر ناشتا کرنے کا تصور ہی نہیں رہا۔ سچ تو یہ ہے کہ میں رات کا کھانا کھاتے ہی صبح کے ناشتے کا انتظار کرنے لگتا ہوں۔''

''جھوٹ بولنا تو کوئی تم سے سیکھے۔ دو عورتوں کے ساتھ محبت محبت کھیل رہے ہو۔ جب کہ وہ دونوں نادان اسی خوش فہمی میں مبتلا ہیں کہ تم اُن کی جدائی میں مرے جا رہے ہو۔''

''خیر ایسی بھی بات نہیں۔ تم سے تو اپنا دل کا رشتہ ہے۔'' میں نے اپنی بائیں آنکھ کا کونا دباتے ہوئے ہوائی بوسہ اس کی جانب اچھالا۔

''اور بیوی سے؟'' فرزانہ چائے کا پانی چولہے پر چڑھا کر کچن کے دروازے میں آ کھڑی ہوئی۔

''مجبوری کا۔''

''مت بھولو کہ مجبوری محبت کے مقابلے میں اکثر جیت جایا کرتی ہے۔''

''ہاں! بات تو سچ ہے مگر بات ہے رسوائی کی...... ویسے تم کہنا کیا چاہتی ہو؟'' میں سب کچھ جانتے ہوئے بھی انجان بن گیا۔ ''آج تم کچھ اکھڑی اکھڑی سی لگ رہی ہو۔ لگتا ہے رات بھر نیند نہیں آئی۔ آنکھوں کے گلابی ڈورے کچھ اور ہی چغلی کھا رہے ہیں۔ نصیب دشمناں طبیعت تو ناساز نہیں؟''

''سنا ہے راشدہ گھر واپس آنے والی ہے۔ تم نے اپنی عزیز بیوی سے معافی مانگ لی ہے اور یقین دلایا ہے کہ اب ہڈحرامی نہیں کرو گے اور ایک ہفتے کے اندر اندر ملازمت ڈھونڈ کر اُسے گھر واپس لے آؤ گے۔''

''تمہیں کس نے بتایا؟'' میں کھسیانی ہنسی ہنسا۔

''خود راشدہ نے۔ فون آیا تھا رات۔ کہہ رہی تھی کہ اس مرتبہ کرایہ اپنے ناصر بھیا کو مت دینا۔ میں بہت جلد واپس آ رہی ہوں۔ اپنے پیا کی محبت میں مری جا رہی تھی احمق عورت۔''

''تم نے اُسے بتایا نہیں کہ ناصر بھائی تو آج کل روزانہ کی بنیاد پر مجھ سے نہار منہ کرایہ وصول کر رہے ہیں۔'' میں نے کھیل بگڑتے دیکھا تو جلدی سے آگے بڑھ کر فرزانہ کی ناگن جیسی سیاہ بل کھاتی لٹ کو چھونے کی کوشش کی۔ لیکن فرزانہ نے میرا ہاتھ راستے میں ہی جھٹک دیا اور واپس چولہے کے سامنے جا کھڑی ہوئی۔

فرزانہ کا بدلا ہوا رویہ محسوس کرتے ہی میں نے بغور اُس کے چہرے کی طرف دیکھا اور پھر گہری سانس لیتے ہوئے قدرے سخت لہجے میں کہا۔ ''لگتا ہے تمہاری طبیعت واقعی ٹھیک نہیں ہے۔''

''ہاں تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔ آج میں تم سے دوٹوک

بات کرنا چاہتی ہوں اور مجھے اپنے سوال کا دوٹوک جواب چاہیے۔'' اُس نے چولہا بند کیا اور چائے دو پیالیوں میں ڈال کر واپس صوفے پر آبیٹھی۔

''کیا بات ہے؟''

میں نے پیالی ہونٹوں سے لگا کر چسکی لیتے ہوئے پوچھا تو وہ خاموشی سے سامنے پڑی پیالی کو گھورتی رہی اور پھر میری جانب دیکھا۔ ''میں چاہتی ہوں کہ تمہاری بیوی کبھی لوٹ کر واپس نہ آئے۔ تم اُس کی چھٹی کردو۔ اب یہ گھر میرا ہے اور اس ناطے تم پر بھی صرف میرا حق ہے۔'' فرزانہ کا لہجہ اس قدر پُرعزم تھا جیسے وہ اپنے فیصلے کو عملی جامہ پہنا کر جائے گی۔

''کیسی باتیں کر رہی ہو۔ یہ کیسے ممکن ہے کہ میں راشدہ کو یوں کھڑے کھڑے اپنی زندگی سے نکال دوں۔ وہ میری بیوی ہے کوئی ملازمہ نہیں۔''

''اگر تم یوں کھڑے کھڑے مجھ سے روابط قائم کر سکتے ہو تو اُسے زندگی سے نکال دینا انہونی بات نہیں ہے۔ سمجھنے کی کوشش کرو۔ میں تمہاری اس قدر عادی ہو چکی ہوں کہ وہ عورت خیالوں میں بھی زہر لگنے لگی ہے۔ یہ سوچ کر میرا دم گھٹتا ہے کہ دو چار روز میں راشدہ واپس آ کر دوبارہ اس گھر پر قابض ہو جائے گی اور میں تم سے مل نہیں پاؤں گی۔ میں یہ بھی جانتی ہوں کہ تم اوّل درجے کے بزدل انسان ہو۔ اُس کے آتے ہی بھیگی بلی بن جاؤ گے۔''

میں اُس کی باتیں سن کر سٹپٹا سا گیا تھا۔ فرزانہ اس وقت حسد کی آگ میں جل رہی تھی۔ اگر میں اس مسئلے کو سلجھانے میں ذرا سی بے احتیاطی کا مظاہرہ کرتا تو نتائج سنگین ہو سکتے تھے۔

معاملے کے ہر پہلو پر غور کرتے ہوئے میں نے چائے کا خالی کپ میز پر رکھا اور قریب پڑی ڈبیا سے سگریٹ نکال کر سلگانے کے بعد گہرے کش لینے لگا۔ کچھ دیر کمرے میں گہری خاموشی چھائی رہی پھر میں نے گفتگو کا دوبارہ آغاز کیا۔

''راشدہ کا بندوبست تو میں کر ہی لوں گا۔ البتہ تم بتاؤ کہ جلال خان کا کیا بنے گا۔ وہ تمہارا شوہر ہے۔ کیسے سوچ لیا تم نے کہ وہ ضدی شخص تمہیں طلاق دے دے گا اور مجھ سے درخواست کرے گا کہ میں اُس کی سابقہ بیوی سے نکاح کر لوں۔'' میری نظریں مسلسل فرزانہ کے چہرے پر مرکوز تھیں۔ میں اُس کے تاثرات کو زبان کھلنے سے پہلے ہی پڑھ لینا چاہتا تھا۔ مگر اس کا چہرہ بالکل سپاٹ تھا۔ وہ چند لمحے میری باتوں پر غور کرتی رہی اور کندھے اچکا کر پُرسکون لہجے میں بولی۔

''جلال خان کو اس بات پر راضی کرنا کہ وہ مجھے طلاق دے، میرا نہیں تمہارا کام ہے۔ لہٰذا یہ طریقہ بھی تم ہی سوچو کہ اُسے کیسے قائل کرو گے۔''

''کیا؟'' مجھے زمین اپنے پیروں تلے سے کھسکتی محسوس ہونے لگی۔ ''یہ تم کیا کہہ رہی ہو۔ میں اُسے یہ بات کیسے کہہ سکتا ہوں کہ وہ تمہیں آزاد کر کے میری جھولی میں ڈال دے۔ تم جلال خان کو اچھی طرح جانتی ہو۔ وہ مجھے جان سے مار ڈالے گا۔''

''اس مسئلے کا حل بھی موجود ہے میرے پاس۔ اس سے قبل کہ وہ تمہیں جان سے مارے، تم اُسے ٹھکانے لگا دو۔'' وہ پُرسکون لہجے میں بولی۔

''کیا بکواس کر رہی ہو۔ دماغ تو خراب نہیں ہو گیا تمہارا۔ جب سے آئی ہو اول فول بکے جا رہی ہو۔''

''دعا کرو کہ میرا دماغ ٹھیک کام کرتا رہے۔ اگر یہ واقعی خراب ہو گیا تو راشدہ اور جلال خان کو سب کچھ سچ سچ بتا دوں گی۔ پھر کہیں منہ چھپانے کی جگہ نہیں ملے گی، اور تمہیں ہر صورت مجھے قبول کرنا پڑے گا۔''

اب تو میری آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھانے لگا تھا۔ ''نہیں نہیں..... تم مذاق کر رہی ہو یقیناً۔ تم جیسی سمجھ دار عورت ایسی سنگین غلطی کیسے کر سکتی ہے۔''

''مجھ جیسی سمجھ دار عورت ہی تمہاری اس سنگین غلطی سے فائدہ اٹھا سکتی ہے ڈارلنگ۔ مجھے ہر صورت جلال خان جیسے عورت بیزار مرد سے نجات چاہیے اور یہ کام تم ضرور کرو گے...... ورنہ میں تمہیں اپنے ساتھ ہی لے ڈوبوں گی۔'' فرزانہ نے میرے موقف کو نظر انداز کرتے ہوئے اپنی بات مکمل کی اور جواب کا انتظار کیے بغیر اپنے فلیٹ میں چلی گئی۔

-☆-

شہر کے مضافات میں واقع اس رہائشی عمارت کی تیسری منزل پر چار فلیٹ تھے۔ جن میں سے دو فلیٹ مجھے وراثت میں ملے تھے۔

میں اپنے والدین کی اکلوتی اولاد تھا۔ والدین کی زندگی میں ہم سب ایک ہی فلیٹ میں مقیم رہے جب کہ دوسرا فلیٹ مستقل بند پڑا رہا۔ یہیں میری شادی راشدہ سے ہو

گئی۔ راشدہ میری خالہ زاد تھی۔ ہم دونوں ایک دوسرے کو پسند کرتے تھے اور اس کے والدین کو بھی ہماری پسند پر کوئی خاص اعتراض نہیں تھا سوائے یہ کہ میں مستقل مزاجی سے کسی ایک جگہ کام نہیں کرتا تھا۔

جب اس اعتراض کی بھنک راشدہ کے ذریعے میرے کانوں میں پڑی تو میں فوراً ایک کارخانے میں ملازم ہوگیا اور چند ماہ مسلسل کام کر کے ثابت کر دکھایا کہ میں ایک ذمے دار آدمی ہوں اور گھر چلانے کی مکمل صلاحیت رکھتا ہوں۔ یوں ایک سال کے اندر ہی راشدہ دلہن بن کر میرے جیون میں آگئی۔

شادی کے دو سال بعد میرے والدین یکے بعد انتقال کر گئے تو میں خود بھی کام دھندا چھوڑ کر گھر میں بیٹھ گیا۔ پہلے پہل تو راشدہ نے سوچا کہ شاید یہ سب والدین کی موت کا صدمہ ہے۔ لیکن جلد ہی اُسے احساس ہوگیا کہ میری نیت خراب ہے اور میں ہڈحرام ہوگیا ہوں۔ یوں ہمارے گھر میں روز فساد شروع ہوگیا۔

انہی دنوں میرے ایک دوست نے دوسرا فلیٹ کرائے پر چڑھانے کا مشورہ دیا۔ نیکی اور پوچھ پوچھ۔ میں تو پہلے ہی چاہتا تھا کہ نا ہاتھ پاؤں ہلائے آمدن کا کوئی مستقل سلسلہ بن جائے۔ دوست کا مشورہ دل کو لگا تو ضروری مرمت کروا کر فلیٹ کرائے پر چڑھا دیا۔

ہمارے پہلے کرائے دار ادھیڑ عمر جلال خان اور اُس کی جواں سال بیوی فرزانہ تھے۔ جلال خان کسی فرم میں ڈرائیور تھا اور دفتری کام کے سلسلے میں اکثر شہر سے باہر جاتا رہتا تھا۔ جب کہ فرزانہ نے بوریت سے بچنے کے لیے راشدہ سے دوستی کر لی تھی اور جلال خان کی غیر موجودگی میں اُس کا ہمارے ہاں آنا جانا کافی بڑھ گیا تھا۔ مگر کچھ دنوں کی علیک سلیک کے بعد ہی میں نے بھانپ لیا کہ فرزانہ مجھے پسند کرنے لگی ہے اور صرف مجھ سے ملنے یہاں آتی ہے۔

قربتیں بڑھیں تو ہماری خفیہ ملاقاتوں کا سلسلہ بھی شروع ہوگیا۔ ان ملاقاتوں میں سب سے بڑی رکاوٹ راشدہ تھی۔ چنانچہ میں نے راشدہ کے ساتھ اتنا سخت رویہ اختیار کیا کہ ایک روز تنگ آکر وہ اپنے میکے چلی گئی۔

اب ہم دونوں آزاد تھے۔ جلال خان کی بے تو جہی نے فرزانہ کو باغی بنا دیا تھا۔ یوں بات آگے بڑھتی چلی گئی۔ ادھر جیسے ہی راشدہ کے والدین کو میری بے پروائی کا احساس ہوا تو انہوں نے برادری کے چند معزز لوگوں کے ذریعے دباؤ ڈالا کہ میں راشدہ کو واپس اپنے گھر لے جاؤں۔

اب میرے پاس انکار کا کوئی خاص جواز نہیں تھا لہٰذا صلح پر آمادہ ہونا پڑا۔

لیکن آج فرزانہ کا رویہ دیکھ کر مجھے اندازہ ہوگیا تھا کہ یہ سب اتنا آسان نہیں رہا۔ میں فرزانہ کی دیوانگی سے خوب واقف تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ بظاہر معصوم اور بے زبان دکھائی دینے والی یہ خوبصورت حسینہ درحقیقت کس قدر کینہ پرور ہے۔

فرزانہ تو اپنا فیصلہ سنا کر لوٹ گئی تھی مگر میں انہی سوچوں میں گم بیٹھا رہا۔ میرا موڈ بہت خراب تھا اور نظریں کھڑکی سے باہر دکھائی دینے والی سڑک پر جمی ہوئی تھیں۔ فی الحال بچت کی یہی صورت دکھائی دے رہی تھی کہ کسی طرح ان لوگوں سے فلیٹ خالی کروا لیا جائے۔ لیکن یہ بھی فوری ممکن نہیں تھا۔ بحیثیت فلیٹ مالک معاہدے کے مطابق میں اس بات کا پابند تھا کہ کرائے دار کو فلیٹ خالی کرنے کے لیے ایک ماہ کا پیشگی نوٹس دوں۔

آج کی تلخ کلامی کے نتیجے میں فرزانہ میرے دل سے اُتر گئی تھی۔ میں جانتا تھا کہ اگر میں آج دن بھر فلیٹ میں رہا تو فرزانہ موقع پاتے ہی دوبارہ آدھمکے گی۔ لہٰذا بحث اور بدمزگی سے بچنے کے لیے میں نے باہر جا کر دوستوں کے ساتھ وقت گزارنے کا فیصلہ کیا اور الماری سے کپڑے نکال کر واش روم میں گھس گیا۔

-☆-

اس روز میں رات دیر تک دوستوں کی محفل میں بیٹھا اپنا غم غلط کرتا رہا۔ مجھے معلوم تھا کہ فرزانہ جلدی سو جانے کی عادی ہے۔ چنانچہ جیسے ہی گھڑی نے گیارہ بجائے میں نے بھی نیند کا بہانہ بنا کر محفل برخاست کرنے کا اعلان کر دیا۔

جب میں واپس پہنچا تو پوری عمارت اندھیرے میں ڈوبی ہوئی تھی ”یہ لوڈشیڈنگ بھی کبھی کبھی انسان کے لیے نعمت ثابت ہوتی ہے۔“ میں نے زیرِلب بڑبڑاتے ہوئے بائیک پارک کی اور سیڑھیاں چڑھتا اپنے فلیٹ کے دروازے تک پہنچ گیا۔

ہر سو گھپ اندھیرا تھا۔ میں نے موبائل کی ٹارچ روشن کر کے فلیٹ کا تالا کھولا اور اندر داخل ہوگیا۔ لیکن دروازہ بند کرنے سے قبل فرزانہ کے فلیٹ کا جائزہ لینا نہیں

بھولا تھا جہاں مکمل خاموشی اس بات کی شاہد تھی کہ وہ گہری نیند سو رہی ہے۔

کھانا میں باہر سے کھا آیا تھا۔ اس لیے کچن کا رخ کرنے کی بجائے کپڑے تبدیل کر کے بستر میں گھسنے ہی والا تھا کہ کسی کے دبے پاؤں سیڑھیاں چڑھنے کی آواز سنائی دی۔ کوئی بنا آواز پیدا کیے احتیاط سے سیڑھیاں چڑھتا چلا آ رہا تھا۔

اس منزل پر صرف چار فلیٹ تھے جن میں سے دو مستقل بند رہتے تھے۔ اس لیے کسی اجنبی کے اوپر آنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ ''پھر یہ کون ہو سکتا ہے؟''

میں نے خود سے سوال کیا اور ماہر سراغ رساں کی طرح دروازے کے پاس پہنچ گیا۔ سیڑھیاں چڑھنے والا اب ہماری منزل پر پہنچ چکا تھا۔ اگر وہ کوئی چور اچکا نہیں تھا تو اُسے میرے یا فرزانہ کے فلیٹ میں سے کسی ایک دروازے پر دستک دینا تھی۔

چند لمحے گہری خاموشی چھائی رہی اور پھر وہ دھیمی چاپ رک گئی۔ میں نے کی ہول پر نظریں جما کر باہر کا منظر دیکھا تو سامنے جلال خان محتاط انداز میں اپنے فلیٹ کے دروازے پر دستک دے رہا تھا۔

''جلال خان آج کیسے لوٹ آیا اُسے تو دو دن بعد آنا تھا؟'' میں ابھی سوچ ہی رہا تھا کہ فلیٹ کا دروازہ کھلا اور فرزانہ کا چہرہ دکھائی دیا۔ میں نے محسوس کیا تھا کہ فرزانہ بھی اُسے یوں اچانک سامنے دیکھ کر ٹھٹک سی گئی تھی۔ اگلے ہی لمحے جلال خان نے تیزی سے قدم آگے بڑھائے اور اندر داخل ہو کر دروازہ بند کر لیا۔

جلال خان کی پُراسرار آمد اور پھر اندر گھس کر دروازہ بند کرنے کا انداز اس قدر عجیب تھا کہ میں کچھ مشکوک سا ہو گیا تھا۔ حالانکہ جلال خان جب بھی گھر لوٹتا تھا۔ بلا وجہ ہمارے فلیٹ کے دروازے پر ایک دھپ ضرور رسید کر دیا کرتا تھا۔ جیسے یہ اعلان سمجھا جاتا تھا کہ جلال خان واپس لوٹ آیا ہے اور کل دوپہر تاش کی بازی ہو گی لیکن آج کی صورتِ حال میری سمجھ سے باہر تھی۔

اُن کے اندر جاتے ہی میں واپس اپنے بستر پر لوٹ آیا اور ایک فلمی میگزین اٹھا کر ورق گردانی کرنے لگا مگر میرا ذہن وہیں اٹکا ہوا تھا۔

بمشکل ایک گھنٹا گزرا تھا کہ فرزانہ کے فلیٹ کا دروازہ کھلنے کی چرچراہٹ سنائی دی، آواز سنتے ہی میں جلدی سے اٹھا اور آگے بڑھ کر بیرونی دروازے کے کی ہول سے باہر کا منظر دیکھنے لگا۔

فلیٹ سے نکلنے والا جلال خان ہی تھا۔ اس مرتبہ فرزانہ دکھائی نہیں دے رہی تھی۔ جلال خان نے احتیاط سے دروازہ لاک کیا اور چابی جیب میں ڈال کر سیڑھیاں اترتا نظروں سے اوجھل ہو گیا۔

جلال خان کے جاتے ہی تیسری منزل کی راہداری کسی آسیب زدہ کھنڈر کی طرح ویران ہو گئی تھی۔ یہ سب اتنا اچانک ہوا تھا کہ میرے دل کی دھڑکن تیز ہو گئی تھی۔ یہ بات مجھے سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ جلال خان اپنے ہی گھر میں اتنے پُراسرار انداز میں کیوں آیا اور پھر واپس لوٹتے وقت باہر سے تالا کیوں لگا دیا جب کہ دروازہ تو اندر سے فرزانہ کو بند کرنا چاہیے تھا۔

رات جیسے جیسے ڈھلتی چلی جا رہی تھی میرے دل میں پیدا ہونے والے وسوسے بڑھتے چلے جا رہے تھے۔ ''کہیں جلال خان نے فرزانہ کو نقصان نہ پہنچایا ہو۔ ممکن ہے ان دونوں کے درمیان کسی بات پر جھگڑا ہو گیا ہو؟''

میں نے دیوار گیر گھڑی پر نظر دوڑائی تو رات کے دو بجنے والے تھے۔ میں کافی دیر تک کمرے میں ٹہلتا رہا اور پھر موبائل اٹھا کر فرزانہ کا نمبر ڈائل کرنے لگا۔ لیکن کئی مرتبہ کوشش کرنے کے باوجود اُس نے میری کال اٹینڈ نہیں کی تھی۔

''اب مجھے خود اندر جا کر صورتِ حال کا جائزہ لینا چاہیے۔ کہیں جلال خان نے فرزانہ کا کام تمام نہ کر دیا ہو۔'' میں نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے حتمی فیصلہ کیا اور پھر اُن کے فلیٹ کی دوسری چابی اٹھا کر باہر نکل گیا۔ چند لمحے بعد میں فرزانہ کے فلیٹ کے سامنے موجود تھا۔ میں نے آخری مرتبہ دروازے سے کان لگا کر اندر کوئی آہٹ سننے کی کوشش کی اور پھر کی ہول میں چابی ڈال کر گھما دی۔

اگلے ہی لمحے ''کٹک'' کی ہلکی سی آواز سے لاک کھل گیا تو میں نے اندر داخل ہو کر دروازہ بند کر لیا۔

مجھے یہ اندیشہ بھی پریشان کیے جا رہا تھا کہ اگر جلال خان واپس لوٹ آیا تو اپنے فلیٹ میں دیکھ کر غصے سے پاگل ہو جائے گا۔ چنانچہ میں نے سرگوشی کے سے انداز میں فرزانہ کو آواز دی۔ جب کوئی جواب نہ ملا تو آگے بڑھ کر کمرے کی لائٹ آن کر دی۔ کمرا روشن ہو گیا مگر فرزانہ وہاں موجود نہیں تھی۔ میں مزید آگے بڑھا اور بیڈ روم، باتھ روم

اور کچن سمیت سارا فلیٹ چھان مارا لیکن وہ کہیں موجود نہیں تھی۔

''آخر وہ کہاں جا سکتی ہے؟''

یہ سوال دماغ پر ہتھوڑے برسا رہا تھا۔ میں نے فلیٹ کی الماریاں تک چیک کر لی تھیں مگر فرزانہ گدھے کے سر سے سینگ کی طرح غائب تھی۔ میرا ذہن یہ تسلیم کرنے کے لیے تیار نہیں تھا کہ ایک جوان عورت یوں اچانک بند فلیٹ سے غائب بھی ہو سکتی ہے۔ اس وقت زیادہ دیر وہاں رکنا خطرے سے خالی نہیں تھا۔ اب میں کمرے کی لائٹ آف کر کے واپس پلٹنے ہی والا تھا کہ کونے میں فریزر پر نظر پڑتے ہی میرا دل دھک سے رہ گیا۔ ''کہیں فرزانہ......؟''

میں اپنا جملہ ادھورا چھوڑ کر فریزر کی طرف لپکا اور پھر بنا وقت ضائع کیے ڈھکن اوپر اٹھا دیا۔ فریزر کا اندرونی منظر دیکھتے ہی میری آنکھیں حیرت اور خوف سے پھیلتی چلی گئیں اور دل کی دھڑکن بے قابو ہو گئی۔ شدید سردی کے باوجود میری پیشانی پر پسینے کے قطرے چمکنے لگے تھے کیوں کہ یخ بستہ فریزر میں ٹھونسی گئی فرزانہ کی نیم وا آنکھیں اور سر سے بہہ کر جمنے والا خون اصل کہانی بیان کر رہا تھا۔

وہی عورت جو چند گھنٹے قبل میری آنکھوں میں آنکھیں ڈالے للکار رہی تھی اب محض مٹی کی مورت بن کر رہ گئی تھی۔ جانے کتنی دیر اُسے یونہی دیکھتے رہنے کے بعد جھرجھری لیتے ہی مجھے ہوش سا آ گیا۔

یہ خیال ذہن میں آتے ہی مجھے فرزانہ کے فلیٹ میں گھٹن محسوس ہونے لگی تھی کہ میں ایک لاش کے سرہانے کھڑا ہوں۔ اس لمحے اگر کوئی مجھے واردات کی جگہ پر دیکھ لیتا تو سارا ملبہ مجھ پر گر سکتا تھا۔ چنانچہ میں نے احتیاط سے فریزر کا دروازہ بند کر کے ہر ممکنہ جگہ اپنے فنگر پرنٹ صاف کیے اور کسی چیز کو چھوئے بغیر احتیاط سے اپنے فلیٹ میں آ گیا۔

-☆-

گزرتے وقت کے ساتھ ساتھ میری بے چینی بڑھتی چلی جا رہی تھی۔ اپنا سکون تو شاید میں فرزانہ کی لاش کے پاس ہی چھوڑ آیا تھا۔ میں فیصلہ نہیں کر پا رہا تھا کہ اب مجھے کیا کرنا چاہیے۔ مجھے فرزانہ کے بہیمانہ قتل کا افسوس ضرور تھا مگر اس بات کا اطمینان بھی تھا کہ اب وہ کبھی مجھے بلیک میل نہیں کر سکے گی۔ ہمارے سارے راز فرزانہ کی موت کے ساتھ ہی فریزر میں برف بن چکے تھے۔

یہ سب سوچتے ہوئے مجھے دلی راحت محسوس ہو رہی تھی۔ اب اگلا مرحلہ یہ معلوم کرنا تھا کہ جلال خان فرزانہ کی لاش کو فلیٹ سے غائب کیسے کرتا ہے؟

اگلی صبح ناشتے کے بعد میں نے فلیٹ میں رہنے کا فیصلہ کیا تا کہ جلال خان غیر موجودگی میں فرزانہ کی لاش ٹھکانے لگانے کی کوشش نہ کرے۔ لیکن سارا دن گزر جانے کے باوجود جلال خان واپس نہ لوٹا۔

اسی طرح اگلا دن بھی گزر گیا۔ اب میرے صبر کا پیمانہ لبریز ہونے لگا تھا اور شدید ذہنی کوفت محسوس ہو رہی تھی۔ یہ سوچ کر میرے دل میں ہول اُٹھ رہا تھا کہ سامنے والے فلیٹ میں فرزانہ کی لاش سردی کا عذاب جھیل رہی ہے۔ مگر میں جلد بازی میں کوئی قدم نہیں اٹھانا چاہتا تھا۔

تیسری رات دس بجے کے قریب میرے خاموش موبائل نے انگڑائی لی۔ میں نے جلدی سے نمبر چیک کیا تو کال جلال خان کی تھی۔ میں نے زیرِلب مسکراتے ہوئے موبائل فون کان سے لگا کر نہایت پُرسکون انداز میں سلام کیا تو جلال خان نے بھی اسی محبت کا اظہار کرتے ہوئے خیر خیریت دریافت کی۔ پھر چند رسمی جملوں کے تبادلے کے بعد اس نے اصل موضوع پر آتے ہوئے اپنے تعین مجھے اطلاع دی کہ دو روز قبل فرزانہ کی ماں کو ہارٹ اٹیک ہو گیا تھا۔ یہ خبر سنتے ہی وہ بنا آپ کو بتائے کراچی چلی گئی۔ اب فی الحال اُس کی واپسی کا کوئی پروگرام نہیں ہے۔ دراصل وہ اپنی بوڑھی ماں کے پاس رہ کر اُس کی خدمت کرنا چاہتی ہے۔ لہٰذا ہم نے فلیٹ خالی کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔

''مجھے فرزانہ کی پریشانی کا سن کر افسوس ہوا۔ باقی جیسے آپ لوگ مناسب سمجھیں۔ میں آپ کی مجبوری سمجھتا ہوں......'' میں افسوس کا اظہار کرتے ہوئے دل ہی دل میں جلال خان کی عیاری پر ہنس رہا تھا۔ ''تو پھر آپ لوگ اپنا سامان کب اٹھائیں گے تا کہ میں کسی دوسرے کرایہ دار کا بندوبست کر سکوں۔ آپ تو جانتے ہیں کہ اسی فلیٹ کے کرائے سے ہمارے کچن کا خرچا چلتا ہے۔''

''سامان بہت جلد اٹھا لیا جائے گا۔'' جلال خان نے جواب دیا ''سارا سامان کراچی پہنچانا ہمارے لیے ممکن نہیں ہے۔ لہٰذا میں نے اپنا ڈیپ فریزر اور چند دوسری چیزیں ایک قریبی دوست کو دینے کا ارادہ کیا ہے۔ کل میرا دوست یہ سامان اُٹھانے آ جائے گا۔ آپ اُس کی مدد کر دیجیے گا۔ فلیٹ کا حساب بے باق کرنے کے لیے دو تین دنوں تک میں خود آپ کے پاس حاضر ہو جاؤں گا۔''

''آپ جب چاہیں اپنا سامان اُٹھا سکتے ہیں۔ مجھے تو حیرت ہے کہ آپ نے وہ فریزر اُسی حالت میں اپنے دوست کو دینے کا فیصلہ کر لیا۔ یقیناً آپ میری بات کا مطلب سمجھ گئے ہوں گے۔''

یہ کہتے ہوئے میں نے طنزیہ قہقہہ لگایا اور جواب سنے بغیر کال منقطع کر دی۔ اب میں تصور کی آنکھ سے جلال خان کا زرد پڑتا چہرہ اور کانپتی ٹانگیں دیکھ کر خوب محظوظ ہو رہا تھا۔

-☆-

رات بھر ہونے والی تیز بارش نے موسم کچھ زیادہ ہی خنک بنا دیا تھا۔ میں اپنے گداز بستر میں بے خبر سو رہا تھا کہ صبح سویرے ہونے والی دستک نے آنکھیں کھولنے پر مجبور کر دیا۔

''فرزانہ تو خود گہری نیند سو رہی ہے پھر اس وقت کون آ گیا؟'' میں نے چونک کر گھڑی پر نظر دوڑائی تو صبح کے پانچ بج رہے تھے۔ پھر ہمت کر کے بستر سے نکلا اور آگے بڑھ کر دروازہ کھول دیا۔ اگلے ہی لمحے میرا دل تیزی سے دھک دھک کرنے لگا۔ کیونکہ سامنے کھڑا جلال خان گہری سرخ آنکھوں سے مجھے گھور رہا تھا۔ اس کی حالت بتا رہی تھی کہ وہ رات بھر جاگتا رہا ہے۔ ''اندر آ جاؤ۔'' میں نے سنبھل کر قدرے سخت لہجے میں کہا۔ حالانکہ ہم دونوں ایک دوسرے کو آپ جناب کہہ کر مخاطب کرتے تھے۔ میرا جذبات سے عاری روکھا رویہ دیکھ کر جلال خان خاموشی سے آگے بڑھا اور سامنے پڑے صوفے پر بیٹھ گیا۔

''چائے پیو گے۔'' میں نے اُس کے مقابل بیٹھتے ہوئے پوچھا۔

''نہیں وقت کم ہے۔ مجھے واپس جانا ہے۔''

''مجھ سے کیا چاہتے ہو۔'' میں نے سگریٹ سلگایا۔

''تم اپنے واجبات وصول کر لو۔ میں سارا سامان آج ہی اُٹھانا چاہتا ہوں۔ دراصل مجھے چند روز کے لیے شہر سے باہر جانا ہے۔ میرے حساب سے فلیٹ کا کرایہ اور دیگر واجبات ملا کر کل پانچ ہزار بنتے ہیں۔'' جلال خان نے جیب سے پرس نکالا تو میں نے ہاتھ کے اشارے سے اُسے روک دیا۔

''فلیٹ کی حد تک تو تمہارا حساب کتاب بالکل ٹھیک ہے مگر شاید تم اس میں فریزر کا کرایہ شامل کرنا بھول گئے ہو۔ وہ فریزر اب عام نہیں رہا۔ کسی نے گھر بسا لیا ہے اُس ٹھنڈی

قبر میں۔''

جواباً جلال خان نے گھور کر مجھے دیکھا اور پھر صوفے کی پشت سے سر ٹکا کر جسم کو ڈھیلا چھوڑ دیا۔ ''تو یہ بات ہے۔ خیر بتاؤ اب تم کیا چاہتے ہو؟''

''تمہارے گناہ کی قیمت۔''

''کھل کر بات کرو۔'' جلال خان کا لہجہ پُرسکون تھا۔ شاید وہ ہر صورت معاملے کو ختم کرنا چاہتا تھا۔

''صرف پانچ لاکھ۔''

میری ڈیمانڈ سن کر جلال خان نے لمحہ بھر کے لیے کچھ سوچا اور پھر نفی میں سر ہلا دیا۔ ''یہ رقم تو بہت زیادہ ہے۔ تم جانتے ہو میں کوئی عادی مجرم نہیں ہوں۔ یہ صرف ایک حادثہ تھا۔ فرزانہ عمر میں مجھ سے چھوٹی تھی اور ہر وقت مجھے بھی احساس دلاتی رہتی تھی۔ اس اختلاف نے ہمارے دلوں میں ایک دوسرے کے لیے زہر گھول دیا تھا۔ کل جب میں واپس لوٹا تو ایک چھوٹی سی بات پر ہمارا جھگڑا شروع ہو گیا۔ میں اُسے مارنا نہیں چاہتا تھا۔ اضطراری طور پر ہاتھ ہتھوڑی کی طرف بڑھا اور میں نے اس کے سر پر وار کر دیا یہ سب غصے میں ہو گیا جس کا مجھے دلی افسوس ہے...... میں چاہتا ہوں کہ تم اس مشکل وقت میں میری مدد کرو۔ اس کے عوض میں تمہیں پچاس ہزار روپے ادا کر سکتا ہوں۔ اس کے علاوہ میرے پاس کچھ نہیں ہے۔''

''جانتا ہوں کہ تم کوئی عادی مجرم نہیں ہو۔ اسی لیے ابھی تک پولیس کو فون نہیں کیا۔ ورنہ اب تک تم حوالات کی ہوا کھا رہے ہوتے۔ باقی جہاں تک تمہارے حالات کا تعلق ہے تو مجھے اس سے کوئی غرض نہیں۔ تمہیں پورے پانچ لاکھ ادا کرنا ہوں گے۔ میں تمہیں چوبیس گھنٹے کی مہلت دے سکتا ہوں۔ اس کے بعد مجھ سے بھلائی کی توقع مت رکھنا۔''

''ٹھیک ہے۔ اگر تم بضد ہو تو میں کچھ بندوبست کرتا ہوں۔''

میرا حتمی فیصلہ سن کر جلال خان نے اثبات میں سر ہلایا مگر اس کے لہجے میں سفاکی سی عود آئی تھی۔ لیکن اب مجھے اس بات کی کوئی پروا نہیں تھی۔ کیوں کہ مفت میں لمبی رقم کمانے کے لیے تھوڑی دلیری دکھانا بہت ضروری تھا۔

جلال خان کے جاتے ہی میں نے ٹھنڈے دل سے اپنی ڈیمانڈ پر غور کیا تو اپنے فیصلے میں نظر ثانی کی گنجائش محسوس ہوئی۔ اس کے مالی حالات اتنے اچھے نہیں تھے کہ لاکھوں میں ادائیگی کر سکے۔ یقیناً جلال خان سے اتنی بڑی رقم مانگ کر میں نے غلطی کی تھی۔ اب میرے کانوں میں جلال خان کا جملہ گونجنے لگا تھا کہ مجھے جلد ہی کچھ نہ کچھ بندوبست کرنا پڑے گا۔

یہ بھی ممکن تھا جلال خان مجھے راستے سے ہٹانے کی کوشش کرتا۔ کیوں کہ انسان کے لیے پہلا قتل ہی مشکل ہوتا ہے۔ پھر وہ اپنا جرم چھپانے کے لیے دوسرا قتل کرنے میں کبھی عار محسوس نہیں کرتا ہے۔

اُس رات میں بہت مضطرب رہا۔ نیند مجھ سے کوسوں دور تھی۔ میں نہیں جانتا تھا کہ جلال خان اب کون سی چال چلنے والا ہے۔

اگلی صبح ناشتے کے بعد میں بے چینی سے جلال خان کا انتظار کرنے لگا۔ رات ڈھلتے ہی میں اپنی ڈیمانڈ پر پھر سے ڈٹ گیا تھا۔ اب مجھے قوی اُمید تھی کہ جلال خان اپنی جان بچانے کے لیے ہر صورت رقم کا بندوبست کر کے آئے گا۔

دوپہر کے وقت میں کھڑکی کھول کر باہر سڑک کا نظارہ کر رہا تھا کہ اپنی عمارت کے سامنے پولیس کی گاڑی رکتی دکھائی دی۔ میں خالی ذہن کے ساتھ پولیس کی گاڑی دیکھ رہا تھا کہ اس میں سے اترنے والے جلال خان پر نظر پڑتے ہی میرے ہوش اڑ گئے۔ جلال خان اب عمارت کے صدر دروازے کے سامنے کھڑا تھا۔ اس کے ساتھ قریبی تھانے کا ایک انسپکٹر اور تین سپاہی بھی موجود تھے۔

یہ منظر دیکھ کر میرا دل ڈوبنے لگا تھا۔ میں ابھی تک کسی نتیجے پر نہیں پہنچ پایا تھا کہ جلال خان پولیس پارٹی کے ساتھ کیا کر رہا ہے۔ اب میرے ذہن پر ایک انجانا سا خوف دستک دینے لگا تھا۔

کچھ دیر بعد فلیٹ کے دروازے پر دستک ہوئی تو میں ہمت کر کے آگے بڑھا اور دروازہ کھول دیا۔ حسبِ توقع جلال خان پولیس کے ہمراہ میری دہلیز پر موجود تھا۔ آنے والا پولیس انسپکٹر قریبی تھانے میں ڈیوٹی انجام دے رہا تھا اور کسی حد تک میرا شناسا بھی تھا۔

میں نے مسکرا کر آنے والے مہمانوں کو خوش آمدید کہا تو انسپکٹر نے بھی گرم جوشی سے مصافحہ کیا اور اپنی آمد کا مقصد بیان کرتے ہوئے بولا۔ ''جلال خان کی بیوی فرزانہ گزشتہ تین روز سے غائب ہے۔ کیا آپ اس سلسلے میں کچھ جانتے ہیں۔''

میں خود بھی جلال خان کی چال سمجھ گیا تھا۔ میرے دل میں یہ خیال بھی آیا کہ انسپکٹر کو حقیقت سے آگاہ کر کے فرزانہ

کی لاش کے بارے میں بتا دوں۔ مگر دماغ نے خطرے کا الارم بجاتے ہوئے ایسا کرنے سے روک دیا۔ اگر میں ایسا کرتا تو انسپکٹر یقیناً پہلا سوال یہی پوچھتا کہ اب تک آپ نے پولیس کو اطلاع کیوں نہیں دی۔

صورتِ حال بگڑ جاتی تو میں کسی طور بھی جلال خان کو قاتل ثابت نہ کر پاتا۔ جلال خان قتل کی رات فلیٹ میں موجود تھا، اس بات کا واحد چشم دید گواہ صرف میں تھا۔ مگر فی الوقت خاموش رہنا ہی دانشمندی تھی۔ وجہ یہ کہ لاعلمی کا اظہار کر کے میں آسانی سے اپنی جان بچا سکتا تھا۔ چنانچہ میں نے حیرت سے کندھے اُچکائے۔

''یہ بات تو خود میرے لیے بھی حیران کن ہے۔ فرزانہ میری بیوی کی موجودگی میں اکثر ہمارے ہاں آیا کرتی تھی۔ لیکن جب سے میری بیوی میکے گئی ہے اُس سے بہت کم سامنا ہوا ہے۔ مجھے جلال خان کی پریشانی کا احساس ہے۔ آپ حکم کریں میں اس سلسلے میں کیا مدد کر سکتا ہوں؟''

''چند روز قبل فرزانہ نے جلال خان سے آپ کی شکایت کی تھی۔'' انسپکٹر نے بغور میری جانب دیکھتے ہوئے کہا۔

''کیسی شکایت؟'' میں چونکا۔

''فرزانہ کا کہنا تھا کہ آپ آتے جاتے اُسے بہت عجیب نظروں سے گھورتے ہیں۔ اس نے یہ بھی کہا تھا کہ ایک روز آپ بلاوجہ اُس کے فلیٹ میں گھس آئے تھے اور دوستی نہ کرنے پر سنگین نتائج کی دھمکی دی تھی۔''

''بالکل نہیں۔ انسپکٹر صاحب یہ سراسر الزام ہے۔ میں کبھی جلال خان کی غیر موجودگی میں ان کے ہاں نہیں گیا۔'' میں اس بدلتی صورتِ حال پر گھبرا گیا۔

''آپ ذرا ان کے فلیٹ کی دوسری چابی لے آئیں تاکہ ہم خود اندر جا کر فلیٹ کا جائزہ لے سکیں۔ ممکن ہے ہمیں کوئی اہم سراغ مل جائے۔'' انسپکٹر نے میرے جواب کو نظر انداز کرتے ہوئے کہا تو میں نے احتجاجاً پوچھا۔

''ان کی اپنی چابی کہاں ہے؟''

اس سے پہلے کہ انسپکٹر کوئی جواب دیتا جلال خان دنیا بھر کا غم اپنے لہجے میں سمیٹے آگے بڑھا۔ ''آپ تو جانتے ہیں ہمارے پاس فلیٹ کی صرف ایک ہی چابی ہے جو فرزانہ کے ساتھ ہی غائب ہو گئی۔ میں اپنے کام کے سلسلے میں شہر سے باہر تھا۔ وہاں سے فرزانہ کو بہت فون کیے لیکن رابطہ نہیں ہو پایا۔ پھر میں نے اس کی قریبی سہیلیوں سے معلوم کیا لیکن وہ سب بھی اُس بارے میں لاعلم تھیں۔ لہٰذا مجھے عجلت میں اپنا کام ادھورا چھوڑ کر واپس آنا پڑا۔''

میں جلال خان کے جھوٹ پر دل ہی دل میں پیچ و تاب کھا کر رہ گیا۔ اس وقت میں کر بھی کیا سکتا تھا، خاموشی سے واپس مڑا اور الماری سے اُن کے فلیٹ کی دوسری چابی لا کر انسپکٹر کے ہاتھ میں تھما دی۔ چابی ملتے ہی انسپکٹر نے مجھے بھی ہمراہ آنے کا اشارہ کیا اور سب لوگ جلال خان کے فلیٹ کا دروازہ کھول کر اندر داخل ہو گئے۔

جلال خان اور پولیس والوں نے فلیٹ کے مختلف حصوں کا جائزہ لینا شروع کر دیا۔ اس دوران جلال خان نے ایک مرتبہ بھی فریزر کا رخ نہیں کیا تھا۔

جب پولیس کے جوان فرزانہ کا سراغ نہ لگا سکے تو جلال خان نے کرسی پر بیٹھ کر رونا شروع کر دیا۔ اسے روتا دیکھ کر انسپکٹر بھی قریب چلا آیا اور دلاسہ دینے لگا کہ فرزانہ کو بہت جلد تلاش کر لیا جائے گا۔

انسپکٹر کی تسلی پر جلال خان کا رونا تو کم ہو گیا تھا مگر وہ یوں ہچکیاں لے رہا تھا جیسے سانس لینے میں تکلیف ہو رہی ہو۔ پھر ہچکیاں لیتے لیتے وہ اپنی جگہ سے اٹھا اور پانی کی بوتل نکالنے کے لیے اُس فریزر کی جانب بڑھنے لگا جس میں فرزانہ کی لاش تھی۔ جلال خان کی عیاری دیکھ کر میرے دل کی دھڑکن تیز ہو گئی تھی۔ شاید اب یہ ڈراما اختتامی مرحلے میں تھا۔

جلال خان نے فریزر کے قریب پہنچ کر جیسے ہی اُس کا دروازہ اوپر اٹھایا خود چیخ مار کر زمین پر گر پڑا۔ اُسے گرتا دیکھ کر انسپکٹر اور سپاہی بھی فریزر کے پاس پہنچ گئے جہاں فرزانہ کی پتھرائی ہوئی ادھ کھلی آنکھیں خود پر ہونے والے ظلم کا نوحہ سنا رہی تھیں۔

جلال خان نے فرزانہ کی لاش دیکھتے ہی دھاڑیں مار کر رونا شروع کر دیا تھا۔ انسپکٹر نے سپاہیوں کی مدد سے لاش کو فریزر سے باہر نکالا اور اُس کا معائنہ کرنے کے بعد میری جانب متوجہ ہوا۔ ''یہ سب کیا ہے جناب!''

''میں اس بارے کچھ نہیں جانتا۔ میں تو خود فرزانہ کی لاش دیکھ کر پریشان ہو گیا ہوں۔''

مجھے اپنی آواز کہیں دور سے آتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔ جلال خان کی چیخ و پکار سن کر عمارت کے چند دوسرے رہائشی بھی وہاں پہنچ گئے تھے اور فرزانہ کی لاش دیکھ کر خوفزدہ تھے۔

''یہ شخص جھوٹ بول رہا ہے انسپکٹر صاحب۔ مجھے

یقین ہے فرزانہ کا قتل اسی سفاک انسان نے کیا ہے۔ فرزانہ نے خود مجھے بتایا تھا کہ یہ عیاش آدمی اُس پر بری نظر رکھتا ہے۔ کاش میں نے اُس کی شکایت کو سنجیدگی سے لیا ہوتا تو آج میری فرزانہ زندہ ہوتی۔'' جلال خان دونوں ہاتھوں سے سینہ کوبی کرنے لگا۔

''یہ جھوٹ ہے۔ جلال خان اپنا گناہ چھپانے کے لیے مجھ پر الزام لگا رہا ہے۔'' یہ کہہ کر میں نے حقیقت کو مزید چھپانا مناسب نہ سمجھا اور ساری بات تفصیل سے انسپکٹر کے گوش گزار کردی۔

''انسپکٹر صاحب!'' جلال خان چیخا۔''یہ شخص اپنے جرم پر پردہ ڈالنے کے لیے اوچھی حرکتوں پر اُتر آیا ہے۔ میں تو گزشتہ پانچ روز سے ڈیوٹی پر تھا۔ آپ چاہیں تو میرے ادارے سے تصدیق کر سکتے ہیں۔''

''میں قسم کھاتا ہوں کہ جلال خان ہی فرزانہ کا قاتل ہے۔ قتل کی رات میں نے خود اسے فلیٹ میں آتے اور پھر واپس جاتے دیکھا تھا۔'' جب میں اپنے موقف پر ڈٹ گیا تو جلال خان پہلے سے زیادہ آگ بگولا ہو گیا اور طنزیہ نظروں سے میری جانب دیکھتے ہوئے بولا۔

''میں نے اپنی بیوی کو قتل نہیں کیا۔ لیکن اگر پھر بھی یہ حیوان نما انسان قتل کی رات اس شہر میں میری موجودگی ثابت کردے تو میں یہ ناکردہ جرم قبول کرلوں گا۔''

جلال خان کا چیلنج سن کر انسپکٹر نے میری جانب دیکھا۔''جلال خان کا مطالبہ بالکل جائز ہے۔ اگر آپ واقعی بے گناہ ہیں اور جانتے ہیں کہ یہ قتل جلال خان نے کیا ہے تو واردات کی رات اس کی شہر میں موجودگی کو ثابت کرنا پڑے گا..... لیکن یہ سب بعد کی باتیں ہیں۔ اس وقت میں آپ کو فرزانہ کے قتل کے الزام میں گرفتار کرتا ہوں۔''

اپنا فیصلہ سنا کر انسپکٹر نے قریب کھڑے سپاہی کو اشارہ کیا تو وہ ہتھکڑی لے کر آگے بڑھا۔

اپنی گرفتاری کا حکم سنتے ہی میری حالت غیر ہوگئی اور آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھانے لگا۔ اس سے قبل کہ سپاہی مجھے لوہے کی چوڑیاں پہناتا فلیٹ کا دروازہ کھلا اور ایک سب انسپکٹر دو سپاہیوں کے ہمراہ اندر داخل ہوا۔ ان کے ہمراہ عام سے حلیے میں ایک محنت کش نوجوان بھی تھا جسے سپاہیوں نے حراست میں لے رکھا تھا۔

اس سے قبل کہ انسپکٹر اُن کی آمد کا مقصد دریافت کرتا نوجوان نے جلال خان پر نظر پڑتے ہی چلا کر کہا۔''جناب! یہی ہے وہ آدمی۔ اسی نے تین روز قبل رات کے وقت مجھ سے سگریٹ خرید کر ہزار روپے کا جعلی نوٹ دیا تھا۔ جس گاڑی کا میں نے آپ کو نمبر بتایا تھا وہ یہی آدمی ڈرائیو کر رہا تھا۔ اُس وقت رات کا ایک بجا تھا اور میں دکان بند کر رہا تھا۔ یہ شخص بہت پریشان اور عجلت میں دکھائی دے رہا تھا۔ میں نے پریشانی کی وجہ پوچھی تو یہ بات کو ٹال گیا کہ سگریٹ کی طلب ہو رہی تھی۔ پھر اس نے مجھے ہزار روپے کا نوٹ دیا اور گھبراہٹ میں بقایا رقم لینا بھی بھول گیا۔''

شناخت کا عمل مکمل ہوتے ہی سب انسپکٹر کے کہنے پر جلال خان کی جامہ تلاشی لی گئی تو پرس میں سے مزید دو جعلی نوٹ برآمد ہوگئے۔

دکاندار نے جلال خان کی شہر میں موجودگی کا جو وقت اور تاریخ بتائی تھی وہ فرزانہ کے قتل کی رات تھی۔

صورتِ حال بہت حد تک کھل کر سامنے آچکی تھی۔ چنانچہ جلال خان کو جعلی کرنسی اور فرزانہ کے قتل کے الزام میں گرفتار کرلیا گیا اور وہی ہتھکڑی جو چند لمحے مجھے پہنائی جانے والی تھی اب اصل قاتل کو اپنی گرفت میں جکڑ چکی تھی۔

میرا چہرہ ابھی تک خوف سے زرد تھا اور ٹانگیں سوکھے پتوں کی طرح کانپ رہی تھیں۔ میں حیرت سے گنگ جلال خان کو پولیس کی حراست میں دیکھ رہا تھا کہ انسپکٹر دھیرے دھیرے چلتا ہوا میرے قریب آیا اور نرم لہجے میں بولا۔

''آپ کا دعویٰ درست ثابت ہوا ہے۔ واردات کی رات جلال خان اسی شہر میں تھا اور اب اسے فرزانہ کے قتل کے الزام میں گرفتار کرلیا گیا ہے۔''

انسپکٹر نے میرا کندھا تھپتھپا کر تسلی دی اور فرزانہ کی لاش پوسٹ مارٹم کے لیے اسپتال روانہ کردی گئی۔ پھر اس نے جلالی خان سے پوچھا۔''یہ نوٹ آئے کہاں سے؟''

''صاحب جی میرا ایک دوست ہے جو جعلی نوٹ کا دھندا کرتا ہے۔ اکثر میں اس سے ہزار کا نوٹ پانچ سو میں خریدتا رہتا ہوں اور اسے گاؤں دیہات کے چھوٹے دکانداروں کو دیا کرتا ہوں۔ اس رات میں بہت گھبرایا ہوا تھا اسی لیے غلطی سے وہ نوٹ محلے کے دکاندار کو دے دیا۔''

''خان یہ بھول گیا تھا کہ محلے کا دکاندار اسے پہچانتا ہے۔ دکاندار کے ساتھ آنے والے ایس آئی نے کہا۔'' اسی لیے پکڑ میں آتے ہی وہ ہمیں خان کے گھر لے آیا یہاں آکر پتا چلا کہ ایک اور کہانی منتظر ہے۔

-☆-☆-

مضبوط عورت

مکرمی مدیراعلیٰ
سلام مسنون
عورت کی زندگی بھی کیا زندگی ہے، وہ خود کو کتنا ہی مضبوط کیوں نہ بنا لے مگر مردوں کے اس معاشرے میں اسے وہ مقام نہیں مل سکتا جس کی اسے چاہ ہوتی ہے نتیجتاً .... وہ ہمت ہار دیتی ہے۔ ارسال کردہ واقعات میری ایک واقف کار کی ہے۔ وہ معاشرے میں ایک مقام رکھتی ہے اس لیےاس کا نام بدل دیا۔ اس کی روداد ہر ایک کے لیے سبق بھری ہے اس لیے اسے ضرور شائع کریں۔

ظہیر مرزا
(کراچی)

رونے پیٹنے کی دلخراش آوازیں سنتے ہی ہاسپٹل کے کاریڈور میں بیٹھی شہناز تیزی سے دروازے کی طرف بڑھی۔ دروازے کے پاس ایک لڑکی چیخ مار کر کھڑے قد سے گر گئی تھی۔ اطراف کے سبھی لوگ اس کے پاس جمع ہونے لگے۔

وہ لڑکی بلک بلک کر بین کر رہی تھی۔ شہناز بھی سہمے ہوئے دل اور لڑکھڑاتے قدموں کے ساتھ ان لوگوں کے قریب گئی۔ کوئی اس سرائیکی لڑکی کو تسلی دے رہا تھا۔ کوئی

اسے پانی پلانے کی کوشش کررہا ہے۔

''نہیں نہیں...... شکر ہے...... یہ تو کوئی اور ہے۔''

لڑکی کے چہرے پر نگاہ پڑتے ہی شہناز نے سکون کا سانس لے کر زیرِ لب کہا۔

چند لمحوں بعد ہی شہناز کو اپنے کہے ہوئے الفاظ کا احساس ہوا اور وہ خود سے شرمندہ سی ہوگئی۔ پھر وہ اس لڑکی کی حالت دیکھ کر اس پر کڑھنے لگی۔

ہاسپٹل کی انتظار گاہ میں بیٹھے بیٹھے شہناز کو کافی وقت ہوگیا تھا اور اسے ابھی تک نیلم کے بارے میں کچھ معلوم نہیں ہوسکا تھا۔

''خدا جانے میری ملاقات نیلم سے ہو بھی سکے گی یا نہیں'' یاسیت سے چاروں طرف دیکھتے ہوئے شہناز نے خود کلامی کی اور آنکھیں بند کرکے کسی وظیفے کا ورد کرنے لگی۔

نیلم پر قاتلانہ حملے کی خبر ملتے ہی شہناز بے قرار ہوکر دوڑی چلی آئی تھی مگر نیلم کے بارے میں کچھ معلوم نہ ہونے کی وجہ سے اس کا اضطراب مسلسل بڑھتا جارہا تھا۔

''چلیے خالہ......'' روبی کی آواز سنتے ہی شہناز نے ایک دم ہڑبڑا کر آنکھیں کھول دیں۔

شہناز نے سوالیہ نگاہوں سے روبی کو دیکھا پھر تیزی سے روبی کے پیچھے پیچھے چلنے لگی۔ شہناز کے دل میں سو طرح کے خیالات گڈمڈ ہو رہے تھے۔

''ک...... کیا ہوا...... کہاں ہے نیلم......'' شہناز نے بیقراری سے پوچھا۔

''کچھ نہیں خالہ...... سب خیریت ہے۔'' روبی نے تسلی دیتے ہوئے سمجھایا ''انہیں ہاسپٹل سے گھر لے جایا جاچکا ہے...... ان کی کوئی رشتہ دار خاتون بھی یہاں انہیں دیکھنے آئی تھیں...... ان سے پتا معلوم کرلیا ہے۔''

روبی کی تسلی دینے کے باوجود شہناز کو یقین نہیں آرہا تھا مگر کچھ کہہ بھی نہیں سکتی تھی۔ خاموشی سے روبی کے ساتھ ٹیکسی میں بیٹھ گئی۔ شہناز کو اس قدر مضطرب دیکھ کر روبی اس کا دھیان بٹانے کے لیے اِدھر اُدھر کی باتیں کرنے لگی۔

''یہ تو پچھلے سال ہمارے کالج کے فنکشن میں چیف گیسٹ کے طور پر آئی تھیں۔'' روبی نے شہناز کو متوجہ کرتے ہوئے کہا ''لیکن آپ نے پہلے کبھی بتایا نہیں کہ نیلم آپ کی کوئی رشتہ دار ہیں؟''

''نیلم میری بہن ہے...... سوتیلی۔'' شہناز نے نظریں ملائے بغیر جواب دیا۔

چند لمحے شہناز خاموش رہی پھر اس نے آہستہ آواز میں کہا۔ ''جب تک ہم دونوں سہیلیاں تھیں خوب دوستی رہی ہم دونوں میں...... بالکل ساتھ والا مکان تھا نیلم کا۔ نیلم شاید گیارہ برس کی ہوگی...... جب نیلم کی ماں کا انتقال ہوا...... پھر...... اس کے ابا نے میری اماں سے شادی کرلی اور......''

روبی نے مزید کچھ نہیں کہا اور صرف اثبات میں سر ہلا دیا۔

''آپ کو پتا ہے مجھے ان کی شاعری بہت زیادہ پسند ہے...... جب میں نے پہلی بار ان کی کتاب پڑھی تب سے ہی مجھے بہت شوق تھا ان سے ملنے کا...... اور اب آج میں ان سے ملوں گی...... مجھے یقین نہیں آرہا۔'' چند لمحوں بعد روبی نے کچھ سوچتے ہوئے جذباتی انداز میں خوش ہوکر کہا۔

''میں بھی کتنے برسوں بعد آج اس سے ملوں گی۔'' شہناز نے حسرت سے خود کلامی کی ''میں تو پل پل اس پر جان چھڑکتی رہی مگر......''

''مگر آپ کے ان سے اختلافات کیوں تھے؟'' روبی نے روانی میں کہہ دیا۔

شہناز کے چہرے پر کئی رنگ آئے اور چلے گئے۔ اپنی غلطی کا احساس ہوتے ہی روبی نے ٹیکسی کی کھڑکی سے دور دیکھنا شروع کردیا۔ شہناز کے لبوں کو ذرا سی جنبش ہوئی۔ اس نے کچھ کہنا چاہا مگر کچھ سوچ کر رک گئی۔

''کبھی کبھی مجھے لگتا ہے کہ میری امی جب طلاق لے کر گئی تھیں...... تو کاش وہ مجھے بھی ساتھ لے جاتیں...... میری تربیت کچھ تو ڈھنگ سے ہوئی ہوتی...... میں لوگوں سے بات کرتے ہوئے پتا نہیں کیا الٹا سیدھا بول جاتی ہوں کہ بس......'' روبی نے روہانسی ہوکر شرمندگی سے کہا۔

''نہیں بیٹا...... ایسا نہ سوچا کرو...... اور تمہاری جگہ کوئی بھی ہوتا تو یہی پوچھتا...... میں تمہیں سب بتاتی ہوں۔'' شہناز نے پیار سے اسے لپٹاتے ہوئے کہا۔

شہناز نیلم کی باتیں کرنے کے لیے شاید خود بھی بیتاب تھی۔ چند لمحوں بعد شہناز نے کہنا شروع کیا ''میں ہمیشہ نیلم کو بڑا آئیڈیلائز مانا کرتی تھی...... کیوں کہ اس کی زندگی ہمیشہ مشکلات میں گھری رہی مگر اس نے کبھی ہار نہیں مانی...... زمانے کی یا لوگوں کی ہر مخالفت کو، اور ہر رکاوٹ کو اس نے

پار کیا اور خود اپنی زندگی بنائی...... مجھ میں شاید اتنی ہمت کبھی بھی نہیں تھی...... مگر میں یہ ضرور سوچا کرتی تھی کہ اگر خدا نے مجھے بیٹی دی تو میں اسے نیلم کے جیسی مضبوط عورت بناؤں گی۔''

ٹیکسی نے ایک موڑ کاٹا اور نسبتاً کچے رستے پر آگئی۔

''آپ دونوں ایک ہی شہر میں رہتی تھیں لیکن پھر کبھی وہ آپ سے ملنے نہیں آئیں۔'' روبی نے بہت محتاط انداز میں پوچھا۔

''ہم حالات سے مجبور تھے اور......'' شہناز نے آنسو پونچھتے ہوئے یاسیت سے کہنا چاہا مگر الفاظ اس کے حلق میں گھٹ گئے۔ چہرہ سرخ ہوگیا۔ ٹیکسی کے رکتے ہی مانگنے والے بچے اور کھلونے بیچنے والے نے آگھیرا۔ شہناز نے جلدی سے پرس کھول کر مانگنے والی ایک چھ سات سالہ بچی کو نوٹ دیا۔

''شاید اتنی بڑی ہی ہوگی نیلم کی بیٹی شائستہ' جب میں نے اسے آخری بار دیکھا تھا...... اب تو کافی بڑی ہوگئی ہوگی وہ۔'' شہناز نے مانگنے والی بچی کو مسکرا کر دیکھتے ہوئے روبی سے کہا ''بہت بڑی افسر لگی تھی نیلم...... بڑے ٹھاٹھ باٹھ تھے اس کے...... میں اپنے شوہر کی ملازمت کے لیے سفارش کرانے گئی تھی اس کے پاس...... یوں کام ہوا اس کے قلم چلانے سے۔'' اس نے چٹکی بجا کر کہا۔

روبی نے اپنے ذہن میں نیلم کی شخصیت کا جو خاکہ بنایا ہوا تھا، شہناز کے الفاظ اس خاکے میں رنگ بھرنے لگے تھے۔ شہناز کی باتیں سنتے سنتے روبی کے ذہن میں ایک خیال شدت سے سر اٹھانے لگا...... کاش وہ بھی زندگی میں نیلم کی طرح باہمت ہوتی، کاش اس نے بھی اپنی زندگی کے بارے میں کیے جانے والے فیصلوں کے آگے سر نہ جھکایا ہوتا تو آج وہ بھی زندگی میں کسی نمایاں مقام پر ہوتی۔ اسی سوچ کی بناء روبی کے دل میں نیلم کے بارے میں ہر بات جاننے کی خواہش بڑھ گئی۔

ڈرائیور نے ٹیکسی کی رفتار تھوڑا آہستہ کی۔ کالج کی کچھ لڑکیاں ہنستی کھلکھلاتی ہوئی تیزی سے ٹیکسی کے سامنے سے گزریں۔ ان کے سڑک کراس کرتے ہی ڈرائیور نے گاڑی کو اسپیڈ سے آگے بڑھا دیا۔

''تمہیں پتا ہے ہمارے کالج کا کوئی فنکشن اس کے بغیر مکمل نہیں ہوتا تھا...... ایسی زبردست تقریریں کیا کرتی تھی، پورے کالج میں ہر طرف اسی کی دھوم تھی...... مگر......

اس کے ہونٹوں پر کبھی میں نے مسکراہٹ نہیں دیکھی۔ لگتا تھا کہ اداسی اس کے چہرے پر ٹھہر گئی تھی۔'' شہناز نے کالج کی لڑکیوں کو دیکھتے ہوئے روبی سے کہا ہلکے سے جھٹکے سے ٹیکسی دوبارہ آگے بڑھ گئی۔

''میرے دل میں تو بس یہی تمنا تھی کہ کاش اس کی ماں زندگی میں اس کی کامیابیوں کو حاصل کرتے دیکھ پاتی تو کتنا خوش ہوتی......'' شہناز نے افسوس کرتے ہوئے کہا۔

''بڑی نیک عورت تھی اس کی ماں صالحہ...... کبھی کسی کی بدی برائی میں نہیں رہتی...... مگر نیلم کو اپنی ماں سے زندگی بھر شکوے ہی رہے......''

''ماں سے......'' روبی نے تعجب سے بے ساختہ کہا

شہناز خاموش رہی۔

روبی کو نیلم سے متعلق ہر بات اس کی اپنی زندگی سے جڑی محسوس ہونے لگی۔ وہ نیلم کی زندگی کے ہر پہلو کو اپنی گھٹی گھٹی زندگی کے بے کیف خانوں میں رکھ کر دیکھنے لگی۔ اگر وہ نیلم کی جگہ ہوتی تو کیا کرتی، شاید ایسا ہوتا یا پھر کچھ اور ہوتا...... کچھ سوچنے پر بھی اسے کوئی واضح شکل سمجھ میں نہ آئی...... اسے لگا کہ اس کی سوچ اس کے ذہن کے بند تاریک غار میں سر پٹختی پھر رہی ہے مگر کوئی راستہ سجھائی نہیں دیتا۔

چند لمحوں بعد شہناز نے آہستہ آواز میں کہا۔

''ہاں...... ماں سے...... اب تمہیں بتاؤں بھی تو کیا...... نظام ہی اوندھا تھا اس گھر کا...... نیلم واقعی بہت حساس لڑکی تھی...... اور اس کی ماں صالحہ بہت سادہ طبیعت کی، شوہر پرست عورت...... اس کا باپ تھا تو پڑھا لکھا شخص مگر بیوی سے اس کا رویہ وہی عام روایتی مردوں والا تھا...... زندگی میں کبھی اپنی بیوی کو کوئی اہمیت نہیں دی...... پیسے کی تو ریل پیل تھی، آئے دن دوستوں کی دعوتیں ہوتی رہتی تھیں اس کے گھر پر لوگوں کی مگر صالحہ کو کسی بات پر کوئی اختیار نہیں تھا...... سچ پوچھو تو میرا ابھی بڑا دل دکھتا تھا کہ وہ سوائے اپنی بیوی کے دنیا کے ہر انسان کے ساتھ خوش رہتا تھا۔ اس پر صالحہ بیچاری اپنے شوہر کی ہر جائز و ناجائز بات خوش دلی سے مانتی تھی پھر بھی شوہر کی جھڑکیوں، بے عزتی میں کوئی کمی نہ ہوتی اور شاید شوہر پرستی کے اسی رویے کی وجہ سے نیلم اپنے باپ سے متنفر ہوگئی تھی۔ اسی لیے اس نے زندگی میں اپنا راستہ خود بنایا......''

روبی نے دلچسپی لیتے ہوئے کہا ''یہ تو بڑی عجیب بات

ہے...... آخر وہ اتنی بے جا باتیں کیوں مانتی تھیں اپنے شوہر کی؟''

شہناز نے سیٹ کی پشت پر سر لگا دیا اور دھیرے سے اپنی آنکھیں بند کرتے ہوئے کہا۔ ''یہی قلق تو نیلم کو بھی تھا...... اس کی ماں ایک ان پڑھ عورت تھی...... وہ اکثر اپنی ماں سے ان باتوں پر ناراض ہوا کرتی تھی کہ اس کی ماں نے ہمیشہ اپنی مرضی، پسند ناپسند اور خواہشات، اپنی ذات کو بھلا کر ہمیشہ شوہر کی بات کو مقدم کیوں رکھا مگر اس کو ملا کیا؟ صرف دو وقت کی روٹی اور چار دیواری کی خاطر اپنی زندگی کو اتنا بے رنگ کر لیا۔ اس پر اس کی ماں اسے بس اتنا ہی جواب دے پاتی تھی ہمیں تو ہمارے بڑوں نے یہی بتایا ہے ہم اسی طرح زندگی گزارتے آئے ہیں...... مگر نیلم...... وہ ہمیشہ چاہتی تھی کہ اس کی ماں بھی برابری کے حق کی بات کرے۔''

ٹیکسی ایک جھٹکے سے رکی۔ بریک چرچرائے ڈرائیور نے اچانک سامنے آتے ہوئے ایک فقیر کو زور دار آواز میں ڈانٹا۔ شہناز نے کھڑکی سے باہر جھانک کر دیکھنا چاہا مگر ڈرائیور نے تیزی سے ٹیکسی آگے بڑھا دی۔

ٹیکسی کے برابر میں ایک اسکول وین ساتھ ساتھ چلنے لگی جس میں سے کئی شریر بچے لوگوں کو دیکھ کر منہ چڑا رہے تھے اور ہاتھ ہلا رہے تھے۔ شہناز بھی انہیں دیکھ کر محظوظ ہونے لگی۔

''ایک بار کی بات بتاؤں...... جب میں اسکول میں تھی تو میں ضد کر کر کے اپنی سالگرہ نیلم کے گھر پر ہی منایا کرتی تھی...... اس کی ماں مجھ سے بڑا پیار کرتی تھی۔'' شہناز نے ہنستے مسکراتے بچوں کو دیکھ کر اپنے بچپن کی یادوں کو پھر سے تازہ کرنا شروع کر دیا ''پر مجھے اس کے ابا سے بڑا ڈر لگتا تھا...... بعد میں تو وہ میرے ابا بھی ہو گئے مگر اس کے مزاج کا کچھ بھروسا نہیں تھا...... بات بات پر جھگڑا کرتا، چیختا چلاتا اور گھر سے نکالنے کی دھمکی تک دیتا مگر اس کی ماں ہر بات پر اس کا غصہ ٹھنڈا کرنے کے لیے جتن کرتی رہتی بات کو دبانے کے لیے، بات ختم کرنے کے لیے کوششیں کرتی۔ بے قصور ہونے کے باوجود معافیاں تلافیاں کرتی رہتی۔ شوہر کے ماتھے کی شکنیں دور کرتے کرتے اس کی زندگی ختم ہو گئی۔''

''اچھا...... پھر ان کا رویہ بعد میں آپ کی امی کے ساتھ بھی ایسا ہی رہا؟'' روبی نے پیشانی پر بل ڈالتے ہوئے پوچھا۔

''نہیں...... اور کسی کے ساتھ ایسا برا رویہ نہیں تھا ان کا......'' شہناز نے سوچتے ہوئے کہا ''بلکہ وہ صالحہ کے ساتھ بھی ہر وقت برا نہیں کرتے تھے...... موڈ اچھا ہوتا تو تھیلے بھر بھر کر فروٹ لا دیتے، طرح طرح کی چیزیں، کپڑے لا دیتے مگر اس میں بھی صرف ان کی اپنی مرضی ہی ہوتی تھی...... بیوی کی خواہش اور اختیار کو کبھی اس نے اہمیت نہ دی...... اور آفرین ہو اس عورت پر جس نے نہ جانے کیسے نباہ کیا ایسے شخص کے ساتھ اور زبان پر کبھی شکوہ تک نہ لائی...... شوہر نے جو کچھ لا دیا احسان سمجھ کر رکھ لیتی......''

''کچھ دن پہلے میں نے پڑھا تھا نیلم صاحبہ کا انٹر ویو چھپا تھا ایک اخبار میں......'' روبی نے فٹ پاتھ کے قریب ایک اخبار فروش کو دیکھتے ہی کہا۔

''ہوں...... کالج کے زمانے میں بھی کتنے ہی اخباروں، رسالوں میں، اس کی غزلیں، اس کی تصویریں اس کے انٹرویو چھپتے تھے...... دور دور تک اس کی شاعری کی شہرت تھی۔ ایک شہر سے دوسرے شہر تک مشاعروں میں اسے بلایا جاتا تھا...... میری بھی بڑی تصویریں چھپی ہیں نیلم کے ساتھ ساتھ کالج کے میگزینوں میں......'' شہناز نے خوشی سے جذباتی انداز میں کہا۔

ٹیکسی کی رفتار ذرا بڑھی اور وہ ایک پل کے اوپر رواں ہو گئی۔ جہاں سے نیچے کا علاقہ دور دور تک فلیٹوں اور مکانوں کا ایک جنگل سا منظر پیش کر رہا تھا۔

''لگتا ہے کبھی کچھ بدل گیا ہے اتنے برسوں میں......'' کھڑکی سے باہر جھانک کر شہناز نے بغور دیکھتے ہوئے کہا۔

''بہت عرصہ بعد آئی ہیں آپ اس علاقے میں؟'' روبی نے استفسار کیا۔

''ہوں...... یہاں کیا میرا تو کسی کے پاس بھی آنا جانا نہیں ہوتا اب...... نیلم کی طلاق کے مقدمے کے بارے میں بھی لوگوں ہی سے سنا ہے میں نے......'' شہناز نے دکھی لہجے میں کہا ''خدا جانے وہ اب بھی مجھ سے ملنا چاہے گی یا نہیں؟''

''آپ ان سے اتنی زیادہ محبت کرتی ہیں...... میرا دل کہہ رہا ہے کہ وہ آپ کو دیکھ کر خوش ہوں گی۔'' روبی نے ہمت بندھاتے ہوئے کہا۔

''خدا معلوم جو حالات زندگی نے ان سب معاملوں میں وہ اپنے باپ کو زیادہ قصوروار زیادہ سمجھتی تھی یا میری ماں کو

مگر...... میں نے ہمیشہ اس کو دل سے چاہا......'' شہناز نے بھی خود کو تسلی دینے کی کوشش کی۔ ''تمہیں پتا ہے جب نیلم کی ماں کا انتقال ہوا تو میری ماں نے نیلم کا بہت خیال رکھا۔ نیلم سارا دن میرے گھر پر ہی رہتی تھی...... شام کو جب اس کا باپ کام سے واپس لوٹتا تو نیلم اپنے گھر چلی جاتی لیکن...... اس وقت ہمارے گھر میں پائی پیسے کی بڑی تنگی تھی۔۔ نیلم کے باپ کو اندازہ تھا وہ ہماری مالی امداد کرنے لگا پھر......'' شہناز کہتے کہتے اچانک رک گئی جیسے کچھ باتیں حذف کرنا چاہتی ہو۔ ''پھر...... وہی ہوا جو...... ان حالات میں ہوتا ہے...... گلی محلے کے لوگوں نے سو سو باتیں بنانی شروع کردیں میری ماں کے متعلق...... چند لمحے خاموش رہنے کے بعد شہناز نے بہت آہستہ آواز میں کہا۔

ٹریفک جام ہونے کی وجہ سے ٹیکسی رک گئی۔ اچانک گالم گلوچ کی تیز زوردار آوازیں آنے لگیں۔ پریشر ہارن اور ہنگامہ کی آوازوں میں کچھ سمجھ میں نہیں آرہا تھا۔ ٹیکسی ڈرائیور بھی اتر کر باہر چلا گیا۔

روبی بالکل خاموش رہی۔ آگے کچھ کہنے کی ہمت بھی نہیں ہورہی تھی اور اس کی سمجھ نہیں آرہا تھا کہ کہے تو کیا کہے۔

''میری ماں نے شاید کسی کے کہنے سننے کی زیادہ پرواہ نہیں کی...... بہت دن اسی طرح گزرتے گئے۔ ایک روز میری ماں کا نیلم کے باپ سے بہت جھگڑا ہوا...... وہ دیر تک روتی رہی اور نیلم کا باپ اس پر چیختا چلاتا رہا...... اس روز میری ماں نے چوہے مارنے والی دوائی پی کر خودکشی کرنے کی کوشش کی......''

''کچھ نہیں ہے...... ارے یہ چھوٹے موٹے ایکسیڈینٹ تو ہوتے رہتے ہیں......'' ٹیکسی ڈرائیور نے بڑبڑاتے ہوئے دوبارہ گاڑی اسٹارٹ کرتے ہوئے کہا اور آہستہ آہستہ گاڑی آگے بڑھانی شروع کردی۔

کچھ لمحوں بعد شہناز نے ...... روبی سے نگاہیں ملائے بغیر کھڑکی سے باہر دیکھتے ہوئے آہستہ سے کہا۔ ''اور پھر...... ڈاکٹروں نے میری ماں کی جان بچالی۔ اگلے چند روز میں نیلم کے باپ نے میری ماں سے نکاح کرلیا۔ دو تین دن میں ہی ہم لوگ نئے محلے میں شفٹ ہوگئے۔ چھ مہینے بعد میری ماں کے ہاں میرا بھائی پیدا ہوا...... جو پیدائشی طور پر ذہنی معذور تھا۔''

''باجی آگے کس طرف......'' اسٹاپ کے قریب موڑ کاٹتے ہوئے ڈرائیور نے پوچھا۔ تو باتوں کا سلسلہ رک گیا۔ شہناز نے گلیوں کو بغور دیکھتے ہوئے ایک جانب اشارہ کیا اور گاڑی اس طرف بڑھ گئی۔

شہناز اور روبی ایک بڑے سے بنگلے میں داخل ہوئیں۔

نیلم کے لیے شہناز سے ملاقات واقعی بہت غیر متوقع تھی۔ دونوں ایک دوسرے سے معافی کی خواستگار تھیں مگر شاید پہل کرنے کی ہمت کسی میں نہیں تھی۔ گلے شکوے دور ہونے کے بعد دونوں پرانی یادوں کو تازہ کرنے لگیں۔

نیلم کی بیٹی شائستہ نے چائے کا اہتمام کرلیا۔ شائستہ کے تعارف پر شہناز ذرا حیران ہی رہ گئی۔ کیونکہ وہ ابھی تک اسے نیلم کی نوکرانی سمجھ رہی تھی۔ شائستہ نے اپنے سر پر منڈھے ہوئے دوپٹے کے کناروں کو کانوں کے پیچھے اُڑسا ہوا تھا۔ لباس بھی بالکل عام سا تھا۔

نیلم کے بازو پر بندھی ہوئی پٹیوں اور چہرے پر چوٹوں کے نشانات کو بغور دیکھتے ہوئے شہناز نے استفسار کیا تو اسے یہی معلوم ہوسکا کہ کسی پڑوس کی عورت کی حمایت میں اس کے مقدمے میں گواہی دی تھی، اس کے دشمنوں نے انتقام لینے کے لیے اس پر فائرنگ کردی۔

''تم واقعی بہت مضبوط عورت ہو نیلم......'' شہناز نے ستائشی انداز میں اس کی ہمت کو سراہتے ہوئے کہنا چاہا مگر نیلم نے پھر رخ پھیر کر آنکھیں سختی سے بند کرلیں۔

''ارے واقعی سچ کہہ رہی ہوں...... پوچھ لو تم اس سے...... میں تو سارے رستے ہی باتیں کرتی آئی ہوں روبی سے......'' شہناز نے یقین دلاتے ہوئے کہا مگر ایسا لگ رہا تھا جیسے نیلم کو یہ الفاظ مسلسل کسی تکلیف میں مبتلا کررہے تھے۔

اسی لمحے دروازے پر آہٹ سی ہوئی، ہنکارا بھر کر شائستہ کا شوہر کمرے میں داخل ہوا۔

شہناز خاموش ہوگئی۔ شائستہ نے آگے بڑھ کر اس کا خوش دلی سے استقبال کیا، پھر شہناز کا تعارف کروایا مگر شائستہ کے شوہر نصیر نے نہایت بے دلی اور روکھے لہجے میں بات کی۔

شہناز کو یہ سب بہت عجیب سا لگا مگر کچھ کہہ نہ سکی۔

نصیر نے اخبار اٹھایا اور صفحے پلٹنے لگا۔ شائستہ نے پھرتی سے دسترخوان سجایا اور جھٹ پٹ گرم گرم روٹیاں بنا کر اس کے سامنے رکھ دیں۔ وہ اخبار کی ورق گردانی

کرتے ہوئے بڑے بڑے نوالے توڑ کر چباتا رہا۔ شائستہ نے خوش دلی سے جو بھی بات پوچھی اس نے توجہ دیے بغیر ہاں ہوں میں جواب دے دیا۔ اس کی نظریں مستقل اخبار پر جمی رہیں۔

شہناز کو ان چند لمحوں میں ہی اندازہ ہو گیا کہ نیلم کا داماد کس قدر کڑوے مزاج کا انسان ہے لیکن اس کے باوجود شائستہ کے رویے پر حیران رہ گئی جو شوہر کی ایسے آؤ بھگت کرنے لگی جیسے وہ کسی ملک کا سربراہ ہو۔

شائستہ نے ٹھنڈا پانی اسے لا کر دیا۔ کھانا کھانے کے بعد صالحہ اٹھی اور نصیر کے بنا مانگے ہی جھٹ پٹ ماچس اور ایش ٹرے لے آئی۔ نصیر نے سگریٹ سلگایا اور پھر اخبار کی سرخیوں پر نظریں دوڑانے لگا۔ شائستہ نے برتن اٹھائے اور پھر نصیر کے پاس آ کر بیٹھ گئی۔ شہناز کو لگ رہا تھا کہ جیسے وہ بہت شوق سے یہ سارے کام کر رہی ہو۔

شائستہ باورچی خانے میں ہی تھی کہ اس کی چار سالہ بچی سوتے سوتے جاگ گئی۔ شائستہ دوڑی دوڑی اس کے پاس آئی۔ بچی کو بہلانے کی کوشش کرنے لگی۔ کچھ دیر بعد شائستہ نے اپنی بچی کو کھانا کھلانا شروع کیا تو بچی نخرے کرنے لگی۔

شہناز کو وہاں بیٹھے یہ سب کچھ دیکھتے ہوئے کوفت سی ہونے لگی لیکن حیران اس بات پر تھی کہ شائستہ بچی کو بہلانے کے لیے لاکھ جتن کرتی رہی، ہر ہر نوالے پر کہانیاں سناتی رہی اور نہ اس پر غصہ کیا نہ اس کی پیشانی پر کوئی بل آیا۔ بچی کے رونے دھونے سے شہناز ذرا چڑ سی گئی۔

ماحول کی کشیدگی کم کرنے کے لیے شہناز نے شائستہ کی بچی کے کپڑوں کی تعریف کر دی تو نیلم نے اسے بتایا کہ صالحہ کو گھر داری کا جنون کی حد تک شوق ہے۔ نہ ٹی وی دیکھنے کا شوق ہے نہ ہی سنگھار پٹار کا لیکن سلائی کڑھائی میں ماہر ہے۔ نہ صرف بچی کے بلکہ اپنے کپڑوں اور چادروں کی سلائی کڑھائی خود ہی کرتی ہے۔

یہ سب سن کر شہناز کا دل اور بجھ سا گیا۔ جو کچھ اسے اس گھر میں نظر آ رہا تھا وہ ہی اس کا دل جلا دینے کے لیے کافی تھا۔ کچھ کہہ تو نہ سکی ہاں ہوں کر کے رہ گئی۔ لیکن اسے مسلسل اس بات کا دکھ ہو رہا تھا کہ نیلم نے جس انداز سے اپنی زندگی گزاری اور لوگوں کے لیے ایک مثال بنی، اس نے اپنی بیٹی کی تربیت نہ جانے کس ڈھنگ سے کی ہے۔ اگر کسی اچھے کالج، یونیورسٹی سے پڑھایا ہوتا تو شاید وہ آج دوسری پڑھی لکھی عورتوں کے طور طریقے سے زندگی گزارتی۔

"لگتا ہے تم نے شائستہ کی شادی چھوٹی عمر میں ہی کر دی تھی...... میرا مطلب ہے کہ وقت سے پہلے ذمہ داریاں کاندھوں پر پڑ جاتی ہیں تو بچی کی اپنی شخصیت نکھر نہیں پاتی......" شہناز بہت محتاط انداز میں اپنا شکوہ زبان پر لے آئی "مجھے تو شائستہ تمہاری بیٹی نہیں لگتی......"

نیلم کے کوئی جواب دینے سے پہلے ہی شائستہ نے آ کر بتایا کہ پڑوس میں کسی کی طبیعت خراب ہے۔ کچھ میڈیکل اسٹور سے دوائیں خریدنے جانا ہے۔

نصیر نے انگڑائی لے کر ناک منہ چڑھا کے اس کی طرف دیکھا، معاملے کو سنبھالنے کے لیے شائستہ نے اس کے کچھ کہنے سے پہلے ہی کہا "کوئی بات نہیں آپ تھکے ہوئے آئے ہیں...... آرام کریں میں لے آتی ہوں...... مجھے کار کی چابی دے دیں۔"

شہناز یہ دیکھ کر حیران سی رہ گئی پھر ادھر ادھر کی باتوں میں مصروف ہو گئی۔

کچھ دیر بعد شائستہ واپس آئی۔ اس نے اطمینان دلاتے ہوئے بتایا کہ میڈیسن مل گئی تھیں تو اس نے وہیں انجیکشن بنا کر لگا بھی دیا ہے۔

شہناز کی حیرانی اور بڑھ گئی۔ باتوں باتوں میں شائستہ نے بتایا کہ اس نے بی فارمیسی کیا ہوا ہے۔ جاب اس لیے چھوڑ دی کہ گھر کو اس کی زیادہ ضرورت تھی لیکن کوچنگ سینٹر میں پڑھاتی ہے۔

شہناز دل ہی دل میں خود سے شرمندہ سی تھی۔ اس کے اندازے اس قدر غلط نکلے۔ لیکن اسے ایک تجسس بھی تھا۔ شوہر اور گھر کے معاملے میں شائستہ کا بے پڑھی لکھی عورتوں کا سا رویہ اسے بے چین کیے ہوئے تھا۔ شہناز سے رہا نہ گیا اور اٹھتے اٹھتے اس نے نیلم سے پوچھ ہی لیا "تمہاری ماں نے تمہیں ایک مضبوط عورت بنایا تھا...... شائستہ پر تو تمہاری پرچھائی بھی نہیں پڑی......"

نیلم کے چہرے پر کئی رنگ ایک ساتھ آئے جیسے کسی شکست خوردہ زمین پر کسی نے فتح کا علم لہرایا ہو...... نیلم نے نیم وا آنکھوں کے ساتھ کہا "میری ماں نے مجھے...... مضبوط عورت...... بنایا تھا...... میں نے اسے...... صرف عورت بنایا ہے......"

محترمہ عذرا رسول

السلام علیکم

لوگ دوسروں کی کہانیاں لکھتے ہیں لیکن میں نے اپنی کہانی لکھی ہے۔ ایک بوڑھے شخص نے خاموش رہ کر مجھے کس طرح سبق دیا یہی میں نے اپنی سرگزشت میں بیان کیا ہے۔

طارق جمال
(کراچی)

اب تو مجھے اس آدمی سے خوف محسوس ہونے لگا تھا۔ بظاہر وہ ایک بے ضرر انسان تھا۔ دبلا پتلا، پچاس سے زیادہ ہی کا ہوگا۔ سستے کپڑے اور خستہ حال جوتے۔ یہ اس کی شناخت تھی لیکن اس عام سے بے ضرر انسان نے مجھے خوفزدہ کردیا تھا۔

میرا خیال ہے کہ مجھے خوف زدہ ہونے کی اصطلاح نہیں استعمال کرنی چاہیے۔ یوں کہیں کہ الجھن میں ڈال دیا تھا۔ یہ بالکل مناسب ترجمانی ہے۔

اس نے مجھے الجھن میں ڈال دیا تھا لیکن یہ پہلے کی بات ہے۔ اب تو الجھن کے ساتھ ساتھ خوف بھی محسوس ہونے لگا تھا۔

میرا نام طارق جمال ہے۔ وکیل ہوں، ایک کامیاب وکیل۔ میں اپنے آپ کو کامیاب وکیل اس لیے کہہ رہا ہوں کہ ایسا شاید ہی ہوا ہو کہ میں نے کوئی کیس ہاتھ میں لیا ہو اور اس میں کامیابی نہ حاصل کی ہو۔

بہرحال میں اس وقت اپنی کامیابیوں کی کہانیاں نہیں سنا رہا۔ بلکہ اس بے ضرر عام سے بوڑھے کے بارے میں بتا رہا ہوں جس نے مجھے خوف زدہ کر دیا تھا۔

اس کے ہاتھ میں ہمیشہ ایک موٹا سا رجسٹر ہوا کرتا۔ یعنی میں نے اسے ہمیشہ رجسٹر کے ساتھ ہی دیکھا۔ ایک رجسٹر اور ایک قلم۔

وہ مجھے دیکھتے ہی رجسٹر پر جلدی جلدی کچھ لکھنے لگتا تھا۔ خدا جانے کیا لکھتا ہو گا لیکن ہوتا یہی تھا کہ وہ ایک نظر میری طرف ڈالتا اور رجسٹر پر لکھنا شروع کر دیتا۔ شاید دو چار جملوں کے بعد پھر دیکھتا پھر لکھتا۔

پہلی دفعہ اس کا احساس اس وقت ہوا جب گھر سے کچھ ہی فاصلے پر گاڑی خراب ہو گئی۔ میں اپنے ساتھ ڈرائیور نہیں رکھتا بلکہ اپنی گاڑی خود ہی چلاتا ہوں۔

میرا تعلق جس پیشے سے ہے اس پیشے کے لوگوں کو ہر قسم کی احتیاط کرنی چاہیے۔ بہرحال یہ ایک الگ ہی بات ہے۔

تو اس دن میں گھر سے چلا ہی تھا کہ گاڑی خراب ہو گئی۔ بلکہ اسے خراب ہونا ہی نہیں کہنا چاہیے کیونکہ اس کا ایک ٹائر پنکچر ہو گیا تھا۔

میں جھنجلا کر گاڑی سے باہر آ گیا۔ گاڑی میں فالتو ٹائر بھی موجود تھا اور جو ضروری اوزار ہوتے ہیں وہ بھی تھے لیکن پرابلم یہ تھی کہ مجھے ٹائر بدلنا نہیں آتا تھا۔

فوری طور پر میں نے ایک آدمی کی مدد سے گاڑی کو ایک طرف لگا دیا۔ میں نے دھکا لگانے والے سے پوچھا۔

''بھائی تمہیں ٹائر بدلنا آتا ہے؟''

''نہیں صاحب میں نہیں جانتا۔'' اس نے جواب دیا۔

''چلو کوئی بات نہیں۔ تمہارا شکریہ کہ تمہاری مدد سے گاڑی یہاں تک آ گئی۔''

اس آدمی کے جانے کے بعد میری نگاہ اس عام سے بے ضرر بوڑھے پر پڑی جو اپنے ہاتھ میں ایک رجسٹر لیے ہوئے کچھ فاصلے پر کھڑا تھا۔

اس کی اس حرکت نے مجھے چونکا دیا کہ وہ ایک نظر میری طرف دیکھتا پھر رجسٹر پر کچھ لکھنے لگتا۔ پھر دیکھتا پھر لکھنے لگتا۔

میں ابھی اس کی طرف دیکھ ہی رہا تھا کہ میری گاڑی سے آگے ایک گاڑی آ کر رک گئی اور ایک صاحب مجھے آواز دیتے ہوئے اپنی گاڑی سے اتر کر میری طرف آنے لگے۔

وہ میرے دوست تھے امجد درانی۔ میری طرح وہ بھی وکیل تھے لیکن وہ سول کیسز لیتے تھے۔ امجد درانی کو دیکھ کر جان میں جان آ گئی تھی۔

''اوہ بھائی! کیوں اکیلے یوسف بے کارواں بن کر کھڑے ہوئے ہو۔''

''امجد صاحب! ٹائر پنکچر ہو گیا ہے۔'' میں نے بتایا۔

''تو کیا ہوا۔ اب تک تو دوسرا ٹائر لگا لینا چاہیے تھا۔''

''لیکن مجھے ٹائر بدلنا نہیں آتا۔''

''یہ بتاؤ فالتو ٹائر ہے؟''

''ہاں ہے۔''

''تو پھر کیا پرابلم ہے۔ میں بدل دیتا ہوں۔''

امجد درانی نے ٹائر بدلنا شروع کر دیا۔ پھر مجھے بوڑھے کا خیال آیا تو وہ اب وہاں سے جا چکا تھا۔

اس وقت اس کے بارے میں ذرا سا خیال آیا تھا۔ پھر ذہن کو جھٹک کر امجد کو ٹائر بدلتے ہوئے دیکھنے لگا۔

اس بوڑھے سے آدمی سے یہ میری پہلی ملاقات تھی۔ ملاقات کیا پہلی مڈبھیڑ تھی جو گھر سے کچھ فاصلے پر ہوئی تھی۔ اس کے بعد میں نے اسے دوسری بار اپنے گھر کے باہر دیکھا۔

میں اپنے خوب صورت سے گھر میں اپنی بیوی اور دو بچوں کے ساتھ رہتا ہوں۔ پرسکون زندگی گزار رہا ہوں۔ کسی قسم کی کوئی خاص پریشانی نہیں ہے لیکن اس بوڑھے کی آمد نے ایک ہلچل سی مچا دی تھی۔

وہ کچھ بھی نہیں کہتا تھا بس مجھے دیکھتا اور اپنی ڈائری میں کچھ لکھنا شروع کر دیتا تھا۔ کیا لکھتا تھا یہ تو مجھے نہیں معلوم لیکن اتنا ضرور احساس ہوتا تھا کہ وہ میرے ہی بارے میں کچھ لکھ رہا ہے۔

ٹائر والے واقعے کے بعد وہ مجھے ایک شاپنگ سینٹر کے باہر مل گیا۔ میں اپنی بیوی اور بچوں کے ساتھ آیا ہوا تھا۔

مجھے اپنے لیے شرٹس اور بچوں کے لیے جوتے خریدنے تھے۔ وہ سب لے کر باہر نکلا تھا کہ اسے سینٹر کے باہر کھڑا ہوا دیکھ لیا۔

بالکل ایسا ہی محسوس ہوا جیسے وہ میرے ہی انتظار میں کھڑا ہو یا اور میرا پیچھا کرتا ہوا یہاں تک آیا ہو۔ پہلی بار مجھے دیکھ کر اس کے ہونٹوں پر ایک مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ بہت طنزیہ سی مسکراہٹ تھی، مذاق اڑاتی ہوئی۔

اس کے ہاتھ میں وہی ڈائری تھی جس میں وہ کچھ لکھا کرتا تھا۔ اس نے پھر لکھنا شروع کر دیا۔

''غزالہ۔'' میں نے اپنی بیوی کو مخاطب کیا۔

''ہوں۔''

''اس آدمی کو دیکھ رہی ہو۔'' میں نے اس بوڑھے کی طرف اشارہ کیا۔

''ہاں۔'' غزالہ نے اس پر ایک اچٹتی ہوئی نگاہ ڈالی۔ ''ہاں دیکھ رہی ہوں، تو پھر۔''

''یہ آدمی مجھے پاگل کیے دے رہا ہے۔'' میں نے کہا۔ ''یہ کم بخت میرے اعصاب پر سوار ہو گیا ہے۔''

''ارے، ایسی کیا بات ہو گئی؟''

''گھر چلو تفصیل سے بتاؤں گا۔ اس وقت مجھے اس کو دیکھ کر وحشت ہو رہی ہے۔''

گھر پہنچ کر میں نے غزالہ کو اس کے بارے میں بتا دیا۔ میری بات سن کر وہ بھی سوچ میں پڑ گئی تھی۔

''یہ تو بہت حیرت کی بات ہے۔ وہ کہتا بھی کچھ نہیں ہے۔''

''نہیں، اسی لیے تو میں زیادہ پریشان ہوں۔ مجھے اس کی خاموشی نے خوفزدہ کر دیا ہے۔ اگر وہ کچھ کہے یا کسی ردعمل کا اظہار کرے تو معاملہ صاف ہو سکتا ہے۔ یہاں تو وہ بالکل خاموش رہتا ہے۔''

''اور آپ کو دیکھ کر لکھتا کیا ہے؟''

''یہی تو نہیں معلوم کہ وہ کیا لکھتا ہے؟''

''آپ تو اتنے بڑے وکیل ہیں۔'' غزالہ نے کہا۔ ''پولیس والوں سے تو آپ کی جان پہچان ہو گی۔ ان سے شکایت کر دیں۔''

''لیکن کس بات کی شکایت، وہ تو یہی کہیں گے کہ جب آپ کو اس سے کوئی نقصان نہیں پہنچ رہا ہے تو پھر آپ کو کیا پریشانی ہے۔''

''ایسا کریں ایک دن خود اس سے پوچھ لیں۔ آپ

کی الجھن دور ہو جائے گی۔"
"ہاں یہ ہو سکتا ہے۔" میں نے اس کی تائید کی۔
"میں یہ کر کے دیکھتا ہوں۔"
میری برسوں کی عادت ہے کہ میں واک کرنے کے لیے قریبی پارک کی طرف جایا کرتا ہوں۔ چونکہ صبح کو وقت نہیں ملتا اس لیے میری یہ واک شام کو ہوا کرتی ہے۔
اس شام وہ کم بخت پارک میں بھی تھا۔ مجھے دیکھ کر اس نے پھر اپنی ڈائری سنبھال لی اور کچھ لکھنا شروع کر دیا۔
اور اس وقت میں نے یہ فیصلہ کر لیا کہ میں اس کم بخت سے معلوم کر کے رہوں گا کہ اس نے یہ کیا تماشا لگا رکھا ہے۔
میں اپنی واک کے ٹریک سے ہٹ کر اس کی طرف چل پڑا۔ اس نے شاید یہ اندازہ کر لیا تھا کہ میں کیا چاہتا ہوں۔ اس لیے اس نے ایک طرف دوڑ لگا دی۔
میں نے اسے آواز دی۔ "اے...... بات سنو...... بات سنو۔"
اس نے بس ایک بار مڑ کر میری طرف دیکھا۔ پھر تقریباً دوڑتا ہوا پارک کے گیٹ سے باہر نکل گیا۔
اس کی یہ حرکت مجھے خوف زدہ کر گئی تھی۔
اس کے دل میں یقیناً کوئی بات تھی، کوئی چور تھا، ورنہ اسے بھاگنے کی کیا ضرورت تھی۔ میں تو اس سے صرف بات کرنا چاہتا تھا۔ پوچھنا چاہتا تھا کہ وہ کون ہے اور مجھ کو دیکھ کر ڈائری میں کیا لکھنے لگتا ہے۔
بہر حال اب میں اتنا بے زار، چڑچڑا ہو گیا تھا کہ میں نے ہر قیمت پر اسے پکڑنے اور یہ راز جاننے کا ارادہ کر لیا تھا۔
میں نے اپنے ایک جاننے والے پولیس آفیسر سے بات کی۔ میں یہ بتا چکا ہوں کہ میں ایک مشہور وکیل ہوں۔ اس لیے بہت سے پولیس والوں سے میری دوستی ہے۔
شعیب نام تھا اس کا۔ اس نے میری پرابلم بہت حیرت سے سنی تھی۔ "یار یہ تو واقعی بہت الجھا ہوا معاملہ ہے۔ ویسے اب خود مجھے بھی اس کہانی میں دلچسپی محسوس ہونے لگی ہے کہ یہ کیا چکر ہے؟"
"یار! اس لیے تو میں بھی الجھ گیا ہوں۔" میں نے کہا۔
"اچھا یہ بتاؤ وہ کہاں ملتا ہے۔"
"ہر اس جگہ جہاں میں جاتا ہوں۔" میں نے بتایا۔ "خاص طور پر اس پارک میں جہاں میں شام کے وقت واک کے لیے جاتا ہوں۔"
"تم نے تو بتایا ہے کہ وہ تم کو پاس آتے دیکھ کر بھاگ گیا تھا۔"
"ہاں! لیکن اب وہ گیٹ کے پاس کھڑا رہتا ہے اور جیسے ہی میں گاڑی روکتا ہوں وہ ایک طرف ہٹ کر کچھ لکھنے لگتا ہے۔"
"بس تو پھر فکر مت کرو۔ آج ہی شام میں کچھ سادہ لباس والوں کی ڈیوٹی لگا دیتا ہوں۔"
"اور تم خود کہاں رہو گے؟" میں نے پوچھا۔
"میں بھی آس پاس ہی رہوں گا۔" اس نے بتایا۔ "بس جیسے وہ نظر آئے اس کی طرف اشارہ کر دینا۔ میرے بندے اسے پکڑ لیں گے۔ دیکھوں تو میں اس نے کیا ڈراما لگا رکھا ہے۔"
ہم نے یہ پروگرام طے کر لیا۔ مجھے یقین تھا کہ وہ بوڑھا ضرور آئے گا۔ کیوں کہ وہ میرے لیے سائے کی طرح ہو گیا تھا۔
معمول کے مطابق میں شام کے وقت واک کرنے پارک کی طرف چلا گیا اور معمول کے مطابق وہ بوڑھا ڈائری لیے ایک طرف کھڑا ہوا تھا۔
میں نے ادھر ادھر نگاہ دوڑائی۔ کچھ فاصلے پر وہ پولیس آفیسر میرا دوست بھی دکھائی دے گیا۔ اس کی نگاہیں میری ہی طرف تھیں۔
میں نے اس بوڑھے کی طرف اشارہ کر دیا۔ ذرا سی دیر میں اس پولیس آفیسر کے آدمیوں نے اسے پکڑ لیا تھا۔
پولیس آفیسر نے اس کے ہاتھ سے رجسٹر چھین لیا اور اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے میرے پاس لے آیا۔
میں نے یہ دیکھا کہ اس دوران وہ بوڑھا بالکل مطمئن انداز میں کھڑا رہا تھا۔ کسی قسم کی پریشانی کوئی گھبراہٹ نہیں تھی۔
"ہاں بڑے میاں، کیا لگا رکھا ہے تم نے؟" میرے دوست نے اپنے مخصوص انداز میں پوچھا۔
"کچھ بھی نہیں۔ میں نے تو کچھ بھی نہیں کیا۔" اس نے کہا۔
"پھر یہ کیا چکر ہے۔ تم ان صاحب کا پیچھا کیوں کرتے ہو اور ان کو دیکھ کر رجسٹر میں کیا لکھتے ہو۔"

''رجسٹر آپ کے پاس ہے جناب۔ آپ خود دیکھ لیں۔'' میرے دوست نے رجسٹر کھول کر دیکھنا شروع کر دیا۔ وہ جیسے جیسے ورق پلٹتا جا رہا تھا اس کے چہرے پر حیرت کے تاثرات گہرے ہوتے جا رہے تھے۔

''اس میں تو کچھ نہیں لکھا ہے۔'' اس نے کہا۔ ''ہر ورق پر ایک ہی جملہ لکھا ہوا ہے۔ ''کچھ نہیں، کچھ نہیں، کیا ہے یہ؟''

میں نے بھی اس کے ہاتھ سے رجسٹر لے کر دیکھنا شروع کر دیا۔ وہ ٹھیک ہی کہہ رہا تھا ہر ورق پر ایک جملہ لکھا ہوا تھا۔ ''کچھ نہیں، کچھ نہیں۔''

''بڑے میاں یہ کیا سلسلہ ہے؟'' میں نے پوچھا۔ ''مجھے دیکھ کر تم یہ جملہ کیوں لکھتے ہو؟''

''میں ایک تجربہ کرنا چاہ رہا تھا جناب۔ لیکن اس میں ناکام ہو گیا ہوں۔'' اس نے کہا۔ ''ابھی تک کچھ بھی نہیں ہوا۔''

''بڑے میاں صاف صاف بتاؤ کیا تجربہ کر رہے تھے؟''

''کیا آپ لوگ تسلی کے ساتھ میری بات سن لیں گے؟'' اس نے پوچھا۔

''ہاں ہاں کیوں نہیں سنیں گے۔ بتاؤ۔'' پولیس آفیسر نے کہا۔

''صاحب آپ کو یاد ہے۔ اب سے تین سال پہلے مطلوب نام کے ایک نوجوان کا قتل ہوا تھا۔'' اس نے میری طرف دیکھ کر کہا۔

''اب اتنا کہاں یاد رہتا ہے۔ تم ذرا تفصیل سے بتاؤ۔''

''صاحب، مطلوب کی ایک چھوٹی سی دکان تھی کریانے کی۔ اور اسے وہ دکان میں نے ہی کر کے دی تھی۔''

''ہاں یاد آ گیا۔ پھر اس کا مرڈر ہو گیا تھا۔'' میں نے کہا۔

''اور اس کا خون بیچنے کے چکر میں ہوا تھا جناب۔'' اس نے بتایا۔ ''اس کا قاتل ایک بڑا غنڈہ اور پیسے والا آدمی تھا۔''

''ہاں یاد آ گیا۔'' میں نے کہا۔ ''شاید ہاشم نام تھا اس کا۔''

''جی جناب اور آپ اس کے وکیل بنے تھے۔'' اس نے یاد دلایا۔

میں نے اب کچھ بے چینی سی محسوس کی۔ ''ہاں تو پھر۔ میرا تو کام ہی یہی ہے۔ میں وکیل ہوں اور اس قسم کے کیس لیتا ہی رہتا ہوں۔''

''پھر یہ ہوا وکیل صاحب آپ یہ جانتے تھے کہ وہ آدمی میرے بیٹے کا قاتل ہے۔ اس کے باوجود آپ نے اس کا کیس لڑا اور اسے باعزت بری کروا دیا۔''

''ہاں تو پھر۔'' پولیس آفیسر نے پوچھا۔ ''لیکن تم یہ سب کیا کرتے پھر رہے ہو۔''

''میں صرف ایک تجربہ کر رہا تھا صاحب۔'' اس نے کہا۔

''کیسا تجربہ؟''

''میں یہ دیکھنا چاہ رہا تھا کہ ایسے معاملات میں کسی کے ضمیر پر کوئی بوجھ ہوتا ہے یا نہیں اور اگر بوجھ ہوتا ہے تو اس کی کسی نہ کسی حرکت سے اندازہ تو ہو جاتا ہو گا کہ وہ دل ہی دل میں شرمندہ ہو رہا ہے لیکن ہوا یہ کہ اتنے دنوں تک وکیل صاحب کی نگرانی کے باوجود بھی یہ احساس نہیں ہوا کہ ان کے دل اور ضمیر پر کوئی بوجھ ہے۔ یہ بالکل نارمل ہیں۔ اس لیے تو میں نے ہر تاریخ کے آگے لکھا ہوا ہے کہ کچھ بھی نہیں۔ کچھ بھی نہیں ہوا۔ میں اپنے تجربے میں ناکام ہو گیا ہوں۔ بس اتنی سی بات ہے۔''

ہم سب خاموش رہے۔ اس بوڑھے نے بہت اطمینان کے ساتھ اپنا رجسٹر واپس لیا اور جاتے جاتے میری طرف دیکھا۔ ''معاف کرنا وکیل صاحب میں نے آپ کو پریشان کیا ہے۔ آئندہ آپ مجھے نہیں دیکھیں گے۔ کیوں کہ مجھے یقین ہو گیا ہے کہ آپ کے دل اور ضمیر پر کوئی بوجھ نہیں ہے۔ کچھ بھی نہیں ہے۔''

بوڑھا چلا گیا۔ ہم سب اس کی طرف دیکھتے رہے۔ کسی میں اسے روکنے کی ہمت نہیں تھی لیکن اس نے ڈائری میں غلط لکھا تھا کہ کچھ نہیں ہوا ہے۔

''کاش وہ مل جائے تو میں اسے بتا سکوں کہ بہت کچھ ہو گیا ہے۔ میں نے اگلے ہفتے ہی سے وکالت چھوڑ دی تھی۔ اور میں ایک فرم میں کام کرنے لگا تھا اور اب میں راتوں کو اٹھ اٹھ کر خدا سے اپنے اس گناہ کی معافی مانگا کرتا ہوں۔ بہت کچھ ہو گیا ہے میرے ساتھ، بہت کچھ!!''

محترم مدیر اعلیٰ
السلام علیکم
میں ایک ڈاکٹر ہوں، میرے پاس مریضوں کی قطار لگی رہتی ہے۔ یہ مریض صرف جسمانی مرض کا شکار نہیں ہوتے، کچھ مریض ایسے بھی ہوتے ہیں جن کی روح میں بیماری سرائیت کر چکی ہوتی ہے۔ یہ آپ بیتی بھی ایک ایسے ہی مریض کی ہے جو خود میں سبق آموز ہے۔

ڈاکٹر فراز آفریدی
(کراچی)

خدایا! انسان کے ساتھ یہ سب کیا ہوتا رہتا ہے۔ وہ کتنا بااختیار اور کتنا مجبور ہوتا ہے۔

میں ایک ڈاکٹر ہوں۔ نہ جانے کتنے روتے، کراہتے مریضوں کو دیکھا کرتا ہوں لیکن میں جس مریض کا ذکر کررہا ہوں اس نے مجھے حیران کر کے رکھ دیا تھا۔

میں جس اسپتال میں ہوں وہاں کینسر کے مریضوں کا علاج ہوتا ہے اور میں اس مرض کے علاج میں ملک بھر میں شہرت رکھتا ہوں۔

دور دور سے مریض میرے پاس آتے ہیں۔ روتے، بسورتے اور موت کے خوف سے لرزتے ہوئے مریض۔ دکھ ان کی آنکھوں میں ہوتا ہے اور ان کے چہروں پر نمایاں ہوتا ہے۔

یہ ایک انتہائی تکلیف دہ مرض ہے۔ اگر کسی کو کینسر تشخیص ہوگیا تو یہ سمجھ لیں کہ اس کی موت کے پروانے پر دستخط ہوگئے۔ جس طرح کسی کو پھانسی کی سزا ملنے کے بعد ہوا کرتا ہے۔ یہ حکم سنتے ہی وہ پھانسی سے پہلے ہی موت کی گود میں چلا جاتا ہے۔ لیکن اس دن میں نے ایک عجیب مریض کو دیکھا۔

میں اپنے کمرے میں تھا کہ مجھے بتایا گیا کہ ایک مریض لایا گیا ہے اور اس مریض کو لانے والے پولیس کے افسران ہیں۔

چند لمحوں بعد پولیس کا ایک اعلیٰ افسر میرے کمرے میں داخل ہوا۔

”ڈاکٹر صاحب! میں آپ کے پاس ایک مریض کو لے کر آیا ہوں۔“ اس نے بتایا۔

”آفیسر یہ تو اسپتال ہے۔ یہاں تو مریض آیا کرتے ہیں۔“ میں نے کہا۔

”لیکن یہ خاص قسم کا مریض ہے۔“

”میں نہیں سمجھا۔ کیا خاص بات ہے اس میں۔“

”وہ ایک قاتل ہے ڈاکٹر صاحب۔“ آفیسر نے بتایا۔ ”دو آدمیوں کا خون کرچکا ہے۔“

”اوہ۔“ میں نے ایک گہری سانس لی۔ ”پھر تو یہ معاملہ ذرا سیریس ہے۔ لیکن اس کے مرض کا کیسے پتا چلا۔“

”جب ہم نے اس کو گرفتار کیا اور حوالات میں لائے تو اس کی طبیعت اچانک خراب ہوگئی۔“ آفیسر نے کہا۔ ”آپ تو جانتے ہیں کہ ان حالات میں اگر کسی مریض کی موت ہو جائے تو سارا الزام پولیس والوں پر آجاتا ہے۔ یہ کہا جاتا ہے کہ پولیس نے اس کو تشدد سے مار دیا۔ چاہے اس کی موت کی وجہ کچھ بھی ہو۔“

”جی ہاں جانتا ہوں میں۔“ میں مسکرا دیا۔ ”آگے بتائیں۔“

”پھر یہ ہوا کہ تھانہ انچارج نے محکمے کے ڈاکٹر سے رجوع کیا۔ اس نے معائنہ کر کے بتا دیا کہ یہ کینسر کا مریض ہے اور ہم اس کے علاج کے لیے آپ کے پاس آگئے ہیں۔“

کیوں کہ اس مرض کے علاج کے لیے آپ کے اسپتال کی بہت شہرت ہے۔"

"جب وہ کینسر سے مرنے جارہا ہے تو پھر اس کے کیس کا کیا ہوگا یا دوسرے الفاظ میں جب اس کے جرم پر اسے پھانسی کی سزا ہونے والی ہے تو پھر اس کے علاج کا کیا فائدہ۔"

"یہ تو ہے ڈاکٹر۔ لیکن کچھ قانونی تقاضے بھی ہوتے ہیں۔" آفیسر نے بتایا۔ "ان کو پورا کرنا ضروری ہوتا ہے۔"

"چلیں ٹھیک ہے۔ مریض کو میرے پاس لائیں۔"

وہ مریض دو سپاہیوں کے ساتھ کمرے میں داخل ہوا۔ ایک لاغر سا انسان۔ جس کی آنکھیں بجھی بجھی ہوئی تھیں اور موت کے سائے اس کے اردگرد منڈلا رہے تھے۔

اس کی شیو بڑھی ہوئی تھی۔ آنکھیں بڑی بڑی تھیں۔ ہوسکتا ہے کبھی وہ روشن بھی رہی ہوں لیکن اب مرجھائی ہوئی آنکھیں تھیں۔

اس کے ہاتھ میں ہتھکڑیاں پڑی ہوئی تھیں اور وہ کسی طرح بھی قاتل دکھائی نہیں دے رہا تھا۔

"آفیسر یہ تو ایک سیدھا سادہ آدمی معلوم ہوتا ہے۔" میں نے کہا۔

"ایسے لوگ اسی قسم کے ہوتے ہیں ڈاکٹر صاحب۔" آفیسر نے بتایا۔ "ان کو دیکھ کر آپ اندازہ بھی نہیں کرسکتے کہ یہ اندر سے اتنے بے رحم اور خطرناک بھی ہوں گے۔ اس نے اپنے دونوں قتل کا اعتراف کرلیا ہے۔"

"اوہ۔" میں ایک گہری سانس لے کر رہ گیا۔

میں نے متعلقہ ماتحت عملے سے کہا کہ مریض کو بیڈ دے دیا جائے۔ اس کا نام امجد بتایا گیا تھا۔ میرے کمرے سے جاتے ہوئے امجد نے ایک نظر میری طرف دیکھا اس وقت اس کی نگاہیں بہت کچھ کہہ رہی تھیں۔

پتا نہیں وہ آنکھیں اتنی دیر میں کیا کیا کہہ گئی تھیں۔ ان میں حقارت تھی، بے نیازی تھی، غصہ تھا، بے چارگی تھی، بہت کچھ تھا ان نگاہوں میں۔

بہرحال ضروری خانہ پری کے بعد امجد کو اسپتال میں داخل کرلیا گیا۔ اب مجھے اس کا علاج کرنا تھا۔ چاہے وہ کوئی بھی ہو، کیسا بھی ہو۔

شام کے وقت جب میں وارڈ میں راؤنڈ لینے گیا تو امجد اپنے بستر پر تھا اور ایک پولیس والا اس کے پاس ہی کھڑا

تھا۔ اسے دیکھ کر مجھے غصہ آگیا تھا۔

''تم کس لیے کھڑے ہو؟'' میں نے پولیس والے سے پوچھا۔

''سر جی یہ خطرناک قیدی ہے۔ اس کی نگرانی کے لیے میری ڈیوٹی لگائی گئی ہے۔'' اس نے بتایا۔

''وہ تو ٹھیک ہے لیکن تم اس کے سر پر مت سوار رہو۔'' میں نے کہا۔ ''تمہیں کرسی مل جائے گی تم دروازے کے باہر برآمدے میں بیٹھو۔''

''وہ تو ٹھیک ہے سر جی لیکن اگر یہ بھاگ گیا تو۔''

''یہ کہیں نہیں بھاگے گا۔''

''ٹھیک ہے سر جی۔'' پولیس والے نے کہا اور کمرے سے باہر چلا گیا۔

''ہاں بھائی کیسے ہو تم۔'' پولیس والے کے جانے کے بعد میں نے امجد سے پوچھا۔

''آپ کا بہت بہت شکریہ ڈاکٹر کہ آپ نے اس سے نجات دلوادی۔'' امجد نے کہا۔ ''ورنہ تو یہ میرے اعصاب پر سوار ہو گیا تھا۔''

بہت مہذب لہجہ تھا اس کا۔ پڑھا لکھا معلوم ہوتا تھا۔ ظاہر ہے کہ جرم کرنے والے اس دنیا سے تعلق رکھنے والے انسان ہی ہوتے ہیں۔

پڑھے لکھے، غیر تعلیم یافتہ، خوب صورت، بدصورت، سب کا تعلق اس دنیا اس معاشرے سے ہوتا ہے اگرچہ امجد بھی پڑھا لکھا اور مہذب تھا تو اس میں حیرت کی ایسی کوئی بات نہیں تھی۔

''مسٹر امجد! آج تمہارے دو چار ٹیسٹ ہوں گے۔'' میں نے بتایا۔ ''اس کے بعد یہ دیکھا جائے گا کہ تمہارا مرض کس اسٹیج پر ہے۔''

''ارے ڈاکٹر صاحب اب تو میں آپ کے رحم و کرم پر ہوں۔'' اس نے کہا۔ ''جو چاہے آپ کا حسن کرشمہ ساز کرے۔''

اس نے ایک بار پھر مجھے چونکنے پر مجبور کر دیا تھا۔ وہ تو خاصا پڑھا لکھا تھا اور باذوق بھی معلوم ہوتا تھا۔ ورنہ اس قسم کے حوالے کون دیا کرتا ہے۔

بہرحال اس کے دو ٹیسٹ ہوئے۔ دو دنوں کے بعد رپورٹ بھی آگئی۔ وہ واقعی کینسر کا مریض تھا اور اس کے مرض کی نوعیت شدید ہوتی جا رہی تھی۔

اس قسم کے مریض کا علاج صرف ان کی تسلی کے لیے کیا جاتا ہے۔ ورنہ موت تو ان کے قریب ہی کھڑی ہوئی ہوتی ہے۔

دو دنوں کے بعد جب میں اس کے پاس گیا تو اس نے مجھ سے کہا۔ ''ڈاکٹر صاحب کیا آپ جانتے ہیں کہ میں ایک وی آئی پی قسم کا مریض ہوں۔''

''وہ کیسے!''

''خود دیکھ لیں۔ پولیس والے میری حفاظت کے لیے پہرہ دیتے ہیں اور وہ بھی چوبیس گھنٹے۔ ایسا سلوک تو عام مریضوں کے ساتھ نہیں ہوتا۔''

''ہاں اس میں تو کوئی شک نہیں ہے۔'' میں نے کہا۔ ''تم عام مریض نہیں ہو لیکن میری سمجھ میں نہیں آیا کہ تم جیسا خاص مریض قاتل کیوں بن گیا۔''

وہ خاموش ہو گیا۔ میں نے جب اسے کریدنے کے لیے اپنا سوال دہرایا تو اس نے دھیرے سے کہا۔ ''اب میں آپ کو ایک بات بتا دوں ڈاکٹر صاحب۔''

''ضرور بتاؤ۔''

''میں نے کوئی قتل نہیں کیا۔'' اس نے بتایا۔

''کیا!'' میں نے بے یقینی سے اس کی طرف دیکھا۔

''جی ڈاکٹر صاحب آپ میری بات کا یقین کریں۔'' اس نے کہا۔ ''میں نے کسی کا خون نہیں کیا۔ میں ایسا آدمی ہوں ہی نہیں کہ کسی کا خون کر سکوں۔ کیوں کہ میں ایک بزدل انسان ہوں اور بزدل انسان اپنے آپ کو تو مار سکتا ہے لیکن کسی اور کو نہیں مار سکتا۔''

''تو پھر یہ سب کیا ہے۔ یہ الزام کیسا ہے تم پر۔''

''اس لیے کہ میں ایک بے گھر، بے سہارا اور کمزور انسان ہوں۔'' اس نے کہا۔ ''پولیس والوں کو تو خانہ پری کرنی پڑتی ہے نا۔ اپنی کارکردگی دکھانے کے لیے انہیں بتانا پڑتا ہے کہ آج انہوں نے اتنے مجرموں کو پکڑا ہے۔ تو میں بھی اس لپیٹ میں آگیا ہوں۔ بس اتنی سی بات ہے۔''

''لیکن وہ تو بتا رہا تھا کہ تم نے اپنے قاتل ہونے کا اعتراف بھی کر لیا ہے۔''

''ہاں میں نے اعتراف تو کر لیا ہے۔''

''لیکن کیوں؟''

''اس لیے کہ میں بھوک، بیماری، بے گھری اور مفلسی کے ہاتھوں پریشان ہو چکا تھا۔'' اس نے بتایا۔

میں اس کی طرف دیکھتا رہا۔ پھر میں نے کہا۔ ''مسٹر امجد! کیا تم مجھے اپنے بارے میں کچھ بتاؤ گے۔''

''کیوں نہیں ڈاکٹر میں تو خود بتانا چاہتا تھا۔'' وہ مسکرا دیا۔

☆......☆

میں نے ایک ادبی اور علمی گھرانے میں آنکھ کھولی۔ والد صاحب ایک باذوق آدمی تھے۔ وہ ایک سیکنڈری اسکول میں استاد تھے۔ پوری دنیا میں، کہانیوں اور اخلاقی کتابوں میں استاد کا چاہے جو بھی مرتبہ ہو لیکن ہمارے ملک اور معاشرے میں اس بے چارے کی کوئی اہمیت نہیں ہوتی۔

وہ معاشرے کا معزز فرد نہیں ہوتا کیوں کہ معاشرے کے معزز افراد دولت والے اور اقتدار والے سمجھے جاتے ہیں۔

بہر حال اتنا ضرور تھا کہ ہمارے پاس سر چھپانے کے لیے ایک کوارٹر تھا۔ خدا جانے والد صاحب نے کتنی محنتوں سے وہ کوارٹر خریدا ہوگا۔

ہم چار بچے تھے۔ بیٹا صرف میں تھا اور میرے بعد تین بہنیں تھیں۔ خدا جانے غریبوں کے یہاں لڑکیاں کیوں پیدا ہونے لگتی ہیں۔

وہ بڑی ہوتی جا رہی تھیں اور ہمیں ان کی شادیوں کی فکر تھی۔

بہر حال کسی نہ کسی طرح ان کی شادیاں ہوگئیں لیکن ان شادیوں نے ہم سے وہ کوارٹر بھی چھین لیا۔ ہم کرائے کے کوارٹر میں آگئے۔

میں آپ کو اپنی کہانی بہت مختصر طور پر سنا رہا ہوں ڈاکٹر صاحب۔ ویسے تو دکھوں کی کہانیاں بہت طویل ہوتی ہیں کیوں کہ ان میں برسوں کی تلخیاں شامل ہوتی ہیں اور برسوں کی تلخیاں لمحوں میں تو بیان نہیں ہوسکتیں۔

بہر حال تینوں بہنیں اپنے گھروں کی ہوگئیں۔ ہمارے لیے یہی بہت تھا۔ ہم کسی نہ کسی طرح اپنی زندگی گزار رہے تھے۔ ہم نے سمجھا تھا کہ شاید اب کچھ دن سکون کے گزر جائیں گے لیکن بعض لوگوں کی قسمت میں حادثات اور بدنصیبیوں کی طویل قطار ہوتی ہے۔ ایک لحظہ بھی جو یاد غم ہستی سے فراغ۔

اس نے ایک اور برمحل شعر پڑھ کر میری دل چسپی مزید بڑھا دی تھی۔ اس لیے میں بہت دھیان سے اس کی کہانی سن رہا تھا۔ ''پھر یہ ہوا ڈاکٹر صاحب کہ ماں کا انتقال ہوگیا۔'' اس نے بتایا۔ ''وہ بیمار پڑی تھیں اور ان کی بیماری کی وجہ سے ہم مقروض ہوگئے تھے۔ ہم نے اپنے طور پر ان کا بہت علاج کروایا لیکن کوئی فائدہ نہیں ہوا اور ان کا انتقال ہوگیا۔''

والدہ کی موت کے بعد والد صاحب بالکل ہی ٹوٹ کر رہ گئے تھے۔ برسوں کا ساتھ تھا جواب ختم ہوگیا تھا۔

وہ اب گھر پر رہتے۔ اسکول کی نوکری بھی ختم ہو چکی تھی۔ میں نے گھر کا خرچ چلانے کے لیے ملازمت شروع کردی اور ملازمت بھی ایسی کہ نہ پوچھیں۔ دن کے وقت ایک پیٹرول پمپ پر اور رات کے وقت شیشے کے گلاس بنانے والی ایک فیکٹری میں۔

''اب سمجھا۔'' میں نے کہا۔ ''یہ مرض شاید تم نے ایسی ہی جگہوں سے حاصل کیا ہے۔''

''ہوسکتا ہے ڈاکٹر صاحب۔'' اس نے ایک گہری سانس لی۔ ''وہ ممکن ہے کہ دنیا بھر کی پریشانیوں نے کینسر کی شکل اختیار کرلی ہو۔''

''بہی ہوا ہے تمہارے ساتھ۔''

''آپ میری کہانی سے بور تو نہیں ہو رہے۔'' اس نے پوچھا۔

''نہیں ہرگز نہیں۔ بلکہ تمہاری کہانی کے راستے میں خود کو تمہیں تلاش کرنے کی کوشش کر رہا ہوں۔'' میں نے کہا۔

''میں کیا اور میری تلاش کیا۔'' اس نے ایک گہری سانس لی۔ ''بہر حال اتنا بتا دوں کہ دن رات کام کرنے اور آرام نہ ملنے کی وجہ سے میں کمزور سے کمزور تر ہوتا چلا گیا۔ بے چارے والد صاحب میری حالت دیکھ دیکھ کر رو دیا کرتے تھے۔''

''طرفہ ستم یہ ہوا کہ والد صاحب بھی بیمار پڑ گئے اور ان کے علاج کی ساری ذمے داری مجھ پر آگئی۔ مختصر یہ کہ جب والد صاحب کا انتقال ہوا تو میں بالکل مفلس ہو چکا تھا۔ میری دونوں ملازمتیں ختم ہوگئی تھیں۔ کرائے دینے کے پیسے بھی نہیں رہے تھے۔ میں ہر لحاظ سے بے گھر اور نادار ہو چکا تھا۔''

اتنا بتا کر وہ خاموش ہوگیا۔ اس کی نگاہیں چھت کی

طرف لگی ہوئی تھیں۔ جیسے اپنی پریشان حالی کا جواز معلوم کرنے کی کوشش کر رہا ہو۔ ''پھر یہ ہوا ڈاکٹر کہ میں دو دنوں سے بھوکا تھا۔'' اس نے پھر بتانا شروع کیا۔ ''دو دن۔ ایک کمزور انسان اور دو دنوں کی بھوک میں نہیں جانتا کہ میں کس طرح عبداللہ شاہ غازی کے مزار کی طرف جا نکلا۔ نقاہت سے چلا بھی نہیں جا رہا تھا۔ میں ایک طرف چکرا کر رہ گیا اور اس وقت نہ جانے کس نے میرے ہاتھ میں بریانی کی تھیلی پکڑا دی۔''

''بس وہ دن تھا ڈاکٹر صاحب کہ میں وہیں کا ہو کر رہ گیا۔ کھانے کے لیے وہیں جاتا اور رہنے کے لیے فٹ پاتھ تھی اور کیا چاہیے تھا بس درد بے چین کیے رکھتا۔ اس وقت تو یہ اندازہ بھی نہیں تھا کہ میں کینسر کا مریض ہو چکا ہوں۔''

''قتل کا الزام کیسے آیا تم پر۔'' میں نے پوچھا۔

''وہی تو بتا رہا ہوں۔ مزار کے باہر جو احاطہ ہے اس احاطے میں ایک رات دو مزدوروں کا قتل ہو گیا۔ بے چارے تھک ہار کر سوئے ہوئے تھے کہ کسی بے رحم نے ان کا خون کر دیا۔ دوسری صبح پولیس آئی اور اس نے مجھے پکڑ لیا۔ کیوں کہ انہیں ایک میں ہی سب سے زیادہ مظلوم اور کمزور دکھائی دیا تھا۔''

''چلو یہاں تک تو بات سمجھ میں آگئی۔ لیکن تم نے قاتل ہونے کا اعتراف کیوں کر لیا۔'' میں نے پوچھا۔

''تو اور کیا کرتا۔ اس بہانے مجھے کھانا تو مل جاتا۔ سونے کے لیے بستر تو ہوتا اور آپ خود دیکھ لیں وہاں فٹ پاتھ پر رہ کر کون میرا علاج کراتا اور اب دیکھیں میں کتنی شان سے رہتا ہوں۔ میری دیکھ بھال ہوتی ہے۔ وقت پر دوائیں ملتی ہیں، سونے کے لیے بستر ہے۔ پولیس والے میری حفاظت کے لیے پہرے دیتے رہتے ہیں۔ ایک بے گھر اور مفلس انسان کو اس کے علاوہ اور کیا چاہیے ڈاکٹر صاحب۔''

میری آنکھوں میں آنسو آگئے۔

میں اس کے پاس بیٹھ نہیں سکا۔ انسان کی ناداری کی کیسی مثال سامنے آئی تھی لیکن میں نے فیصلہ کر لیا کہ میں اس الزام سے تو اس کی جان چھڑانے کی ضرور کوشش کروں گا۔

میں نے اپنے ایک دوست وکیل کو بلا کر اسے امجد کی بیماری کہانی سنا دی۔ وہ بھی یہ داستان سن کر بہت متاثر ہوا تھا۔ نہ جانے بعض لوگ اتنے بدنصیب کیوں ہوتے ہیں۔

میرے وکیل دوست نے اس کا کیس اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ امجد کو میں نے بڑی مشکلوں سے وکالت نامے پر دستخط کرنے کے لیے راضی کیا تھا۔ ''کیا فائدہ ڈاکٹر صاحب۔'' اس نے کہا۔ ''مرنا تو دونوں صورتوں میں ہے پھر آپ میرے لیے اتنی زحمت کیوں اٹھا رہے ہیں۔''

''نہ جانے کیوں میری خواہش ہے کہ تم اس الزام سے آزاد ہو کر اس دنیا سے جاؤ۔'' میں نے کہا۔

''چلیں آپ کی مہربانی۔''

پھر اس نے اپنے دستخط کر دیے تھے لیکن وکیل دوست کو اس کے لیے محنت کرنے کی ضرورت ہی نہیں پڑی تھی۔ دوسری صبح پولیس آفیسر بہت سویرے میرے کمرے میں آگیا تھا۔ ''ڈاکٹر صاحب اصل بندہ ہماری پکڑ میں آگیا ہے۔''

''کون اصل بندہ۔''

''وہی جس نے دونوں مزدوروں کے خون کیے تھے۔ وہ ٹھیکیدار ہے جی اور مزدوروں سے اس دن کسی بات پر اس کا جھگڑا ہو گیا تھا اور اس نے سوتے میں دونوں کا کام کر دیا۔''

''اس کا مطلب یہ ہوا کہ وہ بے چارہ امجد بے گناہ ہے۔''

''ہاں جی بالکل بے گناہ ہے۔ نہ جانے کیوں اس نے اعتراف کر لیا تھا۔''

''میں جانتا ہوں کہ اس نے کیوں اعتراف کیا تھا۔'' میں نے کہا۔ ''چلیں دونوں اس کے پاس چل کر اسے آزادی کی خبر سناتے ہیں۔''

ہم کمرے سے باہر بھی نہیں نکلے تھے کہ ایک نرس دوڑتی ہوئی کمرے میں داخل ہوئی۔ ''سر اس مریض کی ڈیتھ ہو گئی ہے رات ہی کو وہ مر گیا تھا سر۔''

''کس کی بات کر رہی ہو۔''

''وہی جو پولیس کی کسٹڈی میں تھا۔'' نرس نے بتایا۔

میں اور پولیس آفیسر ایک دوسرے کو دیکھتے رہ گئے تھے۔

میں بہت دنوں کے بعد اس شخص کی کہانی لکھتے ہوئے سوچ رہا ہوں کہ آخر کیوں کچھ لوگوں کے نصیب میں صرف مایوسیاں اور پریشانیاں ہی کیوں ہوتی ہیں! کیوں؟

گرمی، حبس اور سلگتی ہوئی دوپہر میں بس کا انتظار اسے گویا موت کا انتظار لگتا تھا۔ اس وقت بھی ثمینہ اسی انتظار کے عذاب میں مبتلا تھی۔ اس کے دائیں بائیں لڑکیوں، عورتوں اور مردوں کی بھیڑ تھی۔ گرمی کی تپش سے زیادہ لڑکوں کی سلگتی ہوئی نظروں سے چڑ تھی۔ فیشن کے نام پر عجیب و غریب حلیوں والے یہ جو کر خود کو ہیرو سمجھ کے اس کے اردگرد منڈلاتے رہتے تھے۔

اسے دور سے لہراتی، بل کھاتی بس نظر آئی جو خراماں خراماں اسٹاپ کی طرف بڑھ رہی تھی۔ بس پہلے ہی کھچا کھچ بھری ہوئی تھی۔ اس نے مروت کو بالائے طاق رکھ کر بہت سی لڑکیوں اور عورتوں کو دھکے دیے، کسی کے پاؤں پر پاؤں مارا اور بس میں داخل ہونے کی کوشش کی لیکن بس میں تو پیر لگانے تک کی جگہ نہیں تھی۔ وہ بے بسی سے ہاتھ ملتی رہ گئی اور بس کھڑکھڑاتی ہوئی آگے بڑھ گئی۔

اپنی بے بسی کے تصور سے اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ اسے پہلی دفعہ ابو پر غصہ آیا۔ شوکت بھائی پر غصہ آیا

محترم مدیراعلیٰ
السلام علیکم
کچی عمر کی لڑکیاں کبھی کبھی نادانستگی میں ایسی غلطیاں کر جاتی ہیں جو والدین کے لیے جلتا ہوا انگارہ ثابت ہوتا ہے۔ ثمینہ بھی ایک ایسی ہی غلطی کر بیٹھی تبھی جس کی وجہ سے اس کی جان بھی گئی اور گھر والوں کی پیشانی پر داغ بھی لگا۔ بھائی نے جیل بھی کاٹی۔ عبرت حاصل کرنے کے لیے ہر لڑکی کو میرا مشورہ ہے کہ اسے ضرور پڑھے۔

امیمہ
(لاہور)

کر گھر میں دو گاڑیاں اور دو تین موٹر سائیکلیں ہونے کے باوجود وہ اس سلگتی ہوئی گرمی میں بس کے لیے دھکے کھا رہی تھی۔ اس نے دل ہی دل میں فیصلہ کیا کہ ابو سے رکشا لگانے کو کہوں گی۔ میں اسی طرح دھکے کھاتی رہی تو اتنا ایم اے کرتے کرتے حلیہ ہی بگڑ جائے گا۔

اچانک اس کے سامنے چمچماتی ہوئی ایک گاڑی رکی۔ اس نے چونک کر اس طرف دیکھا۔ گاڑی میں وسیم کو دیکھ کر اس کا موڈ خراب ہو گیا۔ وسیم اس کے پڑوس میں رہتا تھا۔ اس کے ابا سرکاری ٹھیکے دار تھے اور بڑے بڑے ٹھیکے لیتے تھے۔ گھر میں دولت کی ریل پیل تھی۔ وسیم اکثر اسے گلی کے نکڑ پر نظر آتا تھا۔ وہ ثمینہ کو حسرت بھری نظروں سے اس وقت تک دیکھتا رہتا جب تک وہ گھر میں داخل نہ ہو جاتی۔ وسیم صرف اسے دیکھتا ہی تھا کبھی اس سے بات کرنے کی جرأت نہیں کی تھی۔ وہ جانتا تھا کہ ثمینہ، شوکت کی بہن ہے اور شوکت اس معاملے میں بہت حساس تھا۔ وہ تو ایسا تھا کہ دوسری لڑکیوں کی خاطر لفنگوں سے لڑ جایا کرتا تھا، اپنی بہن کے لیے تو شاید کسی کی جان بھی لے لیتا۔

یوں بھی محلے میں شوکت کا بہت رعب تھا۔ ذرا ذرا سی بات پر وہ لڑنے مرنے پر تیار ہو جاتا تھا۔ سارے محلے پر اس کی دھاک تھی۔

اچانک وہاں بھگدڑ مچ گئی۔ وہ بھی گھبرا کر ایک دکان کی طرف بھاگی۔ بھاگتے ہوئے اس نے لوگوں کی آوازیں سنیں کہ ایک سیاسی تنظیم کے تین کارکن مارے گئے تھے۔ اس کے ردعمل کے طور پر ہڑتال ہو گئی تھی۔

ثمینہ کی جان نکل گئی۔ وہ سوچ رہی تھی کہ اب گھر کیسے پہنچوں؟ شوکت بھائی کو ٹیلی فون کروں یا ابو کو؟ وہ جانتی تھی کہ اس وقت ابو بھی آفس میں ہوں گے اور شوکت بھائی بھی۔ گھر تو پہنچنا ہی تھا۔

اس وقت اسے وسیم کی آواز سنائی۔ ''ثمینہ...... حالات خراب ہو گئے ہیں...... اور مزید خراب ہوں گے...... چلو ابھی تمہیں گھر چھوڑ دوں گا۔''

اس نے وسیم کو گھورا اور کچھ کہنا چاہا۔

''ثمینہ پلیز۔'' وسیم بول اٹھا۔ ''جلدی کرو۔ ورنہ مشتعل لوگ میری گاڑی بھی جلا دیں گے۔ آ جاؤ پلیز۔''

ثمینہ نے چند لمحے کچھ سوچا پھر گاڑی کی طرف بڑھ گئی۔ اس نے عقبی نشست کا دروازہ کھولا اور بیٹھ گئی۔ اس اچانک ہڑبونگ سے وہ خود بھی بہت گھبرا گئی تھی۔ وسیم کے بارے میں اسے اطمینان تھا کہ وہ اسے گھر ہی لے جائے گا۔

''ثمینہ!'' وسیم نے گاڑی اسٹارٹ کرنے کے بعد آہستہ سے کہا۔ ''مجھے غلط مت سمجھنا...... میں نے تمہیں پریشانی میں دیکھا تو تمہیں لفٹ کی آفر کر دی...... آخر میں تمہیں بچپن سے جانتا ہوں...... تم......''

''وسیم صاحب!'' اس نے ناگواری سے کہا۔ ''آپ اپنا دھیان ڈرائیونگ پر رکھیں۔''

''ثمینہ!'' چند لمحوں بعد وسیم نے پھر کہا۔ ''تم نے میری اس حرکت کا برا تو نہیں مانا؟''

''برا مانتی تو آپ کی گاڑی میں بیٹھتی ہی کیوں؟'' ثمینہ نے جواب دیا۔

پھر وسیم نے کوئی بات نہیں کی۔ خاموشی سے گاڑی ڈرائیو کرتا رہا۔ ہاں وہ گاہے گاہے بیک ویو مرر میں ثمینہ پر ایک نظر ڈال لیتا تھا۔

گھر کے نزدیک پہنچ کر ثمینہ نے اسے گاڑی روکنے کو کہا۔ اس نے سعادت مندی سے گاڑی روک دی اور اسے اتار کر آگے بڑھ گیا۔

پھر وہ اکثر ثمینہ کو اسٹاپ کے پاس یا گلی کے نکڑ کے پاس نظر آتا۔ اس کی آنکھوں میں ثمینہ کے لیے ایک خاموش پیغام ہوتا تھا، منہ سے وہ کچھ نہیں بولتا تھا۔

گھر میں ثمینہ کے ساتھ ان کی ایک بیوہ پھپھو اور ان کے بچے بھی رہتے تھے۔ ابو ان سے بہت محبت کرتے تھے۔ وہ انہیں بھی محبت کے قابل۔ ثمینہ کا پھوپی زاد آفتاب اور زرین بھی ان کے ساتھ ہی رہتی تھی۔ پھپھو کے تمام اخراجات ابو ہی پورے کر رہے تھے۔ آفتاب ان دنوں ایم بی اے کر رہا تھا اور زرین اس سال گریجویشن کر کے فارغ ہوئی تھی۔

شوکت، زرین کو پسند کرتا تھا۔ وہ بھی اسے چاہتی تھی۔ ثمینہ ان دونوں کی خاموش محبت کی گواہ تھی۔ وہ نہیں جانتی تھی کہ امی ابو بھی ان کی محبت سے واقف ہیں۔ ایک دن ثمینہ کے تایا ابو فیملی سمیت ان کے گھر آئے ہوئے تھے۔ گھر میں بہت رونق تھی۔ ثمینہ کو معلوم ہوا کہ آج امی اور ابو نے شوکت اور زرین کا رشتہ طے کرنے کے لیے تایا ابو اور چھوٹی پھپھو کو بلایا تھا۔ کھانے کے بعد اس نے اس رشتے کا اعلان کر دیا۔ سب بہت خوش ہوئے۔ شوکت اور زرین کو سب ہی پسند کرتے تھے۔ یوں ان کا رشتہ طے ہو گیا۔ دھچکا تو

ثمینہ کو اس وقت لگا جب امی نے اس کا اور آفتاب کا رشتہ طے کیا۔ وہ تو مارے گھبراہٹ کے سن ہو کر رہ گئی۔ اس کے فرشتوں کو بھی علم نہیں تھا کہ امی ابو اس کے رشتے کی بات بھی کرنے والے ہیں۔

آفتاب اسے شروع سے ہی اچھا لگتا تھا۔ وہ بھی ثمینہ کو عجیب سی نظروں سے دیکھا کرتا تھا۔ ثمینہ ان کا مفہوم خوب سمجھتی تھی۔ وہ بہت باوقار شخصیت کا مالک تھا اس لیے اس نے کبھی محبت کا اظہار نہیں کیا تھا۔

آفتاب سے باقاعدہ رشتہ طے ہوا تو ثمینہ کو شرم آنے لگی۔ وہ ان سے چھپتی پھرتی تھی لیکن ایک گھر میں رہ کر کہاں تک چھپ سکتی تھی۔ کہیں نہ کہیں ان کا ٹکراؤ ہو جاتا۔ وہ ثمینہ کی گھبراہٹ پر مسکرا دیتا۔ وہ بھی فوراً ہی وہاں سے بھاگ جاتی۔

ایک دن پھپھو کے پاس بیٹھی ہوئی تھی۔ وہ جانتی تھی کہ آفتاب گھر میں موجود نہیں ہے۔ وہ ان دنوں ایم بی اے کر چکا تھا اور جاب کی تلاش میں تھا۔ ابو نے شوکت کی شادی تو دو ماہ بعد رکھ دی تھی لیکن پھپھو نے آفتاب کی شادی کے لیے ایک سال کا وقت لے لیا تھا۔ وہ چاہتی تھیں کہ آفتاب جاب کر کے اپنے پیروں پر کھڑا ہو جائے پھر شادی کی جائے۔

پھپھو کچھ دیر تو اس سے باتیں کرتی رہیں پھر وہ اٹھ کر ان کی طرف چلی گئیں۔

وہ بھی اٹھنے کا سوچ ہی رہی تھی کہ اچانک آفتاب آ گیا۔ اسے دیکھ کر ثمینہ گھبرا گئی۔ وہاں سے جانے لگی تو آفتاب نے اچانک اس کا راستہ روک لیا۔ ثمینہ نے حیرت سے اسے دیکھا۔ اس کے چہرے پر شوخی تھی اور آنکھوں میں ثمینہ کے لیے بے انتہا محبت، وہ سنجیدگی سے بولا۔ ”ثمینہ! تم اتنی گھبراتی کیوں ہو؟“

”جی...... نہیں...... میں تو...... نہیں گھبراتی۔“ ثمینہ نے جواب دیا۔

”پھر مجھے دیکھ کر بھاگتی کیوں ہو؟ کیا تمہیں یہ رشتہ پسند نہیں ہے؟“

”ایسی...... ایسی...... تو کوئی بات نہیں ہے۔“ ثمینہ نے کہا۔ وہ آفتاب کی تیز نگاہوں کی تپش سے جھجکتی جا رہی تھی۔

”مجھے لگتا ہے کہ ایسی ہی بات ہے۔“ آفتاب کے لہجے میں سنجیدگی تھی۔ ”ابھی کچھ نہیں بگڑا ہے۔“ وہ سنجیدگی سے بولا۔ ”اگر تمہاری مرضی نہیں ہے تو میں انکار کر دوں؟“

ثمینہ نے تڑپ کر نظریں اٹھائیں اور بولی۔ ”آپ اتنی سی بات کیوں نہیں سمجھتے کہ...... میری...... مرضی کے...... بغیر یہ رشتہ نہیں...... ہو سکتا تھا...... میں......“

”اتنی پریشانی کی کوئی بات نہیں ہے۔“ اس نے ثمینہ کو پریشان دیکھ کر کہا اور راستہ چھوڑ دیا۔

ثمینہ، زرین کے ساتھ چھت پر چلی گئی۔ ان کی چھت بہت بڑی تھی۔ ثمینہ اور زرین نے وہاں بہت سے گملے رکھ دیے تھے۔ وہ دونوں شام کی چائے چھت پر پی رہی تھیں۔

ثمینہ، زرین سے باتوں میں مصروف تھی کہ اسے پڑوس کی چھت پر کسی کی موجودگی کا احساس ہوا۔ بیٹھا ہوا آدمی دوسری چھت سے نظر نہیں آتا تھا۔ ثمینہ باتیں کرنے کے دوران ہی کھڑی ہوئی۔

اچانک سے دوسری چھت پر وسیم نظر آیا۔ وہ ثمینہ کو دیکھ کر مسکرا رہا تھا۔ وہ کچھ ایسے مضحکہ خیز انداز میں کھڑا تھا کہ اس کے مسکرانے پر ثمینہ کو بھی ہنسی آ گئی۔

زرین نے حیرت سے کہا۔ ”تم ہنس کیوں رہی ہو؟“

”مجھے تمہاری باتوں پر ہنسی آ رہی ہے۔“ ثمینہ پھر ہنس کر بولی۔

زرین نے مصنوعی خفگی سے کہا۔ ”میں نے ابھی تو کوئی بات نہیں کی ہے۔“

”مجھے کچھ سوچ کر ہنسی آ گئی تھی۔“ ثمینہ پھر ہنس کر بولی۔

اسے ہنستا دیکھ کر وسیم بھی بے ساختہ ہنسنے لگا۔

”تمہاری باتیں میری تو سمجھ میں آتی نہیں ہیں۔“ زرین نے کہا۔

اچانک شوکت چھت پر آ گیا۔ ثمینہ اسے دیکھ کر گھبرا گئی۔ شوکت کا دھیان زرین کی طرف تھا۔ ثمینہ نے گھبرا کر برابر والی چھت کی طرف دیکھا وہاں اب کوئی نہیں تھا۔ ثمینہ نے سکون کا سانس لیا اور شوکت سے بولی۔ ”شوکت بھائی آپ یہاں کیوں آئے ہیں؟“ زرین، شوکت کو دیکھ کر پہلو بدل رہی تھی۔ وہ بھی شوکت سے اس طرح گھبرا رہی تھی جیسے ثمینہ آفتاب سے گھبراتی تھی۔

”میں تو اپنے ایک کام سے آیا تھا تاہم جلدی سے بولا۔ ”مجھے کیا پتا تھا کہ تم لوگ یہاں ہو۔“ اس نے زرین کو گہری نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔ ”تم پریشان مت ہو، میں جا رہا ہوں۔“ اس نے زرین کی طرف دیکھتے ہوئے

ثمینہ سے کہا اور وہاں سے چلا گیا۔

''ویسے تو تمہاری زبان خوب قینچی کی طرح چلتی ہے۔'' ثمینہ نے زرین سے کہا۔ ''شوکت بھائی کو دیکھ کر تمہارے ہونٹوں پر تالے پڑ جاتے ہیں؟''

''مجھے شرم آتی ہے ان سے۔'' زرین نے کہا۔

''ان سے؟'' ثمینہ ہنس کر بولی۔ ''شوکت بھائی ابھی سے ''ان سے'' ہو گئے۔''

''مجھے تنگ مت کرو ثمینہ۔'' زرین نے نظریں جھکا کر کہا۔ ''ورنہ میں یہاں سے چلی جاؤں گی۔''

ثمینہ کی حالت خود بھی آفتاب کے سامنے ایسی ہی ہو جاتی تھی اس لیے اس نے ہنس کر کہا۔ ''اچھا تم پریشان مت ہو۔ اب میں کچھ نہیں بولوں گی۔''

''میں ویسے بھی جا رہی ہوں۔''

''ارے بیٹھو!'' ثمینہ نے کہا۔ ''میں نے بوا سے چائے لانے کو کہا ہے۔''

اسی وقت بوا چائے لے کر آئیں اور بولیں۔ ''زرین بیٹا! آپ کو نسیمہ صاحبہ بلا رہی ہیں۔''

''امی مجھے بلا رہی ہیں؟'' زرین نے پوچھا۔ ''کیوں؟''

''وہ عالیہ صاحبہ اور ان کے بچے آئے ہیں۔'' پھر وہ ثمینہ سے بولی۔ ''آپ کو بھی بیگم صاحبہ نے بلایا ہے۔'' یہ کہہ کر بوا وہاں سے چلی گئی۔

''یہ بوا بھی عجیب ہیں۔'' ثمینہ نے کہا۔ ''جب ہمیں بلانے ہی آئی تھیں تو یہ چائے لے کر کیوں آئیں۔''

''تم چائے پی کر آ جانا۔'' زرین نے کہا۔ ''میں چلتی ہوں ہم دونوں ہی سے کہا ہے کہ نیچے ہونا چاہیے۔'' زرین یہ کہہ کر چلی گئی۔ ثمینہ چائے کا مگ اٹھا کر چائے پینے لگی۔

چائے پیتے پیتے اس کی نظر پھر برابر والی چھت کی طرف اٹھ گئی۔ وہ گھبرا کر کھڑی ہو گئی۔ وسیم بائیں منڈیر کے پاس کھڑا تھا۔ وہ اسے دیکھ کر بولا۔ ''ثمینہ۔''

''جاؤ یہاں سے۔'' ثمینہ گھبرا کر بولی۔ ''شوکت بھائی کسی بھی وقت اوپر آ سکتے ہیں۔''

''آنے دو۔'' وسیم نے کہا۔ ''شوکت زیادہ سے زیادہ مجھے مار ہی دے گا اچھا ہے وہ مجھے مار دے۔ میں روز جینے اور روز مرنے سے نجات چاہوں گا۔''

''تم مرنے ہی کا فیصلہ کر چکے ہو تو یہاں بیٹھو میں جا رہی ہوں۔ شوکت بھائی کو بھیجتی ہوں۔''

''میں نے کہا نا ثمینہ! مجھے شوکت کی دھمکی مت دو۔ میں اب مرنے سے نہیں ڈرتا۔ تم پر تو میری محبت کا اثر ہوتا نہیں۔ مجھے شوکت نے نہ مارا اگر میں یہاں سے نیچے کود کر اپنی جان دے دوں گا۔''

اچانک ثمینہ کے کانوں میں شوکت کی آواز آئی۔ ''ثمینہ..... ثمینہ!'' وہ سیڑھیاں چڑھ کر اوپر ہی آ رہا تھا۔

ثمینہ نے بوکھلا کر وسیم کی طرف دیکھا۔ وہ اسی طرح ڈھٹائی سے وہاں کھڑا ہوا تھا۔

''تم جاتے کیوں نہیں۔'' ثمینہ بوکھلا کر بولی۔ ''شوکت بھائی اوپر آ رہے ہیں۔''

''آنے دو۔'' وسیم نے بڑی دلیری سے کہا۔

''اللہ کے واسطے، تم یہاں سے جاؤ۔'' ثمینہ اب بہت پریشان ہو گئی تھی۔ ''وسیم پلیز چلے جاؤ۔''

''ایک شرط پر۔'' وسیم نے کہا۔ ''تم کل سات بجے یہاں آؤ گی۔''

''ارے بابا ابھی تو جاؤ۔'' ثمینہ جھنجلا کر بولی۔

''پہلے تم وعدہ کرو، آؤ گی نا؟'' وسیم نے ڈھٹائی سے کہا۔

''اچھا بابا! آ جاؤں گی۔'' ثمینہ نے دانت پیس کر کہا۔

اچانک شوکت چھت پر آ گیا اور بولا۔ ''ثمینہ! تمہیں امی کب سے بلا رہی ہیں۔''

''میں بس جا ہی رہی تھی۔'' ثمینہ نے چائے کا کپ ٹرے میں رکھتے ہوئے کہا اور ڈرتے ڈرتے وسیم کی چھت کی طرف دیکھا۔ وہاں اب کوئی نہیں تھا۔ ثمینہ نے سکون کا سانس لیا اور زینے کی طرف بڑھ گئی۔

دوسرے دن اسے یونیورسٹی جانا تھا۔ اس شدید گرمی میں جانے کا موڈ تو نہیں ہو رہا تھا لیکن جانا ضروری تھا۔ سمسٹر شروع ہونے والے تھے۔ وہ واپسی میں پھر بس اسٹاپ پر کھڑی ہوئی تھی اور بس میں سوار ہونے کے تصور ہی سے نڈھال ہو رہی تھی۔

اچانک اسے پھر وسیم دکھائی دیا۔ اس کی چمچماتی ہوئی گاڑی اس سے کچھ ہی فاصلے پر رکی تھی۔ وسیم نے دروازہ کھولا اور اس کے نزدیک آ کر بہت متانت سے بولا۔

''ثمینہ! گھر چلنا ہے تو چلو، میں بھی گھر ہی جا رہا ہوں۔''

وسیم کو دیکھ کر ارد گرد کے لوگ ثمینہ کی طرف متوجہ ہو گئے تھے۔ ثمینہ خاموشی سے وسیم کی گاڑی میں بیٹھ گئی۔

جب وسیم وہاں سے آگے بڑھ گیا تو ثمینہ بھنا کر بولی۔ ''تمہاری حرکتیں کچھ بڑھتی ہی جا رہی ہیں...... میں......''

''تم شوکت سے شکایت کروگی۔ یہی نا؟''

''مجھے یہ بھی کرنا پڑے گا۔'' ثمینہ سلگ کر بولی۔ ''بلکہ شوکت بھائی کے ساتھ ساتھ میں تمہاری شکایت آفتاب سے بھی کروں گی۔''

''تو پھر کردو۔'' وسیم ڈھٹائی سے بولا۔ ''میں تم سے پہلے بھی کہہ چکا ہوں کہ میں مرنے سے نہیں ڈرتا۔''

''تم آخر چاہتے کیا ہو؟'' ثمینہ چیخ کر بولی۔

''میں...... تمہیں چاہتا ہوں۔'' وسیم نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

''سامنے دیکھو ورنہ......''

وسیم مسکرا کر سامنے دیکھنے لگا۔

''کسی کو چاہنے کا یہ کون سا طریقہ ہے؟'' ثمینہ تلخی سے بولی۔

''تمہیں تو میری چاہت کی پرواہ ہی نہیں تھی۔'' وسیم نے جواب دیا۔ ''یہ راستہ تو مجھے مجبوراً اختیار کرنا پڑا۔''

''تم مجھے چاہتے ہو تو میرے والدین سے بات کرو۔''

''والدین سے بات بھی کروں گا پہلے تم سے تو بات کرلوں۔'' وسیم ڈھٹائی سے بولا۔ اس دوران وہ گھر کے نزدیک پہنچ چکے تھے۔ اس نے گاڑی روکتے ہوئے ثمینہ سے کہا۔ ''ہاں شام کو چھت پر ضرور آنا۔'' وہ اس کا جواب سنے بغیر چلا گیا۔

ثمینہ عجیب مصیبت میں گرفتار تھی۔ وہ وسیم کو بالکل پسند نہیں کرتی تھی۔ وہ تو کسی بلائے ناگہانی کی طرح اس سے چمٹ گیا تھا۔ وہ اگر شوکت کو وسیم کے بارے میں بتا دیتی تو یہ مسئلہ اس دن بلکہ اس وقت ختم ہو جاتا۔ وہ شوکت اور آفتاب کو بھی جانتی تھی ان دونوں کے غصے کو بھی۔ اس کا نتیجہ کیا نکلتا۔ وسیم اگر مارا نہ جاتا تو اس کے ہاتھ پیر تو ضرور ٹوٹ جاتے۔ پھر پولیس تھانے اور کچہری کا چکر چلتا اور ثمینہ بری طرح رسوا ہو کر رہ جاتی۔ وسیم کو قتل یا اقدام قتل کی پاداش میں شوکت یا آفتاب کو جیل کا منہ دیکھنا پڑتا اور پھر...... پھر......

''نہیں نہیں۔'' وہ چونک کر بولی۔ ''میں شوکت بھائی کو تو ہرگز نہیں بتاؤں گی پھر...... پھر کیا کروں۔ اس مصیبت سے کیسے جان چھڑاؤں؟'' ثمینہ نے زچ ہو کر سوچا۔ پھر اس نے اپنی بات کا خود ہی جواب دیا۔ ''چھ مہینے کی تو بات ہے۔ پھر میری شادی آفتاب کے ساتھ ہو جائے گی۔ بس کسی طرح چھ ماہ کا یہ وقت گزر جائے اپنے اس فیصلے سے اسے خود بھی بہت سکون ملا۔''

شام کو جب وہ چھت پر پہنچی تو وسیم اپنی چھت پر موجود نہیں تھا۔ ثمینہ نے سکون کا سانس لیا۔

تھوڑی دیر بعد زرین بھی آگئی۔ ان دونوں نے ایک ساتھ چائے پی اور ہنس ہنس کر باتیں کرتی رہیں۔

اچانک برابر کے گھر کی منڈیر پر وسیم دکھائی دیا۔ اس طرف زرین کی پشت تھی۔ وسیم اشاروں سے کچھ کہہ رہا تھا کہ زرین کو نیچے بھیجو ورنہ...... اس نے منڈیر سے ثمینہ کی چھت پر کودنے کی دھمکی دی۔

اس سے پہلے کہ وہ زرین سے کوئی بہانہ بناتی وہ خود ہی اٹھ کھڑی ہوئی۔ ''میں تو نیچے جا رہی ہوں۔ تم شوق سے بیٹھ کر ٹھنڈی ہوا کھاؤ۔''

ثمینہ نے یوں ظاہر کیا جیسے وہ بھی نیچے جا رہی ہے۔ وسیم نے پھر اسے رکنے کا اشارہ کیا۔

اس نے دل ہی دل میں سوچا کہ آئندہ چھت پر نہیں آؤں گی۔ زرین کے جانے کے بعد وہ کرسی پر بیٹھ گئی۔ چھت پر اس وقت بالکل سناٹا تھا۔ وسیم نے اس سے کچھ کہنا چاہا لیکن فاصلہ زیادہ ہونے کی وجہ سے اس کی آواز ثمینہ تک پہنچ تو رہی تھی لیکن الفاظ واضح نہیں تھے۔ وہ دل ہی دل میں مسکرائی اور بولی اب کیا کروگے میاں مجنوں؟

وہ واقعی مجنوں تھا۔ اچانک ثمینہ کی نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ ثمینہ نے طویل سانس لے کر آنکھیں موند لیں اور سوچنے لگی۔ شاید وسیم مایوس ہو کر چلا گیا۔

اچانک پیچھے سے کسی نے اس کی آنکھوں پر ہاتھ رکھ دیا۔ ثمینہ بری طرح چونک اٹھی۔ وہ سمجھی کہ زرین پھر آگئی ہے۔ اس نے اپنے ہاتھوں سے وسیم کے ہاتھ پکڑے تو پھر وہ بری طرح چونکی اور سوچا یہ زرین کے ہاتھ تو نہیں ہو سکتے۔ تو کیا شوکت بھائی اوپر آگئے ہیں؟ شوکت بھی کبھی کبھی اسے تنگ کرنے کو ایسا کیا کرتا تھا۔

وہ ہنس کر بولی۔ ''شوکت بھائی! میں نے آپ کو پہچان لیا ہے، ہاتھ تو ہٹائیں۔''

ہاتھ بدستور اس کی آنکھوں پر جمے رہے۔ اس نے ایک مرتبہ ہاتھ ٹٹولے تو اس کا ہاتھ انگوٹھی سے ٹکرایا۔ اس

مرتبہ اسے دیکھا لگا۔ انگوٹھی تو شوکت بھائی اور آفتاب میں سے کوئی نہیں پہنتا تھا۔ ثمینہ نے ہول کر سوچا کہیں...... وسیم تو چھت کی منڈیر پھلانگ کر نہیں آ گیا۔

وہ خوف زدہ ہو کر بولی۔ ''کون ہو تم، ہاتھ ہٹاؤ اپنے ورنہ میں شور کردوں گی۔''

''آج شور کر ہی دو۔'' اسے اپنے عقب سے وسیم کی آواز سنائی دی۔ اس نے پوری قوت سے اس کے ہاتھ اٹھائے اور تڑپ کر کھڑی ہوگئی۔ وسیم کو دیکھ کر تو اس کی جان ہی نکل گئی۔ اس وقت اگر شوکت بھائی یہاں آجائیں تو وہ کیا سوچیں گے؟ ثمینہ نے سوچا۔

''تم اتنی ڈری ہوئی کیوں ہو؟'' وسیم پرسکون انداز میں بولا۔

''تم کیوں میری جان کے دشمن بنے ہو؟'' ثمینہ نے روہانسی ہو کر کہا۔ ''تمہیں شاید یہ اندازہ نہیں ہے کہ تمہارے ساتھ ساتھ شوکت بھائی مجھے بھی مار دیں گے۔''

''ہاں تو مار دیں...... جب میں مر جاؤں گا تو مجھے اس سے کیا کہ تم زندہ رہو یا مر جاؤ۔''

''تم تو مجھ سے محبت کے دعوے دار ہو؟'' ثمینہ سلگ کر بولی۔

''اب میں مجنوں فرہاد کی طرح پاگل بھی نہیں ہوں۔''

''اچھا اب تو یہاں سے جاؤ۔''

اچانک زینے پر قدموں کی آہٹیں سنائی دیں۔ پھر شوکت کی آواز آئی۔ ''ثمینہ۔''

شوکت کی آواز سن کر ثمینہ حواس باختہ ہوگئی اور وسیم کی خوشامد کرتے ہوئے بولی۔ ''وسیم تمہیں اللہ کا واسطہ...... اگر مجھے بدنامی اور رسوائی سے بچانا چاہتے ہو تو یہاں سے چلے جاؤ۔''

دوسری مرتبہ شوکت کی آواز بہت واضح طور پر آرہی تھی۔ ثمینہ نے بوکھلا کر وسیم کی طرف دیکھا اور بولی۔ ''وسیم...... تمہیں اللہ کا واسطہ...... تم......''

''ثمینہ!'' شوکت کی آواز زینے کے پاس سے آئی۔

''جی بھائی۔'' ثمینہ کی آواز لرز رہی تھی۔ وہ اٹھ کر زینے کی طرف چلی گئی۔

دوسرے ہی لمحے شوکت چھت پر آگیا۔ ''میں کب سے تمہیں آوازیں دے رہا ہوں امی بلا رہی ہیں تمہیں۔'' پھر وہ ہنس کر بولا۔ ''اب چھت پر بھی انٹرکام لگانا پڑے گا۔ ویسے تو تم سنتی ہی نہیں ہو۔''

''جی جا رہی ہوں۔'' ثمینہ نے اپنا دوپٹا سیٹ کر ڈرتے ڈرتے پیچھے کی طرف دیکھا لیکن وہاں اب کوئی نہیں تھا۔ وسیم نہ جانے کہاں غائب ہو گیا تھا۔ وہ دھڑکتے دل کے ساتھ نیچے اتر گئی۔

وسیم اس کے لیے عذاب بن گیا تھا۔ اس نے سوچا شادی ہونے میں ابھی پورے چھ مہینے ہیں۔ اس دوران میں تو وسیم نہ جانے کیا کر بیٹھے۔ میں زرین کو اس کے بارے میں بتا دیتی ہوں۔ وہ امی کو بتا دے گی۔ ہم سب مل کر اس الجھن کا حل ڈھونڈ لیں گے۔ امی اور پھپھو خود بھی جہاں دیدہ اور تجربے کار ہیں۔ وہ خود نہیں چاہیں گی کہ میں یا شوکت اور آفتاب کسی مشکل میں پھنسیں۔ امی، شوکت بھائی کو بھی سمجھائیں گی کہ اس معاملے میں جوش سے نہیں ہوش سے کام لیں۔ وہ یہ بھی سوچ کر کچھ مطمئن ہوگئی۔

ایک ہفتے بعد گھر میں شوکت کی شادی کے ہنگامے شروع ہو گئے۔ ثمینہ اس ہلے گلے میں ایسی مگن ہوئی کہ وسیم کو بالکل بھول گئی۔

اس دن شوکت کی برات تھی۔ علیم صاحب نے بہن کو عارضی طور پر کرائے کا ایک مکان لے کر دے دیا تھا۔ ان کا خیال تھا کہ زرین رخصت ہو کر اس مکان میں جائے اور کچھ عرصے بعد یہاں آجائے ورنہ ایک گھر میں رہ کر یہ کچھ اچھا نہیں لگ رہا تھا۔

وہ لوگ شوکت کی برات لے کر دلہن کے گھر پہنچے تو اچانک ثمینہ کی نظر وسیم پر پڑی۔ وہ سفید کلف والا کرتہ شلوار پہنے بہت اچھا لگ رہا تھا۔ پڑوسی ہونے کے ناتے ان لوگوں کو بھی شادی کا بلاوا دیا گیا تھا۔

وسیم نے شاکی نظروں سے ثمینہ کو دیکھا اور اسے اشارے سے اپنے پاس بلایا۔ اس کی دیدہ دلیری پر ثمینہ حیران رہ گئی لیکن وہ تو ثمینہ کی محبت میں پاگل ہو رہا تھا اس سے کچھ بعید نہیں تھا وہ کچھ بھی کر سکتا تھا۔ یہ ایک طرح سے اس کی بلیک میلنگ تھی اور اب ثمینہ اس بلیک میلنگ سے تنگ آ گئی تھی۔ وہ دل پر جبر کر کے اس کے نزدیک چلی گئی۔

اس نے ثمینہ کو سر سے پاؤں تک دیکھا اور اوباش انداز میں بولا۔ ''ثمینہ! آج تو تم بجلیاں گرا رہی ہو دل پر۔''

''تم نے مجھے کیوں بلایا ہے وسیم؟'' ثمینہ نے ترش لہجے میں پوچھا۔

''بھئی اس لیے بلایا ہے کہ تمہارے حسن کی تعریف کر سکوں۔ آج تو تم نے میرا سکون اور قرار سب کچھ لوٹ لیا

ہے ثمینہ۔'' وسیم جذباتی ہو کر اس کی طرف بڑھا۔

''تم کیوں مجھے تماشا بنانا چاہتے ہو وسیم!'' ثمینہ نے کہا۔ ''یہاں ابو، شوکت بھائی، امی، دونوں ماموں بھی موجود ہیں اور تم......''

''ایک دن تو ان سب لوگوں کو معلوم ہونا ہی ہے۔'' وسیم نے کہا۔ ''تو پھر ڈرنا کیسا؟''

اس وقت چھوٹے ماموں کی بیٹی روبی، ثمینہ کو دیکھ کر وہاں آگئی اور بولی۔ ''ثمینہ! میں تمہیں اسٹیج پر ڈھونڈ رہی ہوں اور تم یہاں کھڑی ہو۔''

''ہاں! میں ذرا اپنی ایک دوست کو تلاش کر رہی تھی۔'' ثمینہ نے جلدی سے کہا۔

''دوست سے پھر مل لینا۔ وہاں رسمیں شروع ہونے والی ہیں اور دولہا کی بہن بھی غائب ہے جو میرے ساتھ...!''

ثمینہ نے موقع غنیمت جانا اور وہ روبی کے ساتھ چلی گئی۔

پھر پوری تقریب کے دوران میں وسیم نے اسے پریشان نہیں کیا۔ ثمینہ کو اب اس کی شکل سے بھی نفرت ہو گئی تھی۔ اس کا بس چلتا تو وہ وسیم کو جان سے مار دیتی۔ کم بخت نے اسے ذہنی مریض بنا کر رکھ دیا تھا۔ یہ اس کی اچھی زبردستی تھی۔ وہ ثمینہ پر ہر روز دباؤ بڑھاتا ہی جا رہا تھا۔ بغیر کسی وجہ کے۔ ثمینہ نے کبھی اس سے پیار کی باتیں نہیں کی تھیں۔ کبھی وسیم کو خواب نہیں دکھائے تھے۔

وہ اسٹیج کے نزدیک پہنچی تو آفتاب نے اسے روک دیا۔ ثمینہ کو ایسا لگا جیسے آفتاب نے اسے وسیم کے ساتھ دیکھ لیا ہو۔ اس نے ڈرتے ڈرتے آفتاب کی طرف دیکھا۔ آفتاب کے چہرے پر مسکراہٹ تھی اور آنکھوں میں عجیب سی چمک تھی۔ اس نے سیاہ شیروانی پہن رکھی تھی جو اس کے کسرتی جسم اور سرخ و سفید رنگت پر بہت اچھی لگ رہی تھی۔ آفتاب یوں بھی خاصا وجیہہ تھا۔ ثمینہ کا دل بے اختیار بے قابو ہو گیا۔

''ثمینہ!'' آفتاب نے آہستہ سے کہا۔ ''آج تم بہت اچھی لگ رہی ہو؟''

ثمینہ اس کی بات کا جواب دیے بغیر جلدی سے اسٹیج پر چڑھ گئی۔

تقریب ختم ہوئی تو ثمینہ نے سکون کا سانس لیا۔ وسیم کہیں نظر نہیں آ رہا تھا۔ شاید وہ جا چکا تھا۔

ثمینہ سونے کے لیے لیٹی تو آفتاب چھم سے اس کے تصور میں آ گیا۔ آج اس نے پہلی دفعہ ثمینہ کے حسن کی تعریف کی تھی۔ اسے بھرپور نظروں سے دیکھا تھا۔ آفتاب کا تصور کر کے ثمینہ شرمار ہی تھی۔

دوسرے دن ناشتے کی میز پر سب موجود تھے لیکن آفتاب موجود نہیں تھا۔ ثمینہ کو بے چینی ہو رہی تھی۔ آفتاب اس کا منگیتر تھا اس لیے وہ کسی سے اس کے بارے میں پوچھ بھی نہیں سکتی تھی۔ اس کی مشکل انیسہ بیگم نے حل کر دی۔ وہ بولی۔ ''یہ آفتاب کہاں رہ گیا؟''

''وہ جوگنگ پر گیا ہوگا۔'' پھپھو نے جواب دیا۔ ''آندھی آئے یا طوفان ان حضرت کی جوگنگ ضرور ہوتی ہے۔''

''ثمینہ بیٹا!'' علیم صاحب نے کہا۔

''جی ابو۔'' ثمینہ چونکی۔

''بیٹا، ذرا گرم چائے تو لے آؤ۔ میری چائے تو ٹھنڈی ہو گئی۔''

''جی ابو۔'' ثمینہ اٹھ کھڑی ہوئی۔

وہ کچن میں پہنچی تو یہ دیکھ کر حیران رہ گئی کہ آفتاب فرج سے پانی نکال کر پی رہا تھا۔

''آپ... آپ کب آئے؟'' ثمینہ نے کہا۔ ''سب لوگ آپ کا پوچھ رہے تھے۔''

''میں تو کافی دیر پہلے یہاں آ گیا تھا۔ تم تو جانتی ہو کہ میں علی الصبح جوگنگ کے لیے جاتا ہوں تو کچن ہی کا دروازہ استعمال کرتا ہوں تاکہ گھر کے دوسرے افراد ڈسٹرب نہ ہوں۔''

''تو آپ یہاں کیوں بیٹھے ہیں؟'' ثمینہ نے پوچھا۔

''تمہارے انتظار میں۔'' آفتاب نے اسے بھرپور نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

ثمینہ کا دل پھر بے قابو ہونے لگا۔ ''م...... میرے انتظار میں؟'' اس نے لرزتی ہوئی آواز میں پوچھا۔

''ہاں بھئی، ویسے تو تم سے بات کرنے کا موقع ہی نہیں ملتا۔ کبھی تم امی کے ساتھ ہوتی ہو کبھی مامی کے ساتھ۔''

''اچھا اب جائیں یہاں سے...... ابھی کوئی آ جائے گا اور......''

''آنے دو۔'' آفتاب نے شوخی سے کہا۔ ''بھئی کسی کو کیا اعتراض ہو سکتا ہے۔ وہ یہی سمجھے گا کہ آفتاب اپنی ہونے والی دلہن سے بات کر رہا ہے۔''

ثمینہ کے کانوں میں اچانک امی کی آواز آئی۔

''ثمینہ!''

آفتاب بوکھلا گیا اور اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔ ثمینہ کو اس کی حالت پر بے اختیار ہنسی آ گئی۔ چائے تیار ہو چکی تھی۔ اس نے جلدی سے چائے دانی اٹھائی اور کچن سے باہر نکل گئی۔ چہرے پر اب بھی دبی دبی مسکراہٹ تھی۔ امی اسی طرف آ رہی تھیں۔ وہ اسے دیکھ کر بولیں۔ ''بھئی جلدی سے چائے لے آؤ۔ تمہارے ابو کو دیر ہو رہی ہے۔''

اس نے علیم صاحب کو چائے دی اور خود بھی چائے لے کر بیٹھ گئی۔

اچانک داخلی دروازہ کھلا اور آفتاب اندر داخل ہوا۔ ثمینہ اسے دیکھ کر مسکرانے لگی۔ وہ یوں گھر میں داخل ہوا تھا جیسے ابھی ابھی آیا ہو۔

پھر خاندان میں زرین اور شوکت کی دعوتوں کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ دعوت کہیں بھی ہوتی۔ زرین اسے ضرور ساتھ لے جاتی تھی۔ خاندان والے بھی ثمینہ کو ضرور بلاتے تھے۔

چھوٹی پھپھو نے دعوت کی تھی زرین نے ثمینہ سے کہا۔ ''تم جلدی سے جا کر تیار ہو جاؤ۔ چھوٹی خالہ کے ہاں جانا ہے۔''

''بھابی آج تو مجھے معاف کر دیں۔'' زرین نے خوشامد سے کہا۔ وہ شادی کے بعد زرین کو بھابی کہنے لگی تھی۔

''دعوتیں کھا کھا کر میں موٹی ہو رہی ہوں۔''

''آپ چاہتی ہیں کہ میں بھی آپ کی طرح موٹی ہو جاؤں؟'' ثمینہ ہنس کر بولی۔

''میں موٹی ہوں۔'' زرین نے آنکھیں نکالیں۔

''اب تو تم ضرور چلو گی۔ بس جلدی سے جا کر تیار ہو جاؤ''

لاکھ انکار کے باوجود ثمینہ کو جانا ہی پڑا۔ اسے یہ جان کر خوشی ہوئی کہ آفتاب بھی اس دعوت میں جا رہا ہے۔

شادی کے ایک ہفتے بعد ہی شوکت، زرین کو لے کر دوبارہ اپنے گھر آ گیا تھا۔ فرق صرف یہ پڑا تھا کہ اب زرین ماں کے کمرے میں سونے کی بجائے شوکت کے بیڈ روم میں شفٹ ہو گئی تھی۔

اس دن سب کھانا کھانے بیٹھے ہی تھے کہ آفتاب بھی آ گیا۔ وہ خاصا خوش اور پُرجوش نظر آ رہا تھا۔ شوکت ہنس کر بولا۔ ''کیا بات ہے آفتاب! بہت خوش نظر آ رہے ہو۔''

''یار بات ہی ایسی ہے۔'' اس نے کنکھیوں سے ثمینہ کی طرف دیکھا۔

''یار کوئی خوش خبری ہے تو ہمیں بھی بتاؤ تاکہ ہم بھی خوش ہو سکیں۔''

''یار کھانا تو کھا لینے دو۔'' آفتاب نے کہا۔

''تمہاری تجسس پیدا کرنے والی عادت گئی نہیں۔'' شوکت منہ بنا کر بولا۔ ''مت بتاؤ۔'' اس نے اٹھتے ہوئے کہا۔

''اوہو..... یار تم تو ناراض ہو گئے۔'' آفتاب نے جلدی سے کہا۔ ''بیٹھو یار، بتا رہا ہوں۔''

وہ دونوں بچوں کی طرح لڑ رہے تھے اور بزرگ اس پر زیرِ لب مسکرا رہے تھے۔

''چھوٹے ماموں..... مامی، امی مجھے جاب مل گئی ہے۔''

''واقعی۔'' علیم صاحب نے خوش ہو کر پوچھا۔

''چھوٹے ماموں!'' آفتاب نے کہا۔ خوشی اس کے چہرے پر چمک رہی تھی۔ ''مجھے ایک ملٹی نیشنل کمپنی میں جاب مل گئی ہے۔''

''میاں یہ تو خوشی کی خبر ہے۔'' علیم صاحب نے کہا۔

''یار تو اس میں تجسس پھیلانے کی کیا ضرورت تھی؟'' شوکت نے منہ بنا کر کہا۔

''لگتا ہے تمہیں میری جاب سے خوشی نہیں ہوئی؟'' آفتاب نے مصنوعی خفگی سے کہا۔

شوکت نے اسے گھور کر دیکھا۔ پھر ہنستا ہوا اس سے لپٹ گیا۔ ''یار مجھ سے زیادہ خوشی اور کسے ہو سکتی ہے؟''

ثمینہ حسبِ معمول کچن میں چائے بنا رہی تھی۔ کھانے کے بعد سبھی چائے یا کافی پینے کے عادی تھے۔ اس وقت آفتاب دبے پاؤں کچن میں چلا آیا۔ ثمینہ نے چونک کر اسے دیکھا۔ اب وہ آفتاب سے اتنی شرماتی نہیں تھی۔ اسے گھبراہٹ صرف اس وقت ہوتی تھی جب آفتاب اسے گہری نظروں سے دیکھتا تھا۔

''آپ کو جاب بہت بہت مبارک ہو۔'' ثمینہ نے ہنس کر کہا۔

''ثمینہ!'' آفتاب نے محبت بھرے لہجے میں کہا۔ ''اس مبارک باد کی حق دار تو تم ہو۔''

''میں ہوں؟'' ثمینہ نے حیرت سے اپنی خوب صورت آنکھیں پھیلائیں۔ ''وہ کیسے؟''

''بھئی بزرگوں سے سنتے آئے ہیں کہ رزق بیوی کے نصیب کا ہوتا ہے۔''

اس کی بات سن کر ثمینہ بری طرح شرما گئی۔

''صرف جاب ہی نہیں۔'' آفتاب نے کہا۔ ''کمپنی

کی طرف سے فرنشڈ بنگلا بھی ملے گا اور کار بھی۔''
''ارے واہ! آپ تو قسمت کے دھنی ہیں۔'' ثمینہ نے ہنس کر کہا۔
''واقعی میں قسمت کا دھنی ہوں جسے تم جیسی خوب صورت اور مقدر والی بیوی ملی ہے۔''
ثمینہ کا چہرہ مارے شرم کے ایک بار پھر سرخ ہو گیا۔
اس وقت اگر شوکت وہاں نہ آجاتا تو آفتاب نہ جانے اور کیا کچھ کہتا۔ شوکت نے کہا۔ ''یار تم تو بہت ہی بے صبرے ہو۔ چائے کے لیے یہاں چلے آئے۔''
''ثمینہ بھی تو چائے کی جگہ پائے پکاتی ہے۔'' آفتاب نے ہنس کر کہا اور شوکت کے ساتھ باہر نکل گیا۔
دو دن بعد پھر ایک پارٹی تھی۔ اس دن ثمینہ کو خاصا تیز بخار تھا۔ اس نے جانے سے صاف انکار کر دیا۔ زرین نے بھی اس پر زیادہ زور نہیں دیا۔ پھپو نے کہا بھی کہ میں تمہارے ساتھ رک جاتی ہوں لیکن ثمینہ نے انکار کر دیا اور بولی۔ ''پھپو! میں نے ٹیبلٹس لے لی تھیں۔ بخار تو اب بہت کم ہو گیا ہے ابھی تھوڑی دیر میں وہ بھی اتر جائے گا۔ میں ٹھیک ہوں۔''
پھپو نے ایک مرتبہ اس کی پیشانی چھو کر دیکھی اور مطمئن ہو کر بولیں۔ ''بس میری جان تم آرام کرنا۔ کمرے سے باہر مت نکلنا۔ آج سردی کچھ زیادہ ہے۔''
''آپ پریشان مت ہوں پھپو۔'' ثمینہ نے ہنس کر کہا۔ ''میں کوئی چھوٹی بچی نہیں ہوں جو فضول میں سردی میں گھومتی پھروں گی۔''
سب لوگ دعوت میں چلے گئے۔ ان کے جانے کے بعد گھر پر ایک عجیب سناٹا چھا گیا۔ پورا گھر بھائیں بھائیں کر رہا تھا۔
دس منٹ بعد ہی ثمینہ کو اپنے فیصلے پر افسوس ہونے لگا۔ اب ایسی بیمار بھی نہیں تھی کہ دعوت میں جا نہ پاتی۔ دعوت بھی کون سی غیروں کے گھر میں تھی اس کے سگے چچا کے گھر میں تھی۔ ثمینہ وہاں جا کر اطمینان سے لیٹ بھی سکتی تھی۔
اس نے گھڑی دیکھی۔ ابھی صرف ساڑھے دس بجے تھے۔ ثمینہ جانتی تھی کہ وہ لوگ ساڑھے بارہ ایک بجے سے پہلے واپس نہیں آئیں گے۔
وقت گزارنے کے لیے اس نے ایک ناول اٹھائی لیکن ناول میں بھی اس کا دل نہ لگا۔ اس نے سناٹا توڑنے کے لیے ٹی وی کھول دیا اور خود بستر پر نیم دراز ہو گئی۔
اچانک اسے ایسا لگا جیسے زینے پر کسی کے قدموں کی آہٹ گونجی ہو۔
ثمینہ اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ چھت پر جانے کے دو زینے تھے۔ ایک زینہ برآمدے میں تھا اور دوسرا زینہ بنگلے کی عقبی سمت میں تھا۔ وہ جس کوریڈور میں کھلتا تھا اس کے بالکل سامنے ثمینہ کا بیڈ روم تھا۔
اس نے ہول کر سوچا زینے میں کوئی ہے۔ اچانک اسے خیال آیا کہ زینے کا دروازہ کوریڈور میں کھلتا ہے۔ وہ اس وقت بند نہیں ہے۔
وہ جلدی سے اٹھی، جسم کے گرد اونی شال لپیٹی اور ڈرتے ڈرتے کمرے کا دروازہ کھول کر باہر جھانکا لیکن اسے دروازہ بند کرنے میں دیر ہو چکی تھی۔
اس نے جیسے ہی دروازہ کھولا کوئی دھکیلتا ہوا اندر آ گیا۔ ثمینہ کے منہ سے ہلکی سی چیخ نکل گئی۔ وہ گھبرا کر پیچھے ہٹی تو اسے وسیم کا چہرہ نظر آیا۔ وہ اسے نظروں ہی نظروں میں کھا جانے کی کوشش کر رہا تھا۔
کسی نادیدہ قوت کی بجائے وسیم کو وہاں دیکھ کر اس کا خوف اب غصے میں تبدیل ہو چکا تھا۔ وہ درشت لہجے میں بولی۔ ''تم یہاں کیوں آئے ہو؟''
''تم کئی دن سے چھت پر کیوں نہیں آئیں؟'' وسیم نے ڈھٹائی سے کہا۔
''تم فوراً یہاں سے دفع ہو جاؤ، ورنہ......''
''ورنہ تم شوکت کو بلا لو گی؟'' وسیم نے طنزیہ انداز میں اس کا جملہ پورا کر دیا۔
''اس وقت میں شوکت کو نہیں پولیس کو بلا لوں گی۔'' ثمینہ نے دانت پیس کر کہا۔ ''تم میرے گھر میں داخل کیسے ہوئے؟''
''میں تمہارے گھر میں چھت کے ذریعے داخل ہوا؟'' وسیم تمسخر آمیز لہجے میں بولا۔ ''میں نے تمہارے گھر والوں کو جاتے دیکھا تھا۔ ان میں تم نہیں تھیں۔ میں سمجھ گیا کہ آج تم گھر پر اکیلی ہو۔ بس پھر میں یہاں آ گیا۔''
''میں ابھی پولیس کو کال کرتی ہوں۔'' ثمینہ نے دروازے کی طرف بڑھتے ہوئے کہا۔
وسیم نے اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے پیچھے کھینچ لیا۔ ثمینہ اس سے ٹکرائی تو وسیم نے اسے باہوں میں لے لیا اور بولا۔ ''اتنا خوب صورت وقت اس ہاتھا پائی میں برباد مت کرو۔'' وسیم

نے اسے میز پر دھکیل دیا۔
پھر وسیم کی دست درازیاں بڑھتی گئیں۔ ثمینہ اسے پہلے تو روکنے کی کوشش کرتی رہی لیکن آخر کب تک! ایک وقت آیا کہ اس نے ہتھیار ڈال دیئے لیکن وہ زبان سے کہہ رہی تھی کہ وسیم تمہیں خدا کا واسطہ، مجھ پر رحم کرو اب میں کسی کی امانت ہوں۔"
"تم میری ہو..... صرف میری۔" وسیم نے جذباتی لہجے میں کہا۔
اچانک کمرے کا دروازہ کھلا اور ثمینہ کو آفتاب نظر آیا۔ کمرے کا منظر دیکھ کر آفتاب کی آنکھیں غیر یقینی سے پھٹ گئیں۔
اچانک وسیم نے بھی ڈریسنگ ٹیبل کے آئینے سے آفتاب کو دیکھ لیا۔
اس نے ثمینہ کو چھوڑ دیا اور اپنے جوتے اٹھا کر اچانک کوریڈور والے دروازے کی طرف بھاگ گیا۔ آفتاب نے اسے پکڑنے کی کوشش کی لیکن وسیم اسے دکھا دے کر سیڑھیوں کی طرف بھاگ گیا۔
آفتاب کا چہرہ غصے سے سرخ ہو رہا تھا اور پورا جسم کانپ رہا تھا۔ "ثمینہ!" وہ چیخ کر بولا۔ "کون تھا یہ اور تم......" اس نے جنونی انداز میں ثمینہ کے چہرے پر زوردار تھپڑ رسید کر دیا۔ "کس کے ساتھ منہ کالا کر رہی تھی بے حیا۔" آفتاب پھر چیخا۔ "میں تجھے زندہ نہیں چھوڑوں گا۔ دھوکے باز۔"
"آفتاب...... میری بات تو سنو...... میں......"
"بکواس بند کر بدچلن لڑکی۔" آفتاب نے اس کے بال پکڑ لیے اور اس کے سر پر اتنا زوردار تھپڑ مارا کہ ثمینہ کے حلق سے اذیت ناک چیخ بلند ہوئی۔
اچانک باہر بھاگتے ہوئے قدموں کی آواز سنائی دی۔ پھر شوکت، علیم صاحب، زرین، پھپھو بھی کمرے میں آ گئے۔
شوکت کے آتے ہی ثمینہ بلک بلک کر رونے لگی۔ اس کے کپڑے جگہ جگہ سے پھٹے ہوئے تھے بازوؤں پر خراشیں تھیں اور ہونٹوں سے خون بہہ رہا تھا۔ شوکت نے ثمینہ کے جسم پر چادر ڈال دی اور غضب ناک لہجے میں بولا۔
"یہ سب کیا ہے ثمینہ!"
"بھیا!" ثمینہ بلکتے ہوئے بولی۔ "یہ آفتاب...... آفتاب نے......" وہ آگے کچھ نہ کہہ سکی۔ وہ کچھ اور کہنا چاہتی تھی مگر شدت غم اور سر پر لگنے والی ضرب نے اسے موقع نہیں دیا۔ وہ تیورا کر گرتی چلی گئی۔
ثمینہ کی بات پر آفتاب سکتے میں رہ گیا تھا۔ اس کا پورا جسم گویا مفلوج ہو کر رہ گیا تھا۔ اسے ثمینہ کی طرف سے اتنے بڑے بہتان کی اُمید نہیں تھی۔
شوکت نے قہر آلود نظروں سے آفتاب کو گھورا اور اچانک اسے گھونسوں پر رکھ لیا۔ وہ اسے مارتے ہوئے کہہ رہا تھا۔ "ذلیل کمینے ہمارے ٹکڑوں پر پل کر ہماری ہی عزت کو ڈس لیا۔" وہ اسے بے دردی سے مارنے لگا۔
آفتاب اگر چاہتا تو شوکت کو روک سکتا تھا اس کے تشدد کا جواب دے سکتا تھا لیکن وہ خاموشی سے مار کھاتا رہا۔
اسے تو صدمہ اس بات کا تھا کہ ثمینہ نے اسے سب کے سامنے ایک دم گالی بنا دیا تھا۔ یہ وہ ثمینہ تھی جس کی محبت میں وہ دن رات سلگتا تھا۔ اس کی ایک مسکراہٹ کے لیے وہ کچھ بھی کر سکتا تھا۔ اس ثمینہ نے اس پر اتنا بڑا الزام لگا دیا تھا کہ وہ اپنی ہی نظروں میں ذلیل ہو گیا تھا۔
"شوکت!" علیم صاحب چیخ کر بولے۔ "چھوڑ دو اسے تم کیوں اس بے غیرت کے خون سے اپنے ہاتھ رنگنا چاہتے ہو؟" پھر وہ آگے بڑھے اور نفرت بھرے لہجے میں بولے۔ "نمک حرام احسان فراموش! تو نے میری محبتوں کا یہ صلہ دیا ہے۔ میں نے کبھی تجھ میں اور شوکت میں فرق نہیں سمجھا۔ تیری ہر خواہش پوری کی، اعلیٰ تعلیم دلائی تو نے اس کا یہ صلہ دیا۔ پھر اب ثمینہ تو تیری بھی عزت تھی۔ تو نے ایسا کیوں کیا؟"
اس وقت پھپھو آگے بڑھیں اور پے در پے کئی تھپڑ آفتاب کے منہ پر مار دیے اور روتے ہوئے بولیں۔ "میری تربیت میں کہاں کمی رہ گئی تھی بدبخت ...... تو نے اپنے ساتھ ساتھ ہمیں بھی کہیں منہ دکھانے کے قابل نہیں چھوڑا۔ میں تجھے کبھی معاف نہیں کروں گی...... کبھی معاف نہیں کروں گی۔ دفع ہو جا اس گھر سے ہمیشہ کے لیے اپنی یہ منحوس صورت لے کر گم ہو جا۔ بدذات! میں تیری شکل بھی دیکھنا نہیں چاہتی ہوں۔"
آفتاب نے حسرت و یاس سے ماں کی طرف دیکھا۔ پھر اس نے ثمینہ کی طرف دیکھا کہ ممکن ہے اس کا دل پسیج جائے اور وہ سب کو سچائی بتا دے۔
"یہاں سے دفع ہو جا آفتاب۔" شوکت چیخ کر بولا۔ "اس سے پہلے کہ میرا ضبط جواب دے جائے دفع ہو

جا یہاں سے۔"
آفتاب ہارے ہوئے جواری کی طرح بوجھل قدموں سے باہر نکل گیا۔
نسیمہ بیگم نے روتے ہوئے اچانک علیم صاحب کے پاؤں پکڑ لیے۔ "بھیا مجھے معاف کر دینا۔ شاید میری تربیت میں ہی کہیں خامی رہ گئی تھی۔ مجھے معاف کر دینا بھیا۔ مجھے معاف کر دینا۔" وہ علیم صاحب کے پیر پکڑے رو رہی تھی۔
علیم صاحب نے انہیں اٹھایا اور بولے۔ "نسیمہ! اس میں تمہارا کوئی قصور نہیں۔ تم کیوں شرمندہ ہو رہی ہو؟"
نسیمہ بیگم نے بڑبڑاتے ہوئے کہا۔ "میں جانتی ہوں مجھے کوئی معاف نہیں کرے گا۔ انہیں معاف کرنا بھی نہیں چاہیے۔" وہ آنسو بہاتی ہوئی کمرے سے نکل گئیں۔
تبھی بیگم علیم بھاگی ہوئی آئیں اور بوکھلائے ہوئے لہجے میں بولیں۔ "شوکت! نسیمہ نے خود کو بیڈ روم میں بند کر لیا ہے۔ جلدی چلو کہیں وہ کچھ کر نہ بیٹھیں۔"
شوکت سے پہلے علیم صاحب نسیمہ کے بیڈ روم کے دروازے پر پہنچ گئے اور اس طرح دروازہ پیٹ ڈالا اور چیخ کر بولے۔ "نسیمہ...... دروازہ کھولو...... نسیمہ!"
"پھپھو۔" شوکت چیخ کر بولا۔ "دروازہ کھولیے ورنہ میں اسے توڑ دوں گا۔"
اندر سے کوئی جواب نہیں آیا۔
شوکت نے اچانک دروازے پر اپنے کندھے سے وار کیا۔ دروازہ شوکت کی دو ضربیں بھی برداشت نہ کر سکا۔ زوردار آواز کے ساتھ اندر جا گرا۔
کمرے کا منظر دیکھ کر زرین بری طرح چیخی۔
کمرے میں پنکھے کے ہک سے نسیمہ کی لاش لٹک رہی تھی بیڈ پر ایک کرسی اوندھے پڑی تھی۔ نسیمہ بیگم نے اس کرسی پر چڑھ کر اپنے گلے میں رسی کا پھندا ڈالا تھا اور کرسی کو پرے گرا دیا تھا۔
زرین نے ایک چیخ ماری اور دھم سے فرش پر گر پڑی۔ شوکت نے آگے بڑھ کر اسے اٹھایا اور صوفے پر لٹایا۔
ثمینہ کے ہوش میں آنے سے پہلے ہی صرف آدھے گھنٹے میں اس گھر میں قیامت آ گئی تھی۔
علیم صاحب اسٹول پر چڑھ کر نسیمہ کی لاش اتار رہے تھے کہ چھت کی طرف سے پسٹل کے فائر کی آواز آئی۔
شوکت اور علیم صاحب گھر کی چھت کی طرف بھاگے۔

چھت کا منظر دیکھ کر وہ دہل کر رہ گئے۔ وہاں پر مڑا تڑا آفتاب کا جسم پڑا تھا۔ اس کی کن پٹی سے خون بہہ کر کان سے ہوتا ہوا زمین پر گزر رہا تھا۔ آفتاب کے جسم میں ابھی جان باقی تھی۔ وہ گہرے گہرے سانس لے رہا تھا۔
"آفتاب بیٹا!" علیم صاحب چیخ کر بولے۔ "تو نے یہ کیا کر دیا بیٹا۔"
اس نے دھندلائی ہوئی نظروں سے علیم صاحب کو دیکھا اور اس کی گردن ڈھلک گئی۔
اس کے ہاتھ سے ایک پرچہ نکل کر زمین پر گر گیا۔ علیم صاحب نے آگے بڑھ کر وہ پرچہ اٹھا لیا اس میں لکھا تھا۔
"چھوٹے ماموں اور امی! میں اتنا کم ظرف اور احسان فراموش نہیں ہو سکتا کہ اپنے محسن ہی کی عزت کا جنازہ نکال دوں۔ آپ لوگ سوچ بھی کیسے سکتے ہیں کہ میں اتنی گری ہوئی اور گھٹیا حرکت کر سکتا ہوں۔ میں بالکل بے گناہ ہوں۔ میں زندگی میں یہ پہلا اور آخری گناہ کروں گا کہ حرام موت مروں گا۔ آپ سب تو میری کسی بات پر یقین کرنے کو تیار ہی نہیں تھے لیکن مجھے یقین ہے کہ حرام موت مرنے پر میرا اللہ مجھے معاف کر دے گا۔ میں آپ میں سے خاص طور پر شوکت سے ایک مرتبہ پھر معافی مانگتا ہوں۔ ممکن ہو تو مجھے معاف کر دیجیے گا۔"
شوکت بلک بلک کر روتا ہوا آفتاب کی لاش سے لپٹ گیا۔
ثمینہ کو ہوش آ چکا تھا۔ اس نے کچھ بولنا چاہا لیکن بول نہ سکی۔
اس واقعے کو اٹھارہ سال گزر چکے ہیں۔ وسیم جو واقعہ کے فوراً بعد گھر سے فرار ہو کر دبئی چلا گیا تھا پھر واپس نہیں آیا۔ ثمینہ بھی گزشتہ اٹھارہ سال سے خاموش ہے۔ علیم صاحب نے اسے بہت سے ڈاکٹروں کو دکھایا اس کا نفسیاتی علاج بھی کرایا لیکن اس کی قوت گویائی واپس نہ آ سکی۔ دو انسانوں کو شدید ذہنی اذیت پہنچانے کے بعد ان کی جان لینے کی یہ سزا تو کچھ بھی نہیں ہے۔ ثمینہ گونگوں کی طرح سارے گھر کا کام کرتی ہے۔ نہ جانے کب تک کرتی رہے گی۔ اس کے بعد اس کی شادی بھی نہ ہو سکی۔ ثمینہ کو اس وقت تک یہ سزا بھگتنا ہے جب تک موت اسے دبوچ نہیں لیتی۔ وہ خود بھی شدت سے موت کی منتظر ہے۔

انجام

قابلِ احترام مدیر
سلام تہنیت
انسان غلط کام کرتے وقت یہ بھول جاتا ہے کہ ہر کام کی پکڑ ہے۔ اللہ تعالیٰ دیکھ رہا ہے۔ یہ کہانی میری عزیز سہیلی شاہین کے گائوں کی ہے۔ جہاں وہ سب بھول گئے تھے کہ ہر برے کام کا انجام برا ہوتا ہے۔ شاہین کی عزیزہ نے بھی گناہ کو دعوت دے کر اپنے لیے تباہی کا راستہ چن لیا اور اس کا انجام بھی تباہی کا عمیق غار ٹھہرا۔

شاہدہ ملک
(سرگودھا)

"ماسی او ماسی!" ذکیہ گلا پھاڑ کے بولی۔

ماسی نے جھنجلاتی ہوئی آواز میں کہا۔ "منہ سے تو پھوٹ کیا بات ہے؟"

ماسی ابھی ابھی اپنے شوہر سے لڑ کر بیٹھی تھی اور اس کا شوہر ناراض ہو کر رحمت کی بیٹھک کی طرف جا رہا تھا۔ پیپل کے جس درخت کے نیچے ماسی اور اس کے شوہر کا جھگڑا ہو رہا تھا ذکیہ اسی پر چڑھی بیٹھی تھی۔ ذکیہ پہلے تو ان دونوں کا جھگڑا سنتی رہی۔ پھر جب ماسی کا شوہر ناراض ہو کے جا تو وہ دھم
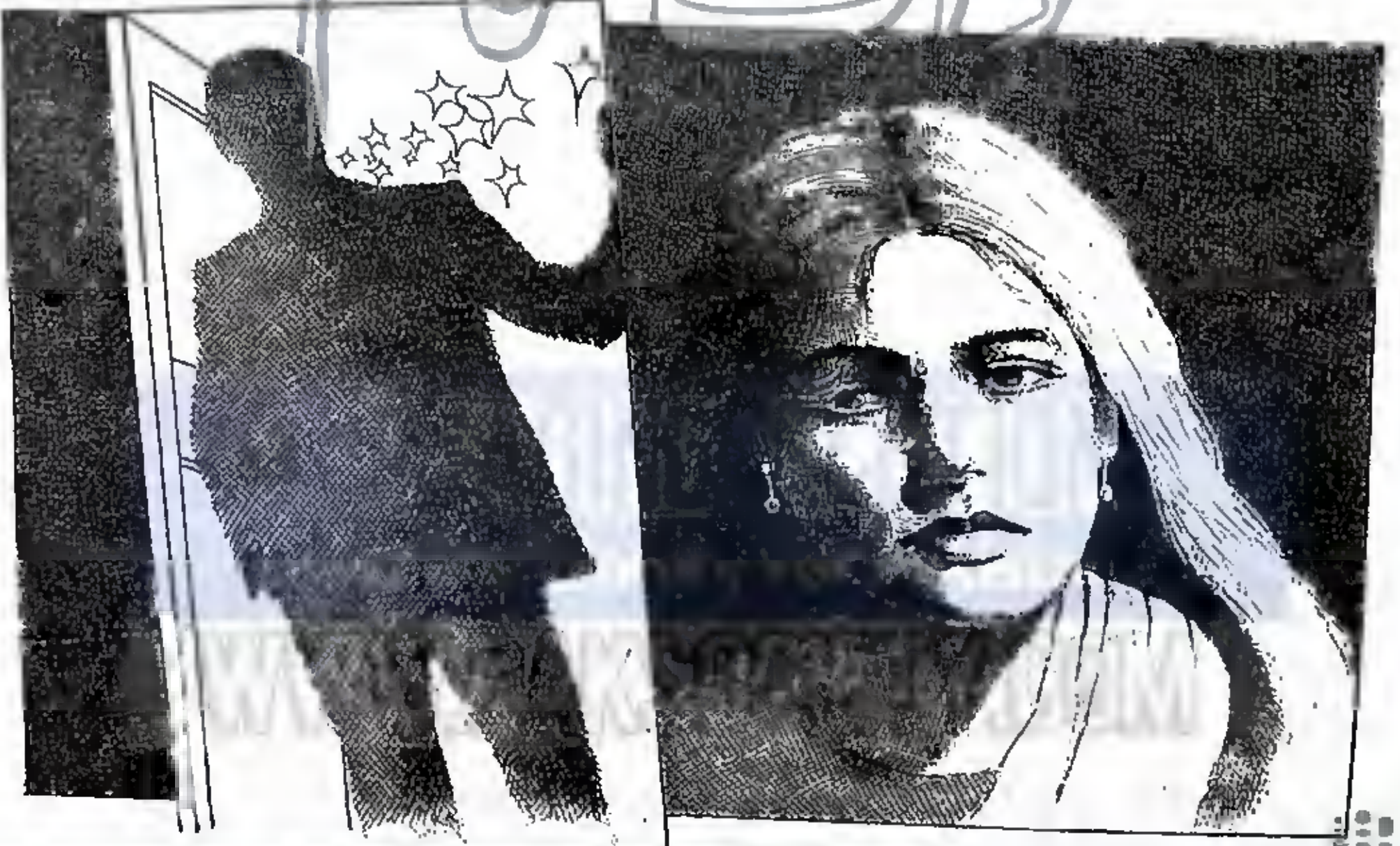
سے نیچے کودی اور ماسی کو دیکھ کر ہانک لگائی۔ ’’ہور رنگ لتھ گیا ململ توں۔ رس رس پینداوے میرا ڈھولا دے گل گل توں‘‘ (ململ سے رنگ اتر گیا اور میرا محبوب بات بات پر روٹھ جاتا ہے۔)

ماسی نے بھنا کر اسے مارنے کو جوتی اتاری تو ذکیہ چھلانگیں مارتی ہوئی یہ جا وہ جا!

وہاں سے بھاگ کر وہ شاہین کے پاس پہنچی وہ اس کی واحد سہیلی تھی جو اسی کی طرح سارا دن کدکڑے لگاتی پھرتی تھی مگر وہ پھر بھی گھر کا تھوڑا بہت کام کر لیتی تھی۔ ذکیہ کو تو قسم تھا کوئی کام کرنا! شاہین اس وقت رومال کاڑھنے میں مگن تھی اس لیے ذکیہ پر اس نے زیادہ توجہ نہیں دی اور اپنے کام میں مصروف رہی۔ یہ دیکھ کر ذکیہ نے کہا۔ ’’شاہین دیکھ تیری بکریاں گنجے کے کھیت میں جارہی ہیں۔ ابھی آجائے گا وہ۔‘‘ یہ سن کر شاہین نے رومال ایک طرف پھینکا اور گنجے کے کھیت کی طرف بھاگی۔

شاہین کو بھاگتے دیکھ کر اس نے اپنی ہی دھن میں ہانک لگائی۔ ’’انجن دے دے دھوں ماہیا، میں اک بت بجاں، روح میری دے توں ماہیا‘‘ ذکیہ اپنی دھن میں گائے جارہی تھی۔ اسے احساس بھی نہ ہو سکا کہ گنجا کب آ کر اس کے پیچھے کھڑا ہو گیا۔ وہ ماہیا سن کر خواہ مخواہ شرمانے لگا۔ ذکیہ گاتے گاتے گھومی تو گنجے کو شرماتے دیکھ کر بے اختیار ہنسنے لگی اور بولی۔ ’’گنجے! تیری منگیتر نہر پر کپڑے دھونے آئی تھی، باتوں ہی باتوں میں وہ تجھے بھائی جان کہہ بیٹھی۔ اب کیا ہوگا؟‘‘ ذکیہ کے لہجے میں شرارت تھی۔

گنجا بے چارہ سیدھا سادہ آدمی تھا۔ نام تو اس کا غلام حسین تھا مگر بدقسمتی سے ایک دفعہ وہ گنجا ہو گیا تھا جبھی سے ذکیہ نے اسے گنجا کہنا شروع کر دیا تھا۔ وہ اتنا بے وقوف تھا کہ محض اس شبہے میں کئی منگنیاں توڑ چکا تھا کہ اس کی جن لڑکیوں سے منگنی ہوئی تھی انہوں نے اسے بھائی کہہ دیا تھا۔ یہ اطلاع ہمیشہ اسے ذکیہ ہی دیتی تھی کہ تیری منگیتر نے فلاں وقت تجھے بھائی کہا تھا۔

اس وقت بھی ذکیہ کی زبان سے یہ سن کر کہ اس کی منگیتر نے اسے بھائی کہا گنجا تیز تیز قدم رکھتا ہوا اپنے گھر کی طرف بڑھ گیا۔

گاؤں کا ہر شخص ذکیہ کی شرارتوں کا نشانہ بنتا رہتا تھا۔ وہ اپنے بہن بھائیوں میں سب سے چھوٹی تھی اس لیے گھر بھر کی لاڈلی تھی۔ اس کے سب بہن بھائیوں کی شادی ہو چکی تھی۔ بہنیں اپنے گھر کی ہو چکی تھیں۔ گھر کے کاموں کی ذمہ دار اس کی بھابیاں تھیں۔ اس لیے وہ دن دن بھر گھومتی پھرتی تھی۔ وہ مویشیوں کو چرانے کے بہانے صبح گھر سے نکلتی اور شام کو لوٹتی۔ اس پر کوئی روک ٹوک نہیں تھی۔ اس کے بھائیوں کی وجہ سے گاؤں والے اس کا خیال رکھتے تھے۔ اب تو وہ اس کی شرارتوں کے عادی بھی ہو چکے تھے۔ وقت بے وقت گیت گانا، شرارتیں کر کے لوگوں کا ناک میں دم کرنا اور واہی تباہی گھومنا اس کے محبوب مشغلے تھے۔

گاؤں میں کسی کی شادی ہوتی، ذکیہ پیش پیش! عقیقہ ہو تو ذکیہ ہی سب سے آگے، دو عورتیں لڑ رہی ہوں تو جلتی پر تیل کا کام کرنے کے لیے ذکیہ موجود! وہ گانے بیٹھتی تو یوں لگتا ڈھولک اس کے اشاروں پر تال دے رہی ہو، آواز اتنی خوب صورت کہ راہ چلتے اسے سننے کے لیے رک جاتے۔ ناچ رہی ہوتی تو لڑکیاں تو لڑکیاں اچھی خاصی عمر دراز عورتوں کو اپنے تن بدن کا ہوش نہ رہتا، جتنی اس کی آواز خوب صورت تھی اس سے کہیں زیادہ وہ خود حسین تھی۔ بڑی بڑی، خوب صورت روشن آنکھیں، لمبے گھنے سیاہ بال، سرخ و سفید رنگت، متناسب جسم اور بوٹا سا قد، جو بھی اسے دیکھتا، دل تھام کے رہ جاتا۔ گاؤں کے بہت سے نوجوان اس کے امیدوار تھے مگر اس نے اب تک کسی کو گھاس نہ ڈالی تھی۔ اب تک وہ اپنے خوابوں کے شہزادے کی تلاش میں سرگرداں تھی۔

ذکیہ کو گورا رنگ بہت پسند تھا اور وہ چاہتی تھی کہ جو شخص بھی زندگی کا ہم سفر بنے اس کی رنگت سفید ہو۔ گوری رنگت ہی کی وجہ سے شاہین اس کی سہیلی تھی، ورنہ اس کے نین نقش تو بہت معمولی سے تھے۔

انہی دنوں گاؤں میں جمیل خان کی آمد کا غلغلہ بلند ہوا۔ وہ بہت چھوٹا سا تھا تو اس کے والد کا انتقال ہو گیا تھا۔ اس کے ماموں ان دنوں لندن میں تھے، انہوں نے جمیل کو بھی لندن بلا لیا۔ اس وقت اس کی عمر بمشکل سات برس تھی۔ اب وہی جمیل ایک طویل عرصے کے بعد وطن لوٹ رہا تھا۔ اس کے ایک دوست نے گاؤں میں اس کے لیے جدید طرز کی کوٹھی بنوانا شروع کر دی تھی۔ راج مزدور دن رات کام کر رہے تھے۔ جمیل نے وہ کوٹھی بالکل یورپین طرز پر بنوائی تھی۔

وہاں جانے کے بعد جمیل ایک مرتبہ بھی گاؤں نہیں آیا تھا۔ وہ لندن سے کئی دفعہ پاکستان آچکا تھا مگر وہ اپنے گاؤں

کی بجائے ایبٹ آباد جاتا تھا جہاں اس کے ماموں کا خاندان تھا اور ماں تھی۔

یہ کوٹھی وہ شوق میں کم اور ماں کی خواہش پر زیادہ بنوا رہا تھا۔ اس کی ماں چاہتی تھی کہ ذرا ڈھنگ کا مکان ہو تو جمیل کی شادی کردی جائے۔ اس کی خواہش تھی کہ جمیل کی شادی گاؤں کی ہی کسی لڑکی سے کی جائے کیوں کہ خاندان میں کوئی ایسی لڑکی نہ تھی جس سے اس کی شادی کی جاسکتی۔ خاندان کی لڑکیاں یا تو شادی شدہ تھیں یا پھر ان کی منگنی ہو چکی تھی۔ جمیل بھی گاؤں میں ہی شادی کرنا چاہتا تھا۔ اس کی کوٹھی اب قریب قریب مکمل تھی اور لوگ جمیل کی آمد کے منتظر تھے۔ انہیں تجسس تھا کہ اتنے برس ولایت میں گزارنے کے بعد جمیل کے انداز میں کس حد تک تبدیلیاں واقع ہوئی ہوں گی۔ بعض تو دبی دبی زبان میں یہ بھی کہہ رہے تھے کہ ممکن ہے اس نے وہاں کسی فرنگن سے شادی کرلی ہو اور اسی کے لیے اتنی شاندار کوٹھی بنا رہا ہو، کوئی کہتا تھا کہ وہ انتہائی شریف لڑکا تھا۔ وہ ایسی حرکت نہیں کرے گا جس سے اس کی ماں کی دل آزاری ہو، غرض جتنے منہ اتنی ہی باتیں ہو رہی تھیں۔

پھر ایک صبح گاؤں میں یہ خبر گردش کر رہی تھی کہ جمیل آج سہ پہر کے وقت گاؤں پہنچ رہا ہے۔ وہ پاکستان آچکا ہے اور آج کل ایبٹ آباد میں ہے۔

شام کو قریباً چار بجے جمیل اپنی ماں کے ہمراہ گاؤں پہنچ گیا۔ گاؤں والے اس کے ٹھاٹ دیکھ کر حیرت زدہ رہ گئے۔ وہ ایک چمچماتی ہوئی جدید ماڈل کی کار میں گاؤں آیا تھا۔ اس کے ساتھ اس کی ماں اور ایک ملازم اور دو ماموں زاد بھی تھے۔ جمیل کو گاؤں والے حیرت اور فخر سے دیکھ رہے تھے۔ اس نے بہترین تراش کا قیمتی سفاری سوٹ پہن رکھا تھا، ہونٹوں میں خوب صورت سا پائپ دبا ہوا تھا اور اس پُروقار شخصیت میں سب سے زیادہ نمایاں اس کی سیاہ، بڑی بڑی ذہین آنکھیں تھیں۔ گاؤں والوں نے والہانہ انداز میں ان لوگوں کا خیر مقدم کیا اور انہیں چوہدری خان محمد کے گھر کی طرف لے چلے۔ چوہدری خود بھی وہاں موجود تھا اور اس نے پیشکش کی تھی کہ جب تک جمیل کا بنگلا مکمل نہیں ہو جاتا، یہ میرا مہمان رہے گا۔

اس دن ذکیہ کی طبیعت خراب تھی اس لیے وہ گھر سے باہر نہ نکل سکی۔ بخار بہت شدید تھا اور سر میں بھی درد تھا، ورنہ ذکیہ ایسے موقع پر پیچھے رہنے والی کب تھی۔ شام کو شاہین سے اس نے سب سے پہلا سوال یہی کیا۔ ''شاہین تو نے دیکھا جمیل کو؟''

''میں نے دیکھا تو ہے مگر مجھے پتا نہ چل سکا کہ ان میں سے جمیل کون سا ہے۔ گاڑی میں سے دو تین مرد ایک ساتھ اترے تھے۔ سبھی خوب بنے ٹھنے تھے۔'' پھر وہ چونک کر بولی۔ ''مگر تو یہ سب کیوں پوچھ رہی ہے، خیر تو ہے۔''

''کچھ نہیں بس ویسے ہی پوچھ رہی تھی۔'' ذکیہ نے جلدی سے کہا۔

گاؤں کے ہر فرد کی زبان پر جمیل کی تعریف تھی۔ ہر شخص اس کے خلوص اور محبت کے گن گا رہا تھا، ہر شخص اس کی دولت سے مرعوب تھا۔ ذکیہ کے دل میں بھی یہ خواہش انگڑائیاں لے رہی تھی کہ وہ بھی ایک نظر جمیل کو دیکھ لے مگر اسے معلوم ہوا کہ گاؤں میں ایک دن رہ کر وہ واپس ایبٹ آباد چلا گیا ہے کیوں کہ اس کی چھٹی ختم ہوگئی تھی اور اب وہ اگلے سال پاکستان آئے گا۔ پھر جمیل کی ماں نے اس کے لیے لڑکی کی تلاش شروع کردی۔ انہوں نے گاؤں کی ہر لڑکی کو غور سے دیکھا مگر کوئی لڑکی انہیں پسند نہ آسکی۔ ایک دن وہ گھومتی ہوئی اس طرف جا نکلیں جہاں گاؤں کی لڑکیاں پانی بھر رہی تھیں۔ وہاں گاؤں کی تقریباً ساری ہی لڑکیاں موجود تھیں۔ وہ ایک ایک لڑکی کو غور سے دیکھ رہی تھیں۔ ذکیہ کو دیکھ کر وہ چونک اٹھیں اور منہ ہی منہ میں بڑبڑائیں۔ ''لو بھلا میں بھی کتنی پاگل ہوں ذکیہ گاؤں میں موجود ہے اور لڑکی کی تلاش میں ماری ماری پھر رہی ہوں۔''

لڑکیاں جمیل کی ماں کی موجودگی سے بے خبر آپس میں ہنسی مذاق کر رہی تھیں۔ کسی لڑکی نے ذکیہ سے گانے کی فرمائش کردی۔ پھر تو سب لڑکیاں اس کے پیچھے ہی پڑ گئیں کہ ہمیں گانا سناؤ۔ کسی نے پانی بھرنے کا ڈول بھی ذکیہ کو تھما دیا۔ وہ ہر طرف سے مجبور ہوگئی تو ڈول بجا بجا کر اپنی خوب صورت آواز میں گانے لگی۔

''چٹے چناں چاندنی وے، اے فصلاں بکیاں نیں،
اساں تیریاں راہواں تکیاں نیں۔''

جمیل کی ماں گانا سن رہی تھی اور خوش ہو رہی تھی۔ تھوڑی دیر بعد سب لڑکیاں وہاں سے چلی گئیں تو جمیل کی ماں بھی اٹھی۔ انہوں نے دل ہی میں فیصلہ کرلیا کہ میری بہو ذکیہ ہی بنے گی۔

دوسرے دن گاؤں کے ہر آدمی نے یہ خبر حیرت سے سنی کہ جمیل کی ماں نے ذکیہ کو جمیل کے لیے مانگ لیا ہے۔ گاؤں کی ہر لڑکی ذکیہ کی قسمت پر رشک کر رہی تھی۔ بلکہ کئی

لڑکیاں تو حسد کی آگ میں جلی مری تھیں اور ایک دوسرے سے کہہ رہی تھیں بھلا اس ذکیہ میں ایسی کیا خاص بات ہے جو جمیل کی ماں نے اسے پسند کرلیا؟

ذکیہ تو خوشی سے دیوانی ہوئی پھر رہی تھی۔ ان دنوں اس کی شوخیاں اور شرارتیں کچھ زیادہ ہی ہوگئی تھیں۔ گنجے نے تو اس کے پاس سے گزرنا بھی چھوڑ دیا تھا۔ کیوں کہ ذکیہ کے مذاق کا نشانہ سب سے زیادہ گنجا ہی بنتا تھا۔ شاہین اکثر ذکیہ کو سمجھاتی۔ ''ذکیہ! اب تو یہ بچکانہ حرکتیں چھوڑ دے تیری ساس یہ دیکھ کر منگنی توڑ دے تو؟''

''توڑنی ہے تو توڑ دے۔'' ذکیہ بے نیازی سے جواب دیتی۔ ''میں نے اس کی خوشامد نہیں کی تھی کہ اپنے بیٹے کی شادی مجھ سے ہی کرے۔'' یہ جواب سن کر شاہین خاموش ہو جاتی۔

جمیل کی ماں نے جمیل کو لکھ دیا کہ میں نے تمہارے لیے لڑکی ڈھونڈ لی ہے۔ اب جلد از جلد چھٹی لے کر آجاؤ تاکہ تمہاری شادی ہو سکے۔ خط کے جواب کے ساتھ جمیل نے ڈھیر دل چیزیں وہاں سے بھیج دیں اور لکھا کہ آپ کی پسند میری پسند ہے۔ میں جلد از جلد آنے کی کوشش کروں گا۔ آپ شادی کی تیاریاں کریں اور جتنی رقم کی بھی ضرورت ہو مجھے لکھ دیں۔

جمیل کا جواب ملتے ہی دونوں گھر دن میں زور و شور سے شادی کی تیاریاں شروع ہوگئیں۔ ذکیہ کے گھر سے رات گئے تک ڈھولک، گیتوں کی آوازیں بلند ہوتی رہتیں۔ جمیل کے گھر میں بھی ان دنوں خوب چہل پہل تھی۔ اس کی ماموں زاد اپنی بہت سی سہیلیوں سمیت ایبٹ آباد سے آگئی تھیں اس لیے وہاں ہر وقت ہلا گلا رہتا تھا۔

شادی کی تاریخ طے ہوتے ہی جمیل کی ماں نے لکھ دیا کہ تمہاری شادی کی تاریخ بھی طے ہوگئی ہے۔ اب جتنی جلدی ممکن ہو پاکستان آجاؤ۔ شادی سے تین دن پہلے جمیل بھی گاؤں پہنچ گیا۔ وہ دلہن کے لیے ایسے ایسے کپڑے اور ایسا قیمتی سامان لایا تھا کہ گاؤں بھر میں اسی کا چرچا تھا۔ عورتیں اٹھتے بیٹھتے اس کے لائے ہوئے سامان کی تعریف کررہی تھیں۔

مہندی والے دن جمیل کی کوٹھی بقعۂ نور بنی ہوئی تھی۔ گاؤں کے کسی گھر میں بجلی نہیں تھی مگر جمیل نے جنریٹر کے ذریعے اپنی کوٹھی کے ایک ایک کونے کو روشن کردیا تھا۔ دلہن کی طرف سے لڑکیاں مہندی لے کر پہنچیں تو کوٹھی کی اندرونی سجاوٹ اور آرائش کو دیکھ کر دنگ رہ گئیں۔ شاہین ان سب میں پیش پیش تھی کیوں کہ وہ ذکیہ کی بہت خاص سہیلی تھی۔ مہندی لگانے جب دولہا کے پاس پہنچی تو ایک لمحے کو سن ہو کر رہ گئی۔ یوں تو جمیل ہر لحاظ سے مردانہ وجاہت کا نمونہ تھا مگر اس کا رنگ سانولا تھا، وہ جانتی تھی کہ گورا رنگ ذکیہ کی کمزوری ہے اور سانولے رنگ سے اسے چڑ ہے۔ کہیں وہ محض سانولے رنگ کی بنیاد پر جمیل سے بددل نہ ہو جائے۔ یہی سوچتے ہوئے اس نے مہندی لگائی اور خاموشی سے لڑکیوں میں آبیٹھی۔ دونوں طرف کی لڑکیاں ایک دوسرے کو نیچا دکھانے کے لیے زور و شور سے گا رہی تھیں مگر شاہین اس شور شرابے سے بے نیاز یہ سوچ رہی تھی کہ جب ذکیہ کو اس کا آئیڈیل نہیں ملے گا تو اس کا کیا ردعمل ہوگا۔

وہاں سے واپسی پر بھی وہ خاموش خاموش تھی۔ ذکیہ اس کی خاموشی بھانپ گئی اور اس سے پوچھا۔ ''کیا بات ہے شاہین کیا دولہا پسند نہیں آیا۔''

''دولہا تو اتنا اچھا ہے کہ تو دیکھے گی تو پاگل ہی ہو جائے گی۔'' شاہین نے سنبھل کر کہا۔ وہ حقیقت بتا کر ذکیہ کو اداس نہیں کرنا چاہتی تھی۔ پھر ذکیہ سے کچھ بعید بھی نہیں تھی کہ وہ عین موقع پر انکار کردیتی۔

بالآخر ذکیہ رخصت ہو کر جمیل کی شاندار کوٹھی میں آگئی۔ اسے ایک آراستہ کمرے میں بٹھا کر لڑکیاں آہستہ آہستہ باہر کھسک گئیں۔ اس نے سرسری طور پر کمرے کا جائزہ لیا۔ فرش پر خوب صورت قالین بچھا ہوا تھا دیواروں پر فریم کی ہوئی تصویریں تھیں اور جس پلنگ پر وہ بیٹھی تھی اس کا گدا اتنا نرم تھا کہ وہ اس میں دھنسی جارہی تھی۔ ابھی وہ کمرے کا جائزہ لے ہی رہی تھی کہ جمیل کمرے میں داخل ہوا۔ اس نے جلدی سے سر جھکا کر گھونگھٹ نکال لیا مگر کن انکھیوں سے جمیل کو دیکھتی رہی ابھی تک جمیل کے چہرے پر اس کی نظر نہیں پڑی تھی۔

جمیل نے اس کا گھونگھٹ الٹا تو اس نے شرماتے ہوئے آنکھیں کھول دیں۔ اس کا چہرہ دیکھ کر وہ سناٹے میں رہ گئی۔ اسے اپنے خواب ریزہ ریزہ ہوتے محسوس ہوئے۔ جمیل انتہائی پُرکشش تھا مگر زیرو پاور کے بلب کی روشنی میں ذکیہ کو اس کا سانولا رنگ بھی سیاہ نظر آیا۔ اس کا دل بجھ کر رہ گیا۔ اس نے تو بچپن سے گورے چٹے رنگ کے خواب دیکھے تھے۔ اس کا دل چاہا کہ چیخ چیخ کر روئے اور اسی وقت اپنے گھر چلی جائے مگر پھر خاندان کی عزت اور بھائیوں کا

خوف آڑے آ گیا اور وہ اپنی قسمت پر شاکر ہو کے بیٹھ رہی۔

اگلے روز اس نے دن کے اجالے میں جمیل کو دیکھا۔ وہ اتنا کالا بھی نہیں تھا جتنا وہ سمجھ رہی تھی۔ بس ذکیہ کے سرخ و سفید رنگ سے اس کا رنگ کچھ دبتا ہوا تھا۔ ذکیہ نے غور سے اسے دیکھا۔ دراز قد، کسرتی جسم، بڑی بڑی ذہین آنکھوں اور کشادہ پیشانی والا جمیل اسے اچھا لگا اور اس نے خود پر لعنت ملامت کی کہ رات خوا مخواہ اتنے خوبرو اور دلکش آدمی کو ناپسند کر رہی تھی۔

پھر وہ دونوں ہنی مون منانے سوات، کاغان اور ناران چلے گئے۔ جمیل اس دفعہ کچھ زیادہ چھٹی لے کر آیا تھا۔ اسے بھی ذکیہ بے انتہا پسند آئی تھی اور اس نے ذکیہ سے وعدہ کیا تھا کہ اگر حالات نے اجازت دی تو لندن جاتے ہی تمہیں بھی بلوا لوں گا۔ ایک مہینا پلک جھپکتے گزر گیا اور وہ لوگ گھوم پھر کر گاؤں لوٹ آئے۔

جمیل کی ماں بھی بہت خوش تھی۔ ایک تو انہیں من پسند بہو ملی تھی دوسرے یہ کہ ان کا بیٹا بھی اس شادی سے خوش تھا۔ سب سے زیادہ خوشی شاہین کو تھی۔ اس کے سب اندیشے غلط ثابت ہوئے تھے۔ ذکیہ نے جمیل کے سانولے رنگ کو بالکل مسئلہ نہیں بنایا تھا۔

ذکیہ یوں بھی ہر وقت بنی سنوری رہنے کی شوقین تھی۔ شادی کے بعد تو اسے اور بھی چھوٹ مل گئی کیوں کہ اس معاملے میں نہ تو جمیل ہی اسے ٹوکتا تھا اور نہ اس کی ماں۔ ذکیہ خوب بھڑک دار، قیمتی اور جدید فیشن کے سلے ہوئے کپڑے پہنتی اور خوشبو تو اس فراخ دلی سے لگاتی کہ جس راستے سے گزر جاتی وہ رستہ معطر ہو جاتا۔ اس راستے سے گزرنے والے سمجھ جاتے کہ ابھی ابھی یہاں سے ذکیہ گزری ہے۔ جمیل کی موجودگی میں بھی وہ اکثر باہر گھومتی رہتی۔ ایسا لگتا تھا جیسے اسے جمیل کی ذرا برابر بھی پروا نہ ہو اور وہ کچھ ایسی سلجھی ہوئی طبیعت کا مالک تھا کہ اس نے ذکیہ پر کوئی روک ٹوک نہیں لگائی۔

پھر جمیل کی چھٹی ختم ہو گئی اور جانے کی تیاریاں کرنے لگا۔ اسے ذکیہ سے بچھڑنے کا بہت افسوس تھا مگر ذکیہ کو اس بات کی بالکل فکر نہیں تھی۔ شاہین کا یہ خیال غلط ثابت ہوا کہ ذکیہ نے ذہنی طور پر جمیل کی سانولی رنگت کو قبول کر لیا ہے۔ اس نے صرف جمیل کی دولت اور اس کی لائی ہوئی قیمتی چیزوں کی بدولت اسے قبول کیا تھا۔ جمیل نے اسے ہر چیز کے استعمال کا طریقہ سکھا دیا۔ اسے پہننے اوڑھنے کا سلیقہ آ گیا۔ اسے دیکھ کر اب کوئی یہ نہیں کہہ سکتا تھا کہ وہ محض گاؤں کی اَن پڑھ لڑکی ہے۔ ساری زندگی یورپ میں گزارنے کے بعد جمیل نے گاؤں کی گنوار اور اَن پڑھ لڑکی سے شادی کی تھی۔ اسے بھی چاہیے تھا کہ وہ جمیل کی محبت کا جواب گرمجوشی سے دیتی مگر وہ تو ابھی تک سفید چمڑی والے آئیڈیل کے چکر میں تھی۔

جمیل نے روانہ ہوتے وقت ذکیہ سے کہا۔ ”اپنی عزت اور وقار کا بھرم رکھنا، میں تمہیں کہیں آنے جانے سے نہیں روکوں گا مگر ایک بات ہمیشہ یاد رکھنا تم میری عزت ہو۔“

ذکیہ نے جمیل سے وعدہ کیا کہ میں تمہاری عزت پر کبھی آنچ نہیں آنے دوں گی۔

جمیل کے جانے کے بعد تو وہ بالکل آزاد ہو گئی۔ وہ ہمیشہ شہر سے جدید تراش کے کپڑے سلواتی، گاؤں میں شادی بیاہ یا کوئی دوسری تقریب ہوتی تو ذکیہ کی سج دھج دیکھنے سے تعلق رکھتی تھی۔ وہ قیمتی زیورات سے لدی ہوئی، بھڑک دار کپڑے پہن کر محلے کی کسی بھی تقریب میں اس شان سے شریک ہوتی کہ لڑکیاں اور عورتیں اسے حسرت بھری نگاہوں سے دیکھتیں۔

ذکیہ کی ساس پنج وقتہ کی نماز پابندی سے پڑھتیں اور اکثر اسے بھی نماز پڑھنے کی تلقین کرتی رہتیں۔ ذکیہ کی ساس نے ایک دو دفعہ ذکیہ سے کہا بھی کہ بہو زیادہ بن سنور کر مت گھوما کرو اس پر ذکیہ نے انہیں وہ سنائی کہ بے چاری اپنا سا منہ لے کر رہ گئیں۔ یونہی دن گزرتے رہے اور ذکیہ ایک دن ایک خوب صورت سے گول مٹول بچے کی ماں بن گئی۔ اس کی بے حسی کی انتہا تو یہ تھی کہ اس نے دو تین گھنٹے تک اپنے جگر گوشے کو اس خوف سے نہ دیکھا کہ کہیں وہ بھی اپنے باپ کی طرح گندی نہ ہو۔ شاہین نے اس حرکت پر اسے خوب برا بھلا کہا اور بتایا کہ تیرا بچہ رنگت میں بالکل تجھ پر گیا ہے۔ ویسی ہی سرخ و سفید رنگت، بڑی بڑی خوب صورت آنکھیں اور بھورے بال اور اگر یہ سب بھی نہ ہوتا تو وہ بہر حال ہے تو تیری اولاد ہی نا۔ جانور بھی اپنی اولاد سے بے پناہ محبت کرتے ہیں، تُو تو پھر انسان ہے۔ جمیل کی فرمائش پر دادی نے پوتے کا نام ثاقب رکھا تھا۔

ثاقب جب بھوک سے بلک کر رویا تو ذکیہ کا دل پسیج گیا اور اس نے جھپٹ کر پہلو میں لیٹے ہوئے ثاقب کو اپنے سینے سے چمٹا لیا۔ وہ یہ دیکھ کر حیران رہ گئی کہ اس کا بیٹا سرخ،

سفید اور انتہائی خوب صورت تھا۔
جمیل کو بیٹے کی پیدائش کی اطلاع ملی تو وہ سب کام چھوڑ کر پاکستان دوڑا آیا۔ بیٹے کو پا کر وہ انتہائی خوش تھا۔ اب اس کے دل میں ذکیہ کی محبت بھی پہلے سے کئی گنا بڑھ گئی تھی۔ وہ ثاقب کے لیے ڈھیروں کھلونے اور کپڑے لایا تھا۔ یہاں آ کر سب سے پہلا کام اس نے یہ کیا کہ بینک میں ثاقب کا اکاؤنٹ کھول دیا۔ پندرہ دن گاؤں میں گزارنے کے بعد جمیل واپس چلا گیا۔ جاتے جاتے اس نے ذکیہ سے کہا۔ ''میں وہاں مکان ڈھونڈنے کی سرتوڑ کوشش کر رہا ہوں مگر ابھی تک مکان نہیں مل سکا ہے۔ جیسے ہی مکان مل گیا میں تمہیں اور ثاقب کو بلوا لوں گا۔''

اسی طرح ایک سال اور بیت گیا۔ ثاقب اب سارے گھر میں دوڑتا پھرتا تھا۔ اسی دوران میں شاہین کی شادی ہو گئی۔ اس کی شادی گاؤں ہی میں ہوئی تھی۔ اس لیے وہ اب بھی تقریباً روزانہ ہی ذکیہ کے گھر آ جاتی تھی۔ ذکیہ کا آنا جانا شاہین کے گھر ان دنوں اس لیے بھی بڑھا ہوا تھا کہ اس کی چھوٹی بہن نسرین کی شادی ہو رہی تھی۔ شادی والے دن اس نے بطور خاص اہتمام کیا تھا کہ وہ شاہین کی قریبی سہیلی تھی پھر یہ کہ ذکیہ تو ایسے موقعوں کی تلاش میں رہتی تھی کہ کبھی ایسی کوئی تقریب ہو اور وہ اپنے زیورات، فیشن ایبل کپڑوں اور اعلیٰ ولایتی خوشبوؤں کا استعمال کرے۔

اس دن نسرین کی برات تھی۔ وہ بڑا سا زرق برق دوپٹا سنبھالتی ہوئی شاہین کے گھر میں داخل ہو رہی تھی۔ ثاقب اس سے چند قدم آگے چل رہا تھا۔ اچانک فضا گھوڑے کی ٹاپوں سے گونج اٹھی۔ دور سے ایک گھوڑا سرپٹ دوڑتا ہوا اسی کی جانب چلا آ رہا تھا۔ ذکیہ کو اپنی تو فکر نہیں تھی مگر اسے ننھے ثاقب کا خیال تھا۔ اس نے جھپٹ کر ثاقب کو اپنی گود میں اٹھا لیا۔

وہ سوار اچانک اس کے سامنے آ کر رک گیا۔ ذکیہ گھوڑے کی رفتار دیکھ کر فوراً سہم گئی تھی۔ گھڑ سوار گھوڑے سے نیچے اترا تو مٹی اور دھول میں اٹے ہوئے ہونے کے باوجود اس کے چہرے پر مردانہ وجاہت تھی۔ سرخ و سفید رنگت تھی۔ وہ شاہین کی والدہ کے رشتے داروں میں سے تھا اور اپنے گاؤں سے گھوڑے پر شادی میں شرکت کرنے آیا تھا۔ اس کا نام ولدار خان تھا اور وہ کوئی اچھا آدمی نہیں تھا۔
ذکیہ نے اسے دیکھا تو مبہوت ہو گئی۔ وہ شخص بالکل ویسا ہی تھا جیسی تصویر ذکیہ نے اپنے دل میں بسا رکھی تھی۔ اس کی سرخ و سفید رنگت دیکھ کر اس کا دل بے قابو ہوا جا رہا تھا اور اس لمحے وہ بھی یہ بھلا بیٹھی تھی کہ وہ جمیل کی عزت اور ایک بچے کی ماں ہے۔

اس وقت شاہین کسی کام سے باہر نکلی اور ذکیہ کو دیکھ کر اسے اپنے ہمراہ اندر لے گئی۔ ولدار خان بغور ذکیہ کی طرف دیکھتا ہوا اپنا گھوڑا باندھنے چلا گیا۔ وہ انتہائی آوارہ اور بدچلن شخص تھا اور اس کی دوستی بھی اپنے ہی جیسے بدمعاش لوگوں سے تھی۔ اس نے اپنی مردانہ وجاہت کی بدولت بہت سی لڑکیوں کو محبت کا جھانسا دے کر بے وقوف بنایا تھا۔ اس نے شاہین پر بھی ڈورے ڈالنا چاہے تھے مگر وہ صاف بچ گئی تھی ذکیہ کو دیکھا تو اس پر بھی ہاتھ صاف کرنے کا سوچ لیا۔

ذکیہ اپنے ذہن سے ولدار خان کا خیال جھٹک کر شادی کے ہنگاموں میں گم ہو گئی۔ لڑکیوں نے حسب معمول اسے دیکھ کر ڈھولک تھما دی اور گانے کی فرمائش کی۔ ذکیہ نے ڈھولک سنبھالی اور ایسی سریلی آواز میں گانا شروع کیا کہ سننے والیاں دم بخود رہ گئیں۔ ذکیہ خود بھی دنیا و مافیہا سے بے خبر آنکھیں موندے گا رہی تھی۔ گاتے گاتے اس نے آنکھیں کھولیں تو سامنے اسے ولدار خان دکھائی دیا۔ وہ صحن کے باہر گلی میں کھڑا ہوا تھا مگر صحن کی کچی دیواریں اتنی نیچی تھیں کہ گلی میں کھڑا ہوا کوئی دراز قد باآسانی اندر دیکھ سکتا تھا۔

اس کے یوں والہانہ انداز میں گھورنے سے پہلے تو ذکیہ کو انجانی سی خوشی ہوئی مگر پھر فوراً ہی اسے اپنے معصوم بچے کا خیال آ گیا اور اس نے اپنا منہ پھیر لیا مگر اس کے دل میں اتھل پتھل جاری تھی۔ اس نے نہ چاہتے ہوئے بھی کئی بار کن انکھیوں سے ولدار خان کی طرف دیکھا۔
شاہین بہت دیر سے ذکیہ کے چہرے کے بدلتے ہوئے رنگ دیکھ رہی تھی۔ ایک دفعہ اس نے ذکیہ کی نظروں کے تعاقب میں دیکھا تو اسے ولدار خان ذکیہ کو گھورتا ہوا نظر آیا۔ وہ فوراً سب معاملہ سمجھ گئی۔ اسی وقت ثاقب نے پانی مانگ کر ذکیہ کی محویت کو توڑ دیا۔ وہ اسے پانی پلانے اٹھی تو شاہین بھی اس کے پیچھے آئی اور بولی۔ ''ذکیہ! ثاقب کو پانی پلا کر ذرا اندر کمرے میں آنا۔''
ذکیہ کمرے میں پہنچی تو شاہین کھڑکی سے باہر دیکھ رہی تھی۔ ذکیہ کی آہٹ سن کر اس نے گھوم کر پیچھے دیکھا۔ اس کا چہرہ اس وقت انتہائی سنجیدہ تھا۔ اس کا سنجیدہ اور اداس چہرہ

دیکھ کر ذکیہ بھی گھبرا گئی۔ ''کیا بات ہے شاہین! خیریت تو ہے؟''

''میں تم سے اتنا کہوں گی کہ تم اب نہ صرف جمیل کی عزت ہو بلکہ ایک بچے کی ماں بھی ہو۔ دلدار خان بہت برا آدمی ہے۔ اس نے گاؤں کی بہت سی لڑکیوں کو شادی کا فریب دے کر تباہ کیا ہے۔ میں جانتی ہوں کہ دلدار خان کا ظاہر بہت اجلا اور خوب صورت ہے مگر باطن اتنا ہی سیاہ اور مکروہ ہے۔''

''تمہیں غلط فہمی ہوئی ہے شاہین۔'' ذکیہ نے جواب دیا۔ ''اتنی پاگل میں بھی نہیں ہوں کہ میں ایسے محبت کرنے والے شوہر اور معصوم بیٹے کو چھوڑ دوں گی۔'' ذکیہ نے واقعی یہ بات خلوص سے کہی تھی اور اس نے دل میں عہد کرلیا تھا کہ آیندہ جمیل کے علاوہ کسی کی شکل بھی نہیں دیکھوں گی۔

''خدا کرے کہ یہ غلط فہمی ہی ہو۔'' شاہین نے کہا۔ ''مگر یہ یاد رکھنا یہ شخص دلدار خان اس سے پہلے دو بیویاں چھوڑ چکا ہے اور نہ جانے کتنی لڑکیوں کے مستقبل تاریک کر چکا ہے۔''

شادی کے دوران تمام وقت دلدار خان نے ذکیہ سے بات کرنے کی کوشش کی مگر ذکیہ نے اسے کوئی ایسا موقع ہی نہ دیا۔

پھر بات آئی گئی ہوگئی۔ دلدار خان اس کے بعد ذکیہ کو پھر کبھی دکھائی نہیں دیا۔

☆......☆

وہ ایک گرمیوں کی دوپہر تھی۔ ذکیہ نے اپنی ساس سے صبح ہی میکے جانے کی اجازت لے لی تھی مگر گھر کے کام کرتے ہوئے اسے دوپہر ہوگئی تھی۔ چلتے وقت اس کی ساس نے اسے ٹوکا بھی تھا کہ اس دوپہر میں کہاں جاؤ گی مگر ذکیہ نے اسے یہ کہہ کر مطمئن کردیا کہ ماں جی گرمی اتنی زیادہ نہیں اور پھر ماں کے گھر کا فاصلہ ہی یہاں سے کتنا ہے۔ یہ کہہ کر وہ ثاقب کو ساتھ لے کر اپنے میکے چل دی۔

گاؤں کے نکڑ پر پیپل کا وہ پرانا درخت تھا جس کی گھنی چھاؤں کے نیچے لوگوں نے ایک چبوترا سا بنایا ہوا تھا۔ اکثر راہ چلتے مسافر اور مویشی چرانے والے ستانے کے لیے اسی درخت کے نیچے آبیٹھتے تھے۔ ذکیہ نے دیکھا کہ اس درخت کے نیچے دلدار خان اپنے دوست فرید خان اور دوسرے بدمعاشوں کے ساتھ بیٹھا تھا۔ ذکیہ نے اسے اس وقت دیکھا جب وہ اس کے بالکل نزدیک پہنچ گئی۔ دلدار

احمد قریع

فلسطین کے وزیراعظم۔ ان کا شمار فلسطین کے اہم رہنماؤں میں ہوتا ہے۔ 94-1993ء میں فلسطینیوں اور اسرائیل کے مابین اوسلو (ناروے) میں جو معاہدۂ امن طے پایا تھا وہ بھی ان کی کوششوں کا نتیجہ تھا۔ وزارت عظمیٰ کا عہدہ سنبھالنے سے پہلے وہ فلسطین کونسل کے اسپیکر کے عہدے پر فائز تھے اور وہ فلسطین کی سب سے بڑی تنظیم الفتح کے ایک مرکزی رہنما کی حیثیت سے بھی تسلیم کیے جاتے ہیں۔

مرسلہ: ناصر حسین سواتی۔ کراچی

میاں محمد اظہر

پاکستان مسلم لیگ (ق) کے صدر اور سابق گورنر پنجاب اور لارڈ میئر لاہور میٹروپولیٹن کارپوریشن۔ تعلق لاہور کی آرائیں فیملی سے ہے۔ مسلم ماڈل ہائی اسکول لاہور سے میٹرک کیا اور پھر اسلامیہ کالج آف کامرس اور گورنمنٹ کالج لاہور میں تعلیم حاصل کی۔ پاکستان مسلم لیگ کے رکن ہونے کی حیثیت سے پنجاب مسلم لیگ کے صدر رہے پھر لاہور میٹروپولیٹن کارپوریشن کے کونسلر اور لارڈ میئر بھی رہے۔ 1988ء کے عام انتخابات میں لاہور سے قومی اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے۔ 6 اگست 1990ء تا 18 اپریل 1993ء پنجاب کے گورنر کی حیثیت سے خدمات انجام دیں۔ دسمبر 2000ء میں مسلم لیگ کے صدر میاں نواز شریف سعودی عرب چلے گئے تو انہوں نے مسلم لیگ ن سے ناطہ توڑلیا اور مسلم لیگ قائداعظم گروپ قائم کیا۔ مارچ 2001ء میں انہیں بلامقابلہ مسلم لیگ (ق) کا صدر منتخب کرلیا گیا۔ اگست 1999ء میں وہ پاکستان فٹ بال فیڈریشن کے صدر بنے۔ اکتوبر 2002ء کے قومی اسمبلی کے انتخابات میں شرق پور اور لاہور سے حصہ لیا مگر دونوں حلقوں سے انتخاب ہار گئے۔ 2002ء کے عام انتخابات کے بعد انہیں باوجود مسلم لیگ کے صدر کے اپنے عہدے سے مستعفی ہونا پڑا۔ 2004ء میں لاہور میں پاکستان نیشنل فورم کا قیام عمل میں آیا تو انہیں پنجاب کا کوآرڈی نیٹر مقرر کیا گیا۔

مرسلہ: اقرار الحسن سومرو۔ خیر پور میرس

خان نے اسے دیکھ کر اپنے دوست فرید کو اس دن والی باتیں بتائیں اور یہ بھی بتایا کہ شکار بھی جال میں پھنسنے کو بے تاب ہے۔ فرید خان تاسف کرتے ہوئے بولا یار تو نے سونے کی چڑیا ہاتھ سے نکال دی اگر تو ذرا سی محنت کرتا تو آج تیرے وارے نیارے ہوتے۔ ذکیہ کا شوہر ولایت میں ہے اس کے پاس لاکھوں روپیا ہوگا۔ خیر اب بھی کچھ نہیں بگڑا بس تو ذرا سی ہمت کرلے، باقی کام ہمارا ہے۔

یہ سن کر دلدار خان کو بھی جوش آگیا اور اس نے دوبارہ کوشش کرنے کی ہامی بھرلی۔

ذکیہ کے گھر سے تھوڑی ہی دور نوراں کا گھر تھا۔ نوراں بیوہ تھی اس لیے ذکیہ اس کی مالی امداد کرتی رہتی تھی مگر وہ انتہائی لالچی عورت تھی۔ دلدار خان نے چھان بین کی تو معلوم ہوا کہ ذکیہ اکثر نوراں کے گھر آتی رہتی ہے اور اس نے کسی نہ کسی طرح نوراں کو لالچ دے کر اپنے ساتھ ملالیا۔

ایک دن نوراں، ذکیہ کے گھر گئی اور اس سے پرانے کپڑے مانگے۔ ذکیہ اسے اکثر پرانے کپڑے بھی دیا کرتی تھی۔ کپڑے باندھنے کے دوران میں ذکیہ گنگنا بھی رہی تھی۔

”چٹا ککڑ بنیرے....“

اسی وقت شاہین وہاں آگئی اور ہنستے ہوئے بولی۔

”ذکیہ تیرے ذہن سے ابھی تک سفید رنگت کا نشہ اترا نہیں۔“

”یہ نشہ تو مشکل سے اترے گا شاہین۔“ ذکیہ ایک دم سنجیدہ ہوگئی۔ ”کاش میرے خواب بھی پورے ہو جاتے۔“

پھر وہ دونوں کھلکھلا کر ہنس دیں۔

”ہم بھی کیسے پاگل ہوتے تھے ذکیہ۔“ شاہین نے ہنستے ہوئے کہا۔ خاص طور پر تو تو سرخ و سفید رنگت کی بہت دیوانی تھی۔

یہ باتیں نوراں کی موجودگی ہی میں ہوئی تھیں اور وہ فوراً سمجھ گئی تھی کہ دلدار خان کو ذکیہ اتنی دلچسپی سے کیوں دیکھ رہی تھی۔ نوراں نے جاکر دلدار خان کو ایک ایک بات بتا دی یہ سن کر دلدار خان خوشی سے پھول گیا اور بار بار اپنی شکل آئینے میں دیکھنے لگا۔

فرید نے کہا۔ ”یار دلدار! تو چیز ہی ایسی ہے کہ لڑکیاں تجھے دیکھتے ہی دیوانی ہو جاتی ہیں۔“

پھر تو نوراں اکثر ذکیہ سے دلدار خان کی تعریفیں کرنے لگی۔ ایک دن ذکیہ جھنجلا کر کہنے لگی۔ ”کیا بات ہے نوراں! تو ہر وقت دلدار خان کی تعریفیں کیوں کرتی رہتی ہے؟ شاہین تو کہہ رہی تھی کہ وہ بہت برا آدمی ہے۔“

”توبہ کریں جی!“ نوراں نے کانوں کو ہاتھ لگا کر کہا۔ ”شاہین کے گھر والے کیسے نیک آدمی پر الزام لگا رہے ہیں۔ اصل بات یہ ہے جی کہ شاہین کے گھر والے اس کی شادی دلدار خان سے کرنا چاہتے تھے، شاہین خود بھی اس کے لیے دیوانی تھی مگر دلدار خان نے نہ جانے کہاں آپ کو دیکھ لیا تھا۔ وہ کہتا تھا کہ میں شادی کروں گا تو صرف ذکیہ سے ورنہ نہیں کروں گا۔ اس بات سے شاہین آپ سے حسد کرنے لگی اور آپ کے سامنے اس کی برائیاں کرتی ہے اور آپ پر تو ایسے ایسے الزام لگاتی ہے کہ بس میں کیا بتاؤں۔“

نوراں مکاری سے بولی۔ ”دلدار خان کے گھر والے تو شاہین کی جھوٹی سچی باتوں میں آگئے مگر دلدار خان نے اس کی کسی بات کا یقین نہ کیا۔ وہ تو اب بھی ہمیشہ آپ کی تعریفیں ہی کرتا ہے۔“

یہ سن کر ذکیہ کے دل میں شاہین کی طرف سے گرہ پڑ گئی اور اس نے سوچ لیا کہ اب میں شاہین کی کوئی بات نہیں مانوں گی۔

ماں جی ذکیہ کے آنے کے بعد گھر کو مکمل طور پر اس کے ہاتھوں میں دے چکی تھیں۔ انہیں گھر کے کسی کام سے کوئی مطلب نہیں تھا اور انہیں ذکیہ پر اس حد تک اعتماد تھا کہ وہ کئی کئی دن کے لیے اپنے بھائیوں کے پاس ایبٹ آباد چلی جاتی تھیں۔ روز روز جھوٹی سچی تعریفیں کر کے بالآخر نوراں ذکیہ کو اپنی راہ پر لگا ہی لائی اور اس نے اپنے گھر میں ان دونوں کی ملاقاتوں کا بندوبست بھی کروادیا۔ اس کے صلے میں وہ دلدار خان اور ذکیہ دونوں سے ہی بھاری رقم اینٹھتی تھی۔

ماں جی ایبٹ آباد چلی جاتیں تو ذکیہ کو مزید آزادی مل جاتی اور دلدار خان کو کھلے عام اپنے گھر میں بھی بلالیتی۔ ایسے میں نوراں نگرانی کرتی رہتی اور اگر کوئی بھی خلاف معمول باتیں دیکھتی تو ان دونوں کو مطلع کردیتی۔ پھر دلدار خان پچھلے دروازے سے نکل جاتا۔

ایک دفعہ حسبِ معمول ماں جی ایبٹ آباد گئی ہوئی تھیں۔ ذکیہ کے لیے میدان صاف تھا۔ اس نے فوراً نوراں کے ذریعے دلدار خان کو بلا بھیجا اور نوراں کوٹھی کے گیٹ پر بیٹھ کر نگرانی کرنے لگی۔ ذکیہ نے آزادی میں خلل نہ پڑنے کی وجہ سے نوراں کو معمول کے مطابق چوکیداری پر بٹھایا ہوا تھا۔ اچانک نوراں کی بڑی بیٹی حیران پریشان وہاں جا پہنچی

اور بولی ''اماں جلدی آؤ گھر میں سب لڑ جھگڑ رہے ہیں۔''

''کم بخت ایک منٹ سکون سے نہیں رہتے۔'' بچوں کو کوستی ہوئی وہ گھر کی طرف بھاگی۔

اسی وقت شاہین آگئی اور سیدھی اندر چلی گئی۔ ذکیہ اور ولدار کو ایک ساتھ بیٹھے دیکھ کر اس کا خون کھول گیا۔ اسے اچانک سامنے دیکھ کر ان دونوں کے چہروں پر ہوائیاں اڑنے لگیں۔ ولدار خان تیزی کے ساتھ باہر نکل گیا۔

''یہ بے غیرت نوراں نہ جانے کہاں مرگئی۔'' ذکیہ نے ڈھٹائی سے کہا۔

''بے غیرت وہ نہیں ہے تو ہے ذکیہ۔'' شاہین نے غصیلے لہجے میں کہا۔ ''مجھے آج معلوم ہوا کہ وہ کٹنی نوراں بھی تیرے ساتھ شریک ہے۔''

''زیادہ پارسا بننے کی ضرورت نہیں شاہین۔'' ذکیہ نے زہریلے لہجے میں کہا۔ ''میں جانتی ہوں کہ تو خود بھی ولدار خان کو پسند کرتی تھی۔''

''اپنا عیب چھپانے کے لیے مجھ پر الزام لگارہی ہے۔ بے غیرت۔'' شاہین نے آپے سے باہر ہوتے ہوئے کہا۔

''مجھے نوراں سب کچھ بتا چکی ہے۔'' ذکیہ نے زہریلے لہجے میں کہا۔

''تو بھی کتنی بھولی ہے ذکیہ۔'' شاہین نے افسوس سے کہا۔ ''میری کون سی بات تجھ سے چھپی ہے۔ میں نے کبھی تجھ سے تذکرہ کیا تھا ولدار خان کا؟ تو میرے ایک ایک پل سے واقف ہے ذکیہ! نوراں نے تجھے بے وقوف بنایا ہے۔ تاکہ ہمارے تعلقات خراب ہو جائیں۔ میرا شوہر بہت کم کماتا ہے، میرے پاس ولایتی کپڑے اور خوشبوئیں نہیں ہیں۔ میرے پاس عالیشان مکان نہیں ہے مگر مجھے فخر ہے کہ میں عزت کی روٹی کھارہی ہوں۔ گاؤں کا کوئی آدمی مجھ پر انگلی نہیں اٹھاتا۔ اب بھی وقت ہے۔ ان راہوں کو چھوڑ دے ذکیہ ورنہ تجھے پچھتانے کا وقت بھی نہیں ملے گا۔''

اس سے پہلے کہ ذکیہ کوئی جواب دیتی۔ ثاقب آنکھیں ملتا ہوا آگیا۔ ''آہا! شاہین خالہ آئی ہیں۔ شاہین خالہ آپ کو پتا ہے میں اس سال چھ برس کا ہو جاؤں گا۔ پھر ابو نے اینٹ آباد والے رضا چاچا کو لکھ دیا ہے کہ وہ مجھے اسکول میں داخل کرادیں۔''

شاہین تھوڑی دیر وہاں رہی پھر گھر آگئی۔ شاہین کا شوہر کراچی میں ملازمت کرتا تھا۔ اس کی ترقی ہوئی تو اس نے شاہین کو بھی کراچی بلالیا۔ یوں ذکیہ میں جو تھوڑی بہت جھجک تھی وہ بھی جاتی رہی۔ اب وہ آزادانہ ولدار خان سے ملنے لگی کیوں کہ ثاقب بھی اسکول میں داخل ہو چکا تھا۔ اس کے میکے والا بھی کوئی نہیں آتا تھا۔ کیوں کہ ذکیہ چالاکی یہ کرتی تھی کہ وہ تین دن بعد خود ہی میکے والوں سے مل آتی تھی۔

ایک دن دوپہر کے وقت ولدار خان اور ذکیہ باتیں کررہے تھے۔ ثاقب اسکول گیا ہوا تھا مگر اس کی واپسی کا وقت ہوگیا تھا۔ ثاقب سمجھ دار ہوگیا تھا اس لیے ذکیہ بار بار ولدار خان سے جانے کے لیے کہہ رہی تھی۔ ولدار خان نے جھنجلا کر کہا۔ ''مجھ سے اب یہ پابندیاں برداشت نہیں ہوتیں ذکیہ! اب تمہیں مجھ سے تعلق رکھنا ہے تو میرے ساتھ چلنا پڑے گا۔''

''مگر...... میرا شوہر...... بچہ!'' ذکیہ نے جھجکتے ہوئے کہا۔

''جمیل تو بعد میں تمہیں خود ہی طلاق دے دے گا۔ رہا بچے کا مسئلہ تو اسے تمہیں چھوڑنا ہی پڑے گا۔ یا تو مجھے چھوڑ دو یا اپنے بیٹے کو چھوڑ دو۔'' ولدار خان نے سفاکی سے کہا۔ ''پھر یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ثاقب سے بعد میں بھی ملتی رہو۔ بولو کیا کہتی ہو؟''

ذکیہ تھوڑے سے پس و پیش کے بعد راضی ہوگئی اور انہوں نے اسی وقت فرار کا منصوبہ بھی طے کرلیا۔ ولدار خان نے کہا کہ اپنی ساس کے آنے سے پہلے جمیل کے اکاؤنٹ سے سارا روپیا نکلوالو۔

دوسرے ہی دن ذکیہ نے بینک سے جمیل کا سارا روپیا نکلوالیا اور اس نے فرار کے لیے قیمتی چیزیں بھی سمیٹنا شروع کردیں۔ اسی دن جمیل کا ٹیلی گرام آیا۔ ذکیہ تو اس وقت گھر میں موجود تھی نہیں۔ ثاقب نے ٹیلی گرام لے کر گاؤں کے ایک پڑھے لکھے آدمی احمد سے پڑھوایا۔ ٹیلی گرام میں لکھا تھا کہ میں پرسوں شام کو کسی وقت پہنچ رہا ہوں۔ یہ سن کر ثاقب خوشی سے دیوانہ ہوگیا۔ پہلے اس نے سوچا کہ یہ خبر امی کو سنادوں مگر پھر وہ یہ سوچ کر خاموش ہوگیا کہ انہیں اچانک معلوم ہوگا تو بہت حیران ہوں گی۔ اس لیے اس نے ماں سے ٹیلی گرام کا کوئی تذکرہ نہیں کیا اور خاموشی کے ساتھ کوٹھی کے اوپر والے کمرے میں جاکر سوگیا۔

ذکیہ ان باتوں سے بے نیاز اپنے عشق میں مگن تھی۔ وہ جلدی جلدی اپنی قیمتی چیزیں ایک سوٹ کیس میں بھر رہی تھی۔ اس کام میں نوراں پورا پورا ہاتھ بٹارہی تھی۔ اگر ذکیہ کوئی چیز

بھول بھی جاتی تھی تو وہ اٹھا کر سوٹ کیس میں ٹھونس دیتی۔

رات کے دس بجے ذکیہ، نوراں کے ہمراہ سوٹ کیس اور سامان کی پوٹلیاں اٹھا کر اس طرف چل دی جہاں دلدار خان پہلے سے موجود تھا۔ دلدار خان نے اسے دیکھ کر خوشی کا اظہار کیا اور سب سے پہلے نقد رقم اور لاکھوں مالیت کے زیورات پر قبضہ کیا۔ پھر اچانک اس نے بدلے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”ذکیہ! اب تم واپس جاؤ میں اس سامان کو ٹھکانے لگا کر جلد ہی تمہیں بھی لے جاؤں گا۔“

ذکیہ کے ذہن میں خطرے کی گھنٹیاں بجنے لگیں۔ اس نے گھبرا کر کہا۔ ”دلدار میں تو اب گھر سے ہمیشہ کے لیے آگئی ہوں اب میں کہاں جاؤں؟ میں تمہارے ساتھ چلوں گی۔“

”فضول کی بات مت کرو ذکیہ۔“ اچانک فرید خان نے جھاڑیوں سے نکل کر کہا۔ اسی وقت دلدار خان کے دوسرے چار ساتھی بھی ذکیہ کے سامنے آگئے۔ ”بہتری اسی میں ہے کہ تم واپس چلی جاؤ۔“ فرید کا لہجہ سخت تھا۔

ذکیہ کو اس وقت پچھتاوؤں کا احساس ہوا مگر اب کچھ بھی نہیں ہو سکتا تھا۔ وہ اس وقت بھی عقلمندی سے کام لیتی تو شاید بات مال جانے پر ہی ختم ہو جاتی مگر وہ اپنے شوہر کے خون پسینے کی کمائی یوں لٹتی نہ دیکھ سکی اور اچانک دلدار خان سے لپٹ گئی۔ ”کتے کمینے! مجھے لوٹ کر یہ سمجھتا ہے کہ میں تجھے آسانی سے جانے دوں گی۔ میں تیرا خون پی جاؤں گی۔“ ذکیہ نے جنونی کیفیت میں کہا۔ ”تو نے مجھے شوہر سے بے وفائی پر آمادہ کیا اور اب مجھے برباد کر کے کہہ رہا ہے کہ میں لوٹ جاؤں۔ میں چیخ چیخ کر گاؤں والوں کو تیرے دوستوں کے اور اس حرافہ نوراں کے کرتوت بتاؤں گی پھر دیکھوں گی تو کیسے بچے گا۔“

”دلدار خان۔“ فرید نے دانت پیستے ہوئے کہا۔ ”اس کا منہ بند کرنے کا ایک ہی طریقہ ہے اسے ہمیشہ کے لیے خاموش کر دیا جائے۔“ یہ کہہ کر فرید خان نے چمک دار پھل کا خوفناک چاقو نکال لیا۔

”نہیں.....نہیں.....“ ذکیہ سہم کر دو قدم پیچھے ہٹ گئی۔ ”دلدار خان!“ اس نے دلدار خان کو مخاطب کیا جو اس کی طرف نہیں دیکھ رہا تھا۔ ”تو تو مجھ سے محبت کا دعویٰ کرتا تھا دلدار خان! میرے ساتھ جینے مرنے کی قسمیں کھاتا تھا۔ اب تجھے......“ اس کا جملہ پورا ہونے سے پہلے ہی فرید خان کا خوف ناک چاقو اس کے سینے میں پیوست ہو گیا۔ وہ تھوڑی دیر تڑپی پھر ساکت ہو گئی۔

صبح ثاقب اٹھا تو ذکیہ کو گھر میں موجود نہ پا کر وہ اسے پاگلوں کی طرح گاؤں بھر میں ڈھونڈتا پھرا۔ آن کی آن میں گاؤں بھر میں یہ خبر مشہور ہو گئی کہ ذکیہ مع نقد رقم اور قیمتی سامان کے غائب ہے۔ شام تک جمیل بھی پہنچ گیا۔ ثاقب نے رو رو کر اسے ذکیہ کی گمشدگی کے بارے میں بتایا۔ جمیل بالکل گم صم ہو کر رہ گیا۔ اسی وقت ایبٹ آباد اطلاع بھجوائی گئی۔ کسی نے پولیس کو بھی اطلاع کر دی اور پولیس نے بھی ذکیہ کی تلاش شروع کر دی مگر اس کی لاش ایسی جگہ پڑی تھی جہاں سے لوگوں کا گزر شاذ و نادر ہی ہوتا تھا۔ اتفاق سے جمیل دو کانسٹیبلوں کے ساتھ ٹہلتا ہوا اس طرف جا نکلا۔ اسے دور ہی سے کتوں کا جمگھٹا نظر آ گیا۔ قریب گیا تو ذکیہ کی لاش نظر آ گئی۔ وہ اسے دیکھ کر سکتے میں رہ گیا۔ اس کی آنکھیں کھلی ہوئی تھیں اور ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ اب بھی گا رہی ہو ”اے فصلاں پکیاں نیں، اساں تیریاں راہواں تکیاں نیں۔“

ذکیہ کو لوٹنے والے بھی اپنے انجام سے نہ بچ سکے۔ دلدار خان نے لوٹی ہوئی رقم سے ایک ٹرک خریدا تھا۔ ایک دن وہ سب لوگ اس میں سوار لاہور کی طرف جا رہے تھے۔ دلدار خان ٹرک ڈرائیو کر رہا تھا اور فرید خان کے علاوہ دیگر ساتھی ٹرک میں موجود تھے۔ ایک خطرناک موڑ مڑتے ہوئے ٹرک دلدار خان کے قابو سے باہر ہو گیا اور وہ خوفناک طریقے سے ابھری ہوئی چٹان سے ٹکرا گیا۔ حادثے میں دلدار خان کے علاوہ ہر شخص ہلاک ہو گیا۔ دلدار خان کی دونوں ٹانگیں اور ایک ہاتھ ٹوٹ گیا جسے ڈاکٹر نے بعد میں کاٹ دیا۔

نوراں دو ہی سال میں اندھی ہو گئی اور اس کی بہوؤں نے اسے گھر سے باہر نکال دیا۔ اب وہ پھٹے پرانے کپڑوں میں گھر کی دہلیز کے باہر بیٹھی رہتی ہے۔ اگر کسی کو ترس آ جاتا ہے تو اسے روٹی دے دیتا ہے ورنہ وہ کئی کئی وقت کے فاقے سے رہتی ہے۔ دلدار خان ... بھی گاؤں سے کچھ فاصلے پر واقع ایک مزار پر پڑا اپنی زندگی کے دن پورے کر رہا ہے۔ اتنا کچھ ہونے کے بعد ایک اچھی بات یہ ہوئی ہے کہ ذکیہ کے فرار کی خبر گاؤں والوں سے پوشیدہ ہے ورنہ ثاقب برباد ہو چکا ہوتا۔ لوگ یہی سمجھ رہے ہیں کہ ذکیہ نے چور کا پیچھا کیا اور اس نے ذکیہ کو قتل کر دیا۔ برے کا انجام برا میں بھی اس کہانی سے واقف نہ ہوتی اگر شاہین نہ سناتی۔

جناب ایڈیٹر سرگزشت

آداب و نیاز

اس بار میں ایک ذرا الگ انداز کی سرگزشت لے کر آیا ہوں جو میرے ایک دوست کی ہے اور واقعات کو دلچسپ بنانے کے لیے میں نے کہانی کا انداز اختیار کیا ہے۔

محمد سلیم اختر
(راولپنڈی)

میں اس دنیا کا سب سے بدقسمت انسان ہوں۔ میرا قد نہایت ہی چھوٹا ہے۔ یعنی پستہ قامت ہوں۔ میرا رنگ کوئلے کی طرح کالا اور میرے چہرے اور جسم کے اعضاء اور نقوش انتہائی غیر مناسب اور بے ڈھنگے ہیں۔ اس بدصورت سراپا پر یہ اتنا بڑا سر تو گویا تاج کی حیثیت رکھتا ہے۔ میرے چہرے پر دو گول گول اندر دھنسی ہوئی دو آنکھیں ہیں۔ پچکی ہوئی ناک ہے۔ منہ اور لب مینڈک نما ہیں۔ تنگ پیشانی اور اطراف میں بڑے بڑے کان ہیں۔

ان سب کے علاوہ میرا چہرہ چیچک کے بڑے بڑے داغوں اور گڑھوں سے بھرا ہوا ہے۔ (جو مجھے عمر کے بارہویں سال میں ہوئی تھی) بچپن میں گرنے سے میری دائیں ٹانگ مفلوج ہوگئی سو اب میں لنگڑا کر چلتا ہوں۔

مختصر یہ کہ میں کراہیت انگیز بدصورتی کا پہاڑ ہوں۔ لوگوں کا کہنا ہے کہ مجھ پر پہلی نظر میں ہی کسی کالے بندر کا گمان ہوتا ہے مگر بندر کو دیکھ کر یہ ضروری تو نہیں کہ لوگ ہنسیں۔ البتہ مجھے دیکھ کر وہ بہرصورت ہنس دیتے ہیں کیونکہ انہیں علم ہے کہ میں بھی ان ہی میں سے ہوں۔ وہ سب لوگ جن کے پاس آنکھیں ہیں مجھے دیکھتے ہی ہنسنے لگتے ہیں۔ کچھ کے تو قہقہے بھی چھوٹ جاتے ہیں۔ وہ اس غیر مہذب حرکت کے جواز کے طور پر آپ کو میرے بارے میں کئی مزیدار کہانیاں سنا سکتے ہیں۔ یہ کہانیاں میرے کانوں تک بھی پہنچ چکی ہیں اور میں ان ساری وجوہات سے باخبر ہو چکا ہوں۔ جو انہیں گدھوں جیسی بے ہنگم آواز میں ہنسنے پر مجبور کرتی ہیں۔

☆......☆

ان کی ہنسی کی ایک وجہ یہ ہے کہ میری بھی ایک محبوبہ تھی۔ مزید برآں میں نے اس سے شادی بھی کی۔ میں چونکہ پہلے عاشق اور پھر شوہر بنا۔ یہی تو وہ کہانی ہے جو عجیب و غریب و مضحکہ خیز ہے۔

ایک بار جب میں سڑک پر جا رہا تھا تو میں نے ایک شخص کو اپنے ساتھی سے یہ کہتے سنا۔

اس شخص کو دیکھ کر مجھے نوٹرے ڈیم کا کبڑا یاد آجاتا ہے۔

میں اگرچہ کبڑا نہیں ہوں۔ اس کے باوجود میں کبھی اپنی اہانت کے خلاف احتجاج نہیں کرتا۔ اب یہ فیصلہ کرنا تو یقیناً میرے اختیار میں نہیں کہ مجھے دیکھ کر لوگوں کو کیا اور کون یاد آنا چاہیے؟ ان ساری اذیت ناک باتوں کے باوجود ان کی ہنسی نے مجھے اپنے بارے میں بہت سی باتوں سے باخبر کیا ہے۔ اپنی ذات کے شناخت کے اس عمل میں یقیناً مجھے خارجی عوامل نے زیادہ مدد دی ہے۔

سڑکوں پر آتے جاتے جب میری نظر شوخ رنگ کپڑوں میں لپٹی خوب صورت دوشیزاؤں پر پڑتی ہے تو میں آپ ہی آپ خود میں سمٹ جاتا ہوں کیوں کہ ان کا حسن جذب کرنے کے قابل ہوتا ہے مگر مجھے دیکھ کر وہ جلدی سے اپنا منہ دوسری طرف موڑ لیتی ہیں اور انسان ہونے کی حیثیت سے میرے جذبات کو ٹھیس پہنچائی جاتی ہے تو پھر مجھے اپنی قابلِ رحم اور حسرت ناک کیفیت کا بھرپور احساس ہوتا ہے۔

☆......☆

میں ابھی اس دنیا میں نہیں آیا تھا کہ میرے باپ کی آنکھیں ہمیشہ کے لیے بند ہوگئیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہوش سنبھالنے پر میں نے گھر پر صرف اپنی بوڑھی ماں ہی کو دیکھا مگر وہ تو خاصی خوب صورت تھی اور لوگ کہتے ہیں کہ میرا باپ بھی بدصورت نہ تھا۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ میری بدصورتی موروثی نہیں ہے مگر سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آخر وہ کون ہستی ہے جو میری اس کراہیت انگیز اور دہشت ناک بدصورتی کی ذمہ دار ہے؟

میری ماں؟ میرا باپ؟ نہیں میں ان کو موردِ الزام نہیں ٹھہراتا۔ شاید انہیں اولاد کی خواہش ہی نہ تھی۔ اس لیے میرے باپ نے زبردستی میری ماں کو ماں بننے سے محروم رکھنے کے لیے طرح طرح کی دوائیں استعمال کرائیں۔ وہ میری آمد کو تو نہ روک سکے مگر ان دواؤں کا مجھ پر اثر ضرور ہو گیا۔ پھر بھی میں اپنے باپ کو قصوروار نہیں سمجھتا کیوں کہ ان کی آمدنی بھی کم تھی۔

میری آمد کے اعلان نے انہیں حواس باختہ کر دیا اور وہ زیادہ سے زیادہ محنت کرنے لگے اور یہی محنت ان کی موت کا سبب بن گئی۔ وہ تغاری سر پر رکھے تیسری منزل پر چڑھ رہے تھے کہ بانس کی سیڑھی سے پھسل کر نیچے آگرے۔

باپ کی کمی کے باوجود میری ماں نے مجھے پالا اور اب میں ان کا ہاتھ بٹا رہا تھا۔ میری ماں اور میں نے پھر کوشش کی تھی کہ گھر کی جڑیں مضبوط بنا ئیں۔ نہ تو میں اپنی محرومیوں سے مرجھایا اور نہ ہی ماں نے ہمت ہاری۔ ہم چاہتے تھے کہ گھر کا پودا پھلے پھولے۔ اس کو نئی شاخیں پتے، پھول اور پھل لگیں۔ کیا ہماری یہ خواہش غیر فطری تھی؟

اسی خواہش کے پیشِ نظر میری ماں نے مجھ سے پوچھا۔ ''بیٹے اب اس گھر میں دلہن آہی جانی چاہیے۔'' ماں کے اس سوال کو سن کر مجھے کوئی حیرت نہ ہوئی کیوں کہ میں تو عرصہ سے یہ چاہتا تھا۔

میں نے جواب دیا۔ ''ہاں...... ماں اب یہ کام بھی ہو جانا چاہیے۔''

ماں نے اسی دن سے ہمسایوں کے ساتھ بات چیت شروع کر دی مگر یہ سلسلہ زیادہ دنوں تک جاری نہ رہ سکا۔ ماں جب بھی کہیں سے لوٹتی تو اس کے چہرے پر دکھ کی

لکیریں کچھ اور گہری نظر آتیں جنہیں دیکھ کر میں بھی پریشان ہو جاتا۔ میں ہر روز اس سے پوچھتا۔

''ماں جی! کیا بنا؟''

''کچھ بھی نہیں۔'' ہر روز اس کا یہی جواب ہوتا۔ جواب دیتے ہوئے یوں لگتا جیسے وہ دکھ اور درد سے کراہ رہی ہو۔

بالآخر اس نے میرے لیے رشتے کی تلاش میں باہر جانا چھوڑ دیا۔ محلے میں بات پھیل گئی تھی کہ میری ماں اپنے لیے بہو تلاش کر رہی ہے۔ اس لیے اب وہ لوگ بھی مجھ پر ہنسنے لگے جو اس سے پہلے مجھ پر کبھی نہ ہنستے تھے۔ لوگ مجھ سے ہمدردی کرتے ہوئے کہتے۔ ''بے چارا......! اس کی ماں نے اس کے لیے دلہن تلاش کرنے کی کتنی کوشش کی مگر ناکام رہی۔ اے پروردگار! تو اس جیسے بے چارے انسان پیدا ہی کیوں کرتا ہے؟''

ماں کی ناکامی کے بعد میں نے اپنے چہرے اور لباس پر توجہ دینی شروع کر دی کہ شاید اس طرح کوئی لڑکی میری طرف متوجہ ہو جائے۔ میں اچھا اور صاف ستھرا لباس پہننے لگا۔ میں نے چہرے کی آرائش کے لیے کریمیں، لوشن اور خوشبو جات استعمال کرنی شروع کر دیں مگر میری یہ ساری کوششیں بھی میرے من کی مراد پوری نہ کر سکیں۔ لوگوں کی ہنسی مزید بڑھنے لگی جیسے میں مزید بھدا اور بدصورت ہو رہا ہوں۔ میں نے اس بات پر سنجیدگی سے غور کیا اور یہ بات عقل میں آ گئی کہ نہانے سے میں خود کو راج ہنس میں تبدیل نہیں کر سکتا۔ بہو کے حصول کے لیے ماں کی ساری کوششیں ناکام ہو چکی تھیں۔ بھلا کون عورت ایک بندر نما انسان کی بیوی بننا پسند کرتی۔ ماں نے اس ناکامی کے غم کو سینے سے لگا لیا۔ اس کی قوتِ مدافعت بھی جواب دے گئی اور اس کی صحت دن بدن گرتی گئی۔ کئی بیماریوں نے اسے گھیر لیا اور پھر میری وہ ماں جو میرے جلتے دل میں اپنی روح کی چاہت سے ٹھنڈک ڈالتی تھی۔ میری پیاری ماں جس نے مجھے محبت سے عاری اس دنیا کے ساتھ اپنی محبت کے سنہری تار سے باندھ رکھا تھا۔ ماں جس کے پیار کے سہارے میں زندہ تھا اور جو میری کراہیت انگیز بدصورتی میں بھی کسی قسم کا حسن تلاش کر لیا کرتی تھی۔ وہ ماں مجھے اس دنیا میں تنہا چھوڑ کر اگلے جہاں سدھار گئی۔ میں نے اس کی جدائی میں بہت آنسو بہائے تھے مگر میرے آنسو اور آہیں میری ماں کو واپس نہ لا سکے۔

☆......☆

کچھ مہینوں بعد میری زندگی میں اچانک ایک تبدیلی رونمائی ہوئی۔ میری زندگی ایک نئی جہت سے روشناس ہوئی ماں کی لوٹی ہوئی آس جو مجھ میں حلول کر چکی تھی۔ ایک روز پھر سے بیدار ہو گئی۔ میری بے رنگ، پھیکی اور اذیت ناک زندگی میں مجھے ایک محبوبہ مل گئی۔ جس نے میری دکھوں بھری کہانی کو پیار کی کہانی بنا دیا۔ میرے اندر کے انسانی جذبوں کو رعنائی بخش دی۔ بلاشبہ وہ بہت ہی عظیم تھی کہ اس نے مجھ سے پیار بھی کیا۔ میری بدصورتی کو نظر انداز کر کے مجھ سے شادی بھی کر لی۔ اس نے مجھ پر ہنسنے والوں کو حیرت زدہ کر دیا اور ان کے ذہنوں کو مفلوج کر دیا۔

☆......☆

اس روز میں اپنے کمرے میں بیٹھا اپنی بدنصیبی کا رونا رو رہا تھا کہ اچانک میں نے گھر کی دہلیز کی سیڑھیوں پر زور زور سے لاٹھی مارنے کی ''ٹھک ٹھک'' سنی۔ اس کے ساتھ ہی ایک لڑکی کی آواز سنائی دی۔ ''خدا کے نام پر کچھ دے دو۔''

وہ ایک بھکارن لڑکی تھی۔ ''جناب میں اندھی ہوں۔'' وہ کہہ رہی تھی۔

میں نے دروازہ کھول کر اس کی آنکھوں کی طرف غور سے دیکھا۔ وہ واقعی اندھی تھی۔ وہ ایک درد انگیز منظر تھا۔ میں اس وقت اپنی حالت کو بھول گیا اور سوچا۔ ''بے چاری نوجوان لڑکی ہے مگر بغیر آنکھوں کے ایک ایسی زندگی کی مالک جو سننے اور چھو کر محسوس کرنے تک محدود ہے۔'' وہ اتنی زیادہ خوب صورت تو نہ تھی مگر پھر بھی سینکڑوں میں ایک تھی۔ اس کے متناسب اور صحت مند جسم میں جوانی کا رس اور خمار تھا۔ ''بے چاری۔'' میں نے کہا اور پھر وہ میرے دل کے نرم گوشوں میں اتر گئی۔

''اندر آؤ اور بیٹھ جاؤ۔'' میں نے نرمی سے کہا۔ وہ راستہ ٹٹول کر آگے بڑھنے لگی۔ یہ دیکھ کر میں اٹھا اور اسے ہاتھ کا سہارا دے کر اندر لے آیا۔ یہ میری زندگی کا پہلا موقع تھا کہ میں کسی نوجوان اور نوخیز لڑکی کو چھو رہا تھا۔ اس کے نرم و نازک ہاتھ کا لمس محسوس کر کے میرے دل کی دھڑکنیں تیز ہو گئیں اور میرے جذبات انتہا کو چھونے لگے۔ میں نے ایک بار پھر اس کی جانب دیکھا۔ آنکھوں کی بے نوری کے باوجود اس کے چہرے پر تازگی اور رعنائی تھی۔

''یہاں بیٹھ جاؤ۔'' میں نے اسے برآمدے میں ایک صاف جگہ پر بٹھا دیا۔ اس نے بھی میرے ہاتھوں کی کپکپاہٹ کو محسوس کیا ہوگا۔ میں نے اسے کچھ کھانے کو بھی

دیا اور ایک دس روپے کا نوٹ بھی۔ وہ خوش ہوگئی۔ اس نے مجھے بتایا کہ اس کا نام شینا ہے اور وہ اپنی بوڑھی ماں کے ساتھ شہر میں ایک بہت بڑی فیکٹری کے پیچھے ایک جھونپڑی میں رہتی ہے۔ اب وہ جانے کے لیے اٹھی تو میں نے اسے دوبارہ آنے کو کہا اس نے وعدہ کیا اور چلی گئی۔

شینا اب اکثر آنے لگی اور پھر اس کا میرے یہاں آنا ایک معمول بن گیا۔ ہم ہر قسم کے موضوعات اور چیزوں پر گفتگو کرتے تھے۔ اس سے باتیں کر کے میرے دل کا بوجھ ہلکا ہو جاتا تھا اور زندگی کے بوجھل لمحے اب میری جانب خوشیاں منتقل کرنے لگے۔ شینا کی آنکھیں اگر ان میں روشنی ہوتی تو وہ اس کے حسن کو چار چاند لگا دیتیں۔ عورت کی آنکھیں ہی تو مرد کو اس کا دیوانہ بناتی ہیں۔ میرے پیاسے دل کی اپنی خواہشات تھیں۔ کاش شینا کی آنکھیں بینائی سے محروم نہ ہوتیں تبھی میرا دماغ ہنکارتا، اگر وہ دیکھ سکتی تو شاید وہ بھکارن نہ ہوتی اور اگر وہ بھکارن ہوتی بھی تو یقیناً وہ مجھ سے خیرات کے سوا اور کوئی چیز قبول نہ کرتی۔ بلکہ وہ مجھ سے نفرت کرتی۔ دوسرے لوگوں کی طرح مجھ پر ہنستی۔ اس کی آنکھیں اسے ہرگز یہ اجازت نہ دیتیں کہ وہ ہر روز میرے پاس آئے اور اپنے دل کی باتیں کرے۔

لوگوں کو ہماری ملاقاتوں کا علم ہو گیا تھا مگر کسی نے بھی ہمارے معاملات میں مداخلت نہ کی۔ بندر نما انسان ہونے کی بدولت میں تو پہلے ہی ان کے مذاق کا مستقل نشانہ ہوا تھا۔ اب مزید ان کے پاس ہنسنے کا سامان آ گیا۔ وہ بدہیئتی اور بے نوری کی یکجائی سے بہت لطف اندوز ہو رہے تھے۔ اس انوکھے اتحاد پر ہر کوئی مسکرا رہا تھا۔

ایک روز میں نے شینا سے پوچھا۔ ''میرے بارے میں تمہاری کیا رائے ہے؟''

جواب میں وہ صرف مسکرا دی۔ اس کی شرمیلی مسکراہٹ نے مجھے مسحور کر ڈالا۔

''شینا بولو نا!'' میں نے اصرار کیا۔

''کیا کبھی میں نے یہ کہا ہے کہ تم برے آدمی ہو؟'' اس نے خلوص بھرے انداز میں جواب دیا۔ میں خوشی سے دیوانہ ہو گیا اور بلا ضرورت پوچھ بیٹھا۔ ''شینا! تم مجھ سے پیار کرتی ہو ناں؟''

اس نے حیا سے گردن جھکا لی اور زبان سے کچھ نہ کہا۔ اس وقت مجھے محسوس ہوا کہ زندگی کا سارا حسن اور رعنائی اس کے چہرے پر سمٹ آئی ہے۔

وہ اس اقرار کے بعد جلد چلی گئی۔ آخر کار میرا شمار بھی ان مردوں میں ہونے لگا جن کی کوئی محبوبہ ہوتی ہے۔ اس بھری دنیا میں اب کوئی میرا بھی تھا۔ میری بے رنگ اور پھیکی زندگی میں اب شیرینی اور قوس و قزح کے رنگ بکھرتے محسوس ہونے لگے۔ کیا یہ میری خوش قسمتی تھی؟ پھر خیال آیا کہ وہ لوگ جو مجھ پر ہنستے ہیں۔ وہ جو میرے حاسد ہیں۔ اگر وہ میری بدصورتی کے بدلے میں شینا کو بتا کر ورغلانے لگے تو پھر کیا ہوگا؟ کہیں انہوں نے یہ حرکت کر ہی نہ دی ہو۔ کون جانے؟

مگر شینا کو کوئی کیونکر خوب صورتی اور بدصورتی کا فرق سمجھا سکتا ہے۔ جب کہ وہ تو دن اور رات کی بھی خود تمیز نہیں کر سکتی۔ وہ تو اندھی ہے اور یہی اس کی سب سے بڑی بدقسمتی ہے مگر وہ پھر بھی اس زندگی سے مطمئن تھی۔

☆......☆

اگلے روز حسب معمول شینا آئی۔ میں سوچنے لگا کہ ہماری شادی کیونکر ہوگی؟ مجھے یہ کام ناممکن لگ رہا تھا کیونکہ ہم دونوں کا مذہب ایک نہ تھا۔ وہ ہندو اور میں مسلمان۔ کسی نے بھی اس معاملے میں ہمارا ساتھ نہیں دینا تھا مگر یہ بھی حقیقت تھی کہ شینا کے سوائے کوئی بھی عورت مجھ سے شادی کے لیے تیار نہ ہو سکتی تھی۔ پھر بھی میں نے شینا سے پوچھا۔ ''تم مجھ سے شادی کرو گی؟''

یہ سن کر وہ ایک دم چپ ہو گئی۔ یقیناً میرے مسلمان ہونے نے اس کو کچھ سوچنے پر مجبور کر دیا تھا۔

''تم کیا کہہ رہے ہو۔ بھلا یہ کیسے ممکن ہے؟'' اس نے حیرت اور خوف سے پوچھا۔

''شینا! کیا یہ بات کافی نہیں کہ ہم دونوں انسان ہیں اور خدا نے خود تمہیں میرے پاس بھیجا ہے۔ ذات پات اور دین دھرم کی دیواریں تو انسان ہی نے بنائی ہیں۔ انہیں گرانا کوئی مشکل کام نہیں ہے اور پھر یہ کوئی گناہ بھی نہیں، میں نے دلائل دے کر اسے قائل کرنے کی کوشش کی تھی مگر وہ خاموش تھی۔ اس کی خاموشی مجھے معنی خیز لگنے لگی تو میں نے کہا۔ ''بولو شینا! میں تمہیں تحفظ دینا چاہتا ہوں۔ میں تمہاری آنکھیں بن کر زندگی بھر تمہارا ساتھ دینا چاہتا ہوں۔ تمہیں بھی وعدہ کرنا ہوگا کہ تم میرا ساتھ دو گی۔ تم میری خوشی اور خواہش کا احترام کرو گی۔''

''میں وعدہ کرتی ہوں۔'' شینا بولی۔

اس نے بالآخر میری چاہت کا بھرم رکھ لیا۔ وہ چند

لمحوں تک شرماتی رہی اور پھر بتانے لگی۔ میں نے لوگوں کو اپنے بارے میں بڑی حقارت سے گفتگو کرتے ہوئے سنا ہے۔ جب میں ان کے پاس سے گزروں تو وہ کہتے ہیں۔

"وہ دیکھو۔ بندر نما انسان کی داشتہ جا رہی ہے۔ ان کے کہنے کے مطابق تم حسن سے عاری ہو۔"

"مگر تم میرے بارے میں کیا محسوس کرتی ہو؟ تم نے مجھے کیسا انسان پایا ہے؟"

"میں اس حسن کے بارے میں کچھ بھی نہیں جانتی جو وہ آپ کے بارے میں کہتے ہیں۔ میں نے تو کبھی بندر دیکھا ہی نہیں۔ بچپن میں جب آنکھیں تھیں تو شاید دیکھا ہو مگر اب تو یاد بھی نہیں۔ اس لیے مجھے ان باتوں کی کوئی پروا نہیں ہے۔ اگر وہ یہ بھی کہیں کہ تم دنیا کے حسین ترین انسان ہو، تب بھی میرا احساس اس سے مختلف نہ ہوتا۔ میں نے تو اس دنیا کو دل کی آنکھوں سے دیکھا ہے۔ میں حسن اور بدصورتی کو دل سے دیکھتی ہوں۔ تم مسلمان ہو اور میں ہندو۔ اگر تمہیں کوئی اعتراض نہیں تو مجھے بھی نہیں۔ میں سوچتی ہوں۔ اس دنیا میں کوئی بھی مجھے پورے خلوص اور دل کی گہرائیوں سے نہیں چاہے گا لیکن......"

"لیکن کیا؟" میں نے بے تابی سے پوچھا۔

"ہاں...... مگر گداگری کے پیچھے بہت بڑا "لیکن" ہے۔ میں پاک دامن نہیں ہوں۔ میری عصمت کی چادر پر کئی دھبے لگے ہیں۔ اندھی ہونے کے باوجود میں محبت کی پیاسی تھی۔ میرا خالی کشکول دن بھر کی گداگری کے باوجود خالی رہتا اور میرے اور میری ماں کے اداس چہروں پر ہنستا تھا۔ اسی نے رات کے اندھیروں میں مجھے مردوں کی آغوش میں دھکیلا۔ تم خود ہی سوچو بھلا ایک نوجوان لڑکی کو خدا اور بھگوان کے نام پر کوئی بھیک دیتا ہے؟ پہلی بار ہاں پہلی بار۔ جب تم مجھے اپنے گھر کے اندر لے گئے تو میرے ذہن میں یہی بات تھی کہ تم بھی مجھ سے بھیک کے عوض وہی طلب کرو گے جو ایک مرد کسی نوجوان اندھی اور مجبور بھکارن سے مانگ سکتا ہے۔ مگر تم نے تو ایسا نہ کیا۔ تم چاہتے تو میرا جسم پامال کر سکتے تھے مگر تم نے میری روح کے اندر اترنے کی کوشش کی۔ یہی وجہ ہے کہ میری نظر میں صرف تم ہی انسان ہو۔ تم ہی عزت کے مستحق ہو۔ میں صرف اور صرف تم سے محبت کرتی ہوں سچی اور پاک محبت۔"

میں شینا کے خیالات جان کر سن ہو گیا۔ چند لمحوں تک خاموشی چھا گئی۔

آسٹیوپوروسس

(osteoporosis)

ہڈیوں کی ایک بیماری کا نام۔ اس بیماری میں کیلشیم کی وجہ سے ہڈیاں پتلی اور کمزور ہو جاتی ہیں۔ حتیٰ کہ معمولی چوٹ لگنے سے ٹوٹ جاتی ہیں بلکہ بعض اوقات تو یہ معمولی سا دباؤ بھی نہیں برداشت کر سکتیں۔ یوں تو یہ بیماری مردوں اور عورتوں دونوں کو ہو سکتی ہے لیکن عورتوں میں یہ بیماری مردوں کے مقابلے میں کہیں زیادہ ہے۔ عموماً اس میں عورتوں اور مردوں کا تناسب تقریباً 2.1 ہے لیکن جیسے ہی خواتین 50 سال کی عمر سے آگے بڑھتی ہیں تو یہ تناسب تقریباً 6.1 تک ہو جاتا ہے۔ اس کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ جب خواتین 50 سال کی عمر کو پہنچتی ہیں تو ان کے جسم میں ایسٹروجن (ایک قسم کا ہارمون) کی تعداد کم ہو جاتی ہے۔ ایسٹروجن کی کمی کی وجہ سے خواتین کی ہڈیوں میں کیلشیم کے ساتھ ساتھ دوسرے مادے بھی کم ہونا شروع ہو جاتے ہیں جس کی وجہ سے ان کی ہڈیاں کمزور پڑ جاتی ہیں اور وہ اس بیماری کا شکار ہو جاتی ہیں۔ جدید تحقیق سے بات واضح طور پر سامنے آ گئی ہے کہ جن عوامل کی وجہ سے یہ بیماری لاحق ہوتی ہے ان میں یہ شامل ہیں۔ عمر کی زیادتی (خواتین 50 سال سے زائد اور مرد 70 سال سے زائد)، خاندانی یا موروثی شواہد کی موجودگی، معمول کی خوراک میں کیلشیم کی مقدار میں کمی، پستہ قد ہونا (وزن 50 کلو سے کم)، خواتین میں ماہواری کے نظام کا جلد (45 سال کی عمر سے پہلے) بند ہو جانا، ورزش نہ کرنا، سگریٹ نوشی، کسی وجہ سے چلنے پھرنے سے معذور ہو جانا اور پھر بستر پر ہی رہنا، زیادہ سفید رنگت کا ہونا، ایشیائی نسل سے تعلق ہونا، چائے اور کافی کا بہت زیادہ استعمال۔ یہ بیماری اس اعتبار سے بہت زیادہ خطرناک ہے کہ اس مرض کے پیدا ہونے کی کوئی علامت ظاہر نہیں ہوتی اور مریض بھی اس سے بے خبر ہوتا ہے مثلاً ریڑھ کی ہڈی کے مہروں کا اپنی جلد سے مل جانا۔ اگر اس بیماری کی وجہ سے ہڈیوں کے نمکیات کم ہو جائیں تو ضروری ہے کہ ورزش کو باقاعدہ بنایا جائے، زیادہ بھاری سامان اٹھانے سے گریز کیا جائے، سگریٹ نوشی سے مکمل پرہیز کیا جائے۔ معالج اس بیماری میں مبتلا مریض کو کیلشیم اور وٹامن ڈی کی گولیاں دیتے ہیں یا ٹیکے لگاتے ہیں جب کہ خواتین کو ایسٹروجن کی گولیاں استعمال کراتے ہیں۔

مرسلہ: توفیق بچہ۔ کراچی

پھر میں نے ایک اعتماد سے کہا۔ ''شینا! تم نے جو کچھ سنایا ہے وہ انسانی خودغرضی، ہوس اور کسی معذور کی مجبوری سے ناجائز فائدہ اٹھانے کی کہانی ہے مگر میرے لیے اب یہ کوئی اہمیت نہیں رکھتی۔ میں اسے بھول جاؤں گا۔ وہ وقت اب ماضی بن چکا تم بھی اسے بھول جاؤ۔ اب دنیا میں کوئی بھی تمہیں لوٹ کا مال نہیں سمجھے گا۔ کوئی تمہیں بے بس نہیں کر سکے گا۔''

وہ خاموشی سے میری باتیں سنتی رہی۔ گویا وہ اپنی خوشی اور رضامندی کا اظہار کر رہی ہو۔

☆......☆

چند ہی دن بعد وہ بات ہوگئی۔ جس نے محلہ میں ہیجان پھیلا دیا۔ کیا یہ بات ہنگامہ خیز نہ تھی کہ کسی خدائی فوجدار کی موجودگی اور کسی کی اجازت یا حمایت کے بغیر ہی میں اور شینا نزدیکی مسجد میں جا کر ایک ہو گئے۔ ہماری شادی کا سن کر لوگوں کے قہقہے اور بھی بلند ہو گئے۔ شینا کی ماں کو بھی میں اپنے گھر لے آیا۔ سماج کے خودساختہ ٹھیکیدار ہم کو شک بھری نظروں سے گھورتے مگر اب ہمیں کسی کی پروا نہ رہی، ہم ایک دوسرے سے یہی کہتے کہ ''یہ احمق لوگ ہیں ان کو ہنسنے دو۔''

☆......☆

ہماری ازدواجی زندگی نہایت ہی پرمسرت اور خوشگوار گزرنے لگی۔ ہم ایک دوسرے کو پاکر بہت خوش تھے۔ ہمارے دامن میں خوشیاں ہی خوشیاں تھیں۔ پلک جھپکتے ایک سال گزر گیا۔ شینا ماں بننے والی تھی۔ ہم دونوں کو اب بدصورتی اور اندھے پن کی کوئی پروا نہ تھی۔ آنے والے بچے کے بارے میں بھی لوگ طرح طرح کی باتیں کرتے تھے مگر میں ان سے بے پروا خوشی سے دیوانا ہو رہا تھا۔ وہ خوشیاں جن کی کبھی میں نے توقع ہی نہ کی تھی۔ اب وہ میری زندگی میں رنگ بھر رہی تھیں۔ میں پروردگار کا شکر گزار تھا کہ اس نے میرا دامن مسرت کے خزانوں سے بھر دیا ہے۔

☆......☆

شینا بچے کی پیدائش سے دو ماہ پہلے بیمار پڑ گئی تو میں ڈاکٹر کو گھر لے آیا۔ اس نے شینا کا معائنہ کیا اور کہنے لگا۔ ''گھبرانے کی ضرورت نہیں۔ معمولی بیماری ہے جلد ٹھیک ہو جائے گی۔''

اس نے چیک اپ کے دوران میں پوچھا کہ ''کیا شینا پیدائشی اندھی ہے؟''

جب میں نے اسے بتایا کہ نہیں تو اس نے ایک بار پھر شینا کی آنکھوں کا غور سے معائنہ کیا اور پھر بڑی سنجیدگی سے کہنے لگا۔ ''آپریشن کے ذریعے اس کی بینائی ٹھیک ہو سکتی ہے مگر ابھی نہیں بچے کی پیدائش کے دو ماہ بعد جب اس کی صحت بحال ہو جائے تو اسے میرے پاس لے آنا۔ میں اس کا آپریشن کرا دوں گا اور پھر یہ دنیا دیکھ سکے گی۔''

ڈاکٹر یہ کہہ کر چلا گیا مگر اس کے الفاظ میرا سینہ چھلنی کر گئے۔ مجھے یوں لگا جیسے میری خوشیوں کا تاج محل زمین بوس ہو جائے گا۔ شینا کی بینائی بحال ہوگئی تو یہ مجھے دیکھ کر کانپ اٹھے گی۔ بھلے سے وہ دل کی آنکھوں سے دیکھ چکی ہے اور محبت بھی کرتی ہے۔ بینائی بحال ہونے کے بعد وہ جب مجھے پہلی مرتبہ دیکھے گی تو اس کے خوابوں کا محل ریزہ ریزہ ہو جائے گا۔ کیا اس کے بعد بھی وہ مجھ سے محبت کرتی رہے گی؟''

میں چیخ کر ڈاکٹر کو کہنا چاہتا تھا کہ شینا کو اب آنکھوں کی ضرورت نہیں ہے مگر میں ایسا نہ کہہ سکا۔ میں نے گھٹے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''شینا! ڈاکٹر صاحب کہتے ہیں کہ تمہاری آنکھوں کا آپریشن کرنے کے بعد تم دیکھنے کے قابل ہو جاؤ گی۔''

شینا یہ جان کر بہت ہی خوش ہوئی۔ بھلا اس سے بڑھ کر اس کی خوشی اور خوش قسمتی کیا ہو سکتی تھی کہ وہ جب پہلی بار دنیا کو دیکھے گی تو اسے یوں لگے گا جیسے اس نے آج ہی نیا جنم لیا ہو۔ وہ کہنے لگی۔

''اگر مجھے بینائی مل گئی تو کتنا مزہ آئے گا۔ کیا تم بھی اتنے ہی خوش ہو گے جتنی کہ میں؟ میں جب تمہیں دیکھوں گی تو اس وقت تم مجھ سے اور بھی زیادہ پیار کرو گے۔''

''ہاں...... ہاں میں تم سے اور بھی زیادہ پیار کروں گا۔'' میں نے اس کی تائید کی۔

شینا بہت ہی پرسکون اور خوش ہوگئی اور باقاعدگی سے دوا کھانے لگی مگر میرے اندر ایک طوفان موجزن تھا۔ میرا ذہن عجیب و غریب خیالات کی آماجگاہ بن گیا تھا۔ میں برآمدے کے آخری سرے پر بیٹھ گیا۔ میرے اس چھوٹے سے جھونپڑے میں یہی ایک سکون کا گوشہ تھا مگر اب یہ بھی طوفان کی زد میں آنے والا تھا۔ میری دنیا پہلے ہی محدود تھی مگر اب مزید محدود ہونے والی تھی۔

☆......☆

شینا ماں بن گئی۔ اس نے ایک بیٹے کو جنم دیا۔ لوگوں نے ہماری ہنسی اڑائی مگر ہم نے پروا نہ کی۔ بدصورت باپ

اور اندھی ماں کا وہ بچہ بہت ہی معصوم تھا۔ اسے میری آنکھیں اور شینا کا حسن ملا تھا اس سے بڑھ کر ہماری اور کیا خوشی ہو سکتی تھی۔

چند ہفتے گزرے، شینا اب صحت یاب ہو گئی تو اس نے ایک روز مجھے اس ڈاکٹر کے بارے میں یاد دلایا۔ جسے میں اپنی خود غرضی کے سبب بھول چکا تھا۔ شینا اپنی آنکھوں کے آپریشن کے لیے اب اس کے پاس جانا چاہتی تھی مگر اسے یہ معلوم نہ تھا کہ میرے دل پر کیا قیامت گزر رہی ہے۔ میں نے اسے کہا کہ میں کل اس ڈاکٹر کے پاس جاؤں گا۔ پھر وہ جس دن آنے کا کہے گا میں تمہیں اس کے پاس لے چلوں گا مگر حقیقت یہ تھی کہ میں شینا سے پہلی بار جھوٹ بول رہا تھا۔ اس روز میں نے اپنے آپ کو سمندر کے وسط میں طوفانی موجوں میں گھرا ہوا محسوس کیا۔ اگلے روز میں ڈاکٹر کے پاس جانے کا جھوٹ بول کر گھر سے نکلا اور دوپہر کو واپس آکر شینا کو بتایا کہ وہ ڈاکٹر ایک حادثے میں فوت ہو گیا ہے۔ اب میں کسی اور ڈاکٹر کا معلوم کروں گا۔

شینا نے دکھ کا اظہار کیا مگر میں افسوس کا ایک لفظ بھی نہ کہہ سکا۔ شینا نے صرف اتنا کہا کہ آپ کسی اور ڈاکٹر کا پتا کریں۔ میں نے اقرار میں گردن ہلا دی۔ جس کو وہ نہ دیکھ سکی۔ میرے اندر خود غرضی اور ظلم کے جذبات سما گئے تھے اور یہ ایک بوجھ تھا جسے اٹھائے رکھنا میرے بس کی بات نہ تھی مگر اپنی دکھ بھری زندگی کے اختتام پر ملنے والی خوشیوں کے ان لمحات کو طول دینے کی بجائے میں کوئی اور طریقہ بھی تو اختیار نہیں کر سکتا تھا۔

☆......☆

وقت کا دھارا کبھی نہ لوٹ کے آنے کے لیے بہتا رہا۔ ایک روز میں جب گھر لوٹا تو میں نے ایک دلدوز منظر دیکھا۔ بچہ اپنے جھولے میں زور زور سے رو رہا تھا۔ شینا اسے سنبھالنے کے لیے تیزی سے بھاگی۔ اس نے کسی چیز کا سہارا بھی نہ لیا۔ کمرے میں تانبے کا ایک بڑا سا ٹب پڑا تھا۔ وہ اس سے ٹکرائی اور دروازے کی چوکھٹ پر جا گری۔ خون فوارے کی طرح اس کے سر سے ابلنے لگا۔ میں اسے فوراً اسپتال لے گیا۔ ڈاکٹر نے بتایا کہ بے چاری بری طرح گری ہے۔ زخم گہرا اور خطرناک ہے۔

انہوں نے اس کا علاج شروع کیا مگر شینا درد سے بے حال ہو رہی تھی۔ اس نے مجھے اپنے قریب بلایا اور سسکیاں لیتے ہوئے بولی۔

”میں زندہ نہیں رہوں گی۔ لگتا ہے میں مر رہی ہوں۔ کاش میں تمہیں ایک بار اپنی آنکھوں سے دیکھ سکتی۔“

مجھے شینا کی آخری خواہش سن کر یوں لگا کہ جیسے یہ میری قوت برداشت کا امتحان ہے۔ کیا وہ ڈاکٹر کی موت سے رنجیدہ تھی؟ پھر وہ خاموش ہو گئی۔

”شینا۔“ میں نے کہا۔ ”مجھے اپنی آنکھوں سے دیکھنا کوئی بڑی بات نہیں۔ کیا تم نے مجھے اپنے دل کی آنکھوں سے نہیں دیکھا؟ میں جانتا ہوں کہ اس دنیا میں صرف تم ہی ہو جس نے مجھے صحیح طور پر سمجھا اور دیکھا ہے۔ اس دنیا میں تو لوگ آنکھیں رکھتے ہوئے بھی ایک دوسرے کو نہیں دیکھ سکتے۔ تم گھبراتی کیوں ہو۔ میں تمہارے پاس ہوں ناں۔ تم جلد ٹھیک ہو جاؤ گی۔“ شینا نے میری باتیں سنیں اور زبان سے کچھ نہ بولی۔

چمکتا سورج مغربی افق کے کنویں میں اتر چکا تھا کہ اچانک شینا کی کراہیں، چیخوں میں بدل گئیں۔ کرب سے میری مٹھیاں بھنچ گئیں۔ میری خود غرضی اور بے رحمی کا راز حلق میں اٹک کر زبان پر آنے کے لیے بے تاب ہو رہا تھا۔ میں زیادہ دیر تک اس کے سامنے نہیں رہ سکتا تھا۔ اتنے میں شینا کی ماں آگئی اور اس نے بچے کو شینا کے پہلو میں لٹا دیا۔ بچہ بھی کربناک ماحول سے گھبرا کر چیخنے لگا۔

شینا بھی چیخنے لگی۔ اس وقت میں خود کو بالکل بے بس اور تہی دست محسوس کر رہا تھا۔ اتنا بے بس میں زندگی میں کبھی نہ ہوا تھا۔

تمام رات اسی طرح گزر گئی۔ ڈاکٹروں نے اس پر کافی توجہ دی دروکش دوائیں دیں لیکن صبح صادق کے وقت شینا کی روح جسم سے نکل کر آسمان کی وسعتوں میں چلی گئی۔ سورج طلوع ہوا تو تاریکیوں کا دامن دراز ہو گیا شینا کی ماں بچے کو لے کر نہ جانے کہاں چلی گئی۔

وہ لوگ جو میری دہشت ناک ہستی اور میری اس عجیب و غریب محبت کی تہہ میں نہیں جھانکتے اور انہوں نے کبھی میرے دلی جذبات کو محسوس کرنے کی کوشش ہی نہیں کی۔ وہ اب بھی مجھے دیکھ کر اسی طرح ہنسنے لگتے ہیں۔

اب میں کبھی کبھار برآمدے کے کونے میں بیٹھ کر حیرت سے سوچتا ہوں کہ اگر میں اندھا ہوتا اور شینا بدصورت ہوتی۔ تو پھر میری کہانی کیسی ہوتی؟ میری زندگی کیسے گزرتی؟

سوسائٹی

زمین کے لیے ڈات کام

محترم معراج رسول
سلام شوق
میں ایک ایسی سرگزشت کے ساتھ حاضر ہوا ہوں جو آپ اور قارئین کو ضرور پسند آئے گی۔ آج جب میں اپنے اردگرد مفاد پرستوں کا ٹولا دیکھتا ہوں تو مجھے والد صاحب کے دو دوست شدت سے یاد آتے ہیں۔ حب الوطنی کسے کہتے ہیں یہ انھوں نے عمل سے بتایا۔ستمبر میں یوم دفاع ہے اگر اس موقع پر لگا دیں تو نوازش ہوگی۔

ایس اے قاضی
(کراچی)

میرے والد اس زمانے میں سرکاری نوکری پر لگے تھے جب مسلمانوں میں انگریزوں سے نفرت کی وجہ سے سرکاری نوکری کا رجحان بہت کم تھا اور اگر کوئی مسلمان سرکاری نوکری کرتا تو دوسرے اسے عجیب نظروں سے دیکھا کرتے تھے۔ مگر والد صاحب کو ان کے والد یعنی میرے دادا نے سمجھایا تھا کہ جب مسلمان اپنا الگ ملک حاصل کرلیں گے تو ان کو ملک چلانے کے لیے ہر شعبے میں قابل اور تجربے کار افراد کی ضرورت ہوگی اس وقت یہی لوگ جو آج

انگریزوں کی نوکری کریں گے۔ وہ آگے چل کر مسلمانوں کے ملک کی خدمت کریں گے۔ بات والد صاحب کی سمجھ میں آگئی اور انہوں نے علی گڑھ یونیورسٹی سے بی اے کرنے کے بعد سرکاری ملازمت اختیار کر لی تھی۔ انہوں نے سول سروس کا امتحان بھی دیا تھا مگر ناکام رہے۔

والد صاحب کا گھرانہ خاص گورداس پور کے علاقے میں رہتا تھا۔ آزادی کا سورج ابھی طلوع نہیں ہوا تھا کہ اس علاقے کے مسلمانوں پر ہندو بلوائی ٹوٹ پڑے تھے۔ دور دور سے بلوائی یہ تہیہ کر کے آئے تھے کہ آزادی کے دن تک دہلی کو مسلمانوں کے وجود سے خالی کر دیں گے۔ چاہے اس کے لیے انہیں ایک ایک مسلمان کو کیوں نہ قتل کرنا پڑے۔ وہ پوری طرح مسلح اور تیار تھے۔ مگر دوسری طرف مسلمان بھی بے خبر نہیں تھے اور انہوں نے اپنے دفاع کی ساری تیاریاں کر لی تھیں۔ آبادیوں کے گرد حصار بنا لیے تھے جو کم نیچے اور کمزور تھے ان کی دیواروں کو اونچا اور مضبوط کر لیا تھا۔ جگہ جگہ چھتوں پر مورچے بنا لیے تھے۔ آتشیں اسلحہ کم تھا مگر لوگوں نے بھالے، نیزے، ڈنڈے، غلیلیں اور تیر کمان تیار کر لیے تھے۔ عورتیں اور بچے بھی پیچھے نہیں تھے۔ انہوں نے پتھر اور اینٹیں جمع کی تھیں۔ ساتھ میں دیگچیاں چولہوں پر چڑھا دی تھیں کہ جیسے ہی حملے کا شور ہو وہ آگ جلا دیں اور حملہ آوروں پر گرم پانی پھینکیں۔

آزادی کا اعلان ہوتے ہی بلوائی چاروں طرف سے مسلمان آبادیوں پر چڑھ دوڑے۔ مگر جب انہیں مسلمانوں کی مزاحمت کا سامنا کرنا پڑا تو ان کے ہوش ٹھکانے آگئے تھے۔ وہ لاشوں کے انبار چھوڑ کر بھاگے تھے۔ تین دن تک مسلمان ان کے حملے استقامت سے سہتے رہے اور انہیں پسپا کرتے رہے لیکن جب چوتھے دن بلوائیوں کے ساتھ بھارتی فوج بھی شامل ہوئی جس کے پاس بھاری مشین گن جیسے جدید ترین ہتھیار تھے تو مسلمان ان کا مقابلہ نہ کر سکے۔ بہت سی آبادیوں نے ہتھیار ڈال دیئے اور وہاں مسلمانوں کا قتل عام ہوا۔

جو ہتھیار ڈالنے کو تیار نہیں تھے انہوں نے پاکستان جانے کا فیصلہ کیا اور قافلے بنا کر گورداس پور سے نکلنے لگے۔ والد صاحب کے محلے میں لوگ ہجرت کے مسئلے پر تقسیم ہو گئے تھے۔ ان میں سے کچھ رہنا چاہتے تھے اور کچھ جانا چاہتے تھے۔ والد صاحب کے ساتھ ان کی گلی کے دو خاندان اور بھی تھے جنہوں نے ہجرت کا فیصلہ کیا۔ یہ شیخ صاحب اور خان صاحب کے خاندان تھے اور دونوں خاندانوں میں خاصی تعداد میں لوگ تھے۔ شیخ صاحب اور خان صاحب دونوں شادی شدہ تھے۔ شیخ صاحب کے تین بیٹے تھے اور خان صاحب کی ایک گود کی بیٹی تھی۔ میرے دو بڑے بھائی بھی ای اور والد صاحب کے ساتھ تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ ان کے علاقے سے نکلنے والا قافلہ پانچ سو افراد پر مشتمل تھا اور محلے سے نکلتے ہی اس پر حملے شروع ہو گئے تھے۔ لوگوں نے ہر ممکن ہتھیار ساتھ لے لیا تھا۔ راستے میں اس قافلے میں مزید لوگ شامل ہوئے اور یہ ہزاروں تک پہنچ گیا۔ قافلے پر درجن سے زیادہ حملے ہوئے اور ہر حملے میں سو سے زائد مسلمان شہید ہوئے تھے۔

والد صاحب بتاتے ہیں کہ عورتوں اور بچوں کو درمیان میں رکھا گیا تھا۔ پھر ان کے گرد بوڑھوں کا حصار تھا اور جوان جو لڑ سکتے تھے وہ قافلے کے سب سے باہر کے حصے میں تھے۔ اس لیے ہر حملے کا اولین نشانہ وہی بنتے تھے۔ مگر وہی مقابلہ بھی کرتے تھے۔ کتنے ہی بلوائی ان جوانوں نے جہنم رسید کیے۔ ان میں والد صاحب کے ساتھ خان صاحب اور شیخ صاحب بھی تھے۔ تینوں عمروں کے فرق کے باوجود ایک ہی علاقے اور گلی کے رہنے والے تھے۔ پھر مصیبت کا دور تھا اس لیے جلد ان تینوں میں بے تکلفی ہو گئی اور وہ شانہ بشانہ ہی سکھوں اور ہندوؤں سے لڑتے اور ایک دوسرے کی مدد کرتے۔ والد صاحب بتاتے ہیں کہ ان تینوں نے کم سے کم پندرہ بلوائی جہنم رسید کیے تھے اور کتنوں کو زخمی کیا تھا۔ اپنے حصے کی انہوں نے اتنی استقامت سے حفاظت کی کہ اس طرف بہت کم نقصان ہوا تھا۔

والد صاحب خاص طور سے خان صاحب کی بہادری اور استقامت کی تعریف کرتے تھے جو ہمیشہ ثابت قدم رہتے تھے اور نصف درجن بار زخمی ہونے کے باوجود انہوں نے کبھی حملہ آوروں کو پیٹھ نہیں دکھائی تھی۔ کئی کئی دن بنا آرام کیے مسلسل پہرے پر رہتے تھے۔ قافلے میں خوراک تو ایک طرف رہی پینے کے پانی کی بھی شدید قلت تھی۔ آبادیوں میں جا نہیں سکتے تھے اور جو کنویں اور تالاب مسلم بستیوں میں تھے ان میں ہندو سکھوں نے زہر ملا دیا تھا۔ پانی کا واحد ذریعہ نہریں اور دریا تھے۔ اس لیے سب ہی مشکل میں تھے مگر خان صاحب نے بہت زیادہ فاقے کیے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ جب وہ پاکستان کی سرحد میں داخل ہوئے تو بے ہوش ہو کر گر پڑے تھے اور پورے دو دن تک بے

ہوش رہے تھے۔ والد صاحب کا کہنا تھا کہ انہوں نے کم سے کم دو مواقعوں پر ان کی اور شیخ صاحب کی جان بچائی تھی۔

☆☆☆

امی ابوان بوڑھی خاتون کو بھی اپنے ساتھ لے آئے تھے۔ جن کا سارا خاندان راہ میں قربان ہو گیا تھا۔ وہ باقی عمر ہمارے ساتھ رہیں اور انہوں نے دس سال بعد ہمارے گھر میں اپنی آخری سانسیں لیں۔ مجھ سے بڑے دو بھائی اور ایک بہن اور پھر میں ان کے سامنے پیدا ہوئے اور ہم انہیں بہت عرصے تک اپنی سگی دادی سمجھتے رہے کیونکہ انہوں نے کبھی اپنے ماضی کا ذکر ہی نہیں کیا۔ ہمیشہ ان کے لبوں پر یہی رہا کہ اللہ کا احسان ہے کہ اس نے ہم مسلمانوں کو الگ وطن دیا جہاں ہم آزاد ہیں۔ ان کے انتقال کے بعد ایک دن امی نے بیٹھ کر ہم سب بہن بھائیوں کو ان کی زندگی کی اصل کہانی سنائی کیونکہ امی ان سے سب سن چکی تھیں۔ ان کی قربانی، نیک فطرت اور پُروقار شخصیت کی وجہ سے امی اور والد ان کا سگی ماں جیسا احترام کرتے تھے بلکہ والد ان کے لیے اتنے جذباتی تھے کہ ان کے انتقال کے بعد کتنے ہی دن روتے رہے اور ان کے لیے ایصال ثواب کا سلسلہ جاری رکھا۔

انڈیا میں والد صاحب محکمۂ داخلہ میں ملازم تھے۔ جب دونوں ملکوں میں سے کسی ایک ملک کو چننے کا مرحلہ آیا تھا تو والد صاحب نے فطری طور پر پاکستان کا انتخاب کیا۔ اگرچہ اس کے لیے انہیں اپنا جدی پشتی حویلی نما مکان چھوڑ کر آنا پڑا تھا اور یہاں آ کر انہوں نے اس کے کلیم میں تین کمروں کا ایک چھوٹا سا فلیٹ ہنسی خوشی قبول کر لیا تھا۔ وہ امی سے کہتے تھے کہ بہت سوں کو تو یہ بھی نہیں ملا۔ جب بھی امی اس کی تنگی سے پریشان ہو کر شکوہ کرتیں تو والد صاحب انہیں دوسروں کی مثال دیتے تھے۔ پھر وقت گزرا اور بچے ہونے سے فلیٹ اور تنگ پڑنے لگا تو والد نے اسے فروخت کر کے ان ہی دنوں نئی نئی آباد ہونے والی پی آئی بی کالونی میں پلاٹ لے کر اس پر چھوٹا سا مکان بنوا لیا۔ شروع میں دو کمرے تھے پھر جیسے جیسے حیثیت ہوتی گئی وہ بنواتے رہے۔ پلاٹ دو سو گز سے زیادہ کا تھا اس لیے خالی حصہ خاصا بڑا تھا اور اس میں امی نے چھوٹا سا باغ بنا لیا۔ ایک آم، ناریل، پپیتے کے درخت لگا لیے اور چھوٹی کیاریاں بنا کر ان میں سبزیاں بو لیں۔ ہم بہن بھائیوں کو کھیلنے کے لیے اچھی جگہ مل گئی تھی۔

جب ہم یہاں آئے تھے تو یہاں گنے چنے گھر تھے اور باقی زمین پر کیکر اگا ہوا تھا یا دوسری جھاڑیاں تھیں۔ رفتہ رفتہ لوگ آتے گئے اور گھر بنتے گئے۔ جب ہم یہاں آئے۔ تو بجلی بھی نہیں تھی جو کئی سال بعد آئی۔ پھر پانی کی لائنیں بچھیں اور سیوریج لائن ڈالی گئی البتہ گیس بہت بعد میں آئی تھی۔ مجھے یاد ہے امی ایک وقت مٹی کے تیل اور لکڑی سے جلنے والے چولہے پر کھانا بناتی تھیں۔ دادی جب تک زندہ رہیں امی کا برابر ہاتھ بٹاتی رہیں۔ اگرچہ امی ان کو بہت منع کرتی تھیں مگر وہ کہتیں کہ بندہ چلتا پھرتا رہے تو اس کے ہاتھ پاؤں بھی کام میں رہتے ہیں بیٹھے بندھے کے ہاتھ پاؤں بھی بندھ جاتے ہیں۔ فارغ اوقات میں وہ پودوں اور درختوں کی دیکھ بھال اور صفائی کرتی تھیں، ان کو پانی دیتیں۔ شام کو کھانا کھا کر وہ لازمی آدھا پون گھنٹا صحن میں چہل قدمی کرتی تھیں۔ گرمیوں میں صحن میں سوتی تھیں اور سردیوں میں کمرے میں آ جاتیں۔ انہیں پنکھے کی ہوا سے الجھن ہوتی تھی اس لیے وہ گرمیوں میں اندر کم ہی آتی تھیں۔ جب آم کا پیڑ بڑا ہوا تو گرمیوں میں اس کے نیچے چارپائی لگانے لگی تھیں۔ شاید یہی وجہ تھی کہ وہ آخر تک پوری طرح صحت مند رہیں اور جب ان کا اوپر سے بلاوا آیا تو بس دو دن بیمار رہ کر خالقِ حقیقی سے جا ملیں۔

دادی جب پاکستان آئیں تب بھی وہ ساٹھ سے اوپر کی تھیں۔ اس سفر میں ان کے دو جوان بیٹے، دو بہویں اور سات پوتے پوتیاں شہید ہوئے تھے۔ خاندان کے دوسرے لوگ اس کے علاوہ تھے۔ وہ اس پر بھی اللہ کا شکر ادا کرتی تھیں کہ ان کے خاندان کی سب عورتیں شہید ہوئیں بلوائی کسی کو اٹھا لے جانے میں کامیاب نہیں ہوئے تھے۔ چلتے وقت سب عورتوں نے اپنے لباس میں تیز چھری رکھی تھی اور جب ایسا موقع آیا کہ عزت اور زندگی میں سے کسی ایک چیز کا انتخاب کرنا ہو تو انہوں نے عزت کا انتخاب کیا اور جان دے دی۔ اپنے خاندان اور اس کی قربانیوں کے حوالے سے امی اور والد صاحب نے انہیں کبھی تاسف کرتے نہیں دیکھا، ہاں وہ قیام پاکستان کے بعد لوگوں کے بدل جانے پر افسوس کرتی تھیں۔ جو وطن ہم نے خون دے کر حاصل کیا اس سے اتنی جلدی بے پروا ہو جانا اور صرف اپنے مفاد میں لگ جانا تعجب انگیز ہی تھا۔ قیام پاکستان سے پہلے اور بعد کے حالات صرف دادی ہی نہیں بلکہ والد صاحب بھی بتاتے تھے۔ میں پاکستان آنے کے تین سال بعد پیدا ہوا تھا۔ میرے دو

بڑے بھائی ای اور والد صاحب کے ساتھ ہی آئے تھے۔

لاہور آنے کے بعد گورداس پور سے چلنے والا قافلہ تتر بتر ہو گیا تھا اور لوگ بکھر گئے۔ والد صاحب فوری کراچی چلے آئے تھے کیونکہ ان کی ڈیوٹی یہیں تھی۔ اس کے بعد والد صاحب کا خان صاحب اور شیخ صاحب سے رابطہ نہیں رہا۔ کئی سال بعد ان کی ملاقات پہلے خان صاحب سے ہوئی اور پھر ان سے شیخ صاحب کا پتا چلا۔ ان دونوں کا آپس میں رابطہ تھا۔ خان صاحب بینک ملازم تھے اور شیخ صاحب کاروباری آدمی تھے اس لیے اپنا کاروبار کر رہے تھے۔ والد صاحب نے انہیں بتایا کہ وہ کہاں رہ رہے ہیں اور یہ اچھی آبادی ہے تو ان دونوں نے بھی ہماری کالونی میں اور ہماری گلی میں پلاٹ لے لیے۔ یہ دادی کے انتقال کے دو سال بعد کی بات تھی۔ اتفاق کی بات تھی کہ یہ دو پلاٹ برابر وقت بک رہے تھے اور ایک خان صاحب اور ایک شیخ صاحب نے لے لیا۔

کارنر والا پلاٹ شیخ صاحب نے لیا تھا اور اس کے برابر والا خان صاحب نے۔ ایک سال بعد انہوں نے تعمیر شروع کرا دی۔ دونوں آر سی سی مکان بنوا رہے تھے۔ بنیادیں پڑ چکی تھیں اور پلرز کھڑے ہو رہے تھے کہ ایک دن صبح سویرے گلی میں شور شرابا ہوا۔ والد صاحب دفتر جانے کی تیاری کر رہے تھے وہ اور ہم بھائی جو اسکول جانے کی تیاری کر رہے تھے شور سن کر باہر نکل آئے۔ اس وقت ہمیں خان صاحب اور شیخ صاحب کا زیادہ علم نہیں تھا۔ لڑکے ویسے بھی خود میں مگن رہتے ہیں۔ والد صاحب کی ان سے دوستی تھی اور وہی انہیں جانتے تھے اور وہی دونوں آپس میں لڑ رہے تھے۔ ان کی آوازیں اتنی بلند تھیں کہ پوری گلی میں گونج رہی تھیں اور تقریباً سب ہی گھروں سے لوگ نکل آئے تھے۔ والد صاحب نے جا کر پوچھا۔ ''کیا بات ہے آپ دونوں صبح سویرے اس طرح کیوں لڑ رہے ہیں۔''

وہ دونوں ہی والد صاحب کی عزت کرتے تھے۔ کیونکہ ہمارا تعلق مشہور قاضی خاندان سے ہے۔ خان صاحب نے شکایتی انداز میں کہا۔ ''دیکھیں قاضی صاحب ہم نے مکان بنوانا شروع کیا تو شیخ صاحب نے ایک فٹ زمین زیادہ لے لی میرے پلاٹ میں سے۔''

''میں مانتا ہوں کہ زمین زیادہ آ گئی ہے۔'' شیخ صاحب بولے۔ ''مگر میں نے جان بوجھ کر نہیں لی ہے۔''

''دیکھا یہ بات مان گئے۔'' خان صاحب چہک کر بولے۔ ''مگر زمین واپس مانگتا ہوں تو مانتے نہیں ہیں۔''

''یہ ٹھیکیدار کی غلطی ہے۔ اب بنیادیں پڑ گئیں ہیں اور ستون اٹھ رہے ہیں۔ اتنا خرچا کر دیا ہے تو اسے کیسے توڑ دوں۔''

والد صاحب نے کہا۔ ''شیخ صاحب غلطی تو آپ کی ہے۔ بے شک ٹھیکیدار نے کی ہے مگر ذمے دار آپ ہیں۔''

''قاضی صاحب میں مان رہا ہوں۔ اب اس مسئلے کا حل یہ ہے کہ میں ایک فٹ زیادہ آ جانے والی زمین کا معاوضہ ادا کر دوں۔''

خان صاحب نے فوراً انکار کر دیا۔ ''مجھے تو زمین چاہیے۔''

''دیکھا قاضی صاحب یہ کیا بات کر رہے ہیں۔'' شیخ صاحب نے شکایت کی۔ ''کیا یہ معقولیت ہے۔''

''ہاں جی کسی کی زمین کھا جانا تو بڑی معقول بات ہے۔'' خان صاحب نے طنز کیا۔

والد صاحب نے کہا۔ ''دیکھیے میں آپ کا پڑوسی ہوں اور میرے لیے آپ دونوں برابر ہیں۔ دوسرے آپ دونوں آپس میں اچھے دوست ہیں مشکل وقت کے ساتھی رہے ہیں۔ اب اگر آپ دونوں جھگڑے کو بڑھاتے ہیں تو بات کورٹ کچہری تک بھی جائے گی۔ اگر آپ مجھ سے ثالثی چاہ رہے ہیں تو میں اس کے لیے بھی تیار ہوں۔''

''مجھے اپنی زمین چاہیے۔'' خان صاحب نے پختہ لہجے میں کہا۔

شیخ صاحب نے فریاد کی۔ ''میں بنیاد میں ہی ہزاروں روپے لگا چکا ہوں۔''

یہ 1960ء کی بات ہے جب خان صاحب اور شیخ صاحب نے اپنے مکانات بنوانے شروع کیے تھے۔ سستا زمانہ تھا اور آٹھ سال پہلے والد صاحب نے ڈھائی ہزار کا پلاٹ لیا تھا اور دو کمرے کل پانچ ہزار میں ڈلوائے تھے۔ اس کے بعد تھوڑے تھوڑے کر کے دو کمرے اور بنوا لیے تھے۔ ان پر بھی زیادہ خرچ نہیں آیا تھا۔ مگر والد صاحب نے سادہ بغیر بیم پلرز کا مکان بنوایا تھا۔ جب کہ خان صاحب اور شیخ صاحب پورا آر سی سی اسٹرکچر بنوا رہے تھے۔ اسی وجہ سے یہ مسئلہ ہوا تھا۔ شیخ صاحب کی بنیاد اور اسٹرکچر پہلے پڑا تھا اور خان صاحب کا دو تین دن بعد پڑا تھا۔ خان صاحب کی باتوں سے لگ رہا تھا کہ وہ مصالحت کے موڈ میں نہیں ہیں اس لیے والد صاحب نے مزید ان کے معاملے میں دخل

نہیں دیا۔ ان کا کہنا تھا کہ غلطی پہلے شیخ صاحب نے کی اور خان صاحب نے جب اپنے مکان کی بنیاد رکھی اور پھر پلنتھ کے ساتھ ستون بھی اٹھوا دیے تو اتنے عرصے بعد ان کو خیال آیا کہ ناپ کر دیکھ لیا جائے۔ اگر وہ شروع میں دیکھ لیتے جب تعمیر زیادہ نہیں ہوئی تھی تو مسئلہ آسانی سے حل ہو سکتا تھا۔

مگر اب بات اتنی بڑھ گئی تھی کہ دونوں ہی پیچھے ہٹنے کو تیار نہیں تھے۔ محلے میں کئی بار جھگڑے کا ماحول بنا مگر نوبت زبانی کلامی رہی۔ شیخ صاحب کاروباری آدمی تھے۔ وہ گروسری ہول سیلر تھے اور خاصا بڑا کاروبار تھا۔ جب انہوں نے یہ مکان بنانا شروع کیا تو ان کے تین بیٹے بھی کاروبار میں شریک ہو گئے تھے۔ کام ایسا تھا کہ ملازموں پر چھوڑا نہیں جا سکتا تھا بیٹوں کی وجہ سے شیخ صاحب کو بہت آسانی ہوئی تھی۔ کاروبار تھا اس لیے پیسا کھلا تھا۔ دوسری طرف خان صاحب ملازمت پیشہ آدمی تھے۔ ایک بینک میں ملازم تھے تنخواہ سے جوڑ جوڑ کر انہوں نے پہلے پلاٹ لیا تھا۔ پھر آفیسر گریڈ میں آئے تو بینک سے قرض لے کر اب مکان بنوا رہے تھے۔ ان کی دو بیٹیاں تھیں جو پڑھ رہی تھیں۔ پہلے دونوں کرائے کے مکان میں رہتے تھے۔ پہلی بار اپنا مکان بنوا رہے تھے۔

دونوں مکانوں کی تعمیر اور اس کے ساتھ ساتھ خان صاحب اور شیخ صاحب کی چخ چخ بھی چلتی رہی۔ مزے کی بات تھی کہ تعمیر کرتے ہوئے دونوں ہی جانتے تھے کہ اب مکان تڑوانا مسئلے کا حل نہیں رہے گا ورنہ اس میں دونوں فریقوں کو بہت نقصان ہوگا۔ زمین لیز تھی اور کے ڈی اے کی طرف سے منظور شدہ تھی اسی طرح نقشے بھی منظور شدہ تھے۔ اگر خان صاحب کے ڈی اے چلے جاتے تو شیخ صاحب مشکل میں پڑ سکتے تھے۔ مگر کے ڈی اے کی طرف سے توڑ پھوڑ ہوتی تو خان صاحب کا مکان بھی محفوظ نہیں رہتا۔ شاید اسی وجہ سے انہوں نے قانونی کارروائی سے گریز کیا۔ یوں ہی لڑائی جھگڑا چلتا رہا اور دونوں کے مکان مکمل ہو گئے۔ اس زمانے میں ایک منزلہ مکان کا رواج تھا اور پھر بڑے پلاٹ تھے اس لیے ایک منزل بھی کافی ہوتی تھی۔ اب دونوں پڑوسی بن گئے تھے مگر ان کے تعلقات سخت کشیدہ تھے۔ باقی سارے محلے سے بہت اخلاق اور خلوص سے ملتے تھے مگر ایک دوسرے کی طرف دیکھنے کے روادار بھی نہیں تھے۔

خان صاحب تقریباً چالیس برس کے سرخ و سفید اور تنومند آدمی تھے مگر تہذیب اور تمیز کا دامن کبھی ہاتھ سے نہیں چھوڑا۔ شیخ صاحب سے لڑائی جھگڑے کے دوران ان کی آواز ضرور بلند ہو جاتی تھی مگر الفاظ میں کبھی گھٹیا پن نہیں آیا۔ ہمیشہ آپ جناب سے بات کرتے تھے۔ گھٹیا الفاظ تو کبھی شیخ صاحب نے بھی استعمال نہیں کیے مگر وہ کبھی کبھی آپ جناب کا دامن چھوڑ دیتے تھے۔ خان صاحب کی بیوی بھی ان کی طرح پُرخلوص اور محلے والوں سے خوش اخلاقی سے ملتی تھیں ان کے گھر جاؤ تو بچھی جاتیں۔ دونوں بیٹیاں اس وقت چودہ اور پندرہ سال کی تھیں۔ وہ بھی شکل صورت کی اچھی اور تمیز والی لڑکیاں تھیں۔ اسکول میں پڑھتی تھیں۔ امی نے خان صاحب کی فیملی سے بہت جلد تعلق بنا لیا تھا اور ان کے آنا جانا شروع کر دیا تھا۔ خان صاحب کی بیگم آتی تھیں البتہ بیٹیاں بہت کم آتی تھیں کیونکہ ہمارے ہاں زیادہ تر لڑکے تھے۔

اگرچہ ہم سب بھائی ان بہنوں سے چھوٹے یا ان کے آس پاس کے تھے اس کے باوجود اس زمانے میں ان باتوں کا بہت خیال رکھا جاتا تھا۔ امی بھی اس بات کا خیال رکھتی تھیں کہ اگر کچھ کہنا منگوانا یا بھیجنا ہو تو مجھ سے بڑی نورین باجی کو بھیجتی تھیں۔ مجبوری میں مجھے بھیج دیا کرتی تھیں مگر مجھ سے بڑے بھائیوں کو کبھی ان کے دروازے پر نہیں بھیجا تھا۔ خان صاحب بیوی اور بیٹیوں کے معاملے میں بہت غیرت مند تھے۔ ان کی بیٹیاں بارہ سال کی عمر میں پردہ کرنے لگی تھیں۔ اس لیے امی بھی اس چیز کا خیال رکھتی تھیں۔ چند دن میں ہی امی اس گھرانے کے گن گانے لگیں اور شیخ صاحب ان کے نزدیک ولن بن گئے جو نہ صرف خان صاحب کی زمین کھا کر بیٹھ گئے تھے بلکہ ان سے دشمنی بھی پال لی تھی۔

دوسری طرف شیخ صاحب کا گھرانہ تھا۔ دونوں میاں بیوی کے علاوہ تین بیٹے تھے۔ سب سے بڑا اٹھارہ سال کا تھا اس سے چھوٹا سولہ سال کا اور سب سے چھوٹا بھی پندرہ سال کا تھا۔ دونوں بڑے بیٹے بالترتیب انٹر اور میٹرک کر کے باپ کے ساتھ کاروبار میں لگ گئے تھے۔ سب سے چھوٹا میٹرک کر رہا تھا مگر وہ بھی شام کے وقت دکان اور گودام پر جاتا تھا۔ چاروں باپ بیٹے بلا کے محنتی تھے۔ صبح گھر سے نکلتے تو دن کی روشنی میں انہیں کسی نے گھر میں آتے نہیں دیکھا تھا۔ اکثر ان کی واپسی سات آٹھ بجے تک ہوتی تھی۔ اس

محنت کا صلہ پیسے کی صورت میں ملا ہوا تھا۔ خان صاحب اور شیخ صاحب دونوں کے مکانات برابر میں تھے۔ خان صاحب نے بھی اچھے انداز میں بنوایا تھا اگرچہ چھوٹا تھا۔ انہوں نے سامنے کی طرف خوب صورت لان بھی بنوایا تھا۔ مگر شیخ صاحب کا مکان دیکھنے سے تعلق رکھتا تھا۔ اس وقت انہوں نے مکان میں وہ چیزیں لگوائی تھیں جن کا متوسط طبقے میں بھی رواج نہیں تھا۔ انہوں نے پورے گھر میں ماربل کا فلور کرایا تھا۔ جدید طرز کا کچن اور باتھ رومز بنوائے تھے۔ ان کے پاس کار بھی تھی جس کے لیے سامنے جدید طرز کا پورچ بنایا تھا۔

شیخ صاحب لوگ پہلے آئے تھے مگر ان کی بیگم سے امی کی باقاعدہ ملاقات محلے کی ایک شادی میں کئی مہینے بعد ہوئی تھی اور تب امی کو پہلی بار پتا چلا کہ شیخ صاحب اور ان کی فیملی بھی بہت اچھی ہے۔ امی اور محلے والے ان کے بارے میں جو تاثر رکھے ہوئے تھے وہ درست نہیں تھا کیونکہ خان صاحب گھلنے ملنے والے آدمی تھے۔ سب محلے والوں سے ان کی سلام دعا ہو گئی تھی۔ اس لیے وہ شیخ صاحب کے بارے میں جو بتاتے لوگ اسی پر یقین کرتے تھے۔ شیخ صاحب سے لوگوں کی صرف جمعے کی نماز میں محلے کی مسجد میں یا پھر رات گھر آتے ہوئے سلام دعا ہوتی تھی اور اس میں آدمی زیادہ بات نہیں کر سکتا ہے۔ اس لیے شیخ صاحب تردید نہیں کر سکتے تھے اور نہ ہی اپنا نقطہ نظر بیان کر سکتے تھے۔ درحقیقت شیخ صاحب اور ان کی بیگم کو علم ہی نہیں تھا کہ محلے میں ان کے بارے میں کیا باتیں پھیل رہی ہیں اور لوگ ان کے بارے میں کیا تاثر رکھتے ہیں۔

شیخ صاحب کی بیگم نے خود امی سے بات شروع کی اور پھر کچھ ہی دیر میں امی ان سے گھل مل گئیں۔ دونوں خواتین نے ایک دوسرے کو گھر آنے کی دعوت دی۔ پہلے شیخ صاحب کی بیگم آئیں۔ امی نے پہلی بار ان سے کھل کر بات کی۔ شادی کی محفل میں کھل کر بات کرنا ممکن نہیں تھا اور شیخ صاحب کی بیگم حیران رہ گئیں جب انہیں پتا چلا کہ محلے والے انہیں اور ان کے شوہر کو بد دماغ اور برا سمجھتے تھے۔ کیونکہ انہوں نے خان صاحب کے پلاٹ کے کچھ حصے پر قبضہ کر لیا تھا۔ شیخ صاحب کی بیگم نے امی کو حلفیہ کہا۔ ”خدا جانتا ہے ہم نے کبھی نہیں کہا کہ ہم نے ٹھیک کیا ہے۔ ہمیشہ مانا کہ خان صاحب کی زمین کا ایک فٹ ہمارے پلاٹ میں شامل ہو گیا ہے۔ شیخ صاحب نے کبھی اس کی تلافی سے انکار نہیں کیا۔ جب پہلی بار انہیں پتا چلا تو انہوں نے یہاں زمین کی قیمت کے حساب سے خان صاحب کو ادائیگی کرنے کو کہا مگر وہ نہیں مانے۔“

”یہ تو ہمیں معلوم ہے۔“

”پھر بھی لوگ ہمیں خائن سمجھتے اور کہتے ہیں۔“ شیخ صاحب کی بیگم نے شکوہ کیا۔ ”یہی نہیں شیخ صاحب نے خان صاحب کو منانے اور تلافی کی ہر ممکن کوشش کی۔ وہ رقم بھی بڑھاتے رہے اور اب زمین کی موجودہ قیمت سے دوگنی رقم دینے کو تیار ہیں۔ مگر خان صاحب کلف لگے لٹھے کی طرح اکڑ گئے ہیں کسی صورت مان کر نہیں دے رہے۔ ان کی ایک ہی ضد ہے کہ مکان کا اتنا حصہ توڑ کر زمین ان کو دے دی جائے۔ آپ خود سوچیں کہ اگر ہم ایک فٹ کا حصہ مکان توڑ دیں تو ہمارا تو پورا مکان ہی برباد ہو جائے گا۔ کتنا خرچا آئے گا پھر سے بنوانے اور ٹھیک کرنے میں۔ بعض جگہیں تو بیکار ہو جائیں گی۔ پھر نیچے بنیاد سے لے کر اوپر بیم تک سب کچھ بنوانا پڑے گا۔“

”کہہ تو آپ ٹھیک رہی ہیں۔“ امی نے دبے لفظوں میں کہا۔ ”مگر زمین بہرحال آپ کے پاس ہے اور خان صاحب کو تلافی کرنا آپ کا کام ہے۔“

شیخ صاحب کی بیگم نے ٹھنڈی سانس لی۔ ”سچ پوچھیں تو میں بھی روز روز کی چخ چخ سے تنگ آگئی ہوں۔ میں نے شیخ صاحب سے کہا کہ آپ اتنا حصہ توڑ کر زمین خان صاحب کو دے دیں مگر ان کا ہاتھ آج کل تنگ ہے۔ پچھلے دنوں کچھ پارٹیوں نے دھوکا کیا۔ سامان لے گئے اور رقم نہیں دی ہے اس سے بہت نقصان ہوا ہے۔ شیخ صاحب کہہ رہے ہیں کہ کچھ رقم ہاتھ آجائے تو ایسا ہی کرتے ہیں۔ مگر خان صاحب اس ایک فٹ کے ٹکڑے کو لے کر کیا کریں گے۔ کیا اپنا مکان بڑھانے کے لیے وہ بھی توڑ پھوڑ کریں گے۔“

امی جانتی تھیں کہ خان صاحب کی پوزیشن بالکل بھی ایسی نہیں ہے کہ وہ مکان کا یہ حصہ توڑ کر دوبارہ بنوا سکیں اور مسئلہ وہی تھا کہ نیچے بنیاد سے لے کر اوپر بیم تک سب نئے سرے سے بنوانا پڑتا تھا اور یہی کام بہ قول شیخ صاحب کی بیگم ان کو بھی کرنا پڑتا۔ حالات ان کے بھی سخت تھے۔ پاکستان بنے پندرہ سال ہوئے تھے اور ابھی ملک کے حالات سنبھلے نہیں تھے۔ اچھے اور مستحکم کاروباریوں کو کمانے کے لیے بہت محنت کرنا پڑتی تھی۔ دو نمبری کا رواج بہت کم

تھا اور زیادہ تر لوگ محنت اور رزق حلال پر یقین رکھتے تھے۔ جو ہزار پتی تھا وہ بھی محنت سے کماتا اور جو لکھ پتی تھا وہ بھی محنت سے کماتا تھا۔ اس سے اوپر کمانے والے اس زمانے میں جیسے آسمان کی مخلوق سمجھے جاتے تھے۔ اس پہلی ملاقات میں امی نے زیادہ تر شیخ صاحب کی بیگم کی بات سنی۔

لیکن اس کے بعد ان کی جب ان سے ملاقات ہوتی وہ کہتیں کہ اس مسئلے کا حل نکالا جائے تاکہ دو پڑوسیوں میں جھگڑے کی بنیاد ختم ہو اور وہ معمول کے مطابق رہ سکیں۔ ابھی تو یہ حال تھا کہ اوپری منزل کی سب سے اونچی دیوار محلے میں ان دو گھروں کے درمیان تھی۔ تاکہ اگر چھت پر بیک وقت جائیں تو ایک دوسرے کا آمنا سامنا نہ ہو۔ محلے کے دوسرے لوگوں نے کئی بار کوشش کی کہ ان کی آپس میں صلح کرا دی جائے۔ مگر مسئلہ اس ایک فٹ دیوار کا تھا جو مرے کتے کی طرح کنوئیں میں پڑی تھی جب تک یہ کتا نہیں نکالا جاتا کتنے ہی ڈول پانی کیوں نہ نکال دیا جائے پانی سے بدبو نہیں جاتی۔ یہ مسئلہ محلے والے حل نہیں کر سکتے تھے کیونکہ دونوں ہی اپنے مؤقف سے ایک انچ پیچھے ہٹنے کو تیار نہیں تھے۔ خان صاحب اڑے تھے کہ شیخ صاحب کا مکان ٹوٹے گا اور شیخ صاحب اڑے ہوئے تھے کہ بے شک وہ ان سے دگنا معاوضہ لے لیں مگر وہ اپنا اتنی محنت اور سرمائے سے بنایا ہوا مکان نہیں توڑیں گے۔

خاص بات یہ تھی کہ شیخ صاحب بے شک دو گنا معاوضہ دے دیتے یا دس گنا کاغذات میں یہ زمین خان صاحب کی ہی شمار ہوتی۔ محلے کے کچھ سیانوں نے شیخ صاحب کو سمجھایا کہ یہ مسئلہ ہمیشہ رہے گا۔ اس کا سب سے اچھا حل ہے کہ وہ خان صاحب سے مکان ہی خرید لیں۔ جن دنوں امی نے شیخ صاحب کی بیگم سے ملنا جلنا شروع کیا تھا ان دنوں شیخ صاحب کے اپنے حالات اچھے نہیں تھے۔ اس لیے وہ پورا مکان خریدنے کی پوزیشن میں نہیں تھے۔ اگر وہ کاروبار سے اتنی بڑی رقم نکال لیتے تو کاروبار کہاں سے کرتے ان کا تو بزنس ہی زیادہ تر ادھار پر چلتا تھا۔ وہ کہہ رہے تھے کہ حالات بہتر ہو جائیں تو وہ اس کے لیے بھی تیار تھے۔ دوسری طرف خان صاحب کا صبر کا پیمانہ لبریز ہوتا جا رہا تھا۔ مکان کی تعمیر کے تیسرے سال انہوں نے کے ڈی اے میں درخواست دے دی کہ شیخ صاحب نے ان کی زمین پر تصرف کیا ہے اور وہ ان سے حاصل کر کے انہیں دے جائے۔ خان صاحب نے بلڈنگ کنٹرول اتھارٹی کو درخواست دی تھی جو تعمیرات کے بارے میں مجاز اتھارٹی تھی اگر وہ دیکھتی اور سمجھتی کہ تعمیر غلط ہوئی ہے تو وہ اسے توڑنے کی مجاز بھی تھی۔

چند دن بعد شیخ صاحب کو نوٹس آ گیا اور وہ جواب دینے کے لیے مجاز دفتر پہنچ گئے۔ وہاں خان صاحب اور شیخ صاحب نے کئی پیشیاں بھگتائیں اور پھر فیصلہ خان صاحب کے حق میں ہو گیا۔ اس دن خان صاحب اتنے خوش تھے کہ آتے ہوئے مٹھائی کا پورا ٹوکرا لائے اور سارے محلے میں مٹھائی بانٹی۔ حالانکہ ابھی صرف ان کے حق میں فیصلہ ہوا تھا۔ ابھی مجاز اتھارٹی شیخ صاحب کو نوٹس دیتی کہ وہ ازخود یہ بڑھا ہوا حصہ مسمار کر دیں۔ ایک کے بعد دوسرا نوٹس جاری ہوتا اور اس کے بعد کے ڈی اے کا عملہ خود کارروائی کرنے آ جاتا۔ اس سارے عمل میں مہینوں لگ سکتے تھے۔ شیخ صاحب اور ان کی بیگم اس بارے میں خاموش تھے۔ جب امی نے ان کی بیگم سے پوچھا کہ اب کیا ہوگا؟ تو انہوں نے ایک ہی جواب دیا۔ ”جو ہوگا وہ سارا محلہ دیکھے گا۔“

ایک مہینے بعد شیخ صاحب کو پہلا نوٹس ملا اور خان صاحب نے اس روز بھی شیرینی بٹوائی تھی۔ حسب معمول شیخ صاحب کے گھر کی طرف سے کوئی ردعمل نہیں ہوا اور نہ لوگوں کو توقع تھی کہ دونوں میں پھر لڑائی ہو گی۔ جس دن دوسرا نوٹس آیا اس دن سب کو یقین ہو گیا کہ اب شیخ صاحب کا مکان ٹوٹا ہی ٹوٹا۔ مگر کوئی ڈھائی مہینے بعد جب کے ڈی اے کا عملہ آیا تو شیخ صاحب نے انہیں عدالت کا حکم امتناعی دکھا دیا۔ انہوں نے خاموشی سے عدالت سے استثناء لے لیا تھا۔ اب سب کی سمجھ میں آیا کہ شیخ صاحب اتنے خاموش کیوں بیٹھے تھے اور انہیں خان صاحب کی پرواہ کیوں نہیں تھی۔ وہ پہلے ہی حفاظتی اقدام کر چکے تھے۔ جب کے ڈی اے کا عملہ واپس جانے لگا تو خان صاحب نے انہیں روکنے کی کوشش کی مگر انہوں نے عذر پیش کیا کہ وہ عدالتی حکم کے سامنے کچھ نہیں کر سکتے۔ اب خان صاحب پہلے عدالت جائیں اور وہاں سے اس حکم امتناعی کو ختم کرائیں اس کے بعد ہی وہ کچھ کر سکتے تھے۔ یہ کہہ کر عملہ چلتا بنا۔

بہت عرصے بعد اس دن شیخ صاحب اور خان صاحب میں لڑائی ہوئی اور یہ ایسی لڑائی تھی کہ اگر محلے والے درمیان میں نہ پڑتے تو وہ آپس میں ہاتھا پائی پر اتر آتے۔ مگر زبانی دونوں نے ایک دوسرے کو دل کھول کر سنائیں اور پہلے اگر کوئی حد رہتی تھی تو اس دن وہ حد بھی ختم ہو

گئی۔ یہ مشکل لوگ ان کو ان کے گھروں میں بھیجنے میں کامیاب رہے اور کچھ افراد رات تک پہرہ بھی دیتے رہے کہ وہ لڑنے کے لیے پھر باہر نہ نکل آئیں۔ اس زمانے میں آتشیں ہتھیار کم ہوتے تھے مگر چاقو چھری اور ڈنڈے وغیرہ تو ہر گھر میں پائے جاتے تھے۔ خانگی لڑائیوں میں یہی ہتھیار استعمال ہوتے تھے۔ مرنے مارنے کی نوبت تو کم آتی تھی مگر زخمی بہت ہوتے تھے۔ لوگوں کو یہی دھڑکا لگا ہوا تھا کہ وہ کہیں لڑائی میں کوئی ہتھیار نہ استعمال کریں۔ شیخ صاحب ٹھنڈے دماغ کے آدمی تھے مگر ان کے بیٹے تو جوان اور گرم مزاج تھے۔

بہر حال یہ رات سکون سے گزر گئی۔ آنے والے اتوار کو محلے کے بڑے ہمارے ہاں جمع ہوئے۔ خان صاحب اور شیخ صاحب کو بھی بلایا گیا۔ پہلے تو وہ ایک دوسرے کا سن کر آنے کو تیار نہیں تھے مگر کسی نہ کسی طرح انہیں منا لیا گیا۔ جب وہ آئے تو ان کے چہروں پر بہت زیادہ کشیدگی تھی۔ محلے میں ایک وکیل صاحب بھی رہتے تھے۔ سب سے پہلے تو انہوں نے عدالتی کارروائیوں کے بارے میں تفصیل سے بتایا کہ اس میں کتنے مشکل مراحل ہوتے ہیں اور معمولی مقدمات بھی سالوں تک چلتے رہتے ہیں۔ کسی بھی مسئلے کو حل کرنے کا سب سے پیچیدہ اور مشکل راستہ عدالت کا ہے۔ دونوں فریقوں کو اس صورت میں بہت سی مشکل پیش آئیں گی۔ ان کا بہت وقت اور پیسا اس کام میں صرف ہوگا اور عین ممکن ہے کہ عدالت سے باہر اس کا حل بہت کم پیسوں اور وقت میں ہو جائے اس لیے ان کی گزارش ہے کہ عدالتی حل سے اجتناب کیا جائے۔ میں اس ساری کارروائی کا عینی گواہ ہوں کیونکہ والد صاحب نے مجھے امور مہمانداری پر مقرر کیا ہوا تھا اور میں وہیں موجود تھا۔ وکیل صاحب کی تقریر کے بعد والد صاحب نے خان صاحب سے کہا۔

"اب آپ اپنی بات کیجیے لیکن خدا کے واسطے بات ایسی ہو جس میں کوئی راستہ نکل رہا ہو۔ ہم اسی مقصد کے لیے یہاں جمع ہوئے ہیں کہ کوئی ایسا راستہ نکل آئے جس پر آپ دونوں راضی ہوں۔ مجھے امید ہے آپ دونوں اپنے مؤقف میں نرمی لائیں گے۔"

خان صاحب نے کہا۔ "میرا مؤقف بہت سیدھا اور صاف ہے کہ مجھے میری زمین دی جائے۔ میں مانتا ہوں کہ شیخ صاحب نے جان بوجھ کر یہ زمین نہیں لی ہے۔ مگر غلطی ان کی ہے۔ اب اس کی تلافی بھی ان کی ذمے داری ہے۔ میرے نزدیک اس کے سوا اور کوئی حل نہیں ہے۔"

"زمین کی دوگنی قیمت ایک معقول حل ہے۔" وکیل صاحب نے کہا۔

"معاف کیجیے گا۔" خان صاحب کے تیور کڑے ہو گئے۔ "پیسا ہر مسئلے کا حل نہیں ہوتا ہے اور خاص طور سے جب انسان کی عزت داؤ پر لگی ہو۔ یہ ملک ہم نے بے پناہ قربانیوں کے بعد حاصل کیا ہے۔ میرے خاندان کے لوگوں کا لہو اس میں شامل ہے۔ اب اگر انڈیا بہت بڑی رقم کے بدلے ہم سے اس کا چند گز ٹکڑا مانگے تو کیا ہم اسے پیسے کے عوض دے دیں گے؟ ہرگز نہیں کیونکہ یہ عزت کا معاملہ ہے۔ انڈیا خون دے کر ہی ہم سے یہ زمین لے سکتا ہے۔ اسی طرح پلاٹ کی یہ چھوٹی سی زمین میں نے بہت مشکل اور کوشش کے بعد لی۔ کمیٹیاں ڈالیں۔ میرے اور میرے بیوی بچوں نے کم میں گزارا کیا۔ میری بیوی نے اپنی ماں کی واحد نشانیاں سونے کی بالیاں اس زمین کی خاطر بیچ دیں۔ جس دن میں نے اس پلاٹ کی رقم ادا کی اس دن میری جیب میں ایک روپیا نہیں تھا کہ میں گھر کھانے کے لیے کچھ لے کر جاؤں۔ تنخواہ ملنے میں دو دن تھے۔ ہم نے یہ دو دن کیسے گزارے یہ ہم ہی جانتے ہیں۔ آپ سب مہربانی کریں اس زمین کے لیے میرے اور میرے گھر والوں کے جذبات سمجھیں۔ یہ ہمارے لیے عام پلاٹ نہیں ہے۔ مجھے بس اتنا ہی کہنا ہے۔"

خان صاحب کہہ کر بیٹھ گئے۔ سب کچھ دیر کے لیے خاموش رہے تھے۔ خان صاحب کی بات ایسی نہیں تھی جس نے کسی دل پر اثر نہ کیا ہو۔ انہوں نے بہت جذباتی انداز میں بات کی تھی۔ شیخ صاحب کھڑے ہوئے اور انہوں نے کھنکھار کر کہا۔ "خان صاحب نے بات کو انڈیا اور پاکستان تک پہنچا دیا۔ اگرچہ وہ بھول گئے کہ ہم نہ صرف ایک مذہب کے ماننے والے اور ایک ملک کے رہنے والے ہیں بلکہ بنیادی طور پر ہمارا تعلق ایک ہی خطے سے ہے۔ اب ہم آپس میں پڑوسی بھی ہیں۔ اس لیے میری درخواست ہوگی کہ خدارا مجھے خود سے اتنا دور نہ کریں جتنا کہ یہ دونوں ملک ہیں۔ ہمارا تنازعہ بہت معمولی سا ہے۔ مجھے تسلیم ہے کہ خان صاحب نے بہت مشکل سے یہ پلاٹ حاصل کیا ہے اور اس سے ان کی جذباتی وابستگی ہے۔ لیکن اگر اس کی ایک فٹ کی زمین غلطی سے میرے پلاٹ میں شامل ہو گئی تو اس میں خدا ناخواستہ عزت بے عزتی کا مسئلہ نہیں آگیا اور نہ ہی میں نے

اس زمین کو اپنی زمین سمجھا۔ اگر میں تین سال سے اسے استعمال کر رہا ہوں تو میں اب تک کا اس کا جو کرایہ بنتا ہے وہ بھی دینے کو تیار ہوں۔ میں خان صاحب کو زمین کی مارکیٹ سے دوگنے ریٹ دینے کو تیار ہوں۔ اگر خان صاحب اس پر راضی نہیں ہیں تو وہ جو کہیں میں وہ دینے کو تیار ہوں۔''

''مجھے صرف زمین چاہیے۔'' خان صاحب نے حتمی لہجے میں کہا۔

''اس طرح تو بات نہیں بنے گی۔'' شیخ صاحب بولے۔

''بات اسی طرح بنے گی۔'' خان صاحب کا لہجہ پھر بگڑ گیا۔

''پلیز خان صاحب۔'' والد صاحب نے کہا۔ ''ہم یہاں مسئلے کا حل نکالنے کے لیے جمع ہوئے ہیں۔ اگر آپ اپنی بات پر جمے رہے تو حل کس طرح نکلے گا۔''

''جس طرح بھی نکلے مجھے اپنی زمین چاہیے۔'' خان صاحب بولے۔ ''اگر یہ عدالت تک جاسکتے ہیں تو میں بھی جا سکتا ہوں۔''

''عدالت جانا آپ کے اور میرے لیے نقصان دہ ہوگا۔'' شیخ صاحب بدستور تحمل سے بول رہے تھے۔ ''میرے پاس ایک تجویز اور ہے۔''

''کیسی تجویز شیخ صاحب؟'' والد صاحب نے پوچھا۔

''میں خان صاحب کا پورا مکان خرید لیتا ہوں اور خان صاحب مجھ سے رقم لے کر اسی علاقے میں اپنا دوسرا مکان تیار کر لیں اور اس دوران میں اسی مکان میں رہیں۔ یہاں بنے بنائے مکان کی قیمت پچیس ہزار ہے اور پلاٹ دس ہزار میں مل جاتا ہے۔ لیکن میں خان صاحب کو تیس ہزار کی آفر کرتا ہوں۔''

شیخ صاحب کی اس فراخ دلانہ تجویز نے سب کو چونکا دیا تھا۔ وکیل صاحب بولے۔ ''یہ تو بہت اچھی تجویز ہے۔''

والد صاحب اور دوسروں نے بھی اس کی تائید کی تو خان صاحب پھر بگڑ گئے۔ ''خاک اچھی تجویز ہے آپ لوگوں کے دماغ میں یہ بات نہیں آرہی کہ میں اپنا پلاٹ کسی صورت نہیں چھوڑنا چاہتا۔ میری اس سے جذباتی وابستگی ہے۔''

''ٹھیک ہے اس سے آپ کی جذباتی وابستگی ہے مگر مسئلے کا حل تو نکل رہا ہے۔'' والد صاحب نے کہا۔

''مجھے یہ حل منظور نہیں ہے۔'' خان صاحب بولے تو رائے عامہ جو ان کی بات سن کر ان کی حامی ہوگئی تھی۔ اب ان کے سخت رویے کے باعث کبیدہ دکھائی دینے لگی۔ وکیل صاحب نے کہا۔

''خان صاحب آپ کا رویہ بے لچک ہے اور اس سے مسئلہ حل نہیں ہوگا۔''

''نہ ہو۔''

''معاملہ عدالت میں ہے۔'' وکیل صاحب نے انہیں یاد دلایا۔

''بے شک ہو میں وہاں بھی دیکھ لوں گا۔'' خان صاحب نے کہا اور کھڑے ہوگئے۔ وہ دوسروں کے روکنے کے باوجود وہاں سے چلے گئے۔ ان کے جانے کے بعد لوگ ان کے رویے پر تبصرہ کرنے لگے اور اکثر کا تبصرہ منفی تھا۔ خان صاحب نے تقریباً سب کو اپنا مخالف کر لیا تھا اور جو مخالف نہیں تھے وہ اب ان کے حامی بھی نہیں رہے تھے۔ ایسا لگ رہا تھا کہ بحث کی حد تک خان صاحب نے اپنا کیس خراب کر لیا تھا۔ وکیل صاحب نے کہا کہ وہ عدالت میں بھی مقابلہ نہیں کر سکیں گے کیونکہ جب شیخ صاحب یہ سب پیشکشیں وہاں رکھیں گے تو عدالت بھی ان کو قبول کرنے کو کہے گی اور اس کا امکان بہت کم ہے کہ خان صاحب کے حق میں فیصلہ آجائے۔ بلکہ سماعت بھی اسی وقت ہوگی جب شیخ صاحب چاہیں گے۔ ورنہ ان کا وکیل تاریخ لیتا رہے گا اور خان صاحب اس میدان میں زیادہ دیر مقابلہ نہیں کر سکیں گے۔ خود خان صاحب جسے وکیل کریں گے وہ بھی یہی چاہے گا کہ مقدمہ طول کھینچتا رہے تاکہ اس کی روزی بندھی رہے۔

پھر ایسا ہی ہوا تھا۔ خان صاحب نے بھی ایک وکیل کیا اور حکم امتناعی کے خلاف عدالت میں چلے گئے۔ مگر شیخ صاحب کا وکیل زیادہ قابل اور ہوشیار تھا اس نے مقدمے کو طول دینے کے لیے تاریخیں لینا شروع کر دیں۔ متعدد بار تاریخ لینے کے بعد کوئی ایک سال کے بعد جا کر پہلی پیشی ہوئی جس میں خان صاحب کے وکیل نے جج کے سامنے ان کا کیس پیش کیا۔ اس پہلی پیشی تک خان صاحب وکیل اور کیس پر خاصی رقم خرچ کر چکے تھے اور امی کو ان کی بیگم سے پتا چلا تھا کہ ان کے مالی حالات تنگ ہیں۔ امی نے بھی انہیں یہی مشورہ دیا کہ وہ شیخ صاحب کی پیشکش قبول کر لیں۔ مالی لحاظ سے وہ شیخ صاحب کا مقابلہ نہیں کر سکتے تھے۔ خان

''خان صاحب کے گھر کے حالات خراب ہیں۔ بھابی اور بچیوں کے منہ اترے ہوئے ہیں۔ سال بھر سے پرانے کپڑے اب تک چلا رہی ہیں۔ چھوٹی کو تو اب کپڑے بھی چھوٹے پڑ گئے ہیں۔ مگر خان صاحب ہیں کہ ان کو بیوی بچوں کی پرواہ نہیں ہے۔ بیوی نے صلح کا کہا تو اسے طلاق دینے پر آمادہ ہو گئے۔''

''بس اللہ ہی ان کو عقل دے، ورنہ سب نے پوری کوشش کر لی ہے۔'' والد صاحب نے گہری سانس لے کر کہا۔

میں نے بتایا کہ والد صاحب سرکاری ملازم تھے اور ساٹھ کی دہائی کے آخر میں انہیں دارالحکومت کراچی سے اسلام آباد منتقل کر دیا گیا تھا۔ مگر بیشتر سرکاری دفاتر اور ملازمین ابھی کراچی میں کام کر رہے تھے جیسے جیسے ان کے لیے اسلام آباد میں بندوبست ہو رہا تھا وہ وہاں جا رہے تھے۔ والد صاحب کو بھی ایسے اشارے مل رہے تھے کہ ان کا دفتر بھی عنقریب اسلام آباد جانے والا ہے اور ظاہر ہے انہیں بھی وہاں جانا ہوگا۔ اس لیے والد صاحب نے ابھی سے تیاری شروع کر دی۔ میرے سب سے بڑے بھائی ذوالفقار قاضی گریجویشن کر کے پی آئی اے میں ملازم ہو گئے تھے۔ ان سے چھوٹے عمار قاضی ان دنوں گریجویشن کر رہے تھے۔ نورین باجی بھی کالج میں ایف اے کے دوسرے سال میں تھیں اور میں یعنی ابصار احمد قاضی میٹرک میں تھا۔ ابو نے فیصلہ کیا کہ اگر ان کا تبادلہ ہوا تو وہ پہلے اکیلے اسلام آباد جائیں گے۔ مکان اور ضروریات کا بندوبست ہونے کے بعد وہ امی کو بلوا لیں گے۔

ہم سب بہن بھائیوں کے لیے فیصلہ ہوا کہ ہم یہیں رہیں گے۔ جب نورین باجی بی اے کر لیں گی تو وہ والدین کے پاس چلی جائیں گی۔ اس کے بعد نورین باجی اور ذوالفقار بھائی کی شادی۔۔۔ کی جائے گی۔ دونوں کے رشتے طے تھے اور خاندان میں ہی ہوئے تھے۔ بھابی کے آ جانے سے گھر دیکھنے کے لیے ایک عورت آ جاتی۔ والد صاحب کا ارادہ مستقل اسلام آباد میں رہنے کا نہیں تھا۔ وہ ریٹائرمنٹ کے بعد واپس کراچی آ جاتے۔ یہ مستقبل کے منصوبے تھے۔ نئے سال کے آغاز میں ہی والد صاحب کا دفتر اسلام آباد چلا گیا اور انہوں نے اسلام آباد جا کر پہلے رہائش کے لیے ایک چھوٹا مکان لیا اور پھر دو مہینے بعد امی کو بلا لیا۔ ان کے جانے سے ہم بہن بھائی اداس ضرور ہوئے

صاحب کی بیگم نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔ ''میں نے بھی خان صاحب سے بھی کہا مگر وہ اتنے بگڑے کہ مجھے طلاق دینے پر آمادہ ہو گئے تھے۔ وہ تو میں نے رو دھو کر اور بچیوں کے واسطے دے کر انہیں روک لیا ورنہ میں خود در بدر ہو چکی ہوتی۔''

''آخر خان صاحب اس معاملے میں اتنے جذباتی کیوں ہو رہے ہیں اور شیخ صاحب سے تو ان کی پرانی دوستی ہے۔''

''پتا نہیں کیا بات ہے۔ میں سمجھتی ہوں کہ بس خان صاحب کی انا ہے جو ان کو اجازت نہیں دے رہی۔ ورنہ وہ تو ایسے ہیں کہ کوئی مدد مانگے تو اپنی جان نکال کر اس کے سامنے رکھ دیں۔''

خان صاحب کی بیگم ٹھیک کہہ رہی تھیں محلے کے ہر مسئلے اور مشکل کام میں خان صاحب آگے آگے رہا کرتے تھے۔ کوئی ان سے مدد لینے آئے کبھی انکار نہیں کرتے تھے۔ اس زمانے میں بینک سے قرض لینا جان جوکھم کا کام تھا۔ مگر خان صاحب نے کتنے ہی لوگوں کو قرض دلوائے تھے اور بعض کے تو ضمانتی بھی بنے تھے۔ مالی لحاظ سے کمزور تھے مگر دینے دلانے میں ہمیشہ آگے رہتے تھے۔ کبھی ایسا نہیں ہوا کہ کوئی موقع ہو اور خان صاحب نے اپنی حیثیت سے بڑھ کر نہ کیا ہو۔ ان کی بیگم امی کو بتا رہی تھیں کہ ہاتھ اتنا تنگ ہو گیا ہے کہ پہلے وہ بیٹیوں کے جہیز کے لیے کچھ نہ کچھ جوڑتی رہتی تھیں۔ مگر اب ایک سال سے گھر کا گزارا ہی مشکل سے ہو رہا ہے۔ بیٹیوں کے لیے کہاں سے جمع کریں۔ اگر گھر میں کوئی مہمان آ جاتا تو اس کی خاطر داری بھی مشکل سے ہوتی تھی۔ بیگم کی باتوں سے لگ رہا تھا کہ وہ خود بھی خان صاحب کی ہٹ دھرمی سے تنگ آئی ہوئی تھیں۔ امی نے آ کر والد صاحب کو بتایا تو وہ بولے۔

''خان صاحب ویسے تو معقول انسان ہیں مگر اس معاملے میں ان کا رویہ بچکانہ ہے۔ انہیں اپنے اور اپنے گھر کے حالات دیکھ کر قدم اٹھانا چاہیے۔ سچی بات تو یہ ہے کہ شیخ صاحب نے بہت زیادہ شرافت دکھائی ہے۔ وہ پورا گھر لینے کو تیار ہو گئے ہیں اس کے تیس ہزار روپے رہے ہیں حالانکہ اس علاقے میں ایسا بنا ہوا مکان پچیس سے بھی کم میں مل جاتا ہے۔ پھر ابھی ان کے کاروباری حالات اتنے اچھے نہیں ہوئے ہیں مگر صرف مسئلہ حل کرنے کے لیے اتنا بڑا قدم اٹھانے کو تیار ہیں۔''

تھے مگر اور کوئی دشواری پیش نہیں آئی۔ ہم سب بہن بھائیوں کی ایسی پرورش ہوئی تھی کہ ہم گھر کے سارے کام خود کر لیتے تھے اور کسی کو کوئی کام کرتے ہوئے مسئلہ نہیں ہوتا تھا۔

نورین باجی نے کچن سنبھال لیا تھا مگر میں ان کا یہاں ہاتھ بٹاتا تھا۔ صبح کا ناشتا ریڈی میڈ ہوتا تھا۔ ڈبل روٹی، انڈے اور مکھن چائے سے ناشتا ہوتا تھا۔ دوپہر کا سالن یا دال نورین باجی رات میں ہی پکا لیتی تھیں اور پھر کالج سے آ کر چاول بنا لیتیں۔ اس سے ہم سالن یا دال کھاتے تھے۔ رات کا سالن اور دال الگ بنتی تھی۔ میں گھر کی صفائی ستھرائی کے ساتھ نورین باجی کا کچن میں ہاتھ بٹاتا تھا۔ چھٹی والے دن سب مل کر سارا گھر صاف کرتے۔ ہفتے بھر کے کپڑے دھوتے تھے۔ اس دن ناشتہ اور دوپہر کا کھانا باہر سے آتا تھا۔ کبھی حلوہ پوری اور کبھی پائے اور کلچے آتے تھے۔ دوپہر کے لیے نہاری یا حلیم کے ساتھ روٹی آتی تھی اور کبھی بریانی لے آتے۔ شام کو نورین باجی اہتمام سے کچھ بناتی تھیں۔ یوں والدین کے جانے سے ہمیں اس لحاظ سے کوئی دشواری پیش نہیں آئی تھی۔ مگر ان کی یاد بہت آتی تھی۔ خاص طور سے مجھے کیونکہ میں سب سے چھوٹا تھا۔

گرمیوں کے آغاز تک میں نے میٹرک کے پیپرز دے دیے تھے اور فارغ تھا۔ اس لیے ذوالفقار بھائی نے مجھے پی آئی اے کے انجینئرنگ ڈیپارٹمنٹ میں ایک کورس پر لگا دیا۔ یہ اپرنٹس شپ تھی جو ایک سال کی تھی اگر میں کامیابی سے مکمل کر لیتا تو مجھے بھی پی آئی اے میں جاب مل جاتی۔ ذوالفقار بھائی ایڈمنسٹریشن میں تھے اس لیے ان کی نائن ٹو فائیو والی جاب تھی۔ میں ان کے ساتھ جاتا اور واپس آتا تھا۔ تنخواہ نہیں تھی مگر کچھ الاؤنس مل جاتا جس سے چھوٹے موٹے خرچ پورے ہو جاتے تھے۔ والد صاحب اور امی کے جانے کے بعد ہمارا محلے والوں سے واسطہ زیادہ تر سلام دعا تک محدود رہ گیا تھا۔ اتفاق سے ہم تینوں بھائی ہی دوستی کے زیادہ قائل نہیں تھے۔ اس لیے محلے میں ہماری جان پہچان محدود تھی اور جو دوست تھے وہ بھی اسکول اور کالجز کے تھے۔ اس لیے ہمیں زیادہ اطلاعات نہیں ملتی تھیں۔ خاص طور سے خان صاحب اور شیخ صاحب کے تنازعے کے بارے میں اب بہت کم سننے میں آتا تھا۔ ایک رات ذوالفقار بھائی کچھ سامان لینے باہر گئے اور واپس آئے تو یہ سنسنی خیز اطلاع ساتھ لائے۔

''کل محلے میں خان صاحب اور شیخ صاحب کا زبردست جھگڑا ہوا ہے دونوں میں ہاتھا پائی ہوئی ہے اور شیخ صاحب کو اچھی خاصی چوٹیں آئی ہیں۔''

تفصیل کچھ یوں تھی کہ خان صاحب غصے میں بھرے ہوئے شیخ صاحب کے گھر پہنچے اور انہیں باہر بلایا۔ طبیعت خرابی کی وجہ سے شیخ صاحب دکان پر نہیں گئے تھے اور گھر میں تھے۔ ان کے بیٹے دکان پر تھے۔ شیخ صاحب باہر آئے اور خان صاحب ان پر گرجتے برسنے لگے کہ بہت ہو گیا اب اگر انہوں نے ان کی زمین واپس نہ کی تو وہ انہیں دیکھ لیں گے۔ طبیعت خرابی کی وجہ سے شیخ صاحب کا ضبط بھی جواب دے گیا اور انہوں نے خان صاحب کو ترکی بہ ترکی جواب دیا۔ خان صاحب نے انہیں تھپڑ مارا اور اس کے بعد دونوں ہی گتھم گتھا ہو گئے۔ جب تک محلے والوں نے بیچ بچاؤ کرایا دونوں کو خاصی چوٹیں آ گئی تھیں۔ خاص طور سے شیخ صاحب کا سر پھٹ گیا تھا۔ دھکا دینے پر وہ دیوار سے جا ٹکرائے تھے۔ انہیں مقامی ڈاکٹر کے پاس لے جانا پڑا تھا۔ ان کے بیٹوں کو خبر ہوئی تو وہ بھاگ کر آئے تھے مگر اس وقت تک شیخ صاحب واپس آ چکے تھے انہوں نے انہیں قابو کر لیا۔

دراصل مقدمے بازی نے خان صاحب کو پریشان کر دیا تھا۔ ان کی آمدنی اتنی نہیں تھی اور پھر پیشی کے چکر میں وہ چھٹی لے کر عدالت پہنچے تو وہاں شیخ صاحب کا وکیل پہلے ہی تاریخ لے چکا ہوتا تھا۔ اس طرح ان کی چھٹی بھی ضائع ہو جاتی۔ اس چھٹی کی تنخواہ بھی کٹ جاتی تھی۔ ان سب عوامل نے مل کر خان صاحب کا غصہ اس حد تک پہنچا دیا کہ وہ مرنے مارنے پر اتر آئے تھے۔ مگر کچھ لوگوں کا کہنا تھا کہ شیخ صاحب کا بہتا خون دیکھ کر خان صاحب کا غصہ سرد پڑ گیا تھا اور پھر وہ جھگڑا چھوڑ کر اپنے گھر چلے گئے تھے۔ نورین باجی اور مجھ سے بڑے عمار بھائی گرمیوں کی چھٹیوں میں امی ابو کے پاس اسلام آباد چلے گئے۔ اب گھر میں میں اور ذوالفقار بھائی تھے۔ یہ جھگڑا ان ہی دنوں میں پیش آیا تھا۔ ذوالفقار بھائی نے فون کر کے ابو کو بھی بتایا۔ اس زمانے میں کال بک کرائی جاتی تھی۔ وہ دفتر سے والد صاحب کے دفتر بات کر لیتے اور خیر خیریت مل جاتی تھی۔ بھائی محلے کے حالات بھی بتا دیتے تھے۔ یہ خاص اطلاع تھی اس لیے بھائی نے فوراً والد صاحب تک پہنچائی تھی۔

چھٹیاں ختم ہوئیں تو باجی اور بھائی واپس آ گئے۔ مگر وہ کچھ پریشان تھے۔ انہوں نے ہمیں بتایا کہ ابو اور دوسرے لوگ کہہ رہے ہیں کہ حالات ٹھیک نہیں ہیں اور سرحدوں پر

کشیدگی ہے۔ اس وقت میڈیا کا دور نہیں تھا۔ ٹی وی اور
ریڈیو سرکاری کنٹرول میں تھے اور ان پر ایسی کوئی خبر نہیں
تھی۔ اخبارات میں بھی زیادہ نہیں آتا تھا۔ ذوالفقار اور عمار
بھائی سول ڈیفنس کی تربیت لے چکے تھے۔ اگست کے وسط
میں اچانک ہی سول ڈیفنس کی مشقیں شروع ہوگئیں۔
ذوالفقار بھائی تو اب ملازم تھے مگر عمار بھائی اور ان کے
ساتھ میں بھی ان مشقوں میں شامل ہوگیا۔ ان مشقوں سے
ہمیں اندازہ ہوا کہ جنگ کا خطرہ ہے۔ ستمبر کے آغاز میں
بھارتی جارحیت میں شدت آگئی اور اس کے طیارے مسلسل
ہماری فضائی حدود کی خلاف ورزی کرنے لگے۔ پھر ایک
دن پاکستان نے سخت جواب دیا اور انڈیا کے چار طیارے
بیک وقت مار گرائے۔ یہ ایک طرح سے اشارہ تھا کہ
پاکستان کا صبر کا پیمانہ لبریز ہوگیا ہے۔

اس واقعے کے بعد حالات زیادہ کشیدہ ہوگئے تھے۔
والد صاحب بھائی کو کال کر کے حفاظتی تدابیر کرنے کو کہہ
رہے تھے۔ دوسری طرف ہم ذرا بے پروا تھے کہ شاید جنگ نہ
ہو۔ اس لیے کوئی خاص احتیاطی تدبیر بھی نہیں کی۔ ہم نے کیا
کسی نے نہیں کی تھی مگر جب چھ ستمبر کا دن طلوع ہوا اور جنگ
کے سائرن بجنے لگے۔ صدر ایوب خان نے اعلان جنگ کیا
اور قوم سے جنگ کے لیے تیار رہنے کو کہا تو ہم سب یوں
حرکت میں آگئے جیسے ہمیشہ سے جنگ کے لیے تیار رہے
ہوں۔ سب سے پہلے ہم نے اپنے کچے صحن میں زمین کھود کر
بمباری سے محفوظ رہنے کے لیے خندق تیار کی۔ اس پر لکڑی
کے تختے رکھے۔ تاکہ جیسے ہی ہوائی حملے کا سائرن گونجے ہم
اس میں چلے جائیں۔ اس کے بعد میں نے اور عمار بھائی
نے محلے والوں کے ساتھ مل کر ان کی خندقیں کھودیں۔

محلہ سول ڈیفنس کمیٹی بنی جس میں سب سے آگے
آگے خان صاحب تھے اور ڈیوٹیاں لگائیں کہ کون کون کب
پہرہ دے گا۔ رات کو بلیک آؤٹ پر سختی سے عمل کیا جائے
گا۔ خان صاحب کے ساتھ ساتھ شیخ صاحب بھی میدان
میں آگئے تھے۔ انہوں نے اعلان کر دیا تھا کہ جو چیز محلے کا
دکاندار زیادہ قیمت پر دے وہ ان سے کہیں وہ محلے والوں کو
بنا کسی نفع کے لاکر دیں گے۔ مگر ایسا ہونے کی نوبت ہی نہیں
آئی۔ محلے کے دکانداروں نے خود قیمتیں کم کر دیں اور
دوسری طرف لوگوں کا یہ حال تھا کہ جو آدھا کلو دودھ لیتا تھا
اس نے ایک پاؤ کر دیا کہ جنگ کے دن ہیں اور ان چیزوں
کی قلت ہوگی اس لیے کم استعمال کی جائے۔ لوگ زیادہ
سے زیادہ بچت کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ تاکہ بچت کو
جنگی فنڈ میں دے سکیں۔

جنگ ہم تک نہیں آئی تھی اس کے باوجود ہم پوری
طرح اس جنگ میں شریک تھے۔ محلے کے خالی پلاٹ میں
ٹینٹ لگا کر وہاں ایک بڑا ریڈیو رکھا گیا تھا جو چوبیس گھنٹے
چلتا تھا اور محلے والوں کو جنگ کی تازہ خبریں ملتی رہتی
تھیں۔ یہاں ہمہ وقت خبریں سننے اور پھر اس پر تبصرے
کرنے والوں کا ہجوم رہتا تھا۔ لیکن اس کا مطلب یہ نہیں
ہے کہ لوگ کام چھوڑ کر بیٹھے رہتے تھے۔ میں نے تو ان دنوں
ان لوگوں کو بھی پورے شوق سے کام پر جاتے دیکھا جن کے
لیے کام کرنا موت کے مترادف ہوتا تھا۔ لوگ ایک دوسرے
کا خیال رکھنے لگے تھے۔ بڑے بوڑھوں سے پوچھا جاتا کہ آج
انہوں نے کیا پکایا ہے۔ اگر کسی کے گھر کچھ نہ پکا ہوتا تو اس
کے گھر کئی گھروں سے کھانا آجاتا تھا۔ وہ لوگ جو پہلے کچرہ
باہر پھینکتے تھے اب وہ صفائی کا خیال رکھنے لگے تھے۔ شر
پسندوں اور تخریب کاروں سے بچنے کی تدابیر کی جاتی تھیں۔
علاقے میں پھیلی جھاڑیوں کا صفایا کیا گیا تاکہ کوئی ان میں
سے چھپ کر کچھ نہ کر سکے۔ میں لفظوں میں نہیں بتا سکتا کہ
اس وقت لوگوں کا جذبہ کیا تھا اور ہم کیسے وطن کی حفاظت
کے جذبے سے سرشار تھے۔ اس وقت سب اپنی حیثیت اور
مفاد بھول گئے تھے صرف ایک خیال تھا کہ ہماری سرزمین پر
حملہ کرنے والے دشمن کو شکست دینی ہے۔ اس کے لیے
لوگ جان اور مال سب قربان کرنے کو تیار تھے۔

جنگ شروع ہوئے چند دن ہوئے تھے کہ حکومت کی
جانب سے ہمارے علاقے میں کیمپ لگا اور لوگوں سے اپیل
کی گئی کہ وار فنڈ میں چندہ دیں کیونکہ اس وقت ہمیں ملک
کے دفاع کے لیے ایک ایک روپے کی اشد ضرورت
ہے۔ اپیل کی دیر تھی کہ لوگ اپنی جمع پونجیاں لے کر حاضر
ہونے لگے۔ بڑے سیکڑوں اور ہزاروں دے رہے تھے تو
چھوٹے بچے اور بچیاں اپنے گلک اٹھائے لا رہے تھے جن
میں وہ سکے کر کے جمع کرتے تھے۔ لڑکیوں نے سونے
کی بالیاں وار فنڈ میں دیں تو جو سہاگنیں تھیں انہوں نے اپنا
زیور نذر کر دیا۔ خان صاحب کی بیوی اپنی بچیوں کے لیے
بنایا ہوا زیور لے کر وار فنڈ میں دینے آئی تھیں۔ کسی نے
کہا۔ ''آپ نے بچیوں کے لیے بنایا تھا۔''

انہوں نے جواب دیا۔ ''یہ ملک رہے گا تو ایسے بہت
سے زیور بن جائیں گے۔ اس ملک سے بڑھ کر ہمارے

لیے کچھ بھی نہیں ہے۔"

ان دنوں سارا محلہ ایک ہو گیا تھا سوائے خان صاحب اور شیخ صاحب کے۔ وہ ہر معاملے میں آگے آگے ہوتے تھے مگر ایک دوسرے سے بات کرنا تو ایک طرف رہا ایک دوسرے کی طرف دیکھنے کے روادار بھی نہیں تھے۔ اگر مجبوری میں کوئی بات کرنی پڑ جائے تو کسی دوسرے کے توسط سے کرتے تھے۔ دونوں ہی محلے کی سول ڈیفنس کمیٹی میں تھے۔ اس لیے کبھی بات کرنے کی ضرورت پڑ ہی جاتی تھی۔ شیخ صاحب نے ان دنوں ہول سیل کا کام چھوڑ کر اپنا سامان بنا کسی نفع کے ان غریب آبادیوں میں فروخت کرنا شروع کر دیا تھا جہاں بسنے والے ایک وقت کا کھاتے تھے تو ان کو دوسرے وقت کا علم نہیں ہوتا تھا۔ بہت سے کاروباری یہی کر رہے تھے اور اپنا نفع وار فنڈ میں دے رہے تھے یا پھر غریبوں میں تقسیم کر رہے تھے۔ ہمارے علاقے میں ایک بہت اچھا مردانی سیلون کھلا تھا۔ جہاں مردوں کے بال کٹوانے سے لے کر بہت سے کام ہوتے تھے اور یہ خاصا مہنگا تھا۔ جب تک جنگ ہوتی رہی اس کا مالک اگلی صبح سیلون کھولنے سے پہلے پچھلے دن کی پوری آمدنی وار فنڈ میں دے جاتا تھا۔ ان سترہ دنوں میں اس نے ایک پیسا بھی پاس نہیں رکھا۔

جنگ کے شروع کے دن بہت کڑے تھے۔ خاص طور سے جب انڈیا لاہور پر قبضے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگا رہا تھا۔ اس کی کوشش تھی کہ لاہور پر قبضہ کر کے پاکستان کو دو حصوں میں تقسیم کر دے مگر ہماری فوج نے عوام کی پشت پناہی سے اس کا یہ ناپاک منصوبہ ناکام بنایا تو اس نے کئی محاذ اور کھول دیے۔ ہماری فوج، فضائیہ اور بحریہ کامیابی حاصل کر رہی تھیں مگر اتنی بڑی جنگی قوت سے مقابلہ کرنا آسان نہیں تھا۔ ہمارے پاس جنگی سامان کم تھا اور اس کمی کو ہمارے جوان اپنی جانوں سے پورا کر رہے تھے۔ عوام با حوصلہ تھے مگر اس کے باوجود خطرہ تھا کہ کہیں انڈیا اپنے ناپاک منصوبوں میں کامیاب نہ ہو جائے۔ پورا مغربی میڈیا بھارت کے ساتھ تھا اور جنگ سے متعلق دی جانے والی خبریں بھارت کی طرف سے آتی تھیں اس لیے ان میں بھارت کا رنگ ہی نمایاں ہوتا تھا۔ ہماری کامیابیاں پس پشت ڈال دی جاتی تھیں اور اس سے دنیا میں یہ تاثر بن رہا تھا کہ انڈیا جنگ جیت رہا ہے۔ جب بی بی سی یا وائس آف امریکا سنتے تو ہمارے دل ڈوبنے لگتے تھے۔

حالانکہ حقیقت اس کے برعکس تھی۔ انڈیا ہر محاذ پر منہ کی کھا رہا تھا۔ صرف ریڈیو پاکستان جو جنگ کی درست خبریں پیش کر رہا تھا۔ پہلے لوگ بی بی سی یا وائس آف امریکا سنتے تھے مگر ان کی یک طرفہ رپورٹنگ کی وجہ سے ہم نے انہیں سننا چھوڑ دیا تھا۔ اگرچہ ساکھ تو ریڈیو پاکستان کی بھی اچھی نہیں تھی مگر اس جنگ کی حد تک لوگ اس پر اعتبار کر رہے تھے۔ جنگ کے دوسرے دن پاک فضائیہ کے شاہینوں نے اپنی حدود میں مکمل برتری حاصل کر لی اور شہروں پر انڈیا کے حملے کے خطرے کو تقریباً ختم کر دیا تھا۔ اسی لیے اس پوری جنگ کے دوران کراچی پر کوئی بھی کامیاب حملہ نہیں ہوا۔ لاہور اور پنجاب کے دوسرے شہروں پر حملے ہوئے مگر وہ زیادہ تر ناکام رہے۔ اسلام آباد بھی بہت کم نشانہ بنا۔ وہاں امی اور والد صاحب تھے ہمیں سب سے زیادہ فکر ان کی تھی۔

جنگ کی وجہ سے فون لائنیں بہت مصروف تھیں اور رابطہ نہیں ہو پا رہا تھا۔ ان کی طرف سے دل پریشان تھا اور ہمہ وقت یہی دعا کرتے تھے کہ اللہ ہمارے والدین کو اپنے حفظ و امان میں رکھے گا۔ جنگ کے دسویں دن ذوالفقار بھائی نے بڑی مشکل سے ایک منٹ کے لیے والد صاحب سے بات کی اور بس ایک دوسرے کی خیریت ہی پوچھ سکے تھے مگر اس مختصری بات سے دونوں گھروں کو ایک گونہ سکون مل گیا تھا۔ جنگ کے شروع دنوں میں شہر کی رونقیں ماند پڑ گئی تھیں مگر جب جنگ میں ہمارا پلہ بھاری ہوا اور کراچی پر سے فضائی حملے کا خطرہ ٹل گیا تو شہر کی رونقیں پھر بحال ہونے لگیں۔ لوگ کھلی جگہوں اور تفریح گاہوں میں نظر آنے لگے۔ البتہ شام ڈھلنے کے بعد بلیک آؤٹ ہو جاتا اور پھر سب اپنے گھروں میں رہتے تھے۔ بلیک آؤٹ پر اتنی سختی سے عمل کیا جاتا کہ رات کے وقت لوگ بلب کے بجائے موم بتی یا لالٹین جلا کر اس سے کام چلاتے تھے۔ تمام کھڑکیوں پر کالا کاغذ چپکایا ہوا تھا۔

ہمارا ملک غریب تھا جو بھرپور جنگ کا متحمل نہیں ہو سکتا تھا۔ اس لیے حکومت کی طرف سے مسلسل عوام سے مدد کی اپیل کی جا رہی تھی۔ لوگ بھی مسلسل دے رہے تھے مگر ضرورت پوری نہیں ہو رہی تھی۔ رات کے وقت ڈیوٹی دینے والے لڑکوں میں میرا نام بھی تھا اور میں رات آٹھ سے صبح چھ بجے تک پہرہ دیتا تھا۔ اس رات بھی میں گلی کے سرے پر تھا۔ اچانک مجھے شیخ صاحب کے مکان کے پاس ایک سایہ

سا حرکت کرتا نظر آیا۔ تاروں کی معمولی سی روشنی تھی اور وہ آدمی واضح نہیں تھا۔ پہلے میں نے للکارنے کو سوچا مگر پھر خود دبے قدموں اس کی طرف بڑھا۔ وہ شیخ صاحب کے گیٹ کے پاس تھا۔ میں دیوار سے لگا ہوا اس کے نزدیک پہنچا تو... مجھے احساس ہوا کہ وہ گیٹ بہت آہستہ سے کھٹکھٹا رہا تھا۔ اس سے پہلے میں مداخلت کرتا گیٹ کھل گیا اور میں نے شیخ صاحب کی حیرت زدہ آواز سنی۔

"خان تم......؟"

"جی شیخ صاحب یہ میں ہوں۔"

شیخ صاحب بامروت آدمی تھے انہوں نے نرمی سے پوچھا۔ "کہو کس لیے آئے ہو؟"

میں حیران تھا کہ خان صاحب اور شیخ صاحب کے دروازے پر۔ پھر مجھے خیال آیا کہ خان صاحب کی مالی حالت خراب ہو رہی تھی اور وہ شیخ صاحب سے ادھار مانگنے آئے تھے۔ کیونکہ وار فنڈ میں انہوں نے بیٹیوں کے زیور کے علاوہ بہت کچھ نقد اور دوسرا سامان بھی دیا تھا۔ شاید یہی شیخ صاحب کے ذہن میں تھا۔ جب خان صاحب کچھ دیر کے لیے خاموش رہے تو انہوں نے پھر کہا۔ "خان صاحب بلاجھجک کہیں، اس وقت ہم پڑوسی ہیں۔"

"یہی سوچ کر میں آیا ہوں۔" خان صاحب نے کہا۔ "شیخ صاحب آپ میرا مکان خریدنا چاہتے تھے۔ میں اپنا مکان بیچنے آیا ہوں۔"

میرے ساتھ شیخ صاحب بھی حیران رہ گئے۔ "خان صاحب، اس وقت......"

"ہاں کیونکہ میں چاہتا ہوں کہ اس کا علم کسی اور کو نہ ہو، بات بس میرے اور آپ کے درمیان میں رہے۔"

شیخ صاحب کچھ دیر کے لیے خاموش ہوئے پھر انہوں نے کہا۔ "خان صاحب اگر آپ کو فوری کسی مدد کی ضرورت ہو تو......"

"نہیں...... نہیں، اللہ کا کرم ہے میرے گھر میں کئی دن کا راشن ہے۔ کوئی اور ضرورت بھی نہیں ہے۔"

"تب آپ مکان اس طرح کیوں فروخت کر رہے ہیں؟"

"بس یہ مت پوچھیں شیخ صاحب۔" خان صاحب نے دوٹوک انداز میں کہا۔ "ساتھ ہی میں آپ سے ان تمام بدتمیزیوں اور بے ہودگیوں کی معافی چاہتا ہوں جو آپ کے ساتھ مجھ سے سرزد ہوئیں۔"

سردار محمد ابراہیم خان

وہ 23 اگست 2001ء تک آزاد جموں و کشمیر حکومت کے صدر رہے۔ انہوں نے دو کتابیں Kashmir Saga اور "متاعِ زندگی" لکھیں۔ انہیں یہ اعزاز بھی حاصل رہا کہ وہ چار مرتبہ آزاد کشمیر کے صدر رہے۔ یہ امر بھی قابلِ ذکر ہے کہ وہ 32 سال کی عمر میں آزاد کشمیر کے نوعمر ترین اور 86 سال کی عمر میں معمر ترین صدر تھے۔ انہوں نے 2003ء میں انتقال کیا۔ وہ غازی ملت کے لقب سے بھی جانے جاتے تھے۔

مرسلہ: اکبر ذیشان۔ میرپور (آزاد کشمیر)

ابو سیاف گروپ

ایک مسلح گروپ جو فلپائن کے علاقے سولو آئی لینڈ میں فلپائن کی فوج سے برسرپیکار ہے۔ اسے 1991ء میں عبدالرزاق جنجلانی نے قائم کیا۔ اپنے پاؤں پر کھڑا کرنے کے لیے اسامہ بن لادن کے قریبی رشتے داروں نے اسے رقوم فراہم کیں۔ اسی گروپ کے ایک رکن کو 1993ء میں ورلڈ ٹریڈ سینٹر میں دھماکا کرنے کے الزام میں گرفتار کرلیا گیا۔ بعدازاں یہ گروپ تین حصوں میں تقسیم ہو گیا اور اسلامی ریاست کے قیام کی جدوجہد کرنے کی بجائے لوٹ مار اور اغوا برائے تاوان کی وارداتوں میں مصروف ہو گیا۔ ابتداء میں اس کی سرگرمیاں خفیہ تھیں لیکن اگست 2000ء میں اس نے اعلانیہ تخریبی سرگرمیاں شروع کر دیں جو 2001ء اور 2002ء میں بھی جاری رہیں۔ اس ضمن میں سب سے بڑی کارروائی 22 اگست 2002ء کو اس وقت کی گئی جب اغوا شدہ مسیحیوں میں سے دو کے سر قلم کر دیے گئے۔

مرسلہ: اکبر ذیشان۔ میرپور (آزاد کشمیر)

آشا بھوسلے

3 ستمبر 1933ء کو پیدا ہونے والی نامور بھارتی گلوکارہ اور ممتاز گلوکارہ لتا منگیشکر کی چھوٹی بہن۔ گلوکاری کی ابتداء 1948ء میں فلم "چڑیا" سے کی۔ ان کے گلے میں بلا کا سوز پایا جاتا ہے اور ان کے گانے میں ایک تھکے ماندے آدمی کو حیاتِ نو کا پیغام ملتا ہے۔ انہوں نے بھارت کی تمام اہم زبانوں میں نغمے گائے جن کی تعداد 14 کے لگ بھگ ہے جب کہ گائے جانے والے نغموں کی تعداد 20 ہزار سے زائد ہے۔

مرسلہ: کنیز۔ میرپور اے کے

شیخ صاحب بھی باہر نکل آئے۔ ''ایسا مت کہیں خان صاحب، قصور ہم دونوں کا برابر کا تھا۔ شاید میرا زیادہ تھا کیونکہ زیادتی کا آغاز مجھ سے ہوا تھا اور میں نے پڑوسی کے بجائے اپنا مکان دیکھا۔ میں بھی آپ سے شرمندہ ہوں اور معافی چاہتا ہوں۔''

''شیخ صاحب میں چاہتا ہوں کہ آپ کل ہی ابتدائی لکھا پڑھی کر کے قیمت مجھے دے دیں اور اگر ہو سکے تو اُس وقت رہنے کی مہلت بھی دیں جب تک میں کسی دوسری جگہ کا بندوبست نہیں کر لیتا۔''

''خان صاحب میں اپنے الفاظ پر قائم ہوں اور با خدا آپ جب تک چاہیں اس مکان میں رہیں ساری عمر رہیں میری طرف سے کبھی تقاضہ نہیں ہوگا۔ خدا گواہ ہے میں نے مکان صرف جھگڑا ختم کرنے کی نیت سے خریدنے کی بات کی تھی ورنہ میری اس پر نظر کبھی نہیں رہی اور نہ ہی مجھے اس کی ضرورت ہے۔''

''میں جانتا ہوں شیخ صاحب آپ کو، پتا نہیں مجھے کیا ہو گیا تھا۔'' خان صاحب نے کہا۔ ''اُمید ہے یہ بات آپ کے اور میرے گھر کے درمیان رہے گی۔''

''بالکل اور کیونکہ آپ کو جلدی ہے اس لیے آپ زحمت کیجیے گا اور میری دکان پر آجایئے گا۔ وہاں ہم سکون سے بیٹھ کر بات کریں گے اور میں جتنی رقم ہو سکی اس کا انتظام کر کے آپ کے حوالے کر دوں گا۔ باقی کے لیے پوری کوشش ہوگی کہ جلد از جلد ہو جائے۔ آپ جانتے ہیں آج کل کاروبار نہیں کر رہا ہوں۔''

''جی میں جانتا ہوں اور کل حاضر ہو جاؤں گا۔'' خان صاحب نے کہا اور ہاتھ ملانے کے لیے دونوں ہاتھ آگے بڑھائے تو شیخ صاحب نے ان کے ہاتھ کھینچ کر انہیں سینے سے لگا لیا۔ مجھے کچھ دیر بعد احساس ہوا کہ دونوں رو رہے تھے۔ پھر وہ ایک دوسرے سے الگ ہوئے اور اپنے اپنے گھروں میں چلے گئے۔ میں ایک آڑ میں کھڑا ہوا تھا اس لیے ان میں سے کوئی مجھے دیکھ نہیں سکا تھا اور میں نے سب دیکھ اور سن لیا تھا۔ میں اس حیرت انگیز واقعے کا عینی گواہ تھا اور میرا بس نہیں چل رہا تھا کہ جلد از جلد گھر جا کر پہلے گھر والوں کو بتاؤں۔ اس کے لیے مجھے صبح چھ بجے تک انتظار کرنا پڑا تھا۔ میں چھ بجتے ہی گھر پہنچا تو سب بیدار ہو چکے تھے اور جب میں نے انہیں بتایا تو سب ہی اچھل پڑے تھے۔ نورین باجی نے کہا۔

''یہ تو معجزہ ہو گیا ہے۔''

''خان صاحب اور شیخ صاحب کا آپس میں ملنا اور گلے لگنا اس سال کی سب سے بڑی خبر ہے۔'' عمار بھائی بولے۔

''سب سے بڑی خبر یہ ہے جو اس وقت ہمارے ملک پر گزر رہی ہے۔'' ذوالفقار بھائی نے انہیں گھورا۔

''اب تو اس کے عادی ہو گئے ہیں۔'' عمار بھائی بولے۔ ''یہ سب سے بڑی خبر ہے۔''

وہ مجھ سے کرید کرید کر سوال کرنے لگے کہ اور کیا بات ہوئی اور پھر تبصرے شروع ہو گئے۔ نورین باجی اور عمار بھائی کا خیال تھا کہ خان صاحب کی انا بالآخر شکست کھا گئی کیونکہ ان کی مالی حالت انتہائی خراب ہو گئی ہے مگر ذوالفقار بھائی کا خیال تھا کہ ایسی بات نہیں ہے، خان صاحب ان لوگوں میں سے نہیں ہیں جو اس بات پر کسی کے سامنے جھک جائیں اور کسی کے سامنے مدد مانگنے جائیں اور وہ بھی اس شخص سے جس سے ان کا شدید اختلاف ہو۔ ان کے خیال میں یہ معاملہ کچھ اور تھا۔

میں ان سے متفق تھا مگر میں، ذوالفقار بھائی بھی سمجھنے سے قاصر تھے کہ خان صاحب نے اتنا بڑا قدم کیسے اٹھایا جب کہ ان سے اس کی توقع نہیں کی جا سکتی تھی۔ مگر ذوالفقار بھائی نے مجھے اور دوسرے گھر والوں کو سختی سے منع کر دیا کہ اس بارے میں کسی سے ایک لفظ نہیں کہنا ہے۔ خان صاحب اور شیخ صاحب اس بات کو راز رکھنا چاہتے ہیں اس لیے اسے راز ہی رہنا چاہیے۔ ہم نے بھائی سے وعدہ کیا کہ کسی کو نہیں بتائیں گے۔

محلے میں کسی کو پتا نہیں چلا کہ رات میں کتنی بڑی تبدیلی آئی تھی۔ رات میں صرف میں نے ان دونوں کو ملتے اور بات کرتے دیکھا اور سنا تھا۔ اگلے دن خان صاحب شیخ صاحب کی دکان پر گئے ہوں گے اور وہاں انہوں نے شیخ صاحب سے مکان کی فروخت کا معاہدہ کر لیا ہوگا۔ مجھے خیال آیا کہ شاید خان صاحب کو کوئی اچھا موقع مل رہا ہو اور وہ اس سے فائدہ اٹھا رہے ہوں۔ کوئی جگہ اچھی اور سستی مل رہی ہو۔ شیخ صاحب انہیں تیس ہزار کی پیشکش کر چکے تھے۔ ان کو سمجھ آ گیا تھا کہ بلاوجہ کی ضد اور جذبات سے صرف ان کا نقصان ہوگا اور بالآخر انہوں نے عقل کا راستہ اختیار کیا۔ کیونکہ خان صاحب بدستور اسی مکان میں رہ رہے تھے اس لیے کسی کو علم نہیں ہوا کہ

انہوں نے مکان فروخت کر دیا ہے۔ چند دن اور گزرے جنگ ختم ہوگئی۔ انڈیا اپنے مذموم عزائم میں ناکام رہا۔ اس جنگ نے سترہ دن کے لیے پاکستان اور اس میں بسنے والوں کو ایک کر دیا تھا۔

ان دنوں ہر فرد پاکستانی تھا اور پورے دل سے پاکستانی تھا، وہ صرف پاکستان کا مفاد سوچ رہا تھا۔ یہ سترہ دن کسی خواب کی طرح گزرے اور مجھے اور مجھ جیسے بہت سے دیکھنے والوں کو آج بھی خواب ہی لگتے ہوں گے۔ جنگ ختم ہوئی اور سب معمول پر آگیا۔ ہم پاکستانی نہیں رہے پھر سے بنگالی، پنجابی، سندھی، مہاجر، پٹھان اور بلوچ بن گئے۔ ایک بڑی کامیابی کے بعد آنے والا انتشار بہت بڑا تھا جس نے چند سال بعد مشرقی پاکستان کے المیے کو جنم دیا۔ اس میں اغیار کی سازشیں نمایاں تھیں لیکن اپنوں کی غلطیاں بھی کم نہیں تھیں۔ بہر حال اس سچ بیانی کا موضوع خان صاحب اور شیخ صاحب ہیں۔ خان صاحب پہلی اکتوبر کو مکان چھوڑ کر گئے تب محلے والوں کو پتا چلا کہ انہوں نے مکان شیخ صاحب کو بیچ دیا ہے۔ وہ کہاں گئے تھے یہ کسی کو علم نہیں تھا۔ حد یہ کہ شیخ صاحب بھی نہیں جانتے تھے کہ خان صاحب نے کہاں مکان لیا تھا۔ وہ کسی کو بتا کر بھی نہیں گئے تھے۔ آج کل کا دور نہیں تھا کہ آدمی کو موبائل اور فیس بک کی مدد سے تلاش کر لیا جائے اس زمانے میں تو لائن کا فون بھی بڑی مشکل سے ملتا تھا۔

محلے والے کچھ دن تو حیران رہے۔ شیخ صاحب نے بتایا کہ انہوں نے پورے تیس ہزار دے کر ان سے مکان خرید لیا تھا اور پھر اپنے نام پر لیز بھی کرا لیا تھا۔ رفتہ رفتہ بات پرانی ہوتی گئی اور محلے والے خان صاحب کو بھولتے چلے گئے۔ اس بات کو کئی سال گزر گئے تھے۔ والد صاحب نے ہماری وجہ سے قبل از وقت ریٹائر منٹ لے لی اور واپس کراچی آگئے۔ یہاں آکر انہوں نے ایک اسٹیٹ ایجنسی کھول لی۔ کچھ عرصے بعد یہ چل نکلی۔ اگر چہ ہم سب ہی بھائی کمانے لگے تھے۔ مجھ سے بڑے تینوں کی شادی ہوگئی اور میں باقی رہ گیا تھا۔ مگر میری عمر اتنی نہیں تھی کہ ماں باپ شادی کے لیے زیادہ فکر کرتے دوسرے میں نے ملازمت کے دوران ہی ڈپلومہ کر لیا اور بی ٹیک کی کوشش کر رہا تھا۔ اس لیے مجھے وقت کم ملتا تھا۔ ان ہی دنوں امی کو دل کی ہلکی سی تکلیف ہوئی اور میں انہیں ڈاکٹر کو دکھانے جناح اسپتال لے گیا۔ امی کو دکھانے کے بعد میں دوائیں اور دوسرے کاموں کے لیے فارمیسی گیا تھا وہاں سے آیا تو امی ایک نقاب پوش خاتون سے بات کر رہی تھیں۔ امی نے ان سے میرا تعارف کرایا تو وہ خوش ہوگئیں۔

''ماشاللہ کتنا بڑا ہوگیا۔''

''میں سوچ رہی ہوں اس کی بھی شادی کر دوں۔''

''ضرور کریں۔ بچوں کو جتنی جلدی نمٹا دیا جائے اچھا ہے۔''

''آپ نے دونوں بیٹیوں کی شادی کی؟''

اس سوال پر وہ خاتون مرجھا گئی تھیں۔ ''کہاں باجی،

آپ جان گئی ہوں گی کہ ہم وہاں سے بے سرو سامان نکلے تھے اور بہت عرصے تک تو مالی لحاظ سے سنبھل نہ سکے۔ کرائے کے گھر میں رہ رہے ہیں۔ جو آتا وہ خرچ ہو جاتا۔ بچیوں کو اچھی تعلیم دلائی مگر اب لوگوں کو تعلیم یافتہ اور سلجھی لڑکیوں کی نہیں جہیز کی ضرورت ہوتی ہے۔''

''خدا مسبب الاسباب ہے۔'' امی نے انہیں تسلی دی۔ ''مجھے تو پتا ہی نہیں تھا کہ خان صاحب اتنا بڑا ایثار کر کے گئے تھے۔''

''ہاں مگر صلہ کیا ملا؟'' خاتون کا لہجہ کسی قدر تلخ ہو گیا۔

''انہوں نے جو کیا اس کا صلہ اوپر والا ہی دے سکتا ہے۔'' امی نے کہا تو وہ شرمندہ ہو گئیں۔

''آپ ٹھیک کہہ رہی ہیں۔ مگر کیا کروں کبھی کبھی لبوں پر شکوہ آجاتا ہے۔ اتنا بڑا گھر چھوڑ کر دو کمروں کے فلیٹ میں رو رہے ہیں۔ وہ کہتے ہیں سب زمین کے لیے کیا۔''

میں سن کر بے چین ہو گیا کہ وہ خان صاحب کی بیگم تھیں اور ان کی امی سے بات ہوئی تھی۔ خان صاحب نے محلے سے جاتے ہوئے کون سا ایثار کیا تھا؟ مگر میں ان کے سامنے نہیں پوچھ سکتا تھا۔ خان صاحب کی بیگم بیمار تھیں اور یہاں ڈاکٹر کو دکھانے آئی تھیں۔ امی نے یقیناً ان سے پتا لے لیا تھا اور ان سے چکر لگانے کو کہا۔ ہم باہر نکلے اور رکشے میں بیٹھے تو میں نے امی سے پوچھا۔ ''یہ کیا کہہ رہی تھیں خان صاحب نے کون سا ایثار کیا؟''

''ایثار سا ایثار۔'' امی نے گہری سانس لے کر کہا۔ ''سچ تو یہ ہے کہ انہوں نے حد کر دی۔ اپنا مکان شیخ صاحب کو بیچ کر ساری رقم وار فنڈ میں دے دی۔''

میں دنگ رہ گیا تھا۔ ''تیس ہزار انہوں نے وار فنڈ میں دے دیے؟''

''ایک روپیا بھی نہیں رکھا۔ بیوی نے مخالفت کی تو بولے کہ یہ پلاٹ اسی وطن کے طفیل ہے۔ رقم کی تو کوئی حیثیت نہیں ہے۔ اس کے لیے تو جان بھی حاضر ہے۔ انہوں نے اپنی انا بھی قتل کر دی۔''

امی نے گھر جا کر سب کو بتایا تو کسی کو یقین نہیں آیا مگر ہم خود خان صاحب کی بیگم سے مل کر آرہے تھے۔ ہوتے ہوتے یہ خبر محلے میں پھیلی تو سب ہی دوڑے آئے تھے۔ سب سے پہلے شیخ صاحب کی بیگم آئی تھیں۔ جب امی نے انہیں خان صاحب کے ایثار اور ان کے گھر والوں کی حالت کا بتایا تو وہ رو دی تھیں۔ دوسری عورتیں آئیں اور فیصلہ ہوا کہ وہ اگلے دن خان صاحب کے گھر جائیں گی۔ پھر سارے محلے کی خواتین خان صاحب کے ہاں گئیں۔ جب واپس آئیں تو پتا چلا کہ امی نے ان کی بڑی بیٹی کو میرے لیے مانگ لیا تھا اور شیخ صاحب کی بیگم نے چھوٹی بیٹی کو اپنے سب سے چھوٹے بیٹے کے لیے مانگ لیا تھا۔ یہ کہانی یہیں ختم نہیں ہوتی ہے۔ شیخ صاحب اور والد صاحب جا کر خان صاحب سے ملے تو شیخ صاحب نے خان صاحب سے کہا کہ وہ اپنا مکان واپس لے لیں۔ انہوں نے آج تک اس کی ایک اینٹ بھی نہیں بدلی تھی۔

خان صاحب راضی نہیں تھے مگر سب نے انہیں مجبور کر کے منا لیا۔ وہ اس شرط پر مانے کہ مکان کی قیمت شیخ صاحب کو قسطوں میں ادا کر دیں گے۔ انہوں نے مرنے سے پہلے یہ وعدہ پورا کر دیا۔ جب تک ملازمت رہی تنخواہ سے قسط ادا کرتے رہے اور جب ریٹائر ہوئے تو فنڈ سے ملنے والی رقم سے باقی ادائیگی کی۔ شیخ صاحب مکان پہلے ہی واپس ان کے نام کر چکے تھے اور انہوں نے وہی تیس ہزار لیے جو خان صاحب کو دیے تھے۔ اگرچہ اس وقت تک مکان کی قیمت دوگنی سے زیادہ ہو گئی تھی۔ یہ مکان آج بھی اسی طرح قائم ہے بلکہ اس کی دو منزلیں ہو گئی ہیں۔ ایک منزل میں، میں اپنی بیوی اور بچوں سمیت رہتا ہوں دوسری منزل میں خان صاحب کی دوسری بیٹی اپنے شوہر اور بچوں کے ساتھ رہتی ہے۔ یہ مکان ان ہی دو بہنوں کی ملکیت ہے لیکن اس کا آج تک بٹوارہ نہیں ہوا ہے۔

شمارہ ستمبر 2015ء کی منتخب سچ بیانیاں

ہماری پیش کش...... آپ کا انتخاب

☆ اوّل: عجب دستور...... سعدیہ

☆ دوم: تلافی...... امیمہ سلیم

☆ سوم: ذمے دار کون...... الف ف

پہلے دوسرے اور تیسرے انعام کے لیے آپ بھی منتخب کیجیے
ہم آپ کی رائے کا احترام کریں گے